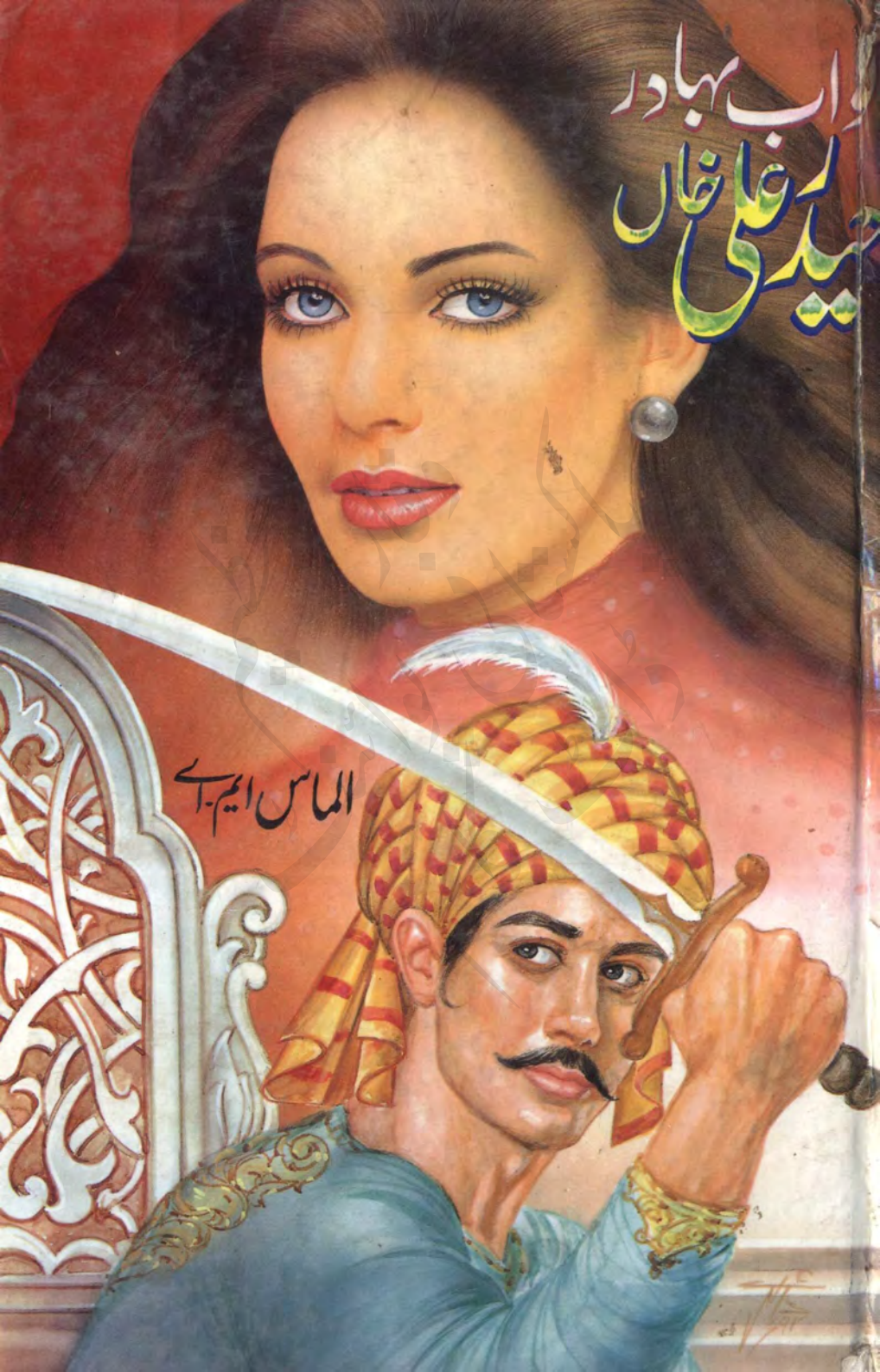


اب ہبادر
میدانی غاغان

الماس ایم ہے



غریب شہر ۸

شمشیر صرف تباہی، بربادی اور قتل و غارت ہی کے لیے بے نیام نہیں ہوتی بلکہ شمشیر کو اس وقت بھی بے نیام کیا جاتا ہے جب تعمیر کا جذبہ دل میں موجزن ہوتا ہے۔

نواب حیدر علی خاں ایسے ہی شمشیر ز نوں کا سرخیل ہے جنہوں نے تحریک کے بجائے تعمیر کے لیے تلوار بلند کی۔ وہ اگرچہ تعلیم سے بے بہرہ تھا مگر اس نے ایک چھوٹی سی ریاست کو ایک عظیم سلطنت میں تبدیل کرنے کا جو منصوبہ بنایا اس پر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ ایک طرف نظام دکن، دوسری طرف مرہٹے اور تیسری طرف انگریزی راج کی بنیادیں مضبوط کرنے والے بدیسی ناجر قدقد پر حیدر علی کے قدم روکنے کی کوشش کرتے رہے۔

مگر —

یہ مجاہد اور فاتح ”سلطنتِ خداداد میسور“ بنانے میں کامیاب و کامران ہوا۔ عظیم جد و جہد پر مشتمل یہ عظیم ناول آپ کو یقیناً پسند آئے گا۔

الماس ایم۔ اے

۲۶۱- خیبر بلوک

اقبال ٹاؤن لاہور

ستمبر ۱۹۹۲ء



شیخ فتح محمد کے گھر میں ہُن برس رہا تھا۔

وہ سرآ کے صوبیدار عابد خاں کے منصب دار تھے۔ منصب دار بھی کوئی ایسے ویسے نہیں بلکہ پانچ سو سوار اور دو ہزار پیادوں کے علاوہ قبیل، نقارہ اور علم کے منصب دار تھے۔ ہر روز، روزِ عید تو ہر شب، شبِ بارات، کا معاملہ تھا۔ لوگ شیخ فتح محمد کی قسمت پر رشک کرتے تھے۔

مگر۔

اس فلکِ کج رفتار کو کسی کی خوش بیاں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ کہتے ہیں کہ ریاستِ میسور کے اس صوبہ کو کسی کی ایسی نظر لگی کہ یہاں کی بہاریں خزاں میں بدل گئیں۔ سرآ کے صوبے دار عابد خاں کا انتقال کیا ہوا کہ دنیا ہی بدل گئی۔ مرحوم صوبیدار عابد خاں کا بیٹا عبدالرسول صوبیداری کا دعوے دار ہوا۔ اس کا حق بھی تھا لیکن شاہیوں اور شخصی حکومتمنوں میں تلوار کی زبان چلتی ہے اور جس کی لاسٹھی اس کی بھینس کے اصول پر ٹل جاتا ہے۔

چنانچہ ایک اور منصب دار نواب طاہر محمد خاں بھی صوبیداری کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ عبدالرسول خاں نے کچھ معززین اور سرداروں کو بیچ میں ڈالا کہ بغیر خونِ خرابے کے یہ معاملہ پنٹ جائے۔ شیخ فتح محمد نے بھی بہت دوڑ دھوپ کی مگر نواب طاہر محمد خاں اپنی تلوار بے پیام کر چکے تھے۔ انہوں نے کسی کی ایک نہ سنی اور لشکر لے کر سرآ پر چڑھ دوڑے۔

عبدالرسول خاں کو بھی مجبوراً ہتھیار اٹھانا پڑے۔ شیخ فتح محمد، مرحوم نواب عابد خاں کے نمک خوار تھے انہیں مجبوراً عبدالرسول خاں کا ساتھ دینا پڑا۔
ابھی گفت و شنید ہو ہی رہی تھی کہ ایک شب عباس قلی خاں تن تنہا سر کی شہر پناہ کے دروازے پر پہنچا۔ جنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے اس لیے فتح محمد بہت محتاط اور ہوشیار رہتا تھا اس کے سوار اور پیادے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔
عباس قلی خاں بالا پور کا حاکم اور نواب طاہر محمد خاں کا بیٹا تھا۔ بعض جگہ عباس قلی خاں کو نواب طاہر خاں کا طرفدار لکھا گیا ہے۔ اسے سب ہی پہچانتے تھے۔ فتح محمد کے سواروں نے اسے فوراً گھیر لیا مگر ادب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔
"نواب قلی خاں!"

فتح محمد کے محافظ سردار نے اسے مخاطب کیا:
"آپ کا اس وقت یہاں آنا بڑی حیرت کی بات ہے۔ کیا آپ آنے کا مقصد بیان کرنا پسند فرمائیں گے؟"

حاکم بالا پور قلی خاں نے سپاٹ لہجہ میں جواب دیا:
"جنگ ناگزیر ہو جائے تب بھی صبح کی گنت گوت کو آخری لمحے تک ہو سکتی ہے۔"
حاکم بالا پور نے درست فرمایا۔ "محافظ سردار نے کہا:
"مگر آپ کا تنہا تشریف لانا کیا ایک غیر دانشمندانہ فعلی نہیں۔ پھر اس وقت جبکہ آپ کے پدر بزرگوار نواب طاہر محمد خاں اور میرے آقا خان عبدالرسول خاں کے درمیان میدان جنگ آراستہ ہو چکا ہے۔"

"تمہارا خیال کسی حد تک ٹھیک ہے محافظ سردار۔" حاکم بالا پور عباس قلی خاں نے تائید کرتے ہوئے کہا:

"لیکن آج جنگ کا بالکل بچا نہیں بلکہ اس کی شنائیاں لے کے آئے ہیں۔ خان عبدالرسول خاں کہہ رہے ہیں کہ اس کی اطلاع دی جائے۔"
"بہتر ہے حاکم بالا پور۔ لیکن۔" محافظ سردار نے رک کر حاکم بالا پور عباس قلی خاں کے چہرے کو دیکھا۔

عباس قلی خاں نے اس میں ایچ و تاب کھامکھام کر لیا مگر منہ سے کچھ نہ بولا بلکہ لٹکی موٹی تلوار

معہ بیٹی کے انارکھ محافظ سردار کی طرف بڑھادی۔
"خدا کسی بہادر سے اس کی تلوار اٹک نہ کرے۔" اس کے ساتھ ہی قلی خاں نے زہر خند کیا۔
محافظ سردار نے بھی زہر خند کے ساتھ جواب دیا:
"حاکم بالا پور مطمئن رہیں۔ ان کی تلوار ان کی نظروں کے سامنے ہی رہے گی۔"
محافظ سردار نے حاکم بالا پور کی تلوار ایک دوسرے محافظ کو دی اور اسے تاکید کی:
"میری واپسی تک تم اپنی جگہ سے نہ ہلو گے۔"
پھر وہ پلٹ کر عباس قلی خاں سے بولا:

"حاکم بالا پور میرے ساتھ تشریف لے گئے۔ میرا خیال ہے کہ خان عبدالرسول خاں آپ کی ملاقات سے انکار نہ کریں گے۔"

محافظ سردار کے اشارے پر شہر کے بڑے دروازے کے اندر کے چھوٹے دروازے کو کھول دیا گیا۔ محافظ سردار اور عباس قلی خاں حاکم بالا پور دروازے سے اندر پہنچ گئے۔
عبدالرسول خاں اپنے مرحوم باپ عابد خاں کی حویلی ہی میں مقیم تھا۔ حویلی شہر پناہ سے کچھ زیادہ دور نہ تھی۔ دم کے دم میں یہ دونوں وہاں پہنچ گئے۔

محافظ سردار عباس قلی خاں کو مہمان خانہ کے ناظم کے حوالے کر کے اندر چلا گیا۔ عباس قلی خاں جیسے بد دماغ کے لیے یہ نہ تھا کہ انہیں آئیں انہی تو ہیں امیر اور نفرت ان کے خیر اور اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اس توہین کا بدلہ ضرور لے گا۔

کچھ دیر بعد حویلی میں جانے والا محافظ واپس آتا دکھائی دیا لیکن وہ اکیلا نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ تین گانیا صوبیدار عبدالرسول خاں بھی تھا۔

عبدالرسول خاں مہمان خانے میں داخل ہوا تو عباس قلی خاں کو کھڑے ہو کر اس کی تعظیم کرنا پڑی۔

عبدالرسول خاں بہت نیک اور ملسار آدمی تھا۔ وہ آگے بڑھ کر عباس قلی خاں حاکم بالا پور سے بٹک گھیر ہوا۔

"خان عباس قلی خاں۔" عبدالرسول نے کہا:

"آپ کے اس وقت، یہاں آنے سے مجھے جس قدر خوشی ہوئی ہے اسے میں بیان نہیں کر سکتا۔ دراصل میں نواب طاہر محمد خاں کی عزت اپنے بزرگوار کی طرح کرتا ہوں مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ

پھر حاکم بالا پور عباس قلی خاں نے شیخ فتح محمد کو مخاطب کیا:
 "شیخ صاحب! آپ کے اہل و عیال بالا پور میں بالکل خیریت سے ہیں۔ میں نے احتیاط کے
 طور پر آپ کی حویلی پر پہرہ لگا دیا ہے۔ میرے خیال میں وہ بالا پور میں زیادہ محفوظ ہیں۔ پھر بھی اگر
 آپ چاہیں تو انہیں آپ کے پاس بھیج دیا جائے۔"

شیخ فتح محمد حاکم بالا پور کو دیکھ کر ہی پریشان ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ عباس قلی خاں کی
 ہمدردیاں نواب طاہر محمد خاں کے ساتھ ہیں مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ عباس قلی خاں کے علم میں یہ بات
 ہے کہ اس کے اہل خانہ بالا پور میں ہیں۔ مگر اس وقت حاکم بالا پور نے جس انداز سے شیخ
 فتح محمد پر اس بات کا اظہار کیا کہ اس کے اہل و عیال بخیریت ہیں، اس سے شیخ کو فوراً خطرے کا
 احساس ہو گیا۔

شیخ فتح محمد نے بہت سنبھل کر کہا:

"مجھے حاکم بالا پور کی شرافت اور خاندانی عظمت سے پوری امید ہے کہ وہ ان بگڑے ہوئے
 حالات میں میرے اہل خانہ کی حفاظت کریں گے۔ اس لیے کہ اختلاف اور جنگ مردوں اور
 فوجوں میں ہوتے ہیں۔ فریقین کے اہل خانہ دورانِ جنگ معصوم ہوتے ہیں اس لیے انہیں کسی
 قسم کی تکلیف نہ ہونی چاہیے۔"

کیونکہ شیخ صاحب آپ نے بالکل درست فرمایا۔" عباس قلی خاں فوراً بولا:

"پھر ابھی جنگ کہاں ہو رہی ہے۔ میں عبدالرسول خاں کے پاس نواب طاہر محمد خاں کا صلح
 کا پیغام لے کے آیا ہوں۔ ذرا آپ بھی عبدالرسول کو سمجھائیے، جنگ سے کسی کا بھی بھلا نہ ہوگا۔"
 شیخ فتح محمد نے عبدالرسول خاں کی طرف دیکھا۔

عبدالرسول خود بھی شیخ فتح محمد کو اس گفتگو میں شریک کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا:

"اے شیخ صاحب! میں اس بات کی تصدیق تو کر سکتا ہوں کہ حاکم بالا پور صلح کا پیغام لائے
 ہیں لیکن یہ پیغام دراصل ہماری موت کا پیغام ہے۔ نواب طاہر محمد خاں چاہتے ہیں کہ میں سمرآ کی
 صوبیداری سے دست کش ہو جاؤں، یعنی اپنا حق چھوڑ دوں اور نواب صاحب کے رحم و کرم پر
 زندگی گزار دوں۔"

"آپ نے حاکم بالا پور کو کوئی حتمی جواب دے دیا ہے کہ نہیں؟" شیخ فتح محمد نے عبدالرسول
 خاں سے دریافت کیا۔

اس وقت مجھے ان کے مقابلہ پر کھڑا ہونا پڑا ہے۔"

"آپ مقابلے پر کیوں کھڑے ہوتے ہیں عبدالرسول خاں! عباس قلی خاں نے اس کی بات
 کاٹتے ہوئے کہا:

"میں اس لیے آیا ہوں کہ آپ کو جنگ سے باز رکھوں۔ نواب طاہر محمد خاں نے پیش کش کی ہے
 کہ اگر آپ سمرآ کی صوبیداری سے دست کش ہو جائیں تو نواب صاحب آپ کو اس بڑے علاقے
 کی صوبیداری دلانے کے لیے کوشش کریں گے۔"

عبدالرسول خاں کو یہ قطع کلامی اور پیش کش دونوں ہی ناگوار گزریں مگر انہوں نے تحمل سے
 جواب دیا:

"عباس قلی خاں! میں نواب طاہر محمد خاں کی پیش کش شکریہ کے ساتھ مسترد کرتا ہوں۔ کیا
 آپ مجھے بتائیں گے کہ نواب طاہر محمد خاں سمرآ کی صوبیداری کا دعویٰ کس بنا پر کر رہے ہیں۔ میرے
 پدر بزرگوار عابد خاں سمرآ کے صوبیدار تھے۔ ان کا انتقال ہو گیا۔ اب شرعی اور قانونی حیثیت سے
 میں ان کا وارث ہوں اس لیے کہ میں ان کی اولاد ہوں۔ نواب صاحب خواہ مخواہ میرا حق
 کیوں چھیننا چاہتے ہیں۔ انہیں سمرآ کی صوبیداری کا حق کس طرح پہنچتا ہے؟"

"خان عبدالرسول خاں! عباس قلی خاں بولا:

"یہ تسلیم کہ آپ عابد خاں کے بیٹے ہیں۔ یہ بھی تسلیم کہ عابد خاں سمرآ کے صوبیدار تھے لیکن
 عابد خاں اب مرحوم ہو چکے ہیں اور سمرآ کی صوبیداری بھی ان کے ساتھ ہی دفن ہو چکی ہے۔ سمرآ کا
 اب کوئی صوبیدار نہیں۔ جتنا حق سمرآ پر آپ کا ہے اتنا ہی حق نواب طاہر محمد خاں کا بھی ہے بلکہ نواب
 صاحب کے علاوہ کوئی بھی سردار سمرآ کی صوبیداری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔"

"یہی تو میں آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ نواب صاحب کو کس آسمانی یا سلطانی قانون نے حق دیا
 کہ وہ سمرآ کی صوبیداری کا دعویٰ کریں؟ عبدالرسول خاں کے بچے میں ملکی سی تلخی نہ لگتی۔
 حاکم بالا پور کی تیوریوں پر بھی بل پڑ گئے۔"

وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ عبدالرسول خاں کا منصب دار شیخ فتح محمد داخل ہوا۔ اس نے
 حاکم بالا پور عباس قلی خاں کو سلام کیا۔ حاکم بالا پور نے فتح محمد خاں کو صرف جواب ہی نہیں دیا بلکہ
 ایک قدم اس کی طرف بڑھ کر اپنے بازو اس طرح پھیلادے جیسے وہ فتح محمد سے بغل گیر ہونا چاہتا
 ہے۔ چنانچہ فتح محمد نے بھی بے تکلفی کا اظہار کیا اور عباس قلی خاں سے بغل گیر ہوا۔

جواب تو نہیں دیا لیکن مجھے نواب طاہر محمد خاں کا مشورہ کچھ پسند نہیں۔ عبدالرسول خاں نے کہا:

”آپ کی یاد رائے ہے شیخ صاحب؟“

ہاں۔ مجھے کچھ دیر سوچنے کا موقع تو دیجیے۔
شیخ فتح محمد گھر گیا۔

فی الحال میں آپ کو کوئی جواب نہیں دے سکتا:

”مگر حکم بالا پورے جواب کے منہ ظہر میں۔“ عبدالرسول خاں نے بتایا۔

شیخ فتح محمد نے حاکم بالا پوری طرف دیکھتے ہوئے کہا:

نباس قلی خاں، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ کل شام تک کا وقت دیدیں تاکہ میں اودھوید؟
عبدالرسول خاں باہم استغاثہ کر کے کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں۔

نہیں ہے۔ آپ اچھی طرح غور فرمائیے۔ میں کل شام تک آپ کے جواب کا انتظار کروں گا۔

اور۔

حاکم بالا پور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

نباس قلی خاں نے جانے کے بعد عبدالرسول خاں اور شیخ فتح محمد دیر تک اپنے اپنے خیالوں

میں ڈوبے رہے۔ وہ مہمان خانے سے اٹھ کر صوبیدار عبدالرسول کے خاص کمرے میں آئے
تھے مگر اب تک ان میں بات چیت نہیں ہوئی تھی۔

اُسے ہاں۔ شیخ صاحب! آپ جس کام کے لیے گئے تھے اس کا کیا بنا؟ صوبیدار عبدالرسول

نے چونک کے سوال کیا۔

شیخ فتح محمد بھی خیالوں سے واپس آچکے تھے۔ انھوں نے ٹھنڈی سانس لی اور بولے:

”صوبیدار عبدالرسول خاں۔ حاکم بالا پور ہم سے زیادہ عقلمند ہے۔ اس نے میرے گھر پر

اس قدر سخت پہرہ لگایا ہے کہ وہاں پر زندہ پر نہیں مار سکتا۔ میرے اہل خانہ گھر سے باہر جانا تک

بھی نہیں سکتے۔ نباس قلی خاں نے میرے داروں کو جبردار کیا ہے کہ اگر شیخ کے پیوی بچے بالاد

سے بھاگ نکلے تو ایک پہرے دار کو بھی زندہ نہ چھوڑا جائے گا۔ مجھے میرے دوستوں نے

بالا پوری کو صدمہ پر جانے سے روک دیا۔ انھوں نے مجھ سے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ اگر پیوی بچوں

کو حاصل کرنا ہے تو صوبیدار عبدالرسول خاں کو چھوڑ کے نواب طاہر محمد خاں کا ساتھ دو۔ دوسری صورت

میں ہاں بچوں سے ہاتھ دھو ڈالو۔“

صوبیدار عبدالرسول شیخ کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ جب وہ خاموش ہوئے تو
اس نے پوچھا:

”پھر آپ نے کیا فیصلہ کیا شیخ صاحب؟“

”وہی فیصلہ جس سے میں نے آپ کو پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔“ شیخ فتح محمد نے بڑے استقلال
سے جواب دیا۔

”یعنی آپ میرا ساتھ دیں گے؟“

”بالکل ساتھ دوں گا۔“

”خواہ آپ کے بچے۔“

”ان کا اللہ مالک ہے۔“ یہ کہتے ہوئے شیخ فتح محمد کی آواز بھرا گئی۔ پھر وہ کھسکا کر بولے:

عبدالرسول خاں۔ میں احسان فرازش نہیں۔ عابد خاں کے مجھ پر اس قدر احسانات ہیں جنہیں

میں اپنی جان دے کر بھی نہیں اتار سکتا۔ میں ان کی زندگی میں ان کے لیے کچھ بھی نہ کر سکا۔

دراصل ان کی زندگی اور ان کا عہد بڑا پرسکون تھا۔ کوئی جنگ ہی نہیں ہوئی کہ میں ان کے کچھ تو

احسان اتار سکتا۔ پھر وہ چپکے سے چلے گئے اور اب جبکہ ان کے بیٹے پر وقت پڑا ہے تو میں بیٹھ

دکھا جاؤں۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔“

صوبیدار عبدالرسول خاں نے متشکر نظروں سے شیخ فتح محمد کو دیکھا۔ شیخ دو ہزار پیادے

پانچ سو سواروں اور فیل، انفارہ، علم کے ساتھ منصب دار تھے لیکن جس دن سے عابد خاں کا

انتقال ہوا اور عبدالرسول خاں نے اپنی صوبیداری کا اعلان کیا تھا تو اس کے ساتھ ہی شیخ فتح محمد

کو سرا کی افواج کا سپہ سالار مقرر کر دیا گیا تھا۔

صوبیدار عبدالرسول خاں انہیں پہلے ہی بتاتا تھا۔ آج شیخ فتح محمد نے اپنے پیوی بچوں

کی پروا نہ کرتے ہوئے عبدالرسول کا ساتھ دینے کا جس عزم اور حوصلے سے اعلان کیا تھا اس

نے صوبیدار سرا کو ہمیشہ کے لیے اپنا غلام بنایا تھا۔

چالاک اور شاطر حاکم بالا پور نے دوسرے روز شام تک عبدالرسول خاں کے جواب کا

انتظار کرنے کی زحمت، گوارا نہ کی بلکہ اسی رات وہ نواب طاہر محمد خاں سے ملا اور یہ فیصلہ کیا کہ رات کے بقیہ حصے میں لشکر کو تیار کیا جائے اور صبح ہوتے ہی سرا پر حملہ کر دیا جائے۔

ادھر سردار سرا تو مدافعت کے لیے پہلے ہی تیار تھا۔ پھر جب شیخ فتح محمد سالار افواج سرانے اپنے غیر متزلزل عزم کا اظہار کیا تو شیخ کے مشورے سے اس نے بھی رات بھر تیار رہیں کا حکم دیا۔

شیخ فتح محمد نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ سرا میں بیٹھ کے نواب طاہر محمد خاں کے حملے کا انتظار کرنے کے بجائے خود ہی اپنے لشکر کو حرکت دے گا اور پہلے بالا پور پر حملہ کر کے اپنے اہل خانہ کو چھڑائے گا اور عباس قلی خاں سے طزیہ گفتگو کا بدلہ لے گا۔ اس کے بعد نواب طاہر محمد خاں کو اس کے غزوہ کا مزہ چکھائے گا۔

یہ عجیب اتفاق تھا کہ دونوں طرف رات بھر جنگی تیاریاں ہوتی رہیں اور صبح ہونے سے پہلے ہی دونوں لشکر سرا کی سرحد کے قریب پہنچ چکے تھے۔

بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ نواب طاہر محمد خاں کی زیادتی ہے۔ سرا کا صوبیدار عابد خاں قیادرا اس کے مرنے کے بعد اس عہدے پر مروج کے بیٹے عبدالرسول خاں کا حق بنتا تھا یا پھر وہ شخص سرا کی صوبیداری کا دعویٰ کر سکتا تھا جسے ریاست میسور کی طرف سے صوبے داری کا پرہ دانہ دیا گیا ہو۔

لیکن۔

اس وقت راجہ میسور کی حیثیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ صرف نام کا راجہ تھا۔ تمام اختیارات راجہ کے وزیر اعظم کے ہاتھ میں تھے۔ وہ بھی بے بس تھا کیونکہ ریاست کے صوبیدار اور منصب دار راجہ میسور کی ریاست تو تسلیم کرتے تھے مگر اس کا کوئی حکم نہ مانتے تھے۔ چنانچہ منصب دار اور صوبیدار وزیر آپس میں لڑتے اور جنگ کرتے رہتے تھے۔ جو طاقتور ہوتا وہ دوسرے کو معزول کر دیتا اور راجہ میسور سے اپنے حق میں تشریف کا پرہ دانہ حاکم لیتا۔

نواب طاہر محمد خاں اور عبدالرسول خاں کا بگڑا جو نے اب جنگ کی صورت اختیار کر لی تھی، پھر اسی قسم کا تھا۔ صوبیدار عابد خاں نے مرنے ہی نواب طاہر محمد خاں، یہ سرا کی صوبیداری پر دانت گاڑ دیے۔

عابد خاں کی حیات میں تو اس نے سرا کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا مگر ان کے مرنے

وہ شیر کی طرح انگڑائی لے کر اٹھا اور عبدالرسول خاں کو سرا کی صوبیداری سے ہٹ جانے کا پیغام بھیجا۔ یہ پیغام نہیں تھا بلکہ الٹی میٹم تھا۔ نواب طاہر محمد خاں کو اپنی کامیابی کی سو فیصد امید تھی کیونکہ اس کے ساتھ حاکم بالا پور عباس قلی خاں بھی تھا۔

سرا کا موجودہ صوبیدار عبدالرسول خاں واقعی ایک کمزور اور کم عقل انسان تھا لیکن اس کا منصب دار جو عابد خاں کے مرنے پر سرا کا سپہ سالار بنایا گیا تھا، وہ شیخ فتح محمد تھا جس کی بہادری اور دورانہ لیشی کا چرچا دور دراز تک پھیلا ہوا تھا۔

شیخ فتح محمد کے بال بچے بالا پور میں رہتے تھے جہاں کا حاکم عباس قلی خاں تھا۔ نواب طاہر محمد خاں نے اسی لیے حاکم بالا پور کو عبدالرسول خاں کے پاس بھیجا تھا تاکہ عباس قلی خاں اور شیخ فتح محمد کے درمیان بھی گفتگو ہو سکے۔

حاکم بالا پور کو دراصل شیخ فتح محمد سے سودے بازی کے لیے بھیجا گیا تھا۔ شیخ فتح محمد بھی غافل نہ تھا۔ ابھی چند دن پہلے نواب طاہر محمد خاں نے سرا کی صوبیداری کا جھگڑا کھڑا کیا تھا۔ نواب طاہر کی اپنی کوئی بڑی فوج نہ تھی۔ یہ بات فتح محمد کو معلوم تھی اور اسی وجہ سے فتح محمد نے چاروں طرف اپنے جاسوس دوڑائے تھے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ نواب طاہر محمد خاں کی پشت پر اور کون لوگ ہیں جن کی شہ پر وہ سرا جیسے مضبوط صوبہ پر بزدل شمشیر قبضہ جمانا چاہتا ہے۔

شیخ فتح محمد کے جاسوسوں نے اسے جلد ہی اطلاع دی کہ حاکم بالا پور عباس قلی خاں، نواب کا حلیف ہے اور جنگ کی صورت میں بالا پور کا لشکر نواب کا ماتھ دے گا۔

بالا پور کا نام سننے ہی اس کے ہوش اڑ گئے اس لیے کہ بالا پور میں اس کی بیوی اور دو بچے رہائش پذیر تھے۔ پس وہ اسحاق دقت بالا پور روانہ ہو گیا مگر جب وہ بالا پور کی سرحد پر پہنچا تو اس کے چند دوستوں نے اسے وہیں روک لیا اور بتایا کہ حاکم بالا پور نے اس کے اہل خانہ پر سخت پرہ لگا دیا ہے اس لیے اس کا دہل جانا موت کو دعوت دینا ہے۔

شیخ فتح محمد نے اپنے دوستوں کا شکریہ ادا کیا اور انہیں یہی تاثر دیا کہ وہ واپس سرا جا رہا ہے مگر بال بچوں کا معاملہ اس کے دل سے لگا تھا اور وہ چوکی پرے کے ڈر سے بالا پور جانے سے نہیں رک سکتا تھا۔

دوستوں سے رخصت ہو کے وہ تھوڑی دور واپس آیا اور راستہ کاٹ کر بالا پور میں داخل ہوا۔ فتح محمد سب دھا اس مکان پر گیا جہاں وہ اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ گیا تھا۔

وہ یہ دیکھ کر سخت متعجب ہوا کہ مکان پر کوئی سپرہ نہ تھا۔ وہ احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا گھر کے دروازے پر پہنچ گیا لیکن اسے نہ کسی نے ٹوکا اور نہ باز پرس کی۔ اس وقت اسے اپنے دوستوں پر سخت غصہ آیا مگر جب مکان کے دروازے پر اس نے تالا لگا دیکھا تو اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔

رات کا وقت تھا اس لیے اسے نہ کسی نے دیکھا اور نہ پہچان سکا۔ اس کے گھر کے قریب ہی ایک قہوہ خانہ تھا۔ اس کا مالک شیخ کاشنا تھا۔ وہ قہوہ خانے کے مالک کے پاس گیا تو وہ فتح محمد کو دیکھ کر گھبرا گیا اور جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کے کمرے میں لے گیا۔

شیخ صاحب! آپ نے یہاں آ کے بڑی غلطی کی ہے۔ قہوہ خانے کے مالک نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

گھبراؤ نہیں! شیخ نے اسے تسلی دی:

اگر میں پکڑ لیا تو تم پر کوئی بات نہ آئے۔ دوں گا مجھے جلدی سے بتاؤ کہ میرے گھر والے کہاں گئے یا انہیں کہاں رکھا گیا ہے؟

مالک کو ذرا حوصلہ ہوا تو اس نے بتایا:

”آپ کے گھر پر سخت سپرہ لگا تھا شیخ صاحب۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو دوسو سوار اور پیادے آپ کے گھر کو گھیرے رہتے تھے۔“

”مجھے تعقل نہ بتاؤ۔“ شیخ نے اس کی بات کاٹ دی:

”صرف یہ بتاؤ کہ وہ اس وقت کہاں ہیں۔ زندہ ہیں یا“

”خدا نہ کرے!“

قہوہ خانے کے مالک نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا:

”پرسوں ملک وہ اسی مکان میں تھے۔ پھر اک دم حاکم کا حکم آیا کہ گھروالوں کو یہاں سے نکال کر قید خانہ میں رکھا جائے۔ اسی وقت یہاں سے لے گئے۔ خدا غارت کرے ان لوگوں کو۔ ظالم! آپ کی بیوی اور دونوں بچوں کو پیدل چلا کر لے گئے ہیں یہاں سے۔“

شیخ فتح محمد نے ایک گری سانس لی۔ پھر پوچھا:

”قید خانہ کہاں اور کتنی دُور ہے؟“

خدا کے لیے شیخ صاحب۔ وہاں جانے کی کوشش نہ کیجیے۔ قہوہ خانے کے مالک نے

شیخ سے درخواست کی:

”میں کل دن بھر وہیں پکڑ لگاتا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ ضرور آئیں گے اور مجھ سے ضرور دریافت کریں گے اس لیے میں کل ادھر حال چال لینے گیا تھا۔“

شیخ صاحب! عجب طرح کا سپرہ ہے وہاں۔ قدم قدم پر مسلح سوار کھڑے ہیں۔ قید خانہ کے چاروں طرف ایک میل دور تک۔ سپرہ ہی سپرہ ہے۔ آپ وہاں نہ جاتیے۔ میں آپ کی منت کرتا ہوں۔“

قہوہ خانے کے مالک نے لاکھ جتن کیے کہ شیخ فتح محمد ادھر نہ جائیں مگر ان کا دل کب مانتا تھا۔ اس کے پاس سے تو ہوں ہاں کر کے اٹھ گئے مگر بیوی بچوں کی محبت، آخر انہیں ادھر پہنچ ہی لے گئی۔

مگر۔

بیتہ وہی ہوا جس کا اشارہ قہوہ خانے کے مالک نے دیا تھا۔ وہ تو خیر ہو گئی ورنہ ایک محافظ نے انہیں دشمن کا جاسوس سمجھ کر پکڑ لیا تھا اور کسی طرح چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا۔ شیخ صاحب کو غصہ، مددہ اور بے کسی نے ایسا گھیرا کہ ان کے سچے آئینہ نگار آئے۔ اس وقت، محافظ کو ان پر دم آ گیا ورنہ لینے کے دینے پڑ جاتے۔

پھر جب شیخ فتح محمد تھکے مارے اور ناکام سراپنچے تو وہاں اپنے دشمن خاص یعنی عباس قلی خاں کو صوبیدار عبدالرسول خاں سے الجھتے ہوئے پایا اور پھر وہ سب کچھ گزرا جس کا حال بیان کیا جا چکا ہے۔



دونوں فوجیں آمنے سامنے تھیں۔

انہیں ایک دوسرے کی فوج کو دیکھ کر ذرا بھی حیرانی نہیں ہوئی عباس قلی خاں نے اگرچہ دوسرے دن شام تک کے لیے فتح محمد کو ہتھ دے دی تھی لیکن اس نے یہ وعدہ وفا نہ کیا اور رات کے آخری حصہ میں نواب طاہر محمد خاں اور اپنی فوجیں لے کر سرا کی سرحد کی طرف چل پڑا۔ یہ سرا سر رکھ کر بازی تھی لیکن جنگ کی زبان میں اسے حکمت علی کہتے ہیں اس لیے کہ جنگ میں ہر بات جائز ہے۔

صوبیدار عبدالرسول خاں اور شیخ فتح محمد نے بھی ایسی ہی پنج حرکت کی۔ شیخ نے عباس قلی خاں سے

کل شام تک جواب دینے کی ہمت حاصل کی تھی لیکن اس نے رات ہی کو فوجیں تیار کیں اور سرحد کی طرف چل پڑا مگر جب اس نے سرحد پر نواب ہاہر محمد خاں اور عباس قلی خاں کے متحدہ لشکر کو حرکت کرتے دیکھا تو اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا وہ عباس قلی خاں کو دھوکہ باز کس طرح کہتا جبکہ خود اس نے مجبور دھوکہ بازی سے کام لیا تھا۔ اس طرح دونوں لشکروں کے کرتا دھرتا دھوکے باز تھے لیکن وہ ایک دوسرے کو زبان سے کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔

آخر انھوں نے ذرا دن چڑھے ایک دوسرے کو جواب دیا لیکن اپنی زبان سے نہیں بلکہ تیز دشمنی کی زبان سے اور کندو تشنگ کی زبان سے۔ دونوں کے پاس بڑے لشکر نہ تھے مگر جنگ اس طرح شروع ہوئی جیسے شیروں اور بھیرلوں کے غول ایک دوسرے پر بھپٹ پڑے ہوں۔

نواب ہاہر محمد خاں نے صوبیدار سرا کو الٹی میم دیا تھا اور اب وہ اس الٹی میم کی لاج رکھنے کے لیے زبردست جنگ کر رہا تھا۔

صوبیدار عبدالرسول خاں کی پوزیشن اس سے زیادہ خراب تھی اس کی صوبے داری صرف اسی صورت میں بچ سکتی تھی کہ وہ نواب عباس قلی خاں کے متحدہ لشکر کو میدان سے مار بھگائے مگر یہ مشکل نظر آ رہا تھا اس کے مقابل برابر سے بھی زیادہ لشکر تھا اس لیے عبدالرسول خاں جی توڑ کے لڑ رہا تھا۔

شیخ فتح محمد اسے ناکارہ اور بزدل سمجھتا تھا لیکن عبدالرسول خاں اس قدر جرأت و بہادری سے لڑا کہ شیخ فتح محمد عیش عش کر رہا تھا۔

اب شیخ فتح محمد خاں تو اسے بہادری سے لڑتا ہی نہ تھا بلکہ شجاعت کے بھٹکے گاڑو بناتے تھے۔ ایک تو وہ منصب دار سے نیا نیا فوجدار سپہ سالار بناتا تھا اس لیے اسے اپنی فوجداری کی عزت برقرار رکھنی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس کے گھروالے بالاپور میں عباس قلی خاں کی قید میں تھے ان کی صلہ مخی اور آزادی کی یہی صورت تھی کہ وہ دشمن کو شکست فاش دے کہ عباس قلی خاں کو قتل کرے اور بیوی بچوں کو آزاد کرائے۔

یہ مختصر فوجوں کی مختصر سی جنگ ایک خونریز جنگ میں تبدیل ہو گئی تھی۔ جنگ صبح ہی سے تیز ہو رہی تھی مگر دوسرا پہر ہوتے ہوئے اس میں بڑی شدت پیدا ہو گئی تھی اس کے ساتھ ہی سرداؤں کا ہلہ بھاری پڑ رہا تھا۔ شیخ فتح محمد کے تابڑ توڑ حملوں نے عباس قلی خاں کو کھلا دیا تھا

اس کا لشکر پسپا ہونے لگا تھا۔

عباس قلی خاں کی فوج میدان چھوڑ گئی تھی لیکن وہ خود اپنے ذاتی محافظوں کے ساتھ میدان میں ڈٹا ہوا تھا۔ شیخ فتح محمد نے اس پر بہت دباؤ ڈالا تھا اور اس کا دباؤ اب اور زیادہ ہو گیا تھا کیونکہ قلی خاں کے گرد صرف نام کے چند سوار رہ گئے تھے۔ آخر شیخ فتح محمد نے اپنا آخری زور وار حملہ کیا اور اپنا گھوڑا چمکا کے اپنے فوجی دستوں سے آگے نکل کر عباس قلی خاں کے پاس پہنچ گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے شیخ فتح محمد اپنے حریف کو چند ہی لمحوں میں مار کر گر ادے گا یا بھڑا ستے میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دے گا۔

لیکن —

تمام انداز سے اور اندیشے غلط ثابت ہوئے۔

عباس قلی خاں جس کی اپنی جان شدید خطر سے تھی اور وہ کوئی دم کا مہمان نظر آتا تھا اس عباس قلی خاں نے نہ جانے کس زبان میں اپنے محافظوں کو کیا حکم دیا کہ عباس قلی خاں کے راس بارہ سواروں نے زمین میں اٹکی ہوئی ریشم کی ڈوریاں تیزی سے کھولیں اور ایک ساتھ ان کی بارہ کندہیں ہوا میں لہرائی ہوئی شیخ فتح محمد پر لہراتے مانپوں کی طرح گر گئیں۔ شیخ اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھا لیکن وہ ایک ماہر شمشیر زن تھا۔ وہ گھوڑا بوڑے کے کندہیں دس سے سات نکل گیا اور دو کندہیں اس کی تلوار کی دھار سے ٹکرا کر کھٹ گئیں۔

اب شیخ فتح محمد کو اپنی نذر پڑ گئی۔

وہ اپنے دستوں سے پانچ گز لمگے نکل آیا تھا رجان بچانے کے لیے وہ تیزی سے اپنے لشکر کی طرف پٹا لیکن مخالف سواروں کے آٹھ دس کندہوں کے سنبھٹے ہوا کریم اس پر گرا ایک حلقہ کندہ اس کو تلوار کو گھیرے ہوئے لیتا ہوا اس کی کلائی تک پہنچا اور جب وہ کہتا تو تلوار شیخ فتح محمد کے ہاتھ سے چھوڑ کر درجہ لگ گئی۔

اسی وقت ایک دوسرا حملہ اس کی گردن کے گرد مانپ کی طرح پیٹ گیا۔ پھر جب اس پر زور پڑا تو شیخ فتح محمد بد کافی تن دوڑتا ہوا ایک تھا گھوڑے سے اچھل کر پہلے زمین سے اٹھا۔ پھر زمین پر آ کر۔

اس کے ساتھ ہی دس بارہ تلواریں ایک ساتھ اس کے جسم پر گر گئیں اور پورا بدن پھٹتی ہو

ذلت، خدا ہی کے ہاتھ میں اور اسی کی طرف سے ہے۔ وہ مصائب میں ڈال کر انسان کے صبر کا امتحان لیتا ہے۔

اس بی بی نے بہت اچھے دن دیکھے تھے اس لیے وہ ان برسوں میں بھی خدا کو نہ بھولی اور صبر و شکر کر کے قید و بند کے دن گزارتی رہی۔

مگر جب شیخ فتح محمد میدان جنگ میں لڑتا ہوا مارا گیا اور حاکم بالا پور کو یہ اطمینان ہو گیا کہ قید خانہ میں بڑی ہوئی منگولوں ہستیوں کا کوئی دالدارت نہیں رہا تو وہ اور زیادہ کھل کھلا۔ شیخ فتح محمد کے اہل خانہ بالا پور میں رہائش پذیر تھے اور حاکم بالا پور انہیں قتل بھی کر سکتا تھا لیکن عباس قلی خاں جس قدر ظالم تھا اتنا ہی دوراندیش بھی تھا۔ اس نے انہیں قتل کرانے کے بجائے اس لیے قید کیا تھا کہ اگر اسے شکست ہو گئی اور شیخ فتح محمد کا سیلاب ہوا تو وہ ان مفید عورت اور بچوں کی آڑ میں فتح محمد سے سودے بازی کرے گا اور ان کے صلے میں منہ کا رقم یا علاقہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

مگر۔

قدرت نے جنگ کا فیصلہ بھی اس کے حق میں کر دیا تھا اور شیخ فتح محمد ہمیشہ کے لیے اس کے راعنہ سے ہٹ گیا تھا۔ اب فتح محمد کے بیوی بچے اس کے لیے بیگار ہو گئے تھے اور انہیں قید رکھنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

تاہم اس ظالم کو پھر یہ خیال آیا کہ شیخ اہل خانہ کو قید میں رکھنے پر اس کی کچھ رقم خرچ ہوئی تھی اس لیے پہلے ان سے یہ رقم حاصل کر لے، پھر ان کی رہائی کے بارے میں سوچے گا۔

مردم فتح محمد کی بیوی مجیدہ بیگم، مر کے ایک بڑے زمیندار کی بیٹی تھیں۔ انھوں نے میکے میں بھی اچھے دن دیکھے تھے۔ پھر جب ان کی شادی شیخ فتح محمد سے ہوئی تو بھی انھوں نے خوشیاں ہی دیکھیں۔

شیخ فتح محمد شادی کے وقت مرا کے منصب دار تھے۔ فتح محمد سے ان کے دو لڑکے تھے۔ بڑے کا نام شہباز اور چھوٹے کا نام حیدر علی تھا۔ دونوں بھائیوں میں پانچ سال کا فرق تھا۔ شہباز دس سال کا تھا اور حیدر علی صرف پانچ سال کا تھا۔ کہاں وہ سچی بھائی بھولی۔ نوکر چاکر۔ گھر علی قسم کے سامان سے بھرا ہوا۔ نہ فکر نہ ناقر۔ دونوں بھائیوں کے رہیسانہ ٹھاٹھے تھے مگر قسمت نے جو بیٹا کھایا تو رئیس سے فقیر ہو گئے۔ حاکم بالا پور نے حویلی ضبط کر کے مجیدہ بیگم شہباز اور حیدر علی کو

کرہ گیا۔

شیخ فتح محمد کا لشکر جو بڑی بہادری سے عباس قلی خاں کے لشکر کو دبا رہا تھا عباس قلی خاں کے پاس پہنچ چکا تھا اور عباس قلی خاں کے بیشتر دستے پہلے ہی میدان چھوڑ بھاگے تھے، ان دنوں نے اپنے فوجدار اور سپہ سالار شیخ فتح محمد کو گھوڑے سے گرتے دیکھا تو بے بساٹے اس کے کردہ اپنے فوجدار کو پچانے کے لیے آگے بڑھتے، انہوں نے اپنے گھوڑوں کا رخ موڑا اور میدان سے بھاگ نکلے۔

ان کی دیکھا دیکھی وہ فوج جو عبدالرسول خاں کے زیرِ کان بڑی بڑی بیڑی سے اپنی جگہ جم کر لڑ رہی تھی، اس میں بھی انتشار پیدا ہوا اور عبدالرسول خاں کے رد کرنے کے باوجود منتشر ہو کر بھاگ نکلے۔

اس طرح عبدالرسول خاں کی صوبیداری کا خاتمہ ہو گیا۔

نواب عبدالرحیم خاں، مرا کے نئے گورنر مقرر ہو گئے۔ راجہ صاحب میسور نے بھی نواب ظاہر کو صوبیدار مرا کا پردانہ بھیج دیا۔

جو نہ کہ حاکم بالا پور عباس قلی خاں نے نواب عبدالرحیم خاں کی کئی بددینوں کی تھی، اس لیے بالا پور کے متزلزل دس دیہات کی حکومت کا پردانہ اسے بھول گیا۔

مثل مشہور ہے کہ مرے پر سودے سے۔ شیخ فتح محمد نے میدان جنگ میں دشمن سے لڑتے ہوئے بان دی۔ وہ سوہ سرائی قربان ہو گئے۔ صوبیدار عبدالرسول سے باندھے ہوئے ہندوفا کو بھاگے۔ انہوں نے جان دے دی مگر بہادری اور وفاداری پر آپج نہ آنے دی۔ جنگ سے پہلے انہیں حاکم بالا پور عباس قلی خاں نے بڑے سبز باغ دکھائے۔ لالچ کا ہتھیار بھی استعمال کیا اور اہل خانہ کے کمزور بیٹوں پر بھی دار کیا لیکن وہ جان باز اور وفا کا پیکر یہ جانتے ہوئے بھی کہ بیوی بچے شدید خطرے میں ہیں، پھر بھی حق سے ناحق نہ ہوا اور آخرا س نے بہادری کی طرح جان دیدی۔

موت برحق ہے اور ذی روح کو اس کے وقت پر موت کا ذائقہ چکھنا ہے لیکن اگر بے وقت موت آئے تو بعض اوقات اس کے بڑے خطرناک اور بھیانک نتائج نکلتے ہیں۔

حاکم بالا پور عباس قلی خاں نے جب شیخ فتح محمد کے بیوی بچوں کو بے گھر کیا اور قید خانہ میں ڈال کے ان پر سخت پھر بٹھا دیا تو اس نیک بی بی نے اس وقت بھی خدا کا شکر ادا کیا کہ عزت اور

تیری سوہیلی کے سامان کا حساب منشی نے کیا ہے۔ وہ صرف ایک ہزار کا ہوتا ہے۔ باقی سترہ ہزار کہیں اور سے لاکھ پور سے گردنہ — اور عباس تو خاں نے ایک بھیا نک فقہ لگا کر جہد پورا کر دیا۔

مجیدہ بیگم دھک سے رہ گئی
اس زمانے میں بھی اس کی حویلی میں لاکھوں کا سامان تھا۔ دنیا کی ہر چیز موجود تھی گھریں۔ سبکوٹ اور رائس کے سامان میں ایک سے ایک نادر چیز تھی۔ بہت سی چیزیں سونے چاندی کی تھیں۔ پورے بیس مہر چاندی کا سڈکاراں تھا جس کے سونے کے فریم میں آئینہ بٹھا تھا۔ پالیس پیس، ہزار کے تو مجیدہ بیگم کے زیورات ہی تھے۔ کیا کچھ نہ تھا۔ ایک مہر سے کی انگوٹھی اس نے گرفتاری کے وقت چھپالی تھی۔ باقی تمام زیور جو حویلی میں تھا یا مجیدہ بیگم کے جسم پر تھا، اسے سپاہیوں نے اتر دیا۔ مگر جو بقیہ مہر کا ضبط کر لیا تھا۔
مجیدہ بیگم ہاتھ مل کے رہ گئی۔

حاکم بالا پور نے جب اٹھارہ ہزار کا الزام لگایا تھا تو اس کے ماتھے پر نمک نہ مٹی تھی۔ بن کا الزام لگانے کا اسے سدھ ضرور ہوا تھا لیکن اٹھارہ ہزار تو صرف اس کے مہر کے سامان سے وصول کیے جاسکتے تھے اس لیے اس نے کہہ دیا تھا کہ گھر کا سامان فروخت کر کے رقم پوری کر لی جائے لیکن — اس غلام نے تو اس کے پورے اثاثے کی قیمت ایک ہزار روپے لگوائی تھی باقی سترہ ہزار وہ کہاں سے لائے۔ کس سے مانگے۔

”کیا سوچ رہی ہے بڑھیا!“
حاکم بالا پور نے اسے چونکا دیا:
”رقم کا انتظام کرنا ہے یا میں تیرے دونوں بیٹوں کو بھی ان کے باپ کے پاس بھیج دوں؟“
”نہیں نہیں۔ ایسا نہ کیجیے۔“
مجیدہ بیگم چیخ پڑی:

”میں رقم کا انتظام کر دوں گی۔ آپ مجھے کچھ مہلت دیجیے۔“
”کہاں سے کرے گی انتظام؟“ حاکم بالا پور نے اپنے اطمینان کے لیے پوچھا۔
”مہر کا پٹم میں میرا بھتیجا ہے۔ آپ ہیں جانے دیجیے۔ میں پورے سترہ ہزار لاکھ کے ادا کر دوں گی۔“

قیدیوں ڈال دیا۔

حاکم بالا پور عباس قلی خاں کا بیگمہ مجیدہ بیگم اور دونوں بچوں کو قید میں ڈال کے بھی ٹھنڈا نہ ہوا اور ان پر مزید ستم توڑنے کے لیے اس نے ایک نیا مہر اس قتل کیا۔

اس نے بیٹوں قیدیوں کو قید خانہ سے بلوا بھیجا۔
مجیدہ بیگم کا کسی نے سایہ بھی نہ دیکھا تھا۔ حاکم بالا پور نے کہہ دیا کہ قیدیوں کو ننگے سراؤ لنگے پاؤں پیش کیا جائے۔

سپاہیوں نے اس نیک خاتون کے سر سے پادری بھی کھینچ لی۔ اس طرح اسے بے پردہ کیا گیا۔ بچوں نے سپاہیوں کو رد کرنے کی کوشش کی تو انہیں مار مار کر ادھموا کر دیا گیا۔

تیرے شوہر نے صوبہ مہرا کے خزانے سے اٹھارہ ہزار روپے بن کیے ہیں۔ یہ رقم پوری گردنہ تیرے لڑکوں کو قتل کر دیا جائے گا۔ عباس قلی خاں نے مجیدہ بیگم کو سر سے لٹکایا نہیں کیا بلکہ اس کے سرے ہوئے شوہر پر چوری کا الزام لگایا۔

مجیدہ بیگم بڑبڑا اٹھی۔
اس کے شوہر شیخ فتح محمد کی ایمانداری کی قسمیں کھاؤ باقی تھیں اور اب اس کے مردے پر بن کا الزام لگایا جا رہا تھا۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا اور رونا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ بے چاری اور کبھی کیا سکتی تھی۔

”رونے کی ضرورت نہیں۔“
عباس قلی خاں نے اسے ڈانٹا:

”اٹھارہ ہزار روپے کا انتظام کر دوں دونوں لڑکوں سے ہاتھ موڑ ڈال۔“

شوہر مارا جا چکا تھا۔ اب بچے بھی ہاتھ سے جالہ سے تھے۔ مجیدہ نے شرم و نفرت بالا نے خاق رکھی۔ باپ دادا کی عزت سے منہ موڑا اور حاکم بالا پور عباس قلی خاں کے سامنے ہاتھ جوڑ کے کھڑی ہو گئی۔

”آپ حاکم ہیں۔ جو کہہ رہے ہیں ضرور سچ ہوگا۔“
مجیدہ بیگم نے خوشامد کا سہارا ڈھونڈا:

”مجھے اجازت دیجیے کہ اپنی حویلی کا سامان بیچ کے مہر کا رکے اٹھارہ ہزار پورے کر دوں۔“

مجیدہ بیگم نے ڈرتے ڈرتے درخواست کی۔

”صرف تو جا سکتی ہے۔ تیرے بچے پیسے نہیں رکھیں گے۔ پندرہ دن میں واپس نہ آئی تو یہ زندہ نہ بچیں گے۔“ حاکم بالا پور نے فیصلہ کر دیا۔

مجیدہ بیگم نے یہ شرط بھی مان لی۔ مرنے کیلئے نہ تار زبردست مارے اور رونے بھی نہ دے دلا معاملہ تھا۔

ماں نے دونوں بچوں کو پیار کیا۔

کہتے ہیں کہ پوت کے پاؤں پالنے ہی میں معلوم ہو جاتے ہیں۔ شہباز اور حیدر علی نہ روئے نہ چیخے بلکہ انھوں نے نہایت خاموشی سے ماں کو رخصت کیا۔

مجیدہ بیگم اٹھ کے کھڑی ہو گئی۔

”مجھے جانے کی اجازت ہے؟“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں حاکم بالا پور سے پوچھا۔

”ابھی نہیں۔ شام کو جانا۔“

پھر اس نے سپاہیوں کو حکم دیا:

”انہیں لے جاؤ اور شام کو پھر پیش کرنا۔“

سپاہی مجیدہ بیگم اور اس کے دونوں بیٹوں کو قید خانہ واپس لے گئے۔

شام کو تینوں ناکرہ گناہ قیدی اس ظالم عباس قلی خاں کے سامنے پیش کیے گئے۔ عباس دربار لگائے بیٹھا تھا۔

دربار کے ایک طرف دو بڑے بڑے نقارے رکھے تھے۔ نقاروں پر کھال منڈھی ہوئی نہ

تھی بلکہ وہ کھلے ہوئے تھے۔ ایسے نقاروں پر اس وقت چوٹ پڑتی جب کسی بڑی تقریب کا آغاز

ہوتا تھا مگر عام طور پر اس طرح کے نقارے میدان جنگ میں لڑائی کے آغاز میں بجائے جاتے تھے۔

مجیدہ بیگم کے دربار میں پہنچتے ہی عباس قلی خاں نے حکم دیا:

”دونوں لڑکوں کو ان کی ماں سے جدا کر دیا جائے اور ماں کو دو سپاہی مضبوطی سے پکڑے رکھیں۔“

حکم کی تعمیل ہوئی۔

مجیدہ بیگم نے بچوں کو سمجھا دیا تھا کہ وہ جدائی کے وقت رونے دھونے کے بجائے صبر کا مظاہرہ

کریں۔ بیچ فوج محمد کے دونوں بیٹے بڑے حوصلے والے اور صابر تھے۔ وہ عباس قلی خاں کا حکم سننے

ہی ماں سے الگ ہو کر کھڑے ہو گئے۔ مجیدہ بیگم کی آنکھیں غمناک ہو گئی تھیں مگر وہ ضبط کیے ہوئے

کھڑی تھی۔

دو سپاہیوں نے دونوں لڑکوں کی کلاٹیاں مضبوطی سے پکڑ لیں اور دو سپاہیوں نے مجیدہ بیگم کے بازو مضبوطی سے تھام لیے۔

مجیدہ بیگم کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ جب بچوں یا اس نے کسی مزاحمت کا مظاہرہ نہیں کیا تو انہیں اس قدر مضبوطی سے کیوں پکڑا گیا ہے۔ اس بے چاری کو علم ہی نہ تھا کہ عیاد نے معصوم بچوں

کے لیے ایک ایسا قفس بنوایا ہے جو تاریخ میں کم از کم بچوں کے لیے کبھی استعمال نہیں کیا گیا تھا۔

دس سالہ شہباز اور پانچ سالہ حیدر علی جب عباس قلی خاں کے روبرو پہنچے تو اس نے گرجدار آواز میں حکم دیا:

”ان لڑکوں کو الگ الگ دونوں نقاروں میں بند کر کے ان پر کھال چڑھا دی جائے۔“

یہ حکم سن کر مجیدہ بیگم کی چٹخیں نکل گئیں۔

اس نے زور لگا کر خود کو پھڑانے کی کوشش کی مگر سپاہیوں کی اس کے بازوؤں پر گرفت اور مضبوط ہو گئی۔

شہباز اور حیدر علی کے لیے بھی یہ حکم بالکل غیر متوقع تھا اس لیے وہ بھی کسمائے سیکن

سپاہیوں نے انہیں جتلیا کر اگر انھوں نے ذرا بھی مزاحمت کی تو وہ انہیں لمبا شہرہ کر دیں گے۔

اسی لیے بچوں نے خود کو قسمت کے حوالے کر دیا۔

مجیدہ بیگم نے وہیں سے بڑے دلدز لہجے میں فریاد کی:

”اے ظالم! ان معصوم بچوں نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔ تو آ کر انہیں کیوں مارنا چاہتا ہے۔ میں

دعہ کرتی ہوں کہ پوری رقم تجھ تک پہنچاؤں گی۔ خدا کے لیے انہیں چھوڑ دے۔ مت مارا انہیں۔

اگر مارنا ہی ہے تو انہیں قتل کرادے۔ انہیں اذیت دے کر تو نہ مار۔ ان کا دم گھٹ جائے گا

نقاروں کے اندر۔“

عباس قلی خاں نے تمقہ لگاتے ہوئے کہا:

”بیک بک مت کر شیطان کی خالہ! آنکھیں کھول کے دیکھ۔ نقاروں میں سوا بے لے ہے

سوراج کرا دیے گئے ہیں۔ پندرہ دن تک یہ کہتے کے پتے نہیں مرسکتے۔ ان اگر تو نے رقم لا

میں دیر کر دی تو پھر یہ اڑیاں گر کر گر کر ضرور جاں لیں گے۔“

ان کو بند کر دیا گیا۔

یہ ایک ایسی قید تھی جس کے ذکر سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہم انگریزوں کے ظلم و ستم کو دہاتے ہیں: "بلیک ہول" کا شکوہ کرتے ہیں جس میں انگریزوں نے ۱۲۵-۱۲۶ء میں ایک چھوٹے سے کمرے میں ٹھونس کے بھر دیا تھا جس کے نتیجے میں وہ سب کے سب دم گھٹ کر مر گئے۔

ٹھیک ہے۔ انگریزوں کا یہ ظلم ایک سیاہ داغ بن کر تاریخ کا حصہ ہو گیا جسے انگریز قوم آج تک نہ مٹا سکی۔
مگر۔

وہ تو انگریز تھے۔ انہوں نے ہندوستانیوں پر یہ ظلم کیا تھا مگر اس ظالم عباس قلی خاں نے تو اپنی ہی ہم قوم ایک عورت اور اس کے بچوں کے ساتھ کیا کیا۔ اس کا اختلاف شیخ فخر محمد سے تھا، نہ کہ اس کے بیوی بچوں سے۔

ایسے ہی لوگوں نے مسلمانوں کو بدنام کیا اور انہی لوگوں کی غداروں سے برصغیر میں مسلمانوں کی عظیم حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

اُدھر سپاہی نقادوں کے کام سے فارغ ہوئے اُدھر مجیدہ بیگم کو ہوش آیا۔ چار سپاہی اسے گھیرے کھڑے تھے۔

ہوش میں آتے ہی اس کے منہ سے

"ماٹھے میرے نیچے"

نکلنا اور وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

ایک سپاہی جس کی داڑھی کے آدھے بال سفید ہو چکے تھے، وہ ایک قدم مجیدہ بیگم کی طرف بڑھ کے بولا:

"اومائی۔ تو میری دین کی بن بھی اور دنیا کی بھی۔ تو خاموشی سے میاں سے چلی جا۔ میاں سے کچھ دھور پر ایک محلہ ہے۔ اس کے مالک سے جا کے کہنا کہ تو وہی عورت ہے جس کے بچوں کو آج نقادوں میں منڈھوایا گیا ہے۔ وہ تیرے لیے کھوٹے وغیرہ کا انتظام کر دے گا۔ خدا کا نام لے کر مرنے والا چم جا اور جہاں سے روپیہ ملتا ہے وہاں سے روپیہ حاصل کر کے جس قدر جلد ہو سکے واپس آجا۔ میں اور میرے ساتھی وعدہ کرتے ہیں کہ تیرے بیٹوں کو نقادوں کے اندر

مجیدہ بیگم نے نقادوں میں جگہ جگہ مورخ دیکھے تو اسے اطمینان ہوا۔ اس نے بچوں سے آواز دے کر کہا:

"میرے بہادر بیٹو۔ نہ رونا اور نہ صبر کا دامن چھوڑنا ورنہ میں تمہیں دودھ نہ بخشوں گی۔ مجیدہ بیگم اس سے اگے کچھ نہ کہہ سکی اور اسے عش آگیا اور وہ سپاہیوں کے ہاتھوں میں جھول گئی۔

اسے ایک طرف ڈال دو۔

عباس قلی خاں نے کہا:

"ہم چاہتے تھے کہ تو اپنے لاڈلوں کے نقادوں میں منڈھے جانے کا دلچسپ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھنی مگر خیر۔"

عباس قلی خاں نہ جانے اک دم کیوں چپ ہو گیا۔ ذرا دیر چپ رہنے کے بعد اس نے حکم دیا:

"لوگوں کو نقادوں میں ڈال کر جلدی سے کھال منڈھ دو۔ یہ غلیظ کام۔ جلوسم ہونا چاہیے۔ شہباز اور حیدر علی نے انتہائی صبر اور تحمل کا مظاہرہ کیا۔ جب انہیں نقادوں پر چڑھا دیا گیا تو ننھے حیدر علی نے کہا:

"میں اندر مت بھینکو۔ ہم خود اس کے اندر کود جائیں گے۔"

اور۔

حیدر علی نے جلدی سے نقارے کے اندر چھلانگ لگا دی۔ شہباز بھی فوراً دوسرے نقارے میں کود پڑا۔

سپاہی اور تمام درباری بچوں کی جرات پر حیران رہ گئے۔ عباس قلی خاں کا چہرہ دھڑاں دھڑاں ہو گیا تھا۔

عباس قلی خاں نے اپنی خفت چھپانے کے لیے حکم دیا:

"عورت کو ہوش آجائے تو اسے باہر نکال دینا اور کہہ دینا کہ اگر وہ وقت پر نہ پہنچی تو اس کے بیٹے تڑپ کر مر جائیں گے۔"

جب ظلم حد سے بڑھ جائے تو مظلوم کے ہمدردانہی فیملوں میں سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ حاکم بالا پور۔ عباس قلی خاں دربار برخواست کر کے محل میں چلا گیا۔ نقادوں پر کھال منڈھ کر

مرنے نہیں دیں گے۔“

سپاہی کی باتیں سن کے جیسے مجذہ بیگم کے جسم میں جان آگئی۔ اس نے سپاہیوں کا شکریہ ادا کرنا چاہا مگر اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں پھٹک پڑیں۔

”دیر نہ کہ میری بہن!“

اسی سپاہی نے پھر کہا:

”ہم سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں تیرے دل کا حال معلوم ہے۔ تیرے لیے ایک ایک پل قیمتی ہے!“

مجذہ بیگم نے ایک نظر منڈھے ہوئے نقاروں کو دیکھا پھر متشکر نظروں سے سپاہیوں کو دیکھتی ہوئی باہر نکل گئی۔



ہندوستان کی قدیم تاریخ کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ اس لیے کہ ہندوستان میں عہد قدیم میں تاریخ نویسی کا کوئی رواج نہیں تھا۔ ٹیکسلا جیسی قدیم یونیورسٹی میں بھی تاریخ کا مضمون نہیں پڑھایا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب بھی ہندوستان کے کسی راجہ ہمارا ذکر مقصود ہوتا ہے تو ہمیں ہندو کی ہندو قوم کی دو مذہبی کتابوں سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔

ہندو قوم کی ان مذہبی کتابوں میں ایک کا نام رامائن اور دوسری کتاب مہابھارت کے نام سے مشہور ہے۔

رامائن میں ہندوؤں کے دیوتا رام جنہیں وہ لوگ بھگوان یعنی خدا کہتے ہیں، کا ذکر ہے وہ راجہ دھرم نو کے بیٹے تھے۔ ان کی سری لنکا (سبیلون) کے راجہ راون کے ساتھ جنگ کے واقعات رامائن میں بیان کیے گئے ہیں۔

دوسری کتاب مہابھارت بھی ہندوؤں کے خاندان کوروں اور پاندوؤں کی جنگ پر مشتمل ہے۔ ان دونوں کتابوں میں ہندوستان کے دوسرے حصوں (در شہروں وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ اور ان ناموں کو سندا مانا جاتا ہے۔

چنانچہ — مہابھارت اور رامائن میں اس سرزمین کا ذکر موجود ہے جہاں جنوبی ہند کی ریاست میسور واقع تھی۔ وہی میسور جہاں حیدر علی بہادر اور ان کے فرزندار جمند پٹھو سلطان شہید نے اپنے خون سے تاریخ ہند کے دو باب رقم کیے۔ جن کی سرحدی وقت کی گرد کے ساتھ دم ہونے کے بجائے تیز اور گہری ہوتی جا رہی ہے۔



خراج وصول کرنے کا فرمان حاصل کر لیا تھا۔

انہی تمام ریاستوں کا نام میسور ہوا تھا جہاں نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے یکے بعد دیگرے اپنی شمشیر خاراٹنگاٹ کے جوہر دکھائے تھے اور نواب حیدر علی، شیخ فتح محمد کاوسی پانچ سال کا بچہ حیدر علی، تھا جسے حاکم بالا پور نے نقارے میں بند کر کے اوپر سے کھال منڈھوا دی تھی۔

اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے جنوبی ہند فتح کیا تو بڑا علاقہ ہونے کی وجہ سے شہنشاہ جنوبی ہند کو دو صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک صوبہ مرا اور دوسرا صوبہ اراکاٹ۔

۱۱۰۰ء تک یہ دونوں صوبے ایک ہی صوبے دار کے ماتحت رہے اور ان کا گورنر اور صوبیدار سعادت اللہ خاں تھا مگر اسی سن میں مرا کا گورنر امین خاں مقرر ہوا۔ امین خاں، سعادت اللہ خاں کی مخالفت کے باوجود اپنی موت تک صوبیدار رہا مگر اس کے بعد دکن کے صوبیدار کی سفارش پر مرا پھر سعادت اللہ خاں کو مل گیا اور سعادت اللہ خاں کی طرف سے طاہر خاں وہاں کا صوبیدار مقرر ہوا۔

ریاست میسور اور اس کی متعلقہ ریاستوں کے پس منظر کا یہ بیان اس لیے ضروری تھا کہ قارئین کو آئندہ پیش آنے والے واقعات کو سمجھنے میں کوئی پریشانی نہ ہو۔ اب ہم پھر اپنی اصل کہانی یعنی شیخ فتح محمد کی، بیوہ حمیدہ بیگم اور اس کے دونوں قیدی بچوں کی طرف آتے ہیں!



بالاپور کے چند خاندانوں کو اس کی مدد سے حمیدہ بیگم کو مرزا کاٹم جانے کے لیے ایک تیز رفتار گھوڑا اور راستے کے لیے ایک معقول رقم اور ضروری سامان مہیا کر دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ حمیدہ بیگم کے ساتھ پانچ سوار بھی کیے گئے جن کا کام حمیدہ بیگم کو بحفاظت مرزا کاٹم پہنچانا تھا۔

حمیدہ بیگم، مرزا کاٹم اس لیے جا رہی تھی کہ وہاں اس کے مرحوم شوہر کے بڑے بھائی شیخ ابیاس کا بیٹا حیدر، راجہ میسور کی ملازمت میں تھا اور اس کے حالات بہت اچھے تھے۔

حیدر ایک باد اپنے چچا شیخ فتح محمد سے ملنے آیا تھا تو اس نے اپنے چچا پر بہت زور دیا تھا کہ وہ مرزا کاٹم آجائے جہاں وہ راجہ سے ملے کہ اسے اچھی ملازمت دلا دے گا مگر شیخ نے

میسور کا قدیم نام ہمیش مند لٹھا اور عید قدیم میں وہاں چند رگبت مور یہ اور اشوک اعظم کی حکومت تھی۔

اس زمانے میں سرکاری مذہب "بدھ" تھا چنانچہ بدھ مذہب کے مبلغین ہمیش مند لٹھا بھی پہنچے۔ تاریخی اعتبار سے یہ زمانہ اس قدر تاریک ہے کہ ۶۰۰ء تک یہ پتہ نہیں چلتا کہ ہمیش مند لٹھا میں کون کون حکمران ہوئے تھے۔ ۳۰۰۰ء کے بعد پتہ چلتا ہے کہ یہاں بالترتیب شواناس اعمادی گنگا، چلوک، ہوسے مالا کے خاندان حکمران ہوتے رہے۔

گیارہویں صدی عیسوی میں ریاست میسور میں چوریا ستیں شامل تھیں۔ چودھویں صدی عیسوی میں جنوبی ہندو جیاننگو کی زبردست ہندو ریاست قائم رہی جو ۳۰۰ سال تک شمالی ہند کے مسلمانوں کو جنوب میں جانے سے روکتی رہی۔

ریاست میسور اور اس پاس کی تمام ریاستیں و جیاننگو کی ہندو ریاست کو خراج ادا کرتی تھیں۔ آخر سترھویں صدی عیسوی میں و جیاننگو کی عظیم سلطنت پر بیجا پور کے سلطان نے قبضہ کر لیا اور و جیاننگو کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

سلاطین بیجا پور کی طرف سے اس علاقہ کا ایک گورنر ہوتا تھا جو مرا میں رہا کرتا تھا مرا بنگلور سے ستر میل شمال مغرب میں واقع ہے۔ سلاطین بیجا پور اور سلطنت مغلیہ کے صوبیداروں کا صدر مقام رہنے کی وجہ سے اس زمانے میں وہاں ۵۰ ہزار مکانات تھے۔ مغلوں کے آخری گورنر لا اور خاں کا محل مغلی طرز تعمیر کا بہترین نمونہ تھا۔

اب بھی اس جگہ ۵۲ مساجد کے آثار نظر آتے ہیں۔ بیجا پور کی مسجد کے علاوہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی مسجد اور عید گاہ اب بھی موجود ہیں۔ یہاں عالمگیر کی ایک بیٹی کا مزار بھی ہے۔ سولہ مساجد اور عید گاہ کے تمام مساجد، شہر اور دیگر عمارات ویران پڑی ہیں۔ جگہ جگہ کھنڈرات ٹوٹے ہوئے محلات اور مزارات بڑی خستہ حالت میں ایک وسیع رقبہ میں نظر آتے ہیں۔

۱۶۸۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی فوجیں بیجا پور کی ریاست کو ختم کر کے اس علاقہ پر قابض ہو گئیں۔ عالمگیر نے بیجا پور کے علاوہ اور بہت سا علاقہ بھی فتح کر لیا تھا۔ اس مقام علاقے کو ایک صوبہ بنا کر مرا کو اس کا صدر مقام بنا دیا گیا۔

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد مرہٹوں نے وہاں کے کمزور شہنشاہ سے اس علاقے کا

وہاں جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس وقت شیخ فتح محمد کے صرف ایک لڑکا شہباز تھا۔ حیدر علی ابھی پیدا نہ ہوا تھا۔

مجیدہ بیگم منزلیں قطع کرتی ہوئی اپنے محافظوں کے ساتھ مرنگا پٹم خیریت سے پہنچ گئی۔ حیدر صاحب گھر پر نہیں تھا۔ وہ راجہ کے دربار میں گیا ہوا تھا۔

مجیدہ بیگم نے یہ موقع غنیمت جانا اور بے جھجک راجہ کے محل میں پہنچ گئی۔ وہ یہ سوچ کے راجہ کے محل میں گئی تھی کہ وہ اپنی داستانِ الم اور بالا پور کے حاکم عباس قلی خاں کے غم و غم سے راجہ کو بھی آگاہ کرے گی۔ حالانکہ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ میسور کا اس وقت کا راجہ چامراجا ڈیر سوم صرف نام کا راجہ تھا اور سارے اختیارات وزیرِ سلطنت کے پاس تھے۔

مجیدہ بیگم نے راج محل پر پہنچ کر حیدر صاحب کو پہنچا۔ بھجوا کر قیمت کی ماری اس کی چچی مجیدہ بیگم بالا پور سے آئی ہے اور وہ حیدر صاحب سے فوراً ملنا چاہتی ہے۔

حیدر صاحب راجہ کے پاس بیٹھا تھا چنانچہ مجیدہ بیگم کی آمد کی اطلاع اسے بھی ہوئی اس نے حیدر کے جواب دینے سے پہلے ہی ملازم کو حکم دیا کہ مجیدہ بیگم کو عزت کے ساتھ اس کے پاس لایا جائے۔

چامراجا ڈیر اور حیدر صاحب دونوں کو سرا کی صوبیداری کے لیے نواب طاہر محمد خاں اور عبدالرسول خاں کے درمیان ہونے والی جنگ اور شیخ فتح محمد کے اس جنگ میں کام آجائے کی خبر مل چکی تھی۔ چنانچہ مجیدہ بیگم کے آنے پر پہلے راجہ نے اس سے تعزیت کی:

"بیگم فتح محمد۔ ہم تمہارے شوہر کی میدانِ جنگ میں بہادری سے لڑتے ہوئے مرنے کی اطلاع سن چکے ہیں۔ ہم چامراجا ڈیر سوم اور میسور کی تمام دنیا تمہارے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ تمہارے دونوں بچے کہاں ہیں۔ انہیں تمہارے پاس لاؤ۔ ہم انہیں فوج میں اچھا جھندہ دیں گے۔"

"میں راجہ میسور کی بہادری کی بہت شکر گزار ہوں۔"

مجیدہ بیگم نے شکریہ ادا کیا اور کہا:

"ان دانائے میرے شوہر کا غم بابت کہ میرے زخموں پر مرہم رکھا ہے لیکن اے میسور کے وحشِ راجہ! ابھی میرے آنسو خشک بھی نہیں ہوئے تھے کہ میری دنیا میں حاکم بالا پور عباس قلی خاں نے آگ لگا دی۔"

مجہ راند بیوہ کے دونوں بچے ہی زندگی کا سہارا تھے لیکن حکم بالا پور نے انہیں بھ سے

پھینک دیا ہے اور انہیں سسکا سسکا کر مار رہا ہے۔"

"شہباز اور حیدر علی کو کیا ہوا چاچی۔" حیدر صاحب سے برداشت نہ ہوا اور وہ بات کاٹ کر بولا۔

"اے میرے بھتیجے! ان دونوں کے ساتھ وہ کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مجیدہ بیگم پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

حیدر صاحب جلدی سے اٹھ کر چچی کے پاس گیا اور رقت بھری آواز میں بولا:

"چاچی جلدی بناؤ۔ اس ظالم نے میرے بھائیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟" مجیدہ بیگم سسکیوں کے درمیان بولی:

"حیدر۔ تیرے دونوں معصوم بھائیوں کو حاکم بالا پور نے الگ الگ دو نقاروں میں ڈال کر ان پر کھال منڈھادی ہے۔"

مجیدہ بیگم کی آنکھوں سے جھری لگ گئی۔

"ہے رام۔ ہے رام۔ اس نے ایسا کیا۔ کیسا کٹھور دل ہے عباس قلی۔ راجہ بہت متاثر ہوا: اس کے لیے کچھ کرنا ہی ہوگا۔"

"مگر چچی۔ اس نے کیوں ایسا کیا۔ ان معصوموں نے کیا لگاڑا تھا اس کا؟" حیدر صاحب کے غم اور غصے سے ہاتھ پاؤں کا پینے لگے۔

حیدر بیٹھے!

مجیدہ بیگم نے تفصیل بتائی:

جب نواب طاہر خاں اور صوبیدار عبدالرسول خاں میں سرا کی صوبیداری کے لیے جھگڑا ہوا تو اس وقت میں اور دونوں بچے بالا پور میں تھے۔ حاکم بالا پور نواب طاہر خاں کی طرف ذرا کر رہا تھا۔ اور تمہارے چچا تو تھے ہی عبدالرسول خاں کی طرف۔ مجھے خطر پیدا ہوا کہ کہیں بد ذات عباس قلی خاں مجھے کوئی نقصان نہ پہنچائے اس لیے میں بالا پور چھوڑنے ہی والی تھی کہ اس ظالم نے ہم سب کو پکڑ کے جیل میں ڈال دیا۔ میں صبرِ شکر کیے قید خانہ میں پڑی رہی۔

پھر دونوں میں جنگ ہوئی اور تمہارے چچا عبدالرسول خاں پر قربان ہو گئے مگر ہمیں آزاد کرنے کے بعد حاکم بالا پور نے تمہارے مرحوم چچا پر اٹھارہ ہزار کارکاری خزانہ نکالا اور مجھے بلکہ کہہ کہ یہ فرضہ فوراً ادا کر دو ورنہ شہباز اور حیدر علی کو قتل کر دیا جائے گا۔ مجیدہ بیگم کی آواز

بھراگئی اور گلزار بندھ گیا۔

”چاچی — میری چچی جان! حیدر صاحب نے بڑی محبت سے کہا: میں ابھی زندہ ہوں۔ اس کیلئے آپ کو تنگ کرنے کے لیے یہ اٹھارہ ہزار قرض کا جھگڑا لگایا ہے۔ آپ سیدھی میرے پاس چلی آئی ہوتیں۔ میں اٹھارہ ہزار لے جا کر اس کے منہ پر مارتا۔“

حیدر بیٹے۔ میں نے اس سے یہی تو کہا تھا کہ وہ ہمیں سرنگا پٹم جانے دے۔ میں رقم وہاں سے لا کر اس کے حوالے کر دوں گی۔“

مجیدہ بیگم بے چاری ٹھنڈی سانسیں لے رہی تھی: ”مگر اس نے حرف مجھے یہاں آنے کی اجازت دی اور شہباز اور حیدر علی کو نقاروں میں بند کر کے وہیں رکھا ہے۔“

”ان پر کیا کر رہی ہو گی؟“ حیدر صاحب نے کہا:

”ان کا تو نقاروں میں خندانہ کرے دم.....“

اور حیدر کے بھی آنسو بھر آئے۔

بیٹے۔ میں نے یہی کہا تھا اس سے۔ ”مجیدہ بیگم نے بتایا:

”مگر اس نے کہا کہ نقاروں میں ہوا کے لیے سوراخ کر دیے ہیں۔ بچے دم گھٹ کے نہیں مرس گئے مگر بھوک پیاس سے تو مر سکتے ہیں۔ اس نے مجھے صرف پندرہ دن کی مہلت دی ہے۔ اور کہا ہے کہ اگر اس دوران رقم نہ پہنچی تو خندانہ کرے دونوں۔“

مجیدہ بیگم کی پھر ہچکی بندھ گئی۔

”کتنی رقم ادا کرنی ہے اس ذیل آدمی کو؟“ راجہ نے حیدر صاحب سے دریافت کیا۔

”آپ نمک نہ کیجیے مہاراج۔ میں آج ہی اٹھارہ ہزار لے کر بالاپور جا رہا ہوں۔“ حیدر صاحب

نے بڑے مزاح سے کہا۔

”نہیں نہیں حیدر۔ تم وہاں جانے کی غلطی نہ کرنا۔ ورنہ وہ تمہیں بھی یرغمال بنالے گا اور پھر بھاری

رقم ہم سے طلب کرے گا۔ اسے معلوم ہے کہ تم میرے خاص آدمی ہو۔ راجہ اڈیر نے بڑے پتے

کی بات کہی۔

حاکم بالاپور سے کوئی بعید نہ تھا کہ وہ حیدر صاحب سے رقم وصول کر کے انہیں بھی قید میں

ڈال دیتا۔

”پھر کیسے بنے گا مہاراج؟“ حیدر صاحب نے الجھتے ہوئے کہا:

”رقم تو بہر حال اسے پہنچانا ہی ہے۔“

”ہم اپنے خزانچی کے ہاتھ رقم بھیجیں گے۔ راجہ نے مسئلہ حل کر دیا:

”تم یا تمہاری چچی بالاپور ہرگز نہیں جائیں گی۔“

پس راجہ چار اجہ اڈیر موم نے حیدر صاحب سے اٹھارہ ہزار کی رقم لے کر اپنے خزانچی کے حوالے

کی اور اسے حکم دیا کہ:

”پندرہ سواردوں کے ساتھ بالاپور جاؤ اور رقم عباس قلی خاں کے حوالے کر کے (روح) شیخ فتح محمد

کے دونوں بچوں کو لے کر جس قدر جلد ہو واپس آؤ۔“

اس وقت مجیدہ بیگم نے بتایا کہ:

”میرے ساتھ بالاپور سے پانچ سوارد حفاظت کے لیے آئے ہیں۔ انہیں واپس جانے کی اجازت

دی جائے۔“

چنانچہ خزانچی کے ساتھ وہ بھی واپس چلے گئے۔



راستہ خراب ہونے کے باوجود سرنگا پٹم کا خزانچی مطلوبہ رقم لے کر اٹھویں دن بالاپور پہنچ

گیا۔ راجہ کے خزانچی کو عباس قلی خاں پہچانتا تھا۔ اسے دیکھ کے وہ جل بھن گیا مگر زبان سے کچھ نہ

بولتا۔ اسے خطرہ پیدا ہوا کہ بات کہیں بڑھ نہ جائے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔

عباس قلی خاں، خزانچی سے گلے ملنے کے لیے مسکراتا ہوا اس کی طرف بڑھا مگر خزانچی کے

قدم فوراً ان نقاروں کی طرف اٹھنے لگے جو اس نے اپنے دشمن شیخ فتح محمد کی شکست کی یادگار کے

طور پر محل کے دروازے پر رکھوا دیے تھے۔

”خزانچی مہاراج۔ ان نقاروں کو ہاتھ نہ لگائیے گا۔“ حاکم بالاپور کا پارہ چڑھ گیا:

”اگر مہاراجہ میسور نے ان کے چھوڑنے کا حکم دیا ہے تو بھی میں انہیں رہا نہیں کر دوں گا۔“

خزانچی نے پلٹ کر جواب دیا:

”عباس قلی خاں۔ ہم نے سنا تھا کہ مسلمان میدان جنگ میں شیر ہو تا ہے لیکن گھر پر آنے والوں

”عباس قلی خاں“ خزاچی نے طیش کے عالم میں کہا:

”یاد رکھو راجے ہمارے چوٹوں پر احسان کرتے ہیں۔ ان کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔
عباس قلی خاں کے آدمیوں نے تھیلیاں سنبھال لی تھیں۔ خزاچی کے اشارے پر اس کے
آدمیوں نے نقاروں کے کنارے خیزد سے تراشتے شروع کر دیے تھے۔
ادپر کی کھال کٹی۔

تازہ ہوا کا جھونکا اندر گیا۔

خزاچی نے جو ادھ دھڑ سے نقارے پر جھکا ہوا تھا، اسے محسوس ہوا کہ جیسے سکرے ہوئے
ہاتھ پیردوں میں کچھ جنفش ہو رہی ہے۔

اتنی دیر میں دوسرا نقارہ بھی کھولا جا چکا تھا۔

پہلے نقارے میں شہباز اور دوسرے میں حیدر علی بند تھا۔ جب انہیں باہر نکالا گیا تو وہ گھڑی
کی طرح پلٹے ہوئے تھے۔ نقارے میں صرف بیٹھنے کی جگہ تھی۔ اتنی ہی جگہ میں وہ دونوں اپنے
اپنے ہاتھ اور پیر سمیٹے اٹھ دن سے بھوکے پیاسے پڑے تھے۔
انہیں کھڑا کرنے کی کوشش کی گئی مگر سمٹے سمٹے ان کے ہاتھ پیر جمبول سے ہو گئے۔ خزاچی
نے انہیں فرش پر لٹا کر پہلے ان کے حلق میں پانی کے قطرے پٹکائے جس سے ان میں کچھ جان
آئی۔

”بے پروا ماتا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ بچے زندہ ہیں ورنہ میں راجہ کو کیا جواب دیتا۔“
ہندو خزاچی آسمان کی طرف دیکھ کے بڑبڑایا۔

اب تو عباس قلی خاں نے بھی دلدار باں شروع کر دیں۔ اپنے ملازموں کو بچوں کے ہاتھ پیر
دبانے پر لگایا۔ پھر وید اور ایک حکیم کو بلا کر بچوں کو کھلایا۔ دونوں کے مشورے سے کھانے اور
الش کرنے کی دوا تیار ہوئی۔

دواؤں کے استعمال سے چار دن بعد شہباز اور حیدر علی چلنے پھرنے کے قابل ہوئے۔
ظالم عباس قلی خاں اپنے فعل پر بظاہر اس قدر نادم ہوا کہ اس نے ہاتھ جوڑ کر خزاچی سے معافی مانگی
اور خزاچی کے کہنے پر اس نے شہباز اور حیدر علی سے بھی معافی مانگی۔

اب تو اس کی یہ کیفیت ہو گئی کہ جب پانچویں دن خزاچی بچوں کو لے کر واپس جانے لگا تو وہ
اپنی غلطی پر رٹو سے بھاتا اور کہتا تھا کہ خدا کے لیے اپنی والدہ سے بھی مجھے معافی دلادینا تاکہ

سے تودہ جھک کے ملتا ہے۔“

عباس قلی خاں شرمندہ ہو کر بغلیں جھانکنے لگا:

”دیکھیے ہمارا راجہ ہم تو خوش خوشی آپ سے گلے ملنے بڑھ تھے مگر آپ ماپ کے ان بچوں
کی طرف بڑھ گئے جو ہمارے دشمن کی اولاد ہیں اور فتح حاصل کرنے کے بعد ہم مقتول کے اہل و عیال
کے مالک ہیں۔“

”ٹھیک ہے عباس قلی خاں“ خزاچی نے اپنے سواروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

”تم لوگ اٹھا ہزار کی رقم لے دو۔“

پھر وہ عباس قلی خاں سے مخاطب ہوا:

”ہمارے ہمارا راجہ نے آپ کو حکم دیا ہے اور نہ درخواست کی ہے بلکہ نہ مانگی رقم آپ کے حوالے
کرنے کا حکم دیا ہے۔“

عباس قلی خاں کے حواس اور عاٹ ہو گئے۔ اس کا خیال تھا کہ راجہ میسور نے اس سے بچوں
کی رہائی کی درخواست کی ہوگی مگر راجہ نے تو وہ پوری رقم اپنے پاس سے بھجوا دی تھی جو اس نے
رنے والے کی بیوہ کو تنگ کرنے کے لیے مانگی تھی۔

سواروں نے پندرہ تھیلیاں جو سونے کے سکوں سے بھری تھیں، عباس قلی خاں کے سامنے
پھینک دیں۔

”گن لو عباس قلی خاں۔ پورے اٹھا ہزار کی رقم ہے“ خزاچی نے انتہائی غصے سے کہا:

”نقاروں کو کھلوانا کہ معلوم ہو سکے کہ غلام بچوں کی کیا حالت ہے؟“

”فرصت کو دیکھو اگر بچے زندہ نہ بچے ہوں تو۔“ حاکم بالا پورے غصے اور غرور سے کہا۔
”تو پھر یہ ہو گا کہ ہم تم سے لڑتے لڑتے اسی جگہ ختم ہو جائیں گے۔“ خزاچی نے جرات آمیز
لے میں کہا:

”اور یہ بھی سن لو عباس قلی خاں کہ جب سرکاری خزاچی اور اس کے تمام محافظوں کے قتل ہونے
کی خبر مرزا پٹنم پہنچی تو تھیں میسور کی تمام ریاستوں کے مشترکہ لشکر سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔
اب بولو۔ کیا کہتے ہو؟“

عباس قلی خاں کے پیردوں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ کھسانی ہنسی ہنس کے بولا:

”نہیں نہیں۔ میرا مذاق کر رہا تھا۔ راجہ صاحب اگر رقم نہ بھی بھیجتے تو میں انہیں رکا دیتا۔“

میری عاقبت سنو جائے۔

چھوٹے یعنی حیدر علی نے شہباز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:
"بھائی تم بھی کمزور مسلمان نہیں۔ ماں جو کہہ رہی ہیں کہ یہ بھی ہمارے بھائی ہیں۔"
پھر دونوں کے ہاتھ سلام کے لیے اٹھے۔ حیدر صاحب نے انہیں اپنی طرف کھینچا:
"ہاں ہاں۔ میں تمہارا بھائی، دونوں کا بڑا بھائی ہوں۔"

"شہباز اور حیدر علی سنو!"

مجیدہ بیگم نے ان دونوں کو سمجھایا:

"ہم سب تمہارے ان بھائی، جن کا نام حیدر صاحب ہے، کے احسان مند ہیں۔ آج سے
حیدر صاحب میرے تیسرے بیٹے ہیں۔ خبردار کبھی ان کی مخالفت نہ کرنا۔ ہمیشہ کہنا ماننا اور جہاں
ان کا پسینہ گرے، خون بہانے پر آمادہ ہو جانا۔"
"بس کیجیے جی جان۔"

حیدر صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

"میرے تو اگے پیچھے ہے کوئی نہیں۔ آپ مل گئیں تو مجھے جیسے سارا جہاں مل گیا۔"



انگریزوں کے لیے تو ہر شخص اس بات پر متفق ہے کہ یہ قوم ہمیشہ سے مکار، چالبا، اور
مستعجب ہے۔ اس قوم کو مسلمانوں سے سب سے زیادہ نفرت ہے۔ خاص سلطنت عثمانیہ ترکی
اور سلطنت خداداد میسور سے تو یہ قوم اس قدر خار کھاتی ہے کہ تحریر اور تقریر میں جہاں بھی اسے
موقع ملتا ہے، یہ زہرا لگنے سے باز نہیں رہتی۔

سلطنت خداداد میسور کے بانی نواب حیدر علی اور سلطان پٹوشید کے بارے میں انگریز
مورخین اور مصنفین نے ایسی ایسی بے ہودہ باتیں لکھی ہیں جنہیں پڑھ کر اس قوم کی خباثت اور
گری ہوئی ذہنیت پر انفس ہوتا ہے۔

لارڈ ولشلیکٹا ہے کہ:

حیدر علی عربی النسل تھے؛

مگر بورنگ جو کہ حد درجہ بورا اور متعصب مورخ ہے وہ کہتا ہے کہ:

"مسلمانوں میں جب کوئی بڑے درجے پر پہنچ جاتا ہے تو اس کا نسب نامہ تیار ہو جاتا ہے۔"

جس وقت شہباز اور حیدر علی سڑک کا پٹم پہنچے اور ان کی ماں مجیدہ بیگم نے انہیں زندہ اور
سلامت دیکھا تو اس کی خوشی کا کیا ٹھکانہ تھا۔ دونوں لڑکوں کو ماں نے سینے سے لگا کر اتنا
بھینچا کہ وہ خود غش کھا گئی اور دونوں بچے اسے سنبھالنے میں لگے۔

حیدر صاحب ماں بیٹوں کے اس ملاپ کو دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے خوشی
کے آنسو جاری تھے۔ ان کی نظروں میں بچوں کے باپ اور اپنے چچا شیخ فتح محمد کا چہرہ گھم گم رہ گیا
اس لیے کہ حیدر صاحب کے والد شیخ الیاس اور شیخ فتح محمد کی صورتیں اس قدر ملتی تھیں کہ دونوں
بڑوں معلوم ہوتے تھے۔

حیدر صاحب اس پُرسمرت نظارے کو دیکھنے میں کچھ ایسے محو ہوئے کہ انہیں اس وقت
ہوش آیا جب ان کی چچی دونوں بچوں کے ہاتھوں میں بھول کر زمین پر آ رہیں۔
حیدر صاحب دوڑ کے وہاں پہنچے۔ پانی منگوا یا۔ مجیدہ بیگم کے منہ پر چھینٹ دیے اور راج محل
سے ٹھکڑا منگا کر چچی کو منگھایا۔

مجیدہ بیگم کو کوئی بیماری تو تھی نہیں، محض شدتِ بزدلتی سے وہ غش کھا گئی تھیں۔ سر پر
پانی کے چھینٹے اور ناک سے ٹھکڑی خوشبودار مٹی میں پہنچی تو اللہ اللہ کہہ کر اٹھ بیٹھیں۔ دائیں بائیں
دونوں بیٹے اور حیدر صاحب کھڑے تھے۔

مجیدہ بیگم نے زمین سے کھڑا ہونا چاہا تو بیٹوں نے سہارا دیا۔ ان کی آنکھیں پھر بھرائی
تھیں مگر یہ خوشی کے آنسو تھے۔

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں:

حیدر صاحب۔ یہ سب اللہ ہی کے کیل ہیں۔ اس نے تمہارا نام میرے ذہن میں ڈالا اور
میں سیدھی تمہارے پاس پہنچی۔ پھر سب ہی کام سیدھے ہو گئے۔

شہباز اور حیدر علی یہ تو سمجھ گئے کہ وہ ان کے کوئی عزیز نہ ہیں مگر اصل رشتہ نہ جانتے تھے۔
ماں نے انہیں تردد میں دیکھا تو کہا:

"تم کیسے بے تیز لڑکے ہو۔ بڑے بھائی کو سلام بھی نہیں کرتے!"

سلطنتِ خداداد کے سلسلہ کا ایک اور مورخ کرنل وکس، جس کا مقصد مرثیہ ہے کہ حیدر علی کے باپ اور ماں دونوں کو گناہ دکھایا جائے۔ تاریخ رئیس میں بھی اسی مورخ کا تتبع کیا گیا ہے۔ بہر حال کرنل وکس کا خیال ہے کہ:

حیدر علی کے آبا و اجداد پنجابی تھے۔

اور یہی خیال زیادہ درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ عربی النسل تھے تو ممکن ہے کہ وہ خفگی کے رستے عرب سے آئے ہوں اور پنجاب میں آباد ہو گئے ہوں۔ یوں انہیں پنجابی کہا گیا ہو۔

نواب حیدر علی کے بچپن کے بارے میں تھوڑا سا تذکرہ کیا گیا ہے۔ آئیے اب حیدر علی کے جوانی میں داخل ہونے سے پہلے ان کے نام و نسب اور خاندان پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ چنانچہ اس سلسلے کی تمام موجود کتابوں کے مطالعے سے نواب حیدر علی کے خاندانی حالات کا نقشہ اس طرح واضح ہوتا ہے:

۱۲۲۰ء کے لگ بھگ پنجاب سے ایک قافلہ دہلی پہنچا اور وہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد اس نے دکن یعنی جزیرہ ہند کا رخ کیا۔ دکن حضرت شاہ بندہ نواز گیسو دراز کی درگاہ مرجعِ خلافت ہوئی تھی اور پورا دکن ان کے فیضِ کرم سے مستفید ہو رہا تھا۔

عازمِ دکن ہونے والا یہ قافلہ عربی النسل یا افغان تھا۔ اس کا سربراہ ایک خدا ترس اور درویش صفت انسان ولی محمد خان تھا۔ دہلی کے قیام کے دوران ولی محمد خان مزاروں اور زیارتوں پر حاضری دینے میں وقت گزارتا تھا۔ اس نے وہیں بابا بندہ نواز کا نام اور ان کی کرامات کا حال سنا۔ پھر اس نام کا ایسا عاشق ہوا کہ دکن پہنچنے پر ان کی درگاہ پر جا کر دم دیا۔

حضرت شاہ بابا بندہ نواز گیسو دراز اپنے پیروں کے کہنے پر دہلی سے ہجرت کر کے گجرات تشریف لائے تھے اور یہاں ایک عرصہ تک عقیدت مندوں کو مرابطہ ستقیم اور وحدانیت کی تعلیم دینے کے بعد اپنے خالقِ حقیقی سے جملے مگر اس درگاہ سے ان کا فیض جب بھی جاری تھا اور اب بھی جاری ہے چنانچہ ولی محمد نے وہیں اقامت اختیار کی۔

انہیں شاہ گیسو دراز سے بے حد عقیدت تھی۔ ان کے علم و اخلاق اور درویشی کا یہ اثر ہوا کہ درگاہ کے متولی نے انہیں اپنا خاص مہمان بنایا۔ ان کے قیام و طعام کا انتظام کیا اور درگاہ کے خند سے مائتہ و لطف بھی مقرر کر دیا۔

پھر متولی درگاہ سے خلوص و پیار اتنا بڑھا کہ انہوں نے اپنی بیٹی دلی محمد خاں کے بیٹے محمد علی خاں کے عقد میں دیدی۔

گلبگاہ اس زمانے میں سلطنتِ بیجاپور کی حدود میں تھا اور اس کا حکمران محمود عادل شاہ تھا۔

اس کے بعد ڈاکٹر عطش درانی اپنی کتاب 'سلطان شہید' میں لکھتے ہیں کہ شیخ علی محمد کی عمر نے دفنانے کی ادب گلبگاہ میں آنے کے کچھ ہی عرصہ بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ باپ کی وفات نے شیخ کے بیٹے محمد علی خاں کا دل گلبگاہ سے اچاٹ کر دیا اور وہ بیجاپور منتقل ہوئے اور محلہ مشائخ پورہ میں رہائش اختیار کی مگر محمد علی خاں وہاں بھی زیادہ دن نہ رہ سکے کیونکہ بیجاپور پر ایسا زوال آیا کہ وہ کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا۔

محمد علی خاں نے پھر ہجرت کی اور کرناٹک کا رخ کیا۔ وہاں بلا گھاٹ کے قصبہ کولار میں سکونت پذیر ہوئے۔

کولار کا حاکم شاہ محمد دکنی تھا۔ اس نے محمد علی خاں کی بڑی آدبگت کی اور ملکی انتظام میں بھی انہیں شریک کر لیا۔

محمد علی خاں شیخ تھے۔ ان کے دل میں مشائخ کا لپکا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ اور ان کی اولاد باپ دادا کی اس عبادت اور ریاضت جس نے ان کے خاندان میں مشائخ کا چراغ روشن کیا تھا اسے زندہ اور تابندہ رکھیں۔ اس لیے ان کا دل کولار کے انتظامی معاملات میں نہ لگتا تھا۔ محمد علی خاں کے چار بیٹے تھے:

۱۔ محمد ایلیاس

۲۔ فتح محمد

۳۔ محمد امام

۴۔ دلی محمد

یہ چاروں کے چاروں باپ کے بالکل الٹ تھے۔ مجاہدانہ زندگی گزارنے اور درگاہوں پر مجاہدوں کے بجائے وہ میدانِ زندگی میں اپنے زور بازو سے روزی کمانے کو ترجیح دیتے تھے۔ پس ایک دن ان سب نے مل کے مشورہ کیا کہ باپ سے سب کے سب ایک ساتھ ملاقات کریں اور ان سے صاف صاف کہہ دیں کہ وہ اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنا چاہتے ہیں اور انہیں اس زلہ دان

نواب حیدر علی کی پیدائش کے بارے میں بڑے اختلاف پائے جاتے ہیں۔ انگریز مؤرخین کا بیان ہے:

"شیخ فتح محمد نے تین شادیاں کیں۔ ان کی پہلی بیوی کو لار میں انتقال کر گئی۔ دوسری بیوی جو اہل ناطہ کی لڑکی تھی، اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کی چھوٹی بہن سے شیخ فتح محمد نے شادی کی اور حیدر علی اسی کے بطن سے ہیں۔"

ایک دوسری روایت کے مطابق:

"شیخ فتح محمد نے تنجور کے ایک درویش کی صاحبزادی سے شادی کر لی تھی اور اس کے بطن سے ۱۷۱۹ء میں شہباز اور ۱۷۲۱ء میں حیدر علی پیدا ہوئے۔"

مگر زیادہ درست یہی معلوم ہوتا ہے کہ حیدر علی کی پیدائش میرا بکر علی خاں نواٹہ جاگیر دار میرا کی صاحبزادی مجیدہ بیگم سے بمقام بودی کوٹہ (منلیج کولار) بمطابق ۱۱۲۴ھ / ۱۷۱۱ء میں ہوئی تھی۔ شیخ فتح محمد اس وقت میرا کے صوبیدار عابد علی خاں کے منصب دار تھے اور انہیں ۲۰۰۰ پیادوں، ۵۰۰ سواروں کے علاوہ باہقی، علم اور نقارہ کا اعزاز حاصل تھا۔

خاندان حیدر علی کے محقر نفاذ کے بعد ہم پھر اپنی اصل کمائی کی طرف آتے ہیں۔ حیدر صاحب کو بچپن اور دو بھائی کیا ملے جیسے پوری دنیا لگتی۔ انھوں نے شہباز اور حیدر علی کو اسی زمانہ کی روایتی تربیت کے لیے فن سپہ گری کے دو استادوں کے سپرد کر دیا۔ اس وقت کا معاشرتی ماحول یہ تھا کہ علم کی تعلیم کے بجائے شمشیر زنی، کمند افگنی اور شمسواری وغیرہ کی علمی تربیت سے نوجوانوں کو سنوار کر میدان جنگ میں قسمت آزمائی کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ دکھاری مجیدہ بیگم جب شہباز اور حیدر علی کو میدان میں گھوڑے دوڑاتے دیکھتی تو اس کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھتیں۔

شہباز اور حیدر علی کی عمریں صرف دو سال کا فرق تھا (بعض کتابوں میں ۵ سال لکھے گئے ہیں) لیکن جب شہباز چودہ اور حیدر علی بارہ سال کے ہوئے تو دونوں عمر ہی معلوم ہوتے تھے۔ بلکہ حیدر علی کا قدر شہباز سے کچھ نکلتا ہوا ہی عکس ہوتا تھا۔ دونوں اگرچہ ہم عمر ہی اور نوجوان تھے لیکن دوسرے جوان انہیں دیکھنے کے دیکھتے رہ جاتے تھے۔

اور درویشانہ زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ انہیں سپاہیانہ زندگی زیادہ پسند ہے۔ جب چاروں بیٹوں نے باپ کے سامنے اپنا متفقہ فیصلہ اور عندیہ رکھا تو باپ نے وہی جواب دیا جو ایک صوفی منش اور قانع انسان کو دینا چاہیے تھا۔ انہوں نے کہا:

"میرے بیٹو! یہ دنیا فانی ہے۔ اس کی چمک دمک سے دل نہ لگاؤ بلکہ آخرت کے جاودانی خزانوں پر نظر رکھو۔ خدائے تمہارا مقدر تو روز ازل سے لکھ دیا ہے پھر ادرادھر کیوں بھاگتے ہو۔ جو کچھ قسمت میں لکھا ہے وہ بغیر دوڑ دھوپ کے تمہیں مل جائے گا۔"

لڑکوں نے دیکھا کہ باپ تو بس سے مس نہیں ہوتے تو وہ چپ چاپ اٹھ آئے۔ انہوں نے سوچا کہ باپ سے بحث کی تو گستاخی کا گناہ اپنے سر لینا ہو گا اور یہ بات ان کو گوارا نہ تھی۔ اس طرح یہ بات آگئی ہو گئی۔

مگر۔

شاید ان کی قسمت زوروں پر تھی۔ حاکم کولار شاہ محمد گنتی اور لڑکوں کے باپ محمد علی درویش کا آگے پیچھے انتقال ہو گیا۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھا تو کولار میں بھی خاک اڑنے لگی۔ تب چاروں بچھیلوں نے پر پھر پھیل لائے اور جس کا جدر خ ہوا اُدھر اڑ گیا۔ شیخ فتح محمد لاکاٹ پہنچے اور نواب سعادت خاں کے پاس ملازم ہوئے۔ بڑی عزت افزائی ہوئی پانچ ہزاری کے منصب پر فائز ہوئے۔

محمد الیاس نے تنجور کا رخ کیا مگر موت ان کے ساتھ ساتھ گئی۔ انھوں نے ۱۷۰۲ء میں انتقال کیا تو راجہ میسور نے ان کے بیٹے حیدر صاحب کو اپنے پاس بلایا اور ۴۰۰ پیادوں اور ایک سو سواروں کی جمعہاری پر فائز کر کے ٹائٹل کا خطاب دیا۔

مشہور ہے کہ شیخ محمد نے لاکاٹ میں حسن کارکردگی کا خوب مظاہرہ کیا اور علم، نقارہ اور باہقی کے حقدار ٹھہرے مگر انہیں یہ ملازمت راس نہ آئی۔ نواب سعادت علی خاں کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے اور بھتیجے میں جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے اور یہ بھی میسور چلے آئے۔

دہاں ٹائٹل حیدر صاحب پہلے سے موجود تھے۔ راجہ نے انہیں بھی ٹائٹل کا خطاب دے کر ملازم کر کے لیا مگر یہ دل برداشتہ ہو کر گھر بیٹھ رہے۔

میور کے راجہ اوڈیر کے دو وزیر تھے۔ ایک کانام دیوراج اور دوسرے کانندراج تھا۔ انہی دونوں کے ہاتھ میں رجاڑے کی بالی ڈور تھی۔

جب دونوں بھائی فنون سپہ گری میں عاقل اور مشاق ہو گئے تو حیدر صاحب کو کمر ہوئی کہ جوانی کے اس امڈتے ہوئے خون پر بندہ باندھا گیا تو کاروں سے چپک کر سیلاب کی صورت نہ اختیار کر لے اس لیے ایک دن بڑی رازداری سے چچی سے عرض کیا: "پیاری چچی جان! یقین کیجیے کہ میں نے اب تک شہناز اور حیدر علی جیسے مشاق سپاہی اور سوار نہیں دیکھے۔"

ماں نے بیٹوں کی تعریف سنی تو کھل اٹھی۔

بیٹے حیدر یہ سب تمہاری توجہ اور محنت کا پھل ہے۔

پھر اس نے حیدر کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا:

"دیکھو حیدر۔ جس طرح میں نے تمہارے سر پر ہاتھ رکھا ہے اسی طرح تم ان یتیموں کے سر پر ہاتھ رکھنا کہ یہ کچھ بن جائیں۔"

حیدر صاحب بولے:

"آج میں اسی لیے حاضر ہوا ہوں چچی جان۔ گو کہ ابھی ان کی عمر کم ہے مگر فنون سپہ گری میں یہ پورے مرد بن چکے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں انہیں راجہ یادوؤں و وزیروں کے ملاحظہ کے لیے پیش کر دوں۔ وزیر دیوراج اور نندراج ان دونوں کے بارے میں مجھ سے کئی بار پوچھ چکے ہیں۔"

مجیدہ بیگم نے فوراً جواب دیا:

"تو حیدر بیٹے۔ یہ کیا بات ہوئی۔ مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم نے پالا پوسا۔ جوان کیا، ماہرین کو ملازم رکھ کر تربیت دلائی۔ دونوں پر مجھ سے زیادہ تمہارا حق ہے۔" بیٹے یہ بات تو ہو گئی۔ حیدر صاحب نے کہا:

"راجہ صاحب بہاری سے اٹھے ہیں۔ ان کی صحت یابی کی خوشی میں جشن ہونے والا ہے۔ اس میں شہسوار اور شیرازی وغیرہ کے مقابلے ہوں گے۔ میں اسی وقت انہیں پیش کر دوں گا تاکہ ان کی جھلک بھی جاتی رہے اور یہ جی توڑ کے مقابلے کریں۔"

حیدر صاحب کو واقعی دونوں بھائیوں سے بڑی محبت تھی اور وہ دل سے چاہتے تھے کہ دونوں

لڑکے میدان میں آکر اپنے اپنے جوہر دکھائیں۔ چنانچہ جب جشن کی تاریخ مقرر ہوئی تو حیدر صاحب نے دونوں وزیروں کے کان میں بات ڈالی۔

"بڑے منتری جی!"

حیدر صاحب دیوراج سے مخاطب ہوا:

"کچھ عرصہ پہلے بالاپور سے میری چچی آئی تھیں۔"

"وہ چچی تو نہیں جن کے دولڑکے تھے؟" یہ لقمہ دیوراج کے چلوٹے بھائی نندراج نے دیا۔ "جی ہاں وہی لڑکے!"

حیدر صاحب کو بات کرنے کی جیسے اجازت مل گئی:

"انہی دونوں کے لیے میں کہنا چاہتا تھا۔"

"انہیں نوکری پر لگانا ہے کیا؟" دیوراج نے بات اچکلی۔

"نہا منتری جی۔ آدمی دھیلے کی ہنڈیا لیتا ہے تو ٹھوک بجا کے دیکھتا ہے۔ حیدر صاحب نے بات بڑھائی:

"کھاتے تو اس وقت بھی وہ آپ ہی کا ہیں مگر نوکری کے معاملے میں میں سفارش نہیں کرتا۔ آپ ان کا حق دیکھیے۔ آزمائیے۔ پھر آپ کی مرضی، میسوری فوج میں ہر ایرے میرے کو تو جگہ نہیں مل سکتی۔"

یہ تو تم نے ٹھیک کہا حیدر۔ نندراج نے تائید کی:

"فوج میں خال تو لوگ تو نہ ہونے چاہئیں۔"

"بالکل ٹھیک جی۔"

حیدر صاحب کا سینہ چوڑا ہو گیا:

"خدا آپ دونوں بھائیوں کو سلامت رکھے۔ آپ دیکھیں گے انہیں تو خوش ہو جائیں گے۔ دونوں پھلاوہ ہیں پھلاوہ۔"

"اچھا۔ اتنا تیار کیا ہے انہیں؟" دیوراج نے دلچسپی سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ پر آزمائش شرط ہے۔ حیدر نے جواب دیا۔

"پھر دکھانا انہیں۔ نندراج کا بھی اشتیاق بڑھا۔

"نندراج چک کر جشن راج کے عرس صحت کے جشن کے موقع پر پیش کر دوں گا۔ حیدر صاحب نے

شروع ہو رہا ہے۔

حیدر صاحب نے چبا چبا کر کہنا شروع کیا:
"اس جشن میں مقابلے ہوں گے۔"

"کس چیز کے مقابلے ہوں گے حیدر بھائی؟" حیدر علی نے بے چینی سے پوچھا۔
"گھڑ سواری کے۔ شمشیر زنی اور کمند انگنی کے مقابلے اور۔"

"میں حصہ لوں گا حیدر بھائی؟" حیدر علی خوشی سے چیخ اٹھا۔
"میں بھی حصہ لوں گا حیدر بھائی؟" یہ شہباز کی مسرت سے بھری آواز تھی۔
"افوہ۔ تم دونوں نے تو اودھم مچا دیا۔" مجیدہ بیگم نے انہیں ڈانٹا:
"کسی کی بات نہیں کاٹا کرتے۔ حیدر میاں کو بات تو پوری کرنے دو۔"

"میری چاچی۔۔۔ چچی جان۔ میں نے تو بات پوری کر لی تھی۔" حیدر صاحب ہنس کے بولے:
"جو کمنا تھا وہ کہہ دیا۔ جو سنا تھا وہ سُن لیا۔ اب آپ ان دونوں کو بھجائیے کہ یہ مقابلے دراصل
ان کا امتحان ہیں زندگی کا پہلا اور آخری امتحان۔ اس میں کامیاب ہوئے تو لوگ ہاتھ چومیں گے
سر پر بٹھائیں گے۔ عزت اور عہدہ پائیں گے۔ خدا نہ کرے ناکام ہوئے تو سپاہیوں میں
بھرتی ہو کر بھر سامان اٹھاتے گرد سے گی۔"

ڈال مارا ج ہوں گے۔ دونوں منتری ہوں گے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہاں عوام ہوں گے
اور عوام کی کسوٹی کھری اور سچی ہوتی ہے۔ انہیں ثابت کرنا ہو گا کہ ان جیسا پورے میسور میں نہ
کوئی شمشیر زن ہے نہ شہسوار۔ بس مجھے ہی کہنا تھا۔
حیدر صاحب اٹھے اور لب جھپ کرتے باہر نکل گئے۔ یہ لوگ حیران نظروں سے انہیں
دیکھتے ہی رہ گئے۔

جشن کو ن ما دور تھا۔

تیسرے دن سے جشن شروع ہو گیا۔ آغا تو دراصل اسی شام کو ہو گیا تھا جس دن حیدر صاحب
نے چچی کے پاس جا کر شہباز اور حیدر علی کو مقابلہ کی اطلاع دی تھی۔ دراصل غسلِ صحت کے جشن
کا شوشہ حیدر صاحب ہی نے چھوڑا تھا۔ انہوں نے دونوں وزیر بھائیوں کے دل میں یہ بات ڈال

سینہ پھلا کر کہا:

"منتری جی۔ پہلوان تو اکھاڑے ہی میں اچھا لگتا ہے۔ وہ ہیں جو ہر کھلتے ہیں ان کے۔
شہسواری اور شمشیر زنی دونوں مقابلوں میں حصہ لیں گے وہ۔"

حیدر صاحب وہاں سے اٹھ کے سیدھے چچی کے پاس پہنچے۔ شہباز اور حیدر علی شہسواری
کی مشق کر کے اس وقت آئے ماں کے برابر بیٹھے تھے۔ حیدر صاحب خوشی سے پھولے نہ
سما رہے تھے۔

چچی نے دیکھتے ہی پوچھا:

"کیوں حیدر میاں۔ بہت خوش نظر آ رہے ہو۔ کوئی خوشخبری لائے ہو کیا؟"

"بالکل چچی جان! حیدر صاحب بیٹھے ہوئے بولے۔

"حیدر بھائی۔ پہلے ہمارے مسلمانوں کا جواب تو دیجئے۔ شہباز نے مسکرا کے کہا۔

"جیتے رہو۔ جیتے رہو۔ دراصل میں اپنے خیالوں میں گم تھا۔ کچھ سن ہی نہیں سکا۔" حیدر صاحب

نے نکتہ سے شہباز کے سر پر ہاتھ پھیرا:

"تم دونوں میرے جان بوجھ کر نہیں اپنے بیٹے سمجھنا ہوں۔ بس یہ آرزو ہے کہ تم میری زندگی
میں کسی مقام پر پہنچ جاؤ۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو حیدر۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے! چچی نے بڑے غصے سے کہا۔
"اچھا تم دونوں جاؤ۔ حیدر میاں شاید کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔" مجیدہ بیگم نے بچوں کو
اس لیے ہٹانے کی کوشش کی کہ شاید حیدر صاحب کوئی ایسی بات کہنا چاہتا ہو جو بچوں کے
سننے کی نہ ہو۔

حیدر صاحب جلدی سے بولے:

"نہیں چچی جان۔ انہیں آپ کیوں بھگاد رہی ہیں۔ بات تو انہی کے بارے میں کرنا ہے۔"

شہباز اور حیدر علی اوجو جانے کے لیے کھڑے ہو چکے تھے، واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

"اچھا حیدر میاں۔ سناؤ اودھ خوشخبری جس کی وجہ سے تمہارا چہرہ پھول کی طرح کھل جا رہا

ہے۔" مجیدہ بیگم کو خود بھی بات سننے کی جلدی ہو رہی تھی:

"م سب سننے کے لیے تیار ہیں۔"

"ہاں چچی جان۔ خوشخبری یہ ہے کہ منگلوار کو ہمارا جہک کرشن راج اوڈیر کا جشنِ صحت

تھی کہ آج کل راج محلوں میں رانیوں نے دزیروں کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا ہے۔ کہہ سکتی ہیں کہ راجہ میسور کو تو دزیروں نے سونے کے عجلات میں قید کر رکھا ہے اور راجہ کے ناک پر وزیر ہی حکومت کرتے ہیں۔ یہ راجہ اور رانیوں کی کھلی ہوئی قومیں ہے اس لیے ان دونوں وزیر بھائیوں کو ٹھیک کرنا ہوگا۔

یہ خبر سن کر وزیر برادران یعنی دیوراج اور نندراج کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے حیدر صاحب نے جو کچھ کہا تھا اس میں مبالغہ ضرور تھا لیکن کچھ حقیقت بھی تھی۔

میسور کے اوڈیرہ خاندان کے شجرہ نسب پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ خاندان ۱۲۹۹ء سے آج تک حکمران ہے۔ موجودہ راجہ کرشن اوڈیرہ اس خاندان کا اٹھارہواں راجہ تھا۔ راجہ کے بجائے دزیروں کی حکومت اس ریاست کا دستور تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے مصر کی فاطمی خلافت کے آخری دور میں فاطمی خلیفہ ہوتے تھے۔ وہ بھی نام کے خلیفہ ہوتے تھے اور حکومت کے تمام اختیارات وزیراعظم کے پاس ہوتے تھے۔

حیدر صاحب نے جب نامنتری دیوراج اور منتری نندراج کو اچھی طرح گھبرا دیا تو نوذہبی تجویز پیش کرتے ہوئے کہا:

”منتري جي - آپ رانیوں کو کسی نہ کسی کام میں لگائے رکھا کیجیے۔ انہیں اپنے مسئلوں سے اپنی فرمت ہی نہیں ملنا چاہیے کہ وہ سلطنت اور حکومت کے بارے میں کچھ سوچ سکیں۔“

”پھر تمہاری کیا رائے ہے حیدر؟“ دیوراج نے گھبرا کر پوچھا۔

”آپ لوگ عقلمند ہیں۔ کوئی ترکیب سوچیے۔“

حیدر صاحب نے تجاہل مار فائدہ سے کام لیا:

”میں نے جو خبریں اور افواہیں سنی تھیں وہ آپ کے گوش گزار کر دیں۔“

پھر ایک ٹم رکے اور چونک کر اس طرح بولے جیسے اچانک انہیں کوئی بات یاد آگئی ہو:

”اے ہاں منتري جي۔ مجھے ایک بات یاد آئی ہے۔ مناسب سمجھیے تو اس پر آسانی عمل

کیا جاسکتا ہے۔“

”ہاں ہاں۔ جلدی بناؤ۔ کس بات پر عمل کیا جاسکتا ہے؟“

نندراج بے چین ہو گیا۔

”پچھلے مہینے ہمارے ہماراج کی طبیعت کچھ خراب ہوئی تھی۔ سرکاری دید اور حکیم دوڑتے

بھاگتے پھر رہے تھے۔ پھر ہماراج ٹھیک بھی ہو گئے تھے۔“

”ہاں ہاں۔“ نندراج نے اچھے ہوئے کہا:

”مگر اس بیماری کا ہمارے کام سے کیا تعلق؟“

”منتري جي۔ میسور کے راجہ بیمار ہوئے۔ پھر خدا نے انہیں اچھا کر دیا۔ کیا ہماراج کے اچھا ہونے پر غل صحت نہیں ہوگا۔ جشن نہیں منایا جائے گا اس خوشی کا؟“

”اے اے اے۔ کیا تہہ سیر بتائی ہے تم نے حیدر صاحب کی تم نے تو کمال کر دیا اس وقت۔“ نندراج خوشی سے پھول گیا:

”اچھا تو یہ جشن کب سے شروع کیا جائے؟“

”نیک کام میں دیر کس بات کی؟“

حیدر صاحب نے کہا:

”کل پرسوں دو دن انتظام کے لیے اور تیسرے دن سے شروع ہمارا جشن صحت یابی ہمارا ہے۔“

”اچھا تو یہ سارا انتظام تم ہی کو کرنا ہوگا۔“

نندراج نے ساری ذمے داری حیدر صاحب پر ڈال دی۔

”واہ منتري جي۔ میں نے ترکیب بتائی اور انتظام بھی میں ہی کروں۔“ حیدر صاحب بولے:

”یہ تو وہی مثل ہوئی کہ جو راستہ بنائے وہی آگے چلے۔“

”ہاں ہاں۔ تم ہی کو سب کچھ کرنا ہوگا۔ آج ہی سے کام شروع کر دو۔ میں ہمارا راجہ کو کل یہ بات

بتاؤں گا۔“

نندراج، حیدر صاحب پر ذمے داری ڈال کر بہت خوش ہو رہا تھا۔

حیدر صاحب تھا بھی ہر فن مولا۔ سرکار دربار کے سب ہی اہم کام ان کے سپرد کیے جاتے

تھے اور یہ ایسا ماہر تھا کہ ادھر کام کے لیے کسی نے زبان کھولی اور حیدر صاحب اسی وقت سے اس کے پیچھے لگ گیا۔

دو منتري بھائیوں کے علاوہ ہمارا راجہ کے احکامات اور رانیوں کی خلائشیں سب ہی کچھ حیدر

کو کرنا پڑتا تھا۔

اس گفتگو کے دو گھنٹے بعد پورے سرنگاپٹم میں ڈیڑھ گھنٹہ کی منگلاکار کو ہمارا جہ صحت کا

اشٹان کریں گے اور اسی دن سے جشن شروع ہوگا۔ کھیل تماشے، ناچ گانے، زرد آرائی کے مقابلے،

میر اندازی، شمشواری وغیرہ وغیرہ۔ ڈگی والے شہر سے نکل کر دیہاتوں میں پھیل گئے۔ پھر تو یکاثر اور کیا دیہات، ہر جگہ جشن کا چرچا تھا۔

یہاں پر ایک بات اور بیان کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ میسور کی عظیم ریاست اس وقت بمٹ سٹا کر صرف بتیس تینتیس گاؤں تک رہ گئی تھی۔ باقی تمام مالیکار باغی ہو گئے تھے اور انھوں نے راجہ کو خراج دینا بند کر دیا تھا۔

مالیکار دراصل جاگیردار ہوتے تھے۔ ان کی جاگیریں ۲۰ میں سے سو سو میں تک پھیلی ہوتی تھیں۔

جاگیرداری کا یہ سلسلہ بہت پرانا تھا۔ یہ جاگیردار حملہ آوروں سے بچنے کے لیے اپنے میں سے ایک کو سردار چن لیتے تھے جو راجہ کہلاتا تھا۔ میسور کے موجودہ خاندان کو ۱۲۹۹ء میں راجہ چنا گیا تھا اور اس خاندان کا پہلا سردار یا راجہ دیدور یا وجیاوڈیر تھا۔ اس کے نام پر یہ اوڈیر و خاندان مشہور تھا۔

اٹنے اٹنے ڈگی کی خبر راج محل کی داسیوں تک پہنچی۔

پھر کیا تھا۔ وہ اسے لے آئیں۔ رانی، راج ماتا، ہمارا ج سب کو ننگ مرچ لگا کے خبر سنائی گئی وہ سب پریشان کہ ہمارا جہ کے جشنِ صحت کا اعلان ٹکوں، ٹنگیوں، شہر اور دیہات میں ہو رہا ہے مگر اس کی اطلاع نہ ہمارا جہ کو ہے اور نہ ہمارانی کو۔

ہمارا جہ نے توسنی آن سنی کر دی اس لیے کہ انہیں رقص و موسیقی کا شوق تھا۔ اس سے فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ کسی اور طرف توجہ دیں۔ ہاں ہمارانی کی جاسوس عورتیں اور مرد پورے مرزا گاہم میں پھیلے تھے جو اسے گھڑی گھڑی کی خبریں پہنچاتے تھے۔

ہمارانی جو راج رانی کہلاتی تھی، اس نے اپنی خاص داسی (کنیز) کو حکم دیا:

”حیدر صاحب کو فوراً حاضر کیا جائے۔“

حیدر صاحب تو ہر مرض کی دوا تھا اس لیے اسے بلوایا گیا۔ راج رانی ایک عزم سے حیدر صاحب کو وزیرِ برادران سے توڑ کے اپنے ٹوٹے میں شامل کرنا چاہتی تھی مگر حیدر صاحب بہت کامیاب تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دیوراج اور نندراج کا اثر رعایا اور فوج دونوں طاقتوں پر ہے اس لیے وہ رانی کے ہتھکنڈے چڑھتا تھا اور راج رانی کی سبجیدہ باتوں کو ہوں ہاں میں ہاں ملاتا تھا۔

حیدر صاحب راج رانی کے حضور پیش ہوا تو اس نے ڈانٹ پلائی:

”یہ کیا مذاق ہے۔ شہر میں کیسی ڈگی بیٹی جا رہی ہے؟“

”ہمارا ج کا غیلِ صمت ہونا ہے راج رانی۔ اس کا جشن ہو گا۔“ حیدر صاحب نے بے حد معصومیت سے کہا۔

”مگر یہ کیوں اور کس کے حکم سے ہو رہا ہے۔ ہمیں اس کی خبر کیوں نہیں دی گئی؟“ راج رانی نے دوسرا سوال کیا۔

”ہما منتری دیوراج اور نندراج کا حکم ہے راج رانی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ یہ سرکاری جشن نہیں ہے بلکہ اس کا تمام خرچ وہ خود برداشت کریں گے۔“ حیدر صاحب نے بڑی سیاسی بات کی۔

خرچ کا نام سن کے راج رانی کا سارا غصہ دفن چکر ہو گیا۔

”یہ تو ٹھیک ہے مگر کم از کم ہمیں بتایا تو ہوتا۔“ راج رانی نے نرم لہجے میں کہا۔

”وہ دونوں آج آپ کے پاس آنے والے تھیں۔ میں اور کہہ دوں گا ان سے۔“ حیدر صاحب نے اپنی جان چھڑائی۔

”نہیں نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔“ راج رانی گھبرا گئی۔

راج رانی ہی کیا، راج محل کے تمام مرد اور عورتیں دیوراج اور نندراج کے نام سے کاہنتے تھے۔ ہمارا جہ میسور کو ایک مقررہ وظیفہ دیا جاتا تھا۔ جب وہ رقم خرچ ہو جاتی تو ہمارا جہ اور راج رانی انہی دونوں بھائیوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے تھے۔



کے پاس لے جاتی تھی اور وہی ان کی داد فریاد سننے اور مسائل کو حل کرنے کے ذمے دار تھے۔
قتل کیے جانے والا چارمراجہ ہفتم بھی انہی حالات میں راجہ ہوا تھا اس لیے کہ وہ بھی اس سے
پہلے کے راجہ دودھ کرشن راجہ اوڈیرہ کالے پاک تھا اور دودھ کرشن راجہ اوڈیرہ کو صرف
راج سنگھاسن پر بیٹھے تین سال ہوئے تھے کہ اسے بھی قتل کر دیا گیا اور مشہور یہ کیا گیا کہ اس
نے خود کشتی کر لی تھی۔

مختصر یہ کہ موجودہ راجہ کرشن راجہ اوڈیرہ تین سال کی عمر سے راجہ تھا۔ جب وہ سن شعور
کو پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ نندراج اور دیوراج کی کوششوں سے راجہ ہوا یہ معلوم ہوتے ہی
اس نے وزیر برادران کے سامنے مر جھکا دیا اور ان سے سہارا لیا کہ اگرچہ وہ راجہ
ہے اور رہے گا لیکن اسے ملکی انتظام و انصرام سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔

وزیر برادران کے پاس اقتدار تو پہلے ہی تھا پھر بھی نندراج نے اس خیال سے کہ چرٹیا
سونے کے پتھر سے کہیں پھر نہ کر جائے، کرشن راجہ اوڈیرہ کے ہوش مدبھالنے ہی اس
کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔ گویا پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر گڑھاٹی میں۔

ریاست میسور کافی مالدار ریاست تھی۔ خزانہ مال و دولت سے بھرا پڑا تھا۔ ریاست میسور کا
کسی سے جھگڑا نہ تھا بلکہ اس پاس کی تمام ریاستوں سے دوستی تھی۔ ماں اگر کوئی پالیگار
(جاگیردار) بغاوت کرتا تو میسور کی فوج کو حرکت کرنا پڑتی درہ فوج برسوں آرام کیا کرتی۔ ماں
میلوں ٹھیلوں اور شاہی تقریبات کے وقت فوج کے سپرد انتظامات کر دیے جاتے تھے۔

آج کے جشن میں بھی فوجی ادھر ادھر بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ نو عمر راجہ کرشن اوڈیرہ کو
مورچ ٹی پہلی کرن کے ساتھ اشتنان (دغل) دیا گیا۔

نندراج اور دیوراج نے اس تقریب پر دل کھول کر وہ پیہ خرچ کیا تھا۔ راج محل کی کینزوں کے
علاوہ پوری ریاست کے پنڈتوں، دیوداسیوں اور بھاریوں کو اشتنان کے لیے بلایا گیا تھا۔
نندراج نے راجہ، راجہ ماتا اور رانیوں کی خوشنودی کے لیے اشتنان کے وقت دھن دھن سیتی
کا انتقام کیا تھا۔

راجہ بھولانہ سمارا تھا۔
راج محل کے اندر اشتنان کا جشن دو گھنٹے تک بر پارہا۔ کینزوں کے علاوہ پنڈتوں اور
بھاریوں وغیرہ کو اس قدر انعامات سے نوازا گیا کہ ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

آج منگلوار (سہ شنبہ) ہے۔
ریاست میسور کے دارالسلطنت مرنگا پٹم کو دہلی کی طرح سبھا لگیا ہے۔ صبح ہی سے گلی
کو چوں میں بھیڑ بھاڑ شروع ہو گئی ہے۔ وزیر بھائیوں کا حکم ہے کہ دکاندار اپنی دکانیں کھول کر
بیٹھیں تاکہ جشن میں شرکت کے لیے باہر سے آنے والوں کو کوئی پریشانی نہ ہو۔ یوں پوری ریاست
میں عام تعطیل ہے اور ایک ہفتہ تک کسی کو کاروبار کرنے کی اجازت نہیں۔
بڑے بازار ہیں تو جگہ جگہ مجمعے لگے ہیں۔ کھیل تماشے والوں نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ
کرنے کے لیے مجمعے لگائے ہیں۔ ناچ گانا کرنے والیوں کی منڈیاں چھوٹے چھوٹے تھیانزوں کے
نیچے دریاں بچھائے ناچ گاہی ہیں اور آنے جانے والوں کو اشاروں ہی اشاروں میں دھکا
دہی ہیں۔

میسور کا موجودہ راجہ کرشن راجہ اوڈیرہ ۱۷۲۲ء میں جب اس کی عمر تین سال تھی، راج
سنگھاسن پر بٹھایا گیا تھا۔ یہ میسور کے راجہ چام راجہ ہفتم کالے پاک تھا۔ چام راجہ کو میسور
کے دونوں وزیر برادران دیوراج اور نندراج نے قتل کر دیا تھا اس لیے کہ چام راجہ نے وزیر
برادران کے اختیارات میں دخل دینا شروع کر دیا تھا۔

میسور میں راجہ کے قتل کو کوئی اہمیت نہ دی جاتی تھی اس لیے کہ رعیت کو معلوم تھا کہ اقتدار
کے اصل مالک تو نندراج اور دیوراج ہیں۔ رعیت اپنے مقدمات اور فریادیں وزیر برادران ہی کے

پنڈتوں کے راج محل سے رخصت ہونے کے بعد راجہ کو دو گھنٹے کا آرام دیا گیا کیونکہ اسے اب شام تک راج محل کے سامنے والے میدان میں شامیانے کے بیچے بیٹھنا تھا اور کھیل تماشے دیکھنے کے علاوہ کامیاب ہونے والوں میں انعامات بھی تقسیم کرنے تھے۔

راجہ کرشن اوڈیرا نندراج اور دیو راج سے رخصت ہو کے بظاہر اپنی خواب گاہ میں آرام کرنے چلا گیا لیکن جیسے ہی اسے کینیز خاص نے اطلاع دی کہ وزیر برادران محل سے جا چکے ہیں تو جوان راجہ نے اپنی محفل فرار جمالی۔ اس کی رانیاں اس کے گرد اس کے بیٹھ گئیں۔ کینیزیں مورچل سنبھال کے کھڑی ہو گئیں۔ راج محل کی مغنیہ نے نغمہ پھیر دیا۔

راجہ کرشن اوڈیرا کی اصل رانی تو نندراج کی بیٹی تھی لیکن راجہ نے چار پانچ نو عمر کینیزوں کو بھی اپنی محبوبہ بنا کر انہیں تقریباً رانی کا درجہ دیدیا تھا۔ راجہ کی یہ محبوب رانیاں راجہ کی مسند کے ساتھ نہ بیٹھ سکتی تھیں کیونکہ راجہ کے ساتھ بیٹھنے کا صرف نندراج کی بیٹی کو حکم تھا۔

راجہ کرشن اوڈیرا کی محبوباؤں کے لیے راجہ کے دائیں بائیں اور پشت کی طرف بہترین قابیلو کا فرش لگایا جاتا تھا جس پر وہ ایک ایک دودھ کے بیٹھے تھیں۔

راجہ کے سامنے گانے بانا چنے والیوں کے سازندے بیٹھے تھے۔ بھر جب محفل رات پر آنے لگی تو انہی کینیزوں میں سے دو کینیزیں ساقی گری کے فرائض سرانجام دیتی تھیں۔ سوائے نندراج کی بیٹی کے راجہ کے سب نوشی کے شغل میں راجہ کی تمام محبوب کینیزیں شامل ہو جاتی تھیں۔

راجہ کرشن اوڈیرا کی ہمارا نندی جو راجہ کے وزیر نندراج کی بیٹی تھی وہ راج محل کی تمام عورتوں سے زیادہ خوبصورت تھی لیکن راجہ کے نزدیک اس کی کوکیا کی جائے کہ اس کی توجہ ہمارا نندی نندی کی طرف کم اور اپنی کینیز محبوباؤں کی طرف زیادہ تھی۔

نندی کو بھی راجہ کی کچھ پروا نہ تھی۔ اس کا محل راجہ کے محل سے الگ تھا لیکن دونوں محلات کے درمیان ایک طویل پختہ راہداری تھی جس نے دونوں محلوں کو ملا رکھا تھا۔

ہمارا نندی نے اپنے محل کا انتظام خود سنبھال رکھا تھا جبکہ راجہ کرشن اوڈیرا کے راج محل کی تمام کینیزیں اور غلام نندراج اور دیو راج کے مشورے سے مقرر کی جاتی تھیں۔

رانی نندی نے اپنی کینیزوں اور محافظ پر مہاروں کا انتخاب خود کیا تھا جس میں وہ سبھا کے مشورے سے تبدیل کرتی رہتی تھی۔

سبھا، ایک سیاہ رنگت، تامل نسل کا مضبوط ہاتھ پیروں کا جوان تھا۔ ہمارا نندی اسے تنہائی میں دیو کہہ کے مخاطب کرتی تھی مگر کینیزوں کے سامنے سبھا ہی کہتی تھی۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ میسور کے وزیر برادران میں ایک تو نندراج تھا جو ہمارا نندی کا باپ تھا اور دوسرا دیو راج تھا جو نندرا کا چچا اور نندراج کا چھوٹا بھائی تھا۔ اسی لیے نندی اپنی کینیزوں کے سامنے اپنے محل کے محافظ داروغہ سبھا کو دیو نہیں کہتی تھی سبھا کہ اس کی خدیو راج کا نون تک پہنچ جاتی تو وہ ہمارا نندی کو تو کچھ نہ کہتا مگر سبھا کی زندگی کا خاتمہ ضرور کر دیتا۔

نندراج نے راجہ کرشن اوڈیرا کو دو گھنٹے آرام کے لیے دیے تھے مگر وہ دقت و سرودی محفل جما کے بیٹھ گیا تھا اور ہمارا نندی راجہ کو چھوڑ کے اپنے محل میں چلی گئی تھی۔ اس نے دہل جاتے ہی دیو (سبھا) کو بلا کر صلاح مشورے شروع کر دیے۔

دراصل ہمارا نندی اور اس کے چچا دیو راج کے درمیان راج پاٹ کے معاملے پر کچھ اختلاف ہو گیا تھا۔ نندی کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی کیونکہ اس کا حکم اپنے محل کے علاوہ راج محل (راجہ کا محل) پر بھی چلتا تھا۔ وہ ہمارا نندی ہونے کے ساتھ ساتھ میسور کے وزیر نندراج کی بیٹی بھی تھی۔

دیو راج کو ہمارا نندی کی یہ خود مری پسند نہ تھی۔ پھر اس وقت یہ اختلاف اور زیادہ شدید ہو گیا، جب ہمارا نندی نے اپنے محل کی حفاظت کے لیے دو سو سواروں کا دستہ اپنے طور پر ملازم رکھا اور اس دستہ کے اخراجات کے لیے اپنے وظیفے میں اضافہ کرایا۔ اس طرح چچا بھتیجی کے اختلاف ذرا کھل کر سامنے آ گئے۔

دیو راج نے ہمارا نندی کے محل کی حفاظت کے لیے فوجی دستہ مقرر کرنے کی شدید مخالفت کی تھی۔ لیکن نندراج کے سامنے اس کی ایک نہ چلی اور نہ صرف دستہ مقرر ہوا بلکہ ہمارا نندی کا وظیفہ بھی بڑھ گیا۔

مقابلہ کا میدان لوگوں سے کچھ بچ بھرا تھا۔ راجہ کے منگھاسن کے لیے ایک بہت اونچی سیڑج بنایا گیا تھا۔ میدان راج محل سے کچھ زیادہ دور نہ تھا بلکہ سامنے ہی تھا۔ اس کے باوجود راجہ اوڈیرا تھی پر سوار ہو کر محل سے نکلے۔

راجہ کے ساتھ ہمارا نندی بھی بیٹھی تھی۔ پچھلے دو ہاتھیوں پر ہمارا نندی اور راجہ کی محبوب کینیزیں

سوار تھیں۔

راجہ کے ہاتھی کے دائیں بائیں اور آگے سوار رنگ برنگ کے لباس پہنے گھوڑوں پر اکڑے بیٹھے تھے۔ سب سے آگے کے سوار کے پاس میسور کا جھنڈا تھا۔

اسیٹج کے سامنے نندراج اور دیوراج نے جو گھوڑوں پر سوار تھے اس رخم کو کے راجہ کو سلامی دیا اور مارانی ندی نے سبز دھال ہلا کر سلامی قبول کی۔

راجہ نے خوار آؤد نظریں بمشکل کھول رکھی تھیں مگر اسے کچھ سمجھائی نہ دے رہا تھا۔ ہاتھی کو اسٹج کے ساتھ لگا کر کھڑا کیا گیا۔ چار پائیدان کی ایک سیرجی جس پر گنگا جمنی کام کیا ہوا تھا، ہاتھی سے اسٹج کے ساتھ لگا دی گئی۔

مارانی نے سہارا دے کر راجہ کو کھڑا کیا اور ڈولتی سیرجیاں چڑھ کر دونوں اسٹج کے اوپر پہنچے۔

راجہ اور رانی کے سنگھاسن پر بیٹھتے ہی نگارے دفقارے پر چوٹ پڑی اور ڈھول تاشے بجا شروع ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی عوام نے اسٹج کو گھیر لیا جس کے گرد سپاہیوں نے حلقہ سا بنا رکھا تھا۔ اس حلقے تک پہنچ کر عوام رک گئے اور انہوں نے راجہ رانی کے اوپر سونے چاندی کے سکے پھینکا شروع کر دیے۔

یہ سکے عموماً اسٹج سے گنگا کر نیچے گرتے تھے جہاں دزیر برادران کے غلام خیندیاں اور لوریائیں لیے کھڑے تھے اور وہ سکے سمیٹ سمیٹ کر ان میں بھرتے جلتے تھے۔ کسی دوسرے کو سکے لوٹنے کی اجازت نہ تھی۔

کافی دیر تک اسٹج پر سکوں کی بارش ہوتی رہی۔

جب پنچادر کا یہ سلسلہ ختم ہوا تو دزیر برادران گھوڑوں سے اتر کے زرنگار کرسیوں پر براجمان ہوئے جو حیدر صاحب نے ان کے لیے لگوائی تھیں۔

میدان کے تمام انتظامات حیدر صاحب کے سپرد تھے اور وہ اکیلے اتنے عظیم جشن اور جلسے کا انتظام کر رہے تھے۔

تماشائی اسٹج کے پاس سے ہٹ کر اپنی اپنی جگہوں پر جا چکے تھے اور بے چینی سے مقابلوں کا انتظار کر رہے تھے۔ پھر نندراج نے حیدر صاحب کو مقابلے کے آغاز کا حکم دیا۔

حکم پاتے ہی حیدر صاحب نے مقابلہ کے منتسین (جیوری) کو مقابلہ شروع کرنے کا پیغام

بجایا۔

سب سے پہلے گھوڑ دوڑ کا انتظام تھا۔

دوڑ میں بیس گھوڑے حصہ لے رہے تھے جن میں شہباز اور حیدر علی بھی اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار دوڑ کے لیے تیار تھے۔

جیوری نے چار چار سواروں کے پانچ گروپ ترتیب دیے تھے۔ حیدر صاحب نے جیوری کو پہلے ہی ہدایات دی تھیں کہ شہباز اور حیدر علی کو الگ الگ گروپوں میں رکھا جائے۔ شہباز پہلے اور حیدر علی پانچویں گروپ میں شامل تھے۔

پہلا گروپ میدان میں لایا گیا۔ چاروں سوار اپنے گھوڑوں کو دوڑ کی لائن پر لے آئے۔ شہباز کا گھوڑا بڑا امنہ زور تھا اور بار بار زور کر کے گھوم جاتا تھا۔

جیوری کا ایک بیج ہزار مال ہاتھ میں پکڑ کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے تیز آواز میں سواروں کو خبردار کیا۔ وہ ایسی جگہ پر کھڑا تھا جہاں اسے دوڑنے والے سوار جیوری کے ممبران اور مقابلہ کے ناظم اعلیٰ دیکھ سکتے تھے۔

بیج کے ہوشیار "کمسنے پر گھوڑ سوار اپنے گھوڑوں کو لائن پر روک کے کھڑے ہو گئے۔ تماشا بینوں پر سناٹا طاری ہو گیا، جیسے انہوں نے اپنی مائیں تک روک لی ہوں۔

پھر بیج کا رومال والا ہاتھ ہوا میں بلند ہوا۔

لوگوں کی نظریں گھوڑوں اور سواروں پر جم کے رہ گئیں۔ چند ہی لمحوں بعد بیج نے ہزار مال ہلا کر مقابلے کا آغاز کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی عوام نے اپنے دل پسند سواروں کی ہمت افزائی کرنا شروع کر دی۔

شہباز اور حیدر علی کا یہ پہلا موقع تھا اور انہیں کوئی نہیں جانتا تھا اس لیے شہباز، جو پہلے گروپ میں شامل تھا، اس کے حق میں کوئی نعرہ بلند نہ ہوا۔

یہ تقریباً چار میل کی دوڑ تھی۔ دو میل جانا اور دو میل آنا تھا۔ جہاں سے گھوڑوں کو واپس آنا تھا وہ ایک پتھر بلاٹیلک تھا۔ جیوری کے دو بیٹے تھے۔ انہیں یہ دیکھنا تھا کہ کون سا گھوڑ سوار ٹیلے کا چکر لگا کر واپس گیا ہے۔

اگر کوئی گھوڑ سوار راستہ میں گرنے یا اسے کوئی اور حادثہ پیش آجائے اور گھوڑا ٹیلے تک نہ پہنچ سکے تو ٹیلے کے جھوں کے پاس چار تیز رفتار سوار تیار کھڑے تھے جو گھوڑ دوڑ

جب شہباز نے دوڑ کا نشان پار کرنے کے بعد گھوڑے کی نگاہیں کھینچیں تو وہ منہ زور نصف میل تک روکے نہ رکھا۔
ادھر حیدر صاحب کا یہ حال تھا کہ وہ شہباز کے گھوڑے کے پیچھے بے تماشیا بھاگے جا رہے تھے اور زبان پر کچھ اس طرح کے کلمے تھے:
شہباز- تو نے بھائی کی لاج رکھ لی۔
سرخرو کر دیا مجھے لوگوں میں۔

و غیرہ وغیرہ۔
اسی طرح وہ آدھے میل تک بھاگے چلے گئے۔
پھر جب شہباز کا گھوڑا رکا تو اس نے فوراً نگاہ کو پیڑ کی شاخ میں اٹکایا اور حیدر صاحب کی لاف دوڑ پڑا۔

حیدر صاحب پسینے پسینے ہو رہے تھے۔ شہباز بھی پسینے میں ڈوبا ہوا تھا لیکن وہ اسی حالت میں ایک دوسرے سے پیٹ گئے۔
حیدر صاحب کا شہباز کی تعریف کرتے منہ نہ دکھتا تھا اور شہباز ان کی تعریف کے جواب میں مڑ ایک ہی جملہ کہتا:
حیدر بھائی! یہ سب آپ کی مہربانی اور اللہ کا احسان ہے۔

اور یہ کچھ غلط بھی نہ تھا۔ حیدر صاحب نے دونوں بھائیوں کی تربیت میں پانی کی طرح روپیہ بہایا تھا۔ انہوں نے ان دونوں کے لیے دو مشین گھوڑے خریدے جن کی پتلی کمر اور شاندار اکڑی ہوئی گردن دیکھنے کے لائق تھی۔ ان میں سے ایک پر سوار ہو کر شہباز نے اپنے گردپ میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔

دوسرا مشین گھوڑا حیدر علی کے پاس تھا جس کا گردپ پانچواں یعنی آخری تھا۔
حیدر صاحب اور شہباز میدان میں واپس آئے تو دوسری دوڑ تیار تھی۔ حیدر صاحب نے جج کو مخصوص اشارہ کیا اور اس نے رومال ہلا کے دوڑ کا آغاز کر دیا۔
دوڑ کا آغاز تو بہت اچھا لگتا ہے مگر گھوڑوں کی واپسی کا انتظار بہت کھلتا ہے۔ دو میل جانا پھر دو میل واپس آنا۔ اس میں کچھ وقت تو لگتا ہے۔

دھوپ بھی تیز ہو گئی تھی۔ اگرچہ یہ گرمی کا زمانہ تھا بلکہ اب تو گلابی جارشے بھی شروع ہو چکے

کے تین گھوڑوں کا پیکر لگانے کے فوراً بعد ان کے پیچھے پوری رپورٹ لے کر مقابلہ کے آغاز والی جیوری کے پاس پیسج کے انہیں رپورٹ پیش کرتے تھے۔

شہباز جب نقطہ آغاز سے روانہ ہوا تھا تو اسے کوئی نہیں جانتا تھا لیکن جب وہ ٹیلے کا پیکر لگا کر واپس آ رہا تھا تو ہر ایک کی آنکھیں حیرت سے کھلی ہوئی تھیں کیونکہ شہباز اپنے ساتھیوں سے تقریباً ایک فرلانگ آگے آ رہا تھا۔

حیدر صاحب نے شہباز کا مشین (سیاہ) گھوڑا ایک فرلانگ آگے آتا دیکھا تو خوشی سے دیوانے ہو گئے اور چیخ کر بولے:
شہباز شاہنشاہ!

ذرا اور تیز!

بس پالامار لیا میرے بیٹے نے!

حیدر صاحب کی آواز پر تماشا بیوں کو آگے آنے والے گھڑ سوار کا نام معلوم ہو گیا۔ پھر تو انہوں نے شہباز، شہباز، شہباز کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھالیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے شہباز کا مشین گھوڑا مقابلے کا نشان پار کر گیا۔

شہباز شہباز کے شور سے پہلے ہی کانپڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اس کے پہلے نمبر پر آنے سے شور میں اور اضافہ ہو گیا۔
لیکن۔

اس شور وغل میں بہت سی تیز اور تجسس بھری آوازیں بھی ابھر رہی تھیں:

یہ شہباز کون ہے؟

کوئی بھی ہو مگر ہے کمال کا شہسوار۔

گھوڑے تو انچوں اور سروں سے جیتے ہیں مگر اس نے تو سب کو ایک فرلانگ پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

حیدر صاحب کا بھائی بند معلوم ہوتا ہے۔

مگر ہے بالکل کسن۔

اور کیا۔ ابھی میں بیگ رہی ہیں اس کی۔

غرض جتنے منہ اتنی باتیں!

فرلانگ آگے آ رہا تھا۔

حیدر صاحب بوجش میں آکے کھڑے ہو گئے۔ ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا:
”شاہنشاہ حیدر علی۔ زندہ باد حیدر علی!“

حیدر علی گھوڑے سے اتر کر بھاگتے ہوئے حیدر صاحب کے پاس آئے۔ حیدر صاحب نے ان سے بغلی گیر ہونے کے لیے بازو کھول دیے لیکن حیدر علی نے ان کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر پیچھے انکھوں سے لگا یا۔ پھر انہیں بوسہ دیا۔ اس کے بعد اس نے بڑے بھائی شہباز کے ہاتھ چومے حیدر صاحب اور شہباز نے حیدر علی کو گلے لگا کر دعا دی۔

پانچوں گروپوں سے اول دوم سوار الگ کر لیے گئے تھے۔ یہ سب دس سوار تھے۔ اب انہیں پانچ پانچ گروپوں میں تقسیم کیا گیا مگر اس طرح کہ شہباز اور حیدر علی الگ الگ گروپوں میں رکھے گئے۔

وقت زیادہ ہو گیا تھا اس لیے فوراً ہی دوڑ متروک کرادی گئی۔ ان گروپوں میں بھی شہباز اور حیدر علی اول آئے۔

اب آخری دوڑ ہونے والی تھی تاکہ یہ طے ہو سکے کہ دونوں میں اول کون ہے اور دوم کون؟ اس وقت حیدر علی نے حیدر صاحب سے کہا:

”بھائی جان، بڑے بھائی سے مقابلہ کرنا موٹے ادب ہے اس لیے میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں۔“

”حیدر علی! تم بہت عظیم ہو۔“ حیدر صاحب نے اس کی تعریف کی اور اس کا ماتھا چوم لیا۔

شہباز اپنے چھوٹے بھائی کے اس خلوص اور ادب سے بہت خوش ہوا۔

دونوں بھائیوں کو میسرور سرکار کی طرف سے ایک ایک گھوڑا معہ ساز کے دیا گیا۔ پھر ہمارا فی نندی نے ایک ایک خنجر جس کا قبضہ سونے کا تھا اور غلاف پر سونے چاندی کے تاروں کا کام کیا ہوا تھا، شہباز اور حیدر علی کو دیا گیا۔ اس کے علاوہ عوام نے دونوں بھائیوں پر سونے چاندی کے سکہوں کی خوب بارش کی۔

آج کا مقابلہ ختم ہو گیا۔

دوسرے دن شمشیر زنی کا مقابلہ تھا اس لیے لوگوں کو جانے کی اجازت دیدی گئی گھر سوار

تھے لیکن وہ پہر سر پر تھی اور حدت بڑھنا ہی تھی۔ میدان میں سائے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ شاہی ہماؤں کے ایجنٹ پر سایہ تھا یا پھر صرف شامیہاں والے دھوپ سے بچے ہوئے تھے۔ یہ شامیہاں خاص خاص لوگوں کے لیے تھے۔ عوام بے چارے دھوپ ہی میں کھڑے تھے۔

پہلی دوڑ میں شہباز اول آیا۔ اس کے ساتھ دو نمبر پر آنے والے کا نام بھی لکھا گیا تاکہ وہ دوسری دوڑوں میں بھی حصہ لے سکیں۔

طے یہ تھا کہ دوڑ میں حصہ لینے والے چار چار کے پانچوں گروپوں میں سے اول اور دوم آنے والے سواروں کو الگی دوڑوں میں حصہ لینے کا حق ہوگا۔ پس دوسری تیسری اور چوتھی دوڑ کے اول اور دوم آنے والے شہسواروں کو الگ کر لیا گیا۔

آخری یعنی پانچویں دوڑ میں شہباز کے چھوٹے بھائی حیدر علی کو حصہ لینا تھا۔ شہباز اپنے محسن حیدر صاحب کی نشست کے پیچھے کھڑا تھا۔

حیدر علی کا قد شہباز سے زیادہ لانا تھا۔ وہ اپنے گھوڑے پر تنے بیٹھے تھے۔ دوڑ کے شروع ہونے سے پہلے حیدر صاحب اور شہباز دونوں کے دل دھڑک رہے تھے لیکن جب دوڑ شروع ہوئی تو حیدر صاحب، شہباز اور تمام تماشا بینوں نے دیکھی۔

جج کے رومال ہلاتے ہی حیدر علی نے کچھ اس انداز سے اپنے منہ کی گھوڑے کو ایڑ دی کہ وہ ایک لمحے کے لیے اپنے پیچھے دونوں پیروں پر الف ہوا۔ پھر جو اس نے قدم زمین پر جما کے آگے کو حرکت کی تو یوں عکسوں ہوا جیسے بندوق سے گولی نکلتی ہے یا پھر باد صحر کا جھونکا۔ ہم سے چھو کر زن سے نکل جاتا ہے۔

حیدر صاحب اور شہباز کے چہروں پر ہلکے آگے شہباز نے جذبات سے مغلوب ہو کر حیدر صاحب کے دونوں شانوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر کہا:

”حیدر بھائی! دیکھ آپ نے حیدر علی کو!“

حیدر صاحب نے مسکرا کر شہباز کی طرف دیکھا۔

تب تک حیدر علی کا گھوڑا تو انکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ باقی تمام گھوڑے دور پر سیاہ دھبوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد آخری گروپ کے سوار واپس آتے دکھائی دیے مگر ان کی واپسی بھی بالکل اسی انداز کی تھی جس طرح پہلی گھوڑا تو انکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس بار حیدر علی کا منہ کی گھوڑا دوسروں کو چھوڑ کر ایک

کے اس مقابلے نے شہباز اور حیدر علی کو سب سے بڑا انعام دیا کہ ان دونوں بھائیوں کے نام میسر کے عوام کی زبان پر چڑھ گئے۔

عوام میلے ٹھیلوں کو خوب پسند کرتے ہیں۔ اس دن کی گھوڑ دوڑ میں شہباز اور حیدر علی کی وجہ سے انہیں ضرورت سے زیادہ لطف آیا۔ چنانچہ اس شب چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں پر شہباز اور حیدر علی ہی کا ذکر تھا۔

لوگ اس بات پر زیادہ حیران تھے کہ دوڑ جیتنے والے دونوں کم عمر جوان تھے۔ جب ان کا اس عمر میں یہ حال تھا تو پتہ نہیں وہ آگے چل کر کیا کیا کارنامے نمایاں انجام دیں گے۔ پھر عوام میں دوسرے دن ہونے والے شمشیر زنی کے مقابلہ کا ذکر چھڑ گیا۔ ایک نام آدمی نے ٹھنڈا سا نس لے کر کہا:

”اے کاش آج کی دوڑ جیتنے والے دونوں جوان کل کے مقابلے میں بھی شریک ہوں۔“
”واہ۔ یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ جو اچھا شمسوار ہو وہ اچھا شمشیر زن بھی ہو۔“ دوسرے نے خواہ مخواہ اعتراض جڑ دیا:

”بے شک دونوں نے شمسواری میں بڑی مہارت دکھائی ہے مگر شمشیر زنی کا فن کچھ اور ہے، کون کہتا ہے کہ اچھا شمسوار اچھا شمشیر زن نہیں ہو سکتا۔“
یہ ایک تیسری آواز تھی:

”میں گلبرگہ کے ایک جوان کو جانتا ہوں جو شمسواری اور شمشیر زنی دونوں میں ماہر اور کثرت ہے۔“

بحث میں اتنی تیزی آئی کہ دو پارٹیاں تیار ہو گئیں اور پہلے بحث۔ تو تو میں میں میں تبدیل ہوئی۔ پھر پارٹیوں نے استینہیں چڑھا لیں۔

جن کے پاس تلواریں تھیں ان کے ہاتھ تلواروں کے مقبضوں پر پہنچ گئے اور جن کی کمیر خنجر لگے تھے انہوں نے اسے خنجر کو مضبوطی سے تھام لیا۔

یہ ایک جھوٹا سا ہونٹ تھا سہم دونوں میں اس پر چار آدمیوں سے زیادہ آدمی بیٹھے دکھائی دیتے تھے مگر اس وقت یہاں پچاس سے زیادہ لوگ موجود تھے جن میں تماشا بینوں

تعداد زیادہ تھی۔

انہی تماشا بینوں میں ایک بزرگ صورت بھی کھڑے تھے۔ ان کی عمر زیادہ نہ تھی کیونکہ دارطی کے بال نصف سے زیادہ کالے تھے مگر اسے پر سجدہ کرنے کا اتنا گہرا سیاہ ڈھٹہ تھا جس نے انہیں اس عمر میں ہی بزرگ بنا دیا تھا۔

وہ بزرگ لوگوں کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھے۔ لوگوں نے ان کی صورت دیکھ کر جگہ دیدی۔ وہ دونوں پارٹیوں کے درمیان جا کھڑے ہوئے۔ پھر فرمایا:

”میرے دوستو اور بھائیو! کیوں آپس میں سر پھوڑتے ہو۔ تم کسی ایسے شخص کو کیوں تلاش نہیں کرتے جو شمسواری اور شمشیر زنی کے فن سے پوری طرح واقف ہو۔ صرف یہی نہیں بلکہ جو آج کے دونوں جوانوں کے پورے خاندان سے واقف ہو۔“

لوگوں نے پہلے تو ایک دوسرے کا منہ دیکھا۔ پھر ایک ہمت کر کے بولا:

”جناب مولانا صاحب۔ اگر آپ کسی ایسے شخص سے واقف ہوں تو ہمیں اس کا پتہ بتائیے تاکہ ہم اس کے پاس جا کر اپنا فیصلہ کر سکیں۔“

”میرے بیٹے تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔“

بزرگ مولانا نے سوال کرنے والے کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

”ایسے چند لوگوں میں سے ایک شخص وہ بھی ہے جو اس وقت تم سے مخاطب ہے۔“

”جی۔ کیا فرمایا آپ نے؟“ سوال کرنے والے نے پوچھا:

”کیا آپ کا نشان اپنی طرف ہے؟“

”بالکل۔ بالکل۔“ بزرگ نے جواب دیا:

”آپ لوگ غصہ تموک کے بیٹھ جائیے۔ میں آپ کو ابھی سب کچھ بتائے دیتا ہوں۔“

سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ باقی کرسیوں اور بنچوں کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔

بزرگ نے کچھ اس طرح کی اشتافی فرمائی:

”میرے دوستو۔ حیدر صاحب کلاں کو تو آپ لوگ جانتے ہی ہوں گے۔ میری مراد ان حیدر صاحب سے ہے جو ان مقابلوں کے ناظم اعلیٰ اور آج کا مقابلہ جیتنے والے دونوں جوانوں کے بڑے بھائی ہیں۔ اس حقیقت کی ان سے پرانی یاد اللہ ہے۔ ہمارے راجہ صاحب کی نظر میں ان کا بڑا مقام ہے اور ریاست کے دونوں وزیروں یعنی نند راج اور دیو راج صاحب سے ان کا بڑا رشتہ ہے۔“

اس ناچیز فقیر کو بھی وہ اکثر ذریعوں کی حویلیوں میں لے گئے ہیں۔ ان کی حویلیاں کیا ہیں راج محل کو مات۔

”ہیں آپ کی داستان نہیں سننا ہے۔ اصل بات بتائیے؟“ ایک دل جلنے پر چخ کے ان کی بات کاٹ دی۔

دوسرے لوگوں کو بھی ان کی باتوں سے الجھن ہو رہی تھی۔ انہوں نے بھی اعتراض کرنے والے کی ہاں میں ہاں ملائی۔

بزرگ محترم جو اعتراض کرنے والے کو کوئی سخت جواب دینے والے تھے، جب انہوں نے دیکھا کہ اور بہت سے لوگ بھی اس کے ہنواہیں تو انہوں نے فوراً پسینہ ترابلا۔

”دوستو۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ لوگ اصل بات معلوم کرنے کے لیے بے چین ہیں۔ میں وہی بات بتانے جا رہا ہوں۔“

پھر انہوں نے لوگوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور بات آگے بڑھائی:

”ہاں دوستو۔ میں یہ کہہ رہا تھا۔ ہاں یاد آ رہا راج محل کی بات ہو رہی تھی۔ اس دلی جلنے نے انہیں پھر ٹوکا:

”جناب! راج محل پر خاک ڈالے۔ اصل بات بتائیے ہیں؟“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔“

انہوں نے ہتھیار ڈال دیے اور اصل بات پر آگئے:

”اصل بات یہ ہے کہ کل کے مقابلے میں یہ دونوں بھائی یعنی شہباز اور حیدر علی اپنی شمشیر زنی کے جوہر دکھانے لگے اور آپ لوگ دیکھیں گے کہ اس میں بھی ان کا غر بھلا ہی رہے گا۔ حاضرین اس اعلان سے بہت خوش ہوئے اور آپس میں باتیں کرتے ہوئے منتشر ہو گئے۔ مولانا جو اپنی لڑائی میں سناٹا چاہتے تھے، امنہ دیکھ کر رہ گئے۔

بزرگ موصوف کا نام ہاتھ تھا کہ لوگ ان کی فضول بکواس کی وجہ سے انہیں کاذب کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ان میں یہ خوبی ضرور تھی کہ وہ بڑی سے بڑی غفل سے بڑے سے بڑے مجھے ادھلے میں بے دھرمک ٹھس جایا کرتے تھے اور موقع پاتے ہی اپنی زبان بے لگام کھول دیتے تھے۔ پھر یہ زبان اس وقت ٹھس چلتی رہتی تھی جب تک انہیں مجلس یا جلسہ سے ہاتھ پکڑ کے نکالا نہ جاتا تھا۔

آج کے مقابلہ کے اختتام پر جب حیدر صاحب کلاں، شہباز اور حیدر علی کامیابی پر انہیں مبارک باد دے رہے تھے تو ان کی زبان سے یہ جملہ نکلا تھا:

”دیکھو لڑکو۔ جس طرح تم نے آج کامیابی حاصل کی ہے اسی طرح کل شمشیر زنی کے مظاہرے میں بھی اول آنا۔“

اس وقت ہاتھ یا کاذب صاحب، حیدر صاحب کی پشت پر کھڑے تھے۔ چنانچہ انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور فی الفور سامنے آ کر حیدر صاحب کو فرشتی سلام کیا۔ ان کی صورت دیکھتے ہی حیدر صاحب کا مزاج برہم ہو گیا مگر انہوں نے ملائمٹ سے کہا:

”ہاتھ نہیں آج نہیں پھر کبھی تشریف لائے گا۔ میں ایک ہفتے تک معروض رہوں گا۔“

حیدر صاحب تو یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے مگر اسی وقت ہاتھ کی آواز سنائی دی:

”کوئی بات نہیں شاہ حیدر۔ میں پھر حاضر ہو جاؤں گا۔“

حیدر صاحب چلتے چلتے رکے اور واپس آ کر بولے:

”ہاتھ۔ اپنا دماغ صحیح رکھو۔ میں بادشاہ نہیں ریاست میسور کے راجہ کرشن اوڈیر کا ایک ادنیٰ خادم ہوں بخیردار۔ آئندہ جو کبھی ایسی بات کہی تو۔“



آج مقابلے کا دوسرا دن تھا۔

ایک طرف کشتی کے اکھاڑے جے تھے۔ ننگے بدن پہلوان جسم پر اکھاڑے کی ٹٹی ملے ہوئے ایک دوسرے سے کھم گتھا ہو رہے تھے۔

دوسری طرف پٹے بازی کے اکھاڑے جمع تھے۔ پٹے بازی کو شمشیر زنی کی ابتدائی صورت کہا جاسکتا ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ پٹے باز کے ہاتھ میں تلوار کی جگہ بانس کی ایک چھڑی ہوتی تھی اور لوہے یا لکڑی کے کھال کے بجائے دفعتی یا گتے کی گول ڈھال ہوتی جس پر کپڑے کی کٹی تھیں لپٹی ہوتی تھیں۔

باقی انداز مارے شمشیر زنی کے ہوتے۔ اسی طرح بانس کی چھڑی کی شمشیر فضا میں لہرائی اور مخالف کے سر پر بجلی جیسی تیزی سے گرتی اور مخالف فوراً پسینہ ترابدل کے دار کو اپنی ڈھال پر روکتا۔ پھر جوابی حملہ کرتا۔

دو دشمنی زن آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ یہ محض اتفاق نہ تھا بلکہ حیدر صاحب نے جان بوجھ کے مقابلے کے دونوں مقامات پر شہباز اور حیدر علی کو الگ الگ مقابلے کا آغاز کرنے کے لیے کھڑا کر دیا تھا۔

ان مقابلوں میں دو دشمنی زن کا میاب قرار دیے جاتے جو سب سے زیادہ دشمنی زنوں کو شکست دیتے تھے۔ شہباز اور حیدر علی دونوں کا لباس یکساں تھا۔ ان کے سر پر آہنی زنجیروں کا جالہارا خود تھا اور جسم پر زرہ بکتر۔

دونوں جگہوں پر مقابلہ ایک ساتھ شروع ہوا۔

مقابلہ سے پہلے دشمنی زنوں کے ناموں کا اعلان کیا گیا۔ اس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ گھوڑوں جیتنے والے دونوں نوجوان دشمنی زن کے مقابلوں میں شریک ہیں۔ اور وہی مقابلوں کا آغاز کر رہے ہیں۔

شہباز اور حیدر علی دونوں کے مقابل دو مرہٹہ جوان تھے جو انعام کے لالچ میں آئے تھے۔ مقابلہ شروع ہوتے ہی شہباز اور حیدر علی نے اپنے مد مقابل کی تلوار لگرائی مگر جب وہ تلواریں الگ ہوئیں تو دونوں مرہٹہ جوانوں کی تلواریں ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گئیں۔ شہباز اور حیدر علی نے مرہٹہ جوانوں کی تلواریں الجھا کر اس انداز سے جھٹکاو دیا تھا کہ تلواریں ان کے ہاتھ سے نکل گئیں۔

اس طرح شہباز اور حیدر علی نے اپنا مقابلہ جیت لیا۔

اس مقابلے کا فیصلہ اس قدر تیزی سے ہوا کہ عوام کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا ہوا۔ انہوں نے تو بس یہ دیکھا کہ شہباز اور حیدر علی کے مد مقابل خالی ہاتھ کھڑے ہیں اور ان کی تلواریں دور جا گری ہیں۔ دوسرے مقابلے میں بھی شہباز اور حیدر علی کا میاب رہے۔ انہوں نے اس بار بھی اپنے مد مقابل کا تلوار اپنی تلوار میں الجھا کر اسے دور پھینک دیا تھا۔

عوام شہباز اور حیدر علی کو پہلی بار کچھ زیادہ داد نہ دے سکے تھے مگر اس بار ان دونوں نوجوانوں کے حق میں اس قدر نعرے لگے جیسے طوفان برپا ہو گیا ہو۔

تیسری اور چوتھی بار بھی شہباز اور حیدر علی نے اپنی اسی مدلت کا مظاہرہ کیا۔ پھر تو ایسٹیم کے اوپر بیٹھنے والوں یعنی نارانی مندی اور راجہ کرشن اوڈیر نے بھی شہباز اور حیدر علی کی تعریف میں زبان کھولی۔ رہے حیدر صاحب تو ان کی خوشی کا کیا ٹھکانہ تھا!

پٹے بازی عوام میں بہت مقبول تھی۔ جنوبی ہند میں یوں بھی سادات کی زیادہ آبادی تھی۔ وہ تعزیر داری اور علم برداری کرتے تھے۔ تعزیر کے جلوس میں آگے آگے پٹے بازوں کی ٹوئیاں ہوتیں۔ یہ لوگ اپنے فن کا مظاہرہ کرتے، جلوس کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ شمال ہند میں خصوصاً لکھنؤ، رامپور وغیرہ پٹے بازی کا رواج تھا جو اب تک قائم ہے۔

آج کا سب سے اہم مقابلہ دشمنی زن کا تھا۔

دشمنی زن کے دو اکھاڑے بنائے گئے تھے۔ اکھاڑے کی زمین کو پہلے اچھی طرح صاف کیا گیا۔ پھر اس پر پانی چھڑکا گیا۔ اس کے اوپر بڑی بڑی سوئی دریوں کا فرش بچھا گیا۔ اس طرح دشمنی زن کے دو اکھاڑے تیار کیے گئے تھے۔ ایک اکھاڑا راجہ کے ایسٹیم کے ذرا دائیں جانب اور دوسرا بائیں جانب۔

دشمنی زن کے مقابلے میں ہر ایک حصے لے سکتا تھا اس لیے دشمنی زن ایک کی کر سے لکھتی نظر آتی تھی اور اسے مردوں کا زیور کہا جاتا تھا۔

مسلمان بچوں کو دشمنی زن کھڑکیوں کے سہارے چلنا سکھایا جاتا تھا۔ بچے سکول کی تعلیم کے بعد بھی دشمنی زن ماہر بن سکتے۔ تربیت حاصل کرتے تھے۔ شاید اسی لیے شیخ فتح محمد کے دونوں بیٹے یعنی شہباز اور حیدر علی علم کا چراغ تود روشن نہ کر سکے مگر دشمنی زن کا علم ایسا بلند کیا جو تاریخ کا سنرا باب بن گئے۔

دشمنی زن کا طریقہ یہ تھا کہ دو دشمنی زن آمنے سامنے کھڑے ہو جاتے۔ انہیں زرہ بکتر پہننے اور خود لگانے کی اجازت ہوتی تھی۔ بعض دشمنی زن گلے کی حفاظت کے لیے آہنی کڑیوں یا زنجیروں کا ہار بنا کے خود کے نیچے لٹکا لیتے تھے۔ پھر گھوڑوں کی طرح رد مال ہلا کر مقابلہ کا آغاز کیا جاتا۔ دونوں دشمنی زن چھٹ کر ایک دوسرے پر حملہ کرتے اور ایک دوسرے پر اس قدر دباؤ ڈالتے کہ وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے مقررہ کیر سے باہر ہو جاتا۔ اس وقت مقابلہ ختم کر دیا جاتا۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ دونوں دشمنی زن اپنی جگہ پہاڑ کی طرح جم کے کھڑے ہو جاتے۔ اور ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹتے۔ اس وقت جج یہ دیکھتا کہ کون دشمنی زن زیادہ زخمی ہو گیا ہے اور اگر اسے میدان سے ہٹایا نہ گیا تو اس کی موت ہو سکتی ہے۔ ایسی صورت میں جج میٹلی بجاکر مقابلہ ختم کر دیتا اور زیادہ زخمی ہونے والے کی ناکامی کا اعلان کر دیتا جاتا۔ آخر مقابلے کا اعلان ہوا۔

زندگی اور کامیابی کی ضمانت مانگتے تھے۔ ہم مسلمان ہیں اور الحمد للہ ہمارا ایمان ہے کہ عزت اور ذلت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے اور خدا ہر شخص کو وہی دیتا ہے جو اس کے خیال میں اس کے قابل ہے۔ بلاشبہ یہ مقابلہ بڑا سخت تھا۔

بغیر ڈھال کے شہباز اور حیدر علی اپنے مقابل کو پانچ سات منٹ میں شکست دے سکتے تھے مگر اس مقابلے کو آٹھ منٹ سے زیادہ گزر چکے تھے اور اب ہلکے فیصلہ نہ ہو سکتا تھا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے حیدر علی کو کامیابی عطا فرمائی۔ وہ بھی اس طرح کہ حیدر علی نے اپنے مقابل کو جھکا کر دے کر اس کے شانے پر اٹا اور اس شدت کا وار کیا کہ اس کی تلوار مقابل کا شانہ کاٹتی ہنسی ایک پہنچ گئی۔ مقابل کا ہاتھ جھول گیا۔ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

پھر تو ایسا نعرہ بلند ہوا کہ جیسے آسمان ٹوٹ پڑا ہو۔ حیدر صاحب ددڑ کر حیدر علی کے پاس گئے اور اسے اپنے سینے سے لگایا۔

حیدر علی کی کامیابی کو انہی چند ہی لمحوں سے گزرے تھے اور حیدر صاحب، حیدر علی سے جدا بھی نہ ہوئے تھے کہ سلام نے ایک اور نعرہ تجنیں بلند کیا۔

حیدر صاحب نے پلٹ کر دیکھا تو ان کی آنکھیں حیرت سے پٹی رہ گئیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ شہباز نے بھی اپنے مقابل کا اٹھے ہی وار سے نشانہ اس طرح تراشا تھا کہ تلوار اس کے ہاتھ میں لٹک کے رہ گئی تھی۔

اس کے ساتھ ہی ہمارا فی نندی نے چیخ کر حکم دیا:

”مقابلہ فوراً بند کر دیا جائے۔“

آندراج اور دہوراج میسرہیاں چڑھ کر اسٹیج پر پہنچے تاکہ معلوم کریں کہ ہمارا فی نے ایسا حکم کیوں دیا ہے؟

ہمارا فی نندی نے اسی طرح چیخ کے کہا:

”وزیر بابا۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ان نوجوانوں کو عوام کے ہاتھوں قتل کرا دیں۔ یہ میسور کی آن بان اور نشان ہیں۔ انہیں سبھال کے رکھا جائے۔“

ہمارا فی نندی کی بات بالکل صحیح تھی۔

شہباز اور حیدر علی نے ثابت کر دیا تھا کہ میسور میں ان جیسے نہ تو کوئی شہسوار ہے اور نہ شمشیر زن۔ پھر ایسے جواہر ریزوں کو مٹی میں کیوں ملایا جائے۔ جوان بلکہ نوجوان خون ان کی رگوں

اس کے بعد پھر اس مقابلہ میں اس وقت اور زیادہ لطف پیدا ہو گیا جب شہباز اور حیدر علی نے اپنی اپنی ڈھال الگ لکھ دی اور بغیر ڈھال کے مقابل، جو ڈھال لیے ہوئے تھے، سے مقابلہ کا اعلان کیا۔

دونوں جوانوں کے اس جرات مندانہ اعلان پر خوب شور ہوا اور ان کی تعریفوں کے پل باند گئے۔ اب مقابلہ فرادیر تک ہوتا کیونکہ شہباز اور حیدر علی کو غناط ہو کر مقابلہ کرنا پڑتا۔ انہیں مقابل کا ہر وار تلوار ہی پر روکتا تھا۔

شہباز اور حیدر علی نے پانچ منٹ کے اندر ہی اندر دونوں مقابل کو اس قدر زخمی کر دیا کہ وہ مقابلہ سے نکل گئے۔

اس طرح مقابلوں کو تقریباً ایک گھنٹہ ہو چکا تھا اور شہباز اور حیدر علی اپنے دس دس مقابلوں کو شکست دے چکے تھے۔ ان کی ہر کامیابی پر میدان اور اسٹیج دونوں جگہوں سے اس قدر شور ہوتا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی۔

ایک گھنٹہ کے بعد شہباز اور حیدر علی نے اپنی کمائی مہارت کا ایک اور مظاہرہ کیا۔ بعد اس طرح کہ انہوں نے اپنے سروں سے خود تار دیے، جس سے ان کے سر اور گردنیں دونوں غیر محفوظ ہو گئیں۔

یہ بڑا حوصلہ مند مگر انتہائی خطرناک اقدام تھا۔ حیدر صاحب کو یہ تو معلوم ہوا تھا کہ شہباز اور حیدر علی شمشیر زنی میں اس قدر ماہر ہو گئے ہیں کہ اب وہ بغیر ڈھال کے لڑ سکتے ہیں مگر انہیں یہ خبر نہ تھی کہ دونوں بغیر خود کے بھی بڑے سے بڑے شمشیر زن سے لڑ سکتے ہیں۔

عوام بھی نوجوانوں کے خود تار دینے پر مسرت کے ساتھ ساتھ خوف میں مبتلا ہو گئے۔ انہوں نے سوچا کہ اس مقابلے میں حصہ لینے والے لوگ پوری تیاری کے ساتھ آئے ہیں اس لیے ان سے میں ڈھال اور خود سے آزاد ہو کر لڑنا کوئی عقلمندی کی بات نہیں مگر یہ فیصلہ شہباز اور حیدر علی کا تھا۔ وہ ان کے فیصلے میں دخل اندازی نہ کر سکتے تھے۔

یہ مقابلہ شروع ہوا تو پورے میدان میں یوں سناتا چھا گیا جیسے وہاں ہرے سے کوئی منتشر موجود ہی نہ ہو۔

ہمارا فی نندی اور اس کا لاپرواہ شوہر بھی یہ مقابلہ دیکھنے کے لیے اسٹیج کے اوپر سے آگے کہ جھک پڑے۔ میسور کے عوام جنہوں نے شہباز اور حیدر علی کو اپنا میر و تسلیم کر لیا تھا وہ ان دونوں کو

نندراج 'ذرا دیر بعد راج محل پہنچ جائیں گے۔
نندراج کوئی بہانہ بھی کر سکتا تھا۔ وہ ہمارا فی خاص کینز سے یہ بھی پوچھ سکتا تھا کہ ہمارا فی
کو اس وقت کیا کام پڑ گیا جس کے لیے اس نے نندراج یعنی ریاست میسور کے مرد آہن
کو طلب کیا ہے؟

نندراج نے ہمارا فی خدمت میں اسی کینز کو اپنا جاسوس بنا کر بھیجا تھا جو وہاں جا کر
ہمارا فی کی جاسوسی کرنے کے بجائے اس کی کینز خاص بن گئی تھی۔
ہمارا فی نندی، نندراج کی بیٹی تھی۔ نندراج نے راجہ کرشن ادڑیر سے اس کی سیاسی شادی
کی تھی تاکہ راجہ ہاتھ پیر نہ نکال سکے اور اگر راجہ ہاتھ پیر نکال لے یا اس کا دماغ خراب ہونے لگے تو وہ
اپنی بیٹی کی مدد سے اس کی قتل ٹھکانے لگا سکے۔

نندراج نے اپنے خیال میں یہ قدم اپنے مفاد میں اٹھایا تھا لیکن یہ اٹا ہو گیا۔ ہمارا فی نندی
بہت جلد راج محل کے تاحکات سے واقف ہو گئی۔ اسے یہ بھی علم ہو گیا کہ نندراج نے راجہ سے
اس کی شادی سیاسی بنا پر کیا ہے۔
اس انکشاف نے اسے نندراج سے باغی کر دیا۔

ہمارا فی نندی کو ہر قسم کا عیش و آرام میسر تھا۔ پھر بھی وہ اقتدار حاصل کرنے کے لیے بے چین
رہتی تھی۔ وہ نندراج کے انتخابات سے واقف تھی اور جانتی تھی کہ نندراج کی دشمنی اسے بہت ہنگامی
پڑے گی۔ جب نندراج اسے ایک ناکارہ اور نااہل مرد کے حوالے کر سکتا تھا تو اپنے خدا کی خاطر
وہ اسے قتل بھی کر سکتا تھا۔

پھر بھی اقتدار کی ہوس نے اسے تمام خطرات سے بے پروا کر دیا تھا اور وہ رات دن ایسی
ترکیبیں سوچتی رہتی تھی جس سے اسے طاقت حاصل ہو اور وہ وزیر برادران کے اقتدار کو ختم
کر کے ملکی انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لے۔
یہ کام اتنا آسان نہ تھا جتنا رانی نندی سمجھ رہی تھی۔

اس کا اختیار اپنے عمل تک محدود تھا۔ اپنے عمل کا داروغہ اس نے لڑ بھڑا کر اپنی مرضی کار کیا تھا
سینا، جسے کینز میں دیو کے نام سے پکارا جاتا تھا، سپاہ رنگت اور اچھے ہاتھ پیروں کا مالک تھا۔
میسوری فوج میں وہ ایک سپاہی بھرتی ہوا تھا اور کئی سال بعد اسے نائیک کا عہدہ حاصل ہوا تھا۔
ہمارا فی نندی نے اسے کہیں دیکھا تھا اور قوی الجنتہ ہونے کی وجہ سے سینا اسے انداز لگاتا تھا۔ پھر

میں دوڑ رہا ہے۔ وہ اپنی طاقت سے ایک بار تو پہاڑ کو بھی جنبش دے سکتے ہیں گھر میں تو ابھی
نا تجربہ کار۔ ابھی میدان جنگ کا انہوں نے منہ بھی نہیں دیکھا۔ دشمن کیسا ہوتا ہے اس کی
انہیں بالکل خبر نہ تھی۔ وہ دونوں حیدر صاحب کے پیچھے بھاڑے تھے لیکن ہے کہ ان کا مقابلہ
کرنے والوں کے ذہن میں حیدر صاحب کا خون بھی موجود ہو۔

ہمارا فی نندی کی بات پر جس انداز سے غور کیا جائے وہ درست معلوم ہوتی تھی۔ نندراج اور
دیو راج دونوں ہی ہمارا فی نندی کے خود مری کے خلاف تھے۔ راجہ کرشن ادڑیر کی طرف سے انہیں
کوئی خطرہ نہ تھا اس کا مشغلہ رقص و سرود یا پھر جوان کینزوں کو اپنی بغل میں جگہ دینا تھا۔ اس سے
زیادہ اس کی کوئی خواہش نہ تھی۔

لیکن
ہمارا فی نندی کے تئیں کچھ اور تھے۔
لوگوں اس کی ہر خواہش پوری کی جاتی تھی۔ وہ رانی تھی مگر اسے ہمارا فی کا خطاب دیا گیا تھا۔ پھر بھی
وہ ان تمام مراعات کے باوجود مطمئن نہ تھی۔
وہ کیا چاہتی تھی؟ اس کا اسے خود بھی علم نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ اسے راج محل میں رہنا پسند
نہ تھا۔ اس نے راج محل میں رہنا چھوڑ دیا تھا اور اس کی ضد پر اسے الگ رانی محل بنا کر دیا گیا تھا مگر
وہ اب بھی مطمئن نہ تھی۔
مقابلہ ختم کر دیا گیا۔

عوام، شہباز اور حیدر علی کی باتیں کرتے اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔
نندراج اور دیو راج ایک ہی محل میں رہتے تھے یعنی ان دونوں کا جوہر میں گھسنے کا ساتھ تھا۔
اس رات جبکہ حیدر صاحب نے اپنے بھائیوں کی کامیابی کی خوشی میں دوستوں کی دعوت کی تھی اور وہ
ان کے درمیان بیٹھا شہباز اور حیدر علی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ اس وقت
وزیر برادران ایک خاص انجمن میں گرفتار تھے۔

بات یہ تھی کہ ہمارا فی نندی نے نندراج کو رانی محل میں فوری طور پر طلب کیا تھا۔
اب نندراج اور دیو راج اس پریشانی میں مبتلا تھے کہ ہمارا فی نے نندراج کو کیوں طلب کیا
ہے اور آیا اسے رانی محل میں تنہا جانا چاہیے یا نہیں؟
ہمارا فی کی خاص ملازمہ جو ہمارا فی کی رازدار سمیٹی بھی تھی اسے یہ کہہ کر واپس کر دیا گیا تھا کہ

”جو کچھ کہنا ہے گل کے کہہ سو راج کھی“۔
 نند راج نے سخت لہجے میں کہا:
 ”مگر یہ یاد رکھو کہ تو نے اپنا وقار میری نظروں میں کم کر دیا ہے۔“
 ٹالک: ”میری طرف سے دل صاف کر لیجیے۔“
 سورج کھی نے جرات سے کہا:

”میری طبیعت ایسی نہیں کہ آپ کو خوش کرنے کے لیے جھوٹی اور من گھڑت باتیں آپ تک
 پہنچا یا کروں۔ میرے خیال میں یہ خیر اہم تھی اس لیے آپ تک پہنچا دی۔“
 ”ٹھیک ہے۔“

نند راج نے اسے طرح دی:

”اب بتاؤ سبنا کو کیا حال ہے؟“

سورج کھی نے کچھ سچ اور کچھ جھوٹ ملا کر سبنا کی خوب خوب برائیاں کہیں۔ نند راج نے اس
 کی پلٹتی ہڑی بے دلی سے سنیں۔ شاید اس لیے کہ اسے ان باتوں کا علم دوسرے ذرائع سے
 ہو چکا تھا۔

وہ اپنی بیٹی کی آزاد خیالی اور بے محابہ بے باکی کو خوب جانتا تھا اس لیے اسے یہ خبر کچھ زیادہ
 متاثر نہ کر سکی۔

”کیا رانی محل پر ریاست کا کوئی اور کارندہ بھی آتا ہے؟“ نند راج نے یونہی پوچھ لیا۔

سورج کھی فوراً سمجھ گئی کہ نند راج نے اس کی بات کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی اس لیے
 اس شاطر کینیز نے فوراً پینتزا بدلا اور سنبھل کے بولی:

”ٹالک۔ رانی محل پر ابھی تک کوئی اہم آدمی تو نہیں آیا لیکن ایک شخص کا نام ہمارا رانی اور سبنا
 کی گفتگو میں اکثر سنا جاتا ہے۔ شاید کوئی فوجی افسر ہے وہ۔“
 فوجی افسر کے نام پر نند راج گھبرا گیا۔

”کیا نام ہے اس کا؟ تم نے یاد نہیں رکھا اس کا نام؟“

”ٹالک۔ مجھے ٹھیک سے تو یاد نہیں۔“

سورج کھی پیشانی پر انگلیاں رکھ کر کہنے لگی:

”اس کا نام۔۔۔ اس کا۔۔۔ گھنٹا۔۔۔ نہیں نہیں گنگا رام ہے اس کا نام۔“

رانی نے باپ سے منکر کے سبنا کو اپنے محل کا دار و نہ بنوا دیا۔

سبنا بڑی بے تکلفی سے محل کے اندر بھی جاتا تھا۔ اس پر کوئی روک ٹوک یا پابندی نہ تھی۔
 کینیز بہن اور دوسرے غلام اس سے سمے سمے سے رہتے تھے کہ وہ محل کا دار و نہ ہونے کے علاوہ
 ہمارا رانی مندی کا منہ چڑھا ملازم تھا۔

کینیز بہن دبی زبان سے کہتی تھیں کہ سبنا کو ہمارا رانی کی خواہ گاہ کے ارد گرد گھومتا ہوا دیکھا گیا
 ہے۔ ہمارا رانی کی کینیز خاص سورج کھی دراصل نند راج کی جاسوس تھی جسے اس نے ہمارا رانی کی
 جاسوسی پر مقرر کیا تھا لیکن ہمارا رانی نے اس پر انعام و اکرام کی بادش کر کے اسے اپنا ہوا بنایا تھا۔
 اب وہ ہمارا رانی کی رازدار سبیل تھی۔

پھر۔۔۔

ایک دن ایسا ہوا کہ سورج کھی اور سبنا میں جھگڑ گئی۔

سبنا کو اپنی دار و نہ اور ہمارا رانی کی حمایت کا زعم تھا اس لیے اس نے یہ جاننے کے باوجود کہ
 سورج کھی بظاہر ہمارا رانی کی کینیز مگر دراصل وہ نند راج کی جاسوس ہے سبنا نے سورج کھی کو دوسری
 کینیزوں کے سامنے اس قدر ذلیل کیا کہ وہ رو پڑی۔

وہ سبنا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ ہمارا رانی سے سبنا کی شکایت کرنا دیوار سے سر پھوڑنے کے
 مترادف تھا۔ اس وقت تو وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی مگر اس کے دل میں سبنا کی طرف سے
 گہرہ پڑ گئی۔

چند دن بعد سورج کھی نے ہمارا رانی سے اس کے پاس جانے کے لیے چھٹی مانگی۔ اس کی ماں
 سرنگا پٹم کے شہر میں رہتی تھی۔

ہمارا رانی نے اسے چھٹی دیدی۔

اس چھٹی کے دوران سورج کھی اپنے پرانے آقا کے پاس پہنچی اور اشاروں کی زبان میں سبنا
 کے بارے میں لگائی بھائی کی۔

”ٹالک۔ آپ نے سبنا کو دار و نہ بنا کر اچھا نہیں کیا۔“ سورج کھی نے بات چھیڑی۔

نند راج نے اسے چونک کر دیکھا۔

سورج کھی کھلے لفظوں میں سبنا کی غیبت پر آمادہ تھی اور چالاک نند راج یہ سوچ رہا تھا کہ اس سے
 باغی ہونے والی یہ کینیز آج رانی محل کے دار و نہ کی شکایت کیوں کر رہی ہے۔

گنگا رام کے نام پر نندراج اچھل پڑا۔
گنگا رام؟

نندراج نے حیرت اور پریشانی سے کہا:
”ٹھیک ہے۔ کیا اس کا نام گنگا رام ہے؟“
”ہاں۔ تجھے تو یہی نام یاد پڑتا ہے۔“
سورج کبھی نے سوکھے منہ سے کہا:

”کیا اس نام کا کوئی آدمی ہماری فوج میں ہے؟ اس نے بات کو طول دینے اور الجھانے
یہ نندراج سے التماس کر دیا۔
”اری بگلی، ہمارا فی مندی کی خاص کمینہ ہے اور اتنا بھی نہیں جانتی؟ نندراج نے محبت
انداز میں اسے ڈانٹا:

”گنگا رام میسور کے لشکر کا فوجدار ہے۔“

”اے رام۔ فوجدار ہے وہ۔“

سورج کبھی نے کمال ہوشیاری سے حیرت کا اظہار کیا:
”پھر تو ملک دال میں کچھ ضرور کالا ہے۔ سبنا ہنٹے میں ایک بار اس سے ملنے ضرور جاتے ہے
اچھا میں دیکھوں گا دونوں کو۔“

نندراج نے فیصلہ کن انداز میں کہا:

”اب تم جاسکتی ہو۔ ہم تمہارے شکر گزار ہیں۔“

نندراج ایک نئی جگہ میں پھنس گیا تھا۔

وہ سبکیا کی طرف سے قطعی مکہ مند تھا اس لیے کہ رانی مندی کے سبنا سے جائز یا ناجائز کسی

کے بھی تعلقات میسور کی ریاست پر اثر انداز نہ ہوتے تھے۔ ریاست کا مطلب خود اس کا اپنا اثر
تھا مگر سورج کبھی کی زبان سے گنگا رام کا تذکرہ خطرے کی گھنٹی تھی۔

لطف کی بات یہ تھی کہ گنگا رام بھی نندراج ہی کا پردہ وردہ تھا اور نندراج نے میسور
کی فوج پر بالواسطہ قبضے کے لیے گنگا رام کو آگے بڑھایا تھا اور وہ اس وقت میسور کا فوج
تھا۔

فوجدار کا عہدہ تقریباً سب سالہ کا ہوتا تھا۔ چونکہ سب سالہ کی حیثیت سے نندرا

اور دیوراج دونوں بھائی مشہور تھے اس لیے گنگا رام کو فوجدار کا عہدہ دیا گیا تھا اور اس کے
سپر فوج کا انتظام دال نظر میں تھا۔

گنگا رام کا باغی ہونا دونوں بھائیوں کے لیے بہت خطرناک تھا۔ نندراج نے اس سلسلے
میں فوراً دیوراج کو اپنے اعتماد میں لیا۔

دیوراج بھی اس خبر سے گھبرا گیا اور اس نے نندراج کو ایک بالکل نیا مشورہ دیا۔
”بھائی نندراج۔ میری مانگو تو اس معاملہ کو بڑے اکھاڑ کے پھینک دو۔ دیوراج نے
مازدارانہ انداز میں کہا۔

”وہ کس طرح؟“

دیوراج نے پوچھا:

”جو کہنا ہے صاف صاف کہو!“

”بھائی نندراج۔ بات بالکل صاف ہے۔ دیوراج نے بڑے استقلال سے کہا:

”دیکھو بھائی۔ راج نیت میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ نہ بھائی بھائی کا اور نہ باپ بیٹے کا۔ اگر
تمہیں یقین ہے کہ ہمارا فی مندی نے اس کا لے بیٹھنے اور گنگا رام کے ساتھ کر ہماری
جرطیں کاٹنے کی کوشش کی ہے تو پھر تم بھی انہیں اپنی پخت کی خاطر ان کی جڑوں سے اکھاڑ کر
پھینک دو۔“

نندراج نے حیرانی سے دیوراج کو دیکھا:

”تمہارا مطلب ہے کہ مندی، سبنا اور گنگا رام تینوں کو ٹھکانے لگا دیا جائے؟“

”صرف ہی تین نہیں۔ اگر ہمارے راستے میں تین سو یا تین ہزار بھی آجائیں تو ہمیں ان کو راستے
سے ہٹانا ہی پڑے گا۔“

دیوراج کا انداز فیصلہ کن تھا۔

نندراج نے اس سے اور کچھ نہ کہا بلکہ وہ دودن اور دو راتیں اسی ادھیڑ بھن میں رہا۔ اس نے
اپنے جاسوسوں کو بلا کر فردا فردا ایک ایک سے فوجدار اور رانی محل کے حالات کے بارے میں
صد سوالات کیے مگر کوئی بھی گنگا رام اور رانی محل کے درمیان کسی تعلق کو نہ بتا سکا۔ رانی محل کی
جاسوس کمینوں اور غلاموں نے قسمیں کھا کر کہا کہ انہوں نے گنگا رام یا اس کے کسی ہر کارے کو
رانی محل میں آنے نہیں دیکھا۔

لی۔ وہ اس لیے پریشان تھی کہ چار سال بعد یہ دوسرا باتیسرا موقع تھا کہ اس کا باپ نندراج بچے پوری ریاست کلبے تاج بادشاہ سمجھا جاتا تھا، اس سے خود ملنے آ رہا تھا اور بغیب کسی اطلاع کے۔

ہمارا رانی ان خیالوں میں گم تھی کہ نندراج سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیا۔ وارو نندراجی مل بچنا اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اس کے ساتھ بہت سی کینزوں میں بھی تھیں۔

ہمارا رانی نے جلدی سے خود کو سنبھالا اور آگے بڑھ کر نندراج کا استقبال کیا؛
”سو سو پرنام وزیر بابا، آج تو میرے محل کی قسمت جاگ اٹھی۔“ رانی نے مسکراتے کی کوشش کی۔

نندراج کے قدم رک گئے۔

اس نے پتری (پتلی) کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی؛

”سدا سہاگن رہو نندی۔“ اس نے جواب میں رسم پوری کر دی۔

نندی نے جیسے نندراج کا جواب سنا ہی نہیں۔ وہ پھر خیالوں میں گم ہو گئی تھی۔

نندراج نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر بولا؛

”کیا سوچ رہی ہو نندی۔ اندر چلنے کو نہیں کہو گی؟“

نندی شرمندہ سی ہو گئی۔ سنبھل کے بولی؛

”وزیر بابا۔ یہ آپ ہی کا گھر ہے۔ قدم بڑھائیے۔ رک کیوں گئے آپ!“ نندی نے بڑی خوبصورتی سے اپنی بوکھلاہٹ چھپائی۔

نندی کی خواب گاہ پر پہنچ کر نندراج نے کہا؛

”میرے پیچھے آنے والوں کو رخصت کر دو۔ میں تمہارے پاس پہنچ چکا ہوں۔“

نندی نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور ساری بھیڑ چھٹ گئی۔

نندراج، ہمارا رانی کی آراستہ خواب گاہ میں داخل ہوا۔ پوری خواب گاہ مختلف قسم کے خوشبوؤں سے تھک رہی تھی۔

نندی ایک چاندی کے سٹول پر بیٹھ گئی اور باپ کو چھپر کھٹ کی طرف اشارہ کیا۔

”اس پر آرام سے بیٹھیے وزیر بابا۔“

نندراج چھپر کھٹ کے کونے پر بیٹھ گیا۔

یہی بیان ان جاسوسوں کا تھا جنہیں وزیر برادران نے فوجدار گنگارام کی جاسوسی پر مقرر کیا تھا۔ انہوں نے بھی قیہیں کھا کر کہا کہ گنگارام کے پاس رانی محل کا نہ تو کوئی قاصد آیا اور نہ کبھی گنگارام نے رانی محل جانے کا ارادہ کیا۔

نندراج کی ان تحقیقات نے اسے رانی نندی کی طرف سے کسی حد تک مطمئن کر دیا اور اس کا نظروں میں سورج کبھی کی اطلاع مشکوک ہو گئی۔ پھر بھی ہمارا رانی نندی اور سبنا کا معاملہ ابھی درمیا میں تھا۔

نندراج کو سبنا اور ہمارا رانی نندی کے تعلقات پر اعتراض نہ تھا بلکہ اصل اعتراض اس پر تھا کہ نندی نے اس قدر بداحتیاطی کیوں برتی کہ بات کینزوں اور غلاموں میں پھیل گئی۔ اب اگر یہ بات رعایا تک پہنچی تو اس سے رانی محل کے ساتھ ساتھ وزیر برادران بھی بدنام ہوں گے۔ کیونکہ ایک تو نندی، نندراج کی بیٹی تھی۔ دوسرے ریاست کی پوری انتظامیہ بھی نندراج ہی کی تھی۔

کچھ روز سوچ بچار کے بعد ایک دن نندراج، رانی محل پہنچ گیا۔

پورے رانی محل میں گھبراہٹ پیدا ہو گئی اور ہر شخص سوالیہ نشان بن کے رہ گیا۔

نندراج کیوں آئے ہیں؟

کس کی شامت آنے والی ہے؟ وغیرہ وغیرہ ہزاروں سوالات پیدا ہو رہے تھے۔

رانی محل کے باسیوں کے دل میں خوف ابھر رہا تھا۔ ہمارا رانی نندی کی کئی کینزوں نے بھاگ

اسے ایک ساتھ اطلاع دی۔

”ہمارا رانی۔ نندراج تشریف لارہے ہیں۔“

ان کے چہرے سے نفہ ٹپک رہا ہے ہمارا رانی؟

بڑے جلال میں ہیں نندراج جی؟

کینزوں نے اپنے اندازے ہمارا رانی کے سامنے اگل دیے اور ہمارا رانی کی یہ کیفیت کہ وہ منہ کھولے ہکا بکا ایک ایک کو دیکھ رہی تھی جیسے اسے کچھ سمجھ نہ آ رہی ہو۔

اس کی شادی کو چار سال ہو چکے تھے اور جس دن سے وہ بیاہ کے آئی تھی بس راج محل کو بوکر رہ گئی تھی۔ سوائے ایک ادھ بار کے وہ میکے نہ گئی تھی اور نہ میکے والوں نے اس کی کوئی خبر

"ایک کام آن پڑا ہے تم سے۔" نندراج نے ایک دم بات شروع کر دی۔
 "میں آپ کے کس کام آ سکتی ہوں وزیر بابا۔ جان حاضر ہے۔ آپ حکم دیجیے۔" ندی
 نے بڑی سعادت مندی سے جواب دیا۔
 "بالاپور کے قلعہ دیونہلی کا محاصرہ ہو رہا ہے۔ ایک نئی فوج تیار ہو رہی ہے وہاں کے
 لیے۔ مضبوط جوان بھرتی کیے جا رہے ہیں اس کے لیے۔" نندراج نے رک کو ہمارانی ندی
 کا منہ دیکھا۔
 ہمارانی ندی ایک ذہین عورت تھی مگر نہ معلوم اس وقت کس الجھن میں تھی کہ نندراج کا
 اشارہ نہ سمجھ سکی۔

اس نے ذرا حیرانی سے پوچھا:
 "وزیر بابا۔ میں اس مسئلے میں کیا کر سکتی ہوں آپ کے لیے؟"
 "بھائی دیوراج کا خیال ہے کہ۔" نندراج پھر کا۔ وہ ندی سے کسی قسم کا جھگڑا نہیں
 کرنا چاہتا تھا:
 "ان کا خیال ہے کہ ہمارے محل کا داروغہ ایک لمبا چوڑا جوان ہے۔ اسے کچھ دنوں کے لیے
 لام (محاذ) پر بھیج دیا جائے۔"
 ندی کی سمجھ میں اب ساری گفتگو اور انداز گفتگو آ گیا۔ اسے غصہ تو بہت آیا مگر بے حد
 ضبط کر کے بولی:
 "آپ مالک ہیں وزیر بابا۔ جس کو چاہیں رکھیں جس کو چاہیں نکالیں۔ مجھ میں کیا طاقت کہ میں
 آپ کے حکم کو ٹالوں؟"
 ندی کا لہجہ بہت جلتا ہوا تھا۔

"یہ بات نہیں ندی!" نندراج نے بھی مصلحتاً تحمل سے کام لیا:
 "میں تمہاری مرضی کے بغیر اسے نہیں لے جاؤں گا۔ یہ ایک ملکی ضرورت ہے۔ سبنا ایک کڑیل
 جوان ہے۔ شمشیر زنی اور شمشورہ بازی بھی جانتا ہے۔ چار پانچ آدمیوں پر بھاری پڑتا ہے اسی لیے
 ہم نے یہ سوچا تھا کہ سبنا کو دیونہلی کے محاذ پر آرمایا جائے۔ اگر مفید ثابت ہو تو اس کو شرفی
 دی جائے۔ محل کا داروغہ تو بس عمر بھر داروغہ ہی رہ جاتا ہے۔"
 نندراج کا لہجہ مشفقانہ تھا اس لیے ندی نے بھی جھگڑا کرنا مناسب نہ سمجھا اور جواب میر

زی سے بولی:
 "وزیر بابا۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ سبنا کا دیونہلی جانا اس کے مستقبل کے لیے بہتر ہے تو
 پہلے آپ اس کا بدلہ میرے پاس بھیجیے۔ میں اُسے پسند کروں تو آپ اسے ملو لیجیے گا۔"
 ندی نے انکار نہیں کیا تھا اس لیے نندراج نے زیادہ زور دینا مناسب خیال نہ کیا۔
 اسی وقت ایک کیمر نے اُس کو اطلاع دی کہ کھانا لگا دیا گیا ہے۔
 ندی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے کہا:

"بابا جیلے پہلے کھانا کھا لیجیے پھر باتیں ہوں گی۔"
 نندراج کھانے کے محلے میں بہت محتاط تھا۔ اس کے سینکڑوں نہیں ہزاروں دشمن
 تھے۔ وہ کسی دی ہوئی چیز چکھتا بھی نہ تھا مگر ندی نے کچھ ایسے خلوص اور پیار سے کہا کہ اسے
 اپنی قسم توڑنا پڑی۔

وہ ندی کے ساتھ کھانے کے کمرے میں چلا گیا۔
 اس نے کھانا شروع کیا تو بے ساختہ اسے ندی کی ماں یعنی اپنی بیوی کا خیال آ گیا۔ وہ اسی
 قسم کے کھانے کا قافی تھی۔
 اس خیال کے آتے ہی نندراج کے سخت دل میں ندی کے لیے ایک اور نرم گوشہ پیدا
 ہو گیا۔

نندراج کھانے سے فارغ ہوا اور بغیر کچھ اور گفتگو کیے وہاں سے روانہ ہو گیا۔ حالانکہ
 ندی نے اسے تھوڑی دیر اور بٹھانے کی جگہ کو نشتر کی۔



اس واقعہ کو چھ ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا۔
 بات آگئی ہو گئی۔ نہ نندراج نے رانی محل میں کوئی دوسرا آدمی بھیجا اور نہ رانی ندی نے سبنا کو
 محل سے ہٹایا۔

اس دوران نندراج اور ہمارانی ندی میں کوئی ملاقات نہ ہوئی۔ نندراج کو اپنے ریاستی بھائیوں
 سے ہی چھٹی نہ ملتی تھی کہ وہ کسی اور طرف دیکھتا۔
 اور۔۔۔ ہمارانی ندی اپنے رنگ میں گمن مٹی!

پھر اس دن شیش زنی کے مقابلہ میں اتفاقیہ نند راج اور دیوراج اور نندی اور راجہ کرن اڈ
سب آمنے سامنے ہو گئے تھے۔ رانی نے اسپٹج کے اوپر سے پیچ کر حکم دیا تھا کہ شیش زنی کا
ختم کر دیا جائے اور اس آواز پر نند راج اور دیوراج دونوں ہی اسپٹج کے اوپر یہ معلوم کرے۔
گئے تھے کہ آخر ہمارا مقابلہ کیوں بند کر رہی تھی۔

یہ ایک مختصر ملاقات یا محض آسمان سامنا تھا یا پھر اس کے بعد اچانک رانی نندی کا یہ فوراً
بلاوا تھا۔

رانی کا بیغام لانے والی مورچ کبھی تھی جس کی مشاطہ چالوں کی ایک جھلک ابھی دکھائی گئی
ہے۔ مورچ کبھی گوکہ نند راج کی جاسوس تھی لیکن اس نے سبنا اور فوجدار گنگا رام کے گٹھ جوڑ کے
بارے میں جو کچھ اطلاع دی تھی وہ سچ ثابت نہیں ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے نند راج نے اب اس سے
کوئی سوال نہ کیا تھا اور یہ کہہ کر اسے واپس بھیج دیا تھا کہ وہ رانی کے پاس تھوڑی دیر میں پہنچ
رہا ہے۔

نند راج نے احتیاط کے طور پر دیوراج کو اپنے رانی عمل جانے کی اطلاع کرا دی تھی اور اس
تاکید کے ساتھ کہ اگر اسے رانی محل میں زیادہ دیر ہو جائے تو وہ دریافت حال کے لیے وہاں پہنچے۔
ان دونوں بھائیوں نے آپس میں طے کر رکھا تھا کہ جب دو میں سے کوئی ایک تنہا نہیں جائے تو
دوسرا اس کا خیال رکھے۔

نند راج کا رانی محل پر پُر جوش استقبال ہوا۔ رانی نندی اپنی تمام کینزوں کے ساتھ محل کے
صدر دروازے پر اس کی منتظر تھی۔

نند راج پہنچا تو رانی نے اسے بڑے ادب سے جھک کر پر نام کیا۔ پھر اس کے پیچھونے
کے لیے جھکی۔

ہندو مذہب اور مذہب میں کسی کے پیچھونے کا مطلب ہوتا ہے کہ پیچھونے والا
اس کی بزرگی اور عظمت کا دل سے معتر ہے۔

شادی کے بعد یہ پہلا اتفاق تھا کہ رانی نندی نے باپ کے پیچھونے کی کوشش کی مگر
نند راج نے اسے پیروں کی طرف جھکنے دیکھ کے فوراً اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔

”یہ کیا کر رہی ہو؟“

نند راج نے اسے ٹوکا:

”یہ ٹھیک ہے کہ میں تمہارا باپ ہوں لیکن تم اس ریاست کی ہمارا بیو ہو اور میں اس ریاست
کا ادنیٰ خادم۔“

نند راج نے اسے پیچھونے سے تو روک دیا مگر وہ سخت پریشان تھا کہ ہمارا بیو آج اس پر
مقدر مہربان کیوں ہے۔ اس میں ضرور کوئی راز ہے۔

”کیا ہمارا بیو ہونے سے بیٹی اور باپ کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے؟“ نندی نے بڑے
لڑپن سے کہا۔

نند راج خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ نندی کے الفاظ اسے کانوں میں سرسراتے ہوئے عیسوی
ہوئے۔ اس نے خود کو سنبھالا اور مسکرایا:

”یہ تمہاری تابعداری ہے نندی۔ ورنہ رانی ہمارا بیو تو ایسٹور کو بھی بھول جاتی ہیں۔“

نند راج نے سر جھکا کر ”بچے کی طرف دیکھا تو اسے سبنا کہیں نظر نہ آیا۔ حالانکہ چھ ماہ پہلے
کی ملاقات میں وہ نند راج کے پیچھے پیچھے ہمارا بیو کی خواب گاہ تک گیا تھا۔

”آج سبنا نظر نہیں آ رہا۔ کیا بات ہے؟“ نند راج کی زبان سے اک دم نکلا۔ حالانکہ سبنا کی
وجودگی یا غیر موجودگی سے اس پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔

”وہ ہل گیا ہے وزیر بابا۔“ نندی نے مختصر جواب دیا کیونکہ وہ دونوں خواب گاہ کے
دروازے پر پہنچ گئے تھے۔

ہمارا بیو نندی نے باپ کو پھر پھر کھٹ پر بٹھایا اور اس کے سامنے چاندی کی کرسی پر بیٹھ گئی۔
سینزوں نے فوراً سامنے پڑی ہوئی میز پر خشک میوؤں سے بھری گنگا جمنی تھالیاں سجا دیں۔

نندی نے ایک تھالی باپ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

”وزیر بابا۔ آپ آج کچھ نکر مند معلوم ہوتے ہیں؟“

نند راج کھسکا نا سا ہو گیا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

نند راج واقعی نکر مند ہو گیا تھا۔ نندی کا اک دم اسے بلانا سبنا کے متعلق اس کے بدلے ہوئے
نیالالت۔ پچھلی مرتبہ اس نے سبنا کو اپنے محل میں روکنے کی فہم کی تھی مگر آج وہ اس سے میرا نظر آ
ہی تھی۔ نند راج کے لیے یہ فکر ہی کی بات تھی۔ اس نے سنبھل کر بات بنائی:

رانی تم نے ٹھیک اندازہ لگایا۔ میں فکر مند ہوں اور مجھے فکر مند رہنا پڑتا ہے۔ اتنی بڑی ریاست سارے انتظامات مجھے اور دیوراج، ہی کو تو کرنا پڑتے ہیں۔ تم بھی تو کبھی کبھی اپنے عمل کی باتوں سے فکر مند ہو جاتی ہو۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟

”جی جی۔ ٹھیک کہہ رہے ہیں وزیر بابا۔“ رانی کو اعتراف کرنا پڑا۔

”ارے ہاں۔“

نندراج کو جسے کچھ یاد آگیا؛
”تم کہہ رہی تھیں کہ سبنا کچھ ہنگ گیا ہے۔“
”جی ہاں وزیر بابا۔“

رانی نے ٹھہرے ہوئے لمحے میں کہا؛
”وہ دراصل میری کمینروں کو پریشان کرنے لگا ہے۔ رانی محل کا داروغہ ہے ناں“ اس لیے اس کا دامغ چل گیا ہے۔ اپنے کو راجہ سمجھنے لگا ہے۔“

”یہ تمہاری ڈھیل کا نتیجہ ہے رانی۔“
نندراج نے پیار سے کہا؛

”ان چھوٹے لوگوں کو سر پر نہ چڑھانا چاہیے۔ یہ تو اپنی جگہ پر ہی ٹھیک رہتے ہیں۔ کہو تو میں اسے تبدیل کر دوں۔“
”ہاں وزیر بابا۔ میں بھی جی چاہتی ہوں۔“ رانی نے اپنا عندیہ ظاہر کر دیا۔
نندراج نے غور سے رانی کو دیکھا؛

”سبنا کو تمہارے عمل سے بدل دیا جائے یا اس کی دنیا ہی بدل دی جائے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟“
”یہ آپ کی مرضی ہے وزیر بابا۔ آپ جو مناسب سمجھیں وہ کریں۔“ رانی نے بات کو ختم کرنے کے لیے کہا۔

”خیر۔ یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں۔ جیسا تم جی چاہتی ہو وہ ہو جائے گا۔“ نندراج نے لاپرواہی سے کہا؛
”ہاں اب تاؤ تم نے مجھے کیوں بلوایا ہے؟“
”اسی مسئلے کے لیے بلوایا تھا وزیر بابا۔“
اور۔۔۔ رانی، نندراج کا منہ دیکھنے لگی۔

”ارے واہ۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی!“
نندراج اٹھ کے کھڑا ہو گیا؛
”رانی بیٹی! تم نے اتنی سی بات کا ہتنگڑ بنا دیا۔ تم نے کسی کمینر کے ذریعے کھلوادیا ہوتا۔ میں اسی وقت اس کا لے دیو کو گرفتار کر کے بلوایتا۔ اچھا اب اجازت دو۔ دیوراج میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

”اتنی جلدی بھی کیا ہے وزیر بابا۔ ذرا دیر بیٹھے ناں۔“
رانی نے ہاتھ پکڑ کے باپ کو بٹھادیا؛
”مجھے ایک بات اور بھی کرنی ہے۔“
”تو کہو نا۔ انتظار کس بات کا ہے۔“

”میں۔۔۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کی جگہ کسی معقول آدمی کو بیجا جائے۔“ رانی مندی نے ٹھٹھکے کہا۔

”کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔“
نندراج نے سر ہلایا؛

”رانی بیٹی تمہیں اس سے زیادہ ذمے دار آدمی دیا جائے گا۔“
”آپ کی نظر میں کوئی ایسا آدمی ہے وزیر بابا۔ اس نے باپ سے سوال کیا۔“
”ابھی۔۔۔ ابھی تو نہیں۔ تم نے کہہ دیا ہے تو ہم دونوں اب اس مسئلہ پر غور کریں گے۔ اور کسی ایسے آدمی کو اس جگہ لگائیں گے جسے تم ضرور پسند کرو گی۔“ نندراج نے جان چڑھانے کے لیے کہا۔
”اگر آپ مجھے کچھ اہمیت دیتے ہوں تو میرے ذہن میں دو ایک نام آئیں۔“ رانی کے لیے میں دبا دبا سا طنز تھا۔

”تم ہمارا ہی ہونہی بیٹی!“
نندراج زور دے کر بولا؛
”راجہ کرشن اور ڈیر کے بعد اس ریاست کی سب سے اہم شخصیت تم ہی تو ہو۔“
”تو آپ یوں کیجیے وزیر بابا۔“
نند نے رک کر باپ کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں؛

"میں سمجھ نہیں سکی وزیر بابا۔"

رانی الجھتے ہوئے بولی:

"آخر وہ سرنگا پٹم میں کیوں نہیں رہ سکتے۔ کوئی جمہوری انہیں شہر چھوڑنے پر مجبور

رہ رہی ہے؟"

"جمہوری یہ ہے میری رانی کہ وہ دونوں میسوری لشکر کے ساتھ بالا پور کے قلعہ دیون

پر حملہ کے لیے جا رہے ہیں۔" نندراج نے آخر رانی پر حملہ کر ہی دیا۔

مگر اس حملہ کی تجھے یا مہاراج کرکشن اوڈیر کو تو کوئی خبر نہیں! رانی نے بھی پہلو

بل کر جوابی وار کیا۔

نندراج اور دیوراج نے راجہ کو تو سن شعور تک پہنچتے ہی قابو کر لیا تھا۔ ایک نواس

ن شادی اپنی بیٹی نندی سے کر دی تھی۔ دوسرے اسے رقص و موسیقی کا اس قدر شوقین

ادبیت تھا کہ اس شوق کے لیے اکثر وہ کھانا، کھانا ہی بھول جایا کرتا تھا۔

نندراج نے راجہ کے ذہن میں یہ چیز بٹھادی تھی کہ ریاست میسور میں جو کچھ ہوتا

ہے وہ اسی کے حکم سے اور اس کی بھلائی کے لیے کیا جاتا ہے۔ ان دونوں بھائیوں نے راجہ کو

حق ضرور دیا تھا کہ وہ ریاست کے کسی معاملہ کے بارے میں جب چاہے تحقیقات کر

لتا ہے مگر راجہ کو کیا پڑی تھی کہ وہ رقص میں لگدش کر فی سڈول ٹانگوں اور جسم کے دوسرے

نصا کو تھرتھرتے دیکھنے کے بجائے کاروبار سیاست کے خشک کام میں مغلز کھپائی کرتا۔

پس —

نندراج نے راجہ اور اموی سلطنت کے اس ردایتی اصول کے تحت، رانی نندی کو ایسا جواب

یا جس نے رانی کا منہ پھیر دیا۔

نندراج پھر کھڑا ہو گیا اور پُر رعب لہجے میں بولا:

"ہمارا فی نندی۔ ہم میں اور راجہ کرکشن اوڈیر میں یہ طے پایا تھا کہ ہم ریاستی معاملات کو

راجہ کے کانوں تک اس وقت تک نہ پہنچائیں جب تک کہ وہ خود اس امر کی خواہش ظاہر

ن کریں۔"

نندراج کا سخت جواب مکمل تھا مگر اس نے اپنے جواب کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

"یہ بھی سن لو ہمارا فی نندی! ہم میں اور راجہ میں یہ طے ہوا تھا کہ اگر انہوں نے ہمارے

اپ شہباز خاں اور حیدر علی، ان دونوں جوانوں کو میرے محل کا داروغہ بنا دیجیے۔ یہ میرا

حکم نہیں بلکہ درخواست ہے بابا!"

نندراج کا دماغ گھوم گیا۔

اسے اب معلوم ہوا کہ ہمارا رانی نے اسے اچانک کیوں بلوایا ہے۔ وہ ہمارا رانی کے اس مطالبہ

کے معنرات کو فوراً ہی بجا پ گیا تھا۔

شہباز اور حیدر علی ابھرتے ہوئے شمشیر زن اور شمسوار تھے۔ نندراج نے ان کے مقابلے

میں کامیاب ہونے کے ساتھ ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ان دونوں جوانوں کو مراعات اور احسانات

کے ذریعے پوری طرح اپنے قابو میں رکھا جائے کیونکہ ان دونوں کی اٹھان بتا رہی تھی کہ یہ جوان

ایک دن سرنگا پٹم کے افق پر آفتاب بن کے چلیں گے۔

نندراج کو خاموش دیکھ کر ہمارا رانی نے اپنی بات دہرائی:

"وزیر بابا۔ کیا آپ کو مجھ سے اتنی بھی محبت نہیں کہ آپ میری یہ درخواست قبول فرمائیں۔"

"یہ بات نہیں ہے نندی!"

نندراج نے اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے کہا:

"میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ ان دونوں جوانوں کے مستقبل کا فیصلہ ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ اب

اس فیصلے کو کیسے بدلا جاسکتا ہے؟"

"آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے ان کے لیے؟" رانی نے فوراً سوال کیا۔

"ہم دونوں بھائیوں نے فیصلہ کیا ہے۔"

نندراج نے فوراً جواب دیا:

"شہباز کو ایک ہزار پیادوں اور پانچ سو سواروں کا رسالدار اور حیدر علی کو، جو اچھی بہت کسرت

ایک سو سواروں کے دستہ کا سردار بنا دیا جائے۔"

"مگر وزیر بابا۔ رانی محل کا داروغہ ہونے سے ان کی ترقی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ رانی

نے بیچ ہی میں دخل دیا:

"میں اپنے محافظ دستے کو بھی اپنے داروغہ کے حوالے کر دوں گی۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" نندراج پہلو بدل کر بولا:

"مگر یہ سب کچھ تو اسی وقت ممکن تھا، جب شہباز اور حیدر علی سرنگا پٹم میں رہ سکتے۔"

ہر کام کی تحقیقات شروع کر دیں تو ہم ہرگز انکار نہ کریں گے لیکن یہی اختیار ہو گا کہ ہم ہمارے کرشن اور دیگر مقرر کردہ رقم کے علاوہ ایک پائی زائد نہ دیں گے اور وہ کسی اضافی رقم کا ہم سے مطالبہ نہ کریں گے۔

نندراج کی اس وضاحت نے ہمارے اندر کو عقل ٹھکانے کر دی۔ رانی نے اپنے باپ اور بچے سے زبانی یہ وعدہ یا معاہدہ کیا تھا کہ وہ اپنے رانی محل کے لیے ایک مقررہ رقم حاصل کیا کرے گی مگر اس نے اپنے اخراجات اس قدر وسیع کر لیے تھے کہ اسے مقررہ رقم جو ملتی تھی وہ آدھے مہینے ہی میں ختم ہو جاتی تھی اور اسے اپنے وزیر بابل سے ہمراہ اضافی رقم کی درخواست کرنا پڑتی تھی۔

وہ سمجھ گئی کہ نندراج نے ہمارے کرشن اور دیگر بات رکھ کر دراصل خود رانی کے کان کھولے ہیں۔

ہمارے اندر مزید کوئی بات نندراج سے نہ کر سکی۔ چالاک وزیر نے ہمارے کرشن کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے بہت سی دعائیں دیں اور چلتے چلتے یہ کہہ گیا کہ:

”نندی بیٹی! میں محسوس کرتا ہوں کہ تمہارا مقررہ رقم میں گوارا نہیں ہوتا۔ میں بھائی دیوراج سے بات کر کے اس رقم کو دو گنا کر دوں گا۔“

اور اب تو ہمارے اندر کی زبان بے عرصے کے لیے بند ہو گئی تھی۔

دیون بلی پر حملہ کا ذکر کر کے نندراج نے رانی کو لاجواب کر دیا تھا۔ یہ بات کچھ زیادہ غلط بھی نہ تھی۔

دیون بلی کا قلعہ ڈوڈ بالا پور کے حاکم عباس قلی خاں کے ماتحت تھا مگر سرنگاپٹم نے بھی اس قلعہ کا دعویٰ کر رکھا تھا۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ ریاست میسور کا رقبہ پہلے ہزاروں میل پر مشتمل تھا لیکن اب یہ ریاست سٹٹسٹا کے سرنگاپٹم کے صرف ۳۳ گاؤں تک محدود ہو چکی تھی۔ ہر گاؤں کا ایک پالیگا یعنی جاگیردار ہوتا تھا جو اپنی آمدنی سے ایک حصہ راجہ میسور کو بطور خراج دیا کرتا تھا۔ پورے جنوبی ہند میں ایسے ہی پالیگار ہوتے تھے جو اپنے مرکز یعنی راجہ کو کمزور دیکھتے تو فوراً آزادی کا اعلان کر دیتے تھے اور جب ان پر کوئی بڑی طاقت حملہ آور ہوتی تو وہ باجگزار ہو جاتے تھے۔

میسور کی ریاست روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی یہاں راجہ موجود ہونے کے باوجود اقتدار

وزیروں کے ہاتھ میں تھا اور وزیروں کی مصلحت یہ ہوتی کہ وہ قرب و جوار کی تمام بڑی طاقتوں کو خراج دیتے تھے۔ پنا پنج میسور ایک طرف تو نظام الملک کو خراج دیتا اور دوسری طرف مرہٹوں کو بھی خوش کرنے کے لیے انہیں ایک معقول رقم بطور خراج پیش کرتا تھا۔

نندراج اور دیوراج کو ریاست کو مدد دینے یا اپنی گردن بچھڑانے کی فکر نہ تھی۔ وہ تو بس یہ چاہتے تھے کہ ریاست کا کاروبار اسی طرح چلتا رہے اور وہ اپنی من مانی کرتے رہیں۔ لیکن۔

شہباز اور حیدر علی نے شہسواروں اور شمشیر زنی کے مقابلوں میں جس ہمارے کا ثبوت دیا تھا، اس نے دونوں بھائیوں کے ذہن میں یہ بات ڈالی تھی کہ اگر کوکشی کی جاسے تو شہباز اور حیدر علی کے سے بہادر جوانوں کے ذریعے ریاست میسور کے وہ علاقے واپس لیے جاسکتے ہیں جو میسور کی کمزوری سے خاندانہ اٹھا کر باقوت آزاد ہو گئے تھے یا ان پر مرہٹوں اور دوسری بڑی طاقتوں نے قبضہ کر لیا تھا۔

اس خیال کے آتے ہی نندراج نے بالا پور کے قلعہ دیون بلی پر قبضہ کی بات سوچی تھی پھر یہ بات اس وقت اور پکی ہو گئی جب رانی نندی نے اپنے محل کے داروغہ بنانے کے لیے شہباز اور حیدر علی کو مانگا تھا۔

نندراج نے رانی نندی کے پاس سے واپس آتے ہی اس سلسلے میں دیوراج سے بات کی۔

”کیوں دیوراج! قلعہ دیون بلی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”ارے خاکہ ڈال دیون بلی پر۔“

دیوراج نے الجھتے ہوئے کہا:

”پہلے رانی محل کی بات سناؤ۔ کیوں بلایا تھا اس نے؟“

”ارے دیوراج۔ رانی محل کی بات ہی سے تو قلعہ دیون بلی کی بات نکلتی ہے۔“ نندراج نے ہنستے ہوئے کہا:

”رانی محل کی رانی مجھ سے شہباز اور حیدر علی کو مانگ رہی تھی۔ دیکھو تو بھلا۔ سے نایہ پالکین۔ دیوراج گھبرا گیا:

”کیوں۔ کیوں۔ وہ شہباز اور حیدر علی کو کیوں ہانگ رہی تھی۔ کیا کوئی نئی چال چلے گی وہ۔“
”معلوم تو مجھے بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔“

نندراج نے جواب دیا:

”مگر میں نے بھی اسے ایسا جواب دیا کہ اس کا منہ بند ہو کر رہ گیا۔“

”اچھا۔ بھلا کیا جواب دیا تم نے؟“ دیوراج نے دلچسپی سے پوچھا۔

”میں نے کہا کہ نندراج اور دیوراج نے تو انہیں دیون ہلی کے قلعے پر حملے کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ وہ دونوں میسور کا پرچم اس قلعے پر لہرائیں گے۔“

”مگر وہ قلعہ عباس قلی خاں کے علاقے میں ہے۔“

دیوراج نے اسے بتایا:

”اس سے بھگڑا مول لینا مناسب نہیں۔“

”تم نیبیر تھو گے یہ بات دیوراج۔“ نندراج نے کہا:

”میں بتاتا ہوں تمہیں۔ دس سال پہلے شہباز اور حیدر علی کو عباس قلی خاں نے نقاروں کے اندر بند کر دیا تھا اور حیدر صاحب کلاں نے اٹھارہ ہزار کی رقم ادا کر کے انہیں عباس قلی خاں سے چھڑایا تھا۔“

اس حلقہ میں شہباز اور حیدر علی، عباس قلی خاں سے اپنی اور اپنی ماں کی بے عزتی کا بدلہ لیں گے تم دیکھنا تو ذرا۔ یہ بچے عباس قلی خاں کے لشکر کا منہ پھیر کے رکھ دیں گے۔“

دیون ہلی پر حملہ کی تیاریاں بہت زور شور پر تھیں۔ نندراج نے تلواروں کو صیقل کرنے کا حکم دیا تھا۔ کئی سوئے گھوڑے خریدے گئے تھے۔ سپاہیوں اور سواروں کی نئی بھرتی بھی جلدی طور پر کی گئی تھی۔

ان تیاریوں کو سب سے پہلے حیدر علی نے محسوس کیا۔ پھر ایک دن جب حیدر صاحب کلاں اس کے گھر آئے ہوئے تھے تو حیدر علی نے ماں اور بڑے بھائی شہباز کے سامنے اس کا ذکر چھیڑا۔ حیدر بھائی، آجکل شکر زور شور سے تیار ہو رہا ہے۔ حیدر علی نے اپنے محسن اور مرنی بھائی

کو اطلاع دی۔

”اچھا۔ تم نے کیسے محسوس کیا؟“ حیدر صاحب نے تعجب سے پوچھا۔

”میں اور شہباز بھائی آجکل بیرکوں ہی میں رہتے ہیں۔“

حیدر علی نے بتایا:

”نئی بھرتی شروع ہے۔ بہت سے گھوڑے خریدے گئے ہیں اور پرانے گھوڑوں کی نعل بندی بھی ہوئی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ نندراج کسی سے جنگ بھیڑنا چاہتے ہیں۔“ حیدر صاحب نے خیال ظاہر کیا۔

حیدر صاحب تھے تو نندراج ہی کے ملازم گمران پر بہت سی انتظامی ذمہ داریاں بھی تھیں اور انہیں فوجی بیرکوں میں جانے کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ فن سپہ گری سے دُور ہو گئے تھے۔ اُس دور میں مسلمان یوں بھی ۲۴ گھنٹے کر کے فوجی خدمت کے لیے تیار رہتے تھے۔ پھر حیدر صاحب کا تو پورا خاندان ہی کسی نہ کسی راجہ یا صوبیدار کی فوج میں کسی عہدے پر تھا۔ حیدر بھائی، میرا توخیل ہے کہ آجکل ہی میں جنگ ہونے والی ہے، حیدر علی نے اپنی بات پر زور دے کر کہا:

”وزیر نندراج نے تو تلواروں کو صیقل کرنے کا بھی حکم دیدیا ہے۔“

حیدر علی اور شہباز کی ماں عجیدہ بیگم اگرچہ زیادہ عمر میں بیوہ نہیں ہوئی تھیں لیکن زمانے کے گرم و سرد نے ان کے سر کے بال تقریباً پھوٹ کر دیے تھے۔ وہ بڑی خاموشی سے رطلوں کی گفتگو سن رہی تھیں۔ مگر جب حیدر علی نے زور دے کر کہا کہ نندراج نے تلواروں کو صیقل کرنے کا حکم دے دیا ہے تو انہیں بھی یقین آگیا کہ جنگ واقعی قریب ہے۔ ان کے شوہر فتح محمد بھی ہر جنگ سے پہلے اپنی تلوار کو صیقل کرتے تھے۔

چنانچہ عجیدہ بیگم نے دخل دیتے ہوئے کہا:

”حیدر بیٹے، کیا تمہیں بھی یقین ہے کہ کوئی جنگ ہونے والی ہے؟“

”ہاں، چچی جان!“

حیدر صاحب نے حیدر علی کی بات سے اتفاق کیا:

”حیدر علی کہہ رہا ہے ماں کہ نندراج نے تلواریں صیقل کرنے کا حکم دیا ہے۔ ایسا حکم تو من جنگ

”جی ہماراج۔ کیا یہ جانثاروں کو نظر انداز کرنے والی بات نہیں ہے؟“ حیدر صاحب نے بھرپور انداز میں شکوہ کیا۔

”اچھا تو پھر ہم تمہارا شکوہ ابھی دور کیے دیتے ہیں۔“

نندراج اسی خوش دلی سے بولا:

”یہ جنگ جس کی تیاریاں ہو رہی ہیں مددہ تمہاری جنگ ہے۔ اس جنگ کے دلدھاتم ہواؤ تمہارے دونوں بھائی شہباز اور حیدر علی اس بارات کے شبہ بالا ہوں گے۔ کچھ سمجھ میں آیا کہ نہیں؟“ حیدر صاحب کا دل خوش ہو گیا:

”ہماراج۔ یہ آپ لوگوں کی عنایت ہے جو ہم بھائیوں کو اتنی عزت دیتے ہیں آپ دیکھیں گے انشاء اللہ میں اس جنگ میں جان کی بازی لگا دوں گا۔“ ہمیں ایسی ہی امید ہے حیدر صاحب۔“

نندراج نے اس کی تعریف کی:

”پھر یہ تمہاری اور تمہارے بھائیوں کی جنگ ہے۔ حیدر صاحب ایک بات یاد رکھو۔ جنگ کا طریقہ یہ ہے کہ اگر دشمن زبردست ہو اور شکست کا امکان ہو تو فوراً مصالحت کی گفتگو کرو مگر اس کی دشمنی دگرہ میں باندھ لو۔ پھر جب تمہیں طاقت حاصل ہو یا پھر دشمن کمزور ہو جائے تو اس سے فوراً لے لو۔“

”آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا ہماراج۔“

حیدر صاحب نے نندراج کی تائید کی:

”تمہارے ایک بزرگ شیخ معدی گور سے ہیں۔ انہوں نے آپ کی اس بات کو ایک حکایت میں بیان کیا ہے۔ آپ کے یہ کہتے ہی مجھے وہ کہانی یاد آگئی۔“

”اچھا۔ تمہارے بزرگ نے بھی یہی بات کہی تھی۔“

نندراج نے پتہ نہیں اپنی معلومات میں اضافے کے لیے یا پھر اسے بھٹکانے کے لیے پوچھ لیا اور کہا:

حیدر صاحب۔ ذرا وہ کہانی ہمیں بھی تو سناؤ۔“

”اب سے سو ڈیڑھ سو سال پہلے برصغیر کے مسلم گھراؤں میں بچے اور بچیوں کی تعلیم کا آغاز ہی

ہی کے موقع پر دیا جاتا ہے۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ آپ کے دونوں بیٹے انشاء اللہ میدان جنگ میں بھی بہادری کے جھنڈے گاڑیں گے۔“

مجیدہ بیگم نے ٹھنڈی سانس لی:

”خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔ سپاہی اور سپاہی زادے میدان جنگ ہی میں اچھے معلوم ہوتے ہیں۔“

حیدر صاحب بہت دنوں بعد چچی سے ملنے آئے تھے اور ان کا ارادہ شام تک ٹھہرنے کا تھا مگر حیدر علی نے جنگ کی خبر دے کر ان میں بے چینی پیدا کر دی تھی۔

دراصل انہیں شہباز اور حیدر علی سے شدید محبت ہو گئی تھی۔ ایک تو وہ ان کے چچا زاد بھائی تھے۔ دوسرے انہوں نے شہسواری اور شمشیر زنی میں نام پیدا کیا تھا جس سے حیدر صاحب کا سر فخر سے بلند ہو گیا تھا۔ وہ جس عقل میں جلتے وہاں حیدر علی اور شہباز کا ذکر پھڑپھڑاتا تھا اور اہل عقل ان سے حیدر علی اور شہباز کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ حیدر صاحب کلاں نے اپنی گفتگو مختصر کی اور ان سے رخصت ہو کے سیدھے وزیر بردارن کے محل میں پہنچے۔

وزیر بردارن پہلے ہی حیدر صاحب کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔ پھر جب سے ان کے بھائیوں نے مقابلہ کا میدان جیتا تھا، اس وقت سے وزیر بردارن کی نظروں میں حیدر صاحب کلاں کی قدر و منزلت میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔

نندراج ہمان خانے میں اکیلے ہی تھا۔ اس نے حیدر صاحب کلاں کو خوش آمدید کہا۔ حیدر صاحب سلام کر کے خاموش بیٹھ گئے۔

نندراج نے انہیں خاموش دیکھا تو ہنس کے کہا:

”کیا بات ہے حیدر صاحب۔ تم آج خاموش کیوں ہو؟“

”ہماراج! حیدر صاحب نے مجھے مجھے دل سے کہا:

”آپ جیسے جیسے جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں مگر آپ کے اپنے پرانے ٹک خواروں کو خبر تک نہ ہوئی۔ کیا آپ مجھے اس قابل نہیں سمجھتے؟“

نندراج قہقہہ مار کر ہنس پڑا:

”تو تم اس لیے خاموش خاموش ہو!“

بوڑھے کو اپنی بے بسی پر رونا آگیا مگر اس نے اس پتھر کو جو شہر کو توال نے اس پر کھینچ مارا تھا، سنبھال کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

کہتے ہیں کہ کچھ ہی دن بعد خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اسی کو توال پر بادشاہ کا عتاب نازل ہوا اور اسے گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیا گیا۔

اس مظلوم بوڑھے کو شہر کو توال کے قید خانہ میں جانے کا حال معلوم ہوا تو فوراً قید خانہ پہنچا اور واروغہ زندان سے اجازت حاصل کر کے شہر کو توال سے ملنے کو پہنچا۔

بوڑھے نے دیکھا کہ شہر کو توال ایک کوٹھڑی میں قید ہے۔ کوٹھڑی میں باہر کی طرف دروازے کی جگہ لوہے کا کھڑا لگا تھا۔

اس وقت شہر کو توال سر جھکاٹے اپنے خیالوں میں گم تھا۔ اس کی ہنٹھ کھڑے کی طرف تھی۔

مظلوم بوڑھے نے جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ پتھر نکالا جو شہر کو توال نے اس پر کھینچ مارا تھا۔ پس بوڑھے نے شہر کو توال کا نشانہ لے کر وہ پتھر اتنے ہی زور سے اس پر کھینچ مارا جتنے زور سے شہر کو توال نے اسے مارا تھا۔

شہر کو توال کی پیٹھ پر پتھر لگا تو وہ بلبلا کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو بوڑھا کھڑے کے باہر کھڑا اُسے گھور رہا تھا۔ شہر کو توال کھڑے کے پاس آیا اور بوڑھے کو دھکے سے لٹکا دیا۔

اُسے نیک بخت! میں تو قید خانے میں پڑا اپنے کیسے کیسے مزا پارہا ہوں بیرو نے تیرا کیا بگاڑا تھا کہ تو نے پتھر جو پر کھینچ مارا؟

بوڑھے نے کڑک کر جواب دیا:

اُسے شہر کو توال! اس پتھر کو اٹھا کر غور سے دیکھ۔ یہ وہی پتھر ہے جو تو نے ایک بچے سے لے کر مجھے مارا تھا۔ مگر اس وقت تو شہر کو توال تھا، میں تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ پس میں نے یہ پتھر اٹھا کر سنبھال لیا تھا کہ جب مجھے موقع ملے گا تو میں یہ پتھر تجھے مار کر اپنا بدلہ لے لوں گا۔

حیدر صاحب کی زبان سے حسب حال کہانی سن کر وزیر فندراج بہت خوش ہوا اور اس

شیخ سعدی کی دو کتابوں گلستان اور بوستان سے کیا جاتا تھا۔ فارسی زبان کی یہ دو کتابیں آج تک اپنی افادیت اور علم اخلاق کے سلسلے میں تروتازہ ہیں۔

حیدر صاحب نے گلستان اپنے بچپن میں پڑھی تھی۔ اس وقت فندراج کی بصیرت پر انہی شیخ سعدی کی وہ حکایت یاد آگئی جس میں اسی قسم کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔

حیدر صاحب نے فندراج کے اصرار پر سعدی کی وہ حکایت بیان کرنا شروع کی:

”فندراج! وہ کہانی کچھ اس طرح ہے کہ کسی زمانے میں ایک بادشاہ کے ایک شہر کا شہر کو توال بہت ظالم تھا۔ وہ اچھے بھلے آدمیوں پر ظلم توڑتا تھا۔ اس شہر میں ایک غریب بوڑھا رہتا تھا۔ وہ نیم پاگل سا تھا۔ جب وہ باہر نکلتا تو محلے کے بچے اسے پتھر اور روڑے سے مارتے تھے۔

ایک دن شہر کو توال اس بوڑھے کے پاس سے گھوڑے پر سوار گزرا۔ بوڑھے پر بچے پتھر برسار رہے تھے۔ شہر کو توال گھوڑا روک کر کھڑا ہو گیا اور بوڑھے کا یہ حال دیکھ کر ہنسنے لگا۔

بوڑھے کو شہر کو توال پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے کہا:

”تو شہر کو توال ہے۔ بجائے اس کے کہ ان بچوں کو پتھر مارنے سے روکے تو خود بھی میرے حال زار کا تسخیر اڑا ہے!“

شہر کو توال نے ہنستے ہوئے ایک بچے کو اپنے پاس بلایا اور اس کے ہاتھ میں بوڑھے کو مارنے کے لیے جو پتھر تھا وہ لے لیا۔ پھر بوڑھے کو مخاطب کیا:

”اب کہہ تو کیا چاہتا ہے؟“

بوڑھا سمجھا کہ شہر کو توال میری ہمدردی کر رہا ہے۔ اس نے اپنی بات دہرائی:

”اے نیک دل شہر کو توال! تو ان بچوں کو منع کر کہ یہ مجھے پتھر نہ ماریں۔“

بوڑھے کی بات ختم ہوتے ہی شہر کو توال نے وہ پتھر جو اس نے لڑکے سے لیا تھا

اس بوڑھے کو کھینچ کر مارا اور کہا:

”اے بوڑھے تو ان بچوں کے لیے ایک تماشہ ہے اور میں اس تماشے کو ختم نہ

کر سکتا۔“

یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کو ایڑی اور گالے بٹھ گیا۔

نے ان سے کہا:

”یہ جنگ ڈوڈبلاپور کے ماتحت قلعہ دیون ہلی کی ہے جس کے لیے ہم نے اس قدر تیاری کی ہے۔ ڈوڈبلاپور کا حاکم وہی ظالم عباس قلی خاں ہے جس نے اپنی کیمنی خصلت سے مجبور ہو کر شہباز اور حیدر علی کو نفاذ میں بند کر کے ان کی جان لینے کی کوشش کی تھی اور اگر تم اٹھارہ ہزار کی رقم شہباز خاں کو نہ پہنچاتے تو آج یہ دونوں ہو نہا ز زندہ نہ ہوتے۔ بس تم یہ سمجھو کہ کافی کا ظالم شکر کو توال بلاپور کا حاکم عباس قلی خاں ہے اور وہ مظلوم بوڑھا تمہارے دونوں بھائی شہباز اور حیدر علی پر جنہیں عباس قلی خاں نے نفاذ میں بند کر کے مارنے کی کوشش کی تھی اب اگرچہ عباس قلی خاں اس وقت بھی طاقت ور ہے لیکن بھگوان نے تم تینوں کو ایک موقع دیا ہے کہ تم اپنے پرانے دشمن سے بھرپور بدلہ لو اور دیون ہلی پر قبضہ کر کے اس کی طاقت کو زبردست نقصان پہنچاؤ۔“

حیدر صاحب۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم بھائیوں نے دیون ہلی پر قبضہ کر لیا اور عباس قلی خاں نے قلعہ واپس لینے کے لیے جنگ کی تو مرزا گاہم کی حکومت تمہیں ایک عظیم شکر بیا کرے گا جس کے تمام اخراجات ریاستی خزانہ سے ادا کیے جائیں گے۔“

حیدر صاحب۔ پہلے خوش تھے۔ اب تو ان کی اور بھی باچیس کھل گئیں۔ انہوں نے خزیہ انداز میں جو خوش سے کہا۔

”ہمارا راج۔ اگر خدا کی مرضی شامل حال رہی تو ہم دیون ہلی کے قلعہ پر ضرور قبضہ کر کے اسے ریاست مرزا گاہم میں شامل کریں گے۔“

نند راج نے فوراً جواب دیا:

”اگر مرزا گاہم کا جھنڈا دیون ہلی کے قلعہ پر تم نے لہا دیا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس قلعہ کے قلعدار تم ہی ہو گے۔“

یہاں پر لفظ ہمارا راج کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔

ہندی زبان میں وہ راجہ جس کے ماتحت بہت سے راجہ ہوتے ہیں وہ ہمارا راجہ کہلاتا ہے بالکل اسی طرح جیسے اردو میں شہنشاہ ہوتا ہے جو کا منصب کئی بادشاہوں کا بادشاہ ہوتا ہے مگر اسی ہندی زبان میں ایک لفظ ہمارا راج ہے جو ہمارا راجہ ہی سے نکلا ہے۔ ہمارا راجہ اراجاؤں کا راجہ ہوتا ہے لیکن ہمارا راج اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کے پاس ریاست یا سلطنت نہ ہو مگر وہ صاحبِ حیثیت ہو

اور لوگ اس کی عزت کرتے ہوں۔

نند راج اور دیو راج اگرچہ راجہ یا ہمارا راج نہ تھے لیکن صاحبِ حیثیت اور قابلِ احترام ہستیاں تھیں اس لیے انہیں ہمارا راج کہا جاتا تھا۔

حیدر صاحب نے واپس جا کر شہباز، حیدر علی اور ان کی والدہ مجیدہ بیگم کو جب یہ بتایا کہ ہمارا راج نند راج۔ دراصل قلعہ دیون ہلی پر حملہ کر کے شہباز اور حیدر علی کے ساتھ کیے گئے ظلم کا بدلہ لینا چاہتے ہیں تو ان لوگوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

مجیدہ بیگم نے بچوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہا:

”اللہ تعالیٰ نے اگرچہ عنود و درگزر کا بڑا ثواب رکھا ہے مگر اس نے بدلہ لینے کی بھی اجازت دی ہے۔ پھر عباس قلی خاں جیسے ظالم سے بدلہ لینا بھی تو ایک کارِ ثواب ہے اس لیے تم اس ظالم کے ساتھ کوئی رعایت نہ برتنا اور پورا پورا انتقام لینا۔“

عباس قلی خاں ان دنوں ڈوڈبلاپور میں تھا۔ اس کے تصور میں بھی نہ تھا کہ مرزا گاہم کی ریاست جو صرف ۳۳ گاؤں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی وہ اپنی حدود سے نکل کر دیون ہلی کے قلعہ پر حملہ کر سکتی ہے کیونکہ دیون ہلی نہ صرف یہ کہ عباس قلی خاں کا حاکم بلاپور کے ماتحت تھا بلکہ عباس قلی خاں کا حلیف (ایک بیان کے مطابق باپ) نواب طاہر محمد خاں صوبدار مرہٹا تھا۔

ناظرین کو یاد ہو گا کہ شہباز اور حیدر علی کے والد شیخ فتح محمد اس کے سابق صوبدار عابد خاں کے منصب دار تھے۔ ان کے انتقال کے بعد صوبدار عابد خاں کا بیٹا عبدالرسل خاں ہوا لیکن نواب طاہر محمد خاں بھی مرہٹا صوبداری کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ طاہر ہے کہ فتح محمد نے عبدالرسل خاں کا ساتھ دیا۔

مرہٹے کے قریب ایک میدان میں عبدالرسل خاں جس کی حمایت پر فتح محمد تھے اور نواب طاہر محمد خاں جس کی حمایت پر عباس قلی خاں تھا، دونوں لشکروں میں شدید جنگ ہوئی۔ عبدالرسل خاں نے شکست کھائی اور شیخ فتح محمد اس جنگ میں کام آئے۔

اس وقت فتح محمد کی بیوہ مجیدہ بیگم اور بچے (شہباز اور حیدر علی) بلاپور میں تھے جس کا حاکم عباس قلی خاں تھا۔

بہر حال مرزا کا پٹم کا وزیر نند راج اپنی غنیمت مگر مضبوط فوج لے کر دیون ہلی کے قلعہ کی طرف بڑھا۔ فوج کی سرداری حیدر صاحب کلاں کے حوالے تھی۔ شہباز اور حیدر علی اس کے نائب تھے۔ غاہر سہم کہ سردار فوج اور اس کے دونوں نائب ریاستی فوج کے ملازم ہونے کے علاوہ جوش انتقام سے بھی بھرے ہوئے تھے۔ ان کا دشمن عباس قلی خاں تھا جو اس قلعہ کا بھی مالک تھا۔ پس حیدر صاحب نے قلعہ کے سامنے پہنچتے ہی عام حملہ کا حکم دیدیا۔

قلعہ میں کافی فوج اور کئی ماہ کا سامان رسد تھا۔ قلعہ والوں کو جب معلوم ہوا کہ حملہ آور مرزا کا پٹم کا وزیر نند راج ہے تو حاکم قلعہ نے اسے کوئی اہمیت نہ دی اور قلعہ کے باہر صف بندی کر کے مقابلہ کرنے پر تیار ہوا۔

مرزا کا پٹم کی فوج جو بعد دوپہر قلعہ کے سامنے پہنچی تھی وہ حیدر صاحب سپہ سالار کا حکم پاتے ہی دیون ہلی کے لشکر پر ٹوٹ پڑی جو صف در صف قلعہ کے سامنے دیوار بنی کھڑی تھی۔

مرزا کا پٹم کی فوج کا حملہ بڑا شدید تھا۔ سیمہ پر شہباز اور میسرہ پر حیدر علی تھا۔ وسط لشکر میں خود حیدر صاحب کلاں فوج کی قیادت کر رہے تھے۔

نند راج ایک اونچی جگہ کھڑا ہوا لڑائی دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ مرزا کا پٹم کا دایاں اور بایاں بازو اس شدت سے حملہ آور ہوا کہ دیون ہلی کا لشکر بپسا ہونے پر مجبور ہو گیا۔

اس طرح شہباز اور حیدر علی دشمن کو دبا تے ہوئے قلعہ کے بہت قریب پہنچ گئے مگر قلب فوج جہاں حیدر صاحب موجود تھا وہ اتنی تیزی سے آگے نہ بڑھ سکا، اس لیے کہ دشمن کے قلب میں قلعہ دار کے علاوہ اس کے بہترین سردار اسے گھیرے ہوئے جنگ کر رہے تھے۔

حیدر صاحب نے بڑھو بڑھ کے کئی بار حملے کیے مگر اس طرف سے اتنی زبردست مدافعت ہوئی کہ قلب لشکر سیمہ اور میسرہ کا ساتھ نہ دے سکا اور تھوڑی دیر آگے جا کر اسے رک جانا پڑا۔

حیدر علی اور شہباز نے قلب فوج کی یہ کیفیت دیکھی تو حیدر علی نے فوراً شہباز کو پیغام بھیجا کہ قلب فوج کو واپس پڑنا ہے اس لیے آگے بڑھنے کے بجائے دایاں اور بایاں بازو ہٹ کر دشمن کا آدھی فوج کو گھیرے میں لے کر حملہ کریں۔

حیدر علی کی یہ چال کامیاب ہوئی۔ شہباز نے بجائے آگے بڑھنے کے اپنی فوج کو بائیں جانب گھومنے کا حکم دیا۔

یہی کام حیدر علی نے کیا اور وہ اپنے لشکر کے ساتھ دائیں جانب مڑ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد

مرزا کا پٹم کا دایاں اور بایاں بازو مل گئے۔ دشمن کا قلب ان کے گھیرے میں آ گیا اور دشمن گھبرا اٹھا۔ دیون ہلی کے قلعہ دار نے گھبرا توڑنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس وقت قلعہ دار نے دکانوں پر کھڑے ہو کر قلعہ کی طرف تلوار سے اشارہ کیا۔ جس کے جواب میں قلعہ کا دروازہ پورا کھل گیا اور دکانوں سے تازہ دم سوار نکلتا شروع ہوئے۔ ان کا رخ قلب فوج کی طرف تھا جو مرزا کا پٹم کی فوج کے گھیرے میں تھا اور راستہ بنا کے بھاگنے کی فکر میں تھا۔

قلعہ دیون ہلی سے پانچ سو سوار نکل کے میدان میں پہنچے تو ان کے پسپا ہوتے ہوئے لشکر کو کچھ سہارا ملا۔

تازہ دم سواروں نے مرزا کا پٹم کی گھیرنے والی فوج پر زبردست حملہ کیا اور آخر انھوں نے حملہ آوروں کے درمیان راستہ بنالیا اور اپنے قلب فوج تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا اور ہر طرف تاریکی پھیل گئی تھی۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دشمن پانچ سو لاشیں میدان جنگ میں چھوڑ کر قلعہ میں پسپا ہو گیا اور رات ہو جانے کی وجہ سے جنگ رک گئی۔

واپس نہیں پہنچے۔

"ارے۔ یہ کیسے ممکن ہے!"

ندراج گہرا کے کھڑا ہو گیا۔

وہ ہر کار سے کوڑا لے کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا حیدر صاحب کے خیمے پر پہنچا۔ خیمہ اب بھی

خالی تھا۔

ندراج کو دوسو سوں نے گھیرنا شروع کر دیا۔

کیا ہوا ان تینوں کو؟

کہاں گئے یہ لوگ؟

"کیس..... کیس وہ....."

مگر نندراج نے اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ تینوں بہادر اور شجاع ہیں۔ انہیں کوئی نہیں مار سکتا۔ میں نے انہیں اندھیل ہونے تک لڑتے دیکھے ہیں۔

ندراج نے دوسو سوں اور برے برے خیالوں سے جتنا ذہن کو صاف کرنا چاہا اتنے ہی خیالات اسے گھیر رہے تھے۔

اس نے تنگ آ کر اپنے خیمے کی طرف قدم اٹھائے کہ معاً اس کی نظر ایک طرف اٹھی۔ کیا دیکھتا ہے کہ خیموں میں جلنے والے چراغوں کی مدھم مدھم روشنی میں دس بارہ آدمی کسی کو ایک لمبے پٹرے پر ڈالے آ رہے ہیں۔

ندراج کے قدم ادھر کو گھوم گئے اور وہ دو ہی منٹ میں وہاں پہنچ گیا۔

شہباز اور حیدر علی کی نظر نندراج پر پڑی تو وہ رک گئے۔

"کیا ہوا۔ کون ہے یہ؟" نندراج نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"حیدر بھائی ہیں۔" شہباز نے جواب میں کہا:

"بہت زیادہ زخمی ہیں۔"

"چلو چلو۔ میرے خیمے میں لے چلو۔" نندراج آگے آگے چلنے لگا۔

ندراج کے خیمے میں حیدر صاحب کو نرم گدے پر ٹایا گیا۔ وہ بے ہوش تھے۔ ان کے کئی زخم آئے تھے۔ خاص کر پہلو کا زخم گہرا تھا جس سے پٹی خون میں بھیگ گئی تھی اور خون پٹی کے اوپر

سے برس رہا تھا۔

رات ہو جانے کی وجہ سے دیون ہلی کے محاذ پر خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ میسور کی فوج نے کوشش کی تھی کہ جنگ کا فیصلہ اسی دن ہو جائے مگر قلعہ دار دیون ہلی اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بقیہ فوج کو بچ کر قلعہ میں واپس پہنچ گیا۔

میسور کی فوج کو بھی واپسی کا حکم دیا گیا اور شہباز، حیدر علی اور حیدر صاحب کلاں خیموں میں واپس آ گئے۔

میسور کا وزیر نندراج بہت خوش تھا۔ اس کے تینوں مسلمان سرداروں نے میدان جنگ میں اپنے آپ کو اہل ثابت کیا تھا۔ دشمن پانچ سو لاکھیں چھوڑ کے پسا ہوا تھا۔ اگر رات نہ ہو جاتی تو میسوری فوجیں آج ہی قلعہ پر قبضہ کر لیتیں۔

ندراج اپنے خیمے میں پہلے ہی واپس آ گیا تھا۔ اس نے آتے ہی آج کے میردز یعنی حیدر صاحب کلاں، شہباز اور حیدر علی کو شاباشی اور کسی حد تک کامیابی کی مبارک باد دینے کو طلب کیا۔

ندراج کا ہر کارہ حیدر صاحب کے خیمہ پر پہنچا۔ اسے بتایا گیا کہ حیدر صاحب ابھی میدان جنگ سے واپس نہیں آئے۔ پھر وہ شہباز اور حیدر علی کے خیمے پر گیا۔ وہ دونوں بھائی ایک ہی خیمے میں مقیم تھے۔ وہاں سے بھی ہر کار سے کوئی جواب ملا کہ دونوں بھائی میدان جنگ سے واپس نہیں آئے۔

ہر کار سے واپس جا کر نندراج کو بتایا: "ہمارا راج ابھی تک تینوں سردار اپنے خیموں پر

سوائے پھرمات آدمیوں کے باقی لوگوں کو خیمہ سے باہر بھیج دیا گیا تھا۔ اس وقت نیچے میں شہباز، حیدر علی اور نندراج کے علاوہ دو اور نائب سردار تھے۔ ان کے علاوہ ایک جراح اور اس کا معاون تھا۔

سب لوگ خاموش اور افسردہ تھے۔ نندراج نے سوالیہ نظروں سے جراح کی طرف دیکھا۔ جراح نے اس سے کہا:

"ہمارا راج خون بہت بہ گیا ہے۔ میں نے پہلو کے زخم میں دو ابھر کے ماضی پٹی کس دی تھی مگر خون بند نہیں ہوا ہے۔"

"مستے بھر خون پٹکتا آیا ہے وزیر اعظم۔" شہباز نے سسکی بھر کر بتایا۔
"قوراپٹی بدلو! نندراج نے حکم دیا:

حیدر صاحب سرنگا پٹم کی ناک ہیں۔ ہمیں ان کی سخت ضرورت ہے۔"

جراح نے پہلو کے زخم کی پٹی کھول کر زخم سے خون اب بھی جاری تھا۔ نندراج نے جھک کے زخم کو دیکھا۔

جراح نے بتایا:

"خیر دل ہلک پیچ گیا ہے ہمارا راج۔ جگہ ان....."

کچھ مت کو۔" نندراج جذباتی ہو گیا:

حیدر صاحب کی زندگی ہر حالت میں بچنا چاہیے۔"

جراح نے زخم میں دو اؤں کا بتایا ہوا المیدہ بھرا۔ اس وقت حیدر صاحب کے جسم کو ہلکی سی جنبش ہوئی اور وہ کراہے۔

کیسے ہو حیدر؟" نندراج نے اپنا کان حیدر صاحب کے منہ سے لگا دیا۔

شہباز اور حیدر علی کے چہروں پر ہلکی سی ہلاکت پیدا ہوئی مگر حیدر صاحب نے کوئی جواب نہ دیا۔ نندراج سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ سب کے چہرے پھر پھیکے پڑ گئے۔

ایک حیدر صاحب نے سنبھالا لیا اور آنکھیں کھول دیں۔ سب چہرے پھر دمک اٹھے۔ نندراج نے جھک کر کہا:

حیدر۔ اس جنگ کا سہارا ہے سر ہے۔"

حیدر صاحب نے شاید اپنی ماری طاقت جمع کی۔ ان کے چہرے کی تمام گریں کچھ گئیں۔ آنکھیں

باہر نکلتی آئیں اور وہ اٹک اٹک کر بولے:

"ہمارا راج..... حیدر..... میسور..... پر قربان..... ہو گیا..... شہباز..... حیدر کا..... خیال..... رکھیے....."

پھر اس کی زبان لڑکھڑائی اور سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔

شہباز اور حیدر علی "حیدر بھائی" کہہ کر ان پر جھک گئے اور نندراج کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے۔

حیدر صاحب کلاں، شہباز اور حیدر علی کے محسن اور مروتی تھے بلکہ وہ ایک مشفق باپ کے فرائض بھی ادا کر رہے تھے۔ دونوں بھائیوں کی سپاسیانہ تربیت انہی کی رہیں منت تھی۔ شہباز اور حیدر علی آج جس مقام پر تھے، اس میں حیدر صاحب کلاں کا سب سے زیادہ ہاتھ تھا۔ حیدر صاحب رباست میسور کے لیے بے انتہا مفید تھے۔

وہ نندراج اور دیوراج کے وفادار اور ایک لائق فوجی سردار تھے اسی لیے نندراج نے انہیں دیون ملی کے معرکہ کے لیے سالانہ مقرر کیا تھا اور اسی لیے نندراج، شہباز اور حیدر علی کے غم میں برابر کا شریک تھا۔

حیدر صاحب کی لاش ان کے پیچھے میں پہنچا دی گئی۔

مگر۔

نندراج نے ان کی موت کو راز میں رکھنے کا حکم دیا۔ چنانچہ سوائے چند مسلمانوں کے اور کسی کو حیدر صاحب کی موت کی خبر نہ ہو سکی۔

طے یہ ہوا کہ حیدر صاحب کو خیمہ کے مغربی جانب صبح ہونے سے پہلے دفن کر دیا جائے۔ نندراج نے دوسرا حکم یہ دیا کہ کل فوج کی سرداری شہباز کرے گا۔

ابھی رات زیادہ نہ گزری تھی کہ قلعہ دیون ملی کی طرف سے کچھ لوگ آتے دکھائی دیے۔ ان کے ہاتھوں میں بڑی بڑی شمشیریں تھیں اور اس روشنی میں وہ سفید پرچم لہراتے ہوئے سرنگا پٹم کی فوج کی خیمہ گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے مگر ان کی رفتار بہت سست تھی۔ ایک لشکری نے دوڑ کر نندراج کو اطلاع دی:

اندرون نظر ڈالے تو اسے حیدر صاحب بیٹھے نظر آئیں۔
شہباز اور حیدر علی اور زیادہ حیران ہوئے۔

”کیا سوچ رہے ہو تم دونوں؟“

ندراج کا ہنر سہمت ہو گیا:

”ہاں یا نہ میں جواب دو۔“

”جی ہاں وزیر اعظم۔“ شہباز نے جلدی سے جواب دیا۔

”شہباز۔ جلدی کرو۔“ یہ کہہ کر نندراج ہرکار سے کو ساتھ لیے واپس ہوا۔

”اب مجھے آنے والے وفد کی جانب جانا ہے۔“ نندراج نے راستے میں رک کر ہرکار سے سے مخاطب ہو کر کہا:

”محافظوں سے جا کر کہو کہ آنے والوں کو سیدھا میرے پاس لے آئیں۔“

”جی ہمارا۔“ ہرکارہ جواب دے کر چلا۔

”اور میں!“ نندراج نے اسے روکتے ہوئے کہا:

”وفد کو حیدر صاحب کے خیمے کے سامنے سے گوارنا مگر ذرا دُور سے۔“

”جی ہمارا۔“ ہرکار سے نے اُٹھان میں سر ہلایا۔

”جی ہمارا۔“ کاچہ۔“ نندراج کو غصہ آ گیا:

”ہر بات میں جی ہمارا۔“ کچھ اور نہیں بول سکتا۔“

ہرکار سے نے سنبھل کے جواب دیا:

”میں آنے والوں کو حیدر صاحب کے خیمے کے سامنے سے گزاروں گا مگر ذرا دُور سے۔“

”اچھا بس۔“ جا، جلدی جا۔“

ندراج اپنے خیمے کی طرف چل پڑا۔

شمع بردار وفد محافظوں کے قریب پہنچنے والا تھا۔ ہرکار سے نے محافظوں کے پاس پہنچ کے

بتایا کہ ہمارا نندراج نے حکم دیا ہے کہ آنے والوں کو ان کے خیمے پر لایا جائے۔

”ٹھیک ہے۔“ محافظ نے جواب دیا:

”تم وفد کو لے جانا اپنے ساتھ۔“

چند لمحوں بعد شمع بردار وفد محافظوں کے پاس پہنچ گیا۔ محافظوں نے تلواریں کھینچ لیں اور

”ہمارا۔“ قلعہ سے شمع بردار وفد آ رہا ہے۔“

ندراج نے جلدی سے پوچھا:

”کہیں دشمن شب خون مارنے تو نہیں آ رہا؟“

لشکری نے اطمینان سے جواب دیا:

”نہیں ہمارا۔“ ان کے پاس سفید جھنڈا ہے۔ وہ جھنڈا ہراتے آ رہے ہیں۔“

”پھر ٹھیک ہے۔“

ندراج کو اطمینان ہوا۔

اچانک نندراج کو نہ جانے کیا سوچھی کہ وہ لشکری کو ساتھ لیے سیدھا حیدر صاحب کے خیمے

پر پہنچا۔ شہباز اور حیدر علی نے اسے حیران نظروں سے دیکھا۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

ندراج نے انہیں اطمینان دلایا:

”ہاں۔ تم لوگوں سے ایک درخواست ہے۔“

”آپ حکم دیجیے۔“ شہباز نے کہا۔

ندراج نے بتایا:

”قلعہ سے بات چیت کے لیے وفد آ رہا ہے۔ اسے یہ معلوم نہ ہونا چاہیے کہ ہمارا سردار فرج

آج کی لڑائی میں کام آیا ہے۔“

شہباز اور حیدر علی نے حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا

کہ حیدر صاحب کی موت کو کیسے چھپایا جاسکتا ہے۔

”اگر وفد نے ہمارے سالار لشکر سے ملنے کی خواہش کی تو کیا ہو گا ہمارا؟“ شہباز کو اکثر

سوال کرنا ہی پڑتا۔

”وہ میں سنبھال لوں گا۔“ نندراج جلدی سے بولا:

”تمہیں صرف ایک کام کرنا ہے۔“

”فرمائیے ہمارا۔“ کیا کرنا ہے ہمیں؟“ شہباز نے پوچھا۔

ندراج نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا:

”کسی طرح حیدر صاحب کو ٹھیک لگا کر اس طرح بٹھا دو کہ خیمہ کے سامنے سے گزرنے والا

راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔

دُفد چار آدمیوں پر مشتمل تھا۔ ان میں سے ایک بولا:

”ہم جنگ کے لیے نہیں آئے بلکہ اپنے قلعہ دار کا پیٹنا مسرنگا پٹم کے سالار لشکر حیدر صاحب کے لیے لائے ہیں۔“

محافظوں کے سردار نے ہرکارے سے کہا:

”انہیں اپنے ساتھ لے جاؤ۔“

ہرکارہ آگے آگے اور شیخ بردار دُفد اس کے پیچھے چلنے لگا۔ وزیر نندراج کے حکم کے مطابق ہرکارہ دُفد کو لے کر حیدر صاحب کے خیمہ کی طرف چلا مگر وہ دل میں ڈر رہا تھا کہ پتہ نہیں شباز اور حیدر علی نے حیدر صاحب کی لاش کو اٹھا کے بٹھایا بھی ہے یا نہیں مگر جب یہ لوگ حیدر صاحب کے خیمے کے سامنے سے گزرے تو اندر بہت تیز روشنی ہو رہی تھی۔ خیمے میں سامنے کی طرف حیدر صاحب بڑی شان سے بیٹھے تھے اور دائیں بائیں شباز اور حیدر علی بڑے ادب کے ساتھ بیٹھے تھے۔

خیمے میں تیز روشنی کے سبب دُفد کے آدمیوں کی نظریں بھی خیمے کے اندر تک پہنچ گئیں۔

ان میں سے ایک نے پوچھا:

”اس خیمے میں اتنی زیادہ روشنی کیوں ہے؟“

چالاک ہرکارے نے جواب دیا:

”زیادہ روشنی اس لیے ہے کہ یہ سالار لشکر حیدر صاحب کلاں کا خیمہ ہے۔“

ادکان دُفد نے قدم روک لیے۔

”ہمیں حیدر صاحب ہی سے ملنا ہے۔“ ایک نے کہا۔

”ان سے آپ بعد میں ملے گا۔“

ہرکارے کا دماغ خوب کام کر رہا تھا:

”ہمارے وزیر اعظم لشکر کے ساتھ ہیں۔ پہلے آپ لوگ ان سے ملیں۔ اگر انہوں نے اجازت دی تو آپ کو حیدر صاحب کلاں سے بھی ملا دیا جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے مگر کیا وزیر اعظم نندراج اور دیوراج خود اس لشکر کے ساتھ آئے ہیں؟“ دُفد کے ایک رکن نے اپنی تسلی کیلئے پوچھا۔

”صرف وزیر اعظم نندراج تشریف لائے ہیں۔“ ہرکارے نے جواب دیا۔

نندراج دُفد کا انتظار کر رہا تھا۔ اطلاع ملتے ہی اس نے دُفد کو اندر بلا لیا۔ دُفد کے ارکان نے نندراج کو ادب سے سلام کیا۔

”کس لیے آئے ہو تم لوگ؟“ نندراج بڑی رعوت سے کہا۔

”ہم قلعہ دار کا پیٹنا سالار فوج کے لیے لائے ہیں وزیر اعظم۔“ ایک رکن نے کہا۔

”ہم خود سپہ سالار ہیں۔ حیدر ہمارا ماتحت ہے۔ جو کہنا ہے ہم سے کہو۔“ نندراج نے اور زیادہ رعوت کا اظہار کیا۔

”ہمارا وزیر اعظم ہمارے قلعہ دار نے تو..... دُفد کے ایک رکن نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ نندراج نے اسے ڈانٹ دیا:

”خاموش ہو جاؤ۔“ نندراج نے تندھے میں کہا:

”پھر پلٹ کر اس نے اپنے ہرکارے کو حکم دیا:

”انہیں بجا خلافت ہماری خیمہ گاہ سے باہر پہنچا دو۔“

دُفد کی جان نکل گئی۔ وہ گر کر گڑا نے لگا۔ دُفد کے ایک دوسرے رکن نے جلدی سے کہا:

”معاف کیجیے ہمارا راج۔ میرے ساتھی سے غلطی ہو گئی۔ یہ شک کر لیا آپ تو مہسور کے مالک ہیں۔

ہمیں عرض کرنے کی اجازت دیجیے۔“

”اجازت ہے۔“ نندراج غرور سے اکر گیا۔

رکن نے کہنا شروع کیا:

”ہمارا راج۔ ہمارے قلعہ دار، قلعہ آپ کے حوالے کرنے پر آمادہ ہیں بشرطیکہ ان کی چند معمولی

شرطیں قبول فرمائی جائیں۔“

شرطیں بیان کی جائیں۔“

”پہلی شرط یہ ہے کہ قلعہ کے تمام لوگوں کی جاں بخشی فرمائی جائے۔ کسی کو قتل نہ کیا جائے۔“ دُفد

نے شرطیں بتانا شروع کیں۔

”دوسری طرف بیان کی جائے۔“

”جو قلعہ سے نکل کے جانا چاہے اسے نہ روکا جائے۔“

یہ دوسری شرط تھی!

کیا تھا۔

واپسی سے پہلے نندراج نے ایک مختصر سی تقریب منعقد کی جس میں فوجی سالاروں کے علاوہ قلعہ کے کچھ معززین کو بھی مدعو کیا گیا۔

اس تقریب میں نندراج نے حیدر علی کے بڑے بھائی شہباز کو دیون ہلی کا قلعہ دار مقرر کیا۔ جب اس نے اس پر مسرت کا اظہار کیا۔ خاص کر حیدر علی کہ بہت خوشی ہوئی کیونکہ اس کی بوڑھی ماں کی یہ خواہش تھی کہ اس کے دونوں بیٹے سپہ گری میں نام پیدا کریں۔

نندراج نے دیون ہلی سے واپسی سے پہلے ہی چار تیرہ فائر سواروں کے ذریعے دیوراج، ہماراج اور ہارانی سند کی کو جنگ جیتنے اور قلعہ پر قبضہ کی اطلاع بھجوا دی تھی۔ اس خبر سے سرنگاپٹم والوں کو جس قدر خوشی ہوئی ہوگی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اس لیے کہ میسور کی یہ ریاست جو صرف ۳۲ گاؤں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی اس پر تو آٹھ دن حملہ ہوا کرتے تھے۔ اس میں کسی پر حملہ کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا مگر دیون ہلی پر حیدر صاحب مرحوم اور دونوں بھائیوں شہباز اور حیدر علی نے توار کے ایسے جوہر دکھائے تھے جس نے قلعہ والوں کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔

قلعہ پر قبضہ ہونے میں نندراج کی عقلمندی کا بھی دخل تھا۔ کسی جنگ میں سالار فوج کا ملنا ہانا فوج کے حوصلے بہت کر دیا کرتا ہے اور دشمن کا لشکر حوصلہ مند ہو جاتا ہے۔ نندراج نے بڑی عقلمندی سے حیدر صاحب کلاں کی لاش کو زندہ ظاہر کرنے کی جو حکمت علی اپنی تھی اس نے سالار فوج کی موت کو مآکنہ ہونے دیا، جس سے ایک طرف تو نندراج کی فوج کے حوصلوں پر کوئی منفی اثر نہ پڑا اور دوسرے دیون ہلی والوں کو حقیقت کا پتہ ہی نہ لگ سکا ورنہ ممکن تھا کہ دوسرے دن بھی شدید جنگ ہوتی اور کس کے حق میں فیصلہ ہوتا اس کا پہلے سے اندازہ نہ کیا جاسکتا تھا۔

حیدر صاحب میدان جنگ میں زخمی نہیں ہوئے تھے بلکہ یہ واقعہ میدان جنگ سے واپسی پر پیش آیا تھا۔

میدان میں اندھرا پھیل جانے کی وجہ سے جنگ رک گئی تھی اور دونوں طرف کے لشکر کی اپنی اپنی فوج گاہ کی طرف واپس ہو رہے تھے۔ حیدر صاحب کلاں، شہباز اور حیدر علی کے ساتھ واپس آ رہے تھے کہ اندھیرے میں حیدر صاحب کسی چیز سے ٹکرائے۔

انہوں نے جھک کر ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ وہ کوئی زخمی ہے جو اس وقت تک زندہ تھا۔ حیدر صاحب کو خیال آیا کہ شاید وہ انہی کا کوئی لشکر ہے اسی لیے انہوں نے اپنی تلوار شہباز کو پکڑا دی اور اس

تیسری شرط بیان ہو۔

”جو اپنا سامان ساتھ لے جانا چاہے اسے نہ روکا جائے۔“

اور۔

”اور کوئی شرط نہیں ہمارا ج۔“ وفد نے اعلان کیا۔

نندراج نے بڑی تکنت سے فیصلہ دیا:

”تمام شرطیں منظور کی جاتی ہیں۔ مگر ہر شخص اپنا اسی قدر سامان لے جاسکتا ہے جتنا وہ خود اٹھا سکتا ہو۔ باقی سامان ہمیں چھوڑنا ہوگا۔“

قلعہ صبح ہونے سے پہلے خالی کر دیا جلائے اور قلعہ کی چابیاں سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہمیں پہنچ جانی چاہئیں۔

جو لوگ قلعہ میں ٹھہرنا چاہیں، وہ ہماری رعیت ہوں گے اور ان کی جان و مال کے ہم ذمہ دار ہوں گے۔“

قلعہ والوں کی تمام شرائط تسلیم کر لی گئی تھیں۔ رات ہی میں قلعہ خالی ہونا شروع ہو گیا تھا۔ نندراج نے اپنے سوار قلعہ کے تمام دروازوں پر مقرر کر دیے تھے تاکہ کسی شرط کی خلاف ورزی نہ ہو۔ شہباز اور حیدر علی، حیدر صاحب کلاں کو وضع کرنے کے بعد اپنے دستوں کے ساتھ قلعہ کے پیرے پر پہنچ گئے۔ گمان کا پیرہ دروازوں سے دُور پر تھا۔

صبح ہونے سے پہلے ہی قلعہ کی چابیاں نندراج کو پہنچا دی گئیں۔

چھوٹ پھیلتے ہی سرنگاپٹم کی فوج فاتح کی حیثیت سے دیون ہلی کے قلعہ میں داخل ہوئی۔ قلعہ میں مستقل رہائش پذیر لوگوں نے قلعہ نہیں چھوڑا تھا۔ یہ لوگ یا تو تجارت ہمیشہ تھے یا پھر کاشت کار۔ قلعہ کے باہر دور دور تک زرخیز زمین پر کاشت کاری ہوتی تھی۔

ان لوگوں نے فاتح فوج اور میسور کے وزیر نندراج کا شاندار استقبال کیا۔ اسے ہارپناٹے اور چھوٹوں کی بیتیاں بچھا کر دیں۔

نندراج کو سرنگاپٹم واپسی کی بہت جلدی تھی کیونکہ اس زمانہ کی ریاستیں گانڈکی ناؤ ہوتی تھیں۔ کوئی بھی طاقتور حملہ کر کے ان پر قبضہ کر سکتا تھا، بالکل اسی طرح جیسے نندراج نے دیون ہلی پر قبضہ

زخمی کو اٹھانے کی کوشش کی۔

حیدر صاحب نے زخمی کو اٹھا کر اپنے سہارے بٹھایا پھر حیدر علی سے کہا کہ وہ اس کی ٹانگیں پکڑے تاکہ دونوں مل کے اسے خیمہ گاہ تک لے جا سکیں۔
مگر۔

ٹھیک اسی وقت وہ دافعہ پیش آیا جس نے حیدر صاحب کی جان لے لی۔

وہ زخمی جسے حیدر صاحب نے سہارا دے کر بٹھایا تھا دراصل قلعہ کی فوج سے نقلی رکھتا تھا جو قلعہ کی طرف بھاگنے کے بجائے دوسری طرف نکل آیا تھا۔ اس نے جب کئی آدمیوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو مردہ بن کر لیٹ گیا۔

بے شک وہ کچھ زخمی تھا مگر اس کے ہوش و حواس درست تھے اور جسم میں طاقت تھی۔ پھر جب حیدر صاحب نے اسے اٹھا کر بٹھادیا اور کسی سے اس کی ٹانگیں پکڑنے کو کہا تو وہ گھبرا گیا۔ اس نے سوچا کہ اس طرح تو وہ کپڑا جاتے گا۔ اس لیے اس نے بیٹھے بیٹھے ہی تیزی سے کمر سے خنجر کھینچا اور حیدر صاحب کے پہلو میں اتار دیا اور اٹھ کے بھاگ پڑا۔

حیدر صاحب صحت اتنا ہی کہہ سکے،

”حیدر علی۔ یہ بچ کے نہ جانے پائے۔“

حیدر علی نے حیدر صاحب کلاں کی زبان سے اتنا سا تو پورا واقعہ اس کی سمجھ میں آ گیا۔ شہباز کے دونوں ہاتھوں میں تلواریں تھیں وہ تو پہچانے کر سکا مگر حیدر علی پھریرے بدن کا چھہ فیٹ سے اونچا جوان تھا۔ اس نے پانچ قدم سے زیادہ حملہ آور کو بھاگنے نہ دیا اور اس کی گردن دوچ کی۔

حیدر علی کا ایک ہاتھ اس کی گردن پر دوسرا اس کے اس ہاتھ پر تھا جس میں خنجر دبایا تھا لیکن اس کی گردن پر حیدر علی کی گرفت اس قدر مضبوط تھی کہ چند ہی لمحوں بعد حملہ آور کی سانس رک گئی اور جسم ڈھبلا پڑ گیا۔

حیدر علی نے اسے ٹٹول کر دیکھا تو وہ مرچا تھا۔

حیدر علی اسے گھسیٹتا ہوا اس جگہ لے آیا جہاں حیدر صاحب زمین پر پڑے تھے اور شہباز گھبراہٹا ہوا ان کی سانس تلاش کر رہا تھا۔

یہ وقت بہت نازک تھا اور ایک ایک لمحہ قیمتی، اس لیے حیدر علی نے حملہ آور کی لاش کو توڑ دیں چھوڑا اور حیدر صاحب کلاں کو پشت پر لا کر خیمہ میں لے آیا۔ مگر دل پر خنجر گئے اور زیادہ خون

بہ جانے کی وجہ سے حیدر صاحب جانبر نہ ہو سکے اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔

دیون ہلی کے قلعہ پر قبضہ کا جشن منانے کا پیم میں پورے ایک ہفتے تک منایا جاتا رہا۔ وزیر نندراج کا خفا دو بالا ہو گیا۔ ہمارا جہر کرشن اوڈیہ اور ہمارا نانی ہندی کے دماغ میں وزیر برادران سے چٹکنکارا حاصل کرنے کا جو خیال پیدا ہو رہا تھا وہ چکنا چور ہو کر رہ گیا۔ یہ خبر جب مرہٹوں انواب ارکاٹ اور نظام تک پہنچی تو ان کے کان بھی کھڑے ہوئے۔

دیون ہلی کے قلعہ کی فتح نے ریاست میسور کے لیے مزید فتوحات کا راستہ کھول دیا اور ۳۳ گاؤں پر مشتمل یہ چھوٹی سی ریاست انتیس ہزار پانچ سو (۲۹۵۰۰) مربع میل کی ایک عظیم الشان ریاست میں تبدیل ہو گئی۔

مگر ان تفصیلات اور فتوحات میں جانے سے پہلے ہنریہ معلوم ہوتا ہے کہ میسور کے راجہ کرشن اوڈیہ کے خاندان کی اس رومان انگیز داستان کا کچھ تذکرہ کیا جائے جو اس ریاست کی بنیاد اور اساس بنی۔

محبت کی یہ دلچسپ داستان کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے۔

قدیم تاریخ بتاتی ہے کہ شمالی ہند کے صوبہ یوپی کے شہر وارکا میں دو بھائی رہتے تھے جن کے نام وجیارایا اور کرشن رایا تھے۔ دو وارکا کا شہر ہندوؤں کا ایک مذہبی مقام ہے۔ دو وارکا اور ہردوار وغیرہ ہندوؤں کی نظریں اسی طرح مقدس ہیں جس طرح مسلمانوں کے لیے اجیرہ شریف اور بکیر شریف مبرک ہیں۔

وجے رائے اور کرشن رائے (وجیارایا اور کرشن رایا) پر خدا معلوم کیا افتخار پڑی کہ دونوں بھائیوں کو اپنا شہر وارکا ہمیشہ کے لیے چھوڑنا پڑا۔ ان بھائیوں کا ہندوؤں کی مشہور ذات ”تھاکر“ سے تعلق تھا۔

ہندو مذہب میں چار ذاتیں مشہور ہیں:

۱۔ برہمن

۲۔ تھاکر

۳۔ ویش

پیشہ در سپاہیوں کی خدمات حاصل کرتا۔

اس طرح مسلح پہرے میں قافلہ ایک منزل سے دوسری منزل پر پہنچتا تھا۔ پھر بھی اکثر ڈاکو اور ہزن قافلوں پر حملہ آور ہوتے اور بڑی مشکل سے قافلوں کو بچا جاتا تھا۔

بہر حال وجے رائے اور کرشن رائے منزلیں مارتے اور تکلیفیں اٹھاتے میسر پہنچ گئے۔ آج کے سرنگاپٹم کے مصفاات میں ہڈناڈ اور کاروگ ہلی نام کے سمولی سے دیہات ہیں مگر ۱۲۹۹ء میں یہ دیہات اچھی خاصی ریاستیں تھیں۔ ان کو سرحدیں آپس میں ملتی تھیں اس لیے آئے دن ریاستی فوجوں میں جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔

وجے رائے اور کرشن رائے ٹھاکر ہوئے۔ ان کی رہبہ سے سپاہیانہ زندگی پسند کرتے تھے۔ یوں بھی دونوں خوبصورت اور جوان رعنا تھے۔ لڑکیوں کی ان پر پڑنے والی نظریں محلوں کے لیے ان کے چہرے پر رک کے رہ جاتی تھیں۔ راستہ میں کئی بار ایسا ہوا کہ اگر وہ ذرا احتیاط سے کام نہ لیتے تو ان کا بیان تک پہنچنا نا ممکن ہو جاتا۔ مگر دونوں بھائیوں نے طے کیا تھا کہ جب تک انہیں کوئی سکون کا ٹھکانہ نہیں مل جاتا اس وقت تک وہ اپنے جذبات پر قابو رکھیں گے۔

وجے اور کرشن نے دو ارکا سے ہاں تک کئی گھوڑوں پر سفر کیا تھا۔ یہ گھوڑے یا تو بھاگتے بھاگتے دم دے دیتے تھے یا چوری ہو جاتے تھے۔ دونوں بھائی بہت تیز گھوڑے بولگاتے اور ان کی یہ دوڑ سورج نکلنے ہی شروع ہو جاتی اور وہ گھوڑے کو اس وقت تک نہر دکتے جب تک رات کے اندھیرے میں انہیں راستہ دکھائی دینا بند نہ ہو جاتا۔ یا پھر گھوڑا ٹھوکر کھانے لگتا۔ یوں معلوم ہوتا جیسے کسی نے ان کے کان میں کہہ دیا ہو کہ شمال سے چلے ہو تو جنوب میں جا کر دم لینا۔ وہ میسر نے نواح میں بھی رکنے کا نام نہ لیتے، اگر ان کو راستے میں ایک واقعہ نہ پیش آ گیا ہوتا۔

جنوبی ہند کا بیشتر علاقہ سطح مرتفع ہے۔ زمین پتھر ملی اور نا ہمارا ہے۔ سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا اور وہ شام سے پہلے کسی آبادی میں پہنچنا چاہتے تھے۔ ان کے کئی گھوڑے ویرانے میں رات بسر کرنے سے قزاقوں کے ہاتھ لگ گئے تھے اس لیے انہوں نے اب آبادیوں میں راتیں گزارنا شروع کر دی تھیں۔

انہوں نے گھوڑوں کی رفتار تیز کر دی۔

اسی وقت انہیں سامنے سے چند آدمی تلواروں سے ایک دوسرے پر حملہ کرتے نظر آئے۔ ان کی رفتار تو تیز تھی ہی، وہ دم کے دم میں وہاں پہنچ گئے۔ انہیں آتا دیکھ کر گھنٹی بونی تلواریں بک

۴۔ شور

برہمنوں کے ذمے مذہبی کاموں کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

ٹھاکر سپاہیانہ زندگی پسند کرتے ہیں۔

ولیش تجارت پیشہ یعنی بیٹے ہوتے ہیں۔

باقی رہے شور در توان کا شمار کسی میں نہیں ہوتا۔ ہندو مذہب کے فلسفہ کے مطابق شور درص اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ وہ اوپر کی تینوں ذاتوں یعنی برہمن، ٹھاکر اور ولیش کی خدمت کریں۔ چنانچہ زمانہ قدیم سے آج تک ہندوؤں کی یہی ذاتیں موجود ہیں اور اسی سے ہندو معاشرہ عبارت ہے۔

راجاؤں ہمارا جاؤں کے زمانہ میں، مندروں اور تما اندھسی امور کے مالک برہمن یا پندت ہوتے ہیں۔ راج گدی ہمیشہ ٹھاکروں کے حصے میں رہی اور تجارت اور دوسرے ملکا امور پر ولیش قابض رہے۔ شور درسا سے بنس اور ملیچھ ہیں۔ ان کی بستیاں الگ ہوتی ہیں۔ مندروں میں یہ داخل نہیں ہو سکتے۔ تعلیم حاصل کرنے کی انہیں ممانعت ہے۔ ایک زمانے میں تو یہ حال تھا کہ اگر کوئی شوردر (جسے اچھوت کہا جاتا ہے) تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کرتا تو اس کے کانوں میں سیسہ لگھلا کر انڈیل دیا جاتا۔ فی زمانہ بھارت میں شوردروں نے ٹھیکر کے کچھ آزادی حاصل کر لی ہے مگر ہندو معاشرہ میں اب تک انہیں کوئی مقام حاصل نہیں ہو سکا اور وہ پہلے ہی کی طرح سچ بھو اچھوت ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ مسلمان قوم چھوٹ جھات کی اس لعنت سے پاک ہے کیونکہ اسلام میں خدا کی نظر میں وہی معتبر اور اعلیٰ مقام کا حقدار ہے جو جس قدر زیادہ متقی ہے۔ اسلام میں کوئی درجہ بندی نہیں، سوائے تقویٰ کے۔ مسلمان کا تعلق خواہ کسی علاقہ، ذات یا برادری سے ہو، اس کی شادی کسی بھی خاندان میں ہو سکتی ہے۔ بہر حال یہ ایک مذہبی مکتہ اور الگ بحث ہے۔

وہ چودھویں صدی عیسوی یعنی ۱۲۹۹ء کا زمانہ تھا جب وجے رائے اور کرشن رائے شمال ہند سے جنوبی ہند پہنچے۔ یہ نو بہتہ نہ لگ سکا کہ انھوں نے یہ طویل طویل ہزاروں میل کا سفر کتنے برسوں میں طے کیا۔ اس زمانے میں نہ تو آج کی طرح ذرائع آمد و رفت تھے اور نہ سفر محفوظ تھا۔ لوگ پیدل یا گھوڑوں پر سفر کرتے مگر سفر سے پہلے انہیں ہفتوں بلکہ مہینوں ایسے قافلوں کا انتظار کرنا پڑتا جو ان کی منزل مقصود کی طرف جا رہے ہوں۔ اس قافلہ میں کئی کئی سو آدمی ہوتے۔ سالانہ قافلہ

کے رہ گئیں۔

وجہ اور کرشن نے اپنے طور پر جنگ اور اس کی وجہ کا کچھ کچھ اندازہ ضرور کر لیا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک طرف ایک کسٹن مگر بہت پھرتیلی لڑکی اور اس کا ایک ساتھی ہے جبکہ دوسری طرف پانچ بھاری جہک سوار ہیں۔ ایک آدمی زمین پر گر رہا ہے۔

اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ اس کسٹن اور خوب روڑ لڑکی کو پانچ سوار اٹھا کر لے جاتے ہیں اور لڑکی اپنے ساتھی سوار کے ساتھ زبردست مدافعت کر رہی ہے۔

وجہ نے فوراً اپنی لمبی تلوار کھینچ لی کہ کرشن نے بھائی کی تقلید کی۔ اب دونوں بھائی شمشیر بکف اپنے گھوڑے بڑھا کر لڑکی کے قریب جا کر گھوڑے بول گئے۔

لڑکی کے پریشان چہرے پر رونق آ گئی اور اس نے بڑے جوش سے مخالف سواروں پر حملہ کر دیا۔

وجہ اور کرشن بھی لڑائی میں شریک ہو گئے۔ اب لڑکی اس کا ساتھی سوار اور یہ دونوں بھائی سب ملا کر چار ایک طرف تھے اور دوسری جانب پانچ مسٹرڈے سوار تھے جن کے رنگ تقریباً سیاہ تھے۔

دوبارہ لڑائی بالکل خاموشی سے شروع ہوئی۔ کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی اور جنگ شروع ہو گئی۔

اسی وقت نہ معلوم ایک سوار اور کدھر سے آ گیا اور وہ مخالف سواروں کے ساتھ شامل ہو کر لڑنے لگا۔

جنوبی ہند کے لوگ عام طور پر چھوٹی اور خرد تلواروں کو استعمال کرتے تھے اور شمال میں لمبی اور سیدھی تلواروں کا رواج تھا۔ وجہ اور کرشن ایسی ہی تلواروں سے لڑ رہے تھے۔ دونوں بھائیوں کے لیے یہ قسمت آزمائی کا بہترین موقع تھا۔ انہوں نے لڑکی کے کپڑوں اور ہاتھ میں ہیرے کی کٹی انگلیوں سے یہ تواندازہ کر لیا تھا کہ اس کا تعلق کسی اعلیٰ خاندان سے ہے۔ اب اگر وہ لڑکی کو حملہ آوروں کے جھگڑے سے چھڑا کر اس کے گھڑ تک پہنچانے میں کامیاب ہوتے ہیں تو ان کی تقدیر کے بندر دوازے کھل سکتے ہیں ورنہ اتنی دیر سے آن بے کار ہو جائے گا۔

وجہ اور کرشن نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا۔ پھر دونوں مخالف سواروں پر اس زور سے حملہ آور ہوئے کہ دو مخالف سوار زمین سے ٹک گئے۔ ان میں یقیناً گھبراہٹ پیدا ہوئی ہوگی لیکن

وجہ اور کرشن نے انہیں سنبھلنے کا موقع نہ دیا اور دوسرا حملہ کر دیا۔

اس حملہ سے زمین سے تو کوئی نہ ٹکا مگر مزید دو سوار شدید زخمی ہوئے۔ انہوں نے فوراً اپنے گھوڑے گھما دیے اور سرپٹ بھاگے۔

اب صرف دو باقی رہ گئے تھے جو میدان چھوڑنے کا راستہ ڈھونڈ رہے تھے۔ ادھر وجہ اور کرشن مسلسل حملے کر رہے تھے جس سے زخمی ہو کر باقی دونوں بھی بھاگ گھڑے ہوئے۔ اب میدان بالکل صاف تھا۔

گھرائی ہوئی لڑکی کا چہرہ مسرت سے چمکا اٹھا اور وہ وجہ اور کرشن کے گھوڑے سے گھوڑا ملا کر کھڑی ہو گئی۔

لڑکی نے وجہ سے کچھ کہا مگر وجہ اس زبان سے واقف نہ تھا اس لیے سمجھ نہ سکا۔ جنوب کے علاقے میں دکھنی، مرہٹی اور تامل زبانیں بولی جاتی تھیں۔ یہ تینوں زبانیں اس قدر ملی جلی تھیں کہ ایک ہی زبان معلوم ہوتی تھیں۔

وجہ اور کرشن شمال کے رہنے والے تھے جہاں بھاشہ اور اڑیہ کی اور ی زبان کثرت سے بولی جاتی تھی۔

وجہ رائے نے اندازہ لگایا کہ لڑکی اس کا شکریہ ادا کر رہی ہے۔ پھر لڑکی کے ساتھی نے کچھ ایسے اشارے کیے جس سے وجہ اور کرشن کی سمجھ میں یہ آیا کہ یہ لڑکی کسی ریاست کی مہارانی ہے۔ یہ سمجھتے ہی وجہ اور کرشن جلدی سے گھوڑوں سے اتارے اور اپنی وہ خون آلود تلواریں جو ابھی ابھی انہوں نے نیام میں ڈالی تھیں، معدنیام کے اپنے ہاتھوں پر رکھ کر بڑے ادب سے مہارانی کو پیش کر دیں۔

یہ دونوں بھائیوں کی طرف سے اظہارِ اطاعت تھا۔

اس کے جواب میں مہارانی بھی گھوڑے سے اتار پڑی۔ پہلے اس نے وجہ کی تلوار، جو وہ اپنے ہاتھوں پر لیے کھڑا تھا، اٹھائی اور مسکراتے ہوئے وجہ کی کمر میں لگا دی۔ یہی عمل اس نے کرشن کے ساتھ دہرایا۔ پھر گھوڑے پر سوار ہو کر دونوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وجہ اور کرشن جیت کر کے اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور مہارانی کے پیچھے پیچھے اپنے گھوڑے بھگانے لگے۔

قدرت کا بھی کیا اچھا انتظام ہے کہ اگر اتفاق سے دو آدمی ایسے مل جائیں جو ایک دوسرے

کی زبان نہ بھانتے ہوں تو بھی وہ کچھ زبان سے اور کچھ اشاروں سے اپنا مقصد ایک دوسرے کو سمجھا دیتے ہیں جس طرح آج پاکستان سے عرب امارات یا یورپ کے ممالک کو جانے والے پاکستانی کرتے ہیں۔

ہمارائی اور اس کا ساتھی سوار آگے آگے اور دوڑا کاسے آنے والے دجے رائے اور کرشن رائے ان کے پیچھے شام کے دھند کے میں گھوڑے بھگاتے چلے جا رہے تھے کہ انہیں سامنے سے آتا ہوا سواروں کا ایک دستہ دکھائی دیا۔

آنے والے جب قریب آئے تو ہمارائی نے اپنا گھوڑا روک لیا اور گھوڑے سے اتر کر سب سے آگے آنے والے سوار کی طرف زور زور سے چلاتی ہوئی دھڑکی۔

آنے والے سوار نے بھی اپنا گھوڑا روکا اور اتر کے وہ بھی چچیتا ہوا لڑکی کی طرف بڑھا۔ دجے اور کرشن حیران حیران نظروں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ پھر جب وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے تو دجے نے کرشن کو بتایا:

”اے آنے والا سوار مرد نہیں، عورت ہے۔“ دجے نے بڑی سرت سے کہا۔
جواب میں کرشن نے بھی اٹکھن کیا:

”وہ عورت بوڑھی ہے۔ شاید اس کی لڑکی کی ماں جسے ہم ہمارائی سمجھ رہے تھے؟“
ٹھیک اندازہ لگایا تم نے۔

دجے نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا:

”ہمارائی دراصل وہ بوڑھی عورت ہے اور ہمیں ملنے والی یہ لڑکی اس کی بیٹی یعنی راجکمار کی ہے۔“
چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی کو چھیڑا:

”ابھی توقع لگانے کی ضرورت نہیں دجے۔ کیا پتہ راجکمار کی شادی شدہ ہو یا اس کا کوئی منگیتر موجود ہو۔ پھر ہمیں ابھی اپنے پیروں پر کھڑے ہونا ہے۔ ایسی باتوں کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔“

دجے رائے، کرشن رائے اور راجکمار کی ساتھی اپنے گھوڑوں سے اتر کر راسیں پکڑے،
ماں بیٹی کے اس ملاپ کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے کہ ہمارائی اور راجکمار دونوں ان لوگوں کی طرف بڑھیں۔

یہ لوگ سمجھ گئے کہ راجکمار نے ہمارائی کو جنگ کی پوری تفصیل بتائی کی ہوگی اور اب ہمارائی شاید

انہیں ”شباباشی“ کہنے آ رہی تھی۔

ان کا خیال ٹھیک تھا۔

ہمارائی ان کے قریب آئی تو راجکمار کی ساتھی سوار نے اسے سلام کیا۔ ہمارائی نے شاید اپنی زبان میں اس کی تعریف کی۔

دجے اور کرشن نے سوار کو سلام کرتے دیکھ کر اس کا طریقہ اور انداز ذہن نشین کر لیا۔ چنانچہ جب ہمارائی ان دونوں کی طرف بڑھی تو انہوں نے بھی بالکل سوار ہی کی طرح ہمارائی کو سلام کیا اور مرتھکا کے کھڑے ہو گئے۔

ہمارائی کو شنید ان کا یہ انداز بہت پسند آیا۔ اس نے دونوں کی کمر چٹکی دے کر شاباشی دی اور راجکمار سے اپنی زبان میں کچھ کہا جسے دونوں بھائی بالکل نہ سمجھ سکے مگر ہمارائی کی بات پر راجکمار جس انداز سے شنائی، اس نے دجے رائے کو کسی اور ہی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا۔

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔

ہمارائی نے واپسی کا حکم دیا۔ تمام لوگ خاموشی سے ہمارائی کے پیچھے چلنے لگے۔ دو تین گھنٹوں کی مسافت کے بعد دو دروازے پر روشنیاں چمکتی دکھائی دیں۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ اب آبادی قریب ہے۔

کچھ دیر بعد یہ لوگ آبادی میں پہنچ گئے۔ ہر طرف تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی اور سامنے ایک بہت بڑا دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔

آگے بڑھے تو دروازے کے ساتھ تفصیل بھی نظر آئی۔ یقیناً یہ کوئی قلعہ تھا لیکن تفصیل قدر آدم سے زیادہ اونچی نہ تھی۔

قلعہ کے دروازے پر ہنوت پہرہ تھا۔ کئی فوجی دستے پڑے باندھے کھڑے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے حاذر پر ہانے کے لیے تیار ہیں۔

ہمارائی اور راجکمار کو دیکھ کر لشکریوں نے سلامی دی اور صدر دروازہ کھول دیا گیا۔ ان لوگوں کے داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا گیا۔

دو دروازے کے دونوں بھائیوں کو یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی مشکل پیش نہ آئی کہ کیا لشکری اور کیا وہاں کے عوام سب کے چہروں پر خوف سا طاری تھا۔ وہ سب کھوٹے کھوٹے سے اور بھرائے بھرائے دکھائی دے رہے تھے۔

دہاں راجکاری دیواجی منی بھی موجود تھی۔ وہ وجے رائے کو بار بار چور نظروں سے دیکھتی تھی۔ اس کے اس طرح دیکھنے سے وجے کا خون تیزی سے گردش کرنے لگا مگر کرشن کا خون خشک ہو رہا تھا۔ اسے خطرہ پیدا ہو رہا تھا کہ کہیں ہمارا فی اپنی بے احتیاطی بیٹی کی نظروں نہ پڑھ لے اور پھر ان دونوں کو پہلی ہی ملاقات میں راج محل سے بے عزت کر کے نکال دیا جائے مگر بلا شے مدد لے بغیر گزشت۔

ایک ہفتے کی غمت سے وجے رائے اور کرشن رائے مقامی زبان سمجھنے اور بولنے لگے۔ ہمدانی نے وجے رائے کو اپنے ذاتی محافظ دستوں کا سردار بنا دیا اور کرشن رائے کو اس کا نائب مقرر کیا گیا۔

دونوں بھائی بڑی تندہی اور خلوص سے ریاست کے کاموں میں رہے۔ وجے نے ریاست ہڈاؤ کی اور کرشن کی ریاستوں کے حالات معلوم کرائے تو اسے معلوم ہوا کہ سوائے روگ ہلی کی ریاست کے اور کوئی ریاست ہڈاؤ سے زیادہ طاقتور نہیں ہے اور روگ ہلی ہی ہڈاؤ کی سب سے بڑی دشمن ہے۔

وجے رائے نے تمام حکومت مال ہمدانی کے سامنے رکھی اور درخواست کی کہ ریاست کی فوجوں میں فوری اضافہ کیا جائے ورنہ روگ ہلی کا راجہ جس کا نام ہی راجہ روگ تھا، کسی بھی وقت ریاست ہڈاؤ پر حملہ کر سکتا ہے۔

ہمدانی نے وجے رائے کو بتایا کہ خزانے میں اتنی رقم نہیں ہے کہ مزید فوج کے اخراجات برداشت کیے جاسکیں۔ اس کے ساتھ ہی ہمدانی نے وجے رائے کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ راجہ روگ ہڈاؤ پر حملہ نہیں کر سکتا۔

وجے رائے نے حیران نظروں سے ہمدانی کو دیکھا:

ہمدانی۔ روگ ہلی اور ہڈاؤ کے سرحدی دستوں میں جنگ ہوتی رہتی ہے۔ اس دن روگ ہلی کے سواروں نے راجکاری کو گرگ خارا دروغا کرنے کی کوشش کی، اس کے باوجود آپ فرما رہے ہیں کہ راجہ روگ ہڈاؤ پر حملہ نہیں کر سکتا جبکہ میری اطلاع کے مطابق راجہ روگ کی طاقت ہماری فوجی قوت سے دوگنی ہے اور وہ کسی وقت بھی ہڈاؤ پر قبضہ کر سکتا ہے۔

وجے رائے کا انداز استغما میر تھا۔

ہمدانی سوچ میں پڑ گئی۔

وجے رائے اور کرشن رائے کو ایک بڑے کمرے میں ٹھہرایا گیا جہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ راجکاری کے ساتھ دلے سپاہی کو بھی ان دونوں کے ساتھ ہی قیام کرنے کا حکم ہوا تھا۔

اس سپاہی کو اجنبیوں کے ساتھ ٹھہرنے کا حکم ہمدانی نے دیا تھا شاید اس لیے کہ ان کے میل جول اور باتوں سے دونوں ملک کے حالات ایک دوسرے کو معلوم ہو سکیں گے لیکن وجے اور کرشن ایک گھنٹے تک سرمو غنی کرنے کے باوجود اس سے کچھ معلوم نہ کر سکے اور نہ اپنے حالات پوری طرح بتا سکے۔

کھانے کے بعد انھوں نے پھر گفتگو شروع کی جس میں زبان سے زیادہ اشاروں سے کام لیا گیا۔ ان کی تمام رات اسی کوشش میں گزر گئی مگر اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وجے رائے اور کرشن رائے کو اس ریاست کے بارے میں تمام موٹی موٹی باتیں معلوم ہو گئیں۔

اس ریاست کا نام ہڈاؤ تھا۔ جن لوگوں سے ان کی جنگ ہوئی تھی وہ ہمارے ریاست روگ ہلی کے سرحدی محافظ تھے۔

ریاست ہڈاؤ کا راجہ ان دنوں سخت بیمار تھا اور اس کے زندہ بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ ریاست کا تمام انتظام ہمدانی کے ہاتھ میں تھا اور اس کی بیٹی راجکاری دیواجی منی راجہ کی واحد اولاد اور ولیعہد ریاست تھی۔

دوار کا کے اجنبیوں کو یہ بھی بتایا گیا کہ ہڈاؤ اور روگ ہلی میں پرانی دشمنی ہے اور رائے دن جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔

وجے رائے نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ راجکاری دیواجی منی ابھی تک کنواری کیزا ہے اور ہمدانی نے اس کا کہیں رشتہ طے بھی نہیں کیا ہے۔

وجے رائے اور کرشن رائے کے لیے یہی باتیں کافی تھیں۔ انہیں اس وقت اور زیادہ اطمینان ہوا جب سپاہی نے انہیں بتایا کہ ان دونوں کی بہادری اور راجکاری دیواجی منی کی سفارش پر ہمدانی نے دونوں بھائیوں کو سرکاری رہائش گاہ یعنی راج محل کے مانتوں میں ملازم رکھ لیا گیا ہے۔

دوسرے دن وجے رائے اور کرشن رائے کو راج محل میں ہمدانی کے سامنے پیش کیا گیا۔

و جبے رائے نے محسوس کیا کہ ہمارائی کوئی بات چھپانے کی کوشش کر رہی ہے، اس لیے اس نے بات ختم کرنے کے لیے کہا:

”ہمارائی فرماتی، میں تو میں تسلیم کرتی ہوں کہ راجہ روگ ہڈ ناڈ پر حملہ نہیں کر سکتا ورنہ بھڑا ہوا کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اور مجھے یہ بھی خطرہ ہے کہ اگر ہم اسی غلط فہمی میں مبتلا رہے تو اس سے ہمیں نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔“

ہمارائی نے سوچا کہ وجے رائے جو اس قدر غصہ اور محنت سے ریاست کے لیے کام کر رہا ہے اس کے دل میں بدگمانی پیدا ہو سکتی ہے اس لیے اس نے مجبوراً وہ راز اگل دیا، جسے وہ اب تک چھپا رہی تھی۔

وجے رائے: ”ہمارائی نے اسے مطالبہ کیا:

”تمہارے خدشے اور دوسو سے اپنی جگہ درست ہیں اور ہم بھی اپنی جگہ درست ہیں مگر تم جیسے وفادار اور جان نثار سے ہم وہ راز نہیں چھپانا چاہتے جس کی بنا پر ہمیں یقین ہے کہ راجہ روگ اس وقت تک ہڈ ناڈ پر حملہ نہیں کر سکتا جب تک وہ ہماری طرف سے بالکل ناامید نہ ہو جائے یا ہم اسے صاف جواب نہ دیدیں۔“

وجے رائے کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ وہ ہمارائی کا منہ دیکھ کر رہ گیا۔

ہمارائی نے ذرا رک کے کہا:

وجے رائے: اصل بات یہ ہے کہ راجہ روگ نے راجہ مادی دیو اچھی مٹی کے لیے اپنی شادی کا پیغام بھیجا ہے۔“

یہ سنتے ہی وجے رائے کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔

گر۔

اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا اور کہا:

”پھر آپ نے کیا جواب دیا راجہ روگ کو؟“

”یہ تو ہم بعد میں بتائیں گے۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ کیا ہمیں یہ پیغام مان لینا چاہیے؟“ ہمارائی نے وجے رائے سے سوال کر کے اسے گھبرا دیا۔

وجے کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ ہمارائی نے اسے خاموش دیکھ کر کہا:

وجے رائے: ”ہم نے تم سے سوال کیا ہے۔ تم جواب کیوں نہیں دیتے؟“

”جی..... وہ.....“ وجے رائے بوکھلا کے بولا:

”راجہ روگ آخر راجہ ہے۔ روگ ہلی، ہماری ریاست سے بڑی ریاست ہے۔ رما اس کی صورت، شکل، اکو دار اور ذات برادری کا معاملہ، اس کے بارے میں تو آپ کو علم ہو گا ہی۔ اگر راجہ مادی دیو اچھی مٹی کو یہ رشتہ پسند ہوتو۔“ وجے رائے کہتے کہتے رک گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

”نہیں وجے رائے!“

ہمارائی نے شانہ انداز میں کہا:

”دیو اچھی مٹی اگر پسند بھی کرے تو ہم یہ رشتہ نہیں کر سکتے۔“

”ٹھیک ہے ہمارائی جی۔ آپ کا حکم ہی چلنا چاہیے۔“

وجے رائے نے سنبھل سنبھل کے کہا:

”راجہ روگ میں ضرور کوئی عیب ہو گا!“

”تم عیب کی بات کرتے ہو۔ اس میں وہ عیب ہے جو دھوٹے سے نہیں دھل سکتا۔ ہمارائی کا لہجہ بہت سخت ہو گیا تھا:

”ہاں وجے رائے۔ ذرا یہ تو بتاؤ تمہاری ذات کیا ہے؟“

ہمارائی کا سوال بڑا اچانک تھا۔ وجے رائے پریشان ہو گیا مگر فوراً سنبھلا اور بولا:

”ہمارائی جی۔ ہمارے دیس میں تین ذاتیں اونچی ہوتی ہیں۔ ایک برہمن، دوسری ٹھاکر اور تیسری ولین۔ ایک چوتھی ذات بھی ہوتی ہے مگر وہ ہمارے برابر کی نہیں ہوتی۔ وہ ہمارے سامنے گھڑی بھی نہیں ہو سکتی۔“

”کیا تمہارے دیس میں پنج ذات نہیں ہوتی؟“

”ہوتی ہے ہمارائی۔ میں اسی کا ذکر کر رہا ہوں۔“ وجے نے جواب دیا:

”اس پنج ذات کو ہم شہود کہتے ہیں۔ ان کا سایہ بھی پڑ جائے تو ہم ناپاک ہو جاتے ہیں۔“

”تو پھر کچھ لو کہ راجہ روگ ہلی اسی پنج ذات سے ہے۔“

ہمارائی نے اطمینان سے کہا:

”وہ دراور ذات کا ہے جو اپنے آپ کو بھارت کے اصلی باشندے کہتے ہیں۔ سو بہت کچھ

تو جیسے کالا دیو۔ اندھیرے میں کوئی دیکھے تو ڈر جائے۔“

"اچھا۔ تو یہ بات ہے۔"

وجہ رائے خوش ہو گیا۔

"ڈراوڑ کول اور بھیل کو تو ہمارے دیس میں بھی پنج ذات سمجھا جاتا ہے۔"

"تم نے اپنی ذات نہیں بتائی وجہ؟" ہمارائی نے اپنا سوال دہرایا۔

"میں ٹھاکر ہوں ہمارائی۔"

وجہ رائے نے بڑے غر سے کہا:

"ہمارے دیس میں یہ ذات راجاؤں، ہمارا جاؤں کی کہلاتی ہے۔ ٹھاکر یا تو راجہ ہوتے ہیں

یا پھر سردار لشکر۔" شمشیر زنی اور شسوار ہمارا پیشہ ہے۔ سچ پوچھیے تو ہم دونوں بھائی جنوب میں اسی

ایسے آئے ہیں کہ فوج میں ملازم ہو کے بہادری کے جوہر دکھائیں۔"

"ہم تم سے خوش ہوئے وجہ رائے۔"

ہمارائی نے کمال سرت سے کہا:

"ہمارا خاندان بھی صدیوں سے راجہ ہوتا چلا آیا ہے۔ ہم نے تمہیں فوجی ملازمت میں لے

لیا ہے۔ وقت آنے پر تمہاری شمشیر زنی کے جوہر بھی دیکھیں گے۔"

تم جانتے ہو وجہ، کہ ریاست کے ہمارا بہت دنوں سے بیمار ہیں۔ ویدوں نے، ناامیدی

کا اظہار کر دیا ہے۔ راجہ روگ نے ہمیں راجکاری کے لیے ایک سال پہلے پیٹا میٹھا دیا۔ ہمارا راجہ

اور وقت بھی بیمار ہے۔ ہم نے انکار کرنے کے بجائے کھلوا دیا تھا کہ ہمارا راجہ بیمار ہیں۔ ان کو تندرست

ہو لینے دو کیونکہ ان کی مرضی کے بغیر ہم راجکاری دیو ارجی منی کی شادی کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ جب سے

اب تک ہم اسے ڈالتے چلے کر رہے ہیں۔ مگر اب وہ بہت زور دے رہا ہے۔ یہ روز درز کے سرورہی

جھگڑے اسی وجہ سے ہوتے ہیں۔

ہمارے پاس اتار دولت نہیں کہ ہم بڑی فوج تیار کر سکیں۔ ادھر راجہ روگ کے تیور ٹھیک

نہیں معلوم ہوتے۔ وہ لڑائی کے بدلے ڈھونڈتا رہتا ہے۔"

وجہ رائے نے جب یہ باتیں اپنے چھوٹے بھائی کرشن رائے کو بتائیں تو وہ بھی پریشان ہو گیا۔

سوال یہ تھا کہ بڑی فوج تیار کرنے کے لیے رقم کیسے اکٹھا کی جائے؟ ہمارائی نے توساد کہہ دیا تھا

کہ اس کے پاس رقم نہیں ہے۔

وجہ رائے اور راجکاری دیو جی منی میں روزہی ملاقات ہوتی تھی مگر وہ سب باتوں تک محدود

رہتی تھی۔

یہ بات نہیں تھی کہ ان میں بھرت کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ یہ تعلق تو دونوں میں پہلے ہی روز

پیدا ہو گیا تھا، جب وجہ رائے اور کرشن رائے نے راجکاری کے ساتھ مل کر روگ ہلی کے

حملہ آوروں کو مارا بھگایا تھا۔ اس کے باوجود دونوں کی زبانوں پر اب تک تالے پڑے تھے مگر یہ

تالے اس دن ٹوٹ گئے جب راجکاری نے وجہ رائے کو راج محل میں بلایا اور اسے اپنے کمرے

خاص میں لے گئے۔

یہ راجکاری کی شب خوابی کا کمرہ تھا۔ پورے کمرے میں صحن، مہینی اور سحر انگیز سی خوشبو بھینچی

ہوئی تھی۔

کمرے کو نوادرات اور خوبصورت رنگین تصویروں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ کمرے کی ہر چیز میں

ایک نفاست تھی جس سے راجکاری کی نفاست طبع کا پتہ چلتا تھا۔

ان چیزوں کے علاوہ راجکاری دیو ارجی منی کی حسین قربت نے وجہ رائے کو بے خود سا

کر دیا تھا۔

وجہ رائے نے ہمارائی سے تمام باتیں سن لی ہیں؟" راجکاری نے وجہ کو ایک زرنکار

اسٹول پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"جی راجکاری۔ مجھے ہڈناڈ اور روگ ہلی کے تمام حالات معلوم ہو گئے ہیں۔ وجہ رائے

نے جواب دیا۔

"پھر تمہارا کیا خیال ہے؟"

"کس بارے میں راجکاری؟" وجہ نے وضاحت چاہی۔

"اس بارے میں کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" راجکاری نے قدرے شرارتے ہوئے کہا۔

"ان حالات میں میری سمجھ میں صرف دو صورتیں آتی ہیں۔"

وجہ رائے نے کہا:

"پہلی صورت یہ ہے کہ ہڈناڈ کو اپنی فوج میں اضافہ کر کے اسے دگنی کر دینا ہے۔ وجہ کے

لبے میں غلصہ ہی غلصہ تھا۔

لیکن فوج کی تخی بھرتی کے لیے رقم کہاں سے آئے گی؟

راجکاری بے بسی سے بولی:

"ہمارا ایک سال سے بیمار ہیں۔ آدھے سے زیادہ گاؤں نے خراج دینا بند کر دیا ہے۔"
"رقم حاصل کرنے کے لیے راجکاری کو بھیک مانگنا ہوگی۔" وجے نے بے دھڑل کہہ دیا۔
راجکاری اس مشورہ پر چیخ اٹھی:

"وجے۔ وجے تم ہڈناؤ کی راجکاری کو بھیک مانگنے کا مشورہ دے رہے ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ میں نے تم سے کتنی امیدیں باندھ رکھی تھیں مگر تم نے مجھے ذلیل کر دیا ہے۔"
"راجکاری۔ راجکاری آپ کو کیا ہو گیا ہے؟"

وجے کو افسوس ہوا کہ اس نے ایک سنجیدہ بات کو مذاق کے انداز میں کیوں کہا۔
"آپ مجھے غلط نہ سمجھیے۔ آپ بھیک مانگنے جائیں گی تو میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ ایک کامرہ آپ کے ہاتھ میں ہو گا۔ دوسرا میرے ہاتھ میں اور تیسرا کامرہ ہڈناؤ کے ہاتھ میں ہو گا۔"
"کیا۔ کیا۔ کیا کیا تم نے؟ ہڈناؤ کی راج تانگی لگی بھیک مانگنے جائیں گی۔ تم تو پاگل ہو گئے ہو۔ میں نے تمہیں بہت اچھا سمجھا تھا۔ تمہارے لیے کیا کیا سوچا تھا میں نے مگر تم نکلا۔ دور ہو جاؤ۔ نکل جھڑپاں سے۔ میں نے تم سے بہت سی امیدیں باندھ لی تھیں۔ اپنے دل میں جگہ دی تھی لیکن تم نے مجھے یا کس کیا۔"

راجکاری۔ میں آج ہی آپ کے حکم کی تعمیل میں جا رہا ہوں۔ راج محل ہی سے نہیں بلکہ میں ہڈناؤ کو بھی ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گا۔
وجے رائے جذباتی ہوتا پھلا گیا:

"میں نے بھی آپ سے بہت سی امیدیں باندھی تھیں۔ آپ پر جان دینے کی بھی قسم کھائی تھی لیکن آپ نے بھی مجھے سخت یا کس کیا۔ بھیک مانگنے سے میری مراد یہ ہرگز نہ تھی کہ آپ فقیروں کی طرح ہر درپر ہاتھ بھیلائیں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ عوام سے فوج کی تیاری کے لیے روپیہ حاصل کیا جائے۔ اس کے لیے چلے ہیں جھوٹ بولنا پڑے کسی کو خرب دینا پڑے یا مذہب کے نام پر بھیک مانگی جلتے جنگ اور محبت میں ہر بات جارت ہے راجکاری۔ رقم اور صرف رقم اس وقت ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے اور نہ آپ دیکھیں گی کہ آج نہیں تو کل راجہ روگ، آپ کی ریاست پر زبردستی قبضہ کر لے گا۔"

راجکاری دیوا جی منی، وجے رائے کی جذباتی باتوں سے بہت متاثر ہوئی مگر بھیک مانگنے والی بات اب تک صاف نہ ہوئی تھی۔

وجے رائے: راجکاری نے زم بھے میں کہا:

"میں تمہارے جذبات کی قدر کرتی ہوں لیکن ہمیں بھیک مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم اپنی رعایا سے کہیں گے کہ ہمیں نئی فوج تیار کرنی ہے اور اس کے لیے رقم چاہیے۔ عوام ہماری ضرورت مدد کریں گے۔"

"راجکاری۔ آپ کی یہی سوچ غلط ہے۔"

وجے رائے نے مضبوط لہجے میں کہا:

"فوج کے نام پر آپ کو ایک چھٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی اور جس دن راجہ روگ کو معلوم ہوا کہ ہڈناؤ میں نئی فوج کی بھرتی ہو رہی ہے وہ اسی دن حملہ کر کے ہڈناؤ کے ساتھ ساتھ آپ پر بھی قبضہ کر لے گا۔"

"پھر تم کس طرح رقم اکٹھا کر گے؟" راجکاری نے بے بسی سے کہا۔

وجے رائے نے ادھر ادھر دیکھا پھر رازدارانہ لہجے میں بولا:

"راجکاری: اس کی ترکیب یہ ہوگی کہ ہمارا راجہ اور ہڈناؤ کی طرف سے اعلان ہو گا کہ ریاست میں کالی دیوی یا بھگوان شیو کا ایک عظیم الشان مندر بنایا جا رہا ہے، اس کی تعمیر کے لیے ہر شخص دل کھول کے چندہ دے۔ پھر دیکھیے گا کیا ہوتا ہے؟"

"تمہیں یقین ہے کہ اس طرح ہمیں فوج کے لیے رقم حاصل ہو جائے گی؟" راجکاری نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ضرور جمع ہوگی رقم۔" وجے رائے نے بڑے استقلال سے کہا:

"مگر یہ رقم کارندوں کے ذریعے جمع نہیں کی جائے گی بلکہ رقم کی وصولی کے لیے اعلان کیا جائے گا کہ ہڈناؤ، راجکاری دیوا جی منی اور ریاست کے تمام سرکاری عہدے دار خود عوام کے پاس جائیں گے اور ان سے شکرے کے ساتھ چندہ وصول کریں گے۔"

"یہ ترکیب تو اچھی ہے مگر کیا ہم کامیاب ہوں گے؟" راجکاری اب تک بے یقینی کی کیفیت کا شکار تھی۔

"راجکاری۔ یقین کیجیے، جب آپ یا ہڈناؤ، کالی دیوی یا شیو کے نام پر چندہ مانگیں گی

تو پھر کوئی ظالم ہی ہو گا جو چندہ دینے سے انکار کر سکے گا۔ دے رائے نے بڑے اعتماد سے کہ
”تم کس قدر عقلمند ہو رہے“

راجکاری نے پیار بھری نظروں سے اسے دیکھا:

”میں تو یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ شمالی علاقہ کا کوئی آدمی اتنا عقلمند بھی ہو سکتا ہے۔“

”راجکاری —“

دے رائے نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

”میں نے بھی کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ جنوبی ہند میں آپ جیسی خوبصورت راجکاری بھی ہو سکتی ہے۔
راجکاری دیواجی سنی نے شرما کے نظریں جھکا لیں۔

ریاست ہڈناڈ (بعض کتابوں میں اسے ہڈناؤ لکھا گیا ہے) اس دن جن کا سامنا پیش
کر رہی تھی جب ہمارا ہی ہڈناڈ اور راجکاری دیواجی سنی ہاتھوں میں بڑے بڑے قیلے لے کر گاڑیوں
اور شیو کے نام پر رعایا سے چندہ مانگنے نکلیں۔

کالی دیوی ہندو مذہب کی زبردست دیوی ہے جو جنگ و جدل، جو رستم اور موت کی دیوی
کہلاتی ہے۔ اسی طرح بھگوان شیو کو خدا کا اوتار بلکہ خدا (بھگوان) سمجھا جاتا ہے۔

ہندو آواگون کے قائل ہیں یعنی ان کا عقیدہ ہے کہ مرنے والے فوراً ہی کسی دوسری شکل میں
پھر دنیا میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ شکل کتے، بلی اور سونڈر کی بھی ہو سکتی ہے۔

اس دن سے پہلے ایک ہفتہ تک علاقہ نے پوری ریاست ہڈناڈ میں ڈنگی بیٹھتی کہ
بھگوان شیو اور کالی دیوی کے عالی شان مندر ہڈناڈ میں تعمیر کیے جا رہے ہیں۔ اس مقدس کام میں
حصہ لینے کے لیے غلام سے اپیل کی گئی تھی اور یہ اعلان ہوا تھا کہ چندہ کی رقم کسی سرکاری اخذ کو نہ دی جائے
بلکہ چندہ وصول کرنے کے لیے ہمارا ہی ہڈناڈ اور راجکاری دیواجی سنی غلام کے پاس خود
کا ثواب ہو۔ چل کر آئیں گے تاکہ چندہ لینے اور دینے والوں کو برابر

اس اعلان سے لوگوں میں بڑا جوش و خروش پیدا ہوا۔ اور وہ اس دن کا بے چینی سے انتظار
کرنے لگے جس سے ہمارا ہی ہڈناڈ اور راجکاری کی چندہ مہم شروع ہونے والی تھی۔

کوشن رائے کے مشورہ سے یہ ہم ایک ہفتہ کے بعد یہ کہ کر بند کر دی گئی کہ اگر تعمیر کے لیے مزید رقم کی ضرورت پڑی تو چندہ ہم دوبارہ شروع ہو جائے گی۔

ددار کا کے دونوں بھائیوں نے اس کام میں جان لٹا دی تھی۔ ہمارا اور راجکمار کی کو سورج نکلنے سے پہلے جگنا اور انہیں ہم کے لیے تیار کرنا یہ انہیں کا کام تھا۔

وجہ رائے کو اس دوران راجکمار کی دیواجی مہی کی قربت حاصل رہی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وجہ کو راج محل میں ہمارا اور راجکمار سے گفتگو کرتے اور آئندہ دن کا پروگرام بناتے کدھی کدھی رات بیت جاتی۔ اس وقت ہمارا توجہ رائے کو اپنی طرف سے حکم دیتی کہ وہ اپنے گھر جو فیسل کے ساتھ غلام کر دیتی ہیں تھا، جانے کے بجائے راجکمار کی خواہش کے برآمدے میں سو جائے۔

دوسرا بھائی کوشن رائے اگرچہ بے لوث خدمت انجام دے رہا تھا مگر اس کام میں بھائی کے ساتھ اس کا مستقبل بھی منور نے کی امید تھی۔ اس لیے دونوں بھائی رات دن بیوں کی طرح کام میں جتنے رہتے۔ آخر ہڈنا ڈالوں کی محنت پھل لائی۔ وجہ رائے کو دورانہ پیشی سے ہڈنا ڈکے دیا توں سے سپاہی بھرتی ہونا شروع ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہڈنا ڈکے فوج کی تعداد گئی ہو گئی اور اس فوج کے لانے کے انتظامات کیے جانے لگے۔

ہمارا اور راجکمار نے تمام انتظامات وجہ رائے پر چھوڑ دیے تھے یعنی وجہ رائے ایک طرح سے ہڈنا ڈکے سیاہ و سفید کا کام ہو گیا تھا۔

کام کے ساتھ ساتھ وجہ رائے اور راجکمار کی دیواجی مہی کا عشق بھی زوروں پر تھا۔ ہمارا اور اس کا علم تھا کہ وہ بھی ڈھیلے رہے رہی تھی اس لیے کہ وجہ رائے سے بہتر داماد سے کہاں مل سکتا تھا۔

ادھر وجہ رائے اس دھن میں لگا تھا کہ کسی طرح راجہ روگ کا ہڈنا ڈکے پر منڈلاتا ہوا فوس مایہ دھ کیا جائے اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب ہڈنا ڈکے نئی فوج خاموشی کے ساتھ ہڈنا ڈکے میں داخل ہو جائے اور پہلے سے موجود فوج کے ساتھ آئے۔

وجہ رائے نے یہ انتظام کیا تھا کہ باہر سے بھرتی ہونے والے سپاہی دس دس پانچ پانچ کر کے ہڈنا ڈکے میں داخل ہوں اور راجہ روگ کو اس کی خبر نہ ہو سکے۔

نئے سپاہیوں کے آنے کی رفتار بہت سست تھی لیکن وجہ رائے کوئی خطہ مول لینا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس نے آنے والوں کی اس تعداد میں اضافہ نہیں کیا۔

چندہ ہم راج محل سے شروع ہو گئی تھی۔

سب سے آگے ہمارا ہڈنا ڈکے تھی۔ اس کے ساتھ ایک ملازم ایک خالی بوری کپڑے چل رہا تھا اس کے پیچھے راجکمار کی دیواجی مہی تھی۔ راجکمار کی ایک داسی دکنیزا ایک ریشمی تھیلا لیے اس کے ساتھ تھی۔

ان دونوں کے بعد وجہ رائے اور کوشن رائے تھے جو خود اپنے ہاتھوں میں بڑے بڑے چھوٹے لیے ہوئے تھے۔

راج محل کی سیڑھیوں ہی سے چندہ دینے والوں کا ہجوم شروع ہو گیا تھا جس میں راج محل کی دایاں اور غلام بھی پیش پیش تھے۔

چندہ مانگنے والے مجمع کے درمیان بنائے گئے راستے سے گزر رہے تھے اور ہر چھوٹے بڑے کو سلام کر کے بوری یا تھیلا اس کے سامنے کر دیتے تھے اور جس سے جو ہو سکتا تھا وہ فیصلے میں ڈال دیتا تھا۔ ہمارا اور راجکمار کی بوریوں کی ریاست کے بڑے بازار تک پہنچتے پہنچتے ہی تانبے، چاندی اور سونے کے سکوں سے بھر گئیں اور انہیں نئی بوریوں میں لٹکا کر اپنا بیٹھا تھا۔

چندہ کی یہ ہم دوپہر تک جاری رہی۔ ہمارا اور راجکمار کی دیواجی مہی کا بدن ٹھکن سے چور چور ہو گیا تھا مگر انہیں تعجب ہو رہا تھا کہ چندہ دینے والوں میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کے گھروں میں شاید ایک ہی وقت چھوٹا کھانا ہو گا۔

دوسرے دن پھر یہ ہم شروع ہوئی مگر اس جگہ سے جہاں تک کل چندہ وصول کیا گیا تھا۔ امیروں کا تو کتنا ہی کیا، غریب عوام نے بھی اس چندہ ہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ایک تو چندہ کالی دیوی اور بھگوان شیو کے نام پر مانگا جا رہا تھا۔ دوسرے یہ کہ چندہ مانگنے والوں میں راج مانا اور ریاست کی وارث راجکمار کی دیواجی مہی آگے آگے تھیں۔ آج بھی یہ ہم دوپہر تک جاری رہی۔ پھر کل پر اٹھا رکھی گئی۔

یہ چندہ ہم ایک ہفتہ تک جاری رہا۔ اس عرصہ میں ہمارا اور راجکمار اپنی ریاست کے کوٹنے کوٹنے تک پہنچ گئی تھیں۔ راج محل میں چندہ کی رقم کے کئی ڈھیر لگ گئے تھے۔ ہمارا نے اتنی کثیر رقم ریاست کے خزانے میں بھی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ پھر وجہ رائے اور

ہوئی اور نصف شب کے قریب وہ اس دنیا کو چھوڑ گیا۔

راجہ اگرچہ معذور اور مجہول پڑا تھا لیکن ہمارا فی کو یہ تو سہارا تھا کہ اس کا بپتی، اس کا سرپرست موجود تھا۔ اب تو اس کی دنیا بالکل ابڑ کے رہ گئی تھی۔ وہ بیوہ اور راجکاری یتیم ہو گئی تھی۔ دے اور کشن ان کے غم میں شریک تھے مگر وہ دونوں ان ماں بیٹی کو سوائے تبدیلیاں دینے کے اور کر ہی کیا سکتے تھے۔

راجہ ہڈناڈ کی موت تو ایک قیامت تھی ہی۔

مگر۔

اسی رات صبح ہونے سے صرف ایک گھنٹہ پہلے کا روگ کے راجہ روگ نے ہڈناڈ پر چڑھائی کر دی۔

یہ اس کے کینے پن کی انتہا تھی کہ راج محل میں راجہ ہڈناڈ کی لاش پڑی تھی۔ پوری ریاست سوگ منا رہی تھی اور اس نے اس غم آلود فضا کو انسانی خون سے رنگیں کر دیا تھا۔

نما امروہی محافظا سے جا چکے تھے اور قبل اس کے کہ ہڈناڈ کی مرگاری فوج مقابلے پر آتی، کا روگ کی فوجوں نے انہیں گھیرے میں لے کر ہتھیار رکھوا لیے۔ ہڈناڈ بالکل بے دست و پا ہو گیا تھا۔

ہمارا فی اور راجکاری، ہمارا جہ کی لاش کے پاس سر جھکا گئے بیٹھی تھیں اور وجے رائے کا دماغ بڑی تیزی سے گردش کر رہا تھا۔ راج محل کو دشمن کی فوجوں نے گھیر لیا تھا اور ہڈناڈ کی راج گدی پر راجہ روگ براجمان تھا۔

ہمارا فی! ایک دم وجے رائے بیچ پڑا۔

ہمارا فی اور راجکاری نے مڑھائے ہوئے چہرے اوپر اٹھائے۔ ان کی آنکھیں دیران نہیں اور ہونٹ تھر تھرا رہے تھے۔

”کیا بات ہے وجے رائے۔ چیخ کیوں رہے ہو؟“ ہمارا فی نے برا سامنہ بنایا۔

”آپ ذرا دوسرے کمرے میں چلیے۔“

وجے نے درخواست کی:

”میں نے چھٹکارے کی ایک تدبیر سوچی ہے۔“

”وجے رائے۔ قسمت خراب ہو تو سب تدبیریں الٹی ہو جاتی ہیں۔“ ہمارا فی نے ایک ٹھنڈی

ایک دوسری مشکل یہ بھی تھی کہ بڑی تعداد میں سپاہیوں کو ہڈناڈ لانے سے راز افشا ہونے کے علاوہ ان کی دلالت کا بھی مسئلہ تھا۔ وجے رائے نئی فوج کو پرانی فوج کے قریب مگر علا اس سے الگ رکھنا چاہتا تھا۔

آج وجے رائے نے ہڈناڈ سے صرف ایک میل دور بے حد محفوظ اور دشمن سے پوشیدہ وہ جگہ ڈھونڈ نکالی جو جنگل سے گھری ہوئی تھی۔ اس کے قریب سے ایک برساتی نالہ بھی گزرتا تھا اور بڑے بڑے غار تھے جن میں فوجی چھپائے جاسکتے تھے۔

ایک ہفتہ کی کوشش سے اس جگہ کو فوجیوں کی رہائش کے قابل بنادیا گیا اور نئے فوجیوں کے آنے کا سلسلہ تیز ہو گیا۔

وجے رائے نے فوری ضرورت کے لیے ۲۰۰ بہترین سپاہیوں کی رہائش کا انتظام راج محل کے بالکل قریب کر دیا جو آواز دینے پر بھی راج محل میں داخل ہو سکتے تھے۔

وجے رائے کے تمام انتظامات بڑی تیزی سے مکمل ہو رہے تھے اور اس نے راجکاری کو یقین دلادیا تھا کہ ہفتہ دو ہفتہ بعد ہڈناڈ فوجی حیثیت سے اس قدر مضبوط ہو جائے گا کہ جو راجہ روگ کے حملے کا منہ توڑ جواب دے سکے بلکہ جوابی حملہ بھی کر سکے مگر ایک مثل مشہور ہے کہ:

تدبیر کند بندہ، تقدیر کند خندہ

یعنی آدمی تدبیر کرتا ہے اور تقدیر اس پر ہنستی ہے۔

یہی حکم وجے رائے کی کوششوں کا ہوا۔

وجے رائے پر کیا راجکاری اور کیا ہمارا فی سب ہی اعتماد کرتے تھے۔ ہمارا جہ ہڈناڈ جو ایک زمانے سے صاحبِ فرائش تھا اس نے وجے کی خدمات کا حال سنا تو اس نے وجے رائے کو بلا کر شاباش دی۔

وجے رائے نے ہمارا فی کو بتادیا تھا کہ ہڈناڈ کی مصیبت ایک ہفتہ بعد ختم ہو جائے گی۔ ہمارا فی اس بات سے بہت خوش تھی اس لیے کہ وہ راجہ روگ کے خوف سے ہر دم ڈرتی رہتی تھی۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی ایک بیچ ذات سے بیاہی جائے اور ہڈناڈ کی ریاست راجہ روگ کی ماتحت ہو جائے۔

مگر ہوتا وہی ہے جو اوپر والا کرتا ہے۔

ہمارا جہ ہڈناڈ جو لسنے دنوں سے بستر پر پڑا ایڑیاں رگڑتا تھا، ایک شام اس کی طبیعت زیادہ تر

اے ہڈناؤ کی مہارانی! میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔ آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیوں کی۔ مجھے بلوایا ہوتا۔" راجہ کاروگ نے بڑے ادب سے کہا۔
مہارانی نے وجہ رائے کو اشارہ کیا۔

وجہ رائے نے اپنا سر مہارانی کی طرف کر دیا۔ مہارانی نے آہستہ آہستہ اس سے کچھ کہا۔ پھر راجہ روگ کو دکھانے کے لیے منہ چلتی رہی۔ کچھ دیر مہارانی کی بات سننے کے بعد وجہ رائے نے سیدھے ہو کر کہا:

"اے کاروگ کے راجہ!"

وجہ رائے نے بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ کہنا شروع کیا:

"مہارانی ہڈناؤ فرماتی ہیں کہ انہیں راجہ روگ کا پیغام راجہ کاری دیوا جی منی کے لیے مل گیا تھا اور ہم نے آپ کو جواب بھجوا دیا تھا کہ ہمارا راجہ کے صحت مند ہوتے ہی راجہ کاری کی شادی ان سے کر دیں گے۔ لیکن راجہ روگ نے راجاؤں کے نیت نیم (دستور) کے خلاف ہم پر حملہ کر دیا اور جلدی اس موقع پر کیا جب ہڈناؤ کے ہمارا راجہ کی لاش ان کے محل میں پڑی ہے۔ ہم خزانہ میں ذلیس کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر انہیں راجہ کاری کی ضرورت تھی تو ہمارے پاس کھلوا دیا ہوتا۔ ہم اسی دم راجہ کاری کو جیسی بیٹھی ہوتی ویسی ہی بھجوا دیتے۔ کیا راجاؤں کی شادیاں اسی طرح ہوا کرتی ہیں؟" راجہ روگ غصے میں بھرا بیٹھا تھا اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ راجہ کاری دیوا جی منی کو بالوں سے پکڑ کر اپنے محل لے جائے گا مگر جب وجہ رائے کے ذریعے اس نے مہارانی کی باتیں سنیں تو اسے بڑی ندامت ہوئی۔

وہ نظریں نیچی کر کے بولا:

"میں مہارانی ہڈناؤ سے بے حد شرمندہ ہوں۔ مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔ مہارانی کا حکم ہو تو میں اپنی فوج لے کر ابھی واپس چلا جاتا ہوں۔"

وجہ رائے نے پھر اپنا کان مہارانی کے قریب کر دیا۔ پھر جب مہارانی کچھ کہہ چکی تو وہ مہارانی کی طرف سے جواب دیتے ہوئے بولا:

"مہارانی فرماتی ہیں کہ راجہ کاروگ نے اگرچہ ہم پر بھروسہ کی طرح حملہ کر کے ہماری فوج سے ہتھیار چھین لیے ہیں مگر ہم ان کے ساتھ راجاؤں والوں کی طرح کریں گے۔

ہم اپنے ہونے والے داماد کو نہ تو ذلیل کریں گے اور نہ خالی ہاتھ جانے دیں گے۔ ہم راجہ کاری

سانسی لی اور اٹھ کے کھڑی ہو گئی۔

راجہ کاری بھی ان کے ساتھ ہوئی۔

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک وجہ رائے، مہارانی اور راجہ کاری کو سمجھاتا رہا۔ پھر جب وہ باہر آئے تو ان کے چہرے کچھ شاداب دکھائی دے رہے تھے۔

وجہ رائے نے فوراً کرشن رائے کو بلوایا۔ تھوڑی دیر اس سے گفتگو کرنے کے بعد اس نے ریاست کے چار پانچ قابل اعتماد آدمیوں کو بلوایا اور انہیں جلدی جلدی ضروری ہدایات دینے لگا۔

"دوپہر سے پہلے پہلے وجہ رائے نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے سے پہلے کے تمام انتظامات مکمل کر لیے تھے۔

پھر اس نے پہلا قدم اٹھایا۔

وجہ رائے نے مہارانی اور راجہ کاری دیوا جی منی کو اپنے ساتھ لیا اور اس محل کی طرف روانہ ہوا جہاں راجہ کاروگ قبضہ جائے بیٹھا تھا۔

یہ محل راجہ کاروگ کے محل کے علاوہ ہر ہفتہ شاہانہ دربار لگایا کرتا تھا۔

وجہ رائے نے مہارانی کے ملازم اور راجہ کاری کی ایک کینز کے ذریعے راجہ کاروگ کو پیغام بھجوا دیا تھا کہ ہڈناؤ کی مہارانی، راجہ کاروگ کے سلام کو تشریف لارہی ہیں۔

راجہ کاروگ کو پہلے تو یقین نہیں آیا۔

مگر

جب مہارانی کی سواری دربار محل کی پٹریوں پر آکر دیوار نے اندر آ کر اسے اطلاع دی کہ ہڈناؤ کی مہارانی تشریف لائی ہیں اور راجہ کے حضور آنے کی خواہشمند ہیں تو وہ گھبرا گیا اور اٹھ کے فوراً باہر کی طرف چلا۔ اس کے ساتھ اس کے ارکان ریاست اور سالارہ افواج بھی باہر کی طرف

چل پڑے۔

مہارانی اور راجہ کاری دیوا جی منی، شاہی سواری سے ان کے دربار محل کی سیڑھیوں پر کھڑی تھیں وجہ رائے کے علاوہ ان کے ساتھ صرف ایک کینز تھی۔ راجہ کاروگ مہارانی کو اس عالم میں دیکھ کر سراپا نیاز بن گیا۔

دیو اجمی منی کو اپنے ساتھ لائے ہیں۔ ہم راجکاری کو راجہ کاروگ کی رانی بنانے کا فیصلہ بہت پہلے کر چکے تھے مگر راجہ کی بیماری نے ہمیں بدحواس کر رکھا تھا۔

راجہ کاروگ اپنی ہونے والی رانی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔ اس بیماری کی تقدیر میں یہی تھا کہ دھوم دھام سے رخصت ہونے کے بجائے وہ ہڈناڈ سے خالی ہاتھ جائے۔ اسی وقت ہمارا رانی نے سسکیاں بھرنے کی اداکاری کی۔

اور۔

راجکاری دیو اجمی منی نے سر پر پٹی چندری کو تھوڑا سا ہٹا کر اپنا چاند سا چہرہ راجہ کاروگ کو دکھایا۔

وہ راجکاری کی خوبصورتی کا چرچا سن چکا تھا۔ اب اس کی ایک جھلک دیکھ کر بالکل ہنی ریشہ خلی ہو کر رہ گیا۔

پس۔

راجہ کاروگ جو مرنے والے راجہ ہڈناڈ کی مسند پر بڑے رعب سے بیٹھا تھا اپنی جگہ سے اٹھ کر ہمارا رانی کے سامنے پہنچا۔ پھر اس نے جھک کر ہمارا رانی کے پیر چھوئے اور گڑگڑایا: ہمارا رانی۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی۔ مجھے معاف کر دیجیے۔ میں راجکاری کو ہاتھ پکڑ کر نہیں لے جاؤں گا بلکہ اسے دھوم دھام سے بیاہوں گا اور راجکاری کاروگ کی ہمارا رانی بن کے یہاں سے رخصت ہوگی۔

ہمارا رانی نے ایک زوردار ٹھنڈی سانس لی اور وجہ رائے فوراً اس کی طرف جھک گیا۔ چند لمحوں بعد سیدھا ہو کر بولا:

ہمارا رانی فراتی ہیں کہ دل تو ہمارا بھی یہی چاہتا تھا کہ راجکاری کو راجکاری کی طرح رخصت کریں۔ سوائے راجکاری کے ان کے اور کون اولاد ہے جس کی خوشی وہ دیکھیں گی۔ یہ سب کچھ اور ہڈناڈ کا راجہ پاٹ سب راجکاری ہی کا ہے اور یہ سب ان کے ساتھ ہی کاروگ جائے گا مگر راجہ کاروگ نے ہمیں ذلیل کر کے رکھ دیا۔ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔

ہمارا رانی۔ ایسی بات نہ کیجیے اب۔

راجہ کاروگ جلدی سے بولا:

راجکاری کی شادی راجکاریوں کی طرح ہوگی۔ آپ جس طرح اور جیسے چاہیں گی ویسے ہی ہوگا۔

وجہ رائے نے ہمارا رانی کی طرف دیکھا:

فرمائیے ہمارا رانی۔ آپ کیا چاہتی ہیں۔ راجکاری کی شادی کس طرح ہونا چاہیے۔

پھر خود ہی ہمارا رانی کی طرف جھک گیا۔ ہمارا رانی نے وجہ سے کچھ کہا۔ اور وجہ نے راجہ کاروگ کے سامنے اسے یوں بیان کیا:

ہمارا رانی فرماتی ہیں کہ راجہ کاروگ دو روز تک ہمارے ہمان رہیں۔ اس دوران ہمارا راجہ ہڈناڈ کے کرایا کم سے کم نارغ ہو جائیں گے۔ پھر راجہ کاروگ اسی محل سے بارات چڑھائیں اور خوب دھوم دھام سے دو لہان کر ہمارے راج محل میں آئیں۔ کچھ نایاب رنگ، کچھ کھانا، تلاتے ہوں وغیرہ میں خیرات بٹے۔ قیدی آزاد ہوں۔ دونوں ریاستوں کے معززین اکٹھے ہوں تو سب کی عزت بڑھے گی اور راجکاری خوشی خوشی رخصت کی جائے گی۔

اس طرح نہیں ہمارا رانی۔

راجہ کاروگ نے کہا:

”میں ابھی اپنا قبضہ اٹھا کر کاروگ واپس جا رہا ہوں۔ آپ لوگ اطمینان سے ہمارا راجہ کرنا کرنا کرنا کیجیے۔ پھر جب آپ لوگ اس صدمہ کو بھول جائیں تو میں دھوم دھام سے بارات لے کر آؤں گا اور راجکاری کو بیاہ کے لے جاؤں گا۔ میں راجکاری سے بھی بہت شرمندہ ہوں اور ان سے معافی مانگتا ہوں۔“

وجہ رائے مستقل طور پر ہمارا رانی کی ترجمانی کر رہا تھا۔ اس نے جواب دیا:

ہمارا رانی فرماتی ہیں کہ ہم نے راجہ کاروگ کو اپنی زبان سے ہمان کہا ہے۔ اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ گھر آئے ہمان کی ہمان نوازی کیے بغیر واپس کر دیں۔ پھر راجہ کاروگ راجکاری دیو اجمی منی کو لینے آئے تھے۔ دو تین دن راجہ کاروگ ہمان رہیں۔ پھر ہم راجکاری کو ان کے ساتھ ہی رخصت کر دیں گے۔ ہمیں شادی کی کوئی تیلری نہیں کرنی۔ سب کچھ تیار ہے۔ راجہ کاروگ اگر چاہیں تو وہ ریاست سے سامان منگا سکتے ہیں اور جہنیں شادی میں شریک کرنا چاہیں انہیں ہوا سکتے ہیں۔ راجہ کاروگ اور زیادہ خوش ہو گیا۔

اس نے ہمارا رانی کی ہمان نوازی قبول کر لی اور ریاست ہڈناڈ پر جو خوف و دمہشت طاری تھی وہ ختم ہو گئی۔

پوری ریاست میں اعلان کر دیا گیا کہ دونوں ریاستوں میں صلح ہو گئی ہے اور بہت جلد

آگ دکھا دی گئی۔

اب کوئی بات ایسی نہ تھی جو راجکاری دیوا جی منی اور راجہ کاروگ کی شادی میں شامل ہو سکتی۔ اس لیے وجہ رائے نے ہمارے فرستادہ کے طور پر راجہ کاروگ سے ملاقات کی اور اس سے شادی کی تاریخ، مہانوں کی تعداد وغیرہ کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی۔ راجہ کاروگ خوشی سے پھولا نہ مہاتا تھا۔ چنانچہ بغیر کسی بحث مباحثہ کے تمام باتیں طے ہو گئیں۔

شادی کا دن اگلا منگلوار طے ہوا اور بارات کے ساتھ آنے والوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار مقرر ہوئی۔ عورتیں اور بچے ان کے علاوہ تھے۔

منگلوار کو صرف تین دن باقی تھے اس لیے اتوار ہی سے شادی میلہ شروع ہو گیا۔ بازاروں اور میدانوں کی رونق بڑھ گئی۔ بچے گانے اور کھیل تماشے والوں کی منڈلیاں (حلقے) ہڈنا ڈھپچن شروع ہو گئے اور پیر کی رات تک ہڈنا ڈھ کے تمام بازار اور میدان لوگوں سے کچھ بھر گئے۔

راجہ کاروگ کے سامنے شادی کے لیے ایک بہت بڑا پنڈال بنایا گیا جس میں کم و بیش چار ہزار آدمی ایک وقت سما سکتے تھے۔

پنڈال کو بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ وجہ رائے نے مہانوں کے گلے میں ڈالنے کے لیے پھولوں کے علاوہ چاندی کے تاروں کے ہار بھی تیار کرائے تھے۔

منگلوار کو بڑی دھوم دھام سے دربار محل سے راجہ کاروگ کی بارات چڑھی۔ کالا بھنگ راجہ کاروگ رنگین لباس میں لنگور دکھائی دیتا تھا اس کے چہرے پر اگر سفیدی تھی تو صرف اس کی آنکھوں یا دانتوں میں تھی۔ باقی تمام چہرہ شب و بچہ کی طرح سیاہ تھا۔

بارات میں ریاست کاروگ کے تمام معززین، سرکاری افسر، فوجی سردار اور راجہ کے قریبی عزیز شامل تھے۔

دھوم دھام سے گاتی، بھاتی اور ڈھول تاشے پڑتی راجہ کاروگ کی بارات دربار محل سے جب راجہ محل پہنچی تو پنڈال کے سامنے وجے رائے، کرشن رائے کے علاوہ تمام معززین ہڈنا ڈھ اس کے استقبال کرنے والوں میں موجود تھے۔

ہر باراتی کے گلے میں ایک ایک پھول کا ہار اور ایک ایک چاندی کے تاروں کا ہار ڈالا گیا۔ عورتوں کے لیے الگ پنڈال میں انتظام کیا گیا تھا، انہیں وہاں پہنچا دیا گیا۔

راجکاری دیوا جی منی کی شادی راجہ کاروگ سے ہوئی۔

راجہ کاروگ نے فوراً ہی ہرے اور جنگ کی کیفیت کے اختتام کا اعلان کر دیا۔ ہڈنا ڈھ کی فوج کو فوجی سپرکوں میں گھیر لیا گیا تھا، وہ گھیر ختم کر کے ان کے ہتھیار بھی انہیں واپس کر دیے گئے۔

کاروگ کے قابض سپاہی اب ہڈنا ڈھ کے کوچر بازار میں گھومتے پھرتے اور خریداری کرتے نظر آنے لگے۔

راجہ کاروگ نے اپنے تمام دور و نزدیک کے رشتہ داروں کو شادی میں شرکت کے لیے بلوایا۔ ہمارے نے ایک اور محل جو سامان کے گودام کے طور پر استعمال ہوتا تھا، اسے نئے آنے والے مہانوں کے لیے خالی کر دیا۔

اب یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ ہمارے راجہ کاروگ اور وجے رائے جس بے سرو ساما کے عالم میں راجہ کاروگ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، ان کی واپسی اس کے برعکس بڑے تزک و احتشام سے ہوئی۔ ریاست کاروگ کا فوجی بینڈ اور ڈھول تاشے ہمارے اور راجہ کاروگ کے سواروں کے آگے گانے بجاتے چل رہے تھے۔ خود راجہ کاروگ اور اس کے صحابہ اس جلوس میں شامل تھے۔

راجہ کاروگ انہیں راجہ محل تک پہنچانے کے لیے واپس آیا۔ دشمنی دوستی میں تبدیل ہو گئی تھی اور شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔

راجہ ہڈنا ڈھ کا کریم دو دن میں ہو گیا۔

ہندو مذہب میں مرنے والے کو ٹھکانے لگانے کے تین طریقے ہیں:

جلادینا

سدا دینا

اور دفن کر دینا۔

راجہ ہڈنا ڈھ کا ہندوؤں کے اس فرقے سے تعلق تھا جس میں مردے جلانے جاتے ہیں۔ چنانچہ راجہ ہڈنا ڈھ کو میدان میں ایک اونچے چوڑے پرٹا کر اس پر خوشبودار گلے چھینکے، پھر اسے

بارات کا استقبال کرتے ہوئے اس وقت ذرا سی ناگوار صورت پیدا ہوئی جب استقبال کرنے والوں نے ان باراتیوں پر اعتراض کیا جو کمر میں تلوار لٹکا کر بارات میں آئے تھے۔

استقبال کرنے والوں نے اعتراض کیا کہ مہمان، تلوار پنڈال کے باہر رکھ کے اندر داخل ہوں۔ بعض مہمانوں نے تلواریں اتارنے سے انکار کر دیا۔ اس پر بات بڑھ گئی۔

اسی وقت وجے رائے نے وہاں پہنچ کر گرجا آواز میں کہا:

”معرزہ مہمانو! آپ بارات میں تشریف لائے ہیں، میدان جنگ میں نہیں جا رہے کہ تلوار لے کر جائیں۔ یہ تو دوستوں کی محفل ہے، یہاں پیار و محبت کے پھول کھلنا ہیں، یہاں تلوار کا کیا دخل؟“

وجے رائے کی اس بات کو باراتیوں نے سراہا اور تلوار مند باراتیوں نے اپنی تلوازیں وجے کو پیش کر دیں۔

وجے رائے نے مسکرا کر تلوازیں لے لیں اور اپنے آدمیوں کے حوالے کر دیں اور مہمانوں کو تسلی دی کہ واپسی پر ان کی تلوازیں ان کے سپرد کر دی جائیں گی۔

اس طرح بات رفع دفع ہو گئی اور باراتی پنڈال میں پہنچ کے اطمینان سے بیٹھ گئے۔ راجہ کاروگ کے لیے آگ کے لاد کے پاس ایک شاندار مسند لگائی گئی تھی۔ آگ کا لادو اس لیے روشن کیا گیا تھا کہ ہندوؤں میں شادی کے وقت پنڈت آگ میں، لونگ، الاچی اور مختلف قسم کی خوشبوئیں، اشلوک پڑھتے ہوئے، ڈالتے جاتے ہیں۔

مہمانوں کو پنڈال میں بیٹھے کافی دیر ہو چکی تھی لیکن راجکاری دیواجی مہنی اور مدانی اب تک پنڈال میں نہ آئی تھیں۔ مہمانوں میں بے چینی پیدا ہو رہی تھی۔ وہ بار بار ایک دوسرے سے دہن کے ابھینکے نہ کی دہر پوچھ رہے تھے۔

راجہ کاروگ سب سے زیادہ پریشان تھا۔ وہ بار بار اپنے خادم خاص کو باہر بھیجتا کہ وجے رائے کو ڈھونڈ کے لائے تاکہ اس سے راجکاری کے نہ آنے کا سبب معلوم کیا جائے۔ غلام ہر بار

واپس آ کر ایک ہی جواب دیتا:

”وجے رائے کہیں نظر نہیں آتے۔“

پھر انتقار بسیار کے بعد وجے رائے پنڈال میں داخل ہوا۔

راجہ کاروگ کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ دوسرے مہمان بھی اسے دیکھ کر بڑے خوش ہوئے

مگر۔

ان کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔

کیونکہ وجے رائے کے ساتھ ساتھ کاروگ والوں کی موت بھی آئی تھی۔

وجے رائے کے داخل ہونے ہی چند لمحوں کے اندر پنڈال کو ہڈنا ڈکے فوجیوں نے نہ صرف گھیر لیا بلکہ ہار پہنے ہوئے مہمانوں پر ہڈ بولی دیا۔

یہ وہی فوجی تھے جنہیں تین دن پہلے راجہ کاروگ کے حکم سے ہٹا کر دیا گیا تھا اور پھر جب راجکاروگ سے اس کی شادی کی تاریخ مقرر ہوئی تو ہڈنا ڈکے ان فوجیوں کو آزاد کر کے ان کے ہتھیار بھی انہیں واپس کر دیے گئے تھے۔ وہی فوجی اس وقت ریاست کاروگ سے آئے ہوئے مہمانوں کا صفایا کر رہے تھے۔

وجے رائے کی تدبیر نے نہ صرف راجکاری کو راجہ کاروگ کے غلیظ پیچوں سے بچا لیا تھا بلکہ ہڈنا ڈکے ریاست بھی ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئی۔

راجہ کاروگ کا سر قلم کر کے نیزے پر چڑھا دیا گیا۔

وجے رائے نے صرف پنڈال والوں کا ہی صفایا نہیں کیا بلکہ اس کے نئے بھرتی کیے ہوئے فوجیوں نے جنہیں شادی کے مہمانوں میں دو دن پہلے ہڈنا ڈکے میں بلوایا گیا تھا، راجہ کاروگ کے فوجیوں کے گرد بڑی خاموشی سے گھیر ڈال لیا تھا۔ پھر جب پنڈال پر حملہ ہوا تو وجے رائے کا بھائی کرشن رائے جو فوج کی کمان کر رہا تھا، اس نے کاروگ کے فوجیوں پر حملہ کر دیا۔

کاروگ کے فوجی اس اچانک حملے سے بدحواس ہو گئے۔ اسی وقت انہیں اپنے راجہ کا سر نیزے پر نظر آیا۔ نفث کے قریب وہ پہلے ہی مارے جا چکے تھے۔ راجہ کا سر دیکھ کر باقیوں کے حوصلے بھی پست ہو گئے اور وہ میدان چھوڑ بھاگے۔

وجے رائے واقعی ایک بہترین جرنیل ثابت ہوا۔

اس نے راجہ کاروگ اور اس کی نصف سے زیادہ فوج کا خاتمہ ہی نہیں کیا بلکہ اپنی پوری فوج کے ساتھ اسی وقت کاروگ کی طرف کوچ کیا۔

دونوں ریاستوں کی سرحدیں تو ملی ہوئی تھیں۔ وجے رائے چند گھنٹوں میں کاروگ کی سرحد

سلطنت سیجا پور کی باجگزار ہو گئی۔

سرنگا پٹم اور سیجا پور کا یہ تعلقی ۱۶۸۸ء تک برقرار رہا۔ پھر جنوب پر سلطنت مغلیہ کے شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا قبضہ ہو گیا اور سرنگا پٹم کے اڈیر خاندان کے چودھویں راجہ چک دیوارا جہ اور ڈیر مغل سلطنت کے ماتحت ہو گیا۔

چک دیوارا جہ اور ڈیر کے زمانے میں ۱۶۹۶ء میں مرہٹوں نے سرنگا پٹم پر حملہ کر دیا لیکن سرنگا پٹم کی فوجوں نے سخت مدافعت کی اور مرہٹوں کو کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

اس زمانے میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر جنوبی ہند میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے وہاں ایک شہر اپنے نام پر "اورنگ آباد" بنایا تھا جہاں اس نے اپنا عارضی صدر مقام بنایا تھا۔

چک دیوارا جہ اور ڈیر بڑا جہانگیر تھا۔ اس نے دربار عالمگیری میں اثر رسوخ پیدا کرنے کے لیے شہنشاہ کو بہت سے تحائف بھیجے۔ اس کے جواب میں شہنشاہ عالمگیر نے اسے جگ دیوارا کے خطاب سے نوازا۔ اور وہ چک دیوارا سے جگ دیوارا ہو گیا۔

شہنشاہ نے راجہ کو نوبت اور تقاریر رکھنے کا بھی حکم دیا اور راجہ کے بیٹے کے لیے باقی وراثت کا ایک تخت بھیجا۔ یہ تخت میسور میں اب تک موجود ہے۔

جب دہلی کی مغل سلطنت زوال سے دوچار ہوئی تو نوابوں اور راجاؤں نے آزاد ہونا شروع کر دیا۔ حاکم سرانواب بن بیٹھا اور سرنگا پٹم کے راجہ اور ڈیر نے بھی آزادی کا اعلان کر دیا۔ پھر ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔

۱۷۲۲ء میں ارکاٹ کے پہلے نواب سعادت اللہ خاں نے مرا کے نواب کی مدد سے سرنگا پٹم پر حملہ کیا اور ایک کروڑ ٹاوان وصول کیا۔

اس کے دو برس بعد مرہٹوں نے سرنگا پٹم پر یلغار کر دی اور بہت سا مال و دولت لے کر واپس ہوئے۔ ان حملوں نے سرنگا پٹم کو بہت کمزور کر دیا۔

۱۷۶۸ء میں راجہ کے انتقال کے بعد وزیروں نے اس کے ایک تین سالہ بیٹے کو گدی نشین کر دیا اور نظام سلطنت خود سنبھال لیا اور اس طرح وہاں وزیر برادران کی حکومت شروع ہو گئی۔

ہڈناڈ کے اس دلچسپ رومان اور سرنگا پٹم کی مختصر تاریخ کے بعد ہم پھر اپنی اصل کہانی کی طرف لوٹتے ہیں یعنی اس دور میں آتے ہیں جب قلعہ دیون بلی کے غوہیں معرکہ میں جبراً

داخل ہو گیا۔

ہڈناڈ سے بھاگ کے آنے والے سپاہی کاروگ کے باقی سپاہیوں کو ہڈناڈ میں ان پر اور ان کے راجہ پر گزرنے والی قیامت کا حال بیان کر رہی رہے تھے کہ انہیں اطلاع ملی کہ وجے رائے کا لشکر کاروگ میں داخل ہو گیا ہے اور تیزی سے راجہ کے محل کی طرف آ رہا ہے۔

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ریاست کاروگ کا راجہ بیچ ذات سے تعلق رکھتا تھا مگر اپنی زبردست فوج کی وجہ سے اونچی ذات کے ہندوؤں کو دباٹے ہوئے تھا اور پاس پڑوس کی ریاستوں پر اکثر حملے کرتا رہتا تھا۔

راجہ کاروگ کے قتل ہو جانے سے کاروگ کے لشکریوں میں بددلی پھیل گئی۔ آدھی فوج تو ہڈناڈ میں ختم ہو گئی تھی۔ رہی باقی آدھی فوج تو اس نے جب ہڈناڈ کی فوج کے آنے کی خبر سنی تو گھبرا کر کاروگ سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

اب کاروگ کے اوپنچی ذات کے ہندوؤں کی بن آئی۔ انھوں نے ہڈناڈ کی فوج کا شاندار استقبال کیا اور وجے رائے نے کاروگ پر قبضہ کر کے اسے ہڈناڈ میں شامل کر لیا۔

اس طرح وجے رائے اور ہڈناڈ کی راجکار دی دیو اجمی سنی کاروان پر دان چڑھا اور اگلے منگلا کو اس خوبصورت جوڑے کی شادی ہو گئی۔

جمارانی نے راجکار دی دیو اجمی سنی کی طرف سے وجے رائے کو ہڈناڈ اور کاروگ کا راجہ بنا دیا اس قابل جہیل نے اپنی زندگی میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے اور ریاست ہڈناڈ کو بہت وسعت دی۔

وجے رائے کے راجہ ہونے سے ہڈناڈ کی ریاست اس کے خاندان میں منتقل ہو گئی۔ جنوب ہند میں وجیانگر کی بہت بڑی ہندو سلطنت تھی۔ وجے رائے وجیانگر کا باجگزار راجہ ہو گیا اور جب تک یہ سلطنت برقرار رہی ہڈناڈ اس کے ماتحت رہی مگر جب وجیانگر پر زوال آیا تو ہڈناڈ کے چیسے راجہ تراج اور ڈیر دوم نے آزادی کا پرچم بلند کیا اور ۱۵۹۶ء میں سرنگا پٹم کو راجہ خانی بنا کر ایک آزاد سلطنت قائم کر لی۔

اس کے بعد کامانوں کی میسور میں آمد شروع ہو گئی اور سرنگا پٹم کی اوڈیر حکومت،

کلاں کام آئے اور ان کی جگہ حیدر علی کے بڑے بھائی شہباز کو قلعہ دیون ہلی کا قلعہ دار مقرر کیا گیا۔
آپندہ صفات میں ہم اس سے آگے کے حالات بیان کریں۔



قلعہ دیون ہلی کے معرکہ میں حیدر علی اور شہباز نے جو اندری اور شجاعت کے نئے باب کھولے تھے۔ نندراج اپنے انتخاب پر بہت خوش تھا۔ دیون ہلی پر فوج کشی کے وقت اس نے حیدر صاحب کلاں کے علاوہ حیدر علی اور شہباز کا خود انتخاب کیا تھا۔ پھر جب اس انتخاب کا نتیجہ فتح کی صورت میں نکلا تو نندراج کا سینہ اور چوڑا ہو گیا۔

شہباز کو دیون ہلی پر بادری کے صلہ میں وہاں کی قلعہ داری مل گئی۔ یہ اس کے لیے ایک بہترین صلہ تھا۔ اسے یہ خیال ضرور آیا تھا کہ وزیر نندراج نے اسے تو نواز دیا لیکن حیدر علی کو بغیر کوئی انعام دیے سرنگا پٹم واپس لے گیا۔ اسے کیا پتہ تھا کہ نندراج کے دل میں حیدر علی کے لیے کس قدر جگہ ہے اور وہ اسے کس عہدے پر فائز کرنا چاہتا ہے۔

سرنگا پٹم واپس آتے ہی نندراج کو ہمارا جہ میسور کا پیغام ملا:
ہمارا جہ میسور کرشن راجہ اوڈیر نے آپ کو سلام دیا ہے اور اس بات کی خواہش کی ہے کہ آپ اپنے ساتھ دیون ہلی کے فاتح حیدر علی کو لے کر راج محل تشریف لائیے۔

یہ پیغام راجہ میسور نے اپنے خاص ملازم کے ذریعے نندراج کو بھیجا تھا۔ ہمارا جہ نے حیدر علی کو پہلے ہی فاتح دیون ہلی کا خطاب دے دیا۔ اس میں بہت کچھ حقیقت تھی لیکن اس فتح میں شہباز اور حیدر صاحب کلاں کا بھی حصہ تھا۔ شہباز کو اگرچہ انعام مل گیا تھا لیکن حیدر علی کلاں تو اس معرکہ میں اپنی جان ہی گنوا بیٹھا تھا، اسی وجہ سے نندراج نے حیدر علی کو فاتح دیون ہلی کا خطاب

”یہ شکوہ تمہیں اپنے باپ سے کرنا چاہیے۔“ راجہ نہ جانے کس موڈ میں تھا کہ اس نے مہارانی پر طنز کیا۔

مہارانی نندی کو بھلا اتنی برداشت کہاں تھی، اس نے فوراً جواب دیا: ”میں نے دیرِ بابا سے اس وقت بھی شکوہ نہیں کیا تھا جب انہوں نے میرا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دیا تھا۔“

مہارانی کا جواب ترکی بہ ترکی تھا مگر مہاراجہ نے حالات سے سمجھ کر لیا تھا ”اس لیے خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا بلکہ خوشامد پر اتر آیا:“

”ارے مہارانی۔ بڑا مان گئیں۔ میرے کہنے کا مقصد کچھ اور نہیں تھا۔ تم جانتی ہو کہ میرا کسی بات پر اختیار نہیں۔ سب کچھ نندراج اور دیوراج کے پاس ہے۔ وہ کسے کیا دیتے ہیں۔ یہ پوچھنے یا اعتراض کرنے کا مجھے حق نہیں۔“

مہاراجہ نے بڑی سادگی سے حقیقت کا اظہار کر دیا تھا۔ وہ دیوراج اور نندراج کا احسان مند تھا۔ ان دونوں بھائیوں کی مہربانی تھی کہ انہوں نے تین سال کے اس لے پالک بچے کو میسور کی ریاست کا راجہ بنا دیا تھا۔

”مہاراجہ کے کیا اختیارات ہیں اور کیا نہیں“ اس پر مہاراجہ نے کبھی غور ہی نہیں کیا: ”مہارانی اسے ایک دوسرے راستے پر چلی:“

”آپ ایک بار اپنے اختیارات کا اظہار کرنے کی کوشش تو کیجیے۔“

”وہ کس طرح۔ تم بتاؤ ہمیں؟“ مہاراجہ نے سادگی سے پوچھا۔

”آپ بابا نندراج سے پوچھیے کہ شہبازی مہادری کے ساتھ ساتھ حیدر علی کی شمشیر نے بھی تو تلوار دیون ہٹی کی جنگ میں جوہر دکھائے تھے۔ پھر اسے نظر انداز کیوں کیا گیا؟“

”ٹھیک ہے۔ نندراج کو مرنگا پٹم واپس آنے دو، ان سے یہی سوال کیا جائے گا۔“

مہاراجہ نے مہارانی کو مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مہارانی واپس چلی جائے گی مگر مہارانی نے ایک اور سوال اٹھایا:

”آپ کے خیال میں حیدر علی کو کیا انعام دینا چاہیے؟“

راجہ کرشن اوڈیرسوج کے بولا:

”انعام دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک نقد رقم اور دوسرا انعام خطاب یا گاؤں جاگیر میں دیا جاتا ہے

نہیں دیا جاتا۔

”فاتح دیون ہٹی“ کے الفاظ دراصل مہارانی نندی کے منہ سے نکلے تھے جس نے یہ الفاظ اپنے شوہر مہاراجہ میسور کرشن راجہ اوڈیر کے منہ میں ڈال دیے تھے۔

مہارانی نندی، حیدر علی کو کس قدر پسند کرتی تھی اس کا اظہار پہلے بھی کئی مرتبہ ہو چکا تھا۔ پہلی مرتبہ اس وقت جب حیدر علی اور شہباز نے شہسواد کی اور شمشیر زنی کے مقابلے جیتے تھے۔

پھر اس کے بعد مہارانی نندی کی محبت کا اظہار اس سے ہوتا تھا جب اس نے اپنے باپ یعنی وزیر نندراج سے فرمائش کی تھی کہ شہباز اور حیدر علی کو اس کے محافظ دستوں کا سردار مقرر کیا جائے۔ مہارانی کی دلچسپی صرف حیدر علی سے تھی، شہباز کا نام اس نے محض اس لیے لیا تھا کہ اس کے دل کا پتو نہ پکڑا جائے۔

اب یہ تیسرا موقع تھا جب مہارانی نے پھر حیدر علی کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تھی۔ دیون ہٹی کی فتح کی اطلاع آتے ہی مہارانی اپنے محل سے چل کر راج محل کی طرف نکلتی تھی۔ یہ اتفاق کم ہی ہوتا تھا اس لیے کہ مہاراجہ کو شراب و شباب کی محفوں سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ وہ مہارانی کی طرف توجہ دے سکے۔

مہارانی کو بھی مہاراجہ کی کچھ ایسی فکر نہ تھی۔ اس نے مہاراجہ کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر ہی اپنی رائے راج محل کے بجائے دوسرے محل میں اختیار کر لی تھی اور مہاراجہ اس بات پر ناراض ہونے کے بجائے خوش ہوا تھا۔

مہارانی نے مہاراجہ کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا:

”مہاراجہ کو دیون ہٹی کی فتح مبارک ہو۔“

مہاراجہ نے بھی محبت کا اظہار کیا۔ اس نے مہارانی نندی کو آغوش میں کھینچ لیا۔ پھر مکرراتے ہوئے اس سے بولا:

”مہارانی کو بھی فتح مبارک ہو۔“

مہارانی پچھلی کی طرح تڑپ کر اس کی آغوش سے نکل گئی۔ مہاراجہ کے منہ سے شراب کے بھیکے نکل رہے تھے۔ مہارانی کا دماغ اٹکنے لگا تھا۔ پھر بھی اس نے وضعداری نہ کرتے ہوئے کہا:

”مہاراجہ۔ یہ تو کوئی انصاف نہ ہو کہ بڑے بھائی شہباز کو تو دیون ہٹی کا قلعہ اربنڈا یا گیا اور حیدر علی کو کچھ بھی نہ ملا۔“

تمہارے خیال میں کیا انعام ملنا چاہیے حیدر علی کو؟
 "واہ واہ ہمارا راج۔ آپ نے خوب کام کیا!"
 ہمارا فی نندی نے ہنس کر کہا:

"جو سوال میں نے آپ سے کیا، وہی آپ نے مجھے لوٹا دیا۔
 بات یہ ہے ہمارا فی کہ ہم تم الگ الگ تو ہیں نہیں۔
 راجہ کرشن اوڈیر کے انداز سے خوشامد جھلک رہی تھی:
 "جو تم کہو۔ وہی انعام دیا جائے۔"

ہمارا فی نندی نے ہونٹوں پر انگلی رکھی جیسے کچھ سوچ رہی ہو، پھر کہا:
 "میرے خیال میں حیدر علی کو فاتح دیون ہلی کا خطاب دینا چاہیے۔"
 "ٹھیک۔ بالکل ٹھیک۔ بڑا مناسب انعام ہے۔" ہمارا جہ نے ہمارا فی کی رائے پر فوراً مناد

کر دیا۔

اسی گفتگو کا نتیجہ تھا کہ جب وزیر نند راج اور حیدر علی دیون ہلی سے واپس آئے تو راجہ نے
 نند راج کو بیٹھا بھیجا:

"ہمارا جہ میسور راجہ کرشن اوڈیر نے آپ کو سلام دیا ہے اور خواہش کی ہے کہ آپ اپنے ساتھ
 فاتح دیون ہلی حیدر علی کو لے کر راج محل تشریف لائیے۔"

وزیر برادران نند راج اور دیو راج کی شان کے یہ بات خلاف تھی کہ راجہ اوڈیر انہیں جس وقت
 بلواتے وہ اسی وقت دوڑے چلے جائیں۔ دیو راج کو بلاوا کم ہی آتا تھا راجہ اوڈیر کو معلوم تھا کہ
 سلطنت کے تمام اختیارات نند راج کے ہاتھ میں تھے اس لیے دیو راج کو بلانا ہی بیکار تھا۔

نند راج نے راجہ کے ہرکارے کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ:

"ہم چند ضروری کام نمٹانے کے بعد ہمارا جہ میسور کے محل میں آئیں گے۔"

نند راج، راجہ کے ہرکارے پر اسی قسم کا جواب بھجوا کر تا تھا جس وقت راجہ کا ہرکارہ جوتا
 لے کر واپس پہنچا تو راج محل میں ہمارا جہ کے ساتھ ہمارا فی نندی بھی موجود تھی۔

"کیا جواب دیا وزیر بابا نے؟" ہرکارے کے بولنے سے پہلے ہی ہمارا فی نندی نے جھٹ سے
 سوال کر دیا۔

ہرکارے نے جواب دیا: "انہوں نے فرمایا ہے کہ چند ایک ضروری کام کرنے کے بعد

راج محل آئیں گے۔"

ہمارا فی نندی کا دماغ جھٹکے رہ گیا:

"وزیر بابا بھی عجیب آدمی ہیں۔ انہیں کسی کے وقت کا احساس ہی نہیں ہے۔ کیا ہم بیکار
 بیٹھے ہیں؟"

"ذرا احتیاط سے بولو ہمارا فی!"

راجہ کرشن اوڈیر نے منہ پر انگلی رکھتے ہوئے کہا:

"تمہیں معلوم نہیں کہ اس محل کے چھپے چھپے پر ہمارے وزیر بابا کے جاسوس موجود ہیں!"

"میں نہیں جانتی کسی جاسوس واسوس سے۔" ہمارا فی نے بگڑ کے کہا:

"جاسوس میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

"تمہارا نہیں بگاڑ سکتے لیکن میرا تو پٹر کر سکتے ہیں آپ کے وزیر بابا!" راجہ کرشن اوڈیر نے

ایک اور حقیقت کا انہار کیا۔

اسی وقت ایک نوکرانی بھاگتی ہوئی آئی:

"نند راج۔ وہ۔ وہ۔ وہ آگئے۔"

"کون آگئے۔ تو اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہے؟" ہمارا فی نے اسے ڈانٹ دیا۔

نوکرانی حواس مجتمع کر کے بولی:

"فوجی آئے ہیں ہمارا راج۔ وہی ہمارا فی کے وزیر بابا۔"

"اُسے؟" ہمارا جہ گھبرا کے کھڑا ہو گیا:

"کیا وزیر نند راج تشریف لا رہے ہیں؟"

"جی ہاں ہمارا جہ۔ وہی وہی۔ بالکل وہی آ رہے ہیں۔ نوکرانی نے جواب دیا۔

راجہ کرشن اوڈیر بڑے بڑے قدم اٹھاتا وزیر نند راج کے استقبال کے لیے آگے بڑھا۔

ہمارا فی نندی جو بہت بڑھ بڑھ کے باتیں کر رہی تھی، وہ بھی راجہ کے پیچھے چل رہی تھی۔

وزیر نند راج محل میں داخل ہو کے ایک راہداری سے گزر رہا تھا جب ہمارا جہ اور ہمارا فی اس کے

استقبال کو آتے ہوئے دکھائی دیے۔

نند راج نے ہمارا جہ کے ہرکارے سے کہہ دیا تھا کہ وہ چند ضروری کام انجام دینے کے بعد

آگئے گا لیکن یہ اس کا ایک روایتی جواب تھا جس سے اس کی تمکنت کا انہار ہوتا تھا، ورنہ وہ ہرکارے کے

واپس ہوتے ہی راج محل کی طرف چل پڑا تھا۔

نند راج کو صرف راج محل کی ریشہ و دانیوں ہی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا بلکہ اسے نامزدوں کی بناوت کا بھی ہر دم دھڑکا لگنا تھا۔

راجہ کرشن اڈیر نے نشے میں دھت تھا مگر نند راج کی صورت دیکھتے ہی اس کا سارا لشہ ہرن ہو گیا تھا، چنانچہ اس نے سلام کرنے میں پہل کی۔

نند راج جواب دے کے اس کے ساتھ ہوا۔ مہارانی نندی نے بھی وزیر بابا کو سلام کیا اور اب وہ بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

نند راج اگرچہ حمان کی حیثیت سے آیا تھا یا پھر ایک وزیر کی حیثیت میں، لیکن وہ مہاراجہ اور مہارانی سے آگے آگے چل رہا تھا اور تمام لوگ اس سے دو قدم پیچھے تھے۔

نند راج جب کبھی راجہ سے ملنے راج محل آتا تو ہمیشہ اس کی خواہ گاہ میں بیٹھا تھا۔ راجہ اڈیر کو اس کی یہ عادت معلوم تھی اس لیے اس نے اپنی خواہ گاہ میں اپنے چہرہ کھٹ کے برابر ایک کوچ والی کرسی بچھوا دی تھی۔ نند راج اسی کرسی پر بیٹھا کرتا تھا۔ آج بھی وہ خواہ گاہ میں پہنچ کر اسی کرسی پر بیٹھ گیا۔

نند راج نے مسکراتے ہوئے کہا:

”مہاراجہ میسور کسے کیا حال چال ہیں؟“

”بس آپ کی گراہ ہے۔ بڑے عیش سے گزر رہی ہے۔ راجہ کرشن بھی مسکرایا۔

”یہ آج مہارانی کیسے دکھائی دے رہی ہیں اس محل میں؟“ نند راج نے دلچسپی سے اپنی بیٹی کو دیکھا۔

مہارانی نندی چٹخ کے بولی:

”کیوں وزیر بابا۔ کیا میرا اس محل میں آنا آپ نے بند کر دیا ہے؟“

”اچھا۔ تو یہ جو کہ تو ان کو ڈانٹ رہا ہے؟“

نند راج آج خوب ہنس ہنس کے باتیں کر رہا تھا:

”میرا اختیار ہو تو میں تمہارے محل میں تالا لگو اداں اور تمہیں مہاراجہ میسور کے محل میں رہنے پر مجبور کر دوں۔“

”اے سب کچھ کر سکتے ہیں وزیر بابا۔“ مہارانی نندی گہرا لٹی:

”مگر کیا آپ یہ نہیں چاہتے کہ آپ کی بیٹی ایک الگ محل میں پوری شان و شوکت سے رہے؟“

”یہی بات تو مجھے کوئی قدم اٹھانے سے روکتی ہے۔“

نند راج میں سینگ کی پیدا ہونے لگی۔ پھر اس نے راجہ کرشن اڈیر کو مخاطب کیا:

”ہاں مہاراج۔ آپ نے مجھے کیوں یاد فرمایا ہے۔ خیریت تو ہے۔“

مہاراجہ نے مہارانی کی طرف دیکھی۔ واصل وہ بات کرتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ مہارانی نے نظریں نیچی لیں۔

”تم دونوں ایک دوسرے کو کیوں دیکھ رہے ہو؟“

نند راج نے پھر کہا:

”بتاؤ۔ کیا چاہیے۔ کس چیز کی ضرورت ہے؟“

نند راج کا خیال تھا کہ راجہ کرشن اڈیر کو کسی ایسی چیز کی ضرورت پڑی ہوگی جو وہ ملازمین

کے ذریعے طلب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مہارانی کی دہلی موجودگی سے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ آج کل

دونوں میں میل ملاپ ہوتا ہے۔

”مہاراجہ اڈیر نے ہنس کر کہا:

”آپ نے سب کچھ تو دے رکھا ہے۔ اب کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ آپ کو حیدر علی کے سلسلے

میں تکلیف دی ہے۔“

”اے ہاں!“ نند راج نے پہلو بدلا:

”حیدر علی کو فاتح دیون ہلی کا خطاب کس نے دیا ہے؟“

راجہ کرشن اڈیر بوکھلا گیا:

”وہ — وہ ہم دونوں نے دیا ہے۔“ اس نے مہارانی کو اس انداز سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ

وہ بھی اس کی تائید کرے۔

مہارانی نے تائید کر دی:

”وزیر بابا۔ کیا حیدر علی اس خطاب کے قابل نہیں ہے؟“

”نند راج نے بڑے پیار سے کہا:

”حیدر علی کے لیے یہ خطاب بہت معمولی ہے۔ وہ تو اس سے کہیں بڑے خطاب کا مستحق ہے۔

دوسری بات یہ کہ حیدر علی کو ”فاتح دیون ہلی“ کا خطاب نہیں دیا جاسکتا۔ اگر ایسا کیا جائے تو اسے

دو ہفتیوں کی دل آزاری اور دل شکنی ہوگی۔

اس میں شبہ نہیں کہ حیدر علی نے دیون ہلی میں بے مثال شجاعت کا مظاہرہ کیا لیکن اس کے دونوں بڑے بھائی یعنی حیدر علی کلاں اور شہباز بھی شجاعت کے اس معرکے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ حیدر علی کلاں نے تو اپنی جان بھی گنوا دی۔ فاتح دیون ہلی واصل مرنے والا ہی ہے۔

”وزیر بابا۔ ایک بات تو بتائیے۔

ہمارا فی نندی نے جرأت دکھائی:

”حیدر علی اور شہباز، دونوں میں سے کون زیادہ بے جگری اور جواغروی سے لڑا تھا؟“

”تمہارا یہ سوال بے موقع ہے ہمارا فی!“ نندراج نے ناگوار بچے میں کہا:

”دونوں جانیوں میں بہت محبت ہے۔ اس قسم کی باتوں سے ان میں اختلاف پیدا ہو سکتا ہے۔

اور یہ اختلاف ریاست میسر کے لیے کسی طرح مفید نہیں۔

ہم نے شہباز کو قلعہ کی سرداری اس لیے نہیں سونپی کہ وہ حیدر علی سے زیادہ بہادر ہے۔ وہ عمر میں حیدر علی سے پانچ سال بڑا ہے۔ وہ ذمہ داری اٹھا سکتا ہے جبکہ حیدر علی کو مرنگا پٹم میں اس لیے رکھا گیا ہے کہ وہ مزید تجربہ حاصل کرے۔“

”وزیر بابا۔ ہمارا فی نندی نے اور زیادہ جرأت دکھائی:

”میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ حیدر علی کو اس کی بہادری کا صلہ ملنا چاہیے۔“

”میرا بیٹی ہمارا فی نندی! فوجوان حیدر علی کو صلہ دینے سے کس نے انکار کیا ہے؟“ نندراج

نے نرم لہجے میں اسے سمجھایا:

”فاتح دیون ہلی کا خطاب اس لیے بھی مناسب بھی کہ اس قلعہ کا حاکم اس وقت شہباز ہے اور ہم اسے ناراض نہیں کرنا چاہتے۔

شاید تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ حیدر علی کو ہم نے محافظ دستوں کا افسر اعلیٰ مقرر کر دیا ہے۔

یہ عہدہ اس خطاب سے بہت بڑا ہے جو تم اسے دینا چاہتی ہو۔“

”یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا وزیر بابا۔“

ہمارا فی نندی خوش ہو گئی:

”آپ نے تو میرا دل خوش کر دیا!“

”زندہ باد حیدر علی خاں!“

راجہ کرشن اڈویر نے فوراً نعرہ لگایا:

”آپ نے اس کی جواغروی کا بالکل صحیح صلہ دیا ہے۔“

”کس کی جواغروی کا؟“ نندراج نے ایک دم پلٹ کر پوچھا۔

”حیدر علی کی جواغروی کا۔“ راجہ کرشن اڈویر نے گھبراتے ہوئے کہا۔

”صرف حیدر علی نہیں بلکہ حیدر علی خاں۔“

نندراج مسکرایا:

”نندراج نے حیدر علی کو ”خان“ کا خطاب دے کر اسے ”حیدر علی خاں“ بنا دیا۔ مجھے یہ خطاب پسند آیا۔ آج سے اسے حیدر علی خاں کے نام سے یاد کیا جائے گا۔ تمام سرکاری درباری کے کاغذوں میں اس کا نندراج ہوگا۔“

اس طرح —

راجہ میسر کی طرف سے حیدر علی کو حیدر علی خاں بنایا گیا اور وزیر نندراج نے حیدر علی خاں کو محافظ دستوں کا افسر اعلیٰ مقرر کیا۔ ان دستوں میں تمام محلات کے محافظ اور دونوں وزیروں کے محافظ دستے بھی شامل تھے۔

نندراج نے چلتے چلتے اپنی بیٹی ہمارا فی میسر سے کہا:

”ایک بار ہمارا فی نے خواہش کی تھی کہ حیدر علی کو ان کے محل کا محافظ بنا دیا جائے۔ آج ہم

نے حیدر علی کو تمام محلات کا محافظ بنا دیا ہے۔ ہمارا فی اب تو خوش ہوں گی۔“

”بھی وزیر بابا۔ میں بہت خوش ہوں۔ ہمارا فی نندی نے مجھے دل سے جواب دیا۔

اس نے تو یہ خواہش کی تھی کہ وہ ہمارا فی کے محل کا محافظ سردار ہو کہ ہر وقت اس کی

نظروں کے سامنے رہے۔

گم۔

نندراج نے اسے تمام محافظ دستوں کا افسر اعلیٰ مقرر کر کے حیدر علی خاں کو اس سے بہت

دور کر دیا تھا۔

اس زمانے میں بیجاپور کا حکمران محمود عادل شاہ کے بعد علی عادل شاہ تھا۔ جس طرح ولی محمد خاں نے گلبرگہ کو دہائی مسکن بنانا چاہا مگر خدا کو منظور نہ تھا اس لیے انہیں اوپر اٹھایا گیا، اسی طرح کا واقعہ محمد علی خاں کے ساتھ پیش آیا۔ انھوں نے بیجاپور کو مسکن بنانے کا قصد کیا تو بیجاپور پر زوال آ گیا اور اس درویش خاندان کو ایک مرتبہ پھر ہجرت کرنا پڑی اور محمد علی خاں اپنے بال بچوں کے ساتھ کرناٹک منتقل ہو گئے اور وہاں بالا گھاٹ کے قصبہ کولار میں سکونت اختیار کی۔ کولار کے حکم شاہ محمد کنی نے محمد علی خاں کی بڑی آؤ بھگت کی اور انتظام حکومت بڑی حد تک ان کے سپرد کر دیا۔

شاہ محمد کنی نے انتظام سلطنت محمد علی خاں کے حوالے تو کر دیا مگر وہ ٹھہرے درویش صفت اور صوفی منش۔ ان کی خواہش تھی کہ خاندانی درویشی اور مشائخی جو ان کے باپ دادا نے بڑے تقویٰ اور ریاضت کے بعد حاصل کی تھی وہ برقرار رہے۔ وہ خود تو صوفی تھے ہی، بیوی بھی درگاہ گیسو دراز کے متولی کی بیٹی تھی۔ چاہے تو یہ تھا کہ ان کی اولاد بھی ان کے رنگ میں رنگ جاتی مگر حساب بالکل الٹا ہوا۔

اس صوفی گھرانے میں چار بیٹے پیدا ہوئے:

محمد ایاس

فتح محمد

محمد امام اور

ولی محمد

مگر باپ کی روش پر ایک بیٹا بھی نہ گیا بلکہ وہ درویشی اور مشائخی سے سخت باغی تھے۔ ان کے دل میں مجاہدانہ زندگی بسر کرنے کی تڑپ تھی۔ وہ شمشیر و سنان کے شیدائی تھے اور درگاہوں پر مجاوروں کے بجائے کارزار حیات میں زور بازو کے بل بوتے پر شہرت اور ناموری کے خواہاں تھے۔

پس چاروں بیٹوں نے ایک دن آپس میں مشورہ کیا کہ سب مل کے باپ کے پاس چلیں اور ان سے مشائخی سے نکل کے سپاہیانہ زندگی گزارنے کی اجازت حاصل کر لیں۔

باپ نے ان کا مطالبہ رٹے محل سے سنا مگر ان کا جواب خالص درویشانہ تھا۔ انہوں نے بیٹوں کو نصیحت کی:

حیدر علی خاں کے آباؤ اجداد کی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس گھرانے کو تقویت اور درویشی سے نہ صرف اُنس رہا ہے بلکہ بعض بزرگوں نے تو اپنی تمام زندگی ہی درویشی میں گزار دی۔

ان کی قناعت کا یہ عالم تھا کہ جہاں بیٹھ گئے بس وہیں کے ہو رہے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ انسان کی تقدیر میں جو رزق لکھا جا چکا ہے وہ بغیر کسی کوشش یا حرکت کے خود اس کے پاس پہنچ جائے گا۔

آئیے۔ حیدر علی خاں کے خاندان پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔

حیدر علی خاں کی پیدائش ۱۷۶۱ء میں ہوئی۔ اس کی پیدائش سے پورے ایک سو سال پہلے یعنی ۱۶۲۰ء میں پنجاب سے آنے والا ایک قافلہ دہلی کے راستے جہڑی ہند کے اس شہر کی طرف رواں دواں تھا جہاں حضرت شاہ بندہ نواز گیسو دراز کی درگاہ مرجع خلافت بنی ہوئی تھی۔ ایک روایت کے مطابق اس قافلہ میں ایک افغان خاندان بھی تھا جس کا سربراہ ولی محمد خاں ایک درویش صفت اور صوفی منش انسان تھا۔

ولی محمد خاں کو حضرت بندہ نواز سے اس قدر عقیدت تھی جو انہیں دہلی سے گلبرگہ پہنچنے لائی تھی۔ اس زمانہ میں گلبرگہ سلطنت بیجاپور کے ماتحت تھا اور بیجاپور کا حکمران محمود عادل شاہ تھا۔ بیجاپور، گلبرگہ سے اسی میل جنوب مغرب میں واقع تھا۔ ولی محمد خاں درگاہ بندہ نواز پہنچے تو پہلی ہی ملاقات میں درگاہ کے متولی، ولی محمد خاں کی درویشی اور علم و اخلاق سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہیں اپنا مکان بنایا۔ یہی نہیں بلکہ متولی نے ان کے اخراجات کے لیے درگاہ شریف سے ایک معقول مائتہ و تلیف بھی مقرر کرادیا۔

متولی اور ولی محمد خاں میں تعلقات گہرے ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ متولی نے اپنی بیٹی، ولی محمد کے بیٹے کے عقد میں دے دی۔

بیٹے کے عقد کے بعد ولی محمد خاں نے گلبرگہ میں مستقل رہائش کا فیصلہ کیا اور اپنی مشائخی کی بساط چھوڑ دی۔ ولی محمد خاں کی مشائخی ابھی کچی بھی نہ تھی کہ اوپر سے بلدا آ گیا اور وہ دنیا کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ گئے۔

باپ کے بعد محمد علی خاں کا دل گلبرگہ سے اچاٹ ہو گیا اور وہ معاملہ گلبرگہ چھوڑ کر بیجاپور چلے گئے اور وہاں غلام شاہ کورہ میں رہائش اختیار کر لی۔

”میرے بیٹو۔ اچھی طرح یاد رکھو۔ جاہ و جلال اور دنیا داری کی ہوس ایک ایسی چنگاری ہے جو جاوہانی نعمتوں کے ذخائر کو دیکھتے ہی دیکھتے خاکستر کر دیتی ہے۔ پھر تم اس دینلے دنی کے پیچھے کیوں بھاگتے ہو۔ ہر ایک کا مقدر روزِ اول لکھا جا چکا ہے اور جو کچھ تمہیں ملنا ہے وہ بغیر دوردھوپ کے تمہارے پاس پہنچ جائے گا کیونکہ پیشِ آنی ہے وہی جو کچھ کہ پیشانی میں ہے۔“ درویش باپ کو جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ دیا مگر مجاہدانہ زندگی کے شیدائی بیٹوں پر اس کا مطلق اثر نہ ہوا۔

پھر یہ اتفاق ہوا کہ ادھر ان کے باپ نے انتقال کیا اور ادھر ان کا مرنی حاکم کو لار شاہ محمد دکنی بھی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ باپ کے دم سے ان کی جو عزت تھی وہ ختم ہو گئی۔ بیٹوں کو اب کوئی روک ٹوک بھی نہ تھی اس لیے محمد علی خاں کے چاروں بیٹے تلاشِ روزگار میں ادھر ادھر بکھر گئے۔ اس طرح دوسرے بیٹے فتح محمد خاں نے نواب اریکاٹ کی ملازمت اختیار کی اور بیچ ہزاری منصب پر فائز ہوئے۔

خیال ہے کہ یہی فتح محمد خاں، حیدر علی خاں کے والد بزرگوار تھے۔ بڑے بھائی محمد ایسا نے تنجا وریں ملازمت کی۔ پھر ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے حیدر صاحب وزیر برادران کی خواہش پر میسور آئے اور انہیں ۵۰۰ پیادوں اور ایک سو سواروں کی جعداری پر مامور کیا گیا۔ انہیں تانیک کا خطاب بھی عطا ہوا۔ یہی حیدر صاحب کلاں معرکہ دیون ہلی میں کام آئے اور شہباز کو قلعہ دیون ہلی کا قلعدار کا عہدہ دیا گیا۔

فتح محمد خاں نے نواب اریکاٹ سعادت اللہ خاں کے یہاں اپنی حسنِ کارکردگی اور بہادری کا ایسا مظاہرہ کیا کہ علم، نقارہ اور ماتھی کے حقدار ٹھہرے مگر یہ عزت اور شہرت چند روزہ ثابت ہوئی۔ نواب سعادت اللہ خاں کی وفات پر اس کے بیٹے اور بھتیجے میں اریکاٹ کے لیے تلواریں کھینچ گئیں اور فتح محمد خاں دل برداشتہ ہو کر میسور چلے گئے۔ جہاں ان کے بھتیجے حیدر صاحب کلاں ایک بڑا مقام حاصل کر چکے تھے۔

حیدر صاحب کلاں کی سفارش پر فتح محمد خاں کو دفنِ ملازمت مل گئی اور تانیک کا خطاب عطا ہوا۔ مگر انہیں یہ ملازمت راس نہ آئی اور وہ ملازمت کو خیر باد کہہ کے گھر بیٹھ رہے۔

اریکاٹ بین قیام کے دوران فتح محمد خاں نے تنجا وریں کے ایک درویش کی صاحبزادی سے شادی کر لی تھی۔ اس طرح ان کے باپ محمد علی خاں کی شادی درگاہ بندہ نواز گیسو دراز کے متولی کی بیٹی سے ہوئی

تھی اور بیٹے فتح محمد خاں نے ایک درویش کی صاحبزادی سے شادی کر کے درویشی اور مشائخ کا سلسلہ قائم رکھا۔

فتح محمد خاں کی اس بیوی (درویش زادی) مجیدہ بیگم سے پہلے شہباز اور پھر پانچ سال بعد حیدر علی پیدا ہوئے۔

حکایتِ حیدر علی کا مصنف حیدر علی کے نام اور پیدائش کے بارے میں ایک واقعہ بیان کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

”حیدر علی کے والد فتح محمد نے ایامِ حمل میں اپنی بیوی مجیدہ بیگم کو حیدر علی شاہ درویش کی خدمت میں بھیجا اور فرزند کی دعا چاہی۔ حیدر علی شاہ نے دعا دی کہ انشاء اللہ فرزند بلند سخت وارجمند پیدا ہو گا اور یہ کہ اس کا نام میرے نام پر رکھا جائے۔ چنانچہ بچے کی پیدائش پر اس کا نام حیدر علی رکھا گیا۔“

اس تفصیل کا بیان اس لیے کیا گیا کہ اس خاندان میں مشائخ اور درویشی شروع ہی سے پائی جاتی تھی اور نہ چاہنے کے باوجود یہ صفت کسی نہ کسی طور اس خاندان میں پیدا ہو جاتی تھی۔ حیدر علی کے دادا کی شادی بندہ نواز گیسو دراز کی درگاہ گلبرگہ کے متولی کی بیٹی سے ہوئی۔ حیدر علی کے والد فتح محمد خاں نے تنجا وریں ایک درویش زادی مجیدہ بیگم سے کی۔ پھر جب حیدر علی کی شادی کا وقت آیا تو ان کے عقد میں ایک پیر زادہ شاہ میاں کی صاحبزادی آئیں۔ اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

حیدر علی خاں کے والد فتح محمد خاں نے اگر باپ کا مسلک یعنی درویشی اور مشائخ اختیار نہیں کیا تھا لیکن درویشوں اور مشائخ سے میل ملاپ ان کے معمولات میں داخل تھا۔ جس وقت وہ مرا کے صوبے وار عابد علی خاں کے منصب دار تھے اور دو ہزار پیادہ اور ۵ سو سوار مع فیل و نقارہ اور علم پر سرفراز تھے، اس وقت بھی یہ درویشوں اور پیروں کے پاس جایا کرتے تھے۔

ادھر بیان کیا گیا ہے کہ فتح محمد خاں نے دوسری اولاد کے لیے مرا کے ایک درویش حیدر علی شاہ کے دروازے پر دستِ نیک دی اور انہیں دروازوں سے حیدر علی پیدا ہوئے۔ ان حیدر علی شاہ کی فرمائش پر حیدر علی کا نام رکھا گیا تھا۔

اسی زمانے میں سر امیں بیروز دوں کا ایک خاندان آباد تھا جس سے فتح محمد خاں کے گھر سے

تعلقات تھے۔ فتح محمد خاں ہفتہ میں ایک بار ضرور پیر زادہ خاندان میں جاتے تھے۔

حیدر علی کی عمر اس وقت چار سال کی تھی اور فتح محمد اکثر اسے اپنے ساتھ پیر زادہ کے پاس لے جایا کرتے تھے۔

پیر زادہ شاہ میاں اس وقت اس خاندان کے سربراہ تھے اور ان کی بڑی صاحبزادی حیدر علی کی تقریباً ۸ م عمر تھی۔ یہ بچی اکثر مردانے میں آجاتی اور حیدر علی کا ہاتھ پکڑ کر اس کے ساتھ کھیلنے لگتی تھی۔

اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ حیدر علی سن شعور کو پہنچنے کے بعد کبھی پیر زادہ شاہ میاں کے گھر گئے ہوں لیکن یہ ضرور ہے کہ جب ان کے بڑے بھائی شہباز، قلندر دیون علی نے بنگالہ گائٹم پہنچ کے کہا:

حیدر علی۔ میں تمہاری شادی کر رہا ہوں۔

تو حیدر علی نے شرم کے سر جھکا دیا۔

خیال رہے کہ شہباز، حیدر علی سے پانچ سال بڑے تھے اور ان کی شادی اس وقت ہو چکی تھی۔ شادی ہونے کے بعد انسان لوں بھی بزرگ ہو جاتا ہے۔ پھر حیدر علی کے والد کا انتقال ایک عرصہ پہلے ہو گیا تھا اور شہباز اب اس کے باپ کی مانند تھے۔

حیدر علی کی خاموشی کو شہباز نے نیم رضامندی سمجھا اور یہ صحیح بھی تھا۔ حیدر علی کی عمر انیس سال کی ہو چکی تھی اور جوش جوانی سے اس کی رگ رگ پھٹک رہی تھی۔ مگر اس جوانی پر شرافت کے پرے بیٹھے تھے اور حیدر علی بھول کے بھی شادی کا نام نہ لیتے تھے۔

اب شہباز نے دوسرا سوال کیا:

تجیدر علی۔ تمہیں یاد ہو گا کہ مراہیں قیام کے دوران ہمارے پدر بزرگوار، پیر زادہ شاہ میاں کی حویلی پر اکثر جایا کرتے تھے۔

تبھی اچھی طرح یاد ہے شہباز بھتیجے۔ حیدر علی نے معلومت مندی سے جواب دیا۔

میں نے ان کی بڑی بیٹی کے لیے تمہارا بیٹا دیا ہے۔ شہباز نے یہ کہہ کر شاید حیدر علی کو ایک عجیب الجھن میں ڈال دیا تھا مگر وہ کچھ پوچھ بھی نہ سکتا تھا۔

شہباز نے خود ہی اٹکٹان کیا:

پیر زادہ شاہ میاں نے تمہارا رشتہ منظور کر لیا ہے۔ اب تمہارا کیا خیال ہے۔

تمہارا کیا خیال ہے شہباز بھائی۔ آپ نے جو کیا وہ ٹھیک ہی ہو گا۔

حالانکہ حیدر علی اس رشتہ سے بہت خوش تھا۔

”مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ تم نے میری بات رکھ لی۔“

شہباز نے حیدر علی کو گلے لگایا۔

مصنف سلطنتِ خداداد کہتے ہیں کہ:

جب حیدر علی کی عمر ۱۹ سال ہوئی تو نندراج وزیر میسور نے پیر زادہ شاہ میاں، ساکن سرا

کی لڑکی سے حیدر علی کی شادی اپنے خرچ پر کرادی۔

مختصر یہ کہ حیدر علی کی شادی خواہ ان کے بھائی شہباز نے کرائی ہو یا وزیر میسور نے اپنے

خرچ پر کرائی ہو، یہ شادی اس قدر دھوم دھام سے ہوئی گویا یہ محافظہ دستوں کے آفر کی نہیں بلکہ

کسی شہزادے سے یا راجا کی شادی تھی۔ شادی میں ہر طرح کے تکلقات ہوئے اور شان و شکوہ کا مظاہرہ

کیا گیا۔

حیدر علی کی شادی کے سلسلے میں ایک بات بہت مشہور ہے۔

حیدر علی کے خسر شاہ میاں ایک بزرگ اور اللہ والے تھے۔ جب حیدر علی کا رشتہ ان کے گھر

طے ہو گیا تو پیر زادہ شاہ میاں نے لڑکے والوں سے کہا کہ:

”شادی کی رسومات نہایت سادگی سے ادا کی جائیں۔“

مگر شہباز یا نندراج نے شاہ میاں کی بات نہ مانی اور رڈ مسکی شادیوں سے بھی زیادہ اہتمام کیا گیا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ شاہ میاں کی لڑکی یعنی دھن نے یا اس کی سہیلیوں نے شادی کے

دوران اس قسم کی ہندوانہ رسمیں ادا کیں جن کا مسلمان گھرانوں میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

کہتے ہیں اللہ تعالیٰ اس بات سے ناراض ہو گیا اور جب حیدر علی کے پہلی اولاد پیدا ہوئی جو ایک

بچی تھی تو زچہ خانہ ہی میں حیدر علی کی بیوی پر فاج گرا اور اس کا پچھلا دھڑ ہمیشہ کے لیے بیکار ہو گیا۔

حیدر علی باوجود چھوٹے فیٹ کا لمبا چوڑا جوان، مونے کے بڑا بردبار اور صابر انسان تھا۔ اس

نے خدا کی مرضی پر سرجھکا دیا اور لوگوں کے لاکھ کہنے پر بھی دوسری شادی کے لیے رضامند نہ ہوا۔

ایک بیان کے مطابق حیدر علی کو اپنی بیوی سے بہت زیادہ محبت تھی۔ بیوی کو مفلوج، مونٹے چھ

سال گزر گئے مگر حیدر علی کی محبت میں کوئی فرق نہ آیا۔

تب —

ایک رات خود اس کی بیوی نے حیدر علی کو بچھایا:

میرے سرتاج۔ آپ کب تک انتظار کرتے رہیں گے کہ میں پہلے کی طرح ایک بار پھر اچھی بلی عورت ہو جاؤں گی۔ میرا مرض لاعلاج ہے۔ دیدوں اور جیکوں نے بہت سرمہ مارا مگر حکم خداوندی میں کون دخل دے سکتا ہے۔ آپ ابھی جوں۔

بیگم۔ ایسی باتیں مت کرو۔

حیدر علی نے اس کی بات کاٹ دی:

”کیا لوگوں کی بیویاں یہاں نہیں ہوتیں۔ آج نہیں تو کل اللہ تمہیں شفا دے دے گا۔“
”نہیں میرے سرتاج۔“

بیوی نے خوشامداز رویہ اختیار کیا:

”ابھی آپ کی ٹھری کیا ہے۔ آپ مجھ لاجپار کے ساتھ اپنی جوانی کو کیوں برباد کرتے ہیں۔ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر آپ کو دوسری شادی کی اجازت دیتی ہوں اور یہ خدا اور اس کے رسول کا حکم بھی ہے۔“

مگر بیگم۔ میں نے کب۔ حیدر علی نے کچھ کہنا چاہا مگر بیوی نے روک دیا:

”بس بس۔ جو میں نے کہہ دیا وہی ہو گا۔ آپ کو میری قسم ہے اب انکار نہ کیجیے گا۔“

باہروالوں کا تو پہلے ہی دوسری شادی کے لیے زور پڑ رہا تھا۔ اب بیوی نے خود نہ صرف پیش کش کی بلکہ حیدر علی کو دوسری شادی کے لیے مجبور کر دیا۔

ممکن ہے کہ ہندو مذہم و رسم و رواج کے برتنے سے واقعی اللہ تعالیٰ ناراض ہو گیا ہو اور ایک طرف تو بزرگواروں کی لڑکی، دوسری طرف باجا گا جا، ناچ ڈنگ اور آتش بازی، یہ تمام شیطانی شاعلی ہیں جو ہم مسلمانوں نے اپنے اوپر مسلط کر رکھے ہیں اور آج انگریزوں کی غلامی اور ہندوؤں کے اثر سے دور ہونے کے باوجود ہم اب تک پرانی رسموں کو برت رہے ہیں۔

اس دور میں تو ہندو لکچر کا اتنا اثر تھا کہ بچے کی پیدائش پر سمان گھرانے بھی ہندو پنڈتوں سے نوزائیدہ کی جسم کٹائی بنواتے تھے۔ اور پنڈتوں کی پیش گوئیوں پر یقین کرتے تھے۔ خود حیدر علی کے والد فتح محمد خاں نے اس کی پیدائش پر بڑی خوشی منائی تھی اور پنڈتوں کو جمع کر کے اس کی جسم کٹائی بھی تیار کر آئی تھی۔

پھر جب پنڈتوں نے جسم کٹائی سے حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ یہ بچہ اپنے باپ کے لیے

حد درجہ منحوس ہے۔

فتح محمد نے پوچھا:

”یہ نخواست کس طرح دور ہو سکتی ہے؟“

پنڈت نے بے دھرمک جواب دیا:

”حضور۔ اگرچہ صاحبزادہ بلند اقبال ہے لیکن اس پر والد کی جان کا صدقہ ہے۔ اس لیے

بہتر یہی ہے کہ اس شیر خوار کو شیر مرگ پلا دیا جائے اور ابھی یمن کے ٹنگوٹے میں سلا دیا جائے۔“

ممکن تھا کہ فتح محمد کے قدم ہلک جاتے اور وہ جو تثنیوں کی باتوں میں آکر اس نعل بے بسا کو ضائع کر دیتے لیکن قدرت نے اس بچے کی پرورش کا ذمہ خود لے رکھا تھا۔ چنانچہ فتح محمد نے بڑے حوصلے اور جرأت سے کہا:

”میں اس بچے کی نخواست پھیلنے کو تیار ہوں لیکن اس کا بال بھی سیکا نہیں ہونے دوں گا۔

جو کچھ ہونا ہے وہ مشیتِ ایزدی سے ہو گا اور جو قسمت میں لکھا جا چکا ہے اسے کون ٹال سکتا ہے۔“

فتح محمد نے بڑے ناز و نعم سے حیدر علی کو پالنا شروع کیا۔

کہتے ہیں بچے کے پاؤں پالنے میں۔ یعنی بچہ بچپن ہی سے اپنے مستقبل کا پتہ دینا شروع کر

دیتا ہے۔ حیدر علی جب تین سال کے ہوئے تو باپ کی تلوار پر ہاتھ ڈالا۔ ان کی والدہ نے والد سے کہا کہ:

”صاحبزادے ابھی سے سپاہی بننے کی فکر میں ہیں۔“

فتح محمد بہت خوش ہوئے مگر افسوس کہ وہ زیادہ دن زندہ نہ رہے اور جب حیدر علی صرف پانچ سال کے تھے تو ان کا انتقال ہو گیا۔

حیدر علی تعلیم نہ حاصل کر سکے۔ اس زمانے میں تعلیم کی طرف لوگوں کی توجہ بھی کم تھی لیکن قدرت

نے ان کی پرورش کی ذمہ داری لی تھی اس لیے وہ سپہ گری کی تربیت میں ایسے مشتاق ہو گئے کہ

دونوں بھائیوں جیسا نہ کوئی شہسوار تھا اور نہ شمشیر زن۔ دیون ہٹی کا معرکہ اس کا کھلا ہوا ثبوت تھا۔

حیدر علی کو سیکورٹی فورس کی افسری کے علاوہ فوجوں کی مجبذی کا کام بھی سونپا گیا تھا۔ وہ

اپنی مفلوج بیوی کے مجبور کرنے پر شادی کے لیے تیار ہو گئے۔ بڑے بڑے امرا انہیں رشتہ

دینے پر تیار تھے مگر حیدر علی زیادہ سے زیادہ وقت لینا چاہتے تھے اس خیال سے کہ شاید ہمیں

بیوی تندرست ہو جائے اور وہ دوسری شادی کے جھگڑے سے دور رہیں۔

اسی دوران پائیں گھاٹ میں ٹائٹوں کی بغاوت کی شورش پیدا ہوئی۔

نندراج کی نظروں میں توجہ دلی سمائے ہوئے تھے۔ اس نے حیدر علی کو تیار کیا کھم دیا۔ وہ تو میدان جنگ کے شیدائی تھے اور ایسے مواقع کے منتظر رہتے تھے۔ چنانچہ نندراج، حیدر علی خاں اور ایک معقول لشکر کے ساتھ پائیں گھاٹ پہنچا اور حیدر علی نے اپنی شمشیر خاں شگاف کے جوہر دکھانا شروع کر دیے۔

یہ بڑی زبردست شورش تھی۔ اگر حیدر علی جیسا جرئیل اس محاذ پر نہ پہنچتا تو سلطنت میسور کا تختہ بھی الٹ سکتا تھا۔

حیدر علی نے بڑی بھرتی اور تیز رفتاری سے اپنے چھوٹے سے لشکر کو پورے علاقے میں گردش دی اور بغاوت کی آگ کو مہرید بھڑکنے سے روک دیا۔

اس محاذ پر حیدر علی خاں کے اصل جوہر کھلے کیونکہ وہ خود ہی کمانڈر تھے اور خود ہی سپاہی۔ جہاں کمان کی ضرورت ہوتی وہاں حیدر علی خاں کی نڈر پیچ جاتا اور جہاں سپاہی کی جگہ خلی ہوتی وہاں حیدر علی خاں ایک جانباز سپاہی کی طرح سینہ سپر ہو جاتا۔ نندراج ان کے جوہر دیکھ کر عشق کر اٹھا۔

حیدر علی خاں نے شورش کو بڑھنے سے تو روک دیا تھا مگر اس پر پوری طرح قابو پانے کے لیے ایک طویل عرصہ اور چھوٹی بڑی لڑائی جھگڑوں کی ضرورت تھی۔

دھرنندراج، سرنگاپٹم سے زیادہ دن دو نہیں رہ سکتا تھا۔ اسے ہر وقت بغاوت کا خطرہ لگا رہتا تھا۔

حیدر علی بڑا ذہین تھا۔ اس نے نندراج کی بے چینی کا اندازہ کر لیا۔

”وزیر محترم؟“ حیدر علی نے ادب سے کہا:

”آپ چاہیں تو سرنگاپٹم تشریف لے جاسکتے ہیں۔“

مگر — ”نندراج، بچپن سے ہوئے بولا:

”میاں کی بغاوت ابھی پوری طرح فرو نہیں ہوئی۔ تم اکیلے رہ جاؤ گے حیدر علی خاں!“

شنا دار استقبال کیا گیا۔

وزیر برادران نے شہر سے باہر آ کر اسے خوش آمدید کہا۔ نندراج نے حسب عادت اسے

گلے لگایا۔

دوسرے دن مہاراجہ اور مہارانی نے راج محل میں حیدر علی خاں کو ایک پُر تکلف ضیافت دی۔

جس میں وزیر برادران اور بعض معزز شہر لوگوں کے علاوہ شہباز نے بھی شرکت کی۔

شہباز، نندراج سے مشورہ کے لیے دیون ملی سے آیا ہوا تھا۔ اس تقریب میں وزیر برادران کا طرف سے حیدر علی خاں کو نمایاں خدمات کے صلے میں ہاتھی، علم، نقارہ، پانکی اور پرچم کے اعزازات سے نوازا گیا۔

میسور کے یہی سب سے بڑے اعزاز تھے۔ ان اختیارات کے تحت حیدر علی اپنی ”خصوصی فوج“ بھی بھرتی کر سکتا تھا۔

حیدر علی خاں نے فوراً چار ہزار پیادوں پر مشتمل ایک دستہ اور پانچ سو سواروں کا خاص دستہ بھرتی کیا۔ ایک روایت کے مطابق وزیر برادران نے نندراج کی بغاوت فرو کرنے کے صلے میں حیدر علی کو ڈنڈیگ کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔

ماڈرن میسور کا مصنف لکھتا ہے:

”یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت میسور میں حیدر علی خاں سے بڑھ کر منظم اور بھری افسر کوئی نہ تھا۔“

حیدر علی خاں کی مفلوج بیوی کو بھی ان کے اس اعزاز سے بہت خوشی ہوئی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ حیدر علی خاں ابھی ایک کرٹیل جوان ہے اور ابھی وہ اس عمر کو نہیں پہنچا جب مرد بیز بیوی کے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس بار اس نے حیدر علی خاں کی دوسری شادی کے لیے اس قدر اصرار کیا کہ اسے ”ٹان“ کو ناہی پڑی۔ دوسری طرف وزیر برادران اور شہباز بھی اس پر دوسری شادی کے لیے بے حد زور دے رہے تھے۔

روایت ہے کہ حیدر علی خاں کی مفلوج بیوی نے اس کے لیے دوسری بیوی کا خود انتخاب کیا تھا۔ اس طرح پہلی بیوی کی رہنمائی اور خواہش پر حیدر علی خاں نے حاکم گرم گنڈا میر مجین الدین خاں کی صاحبزادی فاطمہ بیگم عرف فخر النساء سے ۱۷۵۸ء/ ۱۱۵۸ھ میں عقد کیا۔

یہ خاتون میر رضا علی خاں کی ہمشیرہ تھی۔ حیدر علی نے اس عقد کے وقت کوئی خاص اہتمام نہ کیا اور

نہایت سادگی سے رسم نکاح ادا کی گئی۔

میسور کے شیر دل سلطان شیو کی والدہ محترمہ یہی ناظمہ یکم تھیں، جس کی سلطنت ندادا نے ماری دنیا میں دھم چلائی تھی اور جس کی بھاری اور جرات نے رہتی دنیا تک کے لیے ایک تابناک مثال قائم کی تھی۔

ان واقعات کو ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ کرناٹک میں ابتری پھیل گئی۔ اس ابتری کی وجہ یہ ہوئی کہ نواب نظام الملک ناصر جنگ نے کرناٹک پر چڑھائی کر دی۔

ریاست میسور، نظام الملک ناصر جنگ کی حلیف تھی۔ نواب ناصر جنگ نے راجہ میسور کرشن اوڈیر اور اپنے باجگزار دوسرے پالیگاردوں (زمینداروں) کو اطلاع دی کہ وہ اپنی فوجوں کے ساتھ کرناٹک پہنچ جائیں۔

کرناٹک ان دنوں دوست محمد چندا صاحب کے زیر تسلط تھا اور اسے فرانسیسیوں کی حمایت حاصل تھی چنانچہ اس نے بھی اپنے حلیفوں کو بلوایا۔

مرنگاپٹم سے نندراج اور جواں عمر و جوانمرداں حیدر علی خاں، لشکر کے ساتھ کرناٹک کی طرف روانہ ہو گئے۔ نواب ناصر جنگ کی فوجیں بھی بڑے طعراق سے وہاں پہنچیں۔

اب ایک طرف کرناٹک کا دوست محمد چندا صاحب اپنے فرانسیسی حمایتیوں کے ساتھ صف آرا ہوا تو دوسری طرف ناصر جنگ اپنے حلیفوں کے ساتھ فرانسیسیوں اور چندا صاحب کے مقابلہ پر صف آرا ہوا۔ ناصر جنگ کے ساتھ میسور کی فوج حیدر علی خاں کی سرداری میں میسور پر متعین تھی اور میمنہ پر دوسرے پالیگاردوں کی فوجیں تھیں جن میں کرناٹک کے افغان بھی شامل تھے۔

دونوں لشکروں کو میدان جنگ میں آمنے سامنے صف بند ہونے تین دن ہو گئے تھے مگر جنگ شروع نہ ہوئی۔

دو اصل چندا صاحب کسی وجہ سے جنگ کو التوا میں ڈال رہا تھا۔ اس نے ایک مصالحتی وفد نواب ناصر جنگ کے پاس بھیجا جارہا تھا اور صلح کی گفتگو ہو رہی تھی۔

حیدر علی خاں نے دشمن فوج اور اس کی ترتیب کا بخور مطالعہ کیا تھا۔ اسے سو فیصدی امید تھی کہ نواب ناصر جنگ کو فتح حاصل ہوگی۔ حیدر علی خاں نے زور دے کے یہ بات نندراج سے کی تھی۔

”میں اکیلا نہیں ہوں وزیر محترم!“

حیدر علی نے بڑے استقلال سے جواب دیا:

”آپ بے فکر ہو کر تشریف لے جلیے۔ مرنگاپٹم میں آپ کی موجودگی یہاں میرے ساتھ رہنے سے زیادہ ضروری ہے۔“

نندراج نے آگے بڑھ کر حیدر علی خاں کو گلے لگایا:

”میرے بچے۔ میں نے تم سے جتنی امیدیں باندھی تھیں، تم ان پر پورے اترے ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ تم میں اعلیٰ سپاہیانہ اور قائدانہ صلاحیت کے علاوہ حالات کا صحیح اندازہ لگانے کی قابلیت اور ذہانت بھی موجود ہے۔“

”مجھے تو آپ نے بنایا ہے وزیر محترم۔“

حیدر علی خاں نے شکر گزار نظروں سے نندراج کو دیکھا:

”میں چاہتا ہوں کہ ہمیشہ آپ کے معیار پر پورا اتروں۔ آپ مرنگاپٹم پہنچے۔ یہیں میاں کے حالات درست کر کے جلد از جلد آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔“

لیکن حیدر علی کو اس شورش پر پوری طرح قابو پانے میں تقریباً دو سال لگ گئے تاہم اس جنگ سے حیدر علی خاں کو تجربہ بہت حاصل ہوا۔

نارتھ باغیوں نے حیدر علی کے خلاف جنگ کا ہر طریقہ آزمایا۔ وہ میدان میں جم کے لڑے اور گوریلا انداز کی لڑائی بھی لڑے۔ انھوں نے حیدر علی کے لشکر پر کئی بار شب خون مارے۔ انہیں پریشان کرنے کے لیے باغیوں نے بیک وقت دور اور نزدیک کئی کئی محاذ کھول دیے مگر وہ حیدر علی خاں کو زچ نہ کر سکے۔

حیدر علی خاں چلا وہ تھا، مڑا وہ تھا۔ بگو کہ تھا۔ صبح کو ایک محاذ پر تو دھپہ کو دوسرے پر اور شام کو تیسرے محاذ پر نظر آتا۔

کچھ ہی دنوں بعد نارتھوں میں مشہور ہو گیا کہ حیدر علی خاں انسان نہیں بلکہ جنات میں سے ہے یا پھر جنات اس کی مدد کرتے ہیں۔

آخر حیدر علی خاں کی بھاری اور حسن سیلنگی نے نہ صرف نارتھوں کی شورش کا پوری طرح خاتمہ کر دیا بلکہ اس علاقے کے لوگوں کے دلوں میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا۔

حیدر علی خاں فتح و نصرت کے جھنڈے اڑاتے دارا سلطنت مرنگاپٹم میں داخل ہوئے تو ان کا

نندراج کسی اور ہی خیال میں تھا۔

وہ جانتا تھا کہ جنگ نہ ہو بلکہ صلح ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ صلح کی بات چیت چندا صاحب کی طرف سے شروع ہوئی تھی، اس لیے امکان بھی تھا کہ چندا صاحب کچھ علاقہ دے کر نواب نامہر جنگ سے جان چھڑ لے گا۔

نندراج اس علاقے پر دانت لگائے ہوئے تھا جو صلح کی صورت میں نواب نامہر جنگ کو ملنے والا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ جب حیدر علی خاں نے نندراج سے کہا کہ وہ نواب نامہر جنگ کو فوراً جنگ شروع کرنے کا مشورہ دے تو نندراج نے اس سے وعدہ کر لیا کہ وہ نواب نامہر جنگ سے بات کرے گا لیکن اس نے اس سلسلے میں کوئی قدم نہ اٹھایا اور صلح کا انتظار کرتا رہا۔

انسان کی ہر سوچی ہوئی بات یا اندازہ صحیح نہیں ہوتا۔ نواب نامہر جنگ کو شکست بھی ہو سکتی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ دونوں میں صلح ہو جائے اور نندراج کو کوئی قلعہ یا زمین کا کوئی قطعہ مل جائے لیکن اس معاملے میں نندراج اور حیدر علی خاں دونوں کے انداز سے غلط ثابت ہوئے۔

دونوں طرف سے سفیر آتے جاتے رہے اور بات طویل کھینچتی چلی گئی۔ پھر اسی دوران ایک شب چندافغان سپاہی نواب نامہر جنگ کے خیمے میں گھس گئے اور اسے قتل کر دیا۔

نواب نامہر جنگ کے قتل کے ذمے دار دراصل فرانسیسی تھے۔

یورپ کی یہ دونوں قومیں یعنی فرانسیسی اور انگریز پرلے درجے کے مکار اور دھوکے باز ہوتی ہیں۔ جب انہیں میدان جنگ میں اپنی موت نظر آتی ہے تو فوراً مکاری اور عیاری پر اتر آتے ہیں۔ فرانسیسیوں کو معلوم ہو گیا تھا بلکہ چندا صاحب نے خود ان کو بتایا تھا کہ نواب نامہر جنگ کے ساتھ میسور کی فوج بھی ہے جس کا سردار وہ نو عمر لڑکا ہے جس نے دیون ہلی کے معرکہ میں شہادت اور جو انگریز کا ایک ناقابل یقین کارنامہ انجام دیا تھا۔

فرانسیسی یہ سن کے اور زیادہ پریشان ہوئے اور انھوں نے فوراً مکاری کا سہارا لیا۔ انھوں نے کڑ پتہ اور کرنل کے افغانوں کو نواب نامہر جنگ کے خلاف بھڑکایا۔

ایک نیاں یہ بھی ہے کہ ان افغانوں کو رشوت دی گئی اور انھوں نے نواب نامہر جنگ کو فریب سے قتل کر دیا۔

بہر حال — نواب کا قتل ہونا تھا کہ اتحادی لشکر میں بھگدڑ مچ گئی۔ جدھر جس کا منہ اٹھا وہ ادھر

بھاگ پڑا۔

نندراج پہلے ہی سرنگا پٹم واپس جا چکا تھا۔ حیدر علی بہت پریشان تھے کہ وہ کیا کریں۔ میدان جنگ سے بھاگ وہ جانتے ہی نہ تھے۔ نواب نامہر جنگ کی فوج سامان جنگ میدان میں چھوڑ کے بھاگ چلی تھی۔ نواب نامہر جنگ جنگی اخراجات کے لیے چالیس (یا چار) اونٹوں پر شاہی خزانہ بار کر کے لایا تھا۔ یہ بات حیدر علی کے علم میں تھی۔

اس خزانہ پر فرانسیسیوں نے حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔

حیدر علی خاں نے سوچا کہ اگر وہ بھی میدان جنگ سے خالی ہاتھ واپس گئے تو مہاراجہ کرشن اوڈیر وزیر برادران اور اہل سرنگا پٹم کی سوچیں گے؟

یہ بہت ذہن میں آتے ہی حیدر علی خاں اپنی فوج کے ساتھ ان فرانسیسیوں پر ٹوٹ پڑے جو خزانے سے لے کر اونٹ ہنگامے لیے جا رہے تھے۔

فرانسیسی اپنے آپ کو فاتح سمجھ بیٹھے تھے۔ انھوں نے اس حملے کو حیران نظروں سے دیکھا۔ پھر جلدی سے فوج کو ترتیب دے کر مقابلے پر آگئے۔

مگر —

حیدر علی کا مقابلہ کرنا تو ہے کے چنے جیانا تھا۔ حیدر علی نے انہیں کاٹ کے رکھ دیا اور وہ خزانہ کے اونٹ چھوڑ کے بھاگ کھڑے ہوئے۔

سرنگا پٹم میں نواب نامہر جنگ کے مارے جانے کی خبر پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ وزیر برادران سخت پریشان تھے۔ اسی عالم میں حیدر علی خاں، حیدر آبادی خزانے کے اونٹوں کے ساتھ سرنگا پٹم پہنچا۔ وزیر برادران خصوصاً نندراج کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

کمی نے یہ خبر راج محل میں راجہ تپک پہنچا دی کہ حیدر علی خاں میدان جنگ سے کامیاب اور ایک بڑا خزانہ لے کر واپس آیا ہے۔

راجہ کو ایسا جوشش آیا کہ وہ اسی وقت تاقی پر سوار ہو کر حیدر علی خاں کو مبارک باد دینے پہنچ گیا۔

اس وقت خزانہ اونٹوں پر سے اتارا جا رہا تھا اس خزانے میں شرنیوں سے بھرے سیکنڈوں

”اگر ہم دونوں انکار کر دیتے تو ہمارا جہ اور ہمارا فی اسے ہماری کمزوری پر محمول کرتے۔“
”وزیر محترم۔ کچھ تفصیل بتائیے۔ پتہ تو پہلے“ حیدر علی خاں مفصل حال سننا چاہتا تھا مگر
نندراج ٹال مٹول کر رہا تھا۔

”حیدر علی خاں۔ تمہارا فرزند ڈنڈیگل پہنچنا ضروری ہے۔“
نندراج نے اسے نصیحت کی:

”یاد رکھو اگر حکم اپنے مرکز سے غیر حاضر ہو تو کئی طرح کے فتنے سراٹھاسکتے ہیں۔ اس وقت
تم چلے جاؤ۔ ممکن ہے تمہیں جلد ہی سرنگا پٹم بلایا جائے۔ تم کیل کانٹے سے لیس رہنا۔ میرا
پہنچا مٹتے ہی سرنگا پٹم کے لیے چل پڑنا۔“

ہاں ایک بات اور۔۔۔ شہناز کو بھی اطلاع کر دینا کہ وہ بھی سرنگا پٹم آنے کے لیے
تیار رہے۔“

”بہتر ہے۔ جو آپ کا حکم۔“

حیدر علی نے جواب دیا:

”میں تو یہ چاہتا ہوں کہ یہاں کے حالات پوری طرح درست کر کے ڈنڈیگل جاؤں۔“

نندراج اور حیدر علی ایک ساتھ راج محل گئے۔

حیدر علی نے یہ ضرور محسوس کیا کہ نندراج کی حویلی سے راج محل تک نندراج کے فوجی
دستوں کا سخت پہرہ ہے۔

جب یہ دونوں نندراج کی حویلی سے روانہ ہوئے تو اس وقت ان کے آگے ایک فوجی
سوار دستہ تھا۔ اسی طرح ان کے پیچھے بھی ایک دستہ چل رہا تھا۔

ان دستوں کے علاوہ راج محل کے صدر دروازے اور اس کے گردا گرد بھی نندراج کے
لشکر کی بڑی مستعدی سے پہرہ دے رہے تھے۔

ہمارا جہ میسور کرشنن اوڈیر اور ہمارا فی مندی ان دونوں کے استقبال کے لیے راج محل کے
صدر دروازے پر موجود تھے۔

نندراج کے ساتھ آنے والے دستوں نے راج محل کے دروازے کی محافظت سنبھال لی۔

قیلے تھے۔

راجہ نے ہاتھی سوار اپنے جہز کو گلے سے لگایا۔ پھر جب اس کی نظر انٹرنیوں کے قیلولوں پر
پڑی تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

راجہ نے نندراج سے درخواست کی کہ حیدر علی خاں کو خزانے سے لے آدھے اونٹ دے
دیے جائیں جبکہ نندراج نے حیدر علی خاں کو خزانے سے لے تین اونٹ حوالے کیے۔ اگر خزانہ چار
اونٹوں پر بار تھا تو خزانے کا بیشتر حصہ اسے دیا گیا تھا۔ حیدر علی خاں نے یہ خزانہ اپنے لشکر میں
تقسیم کر دیا۔



حیدر علی خاں کو اس کامیابی کے سلسلے میں ہمارا جہ میسور کرشنن اوڈیر نے راج محل میں دعوت پر
بلایا۔ یہ پہنچا حیدر علی کو اس وقت پہنچا یا گیا جب وہ نندراج کی حویلی میں مقیم تھا اور ڈنڈیگل واپسی
کی تیاری کر رہا تھا۔

ہمارا جہ نے اس دعوت میں نندراج اور دہوراج کو بھی مدعو کیا تھا۔ انکار کی کوئی وجہ نہ تھی۔
اس لیے حیدر علی خاں نے ہمارا جہ کی دعوت قبول کر لی۔

حیدر علی خاں۔ اگر تم نے دعوت سے انکار کر دیا ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔ نندراج نے ہمارا جہ کے
قاصد کے جانے کے بعد کہا۔

”کیوں وزیر محترم؟“ حیدر علی نے حیران نظروں سے نندراج کو دیکھا:

”اگر کوئی ایسی ویسی بات تھی تو آپ مجھے پہلے ہی بتا دیتے؟“

”بات کچھ ایسی ہی ہے حیدر علی!“

نندراج نے ہنستے ہوئے کہا:

”میرا عدم موجودگی میں سرنگا پٹم میں بڑا اودھم مچا تھا مگر دہوراج نے اس پر قابو پایا۔ حالات
ابھی پوری طرح سدھ سے نہیں ہیں۔ ہمیں احتیاط کرنا چاہیے۔“

”وزیر محترم! ایسی بات تھی تو آپ نے ہی انکار کر دیا ہوتا۔“ حیدر علی نے کہا:

”اگر آپ نے انکار کر دیا ہوتا تو مجھے بھی انکار کا موقع مل جاتا۔“

”خیر جو رو اس بات کو۔“ نندراج نے بات ختم کرنے کے لیے کہا:

خلات مجھے کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔

نندراج کی عدم موجودگی میں جو سازش ہوئی تھی اس کا سرغنہ واصل گنگارام ہی تھا۔ نندراج کے مرزا گچم سے نکلے ہی گنگارام نے ہمارائی کو اپنی ایک کینز کے ہاتھ پیغام بھیجا تھا: "ہمارائی صاحبہ۔ میں فوراً آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں مگر اس کی خبر نندراج کے جاسوسوں کو نہ ہوئی چاہیے۔"

اس پیغام کے جواب میں ہمارائی نے راج علی جانے کا ہانہ کیا اور وہاں جانے کے بجائے بھیس بدل کر گنگارام کے پاس پہنچ گئی۔

چند لمحوں کی گفتگو میں شناخت گنگارام نے ہمارائی کو یقین دلادیا کہ اگر ہمارائی اس کے کہنے پر چلے تو وہ اسے وزیر برادران کی غلامی سے نجات دلا سکتا ہے۔

ہمارائی نے فوراً اسے اپنے تعاون کا یقین دلایا اور گنگارام نے ہمارائی سے فرمائش کی کہ اپنے عمل کے تمام ملازمین اور پرے داروں کو فوراً برخواست کر دے۔

اپنے عمل میں پہنچ کے ہمارائی کے گنگارام کے کہنے کے مطابق وزیر برادران کے ملازم رکھے ہوئے تمام افراد کو نکال باہر کیا۔

برخواست شدہ نوکرانہ نوکریاں فریاد لے کر دیوراج کے پاس گئے۔ اس وقت نندراج حیدر علی خاں کے ساتھ کرناٹک گیا ہوا تھا۔

دیوراج نے ہر نوکر کی بات بڑے تحمل سے سنی۔ ان لوگوں کی گفتگو سے دیوراج کو محسوس ہوا کہ ہمارائی اور ہماراجہ کسی کے بہکاوے میں آکر وزیر برادران سے بغاوت پر آمادہ ہیں۔

دیوراج نے تحقیق کے لیے ہماراجہ کرشن اوڈیر سے فوراً ملاقات کی۔ وہ اپنے ساتھ ہندو شمشیر زن لے کر گیا تھا۔ اس نے ان بہادروں کو اپنے ساتھ ہماراجہ کے کمرے تک لے جانے کا ارادہ کیا

مگر ہماراجہ کے نئے محافظوں نے دیوراج کے ان پندرہ محافظوں کو اندر جانے کی اجازت نہ دی۔ دیو راج اس پر بہت چڑھیا ہوا مگر اسے ہماراجہ سے گفتگو کرنا تھی اس لیے بے خوف و خطر تنہا ہماراجہ کے پاس پہنچی۔

ہماراجہ کرشن اوڈیر کے ساتھ ہمارائی نندی بھی وہاں موجود تھی۔ ہماراجہ کا طریقہ یہ تھا کہ وزیر برادران میں سے اگر کوئی ملنے آتا تو وہ بخوبی اپنے کڑے خاص یا ہمان خانے کے دروازے پر اس کا استقبال کرتا تھا مگر آج ہماراجہ نے نہ تو اس کا استقبال کیا اور نہ سلام کرنے میں پہل کی۔ ان

ہمارائی اور ہماراجہ نے بڑی خوشدلی سے میسرور کے دونوں سپوتوں کا استقبال کیا۔

ہمارائی اور ہماراجہ نے کچھ دن پہلے نندراج کے خلالت کے بغاوت کے جو بیج بوئے تھے اس میں ناکام رہے تھے اور اسی وجہ سے ان کی نظر میں نندراج کے سامنے اٹھ نہ رہی تھیں۔

ایک عجیب بات یہ بھی کہ جب وزیر یا وزیروں کے خلاف بغاوت ہوتی تو اس میں ہمارائی نندی پیش پیش ہوتی۔ حالانکہ وہ وزیر نندراج کی ملکی بیٹی تھی اور نندراج اس کا دقار برقرار رکھنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔

کھانے کے دوران ہماراجہ خوب چمکتا مگر ہمارائی نے گفتگو میں بہت کم حصہ لیا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ تھا اور آنکھوں میں عجیب سے بھیاٹک سائے لہرا رہے تھے۔

دعوت سے واپسی پر نندراج نے حیدر علی کو بتایا: "حیدر علی خاں! تم جانتے ہو ہمارائی نندی میری بیٹی ہے۔ اس کے تابناک مستقبل کے لیے میں نے کرشن اوڈیر سے اس کی شادی کرائی تھی مگر یہ میری ہی مخالف ہے اور ہر دم میری جڑیں کاٹنے پر آمادہ رہتی ہے۔"

حیدر علی خاموش رہا۔ وہ باپ بیٹی کے معاملات میں کیا بولتا۔

اور نندراج اپنی بھڑاس نکال رہا تھا۔

"اس نے ایک بار پہلے بھی ایک فوجدار سے سازش کر کے میرا اقتدار ختم کرنے کی کوشش کی تھی اور اس بار بھی جب میں تمہارے ساتھ کرناٹک میں تھا تو اس نے فوجدار گنگارام کو اپنے ساتھ ملا کر مرزا گچم اور دوسرے مقامات پر شورش برپا کرنے کی کوشش کی تھی۔"

گنگارام کے ناک پر حیدر علی چونکا۔

"وزیر محترم! اس گنگارام کو کچھ دن پہلے آپ نے فوجدار کے مدد سے پرگواہ کیا تھا۔"

حیدر علی کی بات میں طنز تو نہ تھا مگر جملہ استغناء مہیا تھا۔ نندراج نے ٹھنڈی سانس لے کے جواب دیا:

"ہاں حیدر علی خاں۔ یہ میری ہی غلطی ہے مگر ایسی غلطیاں مجھے کرنا ہی پڑتی ہیں۔ میں نے تمہارے اور شہزاد کے لیے کیا نہیں کیا۔ اپنا بیٹا، اپنا بھائی اور دوست بنایا۔ اب اگر تم مجھے دھوکہ دے جاؤ تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے کسی نہ کسی پر تو اعتماد کرنا ہی پڑے گا۔"

مجھے بتایا گیا ہے کہ گنگارام، ہمارائی نندی کے ساتھ سازش میں شامل تھا لیکن اس کے

اس نے بولنے میں پہل ضرور کی:

"بیٹھو دیوراج!"

ہماراجہ نے اپنے اوپر شانہ رعب طاری کرتے ہوئے کہا:

"کو کیسے آنا ہوا؟"

دیوراج کے تن بدن میں لگ لگ گئی۔ اس نے بیٹھنے کے بجائے کھڑے کھڑے اور غصہ

میں کانپتے ہوئے کہا:

"اوڈیرو۔ اپنی اوقات مت بھولو۔ یہ گدیا ہم نے تمہیں دی ہے۔ یاد رکھو جو دے سکتا ہے

وہ واپس بھی لے سکتا ہے۔"

ہماراجہ کرشن اوڈیر تو سمجھا۔ کوئی جواب نہ دے سکا مگر ہمارانی مندی نے اسے ہمارادیا

اندکڑک کر بول:

"وزیر چاہا۔ کیا قیامت آگئی ہے کہ تم اس قدر لال پیلے ہو رہے ہو؟"

"ہمارانی مندی۔ تم میری بھتیجی ہو اس لیے میں تمہیں کوئی سخت جواب نہیں دیتا! دیوراج نے

خود پر قابو پاتے ہوئے کہا:

"مگر میں یہ ضرور پوچھوں گا کہ محلات کیسے پرانے ملازموں کو کس نے جواب دیا ہے؟"

"میں نے انہیں نکالا ہے۔"

ہمارانی مندی نے اگرچہ جواب دیا:

"اس لیے کہ وہ تمہارے رکھے ہوئے ملازم تھے۔ وہ ہمارا حکم نہیں مانتے تھے۔ ہم نے انہیں

نکال باہر کیا اور اپنی مرضی کے ملازم رکھ لیے۔"

ہمارانی مندی۔ جھوٹ مت بولو۔ یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ مشورہ کس نے دیا۔ تمہارے پیچھے کون ہے

اور تم کس کے اشاروں پر چل رہی ہو؟

ہمارانی نے ہماراجہ کی طرف دیکھا۔

ہماراجہ سر جھکاٹے خاموش بیٹھا تھا اور اسے پسینے جھوٹ رہے تھے۔ ہمارانی مندی نے

سنجیل کے کہا:

"مجھے مولے ہماراجہ کرشن اوڈیر کے اور کون مشورہ دے سکتا ہے۔ ہم دونوں نے آپس

میں مشورہ کیا اور پرانے نوکروں کو ہٹا کر اپنی مرضی کے نوکر رکھ لیے۔ اس میں ناراض ہونے کی

کیا بات ہے؟"

"میری آخری بات سنو۔ یہ میرا حکم بھی ہے۔"

دیوراج نے بڑی تکنت سے کہا:

"کل صبح تک پرانے ملازم واپس آ جانا چاہیے۔ اس پر عمل ہونا چاہیے۔"

"ہم تمہارے حکم کے پابند نہیں ہیں وزیر چاہا۔ تم نے ہم پر بہت حکومت کر لی۔ اب ہم آزاد

ہیں اور تمہیں ہمارا حکم ماننا پڑے گا۔"

ہمارانی اس کے بعد بھی بولتی رہی۔

مگر۔

دیوراج نے اس کا آخری جملہ بھی نہیں سنا اور واپس چل پڑا۔

مرنگا پٹم کی ریاستی فوج کو نند راج اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یہاں حرف محافظ دستوں کے اور

کوئی فوج نہ تھی۔ ان دستوں پر دیوراج کو اعتماد نہ تھا۔ اسے اب تک یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ ہماراجہ اور

ہمارانی کس کی شہ پر آپس سے باہر ہو رہے ہیں۔ مرنگا پٹم کا فوج چاند اگرچہ مختصر سا تھا مگر وزیر برادران

نے اسے اسٹے وقت کے لیے محفوظ کر رکھا تھا۔

دیوراج، راج محل سے نکل کر سیدھا توپ خانہ پہنچا۔

تمام توپچی وزیر برادران کے پروردہ اور احسان مند تھے۔ دیوراج کو دیکھتے ہی وہ اس کے قدموں

پر جھک پڑے:

"ہماراج۔ جہیں بھی کبھی خدمت کا موقع دیکھیے۔ ایک توپچی گر گڑا یا:

"اتنے عرصے سے ہم مفت کی روٹیاں توڑ رہے ہیں۔ کبھی تو ہم سے کام لیجیے!

"اگر میں یہ کہوں کہ آج میں تم سے کام لینے ہی کے لیے آیا ہوں تو۔" دیوراج نے مسکراتے

ہوئے کہا۔

توپچیوں کے چہروں پر رونق آگئی۔ ان میں سے ایک نے آواز لگائی:

"ہماراج وزیر دیوراج کی ہے۔"

دیوراج نے اس کی آواز میں آواز ملا کر اس کا جواب دیا۔

دیوراج نے حکم مند انداز میں کہا:

"میں جہاں گولے پھینکنے کو کہوں گا، وہاں پھینکو گے؟"

ان کے مردار نے فوراً جواب دیا:

”مہاراج۔ اگر آپ کہیں گے کہ اپنے گھروں پر گولے پھینکو تو بھی ہم انکار نہیں کریں گے۔ آپ کہہ کے تو دیکھیے۔“

”بس ٹھیک ہے۔“ دیو راج نے مطمئن ہو کر کہا:

”تم تو ہیں نکالو اور راج محل کے چاروں طرف لگا دو۔ پھر جس طرح میں کموں اسی طرح کرو۔“
توپخانہ کے عملے نے بڑی تیزی سے توپیں نکالیں اور راج محل کے چاروں طرف لگا دیں۔
راج محل کے ملازموں نے توپوں کی شکل دیکھی تو ان کی اپنی شکلیں گمراہ گئیں۔ پورے محل میں کسہم
پچ گیا۔

مہاراجہ اور مہارانی جو آجکل مہاراجہ کے ساتھ ہی رہا کرتی تھی، ان کے ہاتھ پیرکانے لگے۔
مہاراجہ نے فوراً ایک با اعتماد ملازم کو گنگا رام فوجدار کے پاس بھیجا اور اسے توپخانہ کے محل گیر نے
کے احوال سے آگاہ کیا۔

گنگا رام فوجدار بڑا چالاک تھا۔ اس نے اندازہ کر لیا کہ حالات گمراہ گئے ہیں اس لیے اس نے
مہاراجہ کو جواب بھیجا کہ:

”میں دیہات میں فوج اکٹھا کرنے جا رہا ہوں۔ آپ اپنی جگہ پر ڈٹے رہیے۔ میں بہت جلد فوج
لے کے واپس آؤں گا اور دیو راج کو اس کی گستاخی کی سزا دوں گا۔“

گنگا رام بڑی خاموشی سے سرنگا پٹم چھوڑ گیا اور مہاراجہ اور مہارانی کی طرف سے اس طرح
انہیں پھیر لیں جیسے کبھی ان سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔

وزیر برادران بہت جلدیدہ تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مہاراجہ گانہ میسور کو برسوں سے کس طرح
دبائے چلے آتے۔

جس طرح راجے مہاراجہ موروثی ہوتے تھے اسی طرح میسور کے وزیروں نے بھی اپنا موروثی حق
تسلیم کر لیا تھا۔ نند راج اور دیو راج کے باپ دادا وزیر تھے اور اب انہوں نے اپنی اولاد کو دناڑ
کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔

دیو راج نے توپیں توخت کر دیں مگر ابھی اس نے گولہ باری کا حکم نہ دیا تھا۔ شاید وہ اس
انتظار میں تھا کہ مہاراجہ اور مہارانی کا مزاج درست ہو جائے اور اسے راج محل پر گولہ باری نہ کرانی
پڑے مگر مہاراجہ اور مہارانی کو پہلے تو گنگا رام کا سہارا تھا۔ پھر جب اس نے یہ جواب بھیجا کہ وہ

فوجیں اکٹھی کرنے جا رہا ہے اور مہاراجہ محاذ پر ڈٹا ہے، تو اس وقت مہاراجہ اور مہارانی کی رائے
یہ ٹھہری کہ گنگا رام کے کہنے کے مطابق انہیں دیو راج کے سامنے ہتھیار نہ ڈالنے چاہیے۔

مہارانی نندی نے تو اس خیال کا اظہار بھی کیا تھا کہ دیو راج، راج محل پر گولہ باری نہیں کر
سکتا۔ کیونکہ محل میں خود اس کی بھتیجی اور میسور کے مرد آہن نند راج کی بیٹی موجود ہے۔ دیو راج
میں یہ ہمت ہو ہی نہیں سکتی کہ وہ مہارانی نندی کو ہلاک کر سکے۔

مگر۔

اس وقت مہارانی نندی کا چہرہ فنی ہو گیا جب راج محل کے پائیں باغ میں پسلا گولہ گرنا۔
یاس گولے سے اگرچہ کچھ زیادہ نقصان نہ ہوا اور صرف چند درخت اور زمین جل کے رہ گئی تاہم مہارانی
کی عقل ٹھکانے آ گئی۔

مہارانی نندی بھاگ کے مہاراجہ کی خوابگاہ میں گھس گئی۔

”کرشن اب کیا ہوگا۔ کیا ہوگا اب کرشن؟“ مہارانی نندی کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور اس کی زبان
سے الفا بہت مشکل سے نکل رہے تھے۔

مہاراجہ میسور نے بھی پہلے گولے کی آواز سن لی تھی اور اپنے دست پر اونڈھا پڑا کانپ رہا تھا۔
اس نے مہارانی کی آواز سنی اور مزید دب گیا۔

اسی وقت توپوں کے گولوں کی اس طرح بارش شروع ہو گئی جیسے راج محل میدان جنگ بن
گیا ہو۔

دونوں کے چہرے پہ فنی ہوئے تھے۔ پھر زرد پڑے تھے اور اب ان پر سیاہی پھیل گئی تھی۔
وہ دونوں ایک دوسرے سے پیٹے گٹھری بنے پڑے تھے۔

راج محل کی ہر راہداری میں قیامت برپا تھی۔ کینیز اور غلام ادھر سے ادھر اور ادھر سے
ادھر بھاگ رہے تھے۔ جو راہداری، جو کونا انہیں جانے امن محسوس ہوتا وہ ادھر ہی کو بھاگ اٹھتے
مگر دوسرے ہی لمحے توپ کا گولہ ان کے قریب آکے گرتا اور انہیں دوسری جگہ بھاگنا پڑتا۔

خبر تو یہی تھی کہ اب تک کوئی گولہ راج محل کے کسی کمرے یا راہداری کے اندر نہیں گرا تھا اور
یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے توپچی راج محل کے ان حصوں میں تاک تاک کے گولے پھینک رہے ہیں
جہاں راج محل کے باسیوں کا کم ہی گزر ہوتا تھا۔

دو گھنٹے کی مسلسل گولہ باری سے راج محل کی اصل عمارت تو محفوظ رہی لیکن اس کے باغات،

سکتا ہے۔

ہمارا جہ اور ہمارائی کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔
ہمارا جہ نے خنوک نکلنے ہوئے کہا:

”نندی! جلدی فیصلہ کرو ہیں کیا کرنا چاہیے؟“
ہمارائی کا دماغ صحیح ہو گیا تھا۔ وہ بولی:

”ہمیں خود کو دیوراج کے رحم و کرم پہ چھوڑ دینا چاہیے۔“

ہمارائی نندی نے شاید زندگی میں پہلی بار صحیح فیصلہ کیا تھا اور نہ صاف ظاہر تھا کہ جو راج
عمل کے چاروں طرف گولے پسٹو کا سکتا تھا اس کے بیسے راج محل کوٹھا کے ڈھیر میں تبدیل کرنے
کے لیے صرف زبان ہلانا تھی۔

”تو پھر چلیں۔“ ہمارا جہ نے ہمارائی کی طرف دیکھا۔

”ضرور چلنا چاہیے۔ کبھی کبھی زہر بھی تریاق بن جاتا ہے۔“ اور ہمارائی نندی آگے آگے
چلنے لگی۔

محل کی بیرونی سیڑھیوں کے نیچے ایک بند گھوڑا گاڑی کھڑی تھی جس کی حفاظت بیس ہوا
کر رہے تھے۔

سواروں نے اب سے دونوں کو سلام کیا۔ گاڑی بان نے ایک طرف کا پردہ ہٹایا اور ہمارا جہ
میسور اور ہمارائی نندی مجرموں کی طرح گاڑی میں دبک کر بیٹھ گئے۔

گاڑی کا رخ تو پنجانہ کی عمارت کی طرف تھا۔

دیوراج نے گاڑی آتے دیکھی تو دروازے کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا۔ گاڑی بان نے
ہمارا جہ کو بتادیا تھا کہ وزیر دیوراج سامنے ولے کرے میں بیٹھیں۔ آپ سے وہ وہیں ملاقات
کر رہے گئے۔

دونوں لڑتے قدموں سے کمرے کے دروازے پر پہنچے تو انہیں دیوراج دروازے کی طرف
پیٹھ کیے بیٹھا دکھائی دیا۔

”خستہ وزیر چاہا۔“ ہمارا جہ اور ہمارائی اندر داخل ہوئے اور آواز ملا کر دیوراج کو سلام کیا۔
مگر ان کی مشترکہ آواز زرد رہی تھی۔

”خوش رہو۔ دونوں کی جوڑی سلامت رہے۔“ دیوراج نے سرگھبرا کر کہا اور انہیں سامنے

مہزہ زار روٹیں اور غلام گردش کے تمام مکانات زمیں بوس ہو گئے۔
پھر اک دم گولہ باری بند ہو گئی۔

لیکن۔۔۔ راج محل سے کوئی شخص باہر نہ نکلا، اس ڈر سے کہ کہیں دوبارہ گولے گرنے کا
شروع ہو جائیں۔ راج محل کے باسیوں پر اس قدر دہشت و خوف طاری ہو گیا تھا کہ ایک دوسرے
سے بات بھی نہ کر رہے تھے۔

ہمارا جہ اور ہمارائی نندی خواب گاہ کے ایک کونے میں دم سادھے کھڑے تھے۔ غلام گردش
کے تمام لوگوں (غلام اور کینیز) غلام گردش تباہ ہونے کے بعد راج محل کی راہداریوں میں پناہ
لے لی تھی۔

لطف کی بات یہ تھی کہ راج محل کے چاروں طرف گولے گرے تھے مگر محل کی چھاد دیواری اور صدارت
دروازہ بالکل محفوظ تھے۔ ان پر ایک گولہ بھی نہیں گرا تھا۔

گولہ باری رکنے کے چند ہی منٹ بعد ہمارا جہ کی ایک کینیز نے اندر آکر بتایا،
”فد دروازے کا ایک سپاہی وزیر دیوراج کا پیام لے کر آیا ہے۔“

ہمارا جہ اور ہمارائی نے اس اطلاع پر ہنگوان کا شکر ادا کیا۔ ہمارائی نے کہا:

”سپاہی کو فوراً اندر بھیجو۔“

کینیز باہر گئی اور سپاہی کو ساتھ لے کر پھر آگئی۔ سپاہی نے حسب دستور ہمارا جہ اور ہمارائی کو
جھک کے سلام کیا۔

”کس کا پیغام ہے۔ کیا پیغام ہے؟“ ہمارائی نندی نے دریافت کیا۔

سپاہی نے جواب میں کہا:

”وزیر دیوراج نے ایک بند گاڑی بھیجی ہے اور کہا ہے کہ ہمارا جہ اور ہمارائی اس گاڑی میں بیٹھ کر
فوراً ان کے پاس پہنچ جائیں۔“

دیوراج نے اپنے اقتدار اور طاقت کا تھوڑا سا نمونہ دکھا کر ہمارا جہ اور ہمارائی دونوں کو اپنے
حضور طلب کیا تھا۔ ان کی جان تو پہلے ہی نکل رہی تھی۔ اس پیغام نے ان کے رہے رہے ہوش
بھی اڑا دیے۔

”دیوراج ہمیں گرفتار کر کے قید میں ڈال دے گا؟“ ہمارائی نے خیال ظاہر کیا۔

ہمارا جہ میسور کرشن اوڈیر نے اس میں اضافہ کیا: ”دیوراج ہم دونوں کو قتل بھی کر

کی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ہمارا جہ میسور اور ہمارا فی نندی بیٹھ گئے مگر سب سے اوردور سے۔ حالانکہ دیوراج نے دونوں کو سلامتی کی دعا دی تھی۔

”ہمارا جہ میسور۔ تمہیں اپنے اختیارات کا اندازہ ہو گیا ہوگا؟“ دیوراج نے پھرے ہوئے لیے میں کرشن اوڈیر سے سوال کیا۔

ہمارا جہ میسور کو کوئی جواب نہ سوجھا اور اس نے مثر مندی سے سر جھکا لیا۔

”تم کو ہمارا فی نندی!“

دیوراج نے اس کی طرف دیکھا:

”تمہیں ہمارا فی بھی ہم دونوں بھائیوں نے ہی بنایا ہے۔ کیا تم بھول گئیں؟“

وزیر چاچا۔ سب یاد ہے مجھے! رانی کی آواز بہت دھیمی تھی۔

”پھر تم نے جھ سے کیوں گستاخی کی تھی؟“

دیوراج کا لہجہ اک دم سفت ہو گیا:

”ہم نے تم سے کہہ دیا تھا کہ جو بنا سکتا ہے وہ بگاڑ بھی سکتا ہے۔“

”بس غلطی ہو گئی وزیر چاچا۔“

ندی گڑ گڑانے لگا:

”بس اس دفعہ معاف کر دیجیے۔ آئندہ کبھی آپ کو شکایت کا موقع نہ ملے گا۔“

”تم کیا کہتے ہو ہمارا جہ میسور کرشن اوڈیر۔“ دیوراج سے جو گستاخی ان میاں بیوی نے

کی تھی اس کی تلمی اس کے لیے میں اتر آئی تھی۔

”وزیر چاچا۔“ نندی کی دیکھا دیکھی ہمارا جہ بھی دونوں وزیر برادران کو وزیر چاچا کہنے

لگا تھا:

”اصل غلطی تو میری ہے کہ میں نے آپ کے اقتدار کو جھٹلانے کی کوشش کی تھی۔ آپ مجھے

سزا دیجیے۔“

”میںوں۔ مقابلہ کی طاقت کیا ہوئی؟“

دیوراج نے سخت لہجے میں کہا:

”خطا دونوں کی ہے اور سزا بھی دونوں کو ملنی چاہیے۔“

ہمارا فی نندی سسکیاں لینے لگی۔ ہمارا جہ میسور بھی عورتوں کی طرح آنسو بہانے لگا۔ شاید دیوراج

کو رنج پر رحم آ گیا۔ اس نے کہا:

”تم دونوں کو خطا معاف ہو سکتی ہے مگر۔۔۔“

دونوں نے گھبرا کے مگر پھر امید نظروں سے دیوراج کو دیکھی۔

ہمارا فی نے ہرجا بتاتے کہا:

”وزیر چاچا۔ آپ جو کہیں گے وہ ہم کریں گے۔ آپ بس عین معاف کر دیجیے۔“

”پھر بتاؤ تمہیں کس نے ہکا بٹھا؟“

دیوراج اصل نیت پر دراز کا نام معلوم کرنا چاہتا تھا۔

راجہ کاجی چاہا کہ وہ کنگھارام کا نام لے دے مگر ہمارا فی نے اسے اشارے سے روک دیا۔

اس کے دل میں جو رتھا بھی تو وہ ناکرانا نے گے مگر یز کر رہی تھی۔

رانی نے بر سے سولے سے جواب دیا:

”وزیر چاچا اگر ہمیں کسی نے ہکا بٹھا ہوتا تو اس کا نام بتا کر پہل ہی اچھڑا لیتے۔ یہ

سب ہمارا فی غلطی تھی۔ ہمیں معاف کر دیجیے۔“

دیوراج نے انہیں معصوم سمجھتے ہوئے معاف کر دیا۔ تب ہمارا فی نے ایک اور پیش بندی

کی۔ اس نے دیوراج کے پیروں میں بیٹھ کر کہا:

”وزیر چاچا۔ آپ نے ہمیں معاف کر دیا ہے تو ایک ہر بائی در کیجیے۔“

وزیر دیوراج نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا:

”کو کیا چاہتی ہو؟“

”وعدہ کیجیے کہ اس کا ذکر وزیر بابا سے نہیں کریں گے۔ ہمارا فی نندی نے دیوراج سے

التمار کرتے ہوئے کہا:

”وہ بہت سخت ہیں۔ نہ معلوم کیا کر بیٹھیں۔ مجھے ڈر رہا ہے۔“

دیوراج نے اسے زمین سے اٹھا کر لگا لگا:

”اچھا نہیں کہوں گا۔“ اس نے جان چھڑائی۔

”نہیں وزیر چاچا۔ نندی نے ضد کی:

”آپ وعدہ کیجیے پھر سے!“

”اچھا نہیں کہوں گا نندراج سے۔ وعدہ کرتا ہوں و
 ”پکا وعدہ ہے نا؟“
 ”ہاں ہاں۔ پکا وعدہ۔“

وزیر دیو راج نے اپنا وعدہ وفا کیا اور جب نندراج، کرناٹک کی جنگ حیدر علی خاں کے
 سپرد کر کے مرنگا پٹم سے واپس آ گیا تو دیو راج نے اس سے مہاراجہ اور مہارانی کی مہنات کا کوئی
 ذکر نہ کیا۔

اس کے باوجود دیو راج کو یہ خیال تھا کہ نندراج سے یہ خبر چھپی نہ ہے گی اور کوئی نہ کوئی
 اسے ضرور بتا دے گا۔

پھر جب حیدر علی خاں کرناٹک سے نفا حیدر آباد کے خزانے کے اوٹے کر مرنگا پٹم
 آیا تو مہاراجہ اور مہارانی نے اس کے لیے آنکھیں فرس راہ کر دیں۔ وہ دونوں حیدر علی سے اس طرح
 جھگ کے ملے کہ حیدر علی کو شرم آنے لگی۔

نندراج نے بھی اپنی بیٹی نندی اور داماد راجہ کرشن اوڈر کے اس غلوں کو دیکھا اور دھوکہ کھا
 گیا۔ حیدر علی خاں بھی ایک دن مرنگا پٹم میں قیام کر کے اپنے ملائے ڈنڈیگو واپس چلا گیا۔
 کرناٹک کے عاڈر حیدر علی خاں کے زیرِ کمان ایک تو اس کی اپنی ڈنڈیگیل کی فوج تھی اور
 دوسری مرنگا پٹم کی فوج تھی جو وزیر نندراج اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔
 ڈنڈیگیل واپسی کے وقت حیدر علی خاں صرف اپنی فوج ساتھ لے گیا تھا اور مرنگا پٹم کی فوج
 مرنگا پٹم ہی میں رہ گئی۔ یہ فوج براہ راست دونوں وزیر بھائیوں کے ماتحت تھی۔

حیدر علی خاں کے ڈنڈیگیل جانے ہی مرنگا پٹم ایک بار پھر شورشوں کی پٹیٹ میں آ گیا۔
 نندراج ایک پالیگار کے بیٹے کی شاد میں مرنگا پٹم سے ہر گیا ہوا تھا کہ شہر میں بغاوت پھوٹ
 پڑی۔

دیو راج مرنگا پٹم میں موجود تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ بغاوت دراصل مرنگا پٹم کی اس فوج نے
 کی ہے جو حیدر علی خاں کے ساتھ واپس آئی تھی۔

اس فوج کا سردار فوجدار گنگا رام تھا جس نے مہاراجہ اور مہارانی کو بھڑکانے کے وزیر برادران کے

خلات شورش برپا کی تھی۔

اس دوسری بغاوت کی ذمہ داری دیو راج پر بھی آئی تھی۔ اگر اس نے نندراج کو بتا دیا ہوتا کہ اس
 کی عدم موجودگی میں مہاراجہ اور مہارانی نے کرشن کی تھی جسے راج علی پوتھ کے گولے پھینک کر ختم
 کیا گیا تھا۔ اس اعلان پر ممکن تھا کہ نندراج نے فوجدار گنگا رام کو ہٹا دیا ہوتا کیونکہ وہ شورش کے
 وقت مرنگا پٹم سے بھاگ گیا تھا اور شورش کے بعد مرنگا پٹم واپس آ کر اس نے دیو راج سے معافی
 مانگ لی تھی۔

بغاوت صرف مرنگا پٹم ہی میں نہیں بلکہ پورے میسور میں پھیل گئی تھی۔ گنگا رام اگرچہ پہلی شورش
 کے وقت مرنگا پٹم سے بھاگ گیا تھا لیکن اس نے دارالسلطنت سے دور رہ کر مختلف پالیگاروں
 کو وزیر برادران کے خلالت بغاوت کرنے پر آمادہ کر لیا تھا تاہم حیدر علی خاں کے مرنگا پٹم آنے سے
 اس نے بغاوت کو چند دنوں کے لیے روک دیا تھا۔
 اب گنگا رام کے لیے میدان صاف تھا۔

حیدر علی خاں ڈنڈیگیل واپس جا چکا تھا۔ نندراج مرنگا پٹم سے باہر تھا۔ مرہٹوں سے ساز باز کر
 کے اس نے انہیں مرنگا پٹم کے قریب بلوایا تھا۔
 مرہٹے اس راستے پر سنت پھوڑے رہے تھے جدھر سے نندراج کے واپس آنے کا امکان تھا۔
 مرنگا پٹم کی فوج جو کرناٹک سے واپس آئی تھی اس کا اصل فوجدار گنگا رام ہی تھا۔ اسے فوج کو وزیر برادران
 کے خلالت بھڑکانے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔ حالانکہ اس فوج کو حیدر علی خاں نے حیدر آباد کے نذرانے
 سے اپنے ذاتی سپاہیوں کی طرح برابر کا حصہ بھی دیا تھا۔

گنگا رام نے بغاوت کا علم بلند کر کے سب سے پہلے راج علی پر قبضہ کیا۔ مہاراجہ اور مہارانی
 اس کے پہلے ہی سے حلیف تھے۔ گنگا رام نے راج علی پر اس لیے قبضہ کیا کہ عوام میں مہنت پیدا ہو
 اور وہ بغاوت کے خلالت کوئی آواز بلند نہ کریں۔

دوسرا کام دیو راج کی گرفتاری تھی۔ دیو راج کے جاسوس گنگا رام کی بغاوت کے بارے میں کوئی اطلاع
 نہ دے سکے مگر انہیں میسور کی سرحدوں پر مرہٹوں کے آنے کی خبر مل گئی اور انہوں نے یہ خبر فوراً
 دیو راج کو پہنچا دی تھی۔

گنگا رام کا ایک فوجی دستہ دیو راج کو گرفتار کرنے اور وقت پہنچا جب دیو راج اپنے ایک
 خاص قاصد کو اپنا خط دے کر نندراج کے پاس بھیج رہا تھا۔ اس نے اپنے قاصد کو فوراً روانہ کر دیا۔ پھر

”میں اس وقت بالکل معمول ہوں۔ سرنگا پٹم پر گنگارام کا قبضہ ہے۔ سرکاری فوج اس کے قبضے میں ہے۔ میرے پیارے بھائی کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ سرنگا پٹم بننے کے تمام راستوں کو بند کر دیا گیا ہے۔“

اس کے دوست نے بات کائی:

”تمام راستے کیسے بند ہو سکتے ہیں ہمارا جندراج۔ اگر آپ وہاں جا چاہیں، جس کی میں خود رائے نہیں دوں گا، تو میں آپ کو سرنگا پٹم تک اپنے فوجی دستے کے ساتھ پہنچا سکتا ہوں۔“

”تمہارا بہت بہت شکریہ میرے دوست۔“ جندراج نے انہر دگی سے کہا:

”تمہیں حالات کی سنگینی پوری طرح علم نہیں۔ اس وقت پوری ریاست کو مرہٹوں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ گنگارام نے مرہٹوں سے معاہدہ کر لیا ہے۔ ان حالات میں سرنگا پٹم جانا اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔“

”یہ تو بہت برا ہوا ہمارا ج۔“

اس کا دوست بھی نکر مند ہو گیا:

”حالات خراب ہی نہیں، مخدوش ہیں مگر میں اعلان کرتا ہوں کہ اگر کسی نے آپ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو اسے میری لاش پر سے گزرنے کو گا۔“

جندراج نے آگے بڑھ کر اسے اپنے گلے سے لگا لیا:

”پر ماتا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے صحیح مقام پر پہنچایا۔ اب میں یہاں بیٹھ کے اطمینان سے کام کر سکوں گا۔“

”ہمارا ج جندراج۔ اگر ناگوار نہ ہو تو میں ایک مشورہ دوں۔“

”تم میرے محسن ہو دوست۔ کوئی کیا چاہتے ہو؟“ جندراج نے بڑے پیار سے کہا۔

”میں نے سنا ہے آپ نے حیدر علی خاں اور شہباز پر بڑے احسانات کیے ہیں۔ کیا اس موقع پر وہ آپ کا ساتھ نہیں دے سکتے؟“

”تم نے ٹھیک کہا دوست۔ اس صحیح مشورے کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔“ جندراج

بت خوش نظر آنے لگا تھا:

”اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہارے پاس آنے سے میرا مقصد کیا تھا۔ میں تمہارے جیسے ایک

دوست کی شادی میں آیا تھا۔ وہیں مجھے دیوراج کا خط ملا۔ اس نے مجھے سرنگا پٹم آنے سے روک دیا۔“

اس نے بغیر کسی حیل و حجت کے اپنی گرفتاری دیدی۔

”دستہ راج کو گنگارام کی بغاوت کا پہلے ہی پتہ چل گیا تھا۔ وہ سرنگا پٹم واپسی کا ارادہ کر رہا تھا کہ دیوراج کا قاتل اس کے پاس پہنچا۔“

دیوراج نے اس سے استدعا کی تھی کہ وہ سرنگا پٹم بہت خور و فکر اور انتظامات کے بغیر ہرگز واپس نہ آئے اس لیے کہ میسور آنے والے تمام راستوں پر مرہٹوں نے پیرے بٹھا دیے ہیں۔ گنگارام نے مرہٹوں کا تعاون اس شرط پر حاصل کیا تھا کہ اگر وہ سرنگا پٹم کا وزیر مقرر ہو گیا تو وہ انہیں ریاست کی نسل آمدنی بطور خراج ادا کیا کرے گا۔

جندراج، دیوراج کا خط پا کر اور زیادہ ہوشیار ہو گیا۔ اس نے اپنے بہن بھائیوں کو توجہ تیار کر دیا کہ وہ سرنگا پٹم جا رہے مگر وہ وہاں سے پہلے کے ایک دوسرے پائیگار کے پاس پہنچ جائیں۔ سب سے زیادہ قابل اعتماد آدمی تھا اور جندراج کی دوستی کا دم بھرتا۔ اس نے جندراج کو کھاتوں ہاتھ لیا۔ دونوں دوست بڑے تپک سے ملے۔

”ہمارا ج جندراج میں نے صبح کی پرارتھنا میں دعا مانگی تھی کہ جگوان میرے دوست جندراج کو اپنی حفاظت میں رکھے اور اسے میرے پاس بھیج دے۔“ جندراج کے دوست نے بڑی محنت کے ساتھ کہا۔

جندراج ذہنی طور پر بہت پریشان تھا۔ اس نے جواب دیا:

”جگوان نے تمہاری دعا قبول کر لی مگر دوست! حالات کچھ اچھے نہیں معلوم ہوتے۔“

”ہمارا ج جندراج کو فکر کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب تک میں زندہ ہوں آپ کا کوئی ہال بیک نہیں کر سکتا۔ دوست نے مینڈ تان کر کہا۔“

”مجھے تم سے ایسی ہی امید ہے دوست۔“

جندراج نے ٹھنڈی سانس لی:

”تشاہد نہیں یہ نہیں معلوم کہ دیوراج کو گرفتار کر لیا گیا ہے!“

”ہمارا ج جندراج۔ سرنگا پٹم کی اصل طاقت تم ہو۔ تمہاری موجودگی میں گنگارام زیادہ دن

تک سرنگا پٹم پر اپنا قبضہ برقرار نہیں رکھ سکتا۔ دوست کی بات بالکل درست تھی لیکن اس وقت وہ

بے دست و پا تھا۔

جندراج نے اپنے دوست کو بتایا:

اس نے لکھا کہ اگر میں ادھر کا رخ کروں تو پوری نیادی کے ساتھ۔
ظاہر ہے کہ اس تیاری کے لیے مجھے سکون اور وقت درکار ہے مگر اس شادی کے گھر میں نہ مجھے سکون مل سکتا تھا اور نہ میں وہاں ٹھہرنا مناسب خیال کرتا تھا اس لیے میں نے وہ گھر فوراً چھوڑ دیا اور تھماری چٹانہ میں آ گیا۔

”نہ ہمارا راج نند راج۔ ایسا نہ کیسے۔“ دوست نے جواب دیا؛
نہ چٹانہ گاہ نہیں آپ کا گھر ہے۔ آپ یہاں رہ کر پوری تیاری کیجیے اور جب آپ کو پوری طاقت حاصل ہو جائے تو آپ سرنگاپٹم پر دھوم دھڑکنے سے حملہ کیجیے۔ میں اور میری فوج آپ کے ساتھ ہوگی۔“

”پرانا تمہیں ہمیشہ سکھی رکھے میرے دوست“
نند راج نے اطمینان کا سانس لیا؛

”میں حیدر علی خاں اور شہباز کو خط لکھ رہا ہوں۔ وہ دونوں بڑے وفادار بچے ہیں۔ اس وقت میرے ضرور کام آئیں گے۔“

وزیر نند راج نے حیدر علی خاں کو ایک طویل خط لکھا جس میں اس نے میسور کے اوڈیر خاندان کی پوری تاریخ بیان کی مگر موجودہ راجہ کرشن اوڈیر کی تخت نشینی کی پوری تفصیل رقم کی۔ آخر میں راجہ میسور کا لنگکارام سے سازش کے وزیروں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا، دیوراج کی گرفتاری اور اپنی درباری کا حال تحریر کیا۔

نند راج نے حیدر علی خاں کو لکھا کہ اب اس کی مدد یا تو آسمان کا پرانا کر سکتا ہے یا دنیائے حیدر علی خاں۔

اس نے بند افلا میں حیدر علی خاں پر اپنے کیے ہوئے احاذن کا بھی ذکر کیا اور لکھا کہ اگر تم خلوص دل سے میری مدد کرنا چاہتے ہو تو شہباز کو بھی اپنے ساتھ لے کر میرے پاس فوراً پہنچنے کی کوشش کرو۔

حیدر علی خاں اپنے محسن اور مرہبی کا خط پڑھ کر بے حد متاثر ہوا اور اقتدار کے آنے جانے کا خیال کر کے وہ رونے لگا۔ کہاں وہ نند راج جس کے اشارہ آبرو سے پالیگاروں کی جاگیریں ختم ہو جاتی تھیں جس کی خٹکھو سے راج محل میں زلزلہ بجاتا تھا۔ وہی نند راج آج حیدر علی خاں سے مدد کا طلب کار ہوا تھا اور اس طرح جیسے سال کی کمی کے درد سے پر دست کر رہے۔

حیدر علی خاں نے اسی وقت ایک قاصد شہباز کے پاس بھیجا کہ وہ اپنی فوج کے ساتھ فلاں مقام پر پہنچ کر اس کا انتظار کرے۔

اس نے بڑے بھائی شہباز کو زور دے کر کہلوایا کہ اگر تم نے اس وقت اپنے محسن کا ساتھ نہ دیا تو احسان اور مردت کے الفاظ بے معنی ہو کر رد جائیں گے۔ مسلمانوں کو تاریخ احسان فراتھو کے نام سے یاد کرے گی۔

شہباز کے پاس حیدر علی خاں کا قاصد پہنچا اور اس نے میسور کا حال بیان کر کے حیدر علی کے جوش و جذبہ کی تفصیل بیان کی تو شہباز اسی وقت اوٹ کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی فوج کو دو گھنٹے کے اندر اندر تیار کر دیا۔

پھر وہ شام سے پہلے پہلے اس مقام کی طرف روانہ ہو گیا جس جگہ پہنچنے کے اسے حیدر علی کا انتظار کرنا تھا۔

شہباز نے اپنی طرف سے بہت جلدی کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ حیدر علی کو اس سے زیادہ لشکر لے کے آنا ہے اس لیے اس کے آنے میں تاخیر ہوگ اور اسے حیدر علی خاں کے آنے کا دو تین دن انتظار کرنا پڑے گا مگر جب شہباز مقام مقصود پر پہنچا تو اس کی آنکھیں پٹی کی پٹی رہ گئیں۔

حیدر علی خاں نے اپنے لشکر کے وہر موجود تھا۔

دونوں بھائیوں نے مشورہ کر کے صرف چار گھنٹے کے لیے فوج کو آرام دینے کا فیصلہ کیا۔ ان چار گھنٹوں کے دوران ان کی فوجوں کے رسالدار اور حوالدار وغیرہ اپنے اور اپنے ماتحت لشکریوں کے اسلحہ کو دیکھتے رہے اور آرام کا وقت ختم ہوتے ہی دونوں لشکر سرنگاپٹم کی طرف روانہ ہو گئے۔

حیدر علی خاں نے روانگی سے قبل دو تیز رفتار قاصدوں کو دواطراف میں روانہ کیا۔ ایک قاصد کو وزیر نند راج کے پاس اس اطلاع کے ساتھ بھیجا کہ وہ اپنی جگہ پر بیٹھا رہے اور کوئی خبر نہ کرے۔ حیدر علی خاں مناسب وقت پر اس کے پاس آئے گا اور اپنی خدمات کا ذکر کریگا۔ حیدر علی خاں نے دوسرا قاصد سرنگاپٹم میں لے جانے کے لیے رستہ سردار کے پاس بھیجا تھا۔ اسے

دینے والے، ہنری اور اسکا سر فروخت کر دیا۔ اور سودا گروں کے بیس میں گنگا رام کے
براموئی سید سحر کے لشکر میں بیکر لگاتے تھے۔ ایسے ہی لوگوں کے ذریعے حیدر علی کا معافی کا اعلان
گنگا رام کی فوج تک پہنچا۔

دن کے تیسرے دن سے میسور کے لشکر کی ایک ایک دودھ کے حیدر علی کے کیمپ میں
آئے گئے۔ اس کے بعد ان کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی۔

گنگا رام اس صورت حال سے کافی پریشان ہوا مگر جنگ میں پہل کرنے یا شب خون مارنے
کی اس سے ہمت نہ تھی۔

حیدر علی نے ایک ہفتے تک یہی حکمت عملی برقرار رکھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گنگا رام اپنا شکست
کے کردہ دیں پیچھے ہٹ گیا۔

حیدر علی نے سوز اتا کیا کہ وہ اپنی فوجوں کے ساتھ اس مقام پر چلا گیا جہاں گنگا رام موجود
نئے پڑا تھا۔

اب اس نے ایک اور اعلان کیا۔
یہ اعلان گنگا رام اور ان کے پیلا گروں کے نام تھا جو اپنی فوجیں لے کر گنگا رام کی مدد کو آئے
تھے۔ اعلان یہ تھا کہ جو پالیگار گنگا رام کا ساتھ چھوڑ دے گا وہ حیدر علی کا دوست ہوگا۔ اسی طرح
گنگا رام کے لیے یہ اعلان کیا گیا کہ اگر وہ بغاوت سے توبہ کر کے حیدر علی کے پڑاؤ میں آجائے
تو حیدر علی نہ صرف اس کو جن بخش کر دے گا بلکہ اسے فوجدار کے عہدے پر بھی برقرار رکھے گا۔
دوسری صورت یہ ہے کہ گنگا رام نہ چیل کے کسی طرف نکل جائے۔ اس کی تلاش نہ ہوگی اور
اگر وہ کسی کے ہاتھ لگ گیا تو اسے قتل نہ کیا جائے گا۔

حیدر علی خاں کے دوسرے اعلان نے باغیوں میں بہت بددلی پیدا کر دی۔ پالیگار یہ سوچنے
لگے کہ اگر گنگا رام انہیں چھوڑ کے کسی اور طرف نکل گیا تو حیدر علی انہیں اور ان کے علاقوں کو پھونک
کر رکھ دے گا۔

یہی حال ان لشکریوں کا تھا جو حیدر علی کے ہاتھ سے کرناٹک کے معرکہ میں انجام حاصل کر چکے
تھے۔ پس پالیگار اکٹھے ہو کر گنگا رام کے پاس گئے اور اس سے فوری طور پر جنگ شروع
کرنے کا مطالبہ کیا۔

فوجدار صاحب! اگر آپ متحدہ لشکر چھوڑ کے چلے گئے تو آپ کی جان توجہ جائے نہ مگر ہم

یہ پیغام دے کر بھیجا گیا تھا کہ ریاست میسور کی سرزمین اور خاص کر مرگاپٹم جیٹی خاں اور شہباز
کے سب سے اسی طرح متبرک اور پاک ہے جس طرح ماں کی گود ہوتی ہے۔ مرگاپٹم سردار کو معلوم
ہو جائے کہ میسور کے دو بیٹے یعنی حیدر علی خاں اور شہباز آغوش مادر کی طرف آرہے ہیں
اور یہ وہ مرگاپٹم کا محاصرہ اٹھا کر فوراً اپنے مقام کی طرف واپس جائیں ورنہ انہیں حیدر علی اور
شہباز کو تلوواروں سے ٹکرائیں گے۔

اللہ اللہ! فتح محمد کے دونوں بیٹوں کی کیا شان تھی اور اتنی سی عمر میں ان کا کیا دیدہ تھا
کیا رعب تھا۔

جب مرگاپٹم سردار کو حیدر علی خاں کا پیغام ملا تو وہ مرگاپٹم کا محاصرہ ختم کر کے اپنے مستقر کی
طرف واپس ہو گیا۔

اب حیدر علی خاں اور شہباز کے لیے راستہ صاف تھا۔ چنانچہ دونوں اپنے اپنے لشکر کے ساتھ
بغیر کسی مداخلت کے مرگاپٹم کی حدود میں داخل ہو گئے۔

حیدر علی خاں مرگاپٹم کی سرحد میں صرف داخل ہوا، آگے نہیں بڑھا اور وہیں پر پڑا اور
ڈال دیا۔

حیدر علی خاں جس قدر بہادر و شہساز تھا اتنا ہی بڑا مدبر اور تحمل مزاج بھی تھا۔ وہ چاہتا تھا
کہ کم از کم خونریزی ہو۔ گنگا رام اپنے باقی لشکر کے ساتھ اس کے سامنے آ کے خیمہ زن ہوا۔
حیدر علی خاں اور شہباز کا خون یقیناً کھول اٹھا ہوگا مگر حیدر علی نے تحمل کا ثبوت دیا اور پھر
چوکی درست کر کے گنگا رام کی طرف سے پہل کا انتظار کرنے لگا۔

گنگا رام کے زیرِ کمان اگرچہ ایک بڑی فوج تھی۔ ریاستی فوج کے علاوہ میسور کے اندر اور باہر
کے بہت سے پالیگار اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ گنگا رام کی حاکمیت میں اس کے شانہ بشانہ کھڑے
تھے۔

حیدر علی دودن تک خاموش رہا۔
اس دوران اس نے اپنے طور پر اعلان کر دیا کہ جو باغی واپس آجائیں گے انہیں معاف کر کے
ان کے عہدے پر برقرار رکھا جائے گا۔

یہ اعلان اگرچہ حیدر علی نے اپنے لشکر میں کرایا تھا لیکن اعلان کا ایک ایک لفظ دوسری
جانب پہنچ گیا۔ سودا پیچنے والوں کو حیدر علی نے لشکر گاہ میں آنے کی اجازت دے دی تھی۔ دودھ

لوگوں کا کیلنے گا؟ ایک پالیگار نے صاف الفاظ میں کہا۔

دوسرے پالیگار کا بھہر اور سخت ہو گیا:

"اگر آپ فوراً جنگ نہیں کرنا چاہتے تو ہمیں واپس جانے دیجیے۔ ہمیں آپ کیوں مردنا چاہتے ہیں؟"

تیسرا پالیگار بالکل ہی بے قابو ہو گیا:

"فوجدار صاحب۔ اگر آپ میں حیدر علی خاں اور شہنشاہ سے مقابلے کی جرأت موجود نہیں تھی تو آپ نے بغاوت کیوں کی۔ کس بھلے مانس نے کہا تھا کہ آپ حیدر علی سے جنگ کریں جس کے سامنے سے فرانسس بھی ہلکے گئے تھے۔"

"میں جانتا ہوں تمہیں اس بغاوت کی وجہ۔ ایک اور پالیگار جو گنگارام سے بالکل ہی باغی ہو گیا تھا، بولا:

"یہ سب تریباٹ اور راج ہٹ کا معاملہ ہے۔ جب یہ دو ہٹیں اکٹھی ہو جائیں تو قیامت کا آنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ہمارا جہ میسور نے اعلان کیا ہو گا کہ وہ دونوں وزیروں خندراج اور دیولج کے اقتدار کو نہیں مانتے۔ اس طرح رانی میسور نے مندی ہو گی کہ وزیر برادران اسے ہمارا رانی میسور کیوں نہیں سمجھتے۔ بس پھر ہمارا جہ اور ہمارا رانی کی شہ پر گنگارام نے بغاوت کر دی۔ اگر حیدر علی سے لڑنے کی طاقت نہیں تھی تو پھر بغاوت کا شوشہ کیوں چھڑ گیا؟"

گنگارام نے سب کو سمجھو رہو کہ جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس ہفتہ کے دوران گنگارام کے قوتور ہاؤس سوار اور پیادے حیدر علی خاں کے پاس پہنچ چکے تھے۔ گنگارام نے بہت سے اور پالیگاروں کو بھی مع ان کی فوجوں کے بلوایا تھا مگر بعض تو ٹال گئے اور کوئی جواب نہ دیا اور بعض نے صاف کچھ بھبھا کر:

"ہمارے حیدر علی سے کوئی مخالفت نہیں۔ وہ ایک بہادر سردار ہے۔ اگر اُس نے ہمیں بلایا ہوتا تو ہم ضرور اُس کی مدد کر سکتے؟"

گنگارام کا دل حیدر علی کا اعلان سننے ہی ٹوٹ گیا تھا۔ اپنے لشکر میں بے چینی اور پالیگاروں کے بھبھے ہوئے خطوط کے سمیت جوابات نے اس کے حوصلے اور پست کر دیے۔ پھر بھی اسے اپنے لشکر و تہذیب کا زور تھا۔ اس کا لشکر حیدر علی کے لشکر سے ڈیڑھ گنا تھا۔ در اس میں تقریباً دو ہتھیار اور سوار شامل تھے جو حیدر علی کی مدداری میں کزن جمد کے ماتر پر گئے تھے۔

گنگارام کو اطلاع دی گئی تھی حیدر علی اب تک اپنی جگہ پر ٹھہرا ہوا ہے۔

گنگارام نے اس سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ حیدر علی اس کے مقابلے پر آنے سے کترار ہا ہے کیونکہ اس کی فوج کم ہے اور اسے شکست کا خطرہ ہے۔ اس نے اس سلسلے میں اپنے بعض با اعتماد سرداروں سے بات کی تو انہوں نے فوراً اس کے خیال کی تائید کی۔

انہوں نے اپنے مفاد میں گنگارام کی ہاں میں ہاں ملائی اور گنگارام نے فوراً ہی انہیں اگلے درجے میں ترقی دے دی۔

حیدر علی کے مقابلے پر جلتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ وہ اس کے قریب پہنچنے سے پہلے اس پر شب خون مارے گا پھر اس کے قدم اٹھائے گا۔ مگر جب وہ اپنے پڑاؤ سے حیدر علی کی طرف روانہ ہوا تو نصف منزل کا سفر طے کرنے کے بعد ہی اس کے ایک جاسوس نے آکر اطلاع دی کہ حیدر علی کا لشکر بڑی تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہا ہے اور سچ رات تک وہ گنگارام کے لشکر تک پہنچ جائے گا۔

اس خبر نے گنگارام کے ہاتھ پیر پھلادے اور اس کے منسوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اس نے لشکر کو رکنے کا حکم دیا اور کچھ سرداروں کو ساتھ لے کر کسی معقول مقام کی تلاش میں نکلا جہاں وہ حیدر علی کا ٹھکانہ مقابلہ کر سکے۔

اس کی حسب مرضی اسے تھوڑی ہی دور پر ایک معقول میدان جنگ مل گیا۔ یہ ایک پہاڑی نالا تھا جس میں تمام سال کچھ نہ کچھ پانی رہتا تھا۔

اس نے نالے کو پار کیا۔ پھر کچھ حصہ چھوڑ کے اپنے مورچے لگا دیے۔

حیدر علی خاں اس تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا کہ شام ہوتے ہی اس کے ہراول دستے نظر آنے لگے۔

گنگارام چاہتا تو حیدر علی کے ٹھکانے سے لشکر کو آرام نہ کرنے دیتا اور فوراً اس پر حملہ آور ہوتا مگر وہ بڑی احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ وہ کسی قسم کا خطرہ مول لینے پر آمادہ نہ تھا۔

حیدر علی خاں نے، لے پر پہنچ کر گنگارام کے لشکر پر نظر ڈالی جو دوسری طرف تھوڑے دس گز بھڑکے مورچے لگانے بیٹھا تھا۔ گنگارام کی پشت پر ایک پہاڑی تھی جہاں اس نے اپنے

صبح کو جب سورج نکل آیا اور دور کا آدمی دکھائی دینے لگا تو حیدر علی خاں حملہ کرنے کے لیے تیار ہوا۔

اس کی جانب کے پہریدار خیوں میں واپس جا چکے تھے۔ یہ حملہ کا بہترین وقت تھا لیکن حیدر علی حملہ نہ کر سکا۔ اسے خود پر جبر کرنا پڑا۔

در اصل رات میں یہ طے ہوا تھا کہ حملہ کا آغاز شبا کی طرف سے ہو گا اور اس کے حملہ کے بعد ہی حیدر علی بھی دوسری طرف سے اس جگہ میں شریک ہو جائے گا۔

شبا کی طرف سے حملہ کرنے میں تاخیر اس لیے ہوئی کہ اُس طرف کے پہرے دار جب پہرہ نہ بکھر کر خیوں کی طرف واپس جا رہے تھے تو دوسری طرف گنگا رام کے دوست شکر بایاں کرتے ہوئے اس جگہ آکر کھڑے ہو گئے جہاں پہریدار کھڑے تھے اس وجہ سے انہیں کافی دیر ہو گئی اور دھوپ بھی نکل آئی۔

آخر شبا نے حملہ کا حکم دیا اور سب سے پہلے اس نے کہیں گاہ سے نکل کر ان دونوں باتویوں پر حملہ کیا جنہوں نے اسے دیر کر دی تھی اُن میں سے ایک تو چھینا چلتا تھا گنگا رام کے دوست شبا نے اسے قتل کیا اور جہنم رسید ہوا۔

چند ہی لمحوں میں شبا کی فوج نالا کے اوپر آکر دشمن پر حملہ آور ہو گئی۔ دوسری طرف سے حیدر علی بھی نکل کے سامنے آ گیا۔

گنگا رام نے باہر نکلتے ہی حملہ کا اندازہ کر لیا تھا اور اس نے بیچ بیچ کے شکاریوں کو تیار ہونے کا حکم دینا شروع کر دیا تھا۔ اس کے لشکر کی جلدی جلدی تیار ہو گئے لیکن اس وقت تک اس کی فوج کے کافی آدمی مارے جا چکے تھے۔

جنگ شروع ہو گئی تھی لیکن کوئی صف بندی نہ تھی۔ جو جس جگہ تھا وہیں کھڑے کھڑے لڑ رہا تھا۔ حیدر علی نے گھوڑوں کو خیمہ گاہ ہی میں چھوڑ دیا تھا۔ گنگا رام کے پاس گھوڑے تو تھے مگر اتنا موقع نہ تھا کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو سکے۔

جنگ نے زیادہ طول نہ کھینچا مگر جتنی دیر بھی ہوئی بڑی شدید اور خونریز جنگ ہوئی۔ گنگا رام کے وہ فوجی بے انتہا ہمدردی سے لڑے جو کرنا جس کے عاثر پر حیدر علی کے ساتھ تھے۔ انہوں نے حیدر علی خاں کے ہاتھ سے اس خزانے میں حصہ بھی پایا تھا جسے حیدر علی نے فرانسسیوں سے چھینا تھا۔ وہ اس لیے بھی جان و ثروت لڑ رہے تھے کہ شکست کی صورت میں انہیں معافی ملنا نا ممکن تھا۔

بٹھار کھے تھے۔

حیدر علی نے نالے سے تھوڑا ہٹ کے خیمے لگانے کا حکم دیا۔ اس نے خیمے اس طرح لگوائے کہ ان کی ایک دیوار سی بن گئی۔ خیوں کی پشت نالے کی سمت اور کھلا ہوا حصہ دوسری طرف تھا۔

رات کو کھانے سے فارغ ہونے کے بعد حیدر علی خاں اور شبا جگہ حکمت علی پر غور کرتے رہے۔ پھر نہ جانے انہوں نے کیا طے کیا کہ فوراً ہی تمام رشتہ نشین لگ کر دی گئیں اور پوری خیمہ گاہ پر موت کا ماسٹا بچھا گیا۔

گنگا رام کو خود بھی شب خون کا خطرہ تھا اس لیے اس نے لشکر کے دائیں بائیں پہرہ لگا دیا تھا مگر رات خیریت سے گزری اور صبح کا اجالا پھیلنے لگا۔ شب خون کا خطرہ ٹل گیا۔ گنگا رام کے رات کے پہریدار منہ ہاتھ دھوئے یا تو نالے کے اندر تر گئے یا پھر رات بھر کے تھکے ہوئے اپنے خیوں میں جا کے سو گئے۔

گنگا رام انگڑائی لے کے اٹھا ہی تھا کہ اس کے لشکر کے دائیں بائیں سے بیچ دپکار کی آوازیں بلند ہوئیں۔

وہ گھبرا کے باہر آیا تو اس پر گنگا رام نے حیدر علی کی فوج نے سامنے کی طرف خیمے لگا کر اسے دھوکا دیا اور اس دیوار کی آڑ لے کر اس کا پورا لشکر دائیں بائیں سے نالہ پار کر کے اس کے سر پر بیچ گیا ہے۔ حیدر علی نے حملے کا وقت بھی بہت سوچ کے مقرر کیا تھا۔ اگر وہ رات کو نالہ پار کرتے ہی گنگا رام پر حملہ کر دیتا تو اسے پہلے رات کے پہریداروں سے اچھٹا پڑتا۔ اس دوران باقی لشکر تیار ہو کر مقابلے پر آجاتا۔

حملہ آور فوج کی گمان حیدر علی اور شبا کے ہاتھ میں تھی۔ حیدر علی نے مقابلہ کی صورت پیدا کرنے کے لیے شبا کی پوری فوج کو اسی کی کن میں دے دیا تھا اور شبا نے گنگا رام کے بائیں جانب سے نالہ پار کیا تھا جسکے حیدر علی اپنی فوج کے ساتھ دائیں طرف سے نالہ عبور کر کے دوسری طرف پہنچا تھا۔

حیدر علی نے شبا کو سمجھا دیا تھا کہ وہ نالہ پار کر کے گنگا رام کے لشکر پر اس وقت تک حملہ نہ کرے جب تک دشمن کے محافظ دستے اپنے اپنے خیوں میں واپس نہیں چلے جاتے۔

اس نے یہ بھی تاکید کی تھی کہ خزا سویرا ہی کیوں نہ ہو جائے لیکن محافظوں کے جانے سے پہلے ہرگز حملہ نہ ہو۔

دو گھنٹے ٹپک جم کے لٹائی لڑی گئی۔ پھر گنگارام کے وہ لشکری میدان سے کھینکے لگے جو اس نے دوسرے علاقوں سے بھرتی کیے تھے۔ وہ تو لوٹ مار کے لیے فوج میں آئے تھے مگر یہاں تو حیدر علی کے سپاہی موت کی طرح ان کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ بھاگتے نہ، تو انہیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتے۔

گنگارام نے شکر بوں کو بھاگتے دیکھی تو اسے اپنی جان بچانے کی فکر ہوئی۔ حیدر علی خاں نے شہباز کو آواز دی:

”بڑے بھائی! گنگارام بچ کے نہ جانے پائے۔ اسے زندہ گرفتار ہونا چاہیے۔“

شہباز کی تیز نگاہوں نے گنگارام کو تلاش کر لیا۔ وہ گھبراہٹا ہوا تھا اور بھاگ کے نکل جانا چاہتا تھا کہ شہباز اس کے سر پر پہنچ گیا۔

گنگارام۔ دل کا ارمان نکال لے۔ میں تجھے پہلے وار کرنے کا موقع دیتا ہوں! شہباز نے اسے مقابلے کی دعوت دی۔

گنگارام پہلے ہی گھبراہٹا ہوا تھا۔ شہباز کی آواز نے اسے لرزادیا مگر اسے پہلے وار کا موقع دیا گیا تھا اس لیے اس نے وقت ضائع نہ کیا اور کلائی میں پوری طاقت سمیٹ کر شہباز پر حملہ آور ہوا۔ شہباز نے اس کا وار خالی دیا مگر وہ تجربہ کار تھا، اس نے فوراً ہی پلٹ کے دوسرا وار کر دیا۔ پھر تیسرا اور چوتھا۔ گنگارام نے اپنے مسلسل حملوں سے شہباز کو زخمی کرنے کی بہت کوشش کی مگر شہباز نے ایک بھی زخم نہ کھایا۔

شہباز کو کئی موقع ملے کہ اگر وہ چاہتا تو گنگارام کے دو ٹکڑے کر سکتا تھا لیکن اسے حیدر علی کے الفاظ بار بار یاد آ رہے تھے کہ:

”گنگارام کو زندہ گرفتار ہونا چاہیے۔“

آخر اسے ایک موقع مل ہی گیا۔

گنگارام شاید تنگ گیا تھا۔ اس کا ایک وار شہباز کو بہت ہی جگہ محسوس ہوا تو فوراً ہی اس کے وار کو ڈھال کے بچاؤے اپنی تلوار پر سینا شروع کر دیا۔ پھر ایک بار اس کی تلوار کو اپنی تلوار میں الجھا کر جو زور سے جھٹکا دیا تو گنگارام کی تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑی۔

اس کے ساتھ ہی گنگارام، شہباز کے قدموں میں جھک گیا:

”تمہیں اپنے خدا کی سوگند۔ رسول کی سوگند۔ میری جان نہ لو۔“ وہ شہباز کے قدموں پر پڑا

گر گرفتار نہ تھا۔

گنگارام میں سچے ماروں کا نہیں بلکہ حیدر علی خاں کے سامنے پیش کر دوں گا! شہباز نے تلوار میدان میں کر لی۔

گنگارام کو گرفتار کر لیا۔

جنگ ختم ہو گئی۔

میسور کے جن پالیگاروں نے گنگارام کا ساتھ دیا ان میں سے دو پالیگار میدان جنگ میں مارے گئے۔ باقی جان بچا کے بھاگ گئے۔

حیدر علی خاں نے فوراً اعلان کر دیا کہ جو تلوار پھینک دے گا اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔

میسور کے وزیروں کے خلاف گنگارام کی بغاوت کو راجہ مہسور کی شہرہ پار حاصل رہی۔
یہ بغاوت بڑی زبردست تھی۔

پورے ملک میں اخراجی پھیل گئی۔ نندراج پر سرنگاپٹم کے دروازے بند ہو گئے تھے
لیکن اسی وزیر کی عقلمندی اور حیدر علی خاں کی ہمداری نے میسور کو تباہی سے بچا لیا۔
نندراج نے حیدر علی سے مدد طلب کی اور حیدر علی نے دو ماہ کے اندر اندر بغاوت کو فرو
کر دیا اور گنگارام کو پابجولاں سرنگاپٹم لایا گیا۔

مرہٹوں اور گنگارام کا ساتھ دینے والی فوجوں نے ایسی زبردست شکست کھائی کہ مرہٹوں کو
مرہٹ پریرکھ کر بھاگتے ہی بنی۔
نندراج فاتحانہ سرنگاپٹم میں داخل ہوا۔ حیدر علی خاں نے باغی گنگارام کو نندراج کے
سامنے پیش کیا۔

حیدر علی نے نندراج سے کہا:

”وزیر محترم۔ آپ کا مجرم حاضر ہے۔ اپنی تلوار سے اس کا سر قلم کر دیجیے۔“

نندراج نے حقارت سے گنگارام کو دیکھا:

”او مکھرام۔ تو نے یہ بھی نہ سوچا کہ ابھی نندراج زندہ ہے اور وہ اکیلا نہیں بلکہ اس کے
ساتھ اس کا شیردل محسن اور مرہٹی حیدر علی خاں بھی زندہ ہے۔“
گنگارام گڑ گڑایا: ”پردھان منتری! میری جان بخشی کر دیجیے۔ زندگی بھر آپ کی غلامی میں
رہوں گا۔“

”یہ اسی غلامی کا نتیجہ ہے کہ تو ہمارے سامنے کھڑا ہوا۔“ نندراج نے غصے سے بولا:

”آخر تجھے بغاوت کی جرأت کیسے ہوئی۔ یہ سبق تجھے کس نے پڑھایا؟“

”ہمارا۔“ مجھے ہمارا راجہ اور ہمارا بیٹا نے بغاوت کے لیے کہا تھا۔ وہ آپ سے نجات حاصل کرنا
چاہتے ہیں۔“

گنگارام نے پورا الزام ہمارا بیٹا اور ہمارا راجہ کے سر قلم کر دیا۔
”ٹھیک ہے۔ اگر ہمارا بیٹا اور ہمارا راجہ نے تجھے بھڑکا یا تھا تو کل تجھے ان ہی کی تلوار سے قتل
کر دیا جاتے گا۔“

پھر نندراج نے حیدر علی سے کہا:

حیدر علی خاں کی دوسری شادی نے اس کی قسمت پلٹ گئی۔

یہ شادی حیدر علی کی پہلی معذور بیوی کے بے حد اصرار پر ہوئی تھی۔ فاطمہ بیگم صرف فخر مسعود
کرم کوٹہ کے نواب میر معین الدین خاں کی ماہر سوانی تھیں۔ ”اس وقت پورے ملک میں حیدر علی خاں
کی پہلی شادی میسور کے وزیر سلطنت نندراج اور حیدر علی کے بڑے بھائی شہزادے بڑی
دعوت و عام سے کی تھی لیکن حیدر علی کو یہ شادی اس نے آئی اور ان کی بیوی ایام زچگی میں رہتی تھی
کے باعث معذور ہو گئیں۔“

چنانچہ دوسری شادی پر حیدر علی نے انتہائی سادگی اختیار کی۔ شاید خدا کو اس کی یہ سادگی
پسند آئی اور اس کا ستارہ بننے والوں کی طرف رواں ہو گیا۔

شادی کے چھ سال بعد یعنی ۱۱۵۱ھ میں ناظم حکم کی گورنر میں وہ لعل بے ہا جگہ لایا جس کا نام
ٹیٹو سلطان ہے اور جس کی ہمداری کے پر۔ چھ برس بعد سے نکل کر ایران آئے۔ بطانیہ میں جو گورنر
گئے۔

اسی دوران فوجدار گنگارام کی بغاوت نے ریاست کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ گنگارام کو
مرہٹوں کی حمایت حاصل تھی۔

دوسری طرف میسور کے راجہ کرشن اڈیر نے بھی گنگارام کی بغاوت سے پورا فائدہ اٹھایا
وہ ہمہ وقت اپنے بادشاہ گورنر وزیروں سے نجات حاصل کرنے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا تھا چنانچہ

”کلی اس دھنلے اور مکار کو راج محل میں پیش کیا جائے۔ ہم ہمارا فی اور مہراجہ سے اس کی گردن اڑوائیں گے۔“

”ٹھیک ہے وزیر محترم!“ حیدر علی نے جواب دیا،
”مگر یہ خیال رہے کہ ہمارا فی آپ کی بیٹی ہیں اور اس جرم میں وہ بھی شریک ہیں۔
نندراج نے چونک کر حیدر علی کو دیکھا:

”میرے بہادر سپہ سالار! تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ ہماری بیٹی اس جرم میں برابر کی شریک ہے
اس لیے اسے بھی گنگا رام کے برابر سزا ملنی چاہیے۔
حیدر علی خاں نے جیسے نندراج کو یاد دلایا:

”وزیر محترم۔ اگر ہمارا فی برابر کی شریک ہیں تو ہمارا جہ کرشن اوڈیر بھی اس بغاوت میں برابر
کے شریک ہیں۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے میرے مرنے۔“ نندراج نے فوراً کہا:
”جنگ اور محنت میں ہر چیز جائز ہے کل ہم گنگا رام کے ساتھ ان دونوں کے قتل کا کم بھی
دیے گئے۔ نہ رہے گا بائیس نہ بنے گی بائیس۔“

”اس قدر طیش میں نہ آئیے وزیر محترم!“
حیدر علی خاں نے مصالحتاً نہ رویۃ اختیار کیا:
”ہم اور آپ دونوں ہی ریاست میسور کے ملازم اور راجہ کرشن اوڈیر کی رعیت ہیں اور
رعیت اپنے بادشاہ کے قتل کا حکم نہیں دیا کرتی۔“

نندراج کا منہ اتر گیا۔ اس نے سپاہیوں کو حکم دیا:
”اس کم ظرف کو کل راج محل میں حاضر کیا جائے۔“
پھر اس نے حیدر علی کی طرف گھوم کے کہا:

”مے ریاست میسور کے اگلے پرچکنے والے ستارے! ہمیں تم پرنا دھسے۔ کل راج محل
آجانا۔ جیسا چاہو گے ویسا ہی کیا جائے گا۔“

حیدر علی خاں گھر پہنچا تو وہاں ایک نیا شگوفہ کھلا دیکھا۔ حیدر علی نے مرنگا پٹم کے مٹے

دیو رانی پیٹھ میں اپنا گھر بنایا تھا۔ وہاں تلخہ نما ایک پرانی حویلی تھی۔ حیدر علی نے اسے ٹھیک کر کے
اس کے گرد فصیل نما اونچی دیوار تعمیر کرا دی تھی اور فصیل کے ساتھ گہری خندق کھدوا کر اس میں
پانی بھرا دیا تھا۔

یہ سب اس نے احتیاطاً کیا تھا۔ شخصی حکومتوں میں کسی وقت بھی انقلاب آسکتا تھا۔ یہ
تدبیر اس نے اسی لیے کی تھی۔

حیدر علی خاں نے اپنی حویلی کے باہر ایک گھوڑا گاڑی کھڑی دیکھی جس کی کھڑکیوں پر نہایت
قیمتی پردے پڑے ہوئے تھے۔ گاڑی بان کی نشست پر ایک مضبوط جسم کامیابہ نام جوان بیٹھا تھا
اور حیدر علی گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کا قد چھ فیٹ سے بھی نکلتا ہوا تھا۔ پھر برا بدن، چوڑا سینہ،
بھرے بھرے بازو، کھلتا ہوا گندمی رنگ، لالہ بنی پگڈارم نکھیں۔

سیاہ نام گاڑی بان کی نظر اس لالہ بنے چوڑے، پُر رعب سوار پر پڑی تو گاڑی سے کود کر
کھڑا ہو گیا۔ ہندوؤں کے انداز میں سر جھکا کر حیدر علی کو سلام کیا۔

اسی وقت حویلی کا نیزہ بردار دربان جگتا ہوا حیدر علی کے پاس پہنچا اور جھک کے اپنے آقا
کو سلام کیا۔ افغان ہونے کے ناطے حیدر علی کی مادری زبان فارسی تھی۔ وہ اگرچہ اُن پڑھتا لیکن
فارسی کے علاوہ تمام مروجہ زبانیں، دکنی، اردو، کنڑی، تامل، مرہٹی اور تیلنگی میں بھی بخوبی گفتگو
کر لیتا تھا۔

حیدر علی کا دربان شمالی علاقے کا تھا اور اردو بولتا تھا۔ حیدر علی خاں نے اس سے اردو
میں سوال کیا:

”کون آ رہا ہے؟“

”ایک لڑکی ہے میرے آقا!“ دربان نے ادب سے جواب دیا۔

”کس کی لڑکی ہے؟“ حیدر علی گھوڑے سے اتار پڑا۔

”جی آقا۔ وہ فوجدار گنگا رام ہے نا۔“

”اس کی لڑکی ہے؟“ حیدر علی نے اس کی بات کاٹ دی۔ اور گھوڑے کی لگام دربان کو
پکڑ کے حویلی کے صدر دروازے میں داخل ہوا۔

دربان اس کے پیچھے پیچھے گھوڑا پکڑے آ رہا تھا اور کہتا جا رہا تھا:
”جی ہاں آقا۔ اس نے بنایا کہ وہ فوجدار گنگا رام کے گھر سے آئی ہے۔ میں نے جبکہ حکم صاحب

کو بنایا۔ انوں نے بلا لیا۔ میں اسے ابھی اندر پھوڑ کے آیا ہوں۔

دروازہ کے اندر تھوڑی سی جگہ چھوڑ کر حویلی کی راہداری میں جانے کے لیے بیٹھیاں بنی تھیں۔ بیٹھیاں طے کر کے حیدر علی راہداری میں آئے۔ راہداری میں تیسرا کمرہ ان کی بیگم یعنی فاطمہ خانم کا تھا۔

حیدر علی کا بیٹا فتح علی بیٹو آٹھ نو سال کا ہو چکا تھا مگر وہ باپ کے ساتھ مردانہ میں سوتا تھا۔ حیدر علی کی رہائش حویلی کی پشت کے کمروں میں تھی۔ بیٹو اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ زمانہ حصہ میں آنے کی اسے اجازت نہ تھی۔

جمعہ کے دن بیٹو، باپ کے ساتھ ماں سے ملنے آتا تھا۔ اس وقت زمانے حصے سے تمام گمان خواتین کو رخصت کر دیا جاتا تھا۔

حیدر علی اولاد کے معاملے میں بڑا سخت تھا۔ اس نے خود تو تعلیم حاصل نہ کی تھی لیکن بیٹو کے لیے بہترین استاد مقرر کیے تھے جو مروجہ تعلیم کے علاوہ فنون سپہ گری میں بھی اسے تربیت دے رہے تھے۔

یہ اسی تربیت کا اثر تھا کہ جس نے بیٹو سلطان کو اس کم عمری ہی میں ایک اچھا شہسوار اور شیراز بنا دیا تھا۔ دوسری طرف اس میں سنجیدگی کی ایک لہر بھی سما گئی تھی جس سے بیٹو اپنی عمر سے کہیں بڑا معلوم ہوتا تھا۔

حیدر علی کہاں تو بیوی کی طرف جارہے تھے اور کہاں راہداری میں رکے۔ ایک لمحہ کچھ سوچا۔ پھر راہداری کی دوسری سمت چلنا شروع کر دیا۔ یہ راستہ ان کی اور ان کے بیٹے کی رہائش گاہ کی طرف جاتا تھا۔ حویلی کی دوسری طرف ایک بڑا میدان تھا جہاں بیٹو سلطان تیر و تفنگ کی تربیت لیا کرتا تھا۔ بیٹو اس وقت بھی شیرازی کی علی مشق میں مصروف تھا۔

وہ ایک سفید گھوڑے پر سوار تھا اور اس کا استاد منعم خاں مشکئی گھوڑے پر سوار تھا۔ دونوں کی تلواریں پہن میں ملی ہوئی تھیں اور منعم خاں، بیٹو سلطان کو دشمن کی تلوار میں تلوار الجھا کر اس کی تلوار نیچے گرانے کی تربیت دے رہا تھا۔ منعم خاں کو خاص طور پر بیٹو سلطان کی تربیت کے لیے افغانستان سے بلایا گیا تھا۔

منعم خاں کی نظر آتے ہوئے حیدر علی پر پڑی تو اس نے مرگوشتی کی:

”بیٹو۔ تمہارے خان بابا آرہے ہیں۔“

بیٹو نے آہستہ سے اپنی تلوار پیچھے کھینچی اور گھوڑا گھما کر باپ کی طرف چلا۔ حیدر علی راہداری سے اتر کر میدان میں آچکا تھا۔

”خان بابا۔ آپ اس وقت کیسے آگئے خیریت تو ہے؟“ بیٹو سلطان نے گھوڑے سے اتر کر سوال کیا۔

”تمہارے بیٹے!“

حیدر علی، بیٹو کو بچپن ہی سے شہزادے یا سلطان کے الفاظ سے محالہ کرتے تھے، انہوں نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ رکھ کے کہا:

”تم تمہاری ماں کے پاس جا رہے تھے کہ اچانک خیال آیا کہ یہ وقت علی تربیت کا ہے۔ بس ہم ادھر چلے آئے۔“

”میں آپ کا شکریہ گزار ہوں خان بابا۔“

بیٹو نے بھولپن سے کہا:

”آپ میرا کسی قدر خیال رکھتے ہیں!“

”شہزادے۔ ہم تمہارا نہیں بلکہ اپنا خیال رکھتے ہیں۔“

حیدر علی خاں اگرچہ ان پٹھ تھے مگر ان کی صحبت پڑھ لکھ لوگوں سے تھی اس لیے وہ اکثر فلسفیانہ گفتگو کرنے لگتے تھے:

”شاید تم یہ بات نہ سمجھ سکو۔ میں تمہیں دوبارہ سمجھاتا ہوں۔ آج تم بچے ہو اور میں تمہارا بزرگ مگر تم نہ ہمیشہ بچے رہو گے اور نہ میں تمہارا بزرگ رہوں گا۔ کلی تمہیں جوان ہونا ہے اور میری خالی جگہ کو بزرگ کرنا ہے۔ انسان ہمیشہ زندہ نہیں رہتا۔ جو پیدا ہوا ہے اسے ایک دن یہ دنیا دوسرے کے لیے خالی کرنا ہے۔“

حیدر علی خاں کی یہی احتیاط تھی جس نے بیٹو کو ایک ذمہ دار پیکر میں ڈھان شروع کر دیا تھا۔ بیٹو اور منعم خاں سے تھوڑی دیر گفتگو کے بعد اسی راستے سے پھر بیوی کے کمرے میں پہنچے۔ جب وہ بیوی کے کمرے میں داخل ہوئے تو ان کے داغ میں بیٹو کا خیال سما یا ہوا تھا۔ اس لیے وہ اچانک ہی کمرے میں داخل ہو گئے۔ ان کی بیوی فاطمہ بیگم گھبرا کر کھڑی ہو گئیں اور سیران نظروں سے اپنے شوہر کو دیکھنے لگیں۔

فاطمہ بیگم کی حیرانی تو جلد ہی دور ہو گئی لیکن حیدر علی خاں اپنی بیوی کے برابر کھڑے ہوئے حسن کے

”میں سمجھا نہیں سیکم“

حیدر علی جیسے زچ ہو گئے:

”یہ گنگا رام فوجدار کے گھر سے آئی ہے۔ وہ گنگا رام جس نے ریاست میسور سے بغاوت کی اور آج ہی گرفتار ہوا ہے۔“

”یہ سب ٹھیک ہے: فاطمہ بیگم چیخ پڑی:

”مگر سینا منی گنگا رام کی بیٹی نہیں بیوی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے میں آپ کی بیوی ہوں۔“

”اُدہ۔ یہ بات ہے۔“

حیدر علی خاں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ پھر انہوں نے سینا منی کو دیکھتے ہوئے کہا:

”مگر یہ لڑکی اور — اور وہ گنگا رام — مگر اس کے تو پہلے ہی بیوی بچے موجود ہیں۔ پھر

میں نے اس سے شادی کیسے کر لی؟“

فاطمہ بیگم چیخ کے بولی:

”جیسے آپ نے مجھ سے شادی کی ہے۔ کیا آپ کی پہلی بیوی موجود نہیں؟“

”یہ بات نہیں ہے بیگم:“ حیدر علی نے بیوی کو سمجھانے کے لیے کہا:

”ہم مسلمان ہیں۔ ہمارے مذہب نے بیک وقت چار شادیوں کی اجازت دی ہے بشرطیکہ مرد

چاروں بیویوں کے ساتھ ایک سا برتاؤ کرے اور چاروں کے رونی کپڑے کا محفوظ انتظام کر سکے

لیکن ہندو مذہب میں مرد ایک وقت میں صرف ایک ہی بیوی رکھ سکتا ہے۔ اگر وہ اس کی

غلاف ورزی کرے تو اس کی برادری والے اسے برادری سے خارج کر کے اس کا حقہ پانی بند

کر دیں۔ وہ کسی محفل میں نہ جاسکے۔ کوئی اس سے بات بھی نہ کرے۔“

واضح رہے کہ گفتگو تنگی اور ملی جلی دکنی زبان میں ہو رہی تھی اور سینا منی ان کی باتیں بڑے

غور سے سن رہی تھی۔

حیدر علی خاں کے بارے میں پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ وہ کتابی علم میں اگرچہ بالکل کورے

تھے مگر فن سپہ گری میں ایسے عارف تھے کہ ان کی تمام کمزوریاں چھپ کے رہ گئی تھیں۔

فاطمہ بیگم بھی کچھ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی اور دوسرے مذاہب کے بارے میں کوئی خاص معلومات

نہ رکھتی تھی۔ شوہر نے جو اسے ہندو مذہب میں شادی کے بارے میں تفصیل بتائی تو اس نے سینا منی

کو گھموڑ کے دیکھا۔

ایک پیہ کو دیکھ کر اس قدر حیران ہوئے کہ بے خیال میں ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

حیدر علی خاں بچپن ہی سے پاک دل اور پاک نظر انسان تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ

حسن سے نفرت کرتے تھے۔ حسن سے نفرت کون کر سکتا ہے۔ حسن تو نور ہے اور نور ہی خدا ہے۔

یہ ضرور تھا کہ ان کی نظر نے اس قدر خوبصورت و شیرازہ اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

وہ لڑکی بادوشیزہ واقعی نور کا پیکر تھی۔ سنگ مرمر کا تراشا ہوا بدن، دھمکتی ہوئی شبابی رنگت،

گہری جھلن جیسی شربتی آنکھیں۔ بے پروائی سے شانوں پر بکھری ہوئی زلفیں، متناسب اعضا اور

مناسب قد۔ غرض ہر چیز اس قدر خوبصورت تھی گویا دست قدرت نے اسے بڑی فرصت میں بنایا ہو۔

حیدر علی خاں نے اسے کیا دیکھا کہ دیکھتے ہی چلے گئے۔

فاطمہ بیگم سمجھ گئی کہ لڑکی کا حسن واقعی تو بہ شکن ہے جس نے حیدر علی جیسے پارہ سا کو بھی مہر

کر دیا تھا۔ آخر اس نے اسے محروم توڑا۔

”میرے سرتاج!“ فاطمہ بیگم نے کراری آواز میں، شوہر کو مخاطب کیا:

”یہ سینا منی ہے۔“

فاطمہ بیگم کی آواز حیدر علی خاں کو حقیقت کی دنیا میں واپس لے آئی۔ وہ منہ بھل کے بولے:

”ہاں۔ میں جانتا ہوں۔ یہ گنگا رام کی بیٹی ہے۔“

”یہ آپ کو کس نے بتایا؟“ فاطمہ بیگم بڑی حیران معلوم ہوئی تھی۔

قد بان نے مجھے صدر دروازہ پر بتایا تھا۔“ حیدر علی نے مطمئن ہو کے جواب دیا۔

”دربان تو احمق ہے۔“ فاطمہ بیگم چڑکائی:

”اسے کیا معلوم کہ سینا منی کون ہے۔“

”کیا مطلب؟“ حیدر علی خاں گھبرا گئے:

”کیا یہ وہ لڑکی نہیں جو تھوڑی دیر پہلے ہمارے پاس آئی ہے؟“

”یہ تو ٹھیک ہے مگر دربان نے غلط بتایا کہ سینا منی گنگا رام کی بیٹی ہے۔“ فاطمہ بیگم نے

وصاحت کر دی۔

”کیا یہ گنگا رام کے گھر سے نہیں آئی؟“ حیدر علی نے حیرت سے سوال کیا۔

”اس کے گھر سے آئی ہے مگر اس کی بیٹی نہیں ہے۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں؟“ فاطمہ بیگم کے

لبے کی تلخی میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہو گیا۔

”کیوں سیتا منی۔ تم مجھ سے جھوٹ بولیں۔ گنگا رام نے تم سے شادی نہیں کی؟“ فاطمہ بیگم کا بھر سخت تھا۔

”جی بیگم صاحبہ۔ گنگا رام نے شادی نہیں کی تھی مگر مجھے بیوی بنا کے رکھا تھا۔“ سیتا منی نے بڑی سادگی سے کہا:

”بیگم صاحبہ۔ میں نے آپ کو پوری بات نہیں بتائی اس لیے آپ ناراض ہو رہی ہیں۔ جب میں پوری کہانی سناؤں گی تو آپ ناراض نہیں ہوں گی۔“

”میں نہیں سنتی تیری گندی کہانی۔“

فاطمہ بیگم کو غصہ آ گیا:

”تو گنگا رام کے ساتھ بغیر شادی کے رہ رہی ہے اس سے گندی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔“ سیتا منی نے فاطمہ بیگم سے مایوس ہو کر بڑی امید سے حیدر علی کی طرف دیکھا۔ حیدر علی خاں کو نہ معلوم کیوں اس پر رحم آ گیا۔ نرمی سے بولے:

”بیگم۔ بظاہر تو اس کی تمام باتیں بکو اس معلوم ہوتی ہیں۔ پھر بھی اس کی بات سن کے تو دیکھو شاید اس کی کچھ کوئی مجبوری ہو۔“

”اچھا سنا اپنی رام کہانی۔ کیا نام ہے تیرا۔“ سیتا منی۔ فاطمہ بیگم پلنگ پر بیٹھ گئی اور اس کے برابر حیدر علی خاں بھی بیٹھ گئے۔

فاطمہ بیگم نے پہلے تو سیتا منی کو ایک مونڈھے پر بٹھا رکھا تھا لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ گنگا رام کی رکھیں (دراشتہ) ہے اس وقت سے ان کا دل لگھوم گیا تھا۔ اب انہوں نے سیتا منی کو بیٹھے کا بھی اشارہ نہ کیا حالانکہ مونڈھا وہیں پڑا تھا۔

”بیگم صاحبہ اور سیتا منی جی! آپ بھی میری کہانی سنیے اور انصاف کیجیے کہ میں نے کیا غلطی کی؟“ سیتا منی نے منہ بول کر کہا۔

فاطمہ بیگم نے اسے ڈانٹا:

”وقت خواب نہ کر۔ جو کچھ کہنا ہے جلدی کہہ ڈال۔“

اور۔

سیتا منی نے مختصر اپنی کہانی یوں بیان کی:

”باپ کے سوا اس دنیا میں میرا لگا اور کوئی نہیں۔ ماں میرے پیدا ہوتے ہی

مر گئی تھی۔ کام کر کے اس کا پیٹ بھرتی ہوں۔

ایک سال پہلے ایک جوتشی میرے دروازے پر سے گزرا۔ میں باہر بیٹھی تھی وہ مجھے دیر تک دیکھتا رہا پھر بوجھا:

”تیرا باپ کہاں ہے؟“

میں نے کہا: ”اندر ہے۔“

وہ میرے گھر کے اندر گیا اور باپ کے سامنے میرا ہاتھ دیکھا۔ پھر زمین پر کیمری کھینچا رہا۔ کاغذ پر بھی اس نے کچھ لکھا پھر میرے باپ سے بولا:

”تم بڑے خوش قسمت ہو بابا۔ تمہاری بیٹی رانی بنے گی۔ راج محل میں رہے گی۔“ جوتشی تو یہ کہہ کر چلتا ہوا اور میرا باپ میرے سر ہو گیا کہ میں راج محل جاؤں۔ مجھے

کیا پتہ کہ راج محل کہاں ہے اور میں وہاں کیسے جاؤں۔

میں راج محل ڈھونڈتی پھر رہی تھی کہ گنگا رام اپنے سواروں کے ساتھ سامنے سے آ گیا۔ میرے دل نے کہا کہ کوئی بڑا آدمی ہے، مجھے راج محل ضرور پہنچا دے گا میں نے اس سے اپنا دکھڑا دیا کہ وہ مجھے راج محل پہنچا دے۔ گنگا رام نے مجھ سے وعدہ کیا

کہ وہ مجھے راج محل پہنچا دے گا لیکن مجھے کچھ دیر ٹھہرنا پڑا۔

میں کیا بناؤں بیگم صاحبہ! مجھے کتنی خوشی ہوئی۔ میں اس کے ساتھ چل پڑی۔ وہ مجھے ایک بڑے سے گھر میں لے گیا اور مجھے بڑے آرام سے رکھا۔ اس نے بتایا

کہ راجہ نے کہا ہے کہ وہ چھ ماہ بعد مجھے راج محل میں بلائے گا۔

اب بیگم صاحبہ پانچ مہینے ہو چکے ہیں۔ اگلے مہینے گنگا رام مجھے راج محل لے جائے گا مگر اب وہ کپڑا لیا ہے۔ میں آپ سے منت کرتی ہوں کہ گنگا رام کو چھوڑ دیں

وہ نہ چھوڑتا تو مجھے راج محل کون لے جائے گا؟“

سیتا منی سسکیاں لینے لگی۔

”بے وقوف لڑکی۔“ فاطمہ بیگم جھٹلا اٹھیں:

”وہ مجھے پانچ مہینے سے گھر میں ڈالے ہوئے ہے۔ تجھے ذرا شرم نہیں آتی۔ لوگ کیا کہتے

ہوں گے؟“

”بیگم صاحبہ۔ آپ گنگا رام کو چھوڑا دیجیے۔ میں زندگی بھر دعائیں دیتی رہوں گی۔“

والی حیدر آباد نواب نامر جنگ کو میدان جنگ میں ایک سازش کے تحت قتل کر دیا گیا تھا۔ اس وقت حیدر علی خاں، نواب نامر جنگ کی طرف سے والی ارکاٹ چندا صاحب اور فرانسیسیوں کے مقابلہ پر میدان میں موجود تھے مگر نواب کے قتل ہونے سے حیدر آبادی فوجیں تتر بتر ہو گئیں اور چندا صاحب پورے ارکاٹ پر دندناتا پھرتا تھا۔ اس وقت نواب والا جاہ قلعہ ترچناپلی میں محصور ہو کر رہ گیا تھا۔

چندا صاحب چاہتا تھا کہ جس طرح نامر جنگ کا پتہ صاف ہوا ہے اسی طرح والا جاہ محمد علی بھی راستے سے ہٹ جائے تو پھر اس کے لیے میدان بالکل صاف ہو جائے۔ اسی لیے اس نے فرانسیسیوں کی مدد سے ترچناپلی کے قلعے کا محاصرہ کر لیا تھا اور والا جاہ محمد علی وہاں قید ہو کر رہ گیا تھا۔ حیدر علی خاں، فوجدار گنگارام کی بغاوت سے فارغ ہو کر ابھی سرنگاپٹیم ہی میں تھے کہ ان کے پاس قلعہ ترچناپلی سے والا جاہ محمد علی کا ایک قاصد پہنچا۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ حیدر علی خاں نے اپنے بال بچوں کو سرنگاپٹیم کے قریب دیوڑانی بیٹھ میں ایک محفوظ قلعہ بنا جو پل میں رکھا تھا جو پل کے گرد گہری خندقیں کھدی تھیں اور جو پل کے برحوں پر توپیں نصب کر دی گئی تھیں۔

والا جاہ محمد علی کا قاصد حیدر علی خاں کی اسی رہائش گاہ پر ملاقات کے لیے پہنچا تھا۔ ریاست میسور کے کرتادھرتا وزیر نندراج اور دیوڑا راج تھے مگر اب یہ راز کھلتا جا رہا تھا کہ ریاست میسور کی پشت پر وہ مضبوط فوج ہے جس کا سپہ سالار حیدر علی خاں اور اس کے دوسرے بھائی بند ہیں۔

والا جاہ نے اپنے قاصد کو راجہ یا وزیر برادران کے پاس بھیجنے کے بجائے حیدر علی خاں کے پاس بھیجا تھا۔

ان دنوں حیدر علی اپنے بال بچوں میں چند دن گزارنے کے لیے وہاں ٹھہرے ہوئے تھے کہ والا جاہ کا قاصد پہنچ گیا۔

”آقا والا جاہ محمد علی نے میسور کے سپہ سالار کو سلام شوق بھیجا ہے۔“ والا جاہ کے قاصد نے کمال ادب سے کہا۔

”سلام پہنچا۔ جواب میں ہمارا سلام پہنچا یا جائے۔“ حیدر علی خاں نے خالص سپاہیانہ اور کھرے انداز میں جواب دیا۔

کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ وہ بس خوشامد کیے جا رہی تھی۔

حیدر علی خاں اٹھ کھڑے ہوئے:

”عجیب پاگل لڑکی ہے۔ اس سے کہہ دو کہ گنگارام کل قتل کر دیا جائے گا۔ یہ اپنے باپ کے پاس واپس چلی جائے۔“

فاطمہ بیگم نے سیتامنی کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ اس سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ گنگارام اسے دھوکہ دے رہا ہے مگر وہ تو جیسے چکنا کھڑا تھی۔

اور پھر وہی ہوا جس کا حیدر علی خاں کو خطرہ تھا۔

دوسرے دن سیتامنی راج محل کا پتہ پوچھتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ حیدر علی نے نندراج کو سیتامنی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا اور تاکید کر دی تھی کہ اگر سیتامنی دوبارہ پہنچے تو اسے اندر نہ جانے دیا جائے۔

چنانچہ نندراج کے سپاہیوں نے سیتامنی کو پکڑ کر ایک کونٹھری میں بند کر دیا تاکہ وہ دوبارہ اس پہنچ کر شور نہ مچائے۔

بغاوت کی کم از کم مزاحمت دار ہوتی ہے۔

گنگارام کو نہ صرف قتل کرنے کا حکم ہوا بلکہ نندراج نے یہ بھی حکم دیا کہ اس باغی کو ہمارا جیسو کرکشن اوڈیر خود اپنے ہاتھ سے قتل کریں گے۔

اس دور میں قتل کا عام سا طریقہ یہ تھا کہ عزم کی گردن لکڑی کے ایک بڑے گول تنے پر رکھی جاتی۔ پھر جلدو ایک بھاری گنڈا سے گردن پر ہاتھ مارا اور گردن تنے سے دو جاگرتی مقتول چیتے بھی نہ مار پاتا۔

یوں گنگارام اپنے انجام کو پہنچ گیا۔



حیدر علی خاں کے حکم سے سیتامنی کو اس کے باپ کے حوالے کر دیا گیا۔ اس کا باپ معذور سپاہی تھا لیکن حیدر علی نے اسے اس کے خانہ میں چوکیداری پر مقرر کیا۔ اس کی رہائش گاہ بھی وہیں انتظام کر دیا گیا۔ اس کے باپ کو تاکید کی گئی کہ سیتامنی کے دماغ سے راج محل کا خیال دور کر کے اس کی کسی معقول جوان سے شادی کر دے۔

قاصد کا خیال تھا کہ حیدر علی اس سے پوچھیں گے کہ اس کے آنے کا سبب کیا ہے مگر حیدر علی دو جہلوں میں جواب دے کر خاموش ہو گئے تھے۔ قاصد کو بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ پھر الفاظ تو تھے ہی نہ بولے:

”سپہ سالار! میسر کو معلوم تو ہو گا کہ والا جاہ آج کل قلعہ ترچناپلی میں بہت تکلیف کے دن گزار رہے ہیں!“

”معلوم ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ حسین دوست چندا صاحب فرانسیسی لشکر کے ساتھ ترچناپلی کا محاصرہ کیے ہوئے ہے۔“

حیدر علی کا لہجہ اب بھی کھردراتھا۔

”آپ کو تو سب کچھ معلوم ہے سپہ سالار۔“ قاصد نے شاید حیدر علی کی معلومات کی تعریف کی یا پھر خوشامد کا اظہار کیا۔

”اے والا جاہی قاصد!“ حیدر علی کا لہجہ نا صاف نہ ہو گیا:

”کسی ریاست کے سپہ سالار کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرب و جوار کے حالات پر نظر رکھے۔ اگر اس میں اتنی احمیت نہیں تو اسے ایسی ذمہ دارانہ ملازمت سے مستعفی ہو جانا چاہیے۔“

یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ حیدر علی خاں ان پڑھ ہونے کے باوجود بلا کا ذہین تھا اس نے اپنے طور پر ریاست کے مختلف شعبوں کا انتظام سنبھال لیا تھا اور ایک ایک بات پر نظر رکھتا تھا۔ اور حکومت میں وہ بڑا دیانت دار اور چوکس تھا۔ اس نے میسور اور میسور کے ارد گرد کے علاقوں، ریاستوں، قبیلوں اور شہروں میں اپنے جاسوس اور رچہ نویس مقرر کر دیے تھے جو اسے ہر اہم خبر سے باخبر رکھتے تھے۔

”بے شک۔ بے شک۔ سپہ سالار نے درست فرمایا۔“ اس مرتبہ قاصد نے واقعی اس کی دل سے تعریف کی تھی:

”میرے آقائے مجھے اسی سلسلہ میں آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔“ قاصد نے رک کر حیدر علی کا چہرہ دیکھا۔ شاید وہ اس کے تاثرات کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔

حیدر علی نے فرما دیا:

”خاموش کیوں ہو گئے قاصد! اپنی بات پوری کرو۔ ہم حالات سے پوری طرح واقف ہونا چاہتے ہیں۔“

قاصد نے کناشر دیا کیا:

”آقائے محترم نے ریاست میسور سے درخواست کی ہے کہ وہ اپنی فوجی طاقت سے ان کے دشمنوں کو شکست دیں۔ چندا صاحب کا وادہ صحیح کرنے اور ترچناپلی کا قلعہ اور اس سے ملحقہ علاقے اس دوستی اور خدمت کے صلے کے طور پر ریاست میسور کی تحویل میں دے دیے جائیں گے۔“

بڑی اچھی پیش کش تھی۔

حیدر علی دل میں بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے کہا:

”ہم والا جاہ کی اس پیش کش کے بارے میں وزیر برادران سے گفتگو کریں گے۔ قاصد کو کلی ٹیک اس کا جواب مل سکتا ہے۔ اس وقت تک وہ ہمارے ممان رہیں گے۔“

قاصد کو امید ہو گئی۔ وہ ایک دن ٹھہرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اسے فوراً ممان خانے میں پہنچا دیا گیا۔

حیدر علی خاں نے اسی وقت وزیر برادران نند راج اور دیوراج کو اپنا ہر کار باہر بھیج کر بلوایا۔ اس نے جب ان سے والا جاہ کی پیش کش کی تفصیل بیان کی تو ان کی ہاتھیں کھل گئیں۔ قلعہ ترچناپلی پر ایک زمانہ سے ان کی نظریں لگی ہوئی تھیں۔

نند راج نے افسردہ سے کام لیتے ہوئے کہا:

”حیدر علی خاں۔ اب تم ریاست کے ملازم نہیں بلکہ ہم سب کے مرنے اور دوست ہو۔ فوجی طاقت کا ہم سے زیادہ تمہیں اندازہ ہے۔ اس طرح کے معاملات اور فیصلے تم خود ہی کر لیا کرو۔ ہماری رائے لینے کی ضرورت نہیں۔“

حیدر علی اس مقام پر پہنچ چکے تھے کہ وہ یہی معاملہ نہیں بلکہ ریاست کے تمام معاملات میں تقریباً خود مختار تھے لیکن وہ مصلحتاً اور دراندیشی کے پیش نظر وزیر برادران کو اس کے لئے رکھتے تھے۔ راجہ کرشن اوڈیر نہیں چاہتا تھا کہ میسوری فوجیں مرنگاپٹم سے باہر نکلیں کیونکہ ایک طرف تو مرہٹے میسور پر دانت لگائے بیٹھے تھے، اور دوسری طرف نظام حیدر آباد بھی میسور پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ راجہ میسور کا خیال درست تھا۔

مگر۔

حیدر علی خاں اور وزیر برادران کے سامنے اس کی ایک نہ چلتی تھی۔ حیدر علی نے قاصد کو یہ کہہ کر ترچناپلی واپس بھیج دیا کہ وہ میسوری فوجوں کے ساتھ والا جاہ کی مدد کو پہنچ رہا ہے۔ راجہ میسور کرشن اوڈیر

حیدر علی خاں نے بھلا بھلا کے کٹی شدید جلے یکے۔ وہ اپنے ساتھ قلعہ شکن اور فصیل شکن آلات بھی نہ لایا تھا۔ وہ تو نواب کو محاصرے سے نجات دلانے آیا تھا اور اب خود اسے محاصرہ کرنا پڑا تھا۔

حیدر علی خاں بڑے عزم اور جوش سے کام لیا۔ اس نے ہمت نہ ہاری اور قلعہ پر دباؤ بڑھاتا رہا۔ محاصرہ اتنا سخت کر دیا کہ باہر سے قلعے کے اندر پرندہ بھی نہ جاسکتا تھا۔

ترچناپلی بہت دنوں سے محاصرے کی حالت میں تھا۔ پہلے فرانسیسیوں اور چند اصحاب نے محاصرہ کیا اور اب حیدر علی خاں کا سخت محاصرہ تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ قلعہ کے اندر سامان رسد کی کمی واقع ہوئی۔ نواب والا جاہ پریشان ہو گیا اور اس نے محسوس کر لیا کہ حیدر علی میر قلعہ پر قبضہ کیے جان نہ چھوڑے گا۔

آخر اس نے حیدر علی خاں کے پاس سفارت بھیجی اور درخواست کی کہ والا جاہ کو معہ فوج اور سامان کے قلعہ سے نکل جانے دیا جائے تو وہ قلعہ کی چابیاں حوالہ کر دے گا۔

اسی سفارت سے حیدر علی کے لشکر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ترچناپلی کی جنگ اور اس محاصرے میں میسور کا سارا خزانہ خالی ہو گیا تھا۔ قلعہ پر قبضہ کی امید پیدا ہوئی تو حیدر علی خاں کے لشکریوں کے چہرے کھل اٹھے۔

مگر یہاں بھی ایک سازش اٹھ کھڑی ہوئی۔

نندراج مرنگا پٹم سے چلتا تھا تو اس کے ساتھ درجن بھر سے زیادہ بڑے بڑے تنگ دھاری پنڈت ہو گئے تھے۔ یہ پنڈت شمالی ہند سے آئے تھے۔ راج محل میں ہر وقت دھونی راتے بیٹھے رہتے تھے۔ ہمارا جبر کشن اوڈیر ویسے ہی ایک دہی انسان تھا۔ اسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کوئی اسے زہر نہ دے دے۔ ان پنڈتوں نے شکر پر جنت منتر پڑھ کر راجہ کے حوالے کر دی تھی اور اسے تاکید کی تھی کہ کھانا کھانے وقت وہ ایک چٹکی شکر کھانے میں ڈل لیا کرے۔ شکر کی برکت سے زہر اس پر اثر نہ کرے گا۔

اس طرح کے شہد سے دکھا کر انہوں نے راج محل پر قبضہ جایا تھا۔ ہمارا جبر تمام رانیاں اور محل کے تمام چھوٹے بڑے ان کے اشاروں پر چلتے تھے۔

ہمارا جبر کشن اوڈیر نے پنڈتوں کو اپنا ہمدرد دیکھا تو ان سے اپنا دکھڑا کہہ بیٹھا اور ان سے کہا کہ وہ کوئی ایسا پائے کریں کہ وزیر برادران کا خاتمہ ہو جائے اور گئے ہاتھوں حیدر علی خاں کا

کو حیدر علی سے بات کرنے کی ہمت ہی نہ پڑی اور میسوری فوجیں حیدر علی خاں اور نندراج کی سرکردگی میں ترچناپلی کی طرف روانہ ہو گئیں۔

حیدر علی خاں نے حسب روایت ترچناپلی میں بھی اپنی بہادری کے جوہر دکھائے۔ ان کا سب سے کامیاب حربہ شب خون ہوا مگر نا تھا۔ چنانچہ وہ ہرات ترچناپلی کو گھیرنے والی چند اصحاب اور فرانسیسی فوجوں پر شب خون مارتے اور جو کچھ ہاتھ لگتا وہ سمیٹ لے جاتے۔

حیدر علی خاں کے شب خون اس قدر طوفانی ہوتے کہ دن میں قلعہ سے بیس میل دور رہتے مگر رات ہوتے ہی ان کے تیز رفتار سوار بیس میل کا یہ فاصلہ گھنٹوں میں طے کر کے آدھی طوفان کی طرح دشمن پر حملہ کرتے۔ حملہ آور ہاتھوں میں جلتی ہوئی مشعلیں لیے دشمن کی فوج کے ایک طرف سے داخل ہوتے اور دوسرے سرے سے راستے کاٹتے نکل جاتے۔ ساتھ ہی جو کچھ ان کے ہاتھ لگتا، اٹھا لے جاتے۔

حیدر علی کے ان طوفانی شب خونوں کی بارش نے محاصرہ کرنے والوں کی کڑوٹ کے رکھ دی۔ اس کے نتیجے میں فرانسیسیوں کی کٹی تو میں حیدر علی کے ہاتھ لگیں اور وہ اسے گھسیٹ کر لے گئے۔

انہی شب خونوں کے دوران ایک رات چند اصحاب مارا گیا اور اس کے قتل ہوتے ہی فرانسیسی بھی بھاگ نکلے۔

حیدر علی خاں کی یہ ایک اور بڑی کامیابی تھی لیکن قسمت ساتھ نہ دے تو انسان کیسا مجبور ہو جاتا ہے۔

حیدر علی نے والا جاہ کی عملی مدد کی۔ اس کا محاصرہ ختم کر لیا۔ سب سے بڑا دشمن چند اصحاب مارا گیا مگر اس احسان فراموش نے ترچناپلی پر قبضہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔

نندراج اور حیدر علی کو اس کا افسوس تو ہوا ہی، ساتھ ہی میسوری فوجوں میں بددی بھیل گئی۔ اس حملہ کے لیے میسور کے خزانے سے ایک بیماری رقم نکالی گئی تھی۔ خیال یہ تھا کہ یہ نقصان قلعہ ترچناپلی اور اس کے مصافات پر قبضہ سے پورا ہو جائے گا لیکن اسے لینے کے دینے پڑ گئے۔

حیدر علی نے مجبوراً قلعہ ترچناپلی کا محاصرہ کر لیا۔ نواب والا جاہ کو اس سے کوئی فرق نہ پڑا۔ پہلے وہ چند اصحاب اور فرانسیسیوں سے مدافعت کر رہا تھا اب اس نے حیدر علی سے مدافعت شروع کر دی۔

ماننے بات بھی رہ جائے گی۔

نندراج گفتگو کے بعد خوشی خوشی اپنے خیمہ میں جا رہا تھا کہ راستے میں اسے پندتوں نے گھیر لیا۔

”کیا فیصلہ کیا تم نے ہامنتری؟“ گرد پندت نے نندراج سے اس طرح سوال کیا جیسے اتنا بچے سے سوال کرتا ہے۔

نندراج گھبرا گیا۔ اس نے کہا:

”تمہارا فیصلہ کرنا نہ کرنا ہمارا کام ہے۔ آپ اپنا کام کرتے رہیے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ ٹھیک کیا ہو جائے گا۔ آخر ہم لوگ تمہارے ساتھ کیوں آئے ہیں؟“ گرد پندت نے اکرٹ کر کہا۔

”نیک کام کے لیے نیک آدمیوں کا ساتھ رہنا اچھا ہوتا ہے اکیلیے ہم آپ کو اپنے ساتھ لائے ہیں۔ نندراج نے انہیں ادب سے سمجھایا۔

”اس کا مطلب ہے ہماری کوئی عزت ہی نہیں۔ نہ کوئی صلاح نہ مشورہ۔ تم نے اگر اس مسئلے نے خود ہی سب کچھ طے کر لیا۔ پندت نے اس طرح آنکھیں دکھائیں جیسے نندراج اس کا ملازم ہو۔ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟“ نندراج نے بات کو ختم کرنے کے لیے کہا۔

”ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بنا کوئی فیصلہ نہ کیا جائے۔ گرد پندت نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ آخر کیوں۔ جنگ کی حکمت علی ہم بناتے ہیں۔ جنگ ختم بھی ہم نے کی ہے۔ آپ کا کام صرف پرارٹھنا کرنا ہے وہ آپ کرتے رہیے۔ نندراج سخت لمبے میں جواب دے کر آگے بڑھا۔

”نہیں ہامنتری۔ یہ نہیں ہو سکتا۔“

گرد پندت راستہ روک کے کھڑا ہو گیا:

”آپ جنگ کیسے روک سکتے ہیں۔ ستاروں سے باتیں ہماری ہوتی ہیں۔ آکاش کا حال ہم جانتے ہیں۔ تمہیں کیا معلوم کہ اوپر کیا فیصلہ ہوا ہے۔“

”اوپر۔“ نندراج کو سخت تاؤ آ گیا:

”اوپر سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“

”دیکھو نندراج۔ اس دنیا کا کاروبار یونہی نہیں چلتا۔ اس کا چلانے والا اوپر رہتا ہے۔ اس کے بنا پرستہ بھی نہیں چل سکتا۔ تم اوپر والے کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ گرد پندت نے کچھ اس

کاٹ بھی نکل جائے۔

پھر جب نندراج اور حیدر علی خاں لشکر کے ترچہ چلی روانہ ہونے لگے تو ان پندتوں نے راج کرشن اوڈیر اور رائیوں سے سفارش کرائی کہ گیانی دھیانی پندتوں کو نندراج اپنے ساتھ ترچہ چلی کے محاذ پر لے جائے تاکہ ان کے اشلو کوں اور عبادت و ریاضت سے میسور کی فوجوں کو فتح حاصل ہو۔

نندراج دھرم کے معاملے میں پندتوں کا بہت قائل تھا۔ اکثر حلوں کے وقت اس نے پندتوں اور جوتشیوں سے شبید گھڑی نکلوائی تھی اور اتفاق سے اسے کامیابی بھی حاصل ہوتی تھی۔ جب سے وہ ان کا اور زیادہ قائل ہو گیا تھا۔

تمہارا راج کرشن اوڈیر نے پندتوں کی سفارش کی تو نندراج کی جیسے مراد برائی حیدر علی خاں کی وجہ سے وہ پندتوں اور جوتشیوں کو جنگ پر لے جانا چھوڑ چکا تھا کیونکہ حیدر علی اس طرح دکھاوے والے جٹا دھاری پندت پسند نہ کرتا تھا۔ اب جو ہمارا راج نے سفارش کی اور حیدر علی خاں نے نندراج کو بھی نیم رضا دیکھا تو وہ خاموش ہو گئے۔ پندتوں کو ساتھ جانے کی اجازت مل گئی اور پندتوں کی یہ پلٹن راستے بھر گاتی بجاتی ترچہ چلی پہنچی۔

قلعہ کے محاصرے کے بعد پندتوں نے پیشین گوئی کی کہ قلعہ شام تک فتح ہو جائے گا مگر ایک یا کتنی ہی شامیں گزر گئیں اور قلعہ فتح نہ ہوا۔ مگر پندتوں کی زبان پر مرم ایک ہی کلمہ تھا اور وہ کلمہ تھا: ”شام تک قلعہ فتح ہو جائے گا۔“

حیدر علی خاں جب ان کی بگو اس سستے سستے تنگ آگئے تو انہوں نے نندراج سے صاف کہہ دیا کہ اگر ان پندتوں نے فضول باتیں بند نہ کیں تو وہ قتل کر دیے جائیں گے۔ ان کی موجودگی۔۔۔ لشکر میں بددلی پھیل رہی ہے۔

نندراج تو پندتوں کی مٹھی میں تھا اور وہ انہیں بگوان سمجھ بیٹھا تھا۔ اس نے حیدر علی خاں کی خوشامد درآمد کر کے اسے اس ارادے سے باز رکھا اور نہ انہیں تو ان کم بختوں پر سخت غصہ آ گیا تھا۔

پھر وہ دن آیا جب نواب والا جاہ نے سفارت بھیجی۔ اور قلعہ حوالے کرنے کی شرطیں پیش ہوئیں۔ نندراج اور حیدر علی خاں میں ان شرطوں پر گفتگو ہوئی اور انہوں نے یہی بہتر خیال کیا کہ والا جاہ کو حصار و سامان کے قلعے سے نکل جانے دیا جائے اس طرح قلعہ ہاتھ آجائے گا اور میسور والوں کے

ڈرامائی انداز میں ہاتھوں کو اوپر نیچے کیا کہ نندراج رعب میں آگیا۔
 "یہ تو میں بھی جانتا ہوں مگر اوپر والا کیا چاہتا ہے؟" نندراج بچے میں ٹھراؤ پیدا کرتے ہوئے بولا۔

"اوپر والا کہتا ہے کہ قلعہ ترجنا پمپلی کی چابیاں نہ لی جائیں۔" گرد پندت نے بے دھڑک کھٹاک سے کہہ دیا۔

"کیا کہا کیا کہا۔" نندراج کو پھر غصہ آگیا:
 "چابیاں کیوں نہ لی جائیں؟"

"ہمارے تری۔ یہ میں نہیں کہتا۔ اس کا فیصلہ آکاش پر ہوا ہے۔ گرد پندت نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔

باقی پندت بھی اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ کوئی کچھ کہتا۔ کوئی کچھ۔ نندراج اس صورتحال سے بدحواس ہو گیا۔

گرد پندت نے نندراج کے کانڈھے پر ہاتھ رکھ دیا:
 "دیکھو نندراج۔ تم آکاش پر ہونے والی باتوں کو نہیں سمجھ سکتے مگر یہ جان لو کہ ترجنا پمپلی کا نواب تم سے دھوکا کر رہا ہے۔ اس کی بات پر یقین نہ کرنا ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ فوج برباد ہو جائے گی اور میسور پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ خون کی ندیاں بہ جائیں گی۔ ہر طرف آگ لگ جائے گی۔ تمہارا ساتھ دینے والا کوئی نہ ہو گا۔ حیدر علی خاں تمہیں مار ڈالے گا اور میسور پر مسلوں کا قبضہ ہو جائے گا۔" گرد پندت نے نندراج کو ایسا ڈرایا کہ اس کی سٹاگم ہو گئی اور اسے ہر طرف آگ لگی دکھائی دینے لگی۔ اس کے کانوں میں بھیسا ملک آوازیں آنے لگیں اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے حیدر علی خاں خنجر تانے اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔

نندراج نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے اور اس طرح دوڑ لگائی کہ اپنے خیمے میں جا کر ہی دم لیا۔ اس کے ملازم پریشان ہو گئے۔ ایک آدمی بھاگ کے حیدر علی خاں کے پاس گیا اور انہیں اپنے ساتھ بلا لایا۔

نندراج نے حیدر علی خاں کو بتایا کہ تمام پندت ایک زبان ہو کر کہہ رہے ہیں کہ اگر نواب والا جاہ سے صلح ہوئی اور قلعہ کی چابیاں لی گئیں تو میسوری لشکر تباہ ہو جائے گا۔ آخر اس کی کوئی وجہ؟ حیدر علی خاں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"دوست کہتے ہیں کہ آکاش پر فیصلہ ہو چکا ہے کہ قلعہ ترجنا پمپلی پر قبضہ نہ کیا جائے۔ نندراج نے سوکھے منہ سے کہا۔

"مگر وزیر محترم۔ میں نے قلعہ کا محاصرہ ختم کر دیا ہے۔ تمام دروازے کھل گئے ہیں اور عوام اپنا سامان لے کر قلعہ سے جا رہے ہیں۔"

حیدر علی خاں نے نندراج کو اپنے انتظامات سے آگاہ کیا:

"نواب والا جاہ کا قلعہ کی چابیاں لیے میرے خیمہ میں بیٹھا ہے۔ میں نے اس سے چابیاں نہیں لی ہیں۔ ان پندتوں کو اس کرنے دیجئے۔ آپ چل کے چابیاں لیجئے اور والا جاہ کے نکلنے ہی قلعہ پر قبضہ کیجئے۔"

"نہ۔ نہ۔ نہ۔" نندراج، حیدر علی کے آگے ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا:

"چابیاں ہرگز نہ لیتا۔ ورنہ ہم تباہ ہو جائیں گے۔ میسور کی ریاست ختم ہو جائے گی۔ پھر نہ ہم رہیں گے اور نہ تم۔"

"یہ کیا فضول باتیں ہیں وزیر محترم؟"

حیدر علی خاں نے تیز لہجے میں کہا:

"آپ ان دھوکے بازوں کے کہنے میں آ رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں چابیاں لیجئے اور چل کر قلعہ پر قبضہ کیجئے۔"

"نہیں حیدر علی خاں۔ تمہیں اپنے خدا کی قسم، چابیاں ہرگز نہ دینا ورنہ قیامت آجائے گی۔" نندراج گڑ گڑانے لگا:

"ہم ہندو ہر کام سے پہلے پندتوں سے شگون لیتے ہیں۔ انہوں نے کہہ دیا ہے کہ قلعہ کی چابیاں لینے اور قبضہ کرنے کی شبیہ گھڑی ابھی نہیں آئی۔"

حیدر علی خاں سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

انہوں نے نندراج کو لاکھ سمجھایا مگر اس کی دہی مرے کی ایک ٹانگ۔ اسی بک بک جھک جھک میں صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہو گئی مگر نندراج کی سمجھ میں نہ آتا تھا نہ آیا۔

اس دوران نہ معلوم کس طرح قلعہ میں یہ خبر پہنچ گئی کہ نندراج اور حیدر علی خاں میں سخت اختلاف پیدا ہو گیا ہے اور کوئی دم میں میسوری لشکر آپس ہی میں ایک دوسرے کی گردن کاٹنے لگے گا۔ اس افواہ کے پھیلنے ہی نواب والا جاہ جمنا پمپلی کچی فوج کے ساتھ قلعہ چھوڑنے والا تھا،

اس نے فوراً حکم دیا کہ شہر سے سامانِ رسد حاصل کر کے قلعہ میں پہنچایا جائے۔ دم کے دم میں سامان سے بھری ہوئی سیکنٹوں گاڑیاں قلعہ میں پہنچ گئیں۔

سامانِ رسد کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد والا جاہ نے قلعہ کے دروازے بند کرنے کا حکم دیا اور وہ توپیں جو برجوں سے اتار کر لے جانے کے لیے گاڑیوں پر بارکی لگئی تھیں۔ پھر برجوں پر چڑھا دی گئیں اور اب قلعہ پہلے سے کئی گنا زیادہ طاقتور اور مضبوط ہو گیا تھا۔

حیدر علی خاں کو اطلاع ملی کہ قلعہ والے سامانِ رسد قلعہ میں لے گئے ہیں اور اب قلعہ کے دروازے پھر سے بند کر دیے گئے ہیں تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

اس نے خیمے سے نکل کر دیکھا۔ قلعہ کے برجوں پر توپیں نظر آ رہی تھیں اور مسلح سپاہی فسیل پر بہرہ دے رہے تھے۔

حیدر علی خاں خیمے میں واپس آ کر چیخ پڑا مگر اس کے انداز میں اب بھی نند راج کا احترام پوشیدہ تھا۔

نبائیے وزیر محترم۔ دیکھیے آپ کے پندتوں کی شبہ گھڑی آگئی۔ قلعہ پر قبضہ کر لیں جا کے۔ نند راج کا دل ڈوب گیا۔

ہاٹے یہ کیا ہو گیا۔ تجھے براہِ باد کر دیا ان دھرم کے ٹھیکیداروں نے۔ میں میسور میں جا کر کیا منہ دکھاؤں گا۔

وہ چیتا چلتا تاہر نکل گیا۔ قلعہ کی چابیاں لانے والے بہت پہلے واپس جا چکے تھے۔ ایک لشکر نے آگے بڑھ کر نند راج کا دامن پکڑ لیا۔

”نمائندہ! آپ نے ہماری فتح کو شکست میں بدل دیا۔ تین ماہ کی محنت خاک میں مل گئی۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو لشکر! نند راج نے گٹھی ہوئی آواز میں کہا۔

یہ میری غلطی ہے۔ میں نے پندتوں کا اعتبار کیا اور قلعہ کی چابیاں نہیں لیں۔ مردود یا ہمیں ان دھرم والوں نے۔“

”نمائندہ! یہ پندت تو ہمارا جہاد ہمارا فوجی ہے۔ انہوں نے ان پندتوں کو بھیجا ہی اس لیے تھا کہ یہ موقع پا کر آپ کو اور حیدر علی خاں کو قتل کر دیں۔“

لشکر کے اس اکنشاف پر نند راج کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

سب پندتوں کو گرفتار کر لیا جائے۔ اس نے حکم دیا۔

تھوڑی دیر بعد نند راج کو مطلع کیا گیا کہ تمام پندت اپنے خیموں سے غائب ہیں۔ نند راج نے ان کی گرفتاری کے لیے چاروں طرف سوار دوڑائے مگر اندھیرا پسین جانے کی دھج سے ایک بھی پندت گرفتار نہ ہو سکا۔

حیدر علی خاں نے بڑی افسردگی سے نند راج کو بتایا:

”قلعہ پر اب حملہ نہیں ہو سکتا۔ پورا لشکر سرنگاپٹم واپس جانے کی غمزدگیاں ہے۔“

نند راج پر غموں کا پہاڑ تو پہلے ہی ٹوٹ پڑا تھا۔ اس خبر نے اسے بالکل ہی حواس باختہ کر دیا۔ اس نے گلوگیر آواز میں کہا:

”حیدر علی خاں۔ میں سرنگاپٹم واپس نہیں جاؤں گا۔ میری عزت خاک میں مل گئی ہے۔“

لشکر واپس کیا ہوا کہ تتر بتر ہو گیا۔

نند راج بجائے سرنگاپٹم جانے کے سستی منگی چلا گیا جو اس کی جاگیر تھی۔ حیدر علی خاں راستہ ہی میں تھا کہ نظام حیدر آباد کی فوجیں بدلہ لینے کے لیے میسور پر چڑھ آئیں۔ انہیں کون روکتا۔ نہ

حیدر علی تھے نہ نند راج۔ ہمارا جہاد کا علی گھیرا گیا تو اس نے انہیں معقول معاوضہ دے کر واپس کیا۔

کہتے ہیں کہ مصیبت اکیلے نہیں آتی۔ حیدر آبادی فوجیں واپس ہوئیں تو پونا کا مرہٹہ سردار بالاجی باجی راؤ نے خراج کی وصولی کے لیے میسور پر چڑھائی کر دی۔

بالاجی باجی راؤ نے راج علی گھیر لیا اور راجہ سے ایک کروڑ کی ادائیگی کا مطالبہ کیا۔ راجہ نے اسے کیا رکھا تھا۔ جو کچھ تھا وہ نظام حیدر آباد و صلابت جنگ لوٹ لے گیا تھا۔

راجہ میسور ہاتھ جوڑے ہوئے بالاجی باجی راؤ کے سامنے پیش ہوا۔

”راؤ جی۔ راجہ کرشن اوڈیر نے مجاہدیت سے کہا،

میسور کا خزانہ وزیر بھائیوں نند راج اور دیوداج نے خالی کر دیا۔ جو کچھ بچا وہ حیدر علی دبا کے بیٹھ گیا۔ مجھے آپ کا خراج دینا ہے۔ پورا ایک کروڑ دینا ہے مگر مجھے کچھ ملت دی جائے۔“

”ٹھیک ہے۔ تم تمہیں ملت دیں گے۔“ مغرور مرہٹہ سردار بالاجی باجی راؤ بڑے غرور سے بولا:

”مگر تمہاری ضمانت کون دے گا۔ ضمانت پیش کرو تو دو ماہ کی ملت مل سکتی ہے۔“

دودا تو بہت کم ہیں راڈجی۔“

راجہ اوڈیر گھبرا گیا:

”آپ کو معلوم ہے ترحنا پٹی پر میسور کی فوجوں کو زبردست شکست ہوئی ہے۔ اودھا خرم اس میں خالی ہو گیا۔ باقی جو رہا تھا وہ نظام صلابت جنگ لوٹ لے گیا۔ مجھے چارہ ماہ کی ہملت دی جائے۔ میں سرنگاپٹم کا مغربی علاقہ ضمانت کے طور پر آپ کے قبضے میں دینے کو تیار ہوں۔“

بالاجی باجی راڈ کو لاپٹے لے گیا۔ اس نے فراخ دلی سے کہا:

”ہم چار مہینے کے بجائے چھ مہینے کی ہملت دینے کو تیار ہیں مگر سربراہ ہمارا گورنر رہے گا۔“
سرا میسور کا سب سے بڑا شہر تھا۔ ایک زمانے تک دارا سلطنت بھی رہ چکا تھا۔ بالاجی نے سربراہ قبضہ مانگا تو راجہ کرشن اوڈیر کا دل دھک سے رہ گیا۔

سرا کا علاقہ سب سے زیادہ شاداب اور ترقی یافتہ تھا مگر مرہٹہ سردار کی تلوار راجہ اوڈیر کے سر پر تلک رہی تھی۔ آخر اسے مجبوراً سربراہ ہٹوں کے حوالے کرنا پڑا۔

راجہ میسور کے رشتہ مند ہوتے ہی بالاجی باجی راڈ نے ایک دستہ فوج بھیج کر ہرا کے صوبیدار کو بلوایا جس کا نام نواب دلاور خاں تھا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ راجہ اوڈیر نے خراج کے بدلے سرا مرہٹوں کو دے دیا ہے تو اسے بہت افسوس ہوا مگر کیا کر سکتا تھا۔

بالاجی باجی راڈ بے حد جالاک تھا۔ اس نے نواب دلاور خاں سے کہا:

”دلاور خاں۔ میں تم سے کوئی شکایت نہیں۔ نہ ہم مسلمانوں سے جھگڑنا چاہتے ہیں۔ تمہارے راجہ نے سرا کا قبضہ ہمیں دے دیا ہے۔ ہم بلونت راڈ کو سرا کا گورنر مقرر کرتے ہیں۔ تم پونا کی مرہٹہ سردار کی طرف سے کولار میں ہمارے جاگیردار ہوں گے۔ کو تم ناراض تو نہیں ہو؟“

نواب دلاور خاں ناراض ہوتا تو تہ تیغ کر دیا جاتا۔ اس نے باجی راڈ کا شکریہ ادا کیا:

”میں ہمارا جاکشنگ گزارا ہوں کہ آپ نے مجھے جاگیردار بنایا۔ میں پوری ذمہ داری سے خدمات انجام دوں گا۔ پونا سرکار کو کوئی شکایت کا موقع نہ ملے گا۔“

سرا کے مرہٹوں کے اٹھنے میں جانے سے میسور کی ریاست سرنگاپٹم تک محدود ہو کر رہ گئی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ریاست کا تقریباً خاتمہ ہو گیا۔ وزیر برادران سنی منگل میں منہ چھپاتے بیٹھے

تھے۔

جید وٹلی خاں بے بس ہو گئے تھے۔ وہ بھی نندراج کے پاس سنی منگل پہنچ گئے۔ اور میسور کو مرہٹوں سے پھڑکنے کی تدبیریں شروع ہوئیں۔

بالاجی باجی راڈ نے سرا کا گورنر بلونت راڈ کو مقرر کیا تھا مگر وہ کسی بات پر بلونت راڈ سے ناراض ہو گیا اور اسے معزول کر کے گوبال راڈ کو سرا کا گورنر مقرر کیا۔

گوبال راڈ بڑا ظالم اور لالچی مرہٹہ تھا۔ سرا کا گورنر ہوتے ہی اس نے سرنگاپٹم کا رخ کیا اور راج محل میں پڑاؤ ڈال کے بیٹھ گیا۔

گوبال راڈ نے راجہ کرشن اوڈیر سے مطالبہ کیا:

”ایک ماہ کے اندر ایک کروڑ کی مطلوبہ رقم مل جانا چاہیے ورنہ پوری ریاست میسور پر قبضہ کر لیا جائے گا۔“

راجہ کرشن اوڈیر نے احتجاج کیا:

”سردار بالاجی باجی راڈ نے ہمیں چھ ماہ کی ہملت دی ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اس ہملت کو برقرار رکھیے۔ اس مدت میں رقم کا بندوبست ہو جائے گا۔“

”صوبیدار ہم ہیں۔“

گوبال راڈ پھر گیا:

”حکم ہمارا چلے گا۔ بالاجی باجی راڈ نے تم سے جو معاہدہ کیا، ہم اسے نہیں مننے۔“

مگر اتنی جلدی اتنی بڑی رقم کا انتظام۔ ”راجہ کرشن اوڈیر نے عذر خواہی کی کوشش کی۔“

مگر گوبال راڈ نے اسے ڈانٹ دیا:

”چپ رہو۔ جو ہم نے کہہ دیا وہی ہو گا۔“

گوبال راڈ نے فیصلہ کر دیا۔

راجہ کرشن اوڈیر خاموش ہو گیا۔ ایک ماہ عم ایک کروڑ کا انتظام وہ کہاں سے کر سکتا تھا۔ اسے وہ کہے نندراج پر غصہ آ رہا تھا۔ اس کے خیال میں ترحنا پٹی پر حملہ کر کے نندراج نے سخت غلطی کی تھی کیونکہ اس حملے ہی کی وجہ سے میسور کا خزانہ خالی ہوا تھا۔

ادھر گوبال راڈ نے یہ حرکت کی کہ سوائے بدکردوں کے پورے راج محل پر وہ ادرا اس کے

لشکر کی قابض ہو گئے۔ محل کے تمام ملازم مرد اور عورتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ راجہ اوڈیر کے بجائے گوالیار کی خدمت کریں۔

راجہ اور ہمارا فیصلہ محل کے دو کمروں میں قید ہو کر رہ گئے۔ اس وقت انہیں حیدر علی خاں کا خیال آیا۔ انہیں انیسویں ہوا کہ انہوں نے اس بہادر انسان کی قدر نہ کی۔ وہی ایک استغنیٰ جو انہیں اس قید سے رہائی دلا سکتی تھی۔

ریاست میسور کے دونوں نامور سلوت حیدر علی خاں اور نندراج سنی منگل میں مجبور بیٹھے تھے۔ نندراج، راجہ میسور اور میسور کے باسیوں سے شرمندہ تھا کہ اس نے ترجنا پٹی کے محاصرے میں ریاست کا خزانہ خالی کر دیا۔

وہ حیدر علی خاں سے بھی شرمندہ تھا کیونکہ حیدر علی خاں کے برادر نسبتی میر مکتو، ترجنا پٹی کے بے مقصد محاصرے کے دوران مارے گئے تھے۔

مگر — حیدر علی خاں اب تک نندراج کو اپنا محسن سمجھتے تھے۔ انہیں پوری طرح احساس تھا کہ نندراج شرمندگی کی وجہ سے مرنگا پٹم نہیں جا رہا تھا۔

نندراج نے حلف طور پر کہہ دیا تھا کہ وہ اس وقت تک مرنگا پٹم نہیں بدلے گا جب تک وہ مرہٹوں کو ایک کروڑ روپیہ دینے کے قابل نہیں ہو جاتا۔ مرہٹے اسی ہانے ریاست کے مختلف حصوں پر قبضہ کرتے جا رہے تھے اور نندراج، دیوراج اور حیدر علی خاں یہ سب کچھ مجبوراً سنتے اور دیکھتے رہے تھے!

پھر حیدر علی خاں نے ایک دن بڑا عجیب فیصلہ کیا۔

”میں ایک نیا فوج بھرتی کروں گا۔“ اس نے بڑے اعتماد سے نندراج کو بتایا۔

نندراج نے حیران نظروں سے اسے دیکھا:

”نیا فوج کے لیے رقم کہاں سے آئے گی؟“

”رقم میں پادیا گاروں سے لوں گا۔“ حیدر علی نے پُر غمزہ لہجے میں کہا۔

نندراج نے انہیں سمجھایا:

”پادیا گار عاقبت کو رقم دیتے ہیں۔ اس وقت ہمارا ستارہ گردش میں ہے۔ ان سے امید

نہیں کی جا سکتی۔“

”انہوں نے رقم دینے سے انکار کیا تو میں طاقت استعمال کروں گا۔“ یہ کہہ کے حیدر علی خاں نے نندراج کو اور حیران کر دیا۔

”طاقت کہاں ہے جو استعمال کرو گے؟“ نندراج مسکرایا۔

”آپ دیکھتے جاؤ گے وزیر محترم!“

حیدر علی خاں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا:

”میں اس وقت اپنے کام پر روانہ ہوتا ہوں۔ شام تک دیکھیے، کیا نتیجہ نکلتا ہے؟“

نندراج کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ حیدر علی خاں کا منہ دیکھ کے رہ گیا۔

حیدر علی خاں اپنی نشست سے کھڑے ہوئے۔ اور اپنی شمشیر نکال کے ہوا میں بلند کر دی:

”وزیر محترم! میں جا رہا ہوں اور ساتھ میں آپ کے پندرہ محافظیہ جا رہا ہوں۔“

انہوں نے جواب کا انتظار نہ کیا اور تلوار لہراتے باہر نکل گئے۔ نندراج کے محافظوں نے پُر نظر دوسرے حیدر علی خاں کو دیکھا۔

”کون کون اس تلوار کا ساتھ دے گا؟“ حیدر علی نے تلوار لہراتے ہوئے محافظوں کو مخاطب کر کے کہا۔

حیدر علی شمشیر زنی میں اس قدر شہرت حاصل کر چکے تھے کہ سپاہی ان کی کان میں لڑنے کا ارادہ کیا کرتے تھے۔ اس وقت وہاں تیس کے قریب محافظ موجود تھے ان میں سے بیس جوانوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا۔

”ہم تیار ہیں آپ کا ساتھ دینے کے لیے۔“ انہوں نے بیک وقت کہا۔

گھوڑوں پر سوار ہو جاؤ اور تلواریں بے نیام کر لو۔ حیدر علی خاں نے حکم دیا۔

انہیں محافظ پلک بھیکتے میں گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ وہاں اس وقت اتنے ہی گھوڑے موجود تھے۔ بیسواں سوار باقیوں کے رہ گیا۔

انہیں سواروں کی تلواریں ہوا میں لہرانے لگیں۔

”دوستو!“ حیدر علی خاں نے انہیں مخاطب کیا:

”ہمیں ایک نیک کام کے لیے ایک گھوڑی رقم درکار ہے مگر یہ نیک کام آپ کے لیے نیک ہے میرے لیے ہے۔ آپ کا کام زبردستی رقم حاصل کرنا ہے خواہ کتنی ہی قہر نہانت گری کر، پڑے۔ آپ

”بس۔ اتنی سی رقم؟“ حیدر علی نے پالیگار کو گھور کے دیکھا۔
 ”گھر ایسے مت خالصاحب“ پالیگار نے بڑے اطمینان سے کہا،
 ”آپ ہمارے حمان ہیں۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ آپ کے حوالے کر دیں گے۔“
 چنانچہ کینز بن اندر سے قیسیاں لاتی رہیں اور چند منٹوں میں وہاں قیسیوں کا ڈھیر لگ گیا۔
 پھر ایک کینز نے پالیگار سے کہا:
 ”ماکم۔ اب کوئی قیسی باقی نہیں ہے۔“
 ”ٹھیک ہے تم اندر جاؤ۔“
 کینز اندر چلی گئی تو پالیگار نے حیدر علی خاں سے کہا:
 ”خان صاحب۔ یہ پچاس ہزار کی رقم ہے۔ اس وقت یہی کچھ گھر میں تھا جو حاضر کر دیا۔ کچھ
 حلت دی جائے تو رقم اٹھی ہو سکتی ہے۔“
 حیدر علی نے جواب میں کہا:

”ٹھیک ہے۔ ہم ایک ہفتہ بعد پھر چکر لگائیں گے۔ رقم تیار رکھنا۔“
 پالیگار گھر آیا ہوا تھا کہ شاید حیدر علی دولاکھ کا مطالبہ ابھی پورا کرنے کو کہیں گے۔
 حیدر علی جانتے تھے کہ پالیگاروں کے پاس ایک وقت میں اتنی ہی رقم ہو سکتی تھی۔
 ”اور کوئی خدمت خان صاحب!“ پالیگار خوش ہو گیا تھا۔
 حیدر علی خاں نے کہا:

”تمہارے چالیس سواریاں ہمارے ساتھ جائیں گے۔ ان سے کہو کہ فوراً تیار ہو جائیں۔“
 حیدر علی خاں جب وہاں سے روانہ ہوئے تو پچاس ہزاری کی رقم کے علاوہ ۲۵ سواریاں ان
 کے ساتھ لیے گئے۔

خوڑی دور جا کر حیدر علی خاں نے رقم کا ہمارہ کیا۔ پچاس ہزاری کی قیسیاں چار سواریوں کے ساتھ
 نندراج کے پاس سستی منگل روانہ کر دیں اور باقی ۲۵ ہزار سواریوں میں برابر سار تقسیم کر دیے۔ ان
 ۲۵ سواریوں کو بھی برابر کا حصہ دیا گیا جو ابھی ابھی ان کے ساتھ ہوئے تھے۔

”سردار کی فراخ دلی سپاہیوں کو جرأت مند بنا دیتی ہے۔“
 یہ اس زمانے کا ایک مشہور قول تھا جس زمانے میں لوٹ مار اور قتل و غارت کر کے رقم اکٹھا
 کی جاتی تھی اور اسے ایک مذہب اور سپاہیانہ پیشہ گردانا جاتا تھا۔

یہ بات کہ میں باندھ لیں کہ ہم جتنی رقم لوٹ مار اور جنگ و جدل سے حاصل کریں گے اس کا آدھا حصہ
 آپ لوگوں میں برابر برابر تقسیم کر دیا جائے گا اور حصہ داروں میں میرا شمار نہیں ہو گا۔“
 ”ہیں منظور ہے۔“

”ہمارا سردار حیدر علی خاں۔“

”ہم لوٹ مار کریں گے۔ یہ سردھڑی بازی لگا دیں گے۔“

اس دور میں کسی پرستخ حملہ کر دینا، آبادیوں کو لوٹنا، قتل و غارت کرنا کوئی جرم نہ تھا بلکہ
 انہیں آمدنی کے معنی پیشے کہا جاتا تھا۔

حیدر علی خاں نے تلوار لہرائی۔ گھوڑے کی باگیں اٹھائیں اور ان کے پیچھے انیس شمشیر کٹ
 سواروں نے گھوڑے ہوا کے دوش پر دوڑا دیے۔

دو گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد وہ سستی منگل کی ایک آبادی میں پہنچے۔ یہ ایک پالیگار کی
 جاگیر تھی۔

جس وقت تلواروں کا یہ لہراتا ہوا ٹھکان پالیگار کی ٹولی پر رکا تو وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو
 رہا تھا۔ اس کی نظر حیدر علی پر پڑی تو اس کی جان نکل گئی۔

”جاگیردار!“

حیدر علی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں:

”تمیں دولاکھ روپے فوراً دینا ہیں۔“

پالیگار (جاگیردار) گھبرا کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

حیدر علی نے دوبارہ کہا:

”تمہاں نہیں تم نے۔ دولاکھ فوراً چاہئیں۔ اندر جاؤ اور رقم لے کر آؤ۔ پانچ منٹ سے
 زیادہ لگائے تو گھر کو آگ لگا دی جائے گی اور تمہارے بیوی بچے قتل ہو جائیں گے۔“
 پالیگار نے بونے کی بہت کوشش کی مگر اس کی کھلکی بند ہو گئی۔

”اندر جاؤ اور رقم لے کر آؤ۔“ حیدر علی خاں کی آواز تیسری بار ابھری۔ پالیگار مکا بکا منہ
 کھولے گھر کے اندر چلا گیا۔

پھر جب پالیگار باہر آیا تو اس کے ساتھ پانچ کینز بن تھیں۔ ہر کینز کے ہاتھ میں ایک قیسی
 تھی۔ ہر قیسی میں ہزاری کی رقم تھی۔ کینزوں نے قیسیاں حیدر علی کے سامنے رکھ دیں۔

دے کر اس پر احسان کیا ہے۔

رہے وہ لشکر کی جو حیدر علی خاں نے پالیگاروں سے حاصل کیے تھے تو ان کی خوشی کی انتہا نہ نہ تھی۔ انہیں جس قدر رقم حاصل ہو رہی تھی وہ اسے چار چھ جنگوں میں حصہ لے کر بھی حاصل نہ کر سکتے تھے۔

اس سال ڈیڑھ سال کے عرصے میں مرہٹہ نے جس کا مرکز مرا اور مردارگو پال راؤ تھا، پوری ریاست میسور (ماسوائے مرنگاپٹم) میں اودھم مچاتے رکھا۔ ماراجہ کرشن اوڈیر نے مرہٹوں کو مرا کا قبضہ دیا تھا مگر وہ پوری ریاست پر قابض ہو گئے تھے اور مرہٹہ سپاہی اور فوج جب چاہی لوٹ مار شروع کر دیتی۔

میسور کی رعیت مرہٹوں کے ہاتھوں بہت تنگ تھی اور دل سے چاہتی تھی کہ وزیر برادران اور حیدر علی خاں کی حکومت پھر واپس آئے اور ان کو مرہٹوں سے نجات دلانے۔

آخر وہ دن آیا جس کا حیدر علی خاں ڈیڑھ سال سے انتظار کر رہے تھے۔ وزیر مند راج کا قصد حیدر علی خاں کے پاس پہنچ کر گویا ہوا،

حیدر علی خاں میرے آقا وزیر مند راج نے ہزاروں لاکھوں دعاؤں کے ساتھ آپ کو اطلاع دی ہے کہ آپ سنی منگل تشریف لائیں تاکہ میرے آقا آپ کو اپنے سینے سے لگانے کا فخر حاصل کریں۔

حیدر علی کی آنکھوں میں مسرت کے موتی چمکنے لگے۔ انہوں نے حکم دیا کہ ایک ہزار کی فیصلی قاصد کو دی جائے جو بیرون مرگ لایا ہے۔

مند راج نے حیدر علی خاں کی بھیجی ہوئی ایک کوڑی رقم میں سے پچاس لاکھ کی رقم ماراجہ کرشن اوڈیر کے پاس بھجوا دی تھی اور اسے تاکید کی تھی کہ مرا کے مرہٹہ گورنر کو مطلع کرے کہ معاہدہ کی نصف رقم تیار ہے۔ وہ مرا کا قبضہ چھوڑنے کا قصد کرے۔ باقی نصف رقم اسے مرا کا قبضہ چھوڑنے کا وقت مل جائے گی۔

راجہ کے پاس اتنی رقم پہنچی تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ رقم مند راج کے کہنے پر حیدر علی خاں نے بزورِ شمشیر پالیگاروں سے وصول کی ہے تو اس کی خوشی کا کھانا

حیدر علی خاں نے اسی انداز سے پالیگاروں سے رقم وصول کرنا شروع کر دی۔ وہ ہفتہ میں ایک بار مختصر لشکر کے ساتھ روانہ ہوتے اور شام کو جب واپس ہوتے تو لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ ان کے پاس ہوتا تھا۔

وہ اپنے لشکریوں کو مل کھول کے نوازتے تھے۔ آہستہ آہستہ لشکریوں کو معلوم ہو گیا کہ میسور کے راجہ کرشن اوڈیر نے مرہٹوں کو ایک کوڑی روپیہ مرہٹہ سردار بالاجی باجی راؤ کو دینے کا وعدہ کیا ہے اور جب تک یہ روپیہ ادا نہیں ہوتا، مرہٹے میسور پر اور اس کے علاقوں پر قبضہ کیے رہیں گے۔

اس اٹکناٹ کے بعد لشکریوں نے خود اپنے طور پر اپنا آدھا حصہ چھوڑ دیا یعنی جو رقم پالیگار سے وصول ہوتی اس میں ایک چوتھائی حصہ لشکریوں میں تقسیم ہوتا اور باقی تین چوتھائی مند راج کے پاس سنی منگل پہنچ دیا جاتا۔

رقم جمع ہونے کی رفتار اگرچہ سست تھی، مگر آزمائشی۔ اکثر جنگ و جدل کے مواقع بھی آئے مگر حیدر علی نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔

اس سے ایک طرف تو یہ ہوا کہ رقم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا اور دوسری طرف حیدر علی کہ ایک نئی فوج کی ترتیب میں بڑا فائدہ پہنچا۔

حیدر علی خاں ہر پالیگار سے رقم کے علاوہ کچھ سوار بھی طلب کرتے تھے۔ جیسا کہ آپ کو علم ہے کہ پالیگار یا چھوٹے چھوٹے زمیندار اور جاگیردار اگرچہ آزاد نہ ہوتے تھے اور انہیں کسی نہ کسی راجہ اور نواب کی ماتحتی قبول کرنا پڑتی تھی لیکن انہیں باقاعدہ فوج رکھنے کی اجازت تھی۔ وہ حسب حیثیت ہر وقت اپنی اپنی فوج تیار رکھتے کیونکہ ہر پالیگار راہ راجہ کے درمیان یہ زبانی معاہدہ ہوتا تھا کہ راجہ اپنی جنگی ضرورتوں کے لیے جب بھی فوج طلب کرے گا تو اس کے تمام ماتحت پالیگار اپنی اپنی فوج خود بخود کر کے اسے راجہ کے ماتحت راجہ کو بھجوا دیں گے۔

یہ کام بڑی خاموشی سے جو رہا تھا اس لیے کہ اس کی اطلاع مند راج یا پالیگاروں کے سوا کسی اور کو نہ تھی۔ چونکہ ایک کوڑی رقم حاصل کرنا تھی اس لیے سخت جدوجہد اور دودھ چوب کے باوجود حیدر علی کو رقم جمع کرنے کے لیے ایک سال سے زیادہ لگ گیا۔ مگر وہ خوش تھے کہ اس نے یہ ناکام کام مکمل کر دکھایا۔

ادھر پالیگاروں نے بھی کہ انہوں نے حیدر علی جیسے جبرل اور بہادر سردار کو محبت کے وقت رقم

نہ رہا۔ اس نے قاصد کے ذریعے نندراج کو فوراً سرنگا پٹم آنے کی دعوت دے دی۔

حیدر علی نے نندراج کے قاصد کو انعام و اکرام کے ساتھ رخصت کیا اور یہ پیغام دیا کہ وہ آتی ہفتے سستی منگل پہنچ رہا ہے۔

انہوں نے فوراً واپسی کے انتظامات کیے اور جب وہ سستی منگل کو روانہ ہوئے تو ان کے ساتھ ۴ ہزار سواروں کا ایک مضبوط لشکر تھا۔

نندراج بے چینی سے ان کا منتظر تھا۔ اس نے سستی منگل سے باہر نکل کے حیدر علی خاں کا استقبال کیا۔

اس ملاقات میں دو دوست، دو مرنی، دو محسن، ڈیڑھ سال بعد ایک دوسرے سے ملے تھے۔ وقت و وقت کی بات ہے۔ کبھی نندراج حیدر علی خاں کا عرس و مرنی تھا اور اب نندراج حیدر علی کو اپنا دوست، محسن اور مرنی کہنے لگا تھا۔

اس ملاقات کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ سستی منگل میں راجہ کرشن اوڈیر بھی آیا ہوا تھا۔ اس نے نندراج کو سرنگا پٹم بلوایا تھا لیکن نندراج وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے راجہ کو اطلاع دی کہ چند دنوں میں حیدر علی خاں سستی منگل آ رہے ہیں اس لیے وہ فی الحال سستی منگل نہیں چھوڑ سکتا۔

راجہ کرشن اوڈیر چونکہ خود بھی حیدر علی کا بے حد احسان تھا اس لیے وہ بغیر نندراج کو اطلاع دیے سستی منگل پہنچ گیا۔

نندراج کو اس کی آمد پر بڑی حیرت ہوئی، کیونکہ اس کے خیال میں ریاست میں ماری گڑ بڑ راجہ ہی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اسے یہ بھی شبہ تھا کہ مرہٹوں کو خود راجہ نے سرنگا پٹم بلایا تھا لیکن اس کے اس طرح اچانک آ جانے سے نندراج کا دل راجہ کی طرف سے صاف ہو گیا۔

چنانچہ حیدر علی خاں کے استقبال کے موقع پر راجہ اوڈیر بھی موجود تھا اور حیدر علی خاں کی تعریفیں کرتے اس کی زبان نہ تھکتی تھی اور وہ جیسے اپنی آنکھیں حیدر علی خاں کے لیے فریضی راہ کیے دے رہا تھا۔

دو دن سستی منگل میں قیام کے بعد حیدر علی خاں اور نندراج، راجہ اوڈیر کے ساتھ ہی سرنگا پٹم پہنچے۔ وہاں ریاستی سپاہیوں اور سواروں کو پچھلے تین ماہ سے تختہ ابلیس نہیں لگی تھیں اور انہوں نے سرنگا پٹم میں اوڈھم مچا رکھا تھا اور وہ راج محل کے سامنے ہوک ہڑتال کیے پڑے تھے۔

ہوک ہڑتال شاید ایک جدید اصطلاح ہے۔ تاریخوں میں درج ہے کہ فوج راج محل کے سامنے

دھڑنا مار کر بیٹھ گئی تھی۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ راجہ نے شاید زندگی میں یہی ایک عقلمندی کی تھی کہ اس نے نندراج کے پیچھے ہوئے رہنے کو اب تک گوپال داؤ کو منتقل نہیں کیا تھا بلکہ بڑی حفاظت سے خزانے میں محفوظ کر دیا تھا۔

فوج کے مطالبہ (جو کہ جائز تھا) سے نمٹنے کے لیے نندراج اور راجہ کرشن اوڈیر دونوں نے حیدر علی سے پُر زور درخواست کی۔ حیدر علی خاں چونکہ سپاہی اور سپاہی زادہ تھے اور سوار اور پیدل کے سپاہیانہ دماغ کو اچھی طرح سمجھتے تھے اس لیے انہوں نے انہیں سمجھانے کا وعدہ کر لیا۔

حیدر علی خاں نے نندراج اور راجہ اوڈیر کو دوسری جگہ ٹھہرایا اور خود ۵۰۰ سواروں کو لے کر راج محل کی طرف روانہ ہوئے جہاں فوج دھڑنا مارے بیٹھی تھی۔

وہاں پہنچ کے انہوں نے سواروں کو چار پانچ فرلانگ پیچھے چھوڑ دیا اور نندراج محل پہنچے۔ وہاں کئی ہزار لشکر کی صفیں میں سوار، پیدل اور دوسرے کارکن تھے، پھر بے پیٹھے تھے مگر حیدر علی کو دیکھ کر ان کے گرد جمع ہو گئے اور ان سے کوئی فیصلہ کرنے کی التجا کی۔

حیدر علی خاں نے انہیں مخاطب کیا:

”ساتھیو! میں بھی تمہاری طرح ایک سپاہی بلکہ خاندانی سپاہی ہوں۔ مجھے تمہارے حالات سن کے بے حد افسوس ہوا۔ راج محلوں کی رونق اور ریاست کی شان و دامن ”سپاہی“ کی طاقت سے ہوتی ہے اور جو لوگ اپنے شک کو خوش نہیں رکھتے وہ کبھی خود بھی خوش نہیں رہ سکتے۔ میری خدشات تمہارے لیے حاضر ہیں مگر اس صورت میں کہ تم مجھے اپنی طرف سے بات کرنے کے پورے اختیارات دو۔“

”میں منظور ہے۔ میں منظور ہے۔“

حیدر علی خاں جو فیصلہ کریں گے ہم اسے مانیں گے۔“

سپاہیوں کے ان نعروں سے حیدر علی خاں کو حوصلہ ہوا۔ اس نے کہا:

”آپ لوگ جانتے ہیں کہ کئی محلوں اور جنگوں میں بہت رقم خرچ ہوئی۔ جو بھی وہ نظام حیدر آباد لوٹ لے گیا۔ اس لیے آپ کی تنخواہوں کی پوری ادائیگی اس وقت ممکن نہیں لیکن جو کچھ میرے پاس خزانے میں ہے اسے میں آپ لوگوں میں تقسیم کراؤں دیتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میرا وعدہ ہے کہ ایک ہی جنگ میں تم لوگوں کے اگلے پچھلے سب فرضے ادا کرادوں گا۔“

سپاہیوں کو روٹیوں کے لالے بڑے تھے۔ انہیں تین تین چار چار ماہ سے تنخواہیں نہ ملی تھیں۔ حیدر علی خاں نے انہیں امید دلائی تو وہ خوش ہو گئے۔

حیدر علی خاں نے اپنے سواروں کو بلوایا اور ان میں سے دس بارہ سپاہیوں کو لے کر اپنے سپہنشاہ تیس ہزاری رقم وہاں سے نکالا۔ اس زمانے میں یہ رقم بہت زیادہ تھی۔ حیدر علی نے پندرہ ہزار کی رقم ان میں تقسیم کر دی۔

سب سپاہی ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ ان میں چھوٹے چھوٹے سردار بھی تھے۔ وہ اگر مل گئے کہ انہیں زیادہ رقم ملنی چاہیے۔ حیدر علی خاں کو بھی غصہ آ گیا۔ اس نے انہیں سختی سے ڈانٹ دیا کہ وہ اسے پہلے ثالث مقرر کر چکے ہیں۔ اب انہیں بولنے کا کوئی حق نہیں۔

اس طرح حیدر علی نے کسی کو پیار سے اور کسی کو ڈانٹ ڈپٹ کے راضی کر لیا۔ پھر اس نے ان میں سے دو ہزار بہترین سوار اور پیادے اپنے لشکر کے لیے منتخب کر لیے۔

یہ ایک عجیب بات تھی کہ جس وقت حیدر علی خاں اپنے لیے لشکریوں کا انتخاب کر رہا تھا تو ریاستی فوج کے وہ سپاہی جو بنا دت پر آمادہ تھے، حیدر علی کی خوشامد کر رہے تھے کہ وہ انہیں اپنی فوج میں بھرتی کر لے مگر حیدر علی نے صرف اپنی مرضی کے لشکری منتخب کیے۔

شام کو نے تک راج محل کے سامنے سے باغی فوجیوں نے اپنا جھگڑا ختم کر دیا اور راج محل کے محافظ اور درباری اپنے کام پر واپس آ گئے۔

راجہ اوڈیر اور تمام اراکیاں بھی ایک ایک کر کے راج محل پہنچ گئیں۔ نندراج اور دیوراج بھی اپنے ٹھکانوں پر آ گئے اور اسکو خانے پر ان کا قبضہ بحال ہو گیا۔

وزیر برادران، راجہ کرشن اوڈیر اور راینوں کی سازشوں سے بہت دل برداشتہ تھے۔ وزیر دیوراج تو آئے دن ان سازشوں سے اس قدر پریشان تھا کہ وہ دوسرے ہی ہفتے مرزا کاظم پھوڑ کے نندراج کی جاگیر سستی منگلی چلا گیا تھا۔

مرزا کا عوبے وار گوال راؤ تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ نندراج اور حیدر علی خاں مرزا کاظم واپس آ گئے ہیں۔ نیز حیدر علی نے نئی فوج بھی بھرتی کر لی ہے تو اسے خطرہ محسوس ہوا اور اس نے ارادہ کیا کہ مرزا کاظم پر حملہ کر کے وہاں کی طاقت کا فوری طور پر خاتمہ کر دیا جائے۔

اس نے مرزا کاظم پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں!



حیدر علی خاں، راجہ کرشن اوڈیر سے مطمئن نہ تھا کیونکہ وہ چڑھتے سورج کی پرستش کرنے کا عادی تھا۔ جب نندراج اور حیدر علی کو طاقت میں دیکھنا تو ان کی خوشامد میں لگ جاتا۔ جب کوئی بیرونی طاقت حملہ آور ہونے والی ہوتی تو اس سے ساز باز شروع کر دیتا۔ حیدر علی خاں اسی لیے اپنے ارادوں کو راجہ سے پوشیدہ رکھتا تھا۔

مرٹے اگرچہ مرزا کاظم پر قابض نہ تھے لیکن ریاست کا سب سے بڑا صوبہ مرآان کے ہاتھ میں تھا اور ان کے سوار پوری ریاست میں لوٹ مار کرتے پھرتے تھے۔

نندراج اگرچہ ریاستی معاملات میں دلچسپی کم لے رہا تھا لیکن مرٹہ طاقت کی روز افزائی سے وہ بھی پریشان تھا۔ اگر حیدر علی خاں کا دھڑکا نہ ہوتا تو مرٹے اب تک مرزا کاظم پر قبضہ کر چکے ہوتے۔ ایک دن اس نے خود ہی بیٹی کشی:

حیدر علی خاں، راجہ کرشن اوڈیر کی آٹھ دن کی سازشوں سے میں تنگ آ چکا ہوں۔ اس کا کچھ علاج ہونا چاہیے!

نندراج کا انداز صوابیہ تھا۔ حیدر علی کو پوچھنا پڑا: وزیر محترم! راجہ اوڈیر کی نظروں میں میری اور آپ کی ایک ہی پوزیشن ہے مگر آپ کیوں گھبراتے ہیں۔ آپ میرے عہد میں اور میری زندگی میں راجہ کرشن اوڈیر آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اب میں تمہارا دشمن نہیں ہوں میرے دوست!

نندراج بے حد جذباتی ہو کر بولا:

اب تم میرے دوست اور مرزا کاظم حیدر علی خاں۔ مجھے تمہارا بڑا ہمارا ہے۔ اس نادان راجہ کے علاوہ مرٹوں کا خدشہ بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ اپنے ایک کروڑ روپے وصول کرنے آئے ہیں والے ہوں گے۔

حیدر علی خاں کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی: وزیر محترم! کیا آپ کا خیال ہے کہ میرے سپاہیوں نے یہ ایک کروڑ روپے جمع کرنے پر اپنا خون اس لیے بہایا کہ اس رقم کو ہم چپ چاپ مرٹوں کے حوالے کر دیں؟

نندراج نے چونک کر حیدر علی کو دیکھا:

بڑی پھرتی اور بعض موقعوں پر دراندیشی کا ثبوت دیتا۔ حیدر علی خاں اسی لیے اسے اپنے خاں کاہنوں پر لگاتا تھا۔

نندراج اور حیدر علی کی گفتگو تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ حیدر علی نے کھانڈے راؤ کو اشارہ کیا۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے تلے قدم اٹھاتا ان کے پاس آیا اور دونوں کو ادب سے سلام کیا۔ حیدر علی نے اسے نندراج سے سلام کیا:

”وزیر محترم! یہ جوان بڑا پھرتیلا اور قابلِ اعتماد ہے۔ میں اسے نائب کی حیثیت سے اپنے ساتھ رکھنا ہوں اور ہر اہم کام اس کے سپرد کرتا ہوں۔“

نندراج کے لیے کھانڈے راؤ بالکل اجنبی تھا۔ اس نے اوپر سے نیچے تک اُسے دیکھا۔ چہ نہیں کھانڈے راؤ نندراج کے اس انداز سے کیوں گھبرا گیا۔

”قابلِ اعتماد بھی ہے اور چالاک بھی! نندراج کے منہ سے ایسا دم نکل گیا۔ حیدر علی، نندراج کے اس فقرے پر چونک پڑا۔ وہ اس کے اس خیال کی وضاحت چاہتا تھا کہ کھانڈے راؤ کی موجودگی سے پوچھنے سے گریز کیا۔ پھر وہ کھانڈے راؤ سے مخاطب ہوا:

”ہاں کھانڈے راؤ! کیا خبر لائے ہو؟“

”خاں آقا! گویاں راؤ بڑی زبردست تیار ہیں کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ اس دفعہ حیدر علی خاں کا پکومر نکال دوں گا۔“ کھانڈے راؤ نے زور دے کر کہا۔

نندراج کو کھانڈے راؤ کا انداز گفتگو پسند نہ آیا۔ اس نے اسے ٹوک دیا:

”کھانڈے راؤ! سراسر سو بیدار گویاں راؤ تمہارا عز و دار تو نہیں!“

”نہیں نہیں جی۔۔۔ وہ مرہٹہ ہے اور میں دراوڑ ہوں۔“ کھانڈے راؤ نے جلدی سے انکار کرتے ہوئے کہا:

”میں تو اسے جانتا بھی نہیں۔“

”کوئی اور خبر؟“

”نہیں آقا۔ اور کوئی خبر نہیں۔“

”پھر تم جاسکتے ہو۔“

کھانڈے راؤ سلام کر کے ہٹ گیا۔

”میرے دوست۔ میرے فرزند! مجھے تمہارے ارادے کچھ اور ہی دکھائی دے رہے ہیں!“

”آپ کا خیال درست ہے وزیر محترم!“

حیدر علی خاں کی آنکھوں میں خوفناک مسائے لہرانے لگے:

”فیور میراد وطن ہے۔ اس کی زمین، اس کی ہواؤں اور فضاؤں سے غلبہ محبت ہے۔ انہی کی لوریوں سے میں جوان ہوا ہوں۔ میں کیسے برداشت کر سکتا ہوں کہ میری زمین پر دشمن قبضہ کیے رکھے حالات میں اوپنچ بچ ہوتی ہی ہے مگر اب وہ وقت گزر گیا جب میسور کا خزانہ خالی اور فوج بدظن تھی۔ اب خدام پر ہریان ہے۔ جب ہم ایک کوڑی رقم جمع کر سکتے ہیں تو مرہٹوں کو اپنے وطن سے کیوں نہیں نکال سکتے؟“

حیدر علی خاں کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو گئی تھیں اور اس کا ہاتھ شمشیر کے قبضے پر پہنچ چکا تھا۔ نندراج اس کی باتیں سن کر اوارا راؤ سے جان کو خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ پونا کا مرہٹہ سردار بالاجی باجی راؤ اس وقت برصغیر کی ایک اہم طاقت تھی۔ وہ شاہانِ دہلی کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ نندراج جلد ہی پُر سکون ہو گیا اور بولا:

”حیدر علی خاں! میں تمہارے کسی ارادے میں مزاحم ہونا نہیں چاہتا لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اگر تم اپنے مشوروں میں مجھے بھی شریک کر لو تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ طوفانی مذاہ پر بند باندھنا سراسر حماقت ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارے مدبر مقابل بڑی بڑی طاقتیں ہیں لیکن تمہارا راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔“

”وزیر محترم!“ حیدر علی نے ادب سے کہا:

”آپ کہیں رہیں اور کسی حال میں رہیں۔ میں بغیر آپ کے مشورے کے کوئی کام نہ کروں گا۔ میں سب سے پہلے ان پٹاری چوہوں سے دودھ ہاتھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں جو پاس پڑوس کی ریاستوں کی ہر کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ اس کے بعد پھر دوسروں کو بھی دیکھ لوں گا۔ ہر ایک کا دیا ہوا زخم میرے سینے میں موجود ہے اور پرانی یادیں ’الادین کریم‘ سے ذہن میں دھب رہی ہیں۔“

اس دوران حیدر علی خاں کا سیکرٹری کھانڈے راؤ آگیا تھا لیکن حیدر علی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے دور ہی روک دیا تھا۔

کھانڈے راؤ حیدر علی کا بڑا پُر اعتماد لشکر کی تھا۔ اس نے ایک کوڑی رقم جمع کرنے میں

حیدر علی خاں۔ تم نے اس مرہٹے کو کہاں سے پکڑ لیا؟" مندر راج کو پکارتے ہوئے تھا کہ کھانڈ سے راڈ مرہٹہ ہے۔

"کھانڈ سے راڈ مرہٹہ نہیں ہے وزیر عزم!" حیدر علی نے زبرد کی کوشش کی۔
"تم نہیں جانتے حیدر علی۔ مرہٹے اس خوں سے دوسری ریاستوں میں داخل ہوتے ہیں کہ انہیں پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔"

مندراج نے مزید بتایا:
"میں اس کی گفت گو ہی سے سمجھ گیا تھا کہ وہ مرہٹہ ہے۔ بہر حال وہ کوئی بھی ہو مگر تمہیں تاکید ہے کہ نہ تو اس پر زیادہ اعتماد کرنا اور نہ اس کو زیادہ آگے بڑھانے کی کوشش کرنا۔"

دوسرے یا تیسرے دن راجہ کرشن اوڈیر نے حیدر علی خاں کے اعزاز میں ایک شاندار ضیافت دی جس میں وزیر برادران اور مرنگا پٹم کے معززین کو مدعو کیا گیا۔
راجہ نے دیوراج کو اپنا آدمی بھیج کر سستی مشکل سے خاص طور پر بلوایا۔ دیوراج کچھ دن پہلے ہی اپنی وزارت سے سبکدوش ہو کر مرنگا پٹم چھوڑ گیا تھا۔ بہر حال اس دعوت میں اس نے بھی خاص طور پر شرکت کی۔

حیدر علی خاں تقریب کا مہمان خصوصی تھا۔ وہ پوری آن بان سے ضیافت میں شریک ہوا۔
مندراج نے اسے سینہ سے لگا کر اپنے پیار کا اظہار کیا۔

حیدر علی کے ساتھ اس کا نائب کھانڈ سے راڈ بھی تھا۔ وہ اگرچہ مندر راج سے بہت جھک کے ملا۔ مگر یوں معلوم ہوتا تھا کہ مندر راج کو اس سے خدا واسطے کا بغیر ہو گیا تھا۔ پورا وقت وہ کھانڈ سے راڈ کو گھورتا ہی رہا۔

راجہ کرشن اوڈیر نے اس دعوت کا مقصد چھپائے رکھا مگر جب مندر راج اور دیوراج آگئے تو اس نے اس راڈ سے پردہ اٹھایا۔

وزیر برادران مندر راج اور دیوراج۔ آپ لوگوں کو یہ معلوم کر کے خوشی ہو گی کہ میں حیدر علی خاں کو میسوری فوجوں کا سپہ سالار اعظم بنانا چاہتا ہوں۔ انہیں فوج کی بھرتی اور برخاست کرنے کے علاوہ کسی بھی دوسری ریاست سے جنگ کرنے یا اس سے صلح کا معاہدہ کرنے کے پورے اختیارات

حاصل ہوں گے۔"

مندراج نے قدرے حیرت سے راجہ کو دیکھا۔

اسے گمان ہوا کہ میسور کا راجہ کرشن اوڈیر واقعی عقلمند ہو گیا ہے یا پھر اس کے پس پردہ کوئی اور شخصیت ہے جس کے کہنے پر وہ یہ سب کچھ کر رہا ہے۔
مندراج نے مسکرا کر کہا:

"معلوم ہوتا ہے راجہ کرشن اوڈیر کو اب انسانوں کی پہچان ہوتی جا رہی ہے۔ راجہ واقعی حیدر علی کی خدمات کا بہترین صلہ پیش کر رہے ہیں۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔"

راجہ نے ایک اور انکشاف کیا:

"میسوری فوجوں کی سالاری کے علاوہ ہم ان کی بے پناہ خدمات کے لیے انہیں 'فرزندِ بلند' کا خطاب بھی دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

مندراج نے اپنے بھائی دیوراج کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اب تم راجہ کی تعریف کر دو۔
دیوراج اشارہ پا کر بولا:

"راجہ کا یہ خطاب بہت مناسب ہے کیونکہ کسی انسان کے لیے اس کے فرزند سے زیادہ اور کوئی چیز قیمتی نہیں ہوتی۔ پھر فرزند اگر بلند بھی ہو تو اس کا کیا کہنا۔ یہ تو سونے پر ساگہ کے مصداق ہے۔"

اسی لمحے دو لشکر بھی گاتے ہوئے آئے اور انہوں نے حیدر علی کے آنے کی خبر دی۔ یہ تمام لوگ حیدر علی خاں کے استقبال کو دروازے پر آ گئے۔

حیدر علی خاں عام طور پر مشکلی گھوڑا استعمال کرتے تھے۔ وہ بڑی شان سے اپنے مشکلی گھوڑے پر سوار چلے آ رہے تھے۔ ان سے چند قدم پیچھے ان کا معتد خاص کھانڈ سے راڈ ایک ہلتی (لال کالا) گھوڑے پر سوار تھا۔

حیدر علی کے گھوڑے سے اترنے پر سب سے پہلے مندر راج نے اسے سینے سے لگایا۔ پھر دیوراج نے۔ میسور کا راجہ اپنی جگہ کھڑا مسکراتا رہا۔

دونوں بھائیوں سے فارغ ہو کے حیدر علی خاں راجہ کی طرف بڑے اور قریب پہنچ کر اسے فوجی طرز پر سلام کیا۔ راجہ نے اپنے دونوں ہاتھ پیلا دیے اور آگے بڑھ کر حیدر علی خاں سے بغلیک ہو گیا۔

راجہ کرشن اوڈیر نے بغیر کسی تمہید کے اعلان کیا:
 "میں اپنے ہیرو حیدر علی خاں کو وطن دوستی اور ان کی اعلیٰ کارکردگی کے صلے میں ریاست میسور
 وزیر برادران نندراج اور دبوراچ اور میسور کی رعیت کی طرف سے "فرزند دلبند" کا خطاب دیتا
 ہوں۔ امید ہے کہ ہمارے ہیرو اس خطاب کو بھول کر کے ہم سب کو خوشی کا موقع ملے گا۔"
 سب حاضرین نے اس اعلان پر خوشی کا اظہار کیا۔ نندراج نے ایک بار پھر حیدر علی خاں کو
 بیٹے سے لگا دیا۔

اس کے ساتھ ہی راجہ نے ایک اور اعلان کر کے سب کو چونکا دیا:
 "اس کے ساتھ ہی میں یعنی کرشن اوڈیر راجہ میسور، اپنی اپنے وزیر اور رعیت کی طرف سے
 حیدر علی خاں کو افواج میسور کے سپہ سالار کا عہدہ پیش کرتا ہوں۔
 آج سے فرزند دلبند حیدر علی خاں تمام فوجی اور ملکی معاملات کے سربراہ اعلیٰ مقرر کیے جاتے
 ہیں۔ انہیں دوسری ریاستوں سے ہر قسم کے معاملے کرنے یا ان کے خلاف فوجی کارروائی کرنے کے
 پورے اختیارات دیے جاتے ہیں۔ ان کے کسی معاملے میں کسی کو دخل دینے کا قطعی اختیار نہ ہوگا۔"
 راجہ کے اس اعلان پر حاضرین نے اور زیادہ مسرت کا اظہار کیا۔ ان دو اعلانات کے بعد
 کسی مزید اعلان کی گنجائش نہ تھی مگر اچانک وزیر نندراج نے کہا:
 "راجہ میسور کرشن اوڈیر اور میری حاضریں!"

فرزند دلبند حیدر علی خاں کے سینا پتی اور دیگر غیر فوجی معاملات کے ناظم اعلیٰ مقرر ہونے کے بعد
 کسما دیر کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ فرزند دلبند حیدر علی خاں میں فوجی انتظام کے علاوہ سول
 انتظامیہ کو سلیقے سے چلانے کی پوری اہلیت موجود ہے۔ اس لیے میں اور میرے بھائی دبوراچ میسور
 کی وزارت سے اپنے طور پر سبکدوش ہونے کا اعلان کرتے ہیں اور فرزند دلبند کے لیے دعا
 کرتے ہیں کہ وہ جس طرح سچ تک ریاست میسور کی خدمات انجام دیتے رہے ہیں اسی طرح مستقبل
 میں بھی اپنی اہلیت کا پورا پورا مظاہرہ کرتے رہیں۔

چنانچہ آج سے ریاست میسور میں وزارت کا عہدہ ختم کیا جاتا ہے اور آئندہ اس عہدے پر کسی کا
 تقرر نہ ہوگا۔

راجہ کرشن اوڈیر کی تو جیسے جان میں جان آگئی۔ وہ جب سے راجہ بنا تھا اس کی یہی کوشش تھی
 کہ میسور کو وزیر برادران کے چنگل سے کسی طرح آزاد کرایا جائے مگر اس کی ہر کوشش ناکام ہو گئی تھی۔

اس جگہ پہلے حیدر علی خاں کے خطاب کے بارے میں کچھ وضاحتیں پیش کی جا رہی ہیں کیونکہ
 اس معاملہ میں مؤرخین کی مختلف رائیں ہیں۔

چنانچہ اس سلسلہ میں سلطنت خداداد میسور میں سلطنت خداداد کے پہلے مورخ جناب محمود
 خاں محمود اس طرح رقم طراز ہیں:

"حیدر علی خاں کی اس کارگزاری سے راجہ بہت خوش ہوا اور انہیں
 سپہ سالار افواج میسور کے عہدے پر ترقی دیتے ہوئے "فتح حیدر بہادر"
 کا خطاب دیا اور حیدر علی کو کامل اختیارات دیے گئے کہ وہ مرہٹوں سے
 معاملہ طے کریں۔"

مگر آگے چل کر محمود خاں محمود اپنی اسی کتاب میں لکھتے ہیں:

"یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ حیدر علی خاں نے جس صلح و آشتی سے
 نندراج سے وزارت لی، اس سے نندراج کو حیدر علی خاں سے بھائے
 رنج کے اور زیادہ محبت ہو گئی جس کا ذکر آگے آئے گا۔"

دوسری طرف راجہ اور اس کا خاندان بھی حیدر علی کا بہت احسان مند ہوا
 اور اس کے صلے میں حیدر علی خاں کو "فرزند دلبند" کا خطاب مل گیا۔"

اس طرح محمود خاں محمود سنگوری کی تاریخ سلطنت خداداد میسور کے حوالے سے حیدر علی خاں کو ایک
 خطاب "فتح حیدر بہادر" اور دوسرا خطاب "فرزند دلبند" راجہ میسور کی طرف سے دیا گیا۔

اس موضوع پر دوسری تحقیقی کتاب "سلطان شہید" میں جناب عطش درانی فرماتے ہیں:

"حیدر علی نے اپنی ذہانت اور فراست سے کام لیتے ہوئے راجہ کی
 آبرورہز حرف نہ آنے دیا۔ چنانچہ راجہ نے حیدر علی کو "فرزند دلبند" کا
 خطاب دیا اور اسے مملکت کے دربار کا مختار بنا دیا۔"

اب حیدر علی کے تین خطاب ماننے آتے ہیں:

۱- فتح حیدر بہادر

۲- فرزند دلبند

۳- فرزند دلبند

اس تفصیل سے اس بات کو تقویت پہنچتی ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی سلطان شہید

نہ صرف اس کی رقم ادا کرنے کے قابل ہو جائے گا بلکہ مرہٹوں کے مقابلے پر بھی تیار ہو جائے گا۔
پھر جب گوپال راؤ کو اطلاع ملی کہ ریاست میسور نے اپنے ایک فوجی سردار حیدر علی خاں
کے ذریعے سرنگاپٹم کے قریب وجوار کے پالیگاردوں سے زبردستی روپیہ حاصل کرنا شروع کر دیا ہے تو
اسے تعجب سا ہوا۔ ایک کرڈر کی رقم پالیگاردوں سے کسی طرح وصول نہیں کی جاسکتی تھی۔
پھر ایک دوسری اطلاع میں گوپال راؤ نے کو بتایا گیا کہ میسور کے سردار حیدر علی خاں نے ایک کرڈر
کی رقم حاصل کر لی ہے اور وہ آجکل نئی فوج بنا رہا ہے اس لیے اسے سراٹھانے سے پہلے ہی پکلی دیا
جائے۔

یوں گوپال راؤ دراصل اس بڑھتی ہوئی طاقت کو کیلنے اور مطلوبہ رقم وصول کرنے سرنگاپٹم آ رہا
تھا جبکہ حیدر علی خاں اسے سرکاری صوبیداری سے بے دخل کرنے نکلا تھا۔
دونوں فوجیں بڑھتے بڑھتے جن پٹن پہنچیں۔ یہ مقام سرنگاپٹم اور سرکار کے درمیان میں واقع تھا۔
یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ سرنگاپٹم اور سرکاری مرہٹہ فوجیں ایک ہی دن اسٹاک کے وقت چند پٹن پہنچیں اور
آمنے سامنے پڑاؤ ڈالا۔

مشورہ ہے کہ حیدر علی خاں کو جنگلی جانوروں میں سب سے زیادہ جینا پسند تھا چیتے کی پھرتی اور
چالاک سے حیدر علی خاں بہت متاثر تھا۔ چیتے کو چالاک ترین اور چور درندہ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ
اپنے دشمن کو غافل کر کے یا غافل پاکر اس پر حملہ کرتا ہے اور لٹوں میں اسے تھس کر ڈالتا ہے۔
کچھ اسی قسم کی عاداتیں اور خصوصیات حیدر علی خاں میں بھی تھیں۔ وہ بھی دشمن کو غافل کر کے حملہ کرتا اور
اسے تھس کر دیتا تھا۔

آمنے سامنے پڑاؤ کرتے ہی ایک طرف تو کھانا پکنا شروع ہو گیا اور دوسری طرف لاکھ تو قیج جنگ
کی تیاری اور حکمت علی پر گفتگو ہونے لگی۔

حیدر علی خاں کو اس وقت نندراج بہت یاد آ رہا تھا۔ وہ ایک منجھا ہوا نام ہونے کے ساتھ
ایک بہترین جرنیل بھی تھا اور جنگ کے موقع پر تو ایسی حکمت علی اختیار کرتا تھا کہ پہلے ہی سے فتح
کا امید پیدا ہو جاتی تھی۔

نندراج اور نندراج کے بھائی دیو راج و ونوں نے حیدر علی خاں اور راجہ سے اجازت لے کر
سرنگاپٹم چھوڑ دیا تھا بلکہ انہوں نے وزارت سے ہمیشہ کے لیے اپنا بیچھا چھڑا لیا تھا اور اب اپنی جاگیر

کے خاندان اور اس کے امن کا رناموں میں دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے اور امید کی جاسکتی ہے کہ حیدر علی
اور سلطان بیٹوں کی زندگی کے پوشیدہ گوشوں پر روشنی پڑے گی اور ان کی بے مثال اہلیت و شجاعت
کے کارنامے زیادہ واضح طور پر سامنے آئیں گے۔

صیانت کے اختتام پر حیدر علی خاں واپس جانے لگا تو راجہ نے سوال کیا:
”مہر سالار۔ مرہٹہ سردار کو ایک کرڈر دے کی واپسی کی کیا صورت اختیار کی جائے گی؟“
نندراج اور دیو راج کو تو علم ہو گیا تھا کہ حیدر علی خاں مرہٹوں کو رقم دینے کے بجائے انہیں میسور
سے نکلنے کی فکر میں ہے اس لیے وہ دونوں ہی خاموش رہے۔

حیدر علی خاں نے دونوں بھائیوں کی طرف دیکھا اور اشارہ بھی کیا کہ راجہ کو اصل بات سے آگاہ
کر دیا جائے مگر نندراج نے اسے اشارے سے منع کر دیا۔
حیدر علی نے ذرا سوچ کے جواب دیا:

”نندراج میسور کو فکر کی ضرورت نہیں۔ اب یہ ذمے داری میری ہے۔ میں جو مناسب سمجھوں گا وہ
قدم اٹھاؤں گا۔
یوں آپ کی اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ میں کلی سے میسور کی سرزمین کو مرہٹوں کے ہاپاک
قدروں سے پاک کرنا شروع کر دوں گا۔
راجہ کی باچھیں کھل گئیں۔
اور وزیر برادران صرف مسکرا کے رہ گئے۔

حیدر علی خاں نے صبح کھانا کھا۔ دوسرے ہی دن اس نے کوچ کا حکم دیا اور اپنی فوجیں لے کر مرہٹہ
گوپال راؤ کی طرف بڑھا۔

گوپال راؤ کو کسی ذریعے سے حیدر علی کے ارادوں کی پہلے ہی خبر ہو گئی تھی اس لیے جس دن
حیدر علی خاں کا لشکر اس کی طرف روانہ ہوا، اسی دن گوپال راؤ مرہٹہ فوج لے کر سر سے نکلا اور حیدر علی کو
مزا دینے کے لیے سرنگاپٹم کی طرف بڑھا۔

گوپال راؤ کو یہ تو معلوم تھا کہ سرنگاپٹم کے دو بھائی حیدر علی خاں اور شباز خاں بلا کے بنادر
اور پھر تلے ہیں مگر اسے یہ علم نہ تھا کہ میسور کی ریاست جس کا خزانہ خالی تھا، وہ سال ڈیڑھ سال کے اندر

حیدر علی خاں اپنے پھر تیلے جاننا سواروں کو لے کر اس جگہ پہنچ گیا جہاں سے روانہ ہو کر اسے دشمن کی خیمہ گاہ کے درمیان سے گزرتے ہوئے کھڑپوں میں بندھے اور شعلے اگلے ہوئے چوٹی تیر پھینکنا تھے۔

جنگوں میں عام طور پر بڑے سردار یا بادشاہ قلبِ فوج میں رہ کر لشکر کو لڑاتے تھے یا پھر کسی اور بچی جگہ کھڑے ہو کر لڑائی دیکھتے تھے مگر حیدر علی خاں کا اپنے آغاز سے موت تک ہمیشہ یہ طریقہ کار رہا کہ وہ اپنے لشکر کی نہ صرف رہنمائی کرتا بلکہ حملہ کرتے وقت بھی سب سے آگے رہتا تھا۔

جب حیدر علی کے تمام سوار آگے پیچھے قطاریں بنا کر کھڑے ہو گئے تو حیدر علی خاں جو سب سے آگے تھا، آہستہ سے سیٹی بجاتی جس کے ساتھ ہی سپاہیوں کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی چھوٹی چھوٹی لکڑیاں ایک دم روشن ہو گئیں، جن کے سردوں پر کپڑا بندھا ہوا تھا اور انیس تیل میں ڈبو گیا تھا۔

حیدر علی خاں کے یہ شعلہ بردار سوار گھوڑے اڑاتے اور گولوں کے مانند اڑتے گول پال راڈ کے پڑاؤ میں ایک سرے سے داخل ہوئے اور انہوں نے جیوں پر شعلے پھینک کے آگ لگا دی۔ پھر سامنے آنے والوں اور مزاحمت کرنے والوں پر تلواروں اور نیزوں سے حملہ آور ہو گئے۔

گول پال راڈ کے جیوں میں آگ بھڑک چکی تھی اور اس کے لشکر کی حواس باختہ ادھر ادھر جاگ رہے اور مسلسل قتل ہو رہے تھے۔

حیدر علی خاں نے سواروں کو سمجھا دیا تھا کہ وہ جس قدر تیزی سے ممکن ہو دشمن کی خیمہ گاہ کو پار کر دیں اور دوسرے سرے سے باہر نکل جائیں۔ پھر نصف دائرہ کاٹ کر دشمن پر پھر اسی منہ سے حملہ کریں جہاں سے وہ پہلی مرتبہ ان کی خیمہ گاہ میں داخل ہوئے تھے۔

اس سے دشمن پر یہ تاثر بیٹھا نام مقصود تھا کہ حیدر علی کا پورا لشکر ایک ساتھ شب خون مارنے میں شریک ہوا ہے۔

حیدر علی کی اس حکمتِ علی سے گول پال راڈ کا لشکر واقعی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ حیدر علی کے پاس عظیم لشکر ہے جو ایک گھنٹہ سے مسلسل ایک سمت سے داخل ہو کر دوسری طرف سے نکل رہا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرہٹہ فوجوں میں بھگدڑ چمک اٹھی اور اندھیرے میں جدھر جس کا منہ اٹھ

سنی مشکل میں سکون سے زندگی گزار رہے تھے۔

حیدر علی خاں میں یہ خوبی تھی کہ وہ عین میدانِ جنگ میں دشمن کی فوجی حالت اور اس کی دفاعی پوزیشن کو دیکھ کر اپنی حکمتِ علی فوری طور پر تیار کرتا اور اس پر فوراً عمل شروع کر دیتا۔

دونوں طرف کے لشکر خیمے لگا کے کھلنے پکانے اور جنگی تیاریوں میں مصروف تھے لیکن حیدر علی تنہا گھوڑے پر سوار اندھیری رات میں دشمن کی دفاعی پوزیشن معلوم کرنے کے لیے ادھر ادھر چکر لگا رہا تھا۔

کھانا تیار ہو چکا تھا مگر حیدر علی خاں ابھی تک دشمن کے لگا سوچوں کی دیکھ دیکھ سے واپس نہ آیا تھا۔ وہ اپنے نائب کمانڈرے راڈ سے کہہ گیا تھا کہ اس کی داپسی کا انتظار نہ کیا جائے اور لشکر کھلنے سے فارغ ہو کر آرام کرے۔

کمانڈرے راڈ جوں جوں حیدر علی خاں کے قریب ہوا تھا اسی قدر اس پر اپنے سپہ سالار کی خوبیاں کھلتی جا رہی تھیں۔

حیدر علی خاں نصف شب گزرنے کے بعد پڑاؤ پر واپس آیا۔ اس وقت لشکر پر مٹا چھایا ہوا تھا اور موٹے رات کے گشت کے سواروں یا حیدر علی کے محافظ دستے کے اور بے لشکر اطمینان سے غور و خوض کرتے۔

حیدر علی خاں نے واپس آتے ہی اپنے خاص ملازم کے ذریعے ان سرداروں کو طلب کیا جن کے دستے کسی فوری ضرورت کے وقت استعمال کیے جاتے تھے۔

یہ دستے دراصل شب خون میں استعمال ہوتے تھے اور نصف گھنٹے کے وقفہ میں جنگ کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔

حیدر علی خاں نے چیتے جیسی پھر ق سے دشمن کی پوزیشن کا جائزہ لیا۔ اس کے کمزور پلٹوں پر نظر ڈالی۔ شب خون کا راستہ متعین کیا۔ پھر خیمہ گاہ میں آکر شب خون مارنے والے سرداروں کو بلا کر جلدی جلدی ہدایات دی۔

یہ سرداروں میں آنے والے سرداروں سے زیادہ تیز رفتار آگ کے گولے پھینکنے میں ماہر اور بھگتے گھوڑے پر سوار، تیز چلنے والے اور تلوار چلا سکتے تھے۔

حیدر علی خاں کی خیمہ گاہ میں سناٹا ماری تھا لیکن پانچ سو گھوڑے اور ان کے سوار نکل کے جا چکے تھے۔

وہ بھاگ کھڑا ہوا۔

حیدر علی خاں نے اپنی ذہانت سے شب خون میں صرف پانچ سو سوار استعمال کیے اور گویا لڑاکے پورے لشکر کو میدان سے بھگا دیا۔ جب صبح ہوئی تو سامنے کا میدان صاف تھا۔ سوائے لاشوں اور جلے ہوئے خیموں کے وہاں اور کچھ نہ تھا۔ مرہٹے اپنا تمام مال و اسباب چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اس سامان کا بیشتر حصہ خاک ہو گیا تھا۔ جو سامان بچا وہ حیدر علی نے اپنے لشکر میں تقسیم کر دیا۔

حیدر علی خاں کی اس کامیابی نے اس کے لشکر کے حوصلے بڑھا دیے تھے۔ مرہٹہ فوج بد دل ہو کر بھاگی تھی اور اب اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ کسی جگہ جم کر حیدر علی خاں کا مقابلہ کرے۔ حیدر علی خاں جن پٹن سے اپنی فوجیں لے کر بنگلور کی طرف بڑھے اور شہر کے قریب پیچ کے خیمہ زن ہوئے۔ جن پٹن سے مرہٹہ شکست خوردہ فوج کسی مقام پر نہ ٹھہری اور اس نے مرا کے قلعہ ہی میں جا کر دم کیا۔

گویا لڑنے کے میدان میں لڑنے کے بجائے قلعہ بند ہو کر مدافعت کرنا زیادہ مناسب خیال کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مرہٹوں کے صدر مقام پونا کی طرف یکے بعد دیگرے کئی تیز رفتار سوار دوڑائے کہ اسے پونا سے فوراً فوجی کمک بھیجی جائے تاکہ وہ حیدر علی خاں کا مقابلہ کر سکے۔ ادھر حیدر علی خاں نے سراہلنے کے بجائے میسور کے دوسرے تمام علاقوں کو مرہٹوں سے پاک کرنا شروع کر دیا، جن پر وہ قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔

دو ہفتوں کے اندر اندر حیدر علی خاں نے سوائے مرا کے اور تمام علاقے مرہٹوں سے واکڑا کر لیے۔

گویا لڑاؤ سراہل میں بیٹھا کمک کا انتقاد کرتا رہا مگر اسے پونا سے کوئی مدد نہ مل سکی اس لیے کہ ۱۷۶۱ء میں شمالی ہند میں ایک ایسا انقلاب آیا جس نے مرہٹوں کی کمر توڑ کے رکھ دی!

جنوری ۱۷۶۱ء میں مرہٹے ایک مذابِ عظیم سے دوچار ہوئے۔

جن پٹن کے میدان میں حیدر علی خاں کے شب خون نے مرہٹوں کو ایسا بدحواس کیا کہ وہ تمام مازو سامان چھوڑ کے بھاگ کھڑے ہوئے۔

مرہٹہ سردار گویا لڑاؤ یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ مرنگا پٹم کا ایک معمولی سردار اتنی جرأت کرے گا کہ مرہٹہ لشکر کے سامنے آئے۔ اسی وقت مرہٹوں کا جنوبی ہند اور شمالی ہند دونوں علاقوں میں طوطی بول رہا تھا اور تمام چھوٹی چھوٹی ریاستیں اور رجواڑے مرہٹوں کی پناہ میں آنے کے خواہش مند اور تنہا تھے۔

مگر

جب جن پٹن میں ان کو مار پڑی تو گویا لڑاؤ کی آنکھیں کھلیں اور حیدر علی خاں سے کھلے میدان میں مقابلہ کے بجائے اس نے قلعہ مرا میں پناہ لینا مناسب خیال کیا۔ یوں وہ بھی کچی فوج کے ساتھ قلعہ مرا میں پہنچ گیا۔

جن پٹن سے پسپا ہوتے ہی اس نے مرہٹوں کی مرکزی حکومت جو پونا میں قائم تھی اور بالاجی باجی راؤ ان کا پیٹنوا تھا اسے اطلاع بھجوا دی تھی کہ میسور میں زبردست بغاوت ہو گئی ہے۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے اسے فوراً فوجی کمک کی ضرورت ہے جو اسے میاں جلائے۔

گویا لڑاؤ اپنے پیٹنوا کو اطلاع دے کر اطمینان سے قلعہ مرا میں بیٹھا ہوا تھا کہ جب پونا سے

افغان لشکر پانچوں دریا پار کر کے سر ہند پہنچ چکا تھا۔ وہاں اس کا مقابلہ مغل لشکر جس کا سردار وزیر قمر الدین تھا اسے ہوا۔

قمر الدین اور اس کا بیٹا معین الملک فوجوں جنگ سے واقف اور بادشاہ دہلی کے دل سے وفادار تھے۔ وہ اس قدر جان توڑ کے لڑے کہ احمد شاہ ابدالی کو شکست کھا کر پیچھے ہٹنا پڑا مگر اس جنگ میں قمر الدین شجاعت کے جوہر دکھاتا ہوا کام آیا۔

اپنے وزیر بابتدیر قمر الدین کی موت سے محمدا بادشاہ دہلی اس قدر غمزدہ اور نڈھال ہوا کہ کچھ ہی دنوں بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

دوسرا حملہ

۱۷۴۹ء میں احمد شاہ ابدالی پھر برصغیر پر حملہ آور ہوا۔

اس وقت قمر الدین کا بیٹا معین الملک پنجاب کا گورنر تھا۔ معین الملک تورانی تھا اور دہلی کا وزیر صدر جنگ ایرانی تھا۔ چونکہ ایرانیوں اور تورانیوں میں عہد قدیم سے اختلاف چلا آ رہا تھا اس لیے وزیر صدر جنگ نے اپنے تورانی گورنر معین الملک کو کوئی کمک نہ بھیجی اور گورنر کو ابدالیوں کے ہاتھوں شکست اٹھانا پڑی۔

پنجاب کے چار ضلعے سیالکوٹ، امین آباد، پسر در اور رنگ آباد احمد شاہ ابدالی کے حوالے کر دیے گئے۔

تیسرا حملہ

پنجاب کے چار اضلاع اگرچہ ابدالیوں کے ماتحت ہو گئے تھے لیکن احمد شاہ ابدالی نے ان اضلاع سے مالیہ وصول کرنے کا کام معین الملک ہی کے سپرد کر دیا تھا۔ معین الملک دو سال تک ان اضلاع کا مالیہ وصول کر کے ابدالیوں کو بھیجتا رہا مگر تیسرے سال سے اس نے مالیہ دینا بند کر دیا۔

چنانچہ ۱۷۵۲ء میں احمد شاہ ابدالی نے تیسری بار حملہ کر دیا۔ معین الملک نے دہلی کی مرکزی حکومت سے پھر کمک مانگی مگر اس ایرانی تورانی کے اختلاف کی وجہ سے اسے اس بار بھی مدد نہ دی گئی اور اسے شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

ملک آئے گی تو وہ قلعہ سے نکلے گا مگر اس کا پیشوا اسے مدد کیسے روانہ کرتا؟

اس وقت شمالی ہند میں شاہ افغانستان احمد شاہ ابدالی اپنے لشکر کے ساتھ پنجاب میں اتر رہا تھا اور مرہٹوں کے تمام مقبوضات احمد شاہ ابدالی کی زد پر تھے اور پونا کے پیشوا کا تخت لرز رہا تھا۔

احمد خاں جو احمد شاہ ابدالی اور احمد خاں درانی کے ناک سے بھی مشہور ہوا، افغانستان کی معزز برادری سدوزئی کا سرگرم رہا۔ احمد خاں نے نادر شاہ درانی کی غلامی قبائلی کے خلاف رفاقت اور مدد کی تھی جس کے صلہ میں اسے ان علاقوں کی عداوت حاصل ہو گئی تھی۔

پھر جب ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ اندرونی سازشوں کی بھینٹ چڑھا تو ایران کے جنوب مشرق کے صوبے بلالہ و جہد پکے پیلوں کی طرح احمد شاہ کی گود میں آ گئے۔ احمد خاں کو فوراً افغانستان کا بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔

موجودہ افغانستان کی آزاد مملکت کی بنیاد اسی احمد خاں یعنی احمد شاہ ابدالی نے رکھی تھی اس کی تخت نشینی قندھار میں ہوئی۔

یہ وہی قندھار ہے جس پر قبضہ کے لیے صدیوں تک ایرانی اپنا خون بہاتے رہے ہیں شمال میں بلخ اور مشرق میں پنجاب اور کشمیر تک مقامی حکام نے احمد شاہ ابدالی کا خطبہ پڑھوایا۔ ابدالیوں کو طاقت حاصل ہوئی تو انھوں نے پنجاب پر ہی بس نہیں کیا بلکہ دہلی کے ان تمام علاقوں پر جن پر نادر شاہ نے قبضہ کیا تھا ان کی تجدید کا قصد کیا۔

اس سلسلہ میں احمد شاہ نے ۱۷۴۸ء اور ۱۷۶۱ء کے درمیان برصغیر پر پانچ حملے کیے ان حملوں کا مختصر احوال یہاں درج کیا جاتا ہے۔

پہلا حملہ

احمد شاہ ابدالی کا برصغیر پر پہلا حملہ ۱۷۴۸ء میں ہوا۔

لاہور فتح کرنے کے بعد وہ آگے بڑھا۔ مغل بادشاہ محمد شاہ نے اپنے وزیر قمر الدین کی سرگردگی میں ایک لشکر روانہ کیا۔ شاہ دہلی ان دنوں مرض الموت میں مبتلا تھا۔ پھر بھی اس نے معقول فوج اور توپ خانہ قمر الدین کے حوالے کیا اور ولی عہد شہزادہ احمد کو بھی اس کے ساتھ کر دیا۔

احمد شاہ ابدالی، معین الملک کی بہادری سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے معین الملک کو معاف کر کے اسے اپنی طرف سے پنجاب کا گورنر مقرر کیا اور طے پایا کہ معین الملک ۵۰ لاکھ روپے سالانہ احمد شاہ کو ادا کرے گا۔

چوتھا حملہ

اس دوران مرہٹے بڑی تیزی سے شمالی برصغیر کی سیاست پر چھلنے جا رہے تھے۔ احمد شاہ شاہ دہلی کے وزیر صفدر جنگ نے مرہٹے پیشوا کا تعاون حاصل کیا اور مرہٹے فوج دہلی میں بمال۔ اس فوج نے دہلی اور اطراف دہلی میں خوب اور ہم چایا اور لوٹ مار کی۔ انہی دنوں دوسرے وزیر عماد الملک نے صفدر جنگ کو وزارت سے نکال باہر کیا۔

یہاں تک تو غنیمت تھا لیکن اس نے بھی مرہٹوں کا تعاون حاصل کیا اور انہیں پنجاب کی فتح پر لگا دیا۔ پنجاب کا گورنر معین الملک تھا جسے احمد شاہ ابدالی نے مقرر کیا تھا اور وہ اسی کے ماتحت تھا۔ عماد الملک نے مرہٹوں کی فوج سے پنجاب پر حملہ کیا۔ معین الملک شکست کھا گیا اور عماد الملک نے اپنی طرف سے ادین بیگ کو پنجاب کا گورنر مقرر کر دیا۔

پنجاب پر مغلوں کے قبضہ کی خبر جب قندھار پہنچی تو احمد شاہ ابدالی چوتھی مرتبہ برصغیر پر حملہ آور ہوا۔

اس نے صرف پنجاب کو فتح کیا بلکہ سیدہ دہلی میں جا کر دم لیا۔ یہ حملہ ۱۷۵۶ء میں ہوا اور احمد شاہ ابدالی، ۱۷۵۷ء میں دہلی پہنچا۔

یہ دہی سال ہے جب مکارانگیز قوم نے غدار قوم میر جعفر کی مدد سے دہلی بنگال نواب مرارج الدولہ کو شکست دی تھی۔

احمد شاہ ابدالی نے ایک ماہ دہلی میں قیام کیا۔ عماد الملک نے اس کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ احمد شاہ ابدالی نے عالمگیر ثانی کو منسل بادشاہ تسلیم کر لیا اور وہ ہیلہ سردار نجیب الدولہ کو امیر لارہ کا خطاب دے کر عالمگیر ثانی کا وزیر مقرر کیا۔

اس حملے میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوؤں کے اہم مقام متھرا کو بھی تباہ کیا تھا۔ پھر وہ اپنے بیٹے تیمور شاہ کو پنجاب کا گورنر مقرر کر کے کابل واپس چلا گیا۔

پانچواں اور آخری حملہ

احمد شاہ ابدالی کے واپس جاتے ہی عماد الملک نے وہ ہیلہ سردار نجیب الدولہ کو وزارت سے ہٹا دیا اور خود وزیر بن بیٹھا۔

اس نے پھر مرہٹے فوج طلب کی اور ان کی مدد سے پنجاب پر حملہ کیا۔ وہاں احمد شاہ ابدالی کا بیٹا تیمور شاہ گورنر تھا۔ عماد الملک نے مرہٹوں کی مدد سے اسے شکست دے کر پنجاب سے بھگا دیا۔ اب پنجاب اور دہلی دونوں جگہ مرہٹوں کا قبضہ تھا۔ ان کی فوج دہلی میں مقیم تھی اور وہ محمول کے بنانے آبادیوں کو لوٹ رہے تھے۔

جنوبی ہند میں مرہٹوں کی طاقت پہلے ہی بڑھی ہوئی تھی۔ میسور تک ان کا قبضہ ہو چکا تھا اور اب وہ پورے برصغیر پر ایک ہندو حکومت قائم کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔

۱۷۵۹ء اور کازمانہ تھا جب احمد شاہ ابدالی، شاہ افغانستان کو پنجاب میں اپنے بیٹے تیمور شاہ کی شکست اور مرہٹوں کے قبضے کی خبر ملی۔ چنانچہ احمد شاہ ابدالی کو پانچویں دفعہ برصغیر کا رخ کرنا پڑا۔ لاہور پر مرہٹے سردار ساجی سندھیا کا قبضہ تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے ایک ہی قبیلے سے ساجی سندھیا کا منہ گھوم لیا اور وہ دم دبا کر پنجاب سے نکل بھاگا۔

لاہور پر قبضے کے بعد احمد شاہ ابدالی آگے بڑھا اور دہلی کے قریب دناجی سندھیا کو شکست دے کر اس کا سر قلم کر دیا۔

اسی وقت احمد شاہ ابدالی کے ایک سردار جہاں خاں نے سکندریہ کے قریب ملہار راؤ بھکر کو شکست فاش دی۔ اسی طرح ایک ہی ہم میں شمالی ہند میں مرہٹے اقتدار کی جڑیں ہل کے رو گئیں۔

پنجاب اور دہلی میں مرہٹے افواج کی شکست کی خبر جب جنوبی ہند میں مرہٹوں کے مرکز پونا میں پہنچی تو مرہٹے پیشوا چونک پڑا۔

شمال میں مرہٹوں کے تینوں سردار ملکہ سالارہ افواج مرہٹے، ساجی سندھیا، دناجی سندھیا، اور ملہار راؤ بھکر پیشوا کی ناک تھے اور اسے اپنے ان سالاروں پر بڑا نماز تھا۔ بالاجی ساجی راؤ پور ۲۲ گھنٹے تک اپنے محل کے سامنے میدان میں زخمی و زندے کی طرح تڑپتا اور زخم پاشتا رہا۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا اور کسی کو اس کے قریب جانے کی اجازت نہ تھی۔

ہو جانے کے بعد برصغیر پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں سے کوئی طاقت حکومت کرے گی؟
نجیب الدولہ نے احمد شاہ ابدالی کے دماغ میں یہ بات ڈال دی تھی کہ اگر مرہٹہ طاقت کا خاتمہ
نہ کیا گیا تو مسلمانوں کے ۶۰ سالہ دور حکومت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا اور برصغیر پر مرہٹہ
(ہندو) راج مسلط ہو جائے گا۔

نجیب الدولہ کے یہ بات سمجھنے ہی نے احمد شاہ ابدالی کو اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ برصغیر
پر خواہ کسی کی بھی حکومت قائم ہو جائے مگر مرہٹہ حکومت قائم نہیں ہونی چاہیے۔

اسخرو وہیلہ سردار نجیب الدولہ کی کوششیں بار آور ہوئیں اور شجاع الدولہ احمد شاہ ابدالی کی حمایت
پر آمادہ ہو گیا۔

طیہ ہوا کہ مرہٹہ طاقت کا سرکھل دیا جائے اور دہلی میں ایک بار پھر مسلمانوں کی طاقتور سلطنت
قائم ہو اور مرہٹوں کا ہندو حکومت قائم کرنے کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے۔

مرہٹوں کا تین لاکھ کا لشکر مع توپ خانہ کے پانی پت کے میدان میں پہنچ چکا تھا اور انہوں نے
خندقیں کھود کر مورچے قائم کر لیے تھے۔

احمد شاہ ابدالی نے بجائے پانی پت جانے کے دہلی اور پانی پت کے درمیان پڑا ڈوڈال دیا۔ اس طرح
مرہٹوں کو دہلی سے حاصل ہونے والی سردار راستہ بند ہو گیا اور اب پانی پت کے میدان میں تیسری جنگ
کی تیاریاں شروع ہوئیں۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرہٹوں اور احمد شاہ ابدالی میں متوقع جنگ کا نام پانی پت کی تیسری
جنگ کیوں رکھا گیا؟

کیا مرہٹوں اور احمد شاہ ابدالی میں پانی پت کے میدان میں اس سے پہلے بھی دو لڑائیاں ہو چکی تھیں
کہ اس ہونے والی جنگ کو "پانی پت کی تیسری جنگ" کا نام دیا گیا؟

اس کے جواب کے لیے برصغیر کی گزشتہ تاریخ کے ورق الٹا دیکھیں گے!

پانی پت کا تقصیر ایک طویل قیودق اور بے آب و گیاہ صحرا کے کنارے پر آباد ہے۔ یہ
میدان دہلی سے کچھ دور واقع ہے اور یہاں اس تیسری جنگ سے پہلے دو اور عظیم جنگیں لڑی گئی تھیں
جن کا نام پانی پت کی پہلی لڑائی اور پانی پت کی دوسری لڑائی ہے۔

دراصل پانی پت میں لڑی جانے والی لڑائیاں اس لیے اہمیت رکھتی ہیں کہ اس میدان کی
فتح و شکست نے برصغیر کی قسمت بدل کے رکھ دی تھی۔

پھر جب اس غم اور غصہ سے اس کی طبیعت میں کچھ سکون پیدا ہوا تو اس نے اپنے بھائی سدا
شہو راؤ کو اپنے پاس بلایا اور انگہارا آنکھوں سے اس سے کہا:

"اے بھائی! شمالی ہند میں ابدالی لیڈروں نے ہماری عزت لوٹ لی۔ انہوں نے بھاری شجاعت اور
عظمت کے چراغ کو بجھا دیا ہے۔ ہزاروں فوجیوں کے علاوہ ہمارے پیارے سردار سا باجی سندھیا
دنا جی سندھیا اور ملہار راؤ ہکر کھیت رہے۔ اب اس ڈوبی ہوئی عزت کو تم ہی جنکا سطح پر لا سکتے
ہو اور ہلالہ کی چوٹیوں پر پھر سے پہنچ سکتے ہو۔

میں تمہارے ساتھ اپنے نشت جگہ دشو اس راؤ کو بھیج رہا ہوں۔ دل تو میرا بھی ہی چاہتا ہے کہ
تمہارے ساتھ بچوں اور احمد شاہ ابدالی سے مرہٹوں کے خون کا انتقام لوں مگر کیا کروں ایسے حالات
میں اپنا کوئی چھوڑنا بھی کسی طرح مناسب نہیں۔

اور میرے سے بھی کچھ اچھی خبریں نہیں آ رہی ہیں۔ یہاں بھی حیدر علی نام کا ایک مسلمان پتہ
راجا کرشن اوڈری کی مدد پر اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ گو بال راؤ اس کی سرکوبی کے لیے قلعہ مرلے نکل کر مرنگا پٹم گیا
ہے۔ میرا دل ادھر سے بھی ڈر رہا ہے۔"

مختصر یہ کہ مرہٹوں کے پیشوا بالاجی باجی ناؤ نے تین لاکھ کا ایک لشکر ترتیب دیا جس میں
۵۷ ہزار مرن سوار تھے۔ اس کے علاوہ مشہور توپچی ابراہیم گارڈی مع اپنے توپ خانے کے لشکر کے
ساتھ تھا۔

یہ لشکر بڑی شان و شوکت اور آں بان سے احمد شاہ ابدالی کے مقابلہ کر شمال کی طرف بڑھا۔
مارنچ باقی ہے کہ اس سے قبل کبھی اتنی عظیم مرہٹہ فوج میدان میں نہیں نکلی تھی۔

۶۰ء میں مرہٹہ فوج دہلی میں داخل ہوئی اور اپنی خصلت کے مطابق لوٹ مار مچا دی۔ محلات
مجاہد اور مقبرے تک ان کی دست برد سے محفوظ نہ رہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ قیامت سے
پہلے ایک قیامت مرہٹوں کی شکل میں دہلی والوں پر ٹوٹ پڑی تھی۔

اس اثنا میں احمد شاہ ابدالی انوپ شہر جو بلند شہر میں تھا، میں اپنے لشکر کے ساتھ مقیم
تھا۔ ان دنوں مشرقی صوبہ اودھ کا صوبیدار شجاع الدولہ کی فوجی طاقت خاص اہمیت رکھتی تھی۔ احمد شاہ
ابدالی چاہتا تھا کہ مرہٹوں کے خلاف اسے شجاع الدولہ کی حمایت حاصل ہو جائے۔

روہیل کھنڈ کا روہیلہ سردار نجیب الدولہ ان دونوں میں مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش میں
لگا ہوا تھا۔ کیونکہ اب یہ مسئلہ مرہٹوں اور ابدالیوں کا نہیں تھا بلکہ اب سوال یہ تھا کہ مغلوں کی طاقت غم

بارہ ہزار کا لشکر تھا۔

ظہیر الدین بابر بارہ سال کی عمر سے فتح و شکست سے دوچار ہوتا چلا آ رہا تھا۔ ابراہیم لودھی کی فوج اگرچہ تعداد میں بہت زیادہ تھی مزید برآں کہ اس میں ایک ہزار جنگی ہاتھیوں کا ایک مضبوط دستہ بھی تھا لیکن بابر بالکل ہراساں نہ ہوا اور میدان پر نظر ڈالی کہ اپنی جنگی حکمت عملی فوراً ترتیب دے لی۔ اس نے پانی پت کے قصبے کو اپنے دائیں جانب یعنی میمنہ کی سمت رکھا اور بائیں طرف یعنی میسرہ کی سمت خندق کھود کر اسے محفوظ کیا۔

اب قلب فوج کی حکمت عملی باقی تھی۔ اس کے لیے بابر نے یہ کیا کہ سامنے کی سمت سات سو گاڑیوں کو ایک قطار میں کھڑا کیا۔ گاڑیوں کے درمیان مناسب فاصلے پر مورچے قائم کیے اور ان میں توپیں لگا دیں۔

بابر نے یہ پیش بندی اس لیے کی تھی کہ دشمن کا ڈی دل اپنی پوری قوت سے اس پر حملہ آور نہ ہو سکے۔

۲۱۔ اپریل ۱۵۲۶ء کی صبح ابراہیم لودھی کے لشکر میں حرکت پیدا ہوئی۔ اور پورا لشکر ایک ساتھ بلخارک تارواں آگے بڑھا۔ بابر کی فوج نے اپنی جگہ سے ذرا بھی حرکت نہ کی۔ ابراہیم لودھی کا لشکر جب گاڑیوں کی قطار کے پاس پہنچا تو اس کے قدم ایک دم رک گئے اور وہ متحیر نظروں سے گاڑیوں کو دیکھنے لگا۔

اسی وقت بابر نے اپنے میمنہ اور میسرہ کے سواروں کو اشارہ کیا اور وہ دائیں بائیں سے لشکر کے دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ اس کے ساتھ ہی گاڑیوں کے درمیان بنے ہوئے مورچوں سے توپوں نے آگ لگانا شروع کر دی۔

واضح رہے کہ بارود کا استعمال سب سے پہلے بابر ہی نے کیا تھا۔ ابراہیم لودھی کے لشکر اور جنگی ہاتھی بارود کی گولوں سے قطعی بے خبر تھے۔ اس ناگہانی آفت سے وہ سخت بدحواس ہوئے اور کسی نہ کسی طرح دوپہر تک لڑتے رہے۔ پھر ان کے قدم اکھڑ گئے۔ ابراہیم لودھی میدان جنگ میں لڑتا ہوا مارا گیا۔

پانی پت کی اس جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ برصغیر میں افغان و دھویوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور یہاں ظہیر الدین بابر کی مغل حکومت قائم ہوئی۔

پانی پت کی دوسری لڑائی بھی مولویوں مدعی مسوی میں لڑی گئی۔ اس جنگ کا ایک مندریق

اس میدان میں لڑی جانے والی پانی پت کی پہلی لڑائی کے نام سے مشہور جنگ پہلے منسل شہنشاہ ظہیر الدین بابر اور ہند کے لودھی خاندان کے بادشاہ ابراہیم لودھی کے درمیان اپریل ۱۵۲۶ء میں لڑی گئی تھی۔

دراصل دہلی پر قبضہ ہندوستان پر قبضہ سمجھا جاتا تھا اس لیے ہندوستان پر قبضے کے لیے طاقت کا فیصلہ دہلی سے قریب پانی پت کے عظیم انسان میدان جنگ میں ہوتا تھا۔

ہند میں مغلوں کا جد امجد ظہیر الدین بابر جب پنجاب کو روندنا ہوا دہلی کی طرف چلا تو تاجدار دہلی ابراہیم لودھی بھی اپنے لشکر کے ساتھ پانی پت کے میدان کی طرف روانہ ہوا تاکہ ہند پر حملہ آور ہونے والے بابر کو پانی پت کے میدان میں شکست دے کر اس کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دے۔

بابر کے ہند پر چلے کہ وجہ یہ تھی کہ صوبہ پنجاب کا گورنر دولت خاں لودھی اپنے بادشاہ ابراہیم لودھی سے باغی ہو گیا تھا۔ اس نے قندھار کے بادشاہ ظہیر الدین بابر کو ہند پر حملہ کرنے کا دعوت دی اور بابر اس دعوت پر لشکر لے کر پنجاب پر حملہ آور ہوا۔

یہ حملہ ۱۵۲۴ء میں ہوا۔

بابر نے لاہور پر قبضہ کر کے شہر میں آگ لگوا دی۔ اس کا ارادہ تھا کہ پنجاب اور برصغیر پر ایک مستقل حکومت قائم کرے اس لیے اس نے پنجاب کا معقول انتظام کیا اور دولت خاں لودھی کے بیٹے دلاور خاں کو پنجاب کا گورنر مقرر کر کے کابل واپس چلا گیا۔

دوسری طرف دولت خاں لودھی جس نے بابر کو پنجاب پر حملہ کی دعوت دی تھی اس خیال میں تھا کہ بابر شاہی افواج کو شکست دے کر واپس چلا جائے گا لیکن جب بابر نے مستقل انتظامات کیے اور اس کے بیٹے کو گورنر بنا کر واپس لیا تو اسے سخت غصہ آیا۔ اس نے اپنے بیٹے کو صوبہ واری سے نکال باہر کیا۔ خود پنجاب پر قبضہ کر کے بیٹھ گیا۔

اس کی خبر جب کابل پہنچی تو بابر نے پورے ہند پر ایک مستقل حکومت قائم کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس کے لیے قیدی سے تیاریاں شروع کر دیں۔

تیاریاں مکمل ہونے کے بعد بابر بارہ ہزار کے لشکر کے ساتھ پنجاب میں داخل ہوا۔ پہلے اس نے لاہور پر قبضہ کیا۔ پھر اٹالہ اور شاہ آباد کے راستے جہلم کے کنارے آگے بڑھا۔

دوسری طرف سے ابراہیم لودھی اپنے ایک لاکھ کے لشکر کے ساتھ پانی پت پہنچا۔ اس لشکر میں ایک ہزار جنگی ہاتھی بھی تھے۔ بابر بھی پانی پت پہنچ گیا مگر دشمن کے مقابلہ میں اس کے ساتھ صرف

ہیو بقال قلب میں تھا۔ اس نے فوراً پندرہ سو جنگی قابیل کو قلب فوج میں پہاڑی طرح سے کھڑے تھے، حرکت دیا اور یہ کالا پہاڑ چنگھاڑیں مارتا آگے بڑھا۔

کہتے ہیں کہ اس جنگ میں قدرت نے مخلوق کی عجب انداز سے مدد کی۔ جس وقت ہیو بقال کے جنگی ہاتھی آگے بڑھ رہے تھے اسی وقت کسی مثل تیر انداز کا ایک تیر ہیو بقال کی آنکھ میں پورست ہو گیا۔ ہیو اس تکلیف سے چیخ پڑا۔ وہ ہودج میں گر پڑا۔ ہیو بقال کے نظروں سے غائب ہوتے ہی دشمن کی فوج میں استری پیدا ہوئی اور وہ میدان چھوڑ گئی۔ ہیو بقال گرفتار ہو کر قتل ہوا۔

پانی پت کی دوسری لڑائی کے نتیجہ میں مخلوق کی ڈمکاتی حکومت اور سرزمین گم ہو گئی۔ ہیو جس نے دہلی اور آگرہ پر قبضہ کے بعد راجہ بکرماجیت کا لقب اختیار کر لیا تھا اور سر پر ہند کی عظیم سلطنت کا تاج رکھنے کی آرزو کر رہا تھا اس کا خاتمہ ہو گیا۔ افغانوں کا بھی مخلوق کے خلاف یہ آخری معرکہ تھا۔ پانی پت کی شکست نے ان کے خوابوں کو بھی ہمیشہ کے لیے منتشر کر دیا۔

اب یہ پانی پت کی تیسری لڑائی تھی۔ اس میں ایک طرف مرہٹوں کا لشکر جارا تھا جس کی تعداد تین لاکھ بتائی جاتی ہے۔ اس میں صرف سواروں کی تعداد ۵۵ ہزار کے قریب تھی۔ اس مرہٹہ لشکر کی کان، مرہٹوں کے پیشوا بالاجی باجی راؤ کا بیٹا سدا شیو راؤ جسے عرفاً مامیوں 'بھاد' کہا جاتا تھا، کر رہا تھا اور باجی راؤ کا لڑکا وشوا اس راؤ اس کے ساتھ تھا۔ دوسری طرف افغانستان کا بادشاہ احمد شاہ ابدالی تھا جو اپنے لشکر کے ساتھ پانی پت اور دہلی کے درمیان پڑاؤ ڈالے پڑا تھا اور اس طرح اس نے مرہٹوں کو دہلی سے آنے والی آمد کارا مستہ بند کر دیا تھا۔

مرہٹے پانی پت کے میدان میں مورچے جھڑپے پڑے تھے اور احمد شاہ ابدالی کے پانی پت آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ مگر احمد شاہ ابدالی نے سیپے پانی پت نہ جانے کی قسم کھائی تھی اس کی حکمت علی یہ معلوم ہوتی تھی کہ مرہٹوں کی رسد کو روک کر انہیں اتنا پریشان کیا جائے کہ وہ پانی پت کے میدان میں کمزوری ہوئی خندقوں اور بنائے ہوئے مودچوں سے نکلنے پر مجبور ہو جائیں اور کھلے میدان میں آگے مقابلہ کریں۔

آخر احمد شاہ ابدالی کی اس حکمت علی نے مرہٹوں کو خندقوں اور مورچے چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

سلطنت مغلیہ کا عظیم بادشاہ اکبر تھا۔

اکبر اس وقت بالکل نو عمر تھا جب اس کے باپ شہنشاہ ہمایوں کا انتقال ہوا تو نو عمر جلال الدین اکبر اس وقت اپنے اتالیقی بیرم خاں کے ساتھ پنجاب میں تھا۔ وہیں بیرم خاں نے اکبر کی تاجپوشی کی رسم ادا کرائی۔

اس وقت سلطنت مغلیہ کی حالت بہت دگرگوں تھی۔ سکندر لودھی اگرچہ شکست کھا چکا تھا مگر شمالی پنجاب میں اس کے کئی مضبوط قلعے تھے۔ مشرقی صوبوں پر عادل شاہ کا قبضہ تھا۔ وہ چتر میں تھا لیکن اس کا جرنل ہیومن ایک بڑے لشکر کے ساتھ دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

یہ ہندو دنیا بہت مغرور تھا۔ کہنے کو وہ عادل شاہ کا جرنل تھا لیکن وہ کسی کی پروا نہ کرتا تھا۔ اس کے دامان میں ہندوستان میں ایک عظیم ہندو سلطنت کا سودا سامایا ہوا تھا۔ شہنشاہ ہمایوں کی اچانک موت نے اسے ایک سنہری موقع مہیا کر دیا تھا چنانچہ وہ نو عمر شہنشاہ اکبر سے جنگ کرنے کے لیے چل پڑا۔

اس وقت ہند کے دو دارالسلطنت تھے۔ ایک آگرہ اور دوسرا دہلی۔ دہلی میں مخلوق کا گورنر تردی بیگ تھا۔ ہیو بقال سیدھا دہلی پہنچا۔ اس کے پاس ایک بڑا لشکر تھا جس میں افغانوں کی کثرت تھی۔ اس کے علاوہ راجپوتوں کے بہت سے دستے تھے۔ تردی بیگ ہیو بقال کا مقابلہ نہ کر سکا اور شکست کھا گیا۔

ہیو بقال دہلی اور آگرہ پر قبضہ کرنے کے بعد نعل بادشاہ نو عمر اکبر سے آخری معرکہ کے لیے پانی پت کی طرف روانہ ہوا۔

بیرم خاں، اکبر کو لے کر پہلے ہی پانی پت پہنچ چکا تھا۔ اور اس تاریخی میدان میں تقدیر کا فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔

ہیو بقال کا لشکر تعداد میں بہت زیادہ تھا۔ اس کے ساتھ ڈیڑھ ہزار جنگی ہاتھی بھی تھے۔ آخر ۵ نومبر ۱۵۵۶ء کو ہیو بقال اور اکبر کے لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے اور تاریخ کی بدنام جنگ شروع ہوئی جسے پانی پت کی دوسری لڑائی کہا جاتا ہے۔

ہیو بقال نے پہلے اکبر کے سینہ اور میسرہ پر حملہ کیا اور پھر انہیں دبانے لگا۔ آگے بڑھا بیرم خاں ایک انتہائی تجربہ کار جرنل تھا۔ اس نے دشمن کے دائیں اور بائیں دونوں بازوؤں کے حصوں کو روک دیا اور ہیو بقال کے لشکر کی پیش قدمی چند لمحوں کے لیے رک گئی۔

بھاگے کہ پھر کبھی پہلے جیسا عروج حاصل نہ ہو سکا۔
لیکن۔

اس دو سال کے عرصے میں جنوبی ہند، خصوصاً میسور کے علاقے سرنگا پٹم میں بھی چھوٹے بڑے کٹی انقلاب آئے۔ کچھ بوڑوں نے اپنے قد بڑھانے کی کوشش کی اور کچھ قد آوروں کے شعلے جھک گئے۔

اس زمانے میں حیدر علی خاں کے نائب یا سیکرٹری کمانڈے راؤ کو بڑا عروج حاصل ہوا اور وزیر برادران یعنی مندر راج اور دیوراج کا اقتدار گنا گیا۔

مندراج کو اب وزارت سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ راجہ کرشن اوڈیر اور اس کی رانیوں کی آٹے دن کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ اس لیے اس نے وزارت سے خود ہی سبکدوشی حاصل کر لی اور اپنے بھائی دیوراج کے ساتھ سنی منگل چلا گیا جو اس کی جاگیر تھی اور میدیاں پہلے اس کے خاندان کو میسور کے ایک راجہ نے عطا کی تھی۔

منشی مشہور ہے کہ میں کبلی کو چھوڑتا ہوں مگر کبلی مجھے نہیں چھوڑتا۔

مندراج وزارت چھوڑ چکا تھا اور سرنگا پٹم کو خیرباد کہہ کے اپنی جاگیر پر چلا گیا تھا لیکن اس کے دشمن یعنی راجہ کرشن اوڈیر اور اس کی رانیاں اس کا پیچھا چھوڑنے پر آمادہ نہ تھیں۔ رانیوں میں ایک تو مندر راج کی اپنی بیٹی ہارانی مندی تھی اور ایک نئی رانی دیوراجی منی تھی جو مندر راج کے خلیفہ بڑے چڑھ کر کام کر رہی تھیں۔

ان دونوں رانیوں نے راجہ کے کان میں ایک نئی بات ڈالی؛

”ہمارا راجہ مندر راج اگرچہ وزارت سے سبکدوش ہو گیا ہے لیکن وزارت کی سند اور مہر اس کے قبضے میں ہیں۔ وہ کسی وقت بھی وزارت کی سند پر اپنا حق طلب کر سکتا ہے۔“ رانی مندی نے شوشہ چھوڑا۔

راجہ کرشن اوڈیر تو تنہا ہی موٹی مقل کا۔ رانیوں کے یہ سچانے پر وہ بھڑک اٹھا؛

”ہاں۔ یہ تو بڑے دعوے کی بات ہے۔ مندر راج نے وزارت چھوڑی ہے تو اسے سند اور مہر بھی واپس کرنا چاہیے۔ وہ کسی وقت بھی بھگڑا کھڑا کر سکتا ہے۔“

”پھر آپ نے اس کا کیا علاج سوچا ہمارا راج۔“

یہ سوال اس کی نئی رانی دیوراجی منی نے کیا تھا؛

اس لیے کہ ان کے لشکر میں رسد کی کمی ہو گئی تھی اور اب سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ نہ گیا تھا کہ وہ مورچوں اور خندقوں سے نکل کر ابدالی لشکر پر حملہ آور ہوں جو ان کے حملے کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

پس ۱۲۔ جنوری ۱۶۱۱ء کی صبح مرہٹوں نے مجبوراً خندقوں کو چھوڑا اور میدان میں آکر ابدالی لشکر کی طرف بڑھے۔ ابدالی لشکر اس موقع حملے کا منتظر تھا۔ اس نے بھی آگے بڑھ کر تیروں اور تلواروں سے دشمن کا استقبال کیا۔

اس لڑائی میں کسی قسم کا اتفاق نہیں ہوا۔ تمام دن شدید جنگ ہوتی رہی اور پانی پیت کے میدان میں قیامت برپا رہی۔

مرہٹوں کو اپنی طاقت کا بڑا اعظم تھا مگر ان کے سوار ابدالیوں کے ہاتھیوں کا جرمولی کی طرح کٹ کٹ کے گر رہے تھے۔

شام تک لاشوں کے اس قدر ڈھیر لگ گئے کہ سواروں اور پیادوں کا چلنا مشکل ہو گیا مگر یہ لڑائی دوسرے دن تک بھی نہ جاسکی۔ ابدالی تلواروں نے مرہٹوں کو کاٹ کے رکھ دیا اور وہ میدان میں نہ جم سکے۔

ابدالیوں نے بھاگنے والے مرہٹوں کا تعاقب کیا اور دو تریک انہیں مارتے کاٹتے چلے گئے جو ان کے ہاتھوں سے پنج کے نکل گئے انہیں قرب وجوار کے دیاتی کانوں نے خوب خوب قتل کیا جو بکھرے مرہٹے پورے ہندوستان میں اوجھڑتے پھرتے تھے۔ ان سے کوئی خوش نہ تھا۔

مرہٹے سپہ سالار سداشیو راؤ اور پیشوا کا بیٹا وٹھواس راؤ میدان میں کھیت رہے۔ ایک انداز کے مطابق پانی پیت کی اس تیسری لڑائی میں ایک لاکھ مرہٹے مارے گئے اور ان کی طاقت کا جوازہ اٹھ گیا۔ مرہٹوں کی اس شکست فاش کی خبر، اس خبر کے ساتھ پونا پہنچی کہ اس جنگ میں ایک لاکھ مرہٹے کام آئے ہیں جن میں پونا کے پیشوا بالاجی باجی راؤ کا بیٹا وٹھواس راؤ اور بھائی سداشیو راؤ بھی شامل ہیں۔ بالاجی باجی راؤ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکا اور اسی غم میں مر گیا۔



شمالی ہند میں مرہٹوں اور احمد شاہ ابدالی میں ۱۵۹۱ء میں جو آویز شش شروع ہوئی تھی اس کا خاتمہ ۱۶۱۱ء میں اس وقت ہوا جب پانی پیت کے میدان میں مرہٹے ایک لاکھ لاشیں چھوڑ کر ایسے

”نندراج آسانی سے توسل اور مہر میں واپس کرنے سے راہ
”ہاں۔ یہ بات تو ہے!“

راجہ نے رانی کی ہاں میں ہاں ملائی:

”مگر ہم نندراج پر متنی بھی تو نہیں کر سکتے۔ وہ ہمارے سینا بیتی حیدر علی خاں کا دوست ہے
انہیں یہ بات ناگوار گزرے گی۔“

اس وقت نندی کو نہ معلوم کیوں باپ پر ترس آگیا۔ اس نے کہا:

”میرے بچائی میں چاہے کوئی عیب ہو مگر وہ بات کے بہت پکے ہیں۔ انہوں نے وزارت
چھوڑ دی ہے تو وہ اب اس کا بھی دعوے نہیں کر سکیں گے چاہے ان کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے
مہاراجہ کو ان کی طرف سے اطمینان رکھنا چاہیے۔“

رانی دیواجی مٹی تک کے بولے:

”ہمارا نندی کو یہ نہیں معلوم کہ اقتدار کا نشہ جس پر ایک بار چڑھ جائے، زندگی بھر نہیں
اترتا۔ اگر نندراج ایسے ہی بھلے انسان تھے تو انہیں وزارت کی سند اور مہر میں واپس کر کے جانا چاہیے تھا
لگی اب سیدھی انگلیوں سے نکلنا دکھائی نہیں دیتا۔“

رانی: ”میرے باپ پر الزام مت لگاؤ۔“

ہمارا نندی نے باپ کی حمایت کی:

”میں ان کی بیٹی ہوں اور ان کی طبیعت کو خوب سمجھتی ہوں۔“

”اُس میں جھگڑے کی کیا بات ہے ہمارا نانی!“

دیواجی مٹی اڑ کے بولے:

”تمہارے بچائی ایسے ہی دیوتا ہیں تو انہیں بلواؤ اور سند اور مہر میں لے کر ہمارا راجہ کے حوالے
کر دو۔“

اس نے ہمارا نندی پر ایسا حملہ کیا تھا کہ وہ پھنس کے رہ گئی اور اسے کنا پڑا:

”تھیک۔ میں بچائی کو بلوا کے بات کرتی ہوں۔ اس وقت ہمارا راجہ میرے بچا کے خلاف
کوئی قدم نہ اٹھائیں۔“

ہمارا راجہ نے یہ بات مان لی۔

ہمارا نندی نے اپنا ایک خاص ملازم باپ کے پاس سنی منگل بھیجا اور اسے پیغام دیا کہ وہ

باپ سے ایک اہم معاملے میں مشورہ کرنا چاہتی ہے اس لیے وہ فوراً سرنگاپٹم چلے آئیں۔

نندراج کے پاس اپنی بیٹی نندی کا قاصد پہنچا تو وہ حیران رہ گیا۔ اس کی بیٹی نے راجہ کے ساتھ
شاہی کے بعد سے اب تک کسی معاملے میں اس سے مشورہ نہیں کیا تھا۔ اب اسے کیا ضرورت پیش آگئی ہو
وہ اسے اتنی دور سے مشورے کے لیے بلا رہی ہے۔

نندراج نے دیواراج سے مشورہ کیا۔ دونوں بھائیوں نے وزارت چھوڑ دی تھی۔ پھر بھی انہیں
اپنی جان کا خطرہ تو تھا۔

آخر یہ طے ہوا کہ نندراج سرنگاپٹم چلے کر راج محل جانے سے پہلے دیورانی بیٹھ میں حیدر علی سے
ملاقات کرے اور جیسا وہ مشورہ دیں اس پر عمل کرے۔

نندراج نے بیٹی کے قاصد کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ وہ جلد ہی سرنگاپٹم پہنچ رہا ہے۔ قاصد
کے جانے کے دوسرے دن نندراج اپنی جاگیر سے سرنگاپٹم روانہ ہوا۔

حیدر علی خاں اپنے قلعہ ناگہر دیورانی بیٹھ میں تھے۔ انہیں نندراج کے اس طرح اچانک آجانے
سے بہت حیرت ہوئی۔

”وزیر عزیم۔ آپ نے کیوں تکلیف کی۔ کوئی اہم بات تھی تو مجھے بلوایا ہوتا۔“

حیدر علی خاں نے جذباتی انداز میں کہا:

”آپ جب وزیر تھے تب بھی میرے لیے عزیم تھے اور اب بھی آپ پہلے ہی کی طرح میرے لیے
عزیم ہیں۔“

نندراج نے حیدر علی خاں کو گلے لگاتے ہوئے کہا:

”حیدر علی خاں۔ پہلے میں تمہارے لیے محترم شاہنشاہ تم میرے دوست اور مرنی ہو۔ اس وقت
میں تم سے ملنے نہیں آیا ہوں بلکہ میری بیٹی ہمارا نندی نے کسی ضروری گفتگو کے لیے مجھے بلایا ہے۔
میں نہیں جانتا کہ وہ مجھ سے کس قسم کی بات کرنا چاہتی ہے۔ میں نے طے کیا تھا کہ پہلے تم سے ملوں گا۔
اور تم سے رائے لوں گا کہ آیا مجھے نندی سے ملنا چاہیے یا نہیں؟“

ہمارا نندی نے اگر آپ کو بلایا ہے تو ضرور جائے۔ حیدر علی نے جواب دیا:

”جہاں تک میرا خیال ہے آپ کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ پھر بھی اگر آپ ضروری خیال کریں تو

مجھے ساتھ لیتے ہیں۔

نندراج اچیدر علی کی اس پیش کش پر خوش تو ہوا مگر سوچ میں پڑ گیا۔

اسے خطرہ پیدا ہوا کہ اگر وہ حیدر علی کو ساتھ لے گیا تو ممکن ہے ہمارا فی نندی اس سے وہ بات نہ کر سکے جس کے لیے اس نے بلایا ہے۔

نندراج نے بڑے پیار سے کہا،

”تمہاری اس پُر خلوص پیش کش کا بہت بہت شکریہ۔ میرا خیال ہے مجھے ہمارا فی نندی سے تنہا ملنا چاہیے اس لیے کہ ممکن ہے ہمارا فی نندی موجودگی میں مجھ سے وہ بات نہ کر سکے جس کے لیے اس نے مجھے بلایا ہے۔“

ٹھیک ہے وزیر محترم۔

حیدر علی نے مٹھن بوکے کہا:

”آپ بے فکر ہو کہ ہمارا فی نندی کے پاس جلیئے۔ میرے آدمی راج علی کے باہر اندر ہر جگہ آپ کی حفاظت کریں گے اور مزدورت کے وقت وہ کسی بھی علی قدم کے اٹھانے سے گریز نہ کریں گے۔“

اسی شام نندراج نے ہمارا فی نندی سے راج علی میں ملاقات کیا۔ اس ملاقات میں ہمارا جرنلشن اوڈیر بھی موجود تھا۔

ہمارا فی نندی نے بالکل سپاٹ اور کھورے لہجے میں نندراج سے کہا:

”وزیر بابا۔ آپ نے خود ہی وزارت کا عہدہ چھوڑا اور اپنی مرضی سے سرنگا پٹم چھوڑ کر سستی منگلی چلے گئے ہیں۔ ہمارا جہ چاہتے ہیں کہ جب آپ نے وزارت چھوڑ دی ہے تو پھر سید وزارت اور وزارت کی لہریں بھی شاہی خزانے میں جمع کرادیجیے۔“

میرا پنا خیال ہے کہ سندا اور نہر وزارت آپ کے لیے بیکار ہو چکی ہیں اس لیے انہیں اپنے پاس رکھنے سے آپ کو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔“

نندراج نے فوراً سوال کیا:

”ہمارا فی۔ یہ تمہاری خواہش ہے یا ہمارا جہ بھی چاہتے ہیں؟“

ہمارا فی جواب دینا چاہتی تھی کہ راجہ کرشن اوڈیر بل پڑا:

”ہم بھی یہی چاہتے ہیں وزیر نندراج!“

نندراج کو ہمارا جہ کا یہ انداز پسند نہ آیا۔ اس نے کہا:

”اے ہمارا جہ! یہ اسناد آپ کے آباؤ اجداد سے ہمارے بزرگوں کو حاصل ہوئی ہیں۔ انہیں واپس کرنا با خارج از بحث ہے۔ آپ اطمینان رکھیے، کیونکہ اب ہم ان اسناد کے ذریعے کسی شخص کی راہ میں روڑے نہیں اڑکائیں گے۔ ہم نے حکومت کے تمام معاملات سے قطع تعلقی کر لیا ہے اس لیے راجہ ہمارا اپنے دانش مند مشیروں کے مشورے سے جسے چاہیں عہدہ وزارت پر سرفراز کر دیں، ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

یہ کہہ کر نندراج غصے میں بھرا ہوا دواں سے اٹھ کے چلا آیا اور حیدر علی خاں کے پاس پہنچ کر اسے حالات سے آگاہ کیا۔

نندراج اور حیدر علی خاں میں گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ راجہ کرشن اوڈیر کا قاصد آگیا۔ اس نے سلام کر کے کہا:

”ہمارا جہ نے آپ کو سلام دیا ہے اور کہا ہے کہ اگر حیدر علی خاں کچھ دیر کے لیے راج علی تشریف لائیں تو ان کی ہر بانی ہوگی۔ ہمارا جہ کو کسی بات میں مشورہ کرنا ہے۔“

حیدر علی خاں نے نندراج کی طرف دیکھا۔ نندراج نے اسے کچھ اشارہ کیا اور خود قاصد سے دریافت کیا:

”تم راج علی میں کب ملازم ہوئے ہو؟“

”جی میں رانی دیوا جی مٹی کا نوکر ہوں اور انہی کے ساتھ راج علی آیا ہوں۔“ قاصد نے ادب سے جواب دیا۔

اب حیدر علی خاں نے قاصد سے پوچھا:

”تمہیں میرے پاس راجہ نے بھیجا ہے یا رانی دیوا جی مٹی نے؟“

”دونوں نے بھیجا ہے جی۔“

قاصد بالکل بدحواس معلوم ہوتا تھا۔

”صاف صاف کہو۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ حیدر علی نے ذرا تلخی سے کہا۔

”جی میں رانی دیوا جی مٹی کی خواب گاہ کا پریدار ہوں۔“ قاصد نے وضاحت کی:

”میں پہرے پر تھا کہ ہمارا جہ کی کینز مجھے بلا کے اپنے ساتھ لے گئی۔ دواں ہمارا فی نندی،

میدر علی خاں نے چلتے چلتے کہا:
”آپ ابھی جانیے گا نہیں۔ میں ابھی واپس آتا ہوں۔“

میدر علی خاں راج محل پہنچے تو وہی سند اور مہروں کی بات شروع ہوئی۔ راجہ نے کہا:
”دیکھیں ناخیدر علی خاں۔ وزیر سند راج خواہ خواہ کی ضد کر رہے ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں کہ مجھے اب ان سے کوئی کام نہیں لینا۔ پھر انہیں اپنے پاس رکھنے سے انہیں کیا فائدہ ہوگا؟“
”مہاراجہ کرشن اوڈیر۔ آپ سند راج پر کیوں شبہ کر رہے ہیں؟“ حیدر علی خاں نے اسے بھاننے کے انداز میں کہا:

”وہ ٹھیک کہتے ہیں کہ سند اور مہروں ان کے لیے ریکارڈ ہیں۔ وہ ان چیزوں کو محض باپ دادا کی یادگار اور تبرک کے طور پر اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو کسی نے غلط مشورہ دیا ہے۔ سند راج میرے کر مضر، میں ان کی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ آپ بالکل شبہ نہ کریں۔ وہ اس سند اور مہروں سے کوئی غلط کام نہیں لیں گے۔“
راجہ کرشن اوڈیر کے دائیں بائیں اس کی دونوں رانیاں، رانی سندی اور رانی دیواجی مٹی بیٹھی تھیں۔ حیدر علی کے سامنے انہیں بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ان وہ اشاروں ہی اشاروں میں راجہ کو کچھ بھاننے کی کوشش کر رہی تھیں۔
راجہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا:

”حیدر علی خاں ہم نے آپ کو بلوایا تھا کہ اگر آپ سند راج سے کہہ دیں تو وہ انکار نہیں کریں گے۔ ہمارا اور ہمارے رانیوں کا یہی خیال تھا کہ سند راج آپ کی بات بہت جلد ماننے میں آئے۔ آپ سے تو وہ انکار کر ہی نہیں سکتے۔“

حیدر علی نے دیکھا کہ راجہ کے دماغ میں کسی نے یہ ٹھونس دیا ہے کہ اگر سند راج نے وزارت کی سند اور مہروں واپس نہ لیں تو کسی وقت دعویٰ کر کے وہ وزارت پر قبضہ کر سکتا ہے۔
حیدر علی نے ہنسنے شروع کر دیے کہ:

”ٹھیک ہے۔ مہاراجہ کا حکم ہے تو میں سند راج سے کہوں گا کہ وہ سند اور وزارت کی مہروں واپس کر دیں۔“

اور رانی دیواجی مٹی، مہاراجہ سے باتیں کر رہی تھیں۔
میں تھوڑی دیر وہاں کھڑا رہا۔ پھر رانی دیواجی مٹی نے مہاراجہ سے کہا کہ میرا آدمی زیادہ قابل اعتماد ہے۔ اسے ہی آپ حیدر علی خاں کے پاس بھیجیں۔ راجہ نے کہا ٹھیک ہے۔ پھر میں یہ پیغام لے کر آپ کے پاس آ گیا۔“

حیدر علی خاں نے ایک اور سوال کیا:
”تم یہاں کیسے پہنچے۔ کیا اس سے پہلے یہاں آپکے بھو؟“
”جی ہاں۔ میں ایک بار پہلے ہی یہاں آیا ہوں۔“
قاصد نے بتایا:

”رانی دیواجی مٹی نے مجھے مہاراجہ کے ایک آدمی کے ساتھ بھیجا تھا۔ اس نے مجھے یہ جگہ اور مہاراجہ کے تمام بڑے بڑے افراد کے گھر دکھائے تھے۔ رانی دیواجی مٹی کہتی تھیں کہ کیا پتہ تک کسی آدمی سے کوئی کام اڑ جاتا ہے اس لیے تمہیں سب کے پتے معلوم ہونا چاہیے۔“

”اچھا تم چلو۔ ہم آ رہے ہیں۔“
حیدر علی خاں نے اسے رخصت کیا۔ پھر سند راج سے کہا:
”راجہ کی یہ رانی کچھ زیادہ ہی چالاک معلوم ہوتی ہے۔“
”مجھے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔“ سند راج نے جواب دیا:
”اب تم جا رہے ہو تو ذرا اسے ٹھونسنے کی کوشش کرنا۔“
ٹھیک ہے۔“

حیدر علی خاں جانے کے لیے اٹھا:
”یہ تو ظاہر ہے کہ راجہ کرشن اوڈیر اسی سند اور مہروں کے لیے گفتگو کریں گے اور مجھ سے سفارش کرنے کو کہا جائے گا۔“
”مجیب بے وقوف آدمی ہے۔“

سند راج چر گیا:
”سند اور مہروں نہ میرے کام کی ہیں نہ اس کے کام کی۔ معلوم نہیں اسے کون بھڑکا رہا ہے میں نے تو یہ سوچ کے انکار کیا تھا کہ وہ میرے باپ دادا کی نشانیاں ہیں ورنہ مجھے کیا ان چیزوں کا اچاڑ اٹانا ہے؟“

کر دیں جو ہماری ضروریات پوری کرتا رہے۔
 آپ چاہتے ہیں کہ سند راج کی جگہ نیا وزیر مقرر کیا جائے؟ حیدر علی خاں نے راجہ کو
 گھور کے دیکھا۔

”جی ہاں۔“ راجہ نے دبے الفاظ میں کہا:
 ”یہی چاہتے ہیں ہم۔ آپ کو بار بار تکلیف دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔“
 ”ہمارا راجہ۔“

حیدر علی خاں کا لہجہ اک دم سخت ہو گیا:
 ”آپ کو اب تک وزیروں سے شکایت تھی اور آپ ان سے پیچھا پھڑانا چاہتے تھے۔ اب دونوں
 دفاتر دار وزیر استعفیٰ دے گئے ہیں تو آپ پھر ان کی جگہ وزیر مقرر کرنے کی خواہش کر رہے ہیں۔ یہ بات
 میری کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ ایک طرف وزیروں کی مخالفت دوسری طرف نئے وزیر کے تقرر کی خواہش۔
 غجے مہارانی کے روئے پر بھی افسوس ہے کہ وہ اپنے والد کی مخالفت میں اب تک پیش پیش رہی ہیں۔“
 مہاراجہ یا مہارانی کے پاس حیدر علی خاں کی باتوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ سر جھکائے خاموش
 بیٹھے رہے۔

ذرا دیر بعد حیدر علی نے انہیں ٹھوٹا:
 ”راجہ بہادر۔ فرمائیے کہ آپ سند راج کی جگہ کس نئے وزیر کا تقرر چاہتے ہیں؟“
 ”نہیں نہیں حیدر علی خاں۔ آپ ہماری نیت پر شک نہ کیجئے۔ راجہ کرشن اوڈیر نے زور
 دے کر کہا:

”ہم اپنا کوئی آدمی وزیر نہیں بنانا چاہتے اور یہ بھی نہیں چاہتے کہ سند راج کی جگہ جو وزیر بنایا جائے
 اسے سند راج جیسے لامحدود اختیارات دیدیے جائیں۔ آپ اس کی حد ضرور مقرر فرما دیجئے۔“
 ”پھر بھی کوئی نام ہے آپ کے ذہن میں؟“ حیدر علی نے دوبارہ پوچھا۔

دراصل اسے اب تک یہی شبہ تھا کہ راجہ اور رانیوں نے کسی نئے وزیر کا انتخاب کر لیا ہے اور
 اب وہ حیدر علی سے اس کی اجازت چاہتے ہیں۔
 راجہ کرشن اوڈیر دھیمی آواز میں بولا:

”ہم اپنا کوئی آدمی وزیر نہیں بنانا چاہتے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ آپ اپنا کوئی آدمی وزیر مقرر
 کر دیں جو ہماری ضرورتوں کا خیال رکھے اور آپ کو بھی اطمینان رہے۔“

حکم نہیں۔ یہ تو ہماری درخواست ہے حیدر علی خاں۔

راجہ کرشن اوڈیر جلدی سے بولا:
 ”آپ ہمارے فرزند راجہ ہیں۔ ہم آپ کو حکم کیسے دے سکتے ہیں؟“
 حیدر علی خاں جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے:
 ”بس یہی بات تھی۔ اور تو کچھ نہیں کہنا ہے؟“

”نہیں۔ بس یہی بات تھی۔“ راجہ بھی حیدر علی کے ساتھ ہی اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی
 رانیاں بھی کھڑی ہو گئیں۔

راجہ کی بات ختم ہوتے ہی رانی دیو اجمی نے قلم دیا:
 ”تمہارا وہ وزیر۔۔۔۔۔“

راجہ کو جیسے یاد آ گیا۔ اس نے جلدی سے کہا:
 ”ہاں حیدر علی خاں۔ ایک بات اور کرنا ہے۔“

”فرمائیے۔ میں حاضر ہوں۔“

حیدر علی خاں پھر بیٹھ گئے۔

بات یہ کہنا تھی آپ سے۔“ راجہ نے مسند پر بیٹھتے ہوئے کہا:

”وزیر سند راج اور دیو راج تو اپنے عہدوں سے سبکدوش ہو گئے ہیں۔ ہم ہماری رانیاں اور
 محلات کے دوسرے لوگ ان سے اپنی ضرورتیں کہہ دیتے تھے اور وہ پوری کر دیتے تھے۔ ان کے جانے
 کے بعد ہمیں بار بار آپ کو زحمت دینا ہوگی۔ آپ کی فوجی ذمہ داریاں پہلے ہی بڑھی ہوئی ہیں۔ یہ اچھا
 نہیں معلوم ہوتا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے ہم آپ کو تکلیف دیں۔ ہم چاہتے تھے کہ اس مسئلے میں آپ
 ہماری رہنمائی کریں۔ ہماری یہ مشکل کس طرح آسان ہو سکتی ہے؟“

حیدر علی خاں نے اس بات کو تو مہجاری نہ تھا۔ سند راج کے جانے کے بعد شاہی محلات کی تمام
 ذمہ داری اسی پر آتا تھی اور وہ یہ جھگڑا مول لینے کے لیے قطعی طور پر تیار نہ تھا۔ اس نے اس مسئلے میں
 راجہ کو کہہ دیا:

”آپ کے خیال میں یہ مشکل کس طرح آسان ہو سکتی ہے؟“

”ہم یہ چاہتے ہیں۔۔۔۔۔“ راجہ کہتے کہتے اک دم رکا،

”اس مسئلے میں ہماری آپ سے درخواست ہے کہ وزیر سند راج کی جگہ آپ کوئی معقول آدمی مقرر

ٹھیک ہے۔ اسی نام پر غور ہو سکتا ہے لیکن پہلے سند اور مہروں کا قصہ ختم ہو جائے پھر۔“
حیدر علی خاں نے واپس جا کے سند راج کو بتایا کہ راجہ اور رائیں سند اور مہروں کے لیے خدک
رہی ہیں۔ کھانڈے راٹو کے سلسلے میں اس نے سند راج سے کوئی بات نہ کی۔ وہ جانتے تھے کہ وزارت
کا ذکر آئے گا تو سند راج کو رنج ہو گا۔
ایک بات یہ بھی تھی کہ سند راج کھانڈے راٹو کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کا اظہار وہ بر ملا کر چکا
تھا۔

حیدر علی خاں نے سند راج کا عندیہ لینے کے لیے کہا:
”آپ کا کیا خیال ہے وزیر محترم۔ راجہ اور رائیں سند اور مہروں کے لیے اس قدر پریشان
کیوں ہیں؟“
”یہ سر امران کی بے وقوفی ہے۔“
سند راج نے تلخی سے کہا:

”انہیں ڈر ہے شاید میں پھر واپس آ جاؤں گا۔ اچھی کیوں کے۔ اگر مجھے واپس آنا ہوتا تو میں بھلا
جانا ہی کیوں!“
”میرا بھی یہی خیال ہے۔“
حیدر علی خاں نے جواب دیا:
”وہ تو میرے اس طرح سر ہو گئے جیسے سند اور مہروں واپس ملنے سے انہیں کہیں کی ریت
مل جائے گی۔“

سند راج کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اسی نے پوچھا:
”پھر تم نے انہیں کیا جواب دیا؟“
”میں نے صاف جواب دے دیا کہ یہ ان کی مرضی ہے۔ وہ چاہیں تو اپنے پاس رکھ سکتے ہیں اور
چاہیں تو واپس کر دیں۔ میں اس سلسلے میں وزیر محترم پر زور نہیں دے سکتا۔“ حیدر علی خاں نے نرم لہجے
میں دھڑک کر کہا۔

سند راج سنجیدگی سے بولا:
”حیدر علی خاں۔ یہ راج ہٹ ہے راج ہٹ۔ جب تک انہیں سند اور مہروں میں نہیں ملتیں ان کا
کھانا بیہ احترام رہے گا اور یہ روز تھما رہی جان کھاتے اور ناک میں دم کرتے رہیں گے۔ میں سنی منگل

حیدر علی خاں کے دل میں جو شبہ تھا وہ جاتا رہا۔
وہ سوچ ہی رہا تھا کہ راجہ کی نئی رانی نے دخل دیتے ہوئے کہا:
”میسور کے سپہ سالار حیدر علی خاں غصے پہلے سے نہیں جانتے مگر میں انہیں یقین دلاتی ہوں کہ راجہ
چاہتے ہیں کہ وزارت کے عہدے پر اب جو بھی مقرر ہو وہ سپہ سالار میسور کے اعتماد کا اور اعتبار کا
آدمی ہو تاکہ راج محل اور سپہ سالار کے درمیان کبھی کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو سکے۔
اس سلسلے میں میرے ذہن میں ایک نام ہے۔ اگر سپہ سالار اجازت مرحمت فرمائیں تو میں وہ
نام پیش کر سکتی ہوں۔“

حیدر علی خاں کو رانی دیواجی مٹی کی باتیں بڑی کاٹ دار معلوم ہوئیں اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا
کہ راج محل کی سب سے معتقد بیوی نئی رانی دیواجی مٹی ہے۔ پھر اس کا یہ کہنا کہ اس کے ذہن میں ایک
نام وزارت کے عہدے کے لیے ہے، اس نے حیدر علی کو اور زیادہ حیران کر دیا۔
”رانی دیواجی مٹی۔ آپ کے پاس وزارت کے لیے کون شخص ہے؟“ حیدر علی نے رانی کا ذہن پڑھنے
کے لیے سوال کیا۔

”سپہ سالار افواج میسور!“
رانی دیواجی مٹی بڑی متانت سے بولی:
”میں نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ میرے پاس وزارت کے لیے کوئی موزوں شخص ہے۔ میں نے تو یہ
کہا تھا کہ میرے ذہن میں ایک ایسے شخص کا نام ہے جو اسی عہدے کا لائق بھی ہے اور سپہ سالار اس
پر اعتماد بھی کر سکتے ہیں۔“
”چلیے یونی سہی۔“

حیدر علی نے بات ختم کرنے کے لیے کہا:
”رانی کے ذہن میں جو نام ہے اسے ارشاد فرمائیں۔“
”میرے ذہن میں وزارت کے لیے موزوں ترین شخص آپ کا نائب اور فوجدار کھانڈے راٹو
ہے سپہ سالار محترم۔“ رانی نے بڑے اعتماد سے کہا:
”وہ آپ کے آدمی ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ وہ اسی قد رینک ہیں کہ ہماری ضرورتیں پوری کرنے
میں ذرا بھی حیل و حجت نہ کریں گے۔“
حیدر علی نے حیرانی سے رانی کو دیکھا:

جانتے ہی تھیں سب کا غذات بھیج دوں گا۔ تم جا کے ان کے منہ پر مار دینا۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ تمہیں پریشان کریں۔

”جیسی آپ کی مرضی وزیر محترم۔ آپ بھیج دیں گے تو میں ان کے حوالے کر دوں گا۔ ختم ہو جائے گی ان کی یہ منہ۔“

حیدر علی خاں دل میں بہت خوش ہوئے۔ ان کے بغیر کچھ کسے بات اپنے ہی آپ بن گئی تھی۔
نندراج اسی دن واپس چلا گیا۔

چار دن بعد اس نے سند وزارت اور وزارت کی تمامہریں ایک صندوقچی میں رکھ کے حیدر علی کو بھجوا دیں۔

حیدر علی خاں نے سند اور مہریں دیکھنے کے بعد راجہ کرشن اوڈیر کو پہنچا دیں۔ راجہ اور بانیوں سند اور مہریں دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو گئے۔ ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ جب تک نندراج سند اور مہریں واپس نہیں کرتا، اس کے واپس آنے کا خطرہ موجود رہے گا۔

دکن حیدر آباد میں بھائیوں میں آپس میں سازش ہوئی۔
ایک بھائی صلابت جنگ قید ہو گیا۔ باقی دو بھائی یعنی میر نظام علی خاں اور بسالت جنگ ریاست کے حکمران ہوئے۔
دریائے کرشنا کا جزیری حصہ بسالت جنگ کے قبضہ میں آیا۔ اس نے اپنا مستقر ادھونی میں قائم کر لیا۔

پانی پت کے میدان میں جب مرہٹے احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہوئے تو پورے ہندوستان میں ان کی سارکھ ختم ہو گئی۔ صوبہ مراد اصل حیدر آباد کا حصہ تھا جس پر اس وقت گوپال راؤ قبضہ کیے بیٹھا تھا۔ یہ صوبہ بھی بسالت جنگ کے حصہ میں آیا تھا۔
مرہٹوں کی شکست کا حال سن کے بسالت جنگ صوبہ مراد آباد کو آزاد کرانے کے لیے فوج لے کر نکلا۔
اس نے صوبہ مرا کے مشور قلعہ ہو سکوتھ کا محاصرہ کر لیا۔

بسالت جنگ کے پاس فوج تو تھی لیکن وہ فوج جنگ سے واقف نہ تھا اس لیے قلعہ پر قبضہ نہ کر سکا اور محاصرہ طویل پکڑتا چلا گیا۔

اس وقت بسالت جنگ نے حیدر علی خاں سے امداد طلب کی۔
حیدر علی خاں کی نظر میں یہی سراسر پر تھیں۔ وہ فوراً امداد دینے پر تیار ہو گیا۔ چنانچہ دو دنوں میں شراٹھ لے ہوئیں اور محاصرہ ہو گیا۔

اور نشان، نواب بہادر کا خطاب اور مہفت ہزاری کا منصب عطا کیا۔
ادھر تو نواب حیدر علی خاں کو یہ مرتبے اور درجات عطا ہو رہے تھے اور ادھر ہندو مسلم کا سوال پیدا کر کے اس کے خلاف ایک زبردست سازش تیار ہو رہی تھی۔
نواب بہادر حیدر علی خاں نے ہمارا جہ اور راہبوں کی سفارش پر اپنے نائب کھانڈے سے راؤ کو میسور کا وزیر مقرر کر دیا تھا۔

کھانڈے سے راؤ بظاہر جتنا وفادار تھا، باطن وہ اسی قدر بے وفاء اور غدار تھا۔ حیدر علی خاں نے شجاعت اور وفاداری کے پیش نظر اسے ترقی دیتے دیتے اپنے نائب اور سکریٹری بنایا تھا لیکن اس کے ارادے کچھ اور ہی تھے۔
یہ بات بعد میں معلوم ہوئی کہ ہمارا جہ اور راہبوں نے یہ جانتے ہوئے کہ کھانڈے سے راؤ حیدر علی کا بڑے اعتماد کا آدمی ہے، پھر بھی اس کے وزیر مقرر کرنے کی سفارش کیوں کی تھی۔ دراصل یہ کھڑی بہت دوز سے پک رہی تھی۔

کھانڈے سے راؤ نے بڑی محنت سے خود کو حیدر علی خاں کی نظروں میں وفادار ثابت کیا تھا لیکن حقیقت میں وہ ایک کٹر ہندو تھا اور حیدر علی کے بڑھتے ہوئے عروج کو کسی حالت میں برداشت کرنے پر آمادہ نہ تھا۔

کھانڈے سے راؤ نے حیدر علی خاں کا اعتماد تو حاصل کر لیا تھا اور اب اس فکر میں تھا کہ اس کی رسائی کسی طرح راجہ اور راہبوں تک ہو جائے تاکہ وہ راج محل کا بھی اعتماد حاصل کرے اور اپنے ناپاک منصوبے کو آگے بڑھائے۔

ہمارا جہ تک رسائی کے لیے اس نے ایک آسان مگر زبردست نسخہ استعمال کیا۔ کھانڈے سے راؤ کو معلوم تھا کہ ہمارا جہ کرشن اوڈیر شراب و شباب کا رسیاہ ہے۔ شراب کی توجراں محل میں کمی نہ تھی شباب بھی راج محل میں بکھرا پڑا تھا۔ رانی مندی اور رانی دیواجی منی حسن کے معاملہ میں اپنی مثال آپ تھیں۔ ہمارا جہ کی کنیزیں بھی ایک سے ایک بڑھ کے تھیں۔

ان حالات میں بھی کھانڈے سے راؤ نے ہمت نہیں ہاری اور میسور ہی نہیں بلکہ جنوبی ہند کی حسین ترین عورت کو ڈھونڈ نکالا۔

یہ عورت تھی سیتامنی!

دہی سیتامنی جو گنگا رام فوجدار کی داشتہ زہ چکی تھی۔ معمول گھرانے کی اس لڑکی کے دماغ میں یہ

معادے میں مندرجہ ذیل شرطیں رکھی گئی تھیں:

۱۔ قلعہ ہو سکوتھ کے فتح ہونے پر قلعہ کا سامان اور آلات جنگ بمالت جنگ کو ملیں گے۔

۲۔ ہو سکوتھ اور اس کے مضافات حیدر علی خاں کو ملیں گے۔

۳۔ بمالت جنگ دربار دہلی میں سرکاری صوبے داری کے لیے حیدر علی خاں کی سفارش کرے گا۔

۴۔ قلعہ گرم کٹھ جو اب تک حیدر آباد کے ماتحت تھا اب حیدر علی خاں کی ملکیت تسلیم کیا جائے گا۔

معادہ پر دستخط ہونے کے بعد حیدر علی خاں اپنی فوج لے کے بڑھا اور چند دن کے محاصرے کے بعد قلعہ ہو سکوتھ پر حیدر علی کا قبضہ ہو گیا۔

معادہ کے مطابق قلعہ کا سامان اور آلات حرب نواب بمالت جنگ کے حوالے کر دیے گئے اور ہو سکوتھ اور اس کے مضافات ریاست میسور میں شامل کر لیے گئے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ نواب بمالت جنگ نے قلعہ ہو سکوتھ کا سامان اور آلات حرب حیدر علی کے ہاتھ فروخت کر کے نقد رقم حاصل کی تھی۔ حیدر علی خاں مذاق میں نواب بمالت جنگ کو "تاجسہ" لکھا کرتا تھا۔

پانی پت میں مرہٹوں کو شکست ہوئی تو وہ دہلی چھوڑ کے بھاگ گئے۔ فاتح احمد شاہ ابدالی نے شہ عالم ثانی کو دہلی کا تاجدار تسلیم کر لیا اور وہ باقاعدہ محل بادشاہ کی حیثیت سے حاکم ہوا۔

نواب بمالت جنگ نے اس زمانے میں سرکاری صوبے داری کے لیے حیدر علی خاں کا نام تجویز کیا اور بادشاہ ہند سے سفارش کی کہ حیدر علی خاں کو سرکار گورنر تسلیم کیا جائے۔

بظاہر جنوبی ہند کے تمام محلی مقبوضہ علاقوں پر گورنر تعینات تھے مگر یہ گورنر خود مختار بادشاہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ شاہ عالم ثانی نے بمالت جنگ کی سفارش منظور کر لی اور شہنشاہ ہند کا سفیر حیدر علی خاں کے پاس سرکاری صوبے داری کا فرمان شاہی لے کر حاضر ہوا۔

اس کے ساتھ ہی شہنشاہ نے اپنے گورنر کے لیے شمشیر مرصع، سپر مرصع، ہالکی جواہر نگار، نقرہ

اس کے گرد فصیل بنوائی تھی اور فصیل کے برجوں میں توپیں نصب کرا دی تھیں۔

اس عیسیٰ میں تقریباً ۲۰ جانبازوں کا ایک دستہ ہر وقت پہرے پر رہتا تھا۔ یہ جوان حیدر علی کے محافظ تھے اور انھوں نے اپنی جانیں اس کے لیے وقف کر دی تھیں۔

حیدر علی خاں حالات سے بے خبر مستقبل کے منصوبوں میں الجھا رہتا تھا۔ اسے سرکاری صوبیداری بھی مل گئی تھی۔ دہلی دربار میں بھی اس کا نام عزت سے لیا جاتا تھا۔ پانی پت کی تیسری لڑائی میں اگرچہ مرہٹوں کی کمرٹوٹ لٹی تھی لیکن جنوب میں اب بھی ان کی طاقت موجود تھی اور وہ کسی وقت بھی حیدر علی خاں کے لیے خطرہ بن سکتے تھے۔

حیدر علی خاں کو دراصل مرہٹوں کی فکر تھی اور وہ میسور کا دفاع اس قدر مضبوط کر دینا چاہتا تھا کہ مرہٹوں کی اس طرف نظر نہ اٹھ سکے۔

نواب حیدر علی خاں میسور کے مستقبل کی نگرہوں میں گھلے جا رہے تھے اور اس کا ناٹ کھانڈے راؤ مار آستین بن کر انہیں ڈسنے کی فکر میں تھا۔

کھانڈے راؤ نے حیدر علی خاں کے راج محل پر متعین جاسوسوں میں سے دو کا خاتمہ کر دیا اور باقی دو کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ راج محل پر حیدر علی خاں کے چار وفادار کام کر رہے تھے۔ دو مسلمان اور دو ہندو۔ کھانڈے راؤ ناٹب ہونے کی وجہ سے حیدر علی کے بہت سے رازوں سے واقف تھا اور اسے راج محل اور فوجی جھاڑنیوں میں متعین جاسوسوں کے ناموں کا بھی علم تھا۔

کھانڈے راؤ نے سب سے پہلے راج محل کے دونوں مسلمان جاسوسوں کو غائب کر لیا۔ پھر دونوں ہندو جاسوسوں کو ہندو مذہب کے نام پر اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس طرح حیدر علی خاں کا راج محل سے رابطہ ختم ہو گیا۔

مسلمان جاسوس تو غائب ہو چکے تھے، ہندو جاسوس کبھی کبھی دیورانی پیٹھ "جاتے اور حیدر علی کو شب ٹیک ہے" کی خبر پہنچا آتے تھے۔

یہ عمل فوج کے جاسوسوں کا تھا۔ وہاں سے بھی مسلمان جاسوسوں کا خاتمہ کر دیا گیا تھا اور ہندو جاسوس مذہب کے نام پر کھانڈے راؤ کے وفادار ہو گئے تھے اور اب حیدر علی کو راج محل اور فوج کے بارے میں شب اچھا ہے، تم سوا اور کوئی خبر نہ ملتی تھی۔

حیدر علی خاں کو دو ایک بار یہ خیال آیا بھی کہ وہ مسلمان جاسوسوں کے بارے میں پتہ کوٹنے کہ آئندہ انہوں نے دیورانی پیٹھ، نایکوں چھوڑ دیا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے کھانڈے راؤ سے رابطہ قائم کیا تو اسے

بات بیٹھ چکی تھی کہ وہ راج محل کے قابل ہے۔ اس سلسلے میں اس نے ریاست میسور کے فوجدار گنگارام کا سردار ڈھونڈا تھا جس نے اسے اپنی داشتہ بنایا تھا اور اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے راج محل پہنچانے کے لگے گا اور گنگارام بنات کے جوہم میں قتل ہو گیا۔

کھانڈے راؤ کو ان حالات کا علم تھا۔ گنگارام کا انجام بھی اس کے سامنے تھا مگر وہ گنگارام ہی کے نقش قدم پر چل پڑا۔ اس نے سینا سنی کو ڈھونڈا اور پھر ایک شب ہمارا جہ کی ایک کینز کے ذریعے اسے راج محل پہنچا دیا۔ ہمارا جہ کی کینز نے کھانڈے راؤ کو یہ موقع فراہم کیا تھا "اس سے کھانڈے راؤ نے شادی کا وعدہ کیا تھا۔

ہمارا جہ اس سیتامنی کے حسن کو دیکھ کر پاگل ہو گیا۔ اس نے سیتامنی کو چند غلاموں اور کینزوں کا مدد سے ایک الگ محل میں رکھا اور پھر وہاں گاہے گاہے جانا اور دوسری پیش دینا تھا۔

اس طرح کھانڈے راؤ نے ہمارا جہ اور کینز کو اپنے اغما میں لیا۔ اس نے سب پر یہی ظاہر کیا کہ وہ سندھ راج کی جگہ وزیر مملکت ہونا چاہتا ہے۔ چنانچہ سندھ راج کو وزارت سے الگ کر کے اسے دین پروردہ کھانڈے راؤ کا ماتہ تھا۔ سندھ راج کے وزارت چھوڑتے ہی راجہ کی سفارش سے وہ وزیر کے عہدے پر فائز ہو گیا۔

وزیر ہوتے ہی اس نے ماتہ پیر نکالے۔ نواب حیدر علی خاں کا ناٹب ہونے کی وجہ سے میسوری فوج اس کا پہلے ہی اثر تھا۔ وزیر ہونے کے بعد اس نے فوج پر اس طرح کی نہر بانیاں کیں کہ وہ فوج میں پوری طرح مقبول ہو گیا۔

پھر فوج کو آہستہ آہستہ اس نے حیدر علی کے خلاف کر دیا۔ اس کے لیے اس نے ہندو مسلم کاغذ کھڑا کیا اور فوج کے سرداروں کو یہ سبق دیا کہ ایک مسلمان پوری ریاست پر چھٹا چلا جا رہا ہے اور یہی حال رہا تو میسور کی ریاست ایک مسلم ریاست میں تبدیل ہو جائے گی۔

اس کے اس زہر نے فوج میں کام کیا اور پوری فوج حیدر علی خاں سے باغی ہو گئی۔ نواب حیدر علی خاں ان تمام واقعات سے بالکل بے خبر تھا۔ وہ اپنے گھر دیورانی پیٹھ میں اپنے بال بچوں کے ساتھ اطمینان سے دن گزار رہا تھا۔ ریاست میں بظاہر امن و امان تھا۔ دیورانی پیٹھ کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے کہ دیکھنے میں تو یہ ایک بڑی حویلی تھی لیکن حیدر علی نے

نفوں کے لیے تو یہ دنیا ہی ہے اور اسی زندگی کا نام زندگی ہے مگر آپ کا یہ سیوک اور غلام کیا کرے اسے حکم دیا گیا ہے کہ راج محل کی نگین محفوں کو فوراً بند کیا جائے ورنہ آپ کے اس غلام کو وزارت سے ہٹا یا جائے گا۔

اب بتائیے میں کیا کروں؟ حکم نہیں ماننا تو ملازمت جاتی ہے یا پھر باغی کہلاتا ہوں اور اگر حکم ماننا ہوں تو۔۔۔

کھانڈے راؤ خاموش ہو گیا۔

ماراجہ نشے میں دھت تھا۔ اس نے سر اٹھا کر کہا:

”کس نے یہ حکم دیا ہے تمہیں؟ میسور کا راجہ، کرشن اوڈیر ہے۔ یہاں صرف ہمارا حکم چلتا ہے:

”ماراجہ بہادر درست فرماتے ہیں۔“

کھانڈے راؤ گڑ گڑایا:

”ریاست آپ کی ہے۔ ہمارا آپ ہیں مگر سارے اختیارات تو آپ نے اس مسئلے کو دے رکھے ہیں جو اپنے آپ کو نواب بہادر حیدر علی خاں کہتا ہے۔ اس کے قلعہ دیوانی پیٹھ پر پتھر بٹاتا ہے اور تاج دہلی کا پھر برا لہراتا ہے۔“

حیدر علی خاں کے نام پر راجہ کا سارا نقشہ ہرن ہو گیا۔ وہ ایسا خاموش ہو گیا جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

کھانڈے راؤ نے ہمارا کو خاموش دیکھا تو بات آگے بڑھائی:

”ماراجہ بہادر اگر اسی طرح خاموش رہے تو مجھے نواب حیدر علی خاں کے حکم کی تعمیل کرنا ہوگی اور اس محل میں رخصت و سرود کی کوئی عقل منقذ نہ ہو سکے گی۔“

راجہ نے غور نظر سے کھانڈے راؤ کو دیکھا:

”کھانڈے راؤ۔ ان محفلوں کی دہر سے تو ہم نے ریاست کا کاروبار دوسروں کے حوالے کر دیا ہے۔

وہ پھر بھی ہماری محفلوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تو بڑا ظلم ہے۔“

”ماراجہ بہادر۔“ کھانڈے راؤ نے ذرا قہر کر کہا:

”میں اگر کچھ کھوں گا تو آپ کو ناگوار تو نہ ہو گا۔“

ماراجہ کو ذرا حوصلہ ہوا:

”کو کو۔ تم کیا کتنا چاہتے ہو۔ تم ہمارے آدمی ہو۔ تمہاری بات میں قطعی ناگوار نہ ہوگی۔ راجہ نے

بتایا گیا کہ دونوں مسلمان جاسوس کھانڈے راؤ سے لمبی چٹائی کر شمالی ہند گئے ہوتے ہیں حیدر علی اس اطلاع سے مطمئن ہو گیا اور پھر اپنے منصوبوں میں لگ گیا۔

اب کھانڈے راؤ کو راج محل پر اور فوج کے اندر مکمل اختیار حاصل ہو گیا۔ اس کے لیے اسے زیادہ تنگ و دودا اس لیے نہ کرنا پڑی کہ پورا راج محل ہندو تھا اور فوج میں نوے فیصد ہندو لشکر ہی تھے۔ دونوں مقامات پر اس نے روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ راج محل میں ہمارا راجہ اور رانیوں کے بغیر مانگے بہترین مازو سامان، اعلیٰ پارچہ جات، ظروف اور دیگر آرائش کی چیزیں بھجوائیں۔ کینزوں کی تنخواہوں میں سو فیصد اضافہ کر دیا۔ مستقل لشکریوں کی تنخواہوں میں بھی اس نے سو فیصد اضافہ کر دیا۔ راج محل اور فوج اس سخاوت سے خوش ہو گئے اور کھانڈے راؤ کا دم بھرنے لگے۔

اس کے بعد کھانڈے راؤ نے اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے قدم اٹھایا۔

ایک شب جب راج محل میں محفل رقص و سرود برپا تھا۔ ہمارا راجہ شراب و شباب میں کھویا ہوا تھا رانیوں اور دستاؤں کے علاوہ راج محل کی حسین ترین کینز ہمارا راجہ پر پروانہ وار ناثر ہو رہی تھیں۔ کہ کھانڈے راؤ نے راجہ سے سرگوشی میں تخلیک کی درخواست کی۔

ہمارا راجہ اس ارغی جنت کی بہار پر آئی ہوئی محفل کو اجاڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن کھانڈے راؤ کی درخواست ٹال بھی نہیں سکتا تھا۔ وہی توان راج محفلوں کی جان تھا۔ ہمارا راجہ اسے ہر محفل میں بلاتا اور اسے اپنے پہلو میں جگہ دیتا تھا۔

راجہ کرشن اوڈیر نے تخلیک کا حکم دیا تو حسین جبینوں پر نگینیں پڑ گئیں۔ بھلا شباب پر آئی ہوئی اس رنگ و نور کی محفل کو برخواست کرنے کا حکم کس طرح جائز سمجھا جاسکتا تھا۔

رانیوں نے حکم منسوخ کرنے کی درخواست کی۔

کئی جوانیاں ہمارا راجہ پر اس قدر جھک گئیں کہ اس کی آنکھیں صحن بے ماباکی اس ناٹش سے چکاچوند ہو گئیں۔

مگر۔۔۔ ہمارا راجہ، کھانڈے راؤ کی درخواست رد نہ کر سکا اور لڑکھڑاتی جوانیوں اور ڈٹکلاتے شباب کو محفل سے اٹھ کے جانا پڑا۔ صرف ہمارا راجہ کی جائز رانیوں کو ٹھہرنے کی اجازت دی گئی، وہ بھی کھانڈے راؤ کی اجازت پر۔

تخلیک ہونے پر کھانڈے راؤ نے کھڑے ہو کر ہمارا راجہ کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا:

”ماراجہ بہادر۔ میری جان آپ پر صدق ہے۔ ایسی رنگین محفلوں کو بھلا کون روک سکتا ہے۔ ایسی ہی

آ نکھیں ملتے ہوئے کہا۔

کھانڈے راڈ اور تن گیا اور بولا :

"اس تہی دست نائیک نے، جو خود کو آج نواب جیہو علی خاں کہتا ہے، آپ کی ہر بانو، کے میں ترقی کے تمام زینے طے کیے ہیں اور ریاست کے خزانے سے ایک بڑا لشکر تیار کر لیا ہے۔ اس کا یہ اعلیٰ رتبہ آپ کے معاملات میں الجھنیں پیدا کر رہا ہے لیکن آگے جا کر اس سے ریاست کے معاملات بھی الجھ سکتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ غیر قوم کا ایک اجنبی مسلمان، راجہ کی حکومت میں دخل اندازی شروع کر دے اور خواہ مخواہ آپ کے باپ و دادا کی بنائی ہوئی ریاست ہاتھ سے نکل جائے۔ ہاں اگر اس خادم کو اجازت ہو تو اس کے اثر اور اختیار کو کم کرنے کی کوشش کی جائے۔"

راجہ کرشن اوڈیرہ سوچ میں پڑ گیا۔

اس نے بڑی مشکل سے مندر راج اور دیوراج کو وزارت سے ہٹایا اور کوشش کر کے کھانڈے راڈ کو وزیر بنوایا تھا مگر اب حیدر علی اس کی زندگی کی تمام رنگینوں کو ختم کرنے کے درپے تھا۔

اس نے سوچا، کھانڈے راڈ وزیر بھی ہے اور فوجدار ہونے اور حیدر علی خاں کا نائب ہونے کی بنا پر اس کا فوج میں بھی کافی اثر ہے۔ لیکن ہے کھانڈے راڈ، حیدر علی خاں کے اقتدار کا خاتمہ کر دے۔ پھر بھی وہ کوئی حکم دینے سے پہلے کھانڈے راڈ کی طرف سے پوری طرح اطمینان کرنا چاہتا تھا۔

اس نے کھانڈے راڈ سے کہا :

"کھانڈے راڈ، تم گنگا رام کے انجام سے واقف ہو۔ ایسا نہ ہو کوئی غلط قدم اٹھاؤ اور تمہارا انجام بھی گنگا رام جیسا ہی ہو۔"

کھانڈے راڈ نے بڑے جوش سے کہا :

ہمارا راجہ باد۔۔۔ مجھے ہر بات کا علم ہے۔ مجھے حیدر علی خاں کی طاقت کا بھی حال معلوم ہے۔ ریاست کی تمام فوج میرے قبضے میں ہے اور میرے اشارے کی منتظر ہے۔ آپ اجازت دیجیے۔ پھر دیکھیے کہ آپ کا یہ خادم کیا کر رہا ہے؟"

ہمارا راجہ کرشن اوڈیرہ کانوں کا کچا تو تھا ہی وہ کھانڈے راڈ کے فریب میں آ گیا اور اس نے خوش ہو کر کہا :

"کھانڈے راڈ، میں تم پر پورا اعتماد ہے۔ تم ریاست کے بھلے کے لیے جو چاہو، قدم اٹھا سکتے ہو۔"

کھانڈے راڈ کو اجازت ملی گئی۔

راجہ نے اجازت تو دے دی لیکن یہ گھبراہٹ تھی کہ کہیں کھانڈے راڈ دغا نہ کرے کیونکہ وہ

حیدر علی خاں کا نائب تھا۔

ادھر کھانڈے راڈ اپنی جگہ خوش بھی تھا اور گھبراہٹ بھی۔ اسے راجہ کی کمزور طبیعت سے یہ خطرہ تھا کہ راجہ کسی دقت بھی رنگ بدل سکتا تھا۔

دوسرے دن کھانڈے راڈ نے راجہ کو مشورہ دیا کہ :

یہ معاملہ انتہائی اہم ہے اس لیے ہم دونوں کو مندر میں چلا کر اس کی رازداری اور وفاداری کی قسم کھانی چاہیے۔

راجہ بھی شگ و شبہ میں مبتلا تھا۔ اس نے فوراً یہ بات تسلیم کر لی۔ راجہ علی کے احاطہ میں رنگ نہ تھا سو اسی کامندر تھا۔ راجہ اور کھانڈے راڈ دونوں مندر میں گئے اور بت کے آگے دونوں نے رازداری اور حیدر علی خاں کے خلاف کاروائی کی قسم اٹھائی۔

ہمارا راجہ اور کھانڈے راڈ قسم کھانے کے بعد مطمئن ہو گئے۔

راجہ کرشن اوڈیرہ اپنے آپ کو بالکل آزاد اور خود مختار سمجھنے لگا۔ ادھر کھانڈے راڈ نے فوری طور پر مرہٹوں کے مرکز پونا ایک خط تیز رفتاری سے لکھا جس کے ذریعے بھوجایا۔ اس خط کا مضمون کچھ اس طرح تھا :

"حیدر علی خاں جو ریاست کا ایک ادنیٰ مسلمان نوکر تھا، وہ ترقی کر کے ملک و مال پر قابض ہو گیا ہے اور اس قدر مرکز ہو گیا ہے کہ راجہ صرف نام کا حکمران ہو کر رہ گیا ہے۔"

اگر اس دقت اسے نکال باہر کرنے میں تم ہماری مدد کرو تو ہم تمہارے مفرد کردہ سالانہ خراج کے علاوہ لشکر کے اخراجات کے لیے ۵ لاکھ روپے بلا توقف پیش کریں گے۔"

کھانڈے راڈ نے پونا کے پیشوا کو صرف خط نہیں بھیجا بلکہ قاصد کے ہاتھ دو لاکھ روپے بطور نذرانہ بھی بھیجے۔

مرہٹوں کو اگرچہ پانی پت میں شکست ہو چکی تھی اور پونا کا پیشوا بالاجی باجی راڈ اسی حد سے اس مرگیا تھا مگر جب کھانڈے راڈ کا یہ خط اور دو لاکھ روپے کی رقم پیشوا کے بیٹے ماہو لال کو ملی تو اس

نے اسے غیبی مدد سمجھ کے رکھ لیا اور ایک مہرہ لشکر ترتیب دے کر ایسا جی پنڈت پینی کی سرکردگی میں سرنگا پٹم روانہ کر دیا۔
لشکر کی روانگی سے پہلے اس نے کھانڈے راؤ کو مطلع کر دیا کہ وہ فکر نہ کرے، مہرہ لشکر جلد پہنچ رہا ہے۔

نواب حیدر علی خاں اگرچہ بڑا ذہین اور بھدار انسان تھا مگر وہ اعتماد سے دھوکہ کھالیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کھانڈے راؤ جسے اس نے مٹانے سے سونایا تھا، وہ اس کے ساتھ غداری کرے گا۔ کچھ دنوں سے اسے کسی نامعلوم خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔ اس خطرے کے پیش نظر اس نے ایک سوار کو میسوری چھاؤنی میں بھیجا تاکہ وہ یہ پتہ لگائے کہ اس کے دونوں جاسوس کہاں ہیں؟ حیدر علی خاں کے ذاتی محافظ دستے کا سوار جب چھاؤنی میں پہنچا تو اسے فوراً ہی محسوس ہو گیا کہ لشکر کا اسے پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھ رہے ہیں۔

اس نے جب سامان جاسوس کے بارے میں پوچھ گچھ کی تو اسے کسی نے قلمی بخش جواب نہ دیا۔ اور کہہ دیا گیا کہ انہیں کچھ نہیں معلوم۔ پھر جب اس نے حیدر علی خاں کے ہندو جاسوس کے بارے میں دریافت کیا تو ایک لشکر کے منہ سے نکل گیا کہ ان دونوں کو وزیر کھانڈے راؤ نے اپنی ذاتی ملازمت میں لے لیا ہے اور اب وہ دونوں راج محل میں پہرہ دیتے ہیں۔

حیدر علی کے محافظ دستے کے سوار نے جب واپس آ کر اسے حالات سے آگاہ کیا تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

اس کے محافظ سوار نے حیدر علی سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ چھاؤنی کے لشکر سے کوئی امید نہ رکھیں کیونکہ تمام ہندو لشکر ان سے باغی ہو چکا ہے۔

حیدر علی خاں کو یقین ہو گیا کہ اس وقت قسمت اس کا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ اپنے پرانے ہو گئے۔ وہ لشکر جو اس پر جان دیتا تھا آج وہ بھی مذہب کے ناپر دھوکہ دے گیا ہے اور اس سے باغی ہو گیا ہے۔

پھر بھی اس نے خود کو مطمئن کرنے کے لیے ایک غلام کو راج محل بھیجا اور کھانڈے راؤ کو مشورہ

کے لیے اپنے پاس بلوایا۔ بھلا کھانڈے راؤ کیوں آتا وہ تو حیدر علی کو قید کرنے کی فکر میں تھا۔ اس نے قاصد غلام کو ٹال دیا۔

حیدر علی نے دوسری بار یہ پیغام بھیجا کہ بعض انتہائی اہم معاملات میں وہ کھانڈے راؤ سے گفتگو کرنا چاہتا ہے اس لیے وہ تھوڑی دیر کے لیے آجائے۔

کھانڈے راؤ نے اس کے پیغام کے جواب میں حیدر علی کو ان الفاظ سے مطلع کیا:

نواب بہادر حیدر علی خاں!

مجھے راجہ کے پاس سے کہیں جانے کی فرصت نہیں ملتی۔ البتہ اگر

جناب والا خود تشریف لاکر راجہ کی اجازت سے مجھے لے جائیں تو حاضر ہو سکتا ہوں۔

کھانڈے راؤ کے اس تلخ جواب نے حیدر علی کو حالات کی سنگینی کا پورا احساس دلایا۔ ریاستی فوج کی طرف سے وہ پہلے ہی ناامید ہو چکا تھا۔ اب اسے اپنے بچاؤ کی فکر ہو گئی۔

خالی ہاتھوں سے کھانڈے راؤ سے لڑنا خود کو موت کے حوالے کرنے کے مترادف تھا اور دیورانی بیٹھ میں ٹھہرنا بھی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

حیدر علی خاں، کھانڈے راؤ کے تلخ جواب پر بیچ و تاب کھاتا تھا کہ اس کے ایک جاسوس نے کمرے میں داخل ہو کر اطلاع دی:

آقا۔ سرنگا پٹم سے باہر جانے کے تمام راستوں پر کھانڈے راؤ کے فوجیوں کا سخت پہرہ ہے نہ کوئی شہر میں آ سکتا ہے اور نہ باہر نکل سکتا ہے۔ ہر ایک سے پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔ پرندہ پر نہیں مار سکتا۔

اسی وقت حیدر علی کے محافظ دستے کے سردار نے اندر آ کر عرض کیا:

نہر سالار محترم۔ شہر کے حالات بہت خراب ہیں۔ دیورانی بیٹھ پر کسی وقت بھی حملہ ہو سکتا ہے آپ ہمیں ہمارے حالات پر چھوڑ دیے اور اللہ کا نام لے کر کسی طرف نکل جائیے۔ اللہ کو منظور ہوا تو پھر تمہیں گے ورنہ قیامت میں ملاقات ہو گی۔

حیدر علی بڑے حوصلے کا آدمی تھا مگر حالات نے اسے بے بس کر دیا تھا۔ محافظ دستے کے سردار کی رائے اسے معقول معلوم ہوئی مگر وہ اپنے محافظ دستوں کو دشمن کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ شام کا وقت تھا اور سورج غروب ہونے کو تھا۔ حیدر علی فوراً زمان خانے میں پہنچا۔ اس نے نو عمر شہزادے شو

کو سینے سے لگایا۔ پھر بوی سے کہا:

”تمہیں اور شہزادے کو اللہ کی امان میں چھوڑتا ہوں۔ میرا سر لگا بٹم سے جانا ضروری ہے۔ تم لوگ جو صدر رکھنا اور خدا پر بھروسہ کرنا۔ قسمت نے ملایا تو پھر میں گئے۔“

اس کے بعد اس نے بیٹو کو ایک بار پھر سینے سے لگایا اور کہا:

”بیٹو۔ تم شیر کی اولاد ہو۔ گھبراؤ گے تو نہیں؟“

بیٹو نے پیار بھری نظروں سے دیکھا اور کہا:

”بابا! میں کبھی بھی شیروں کے بچے شیر ہوتے ہیں۔ میں بھی شیر ہوں۔“

”شاباش بیٹو۔ فی امان اللہ۔“

حیدر علی خاں اہل و عیال سے رخصت ہو کے باہر آیا۔ محافظ دستے کا سردار اب بھی سر جھکا گئے

بیٹھا تھا۔ حیدر علی نے کہا:

”ہمارے پاس کل کتنے جوان ہیں؟“

”تقریباً تین سو۔“ سردار نے سر اٹھا کر کہا۔

”سب کو تیار ہونے کا حکم دو۔“

”جی۔“ سردار نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔

”یہ ہمارا حکم ہے۔“ حیدر علی نے کہا:

”آب تم جاسکتے ہو۔“

محافظ سردار کو ملوکی حالت میں دروازے کی طرف بڑھا۔

اسی وقت سامنے کا دروازہ ایک آواز کے ساتھ کھلا اور ایک عورت جو کپڑے سے اپنے نہر کو

چھپائے ہوئے تھی، تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ شاید وہ بھاگتی ہوئی آئی تھی۔

وہ سیدھی حیدر علی کے پاس ٹکری۔

”آپ حیدر علی خاں ہو؟“ اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔

”ہاں۔ میں حیدر علی ہوں۔“ حیدر علی خاں نے جواب دیا:

”مگر تم کون ہو؟“

عورت نے جواب دینے کے بجائے کانڈی ایک چٹ حیدر علی خاں کی طرف بڑھادی۔ حیدر علی

بڑھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے وہ چٹ محافظ سردار کی طرف بڑھادی:

”پڑھو۔ اس میں کیا لکھا ہے؟“

اندھیرا پھیل گیا تھا۔ چراغ روشن ہو گئے تھے۔ محافظ سردار نے چراغ کی روشنی میں پڑھا۔

چٹ پر لکھا تھا:

”صبح ہونے سے پہلے اپنا ڈیرا چھوڑ دو۔“

دستخط کی جگہ حرف ”ہمدرد“ لکھا تھا۔

حیدر علی نے زنی سے اسی عورت سے پوچھا:

”خاتون! جبر لانے کے لیے میں تمہارا شکم گزارا ہوں مگر یہ تو بتا دو یہ چٹ تمہیں کس ہمدرد

نے دی ہے؟“

عورت نے چہرے سے ذرا سا کپڑا ہٹایا جس سے اسی کی روشن آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔ اس نے

جواب دیا:

”حیدر علی خاں۔ میں نام بتانے کو رد کا گیا ہے آپ فوراً چلے جاؤ۔“

”نام نہیں بتاؤ گی اس کا؟“

”اس کا نام رانی دیو اجی منجھے۔ ہم بھی کہتا ہے اب چلے جاؤ۔ ابھی چلے جاؤ۔“

اور۔

وہ عورت جس تیزی سے آئی تھی اسی تیزی سے دروازے سے نکل گئی۔ حیدر علی اور محافظ سردار کے

منہ کھلے کھلے رہ گئے۔

کچھ دیر بعد انہیں ہوش آیا تو حیدر علی نے حکم دیا:

”توبیلی اور فضیل کی تمام روشنیاں گلی کر دی جائیں اور یہ معلوم کیا جائے کہ دروازے پر پہرہ

ہونے کے باوجود یہ عورت کس طرح اندر آئی۔“

حیدر علی خاں کی بات ختم ہوئی ہی تھی کہ باہر صدر دروازے کی طرف سے گولی چلنے کی آواز آئی۔

حیدر علی زور سے چیخا:

”صدر دروازہ بند کر دو اور سب کو ہوشیار کر دو۔“

یہ کہہ کر وہ اندر گیا۔ جلدی جلدی جسم پر اسلحہ سجایا اور باہر سہان خانے میں آ گیا۔ وہ کوئی اور حکم

دینے والا تھا کہ دوڑا کسی زخمی کو اٹھائے ہوئے داخل ہوئے۔

”آقا! یہ مظلوم عورت آپ کے پاس فریادے کے آئی تھی۔ اب واپس جا رہی تھی کہ دروازے سے

نکلے ہی کسی نے باہر سے اس پر گولی چلا دی؟

یہ بیان دروازے کے پریدار کا تھا۔

حیدر علی سمجھ گیا کہ مظلوم عورت کا روپ دھار کے اندر داخل ہونے والی یہ عورت وہی تھی جس نے دیواجی رانی کی چٹ اسے پہنچائی تھی مگر واپسی میں دشمنوں نے اسے گولی مار دی۔
"اسے روشنی میں لاؤ۔" حیدر علی نے جلدی سے کہا؛

"کیا زندہ ہے؟"

عورت مظلوم تھی یا نہیں مگر حیدر علی کی نظر میں اب وہ مظلوم بھی تھی اور قابلِ احترام بھی وہ دیواجی رانی کی چٹ لے کے آئی تھی جس نے اس کے تمام اندیشوں اور دوسو سو کو بیٹھن میں بدل دیا تھا۔ وہ اسوقت دشمنوں میں بری طرح گھر گیا تھا۔

"آقا خاموش کہ یہ عورت مر چکی ہے۔ گولی سیدھی سینے میں لگی ہے۔" پہرے دار روشنی لیے عورت پر جھکا ہوا تھا۔

حیدر علی خاں کو بھی اس کا مدہم ہوا۔ وہ زندہ ہوتی تو یہ تو مظلوم ہو جاتا کہ اس نے اتنی جرأت کیوں کی اور اس کی اہلیت کیا تھی؟

حیدر علی بھی عورت پر جھکے مگر جب ان کی نظر مرنے والی پر پڑی تو وہ چونک پڑے؛
"سیتا منی۔" انہوں نے جیسے خود سے کہا۔

پھر انہوں نے سیدھے ہو کر کہا؛

"یہ یقین کرنے کے بعد کہ یہ عورت واقعی مر چکی ہے، اسے گڑھا کھود کے دفن کر دیا جائے اور تمام لوگ تیار ہو کے یہاں جمع ہو جائیں۔"

حیدر علی سخت پریشان تھے۔ ان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ سیتا منی جسے کھانڈے سے راؤ نے ہمارا جہر کو رام کرنے کے لیے محل میں پہنچایا تھا، اس نے اتنا اہم کام کیوں کیا؟

سیتا منی کو ان سے ہمدردی کیوں پیدا ہوئی؟

پھر دیواجی منی بھی اس کے خلاف تھی۔ اس نے کھانڈے سے راؤ کی سفارش کی تھی اور اب اس کے خلاف (حیدر علی) کو چٹ بھیج کر خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔



وہ بڑی پُر ہول رات تھی۔

سخت تاریکی اور آسمان سے برستا ہوا اہم پانی۔ اس پر بجلی کی چمک زنی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد بادل گرجتے بھرنے لگے چمکتے اور دُور تک روشنی کی لہر دوڑاتی۔

اشجار دیو دیو کی طرح جھومتے نظر آتے۔ انسان اور جانور سب ہی اپنے اپنے ٹھکانوں میں دبکے بیٹھتے۔ دریا نے گاؤں کی پورے جوشش پر تھا۔ پانی اس کے کناروں سے نکل کر طغیانی کی صورت اختیار کر چکا تھا۔

مگر —

شدت کی اس بارش کے باوجود حیدر علی خاں اور اس کے تین موصاحب دشمنوں کا محاصرہ تو ترک نہ کیا۔ دیوارانی پیٹھ سے نکلے اور جانوں کی پروا نہ کرتے ہوئے دریا نے گاؤں کی پورے پورے۔

حیدر علی خاں کی دیوارانی پیٹھ کی رائٹس گاہ کا عاصم کھانڈے سے راؤ اور مرہٹوں کی فوجوں نے مل کر کیا تھا۔

یہ وہی کھانڈے سے راؤ تھا جو پہلے حیدر علی خاں کا نائب اور سیکرٹری تھا اور حیدر علی خاں نے جسے انکار کا آڑی سمجھتے ہوئے میسور کے راجہ کرشن اوڈیر کا وزیر مقرر کیا تھا۔

حیدر علی کے خلاف یہ سازش بڑی زبردست تھی۔ کھانڈے سے راؤ نے راجہ اور رانیوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ فوج کو بھی اس نے اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ پھر اس نے راجہ سے حیدر علی کے خلاف یہ کارروائی کرنے کی اجازت مانگی۔

راجہ نے یہ سوچتے ہوئے کہ وزیر برادران کا تو خاتمہ ہو گیا ہے۔ اب اگر حیدر علی خاں کا نائب بھی درمیان سے نکل جائے تو وہ بالکل آزاد ہو جائے گا، اجازت دے دی۔ تب کھانڈے سے راؤ نے دو لاکھ کا رقم پیش کی مگر یہ فوجوں کو مرنگا پٹم بلایا۔

مرہٹہ فوجیں مرنگا پٹم میں داخل ہوئیں تو کھانڈے سے راؤ نے حیدر علی خاں کی رائٹس گاہ دیوارانی پیٹھ کا محاصرہ شروع کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ حیدر علی نے اپنی رائٹس گاہ کو قلعہ میں تبدیل کر رکھا ہے اسی لیے اس نے فیصل اور برجوں پر توپیں چڑھا دی تھیں۔ اس لیے کھانڈے سے راؤ نے بڑی خاموشی سے محاصرہ شروع کیا تھا۔

مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے!

حیدر علی خاں کو اپنے جاسوسوں سے محاصرے کی خبر مل گئی تھی مگر باہر جانے کے تمام راستوں پر

کھانڈے راڈ نے سخت پھر لگا دیا تھا۔

سب طرف سے مجبور ہو کر اس نے ایک طوفانی رات میں اپنے تین سوجاؤں کے ساتھ دریائے کادیری کا رخ کیا۔

یہ وہی رات تھی جب راج محل سے رانی دیواجی مہنی نے سیتامنی کے ذریعے حیدر علی خاں کو رنگا پٹم بھیج دینے کی تاکید کی تھی اور غریب سیتامنی واپسی پر کھانڈے راڈ کے اس گشتی دستے کی گولی کا نشانہ بن گئی تھی جو حیدر علی خاں کے گرد گھیر ڈالنے کے انتقامات میں مصروف تھا۔

اسی رات حیدر علی خاں اپنی جھولی کی پشت کے دروازے سے ۲۰۰ جوانوں کے ساتھ نکلا۔ ہر طرف طوفانِ باد و باران کا راج تھا۔ حیدر علی اور اس کے ساتھی طوفان کے تھیرے کھاتے دریا ئے کادیری کے کنارے پہنچے اور ان سب نے اللہ کا نام لے کر بخود کو دریائے کادیری کی طوفانی لہروں کے حوالے کر دیا۔ ہر چند کہ دریا کی منہ زور لہریں حیدر علی اور اس کے ساتھیوں کے منہ پھرے دیتی تھیں مگر یہ لوگ مردانہ وار لہروں سے لڑتے بھڑتے دریا پار کر گئے۔

حیدر علی خاں نے ایک ٹم بھی ضائع نہ کیا اور مرنگا پٹم سے نکلنے کے بعد اپنے جوانوں کے ساتھ حیدر بنگلور پہنچے۔

حیدر علی خاں نے بنگلور پہنچ کے وہاں کے ماتحت پایگا ر دن اور قلعہ داروں کو اپنی فوجیں لانے کا حکم دیا۔ بنگلور والوں کو میسور اور مرنگا پٹم کے حالات کا کچھ علم نہ تھا۔ ان کے خیال میں حیدر علی سپہ سالارِ افواجِ میسور تھا اس لیے انہوں نے فوراً اپنی فوجیں اکٹھی کر کے حیدر علی کے حوالے کر دیں۔

حیدر علی خاں بنگلور کے مابو کار دن سے بھی پچاس لاکھ روپیہ خرچ کیا اور اسی وقت فوجی بھرتی شروع کر دی۔ ساتھ ہی میر رضا علی خاں کو بنگلور بلوایا۔

مرنگا پٹم میں حیدر علی خاں کے فرار ہونے کی خبر دوسرے دن صبح کو اڑی۔ مرہٹے اور کھانڈے راڈ ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر رہ گئے۔

کھانڈے راڈ نے راجہ کے حکم سے اپنے سپہ سالار کو نیری راڈ کو بنگلور پر حملے کے لیے بھیجا۔ حیدر علی کے سر کا انعام بھی شتر کی لگائی مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ کھانڈے راڈ نے دیورانی پیٹھ پر حملہ کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہاں سخت مقابلہ ہو گا مگر وہاں کی قومیں خاموش رہیں اور کھانڈے راڈ نے دیورانی پیٹھ پر قبضہ کر کے حیدر علی خاں کے اہل خانہ، جن میں شہزادہ ٹیپو بھی تھا، قید کر دیا۔

مرہٹے اور کھانڈے راڈ کا سپہ سالار کو نیری راڈ اپنی فوج کے ساتھ بنگلور پہنچا۔ حیدر علی خاں کو ان کے آنے کی خبر ہوئی تو وہ قلعہ بنگلور سے باہر نکلا۔ صف بندی کی اور مرہٹوں اور کو نیری راڈ کے لشکر پر ٹوٹ پڑا۔

مشورہ ہے کہ دن بھر جنگ ہوتی رہی۔ حیدر علی اور کو نیری راڈ دونوں کو معلوم تھا کہ اس جنگ پر ان کی قسمتوں کا دار و مدار ہے اس لیے دونوں لشکر جی چھوڑ کر لڑے۔ اور مرنے والوں کے پشتے لگ گئے!

مصنف حیدر علی نے اس جنگ کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ اس طرح ہے:

’دونوں مابھارت دیں جیسے ساون بھادوں کے گھنگورو۔‘
طرف سے آئے ہیں، ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں۔ پہلے تو دوسرے گویاں اور گولے، ٹم گولے کی طرح دونوں طرف سے برسے گئے۔ گولوں کی گڑ گڑاہٹ اور گولیوں کی کڑکڑاہٹ بادل کی گرج اور مد کی کڑک تھی۔ رنجک کاڑھا اور متابی کا پھٹکا، برق کی جھلک اور بجلی کی چمک، دھواں دھواں توپوں کے ہنگامے محشر کا پدیدار (منظر) تھا اور دھک سے اس کے زلزلت الارض، آشکارا جب دونوں فوجیں لڑتے لڑتے نزدیک آئیں اور زبوت کو تہ براق کو پہنچی تو تیغ و تبر، خنجر، جھڑ، پستول، طینے، بھڑی، گٹاری، بھالے، برحق کی بو بھاری چلتی تھیں اور خون کی پھیاریں اڑتی تھیں۔ ایک لمحے میں خون کی ندیاں نالے بہنے لگیں۔ باقی گھوڑے، اونٹ، گاؤ، بچھڑے مادی کے مانند اس میں نظر آتے تھے۔ فیلوں کے سر جاب کے مانند تیرتے پھرتے تھے اور کشتیوں کے مانند لاشیں موجوں کے مارے بہ بہ کے کنارے گلتے تھے۔ آخر کار نواب رستم شوکت اسفندیار صولت نے میسور کے لشکر کو ’مزیت فاش دی‘۔

اس شکست کی خبر جب مرنگا پٹم پہنچی تو راج محل میں کھرام چل گیا۔ مرہٹہ سردار ایاجی اور کھانڈے راڈ میں کسی نے بیوقوفی کے لیے گفٹ کو شرم نہ ہوئی۔

اس فتح کا حال جب وزیرِ ندر راج کو معلوم ہوا تو وہ بہت خوش ہوا۔ ایک روایت کے مطابق حیدر علی نے نندر راج کو اطلاع دی کہ کھانڈے راڈ ریاست کو مرہٹوں کے ہاتھ فروخت کرنے کی سازش کر رہا ہے اس لیے وہ اس معاملے میں دخل دیں۔

وزیر نندراج نے اسی وقت مرہٹہ سردار ایسا جی کو ایک خط لکھ جس میں تحریر تھا :

"حیدر علی خاں ریاست میور کا ایک عمدہ دار ہے اور اس کا ریاست پر بہت حق ہے۔ کھانڈے راڈ، حیدر علی خاں کا ملازم ہے اور اس نے بغاوت اور کرکشی اختیار کی ہے۔ اس کے پیش نظر تمہارے لیے یہ مناسب نہیں کہ تم ہماری ریاست کے معاملات میں مداخلت کرو ورنہ صرف اپنی چوتو (خراج کی رقم) وصول کرنے کی فکر کرو اور واپس چلے جاؤ۔"

مرہٹہ سردار شکست کے بعد اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا۔ اسے سند راج کا خط ملا تو اس نے صرف رقم کا مطالبہ کیا۔

حیدر علی کے پاس نقد رقم نہیں تھی اس لیے انہوں نے "بارہ محل" کا علاقہ مرہٹوں کے نام لکھ دیا۔ مرہٹہ سردار نے اسی کو غنیمت جانا اور ہنگو راوہ مرنگا پٹم سے کوچ کر گیا۔

مرہٹوں کو بارہ محل کا علاقہ لکھ دیا گیا تھا مگر یہ تحریر کاغذوں ہی تک محدود رہی اور مرہٹوں کو یہ علاقہ کبھی نہیں ملی سکا۔

مرہٹوں سے جان بچانے کے بعد حیدر علی خاں نے سرنگا پٹم پر تو جبر کیا۔ اس نے اس سلسلے میں میرزا علی خاں سے مشورہ کیا۔ باہم مشورہ میں یہ طے پایا کہ سرنگا پٹم پر حملہ کر کے کھانڈے راڈ کا خاتمہ کیا جائے تاکہ ریاست میں امن و امان بھلے ہو۔

حیدر علی خاں نے اس مشورہ پر ابھی قدم نہیں اٹھایا تھا کہ انہیں سرنگا پٹم کے راج محل سے رانی دیو جی منی کا ایک خط وصول ہوا۔ یہ خط راج محل کا ایک ناصد لے کر آیا تھا۔

خط میں حیدر علی کو لکھا گیا تھا :

"ملک کی بد انتظامی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ قریب ہے کہ ریاست ہمارے

ہاتھ سے چھن کر مرہٹوں کی عداوت میں چلی جائے۔ اس لیے ہمیں اس تباہی

سے بچانے کے لیے آپ کا مرنگا پٹم پہنچانے کا ضروری ہے۔"

حیدر علی کے لیے اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بدظنیت کھانڈے راڈ کو مزادینے کے لیے مرنگا پٹم کی طرف بڑھے۔ پس حیدر علی خاں کو ڈشک کے ساتھ سرنگا پٹم کی طرف بڑھا۔ راستہ میں نندراج کی جاگیر بڑھتی تھی۔ وہاں ٹھہر کر حیدر علی نے نندراج کو تمام احوال سے آگاہ کیا اور اس سے مشورہ کیا۔ اس نے بھی سرنگا پٹم پر چڑھائی کا مشورہ دیا۔

حیدر علی نے سرنگا پٹم پہنچنے ہی راج محل پر گولہ باری کا حکم دے دیا۔ بدظنیت کھانڈے راڈ راج محل میں چھپا بیٹھا تھا اور راجہ کی خوشامد مگر رہا تھا کہ حیدر علی سے اس کی جان بخشی کرادی جائے۔

راج محل پر گولہ باری شروع ہوئی تو سب کی عقل ٹھکانے آ گئی۔ رانیوں نے دونا پیشینہ شروع کر دیا۔ رانی مندی اپنی کینزوں کو لے کر محل سے نکلی اور حیدر علی کے کیمپ میں پہنچ گئی اور اس سے معافی کی خواہش گار ہوئی۔

رانی مندی، حیدر علی کے محسن وزیر نندراج کی بیٹی تھی۔ اس نے کھڑے ہو کر رانی مندی کا استقبال کیا اور اس کی بہت خاطر مدارات کی۔

رانی مندی نے حیدر علی سے راج محل پر گولہ باری بند کرنے کی درخواست کی۔ حیدر علی نے فوراً گولہ باری بند کرادی مگر راجہ کرشن اوڈیر سے کھانڈے راڈ کی حوالگی کا مطالبہ کیا۔ راجہ اوڈیر جیلے جانے کرنے لگا۔ حیدر علی خاں نے سختی کی اور محل کو گھیرے میں لے کر تمام دربانوں اور ہریداروں کو ہٹا کر ہر جگہ اپنے لشکر کی مقرر کر دیے۔

جب راجہ اوڈیر کے پاس کوئی چارہ نہ رہا تو اس نے حیدر علی سے درخواست کی کہ وہ کھانڈے راڈ کو حوالے کرنے پر تیار ہے۔ بشرطیکہ حیدر علی اسے قتل نہ کرے۔

حیدر علی نے راجہ کو زبان دی اور کھانڈے راڈ کو قتل نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ پھر اس کے آدمیوں نے کھانڈے راڈ کو محل کے دروازے پر گرفتار کر کے حیدر علی کے سامنے پیش کیا۔ کھانڈے راڈ دوسرے سے پریٹک کاپ رہا تھا۔

"ہم نے تمہیں قتل نہ کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ تم اطمینان رکھو۔ تمہیں قتل نہیں کیا جائے گا۔ کوئی جسمانی تکلیف بھی نہیں دی جائے گی لیکن تم نکل حرامی اور بغاوت کی مزا سے نہ بچ سکو گے۔"

یہ کہنے کے بعد حیدر علی نے ایک قدم اڑا کر بے جا بھڑکتا کرنے کا حکم دیا۔

پتھر تیار ہوا۔

اور —

نمک حرام کھانڈے راڈ کو اس پتھر سے میہ بند کر کے معقل کر دیا گیا۔

اس کی عذہ اودھ اور چاول مقرر ہوئی۔ حیدر علی خاں اسے دیکھ کر اکثر اپنے درباریوں سے کہا کرتے تھے،

"یہ میرا طوا ہے۔ میں اسے پال رہا ہوں۔"

کھانڈے راؤ دودھ چاول کھا کھا کر بھلا اور بد وضع ہو گیا۔ بجنرے میں رہتے رہتے اس کا جسم بہت موٹا ہو گیا۔ لوگ اسے دوردور سے دیکھنے آیا کرتے تھے۔ حیدر علی اس کا بجنرہ سفر و حضر میں ساتھ رکھا کرتے تھے۔

کھانڈے راؤ اپنی موت تک اس بجنرے میں قید رہا!



کھانڈے راؤ کو لوہے کے بجنرے میں بند کر کے لٹکا دیا گیا۔
اسی کو یہ سزا اس کی نمک حرامی اور غداری کی وجہ سے دی گئی۔ حیدر علی خاں نے اسے ترقی دے کر پہلے اپنا نائب مقرر کیا۔ پھر میسور کے راجہ کرشن اوڈیر کا وزیر بنا دیا۔ فوجدار کا عہدہ پہلے ہی سے اسی کے پاس تھا۔ وزارت پلتے ہی کھانڈے راؤ کو شیطان نے گھیرا اور وہ نمک حرامی پر آمادہ ہو گیا۔

کھانڈے راؤ نے پہلے راجہ کرشن اوڈیر کو حیدر علی کے خلاف درغلیا اور اس کو یہ تاثر دیا کہ ایک مسلمان آہستہ آہستہ ریاست میسور پر قابض ہوتا جا رہا ہے اور اگر اسے روکا نہ گیا تو پھر حالات قابو سے باہر ہو جائیں گے۔

راجہ اوڈیر سدا کا بدھو اور کم عقل تھا۔ وہ اس کے بہکاوے میں آ گیا اور کھانڈے راؤ کو حیدر علی کے خلاف کاروائی کی اجازت دیدی۔

بد بخت کھانڈے راؤ نے پلے کے مرہٹہ پیشوا کو ایک معقول رقم ارسال کی اور اس سے حیدر علی کے خلاف فوجی مدد طلب کر لی۔

حیدر علی اپنے نائب پر بڑا اعتماد کرتا تھا۔ اسے کھانڈے راؤ سے کسی دغا بازی کی امید نہ تھی۔ چنانچہ وہ اعتماد سے ارکھا گیا۔ اسے اصل حالات کا علم اس وقت ہوا جب مرہٹہ فوج سرنگاپٹم پہنچی۔
کھانڈے راؤ نے مرنگاپٹم سے باہر جانے والے تمام راستوں پر اپنی فوج لگا دی تھی اور اپنے

خیال میں حیدر علی کو ہر طرف سے محصور کر لیا۔
لیکن

مشور ہے کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے!

حیدر علی اپنی قلعہ نما حویلی میں تھا اور اس کے پاس ۳۰۰ آدمی تھے۔ اس کے بیوی بچے بھی گھر ہی میں تھے مگر وہ مرد میدان اندھیری رات اور باد و باران کے طوفان میں حویلی سے نکللا اور میدانے کا دیری پر پہنچ گیا۔

دربار آنکھیں دکھا رہا تھا اور اس میں سیلابی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ حیدر علی نے خوف دہراں کو سر جھٹک کر دور کیا اور اپنے ساتھیوں سمیت دربار میں اتر گیا۔ وہ موجوں سے ٹٹا ٹھٹرا دوسرے کنارے پر پہنچا اور صرف ۲۰ گھنٹہ میں جنگ لڑ چکا گیا۔
حیدر علی کو اتنا ہی وقفہ کافی تھا۔

اسی نے دوڑ و دوپ کے بنا شکر تیار کیا۔ پھر سرنگا پٹم کی طرف بڑھا۔

ادھر بوکھلایا ہوا کھانڈے راؤ اور مرہٹے جنگجو پر حملہ کیے آ رہے تھے۔ حیدر علی نے ان پر ایسا زبردست حملہ کیا کہ وہ زیادہ دیر میدان میں نہ جم سکے اور جاگ کھڑے ہوئے۔

حیدر علی یخاڑ کرتا ہوا سرنگا پٹم پہنچا اور اس نے راج محل کا محاصرہ کر کے گولہ باری شروع کر دی۔ کھانڈے سے راؤ محل ہی میں موجود تھا۔

راج محل پر گولہ باری سے چیخ و پکار اور قیامت مچ گئی۔ راینوں نے قاصد بھیج کر حیدر علی سے گولہ باری بند کرنے کی درخواست کی۔

حیدر علی کا مقصد محل والوں کو جان سے مارنا نہیں تھا بلکہ یہ احساس دلانا تھا کہ دشمنوں کی سازشیں ناکام ہو چکی ہیں اور خدا دیوں کی طاقت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

راج محل پر گولہ باری بند کر دی گئی۔

حیدر علی نے طالبہ کیا کہ فساد کی جڑ اور سازشی کھانڈے راؤ کو اس کے حوالے کیا جائے۔

کھانڈے راؤ ایک ایک رانی کے سامنے ہاتھ جوڑتا اور اپنی زندگی کی بھیک مانگتا تھا مگر اسے کون بچا سکتا تھا۔ نہ راجہ اوڈیرہ اس کی کوئی رانی۔

حیدر علی خاں نے کچھ دیر کھانڈے راؤ کی حواگی کا انتظار کیا پھر راج محل قاصد روانہ کیا کہ اگر فوری طور پر کھانڈے راؤ کو اس کے حوالے نہ کیا گیا تو راج محل کو زمین بوس کر دیا جائے گا۔

قاصد نے جس وقت راجہ کرشن اوڈیرہ کو یہ پیغام دیا کھانڈے راؤ اس وقت راجہ کے پیروں سے پٹا کر گر مار رہا تھا:

”جھے بچا لیجیے ہمارا راج۔ حیدر علی خاں کے حوالے نہ کیجیے مجھے!“

اس کیفیت میں راجہ کو حیدر علی کا آخری پیغام ملا۔ اسے پہلے ہی پسینے آ رہے تھے۔ حیدر علی سے وہ خود بھی شرمندہ تھا۔ کھانڈے راؤ کے ہٹکاوے میں آکر وہ بھی حیدر علی کے خلاف ہو گیا تھا لیکن کھانڈے راؤ کی طاقت باندی کا اباں تھی۔ مرہٹوں سے مدد حاصل کرنے کے باوجود اسے شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور اب اسے جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔

راجہ کرشن اوڈیرہ کو اس پر اس قدر غصہ تھا کہ جب اس نے راجہ کے پیر پکڑ کر اس سے جان بخشی کرانے کی درخواست کی تو راجہ نے اسے ٹھوکر مار کر قدموں سے دور کر دیا:

”تو کیمنہ ہے۔ تجھے مرنا ضرور ملنی چاہیے۔ تو نے حیدر علی خاں کی نظروں میں مجھے بھی ہمیشہ کے لیے ذلیل کر دیا!“

راجہ کو اس پر کوئی رحم نہ آیا مگر رانیاں اور محل کی دوسری عورتیں نہ رہ سکیں۔ ان کے دل پیسج گئے اور انہوں نے راجہ کو مجبور کیا کہ وہ حیدر علی سے کھانڈے راؤ کی جان بخشی کی سفارش کرے۔ آخر راجہ نے حیدر علی کے قاصد سے کہا:

”نواب حیدر علی خاں کو میری طرف سے درخواست کرنا کہ ہمارا جیسیور رانی صاحب سے بہت شرمندہ ہیں اور انہوں نے درخواست کی ہے کہ کھانڈے راؤ پر رحم فرماتے ہوئے اسے موت کی سزا نہ دی جائے۔“

اس طرح کھانڈے راؤ کی جان تو بچ گئی مگر حیدر علی خاں نے حکم دیا:

”کھانڈے راؤ کو لوہے کے قد آدم بجڑے میں بند کر کے لٹکا دیا جائے۔ اس کی غذا دودھ چاول مقرر کی جاتی ہے۔“

کہتے ہیں کہ اس غدار کو لوگ دور دور سے دیکھنے آتے اور عبرت حاصل کرتے تھے۔

دوسرے دن حیدر علی خاں اپنی بیوی کے ایک دستے اور چند افراد کے ساتھ راج محل پر گئے تاکہ دروازوں اور راستوں پر فوجی پہرہ لگا دیا گیا۔

سے نکلا ہوا یہ جملہ رانیوں کا رٹایا ہوا تھا۔
مگر۔

حیدر علی نے راجہ کی معذرت کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ کینزوں سے کہا:
”سب لوگ جا کے آرام کریں۔ صرف فوجی سردار ہمارے ساتھ رہیں۔“
راجہ، تمام رانیاں اور کینزس سر جھکائے واپس ہو گئیں۔

حیدر علی خاں دونوں بیٹوں اور سرداروں کے ساتھ دربارِ ملی میں جا بیٹھے۔ پھر انہوں نے تحائف
کے وہ خزانے منگوائے جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ انہوں نے خزانوں کو دہاں موجود کینزوں کے حوالے کیا
اور ایک کینز سے کہا،

”راجہ اوڈیرہ کو یہ تحائف پہنچا دو اور اسے پیغام دو کہ ہم اسے معزول نہیں کرتے لیکن اب وہ صرف ایک
آئینی حکمران رہیں گے۔“

ان سے یہ بھی کہو کہ چونکہ راجہ ریاست کے انتظامات سے غافل رہے ہیں اس لیے ریاست کے
مضامین وہ خود کو ریاستی انتظامات سے سبکدوش سمجھیں۔ ان کے اخراجات کے لیے تین لاکھ کی جاگیر عطا
کی جاتی ہے۔“

اس طرح راجہ اوڈیرہ کی آئینی حیثیت برقرار رکھی گئی اور حیدر علی خاں نے ریاستی انتظامات اپنے ہاتھ
میں لیے۔

یوں ہی حیدر علی خاں کو دربارِ دہلی سے صوبہ سرحد کی گورنری کا پروانہ معہ طبل و نشان اور منصب دیا
گیا تھا اور ریاست میسور اسی صوبہ کے ماتحت تھی اس لیے حیدر علی خاں اگر میسور کی عتباتِ حکومت راجہ سے
نہ بھی حاصل کرتے تو بھی میسور انہی کے ماتحت رہتا۔

چونکہ گورنری حیثیت سے صوبہ سرحد کا انتظام بھی انہی کے سپرد تھا، چنانچہ حیدر علی نے سرحد کے
نظم و نسق کی طرف توجہ دی۔ فتنہ پرور ماکوں کو معزول کیا۔ مکار اور بد معاملہ مشینوں پر جرمانے عائد کر کے
انہیں سنبھلنے کا موقع دیا۔ اور عدل و انصاف کی نفاذ پدالی۔

بعض لوگوں نے بغاوت پر کمر باندھ ہی تو انہیں سختی سے کچل دیا گیا۔ ایک سال کے اندر اندر حیدر علی نے
صوبہ سرحد کا پورا انتظام درست کر دیا۔

اس کے بعد ۱۷۹۳ء میں انھوں نے بالاپور، خوردا اور بندی گڑھ کی طرف توجہ کی۔

بالاپور سے حیدر علی خاں کی یچن کی یادیں وابستہ تھیں۔ یادیں کیا، بلکہ بالاپور خوردا میں ان کے

کھانڈے راؤ کی گرفتاری کے بعد حیدر علی خاں اپنے بال بچوں سے ملاقات کے لیے راج محل پہنچا
تو محل کے چوکیدار سے لے کر راجہ اوڈیرہ تک اس کے استقبال کو محل کے دروازے پر دست بستہ
موجود تھے۔

حیدر علی جب اپنی رہائش گاہ دیورانی پہنچے تو بے مروتی کے عالم میں ارات کے اندھیرے
اور باد و باران کے طوفان میں جان بچا کے نکلے تھے تو اپنے اہل خانہ یعنی بیوی اور دونوں بچوں ٹیپو سلطان
اور عبدالکیم کو اپنی حویلی میں خدا کے حوالے کر گئے تھے۔

کھانڈے راؤ کو جب حیدر علی ہاتھ نہ آئے تو وہ ان کے اہل خانہ کو گرفتار کر کے راج محل لے گیا۔
اس وقت سے اب تک وہ راج محل میں کھانڈے راؤ کے قیدیوں کی طرح رہ رہے تھے مگر اس وقت کینزوں
ان کے آگے پیچھے پھر رہی تھیں۔

حیدر علی خاں جب راج محل کے دروازے پر گھوڑے سے اترے تو ان کی نظر سب سے پہلے
اپنے اہل و عیال پر پڑی۔ ان کی آنکھیں جھپک آئیں۔ حیدر علی نے تیزی سے بڑھ کر پہلے ٹیپو پھر عبدالکیم
کو گلے لگایا۔ باپ کو دیکھ کر اگرچہ ان کے چہرے کھل اٹھے تھے مگر گزشتہ دنوں کی پریشانیوں نے انہیں
معطل کر دیا تھا۔

پھر حیدر علی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ اس دوران
استقبال کرنے والے تمام لوگ جم بخود کھڑے رہے۔ حیدر علی نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔
بیوی بچوں سے فارغ ہونے کے بعد حیدر علی نے کسی سے گفتگو نہیں کی۔ راجہ اور اس کی رانیاں
سچی جا رہی تھیں کہ دیکھیے انہیں کیا مزا ملتی ہے!

حیدر علی نے بیوی کو تو کینزوں کے حوالے کیا کہ انہیں اندر لے جائیں اور خود دونوں بچوں کی انگلیاں
پکڑے راج دربار کی طرف چلے محل کے تمام لوگ ان کے ساتھ تھے۔ ان کے پیچھے وہ فوجی افسر تھے جو حیدر علی
کے ساتھ معہ ایک دستہ سواروں کے آئے تھے۔

راج محل کے دربارِ ملی پر پہنچنے کے حیدر علی نے راجہ کو مخاطب کیا:

”آپ اندر جائیے۔ مجھے ضرورت ہوگی تو اطلاع دوں گا۔“

راجہ اوڈیرہ نے، چکچکاتے ہوئے کہا:

”میں اپنی غلطی پر شرمندہ ہوں حیدر علی خاں!“

راجہ کو رانیوں نے سچی دیا تھا کہ وہ حیدر علی سے اپنی غلطی پر اظہارِ شرمندگی کرے۔ راجہ کے منہ

ساتھ وہ المیہ پیش آیا تھا جس سے انہیں دوبارہ زندگی ملی تھی۔

وہ المیہ یوں تھا کہ حیدر علی کے والد فتح علی خاں کے ایک جنگ میں مارے جانے کے بعد ان کے دونوں بیٹوں اور بیوی کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ فتح علی خاں کے بیوی بچے بالا پور میں رملش پذیر تھے وہاں کا حاکم عباس قلی خاں فتح علی خاں کے دشمنوں کا حلیف اور ہمدرد تھا۔

جب فتح علی خاں جنگ میں مارے گئے تو حاکم بالا پور عباس قلی خاں نے اس کے دونوں لڑکوں شہباز اور حیدر علی اور ان کی والدہ مجیدہ بیگم کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا اور انہیں گایا کر مرحوم فتح علی خاں نے اس سے اٹھارہ ہزار روپے قرض لیے تھے اور جب تک یہ رقم ادا نہ ہوگی اس وقت تک وہ انہیں رہا نہ کرے گا۔

غریب بیوہ مجیدہ بیگم نے عباس قلی خاں سے کہا کہ اگر وہ اسے چھوڑ دے تو وہ کہیں سے رقم کا انتظام کر کے اپنے بچوں کو لے جائے گی۔

عباس قلی خاں نے مجیدہ بیگم کو تو آزاد کر دیا مگر اس کے بیٹوں شہباز اور حیدر علی کو نقاروں کے اندر بند کر کے اوپر سے کھال منڈھ دی۔ اندر رہا جانے کے لیے اس نے نقاروں میں چھوٹے چھوٹے سوراخ کرا دیے۔ پھر اس نے مجیدہ بیگم سے کہا،

”اگر تم رقم لے کر پندرہ دن کے اندر واپس نہ آئیں تو تمہارے بیٹے نقاروں کے اندر مر جائیں گے۔“

ممتا کی ماری ماں کسی نہ کسی طرح سرنگاٹیم پہنچی۔ وہاں راجہ میسور کی ملازمت میں فتح محمد خاں کا بھیجا حیدر صاحب تھا۔ مجیدہ بیگم نے اس سے جو اپنا حال بتایا تو وہ بہت متاثر ہوا اور اس نے فوراً اٹھارہ ہزار روپے کا انتظام کر کے اپنے دونوں چچا زاد بھائیوں کو نقاروں کی قید سے آزاد کرانے کے لیے اپنے منگوا لیا۔

اس وقت سے اب تک حیدر علی خاں جب کبھی بالا پور کا نام کسی سے سنتا تو غم و غصہ سے اس کا بدن کانپ اٹھتا تھا۔

جس وقت حیدر علی نے بالا پور پر حملہ کا ارادہ کیا اس وقت بالا پور پر ہمدردی پر لگنے کا راجہ مراری راؤ آمادہ ہو گیا اور فوراً اپنا لشکر لے کر بالا پور پہنچ گیا۔

ادھر سے حیدر علی خاں اپنے لشکر کے ساتھ چلے۔ ادھر سے بالا پور اور راجہ مراری راؤ کے مشترکہ لشکر بالا پور سے آگے بڑھ کر ندی کے میدان میں خیمہ زن ہوئے۔

حیدر علی خاں نے ندی کے میدان میں پہنچتے ہی بالا پور اور پگنڈہ کے راجہ مراری راؤ کے مشترکہ لشکر پر زبردست حملہ کیا۔ مراری راؤ کو اس اچانک حملہ کی امید نہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ حیدر علی کا لشکر تھکا ہوا آیا ہے۔ وہ ایک دو دن آرام کرنے کے بعد جنگ کرے گا مگر حیدر علی خاں کا لشکر اس منہ زور گھوڑے کی طرح تھا جو اپنے سوار کے قابو سے باہر ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے لشکر نے ندی کے میدان میں دشمن کے ٹارگٹرز کو فروکش دیکھ کر حیدر علی سے وہاں پہنچتے ہی دشمن پر حملہ کرنے کی درخواست کی۔

حیدر علی اپنے لشکر کی نظرت سے آگاہ تھا۔ اس فطرت کے بنانے میں خود حیدر علی کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ اپنے لشکریوں کو پہلا سبق یہ پڑھاتا تھا کہ دشمن پر اچانک حملہ کرو اور دشمن سامنے موجود ہو تو ایسے وقت میں اس پر حملہ آؤ کہ وہ دھوکھلا کر رہ جائے۔

اسی لیے حیدر علی دن کے بجائے دشمن پر شب خون زیادہ مارتا تھا اور اس کا ہر شب خون کامیاب ہوتا تھا۔ یہ ایک طرح سے حیدر علی اور اس کے لشکر کی فطرت میں داخل ہو گیا تھا۔

اسی وقت دشمن ندی کے میدان میں پہلے سے موجود تھا اور اس نے اپنے لشکر کو ابھی جگہ خیمہ زن کیا تھا۔ بر خلاف اس کے حیدر علی خاں میدان میں بعد میں پہنچے تھے اور وہاں اپنے لشکر کے لیے مراری راؤ سے ابھی جگہ حاصل نہیں کر سکے تھے۔

اب جگہ کا تلاش کے لیے جنگ کو کچھ دن کے لیے موقوف رکھنا نہ حیدر علی کے لیے کچھ مفید تھا اور نہ اس کے لشکریوں کے لیے۔ پس جب لشکر نے فوری حملہ کی درخواست کی تو حیدر علی نے اس کی درخواست اس شرط کے ساتھ منظور کی کہ پہلے لشکر کے میدان میں خیمے لگائیں گے تاکہ دشمن یہ سمجھے کہ آگے والا لشکر آرام کرنے کے لیے دو چار دن جنگ موقوف رکھے گا۔ ادھر دشمن کی اس غلط فہمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جلدی جلدی سامان اتار کے خیموں کی آڑ میں صف بندی کریں اور پھر اچانک دشمن پر جاڑیں۔

لشکر حیدر علی کی شرط کا مطلب فوراً سمجھ گئے۔ وہ خیمے بھی لگاتے گئے اور دوسری طرف صف بندی بھی کرتے گئے۔ گھنے ڈیڑھ گھنٹے میں تمام خیمے ندی کے میدان میں لگ گئے۔

راجہ مراری راؤ اپنے چھوٹے سرداروں کے ساتھ اپنی خیمہ گاہ کے آگے کھڑا حیدر علی کی لشکر گاہ کے خیمے نصب ہوتے دیکھ رہا تھا۔

”کچھ آدمیوں کو بھیج کر معلوم کرو کہ حیدر علی کے لشکر کی صحیح تعداد کیلے ہے؟“ راجہ مراری راؤ نے

یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے نیچے پس منظر میں چلے گئے ہیں۔ خیموں کے بجائے سامنے کے پورے میدان میں گھوڑے بھاگتے نظر آ رہے تھے جن کا رخ مراری راؤ کے لشکر کی طرف تھا۔

راجہ بہادر بھاگے۔ بھاگے، حیدر علی نے حملہ کر دیا ہے۔ اپنی جان بچائیے! سردار یہ کہتا ہوا اپنے خیموں کی طرف بھاگ پڑا۔

راجہ مراری راؤ کا سر ہلکا گیا۔ اسے آنے والے گھوڑے اپنے سر پر دوڑتے معلوم ہوئے۔ راجہ کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ چلا یا:

’ہوشیار ہو شیار۔ حملہ ہو گیا۔ ہمیں دھوکا دیا حیدر علی نے۔‘

راجہ واپس بھاگتا جاتا تھا اور یہ کہتا جاتا تھا۔ لشکر کے پہرے داروں نے بھی آنے والے سواروں کو دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے گھوڑے دوڑا کر پورے لشکر میں ’حملہ‘ کی خبر پہنچادی اور راجہ کے لشکر کی جلد جلد تیار ہو کر میدان کی طرف دوڑ پڑے۔

مردچوں میں بیٹھے ہوئے تو بچپوں کو ان کے افسروں نے فائر کھولنے کا حکم دے دیا تھا اور انہوں نے اندھا دھند گولہ باری شروع کر دی تھی۔

لیکن۔

اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

تو بچپوں نے پہلی بار ہی گولوں کی بارشاری تھی کہ حیدر علی خاں کے تیز رفتار سوار دشمن کی سوار اور پیدل فوج کے سر پر پہنچ گئے۔ گولہ باری بیکار تھی۔ تو ہمیں خاموش ہو گئیں اور دست بدست جنگ شروع ہو گئی۔

راجہ مراری راؤ کے لشکر میں نہ تو صف بندی ہو سکی تھی اور نہ کوئی ترتیب تھی۔ بس جو سپاہی اور جو بیادہ جہاں تھا وہیں پر دفاعی جنگ کر رہا تھا۔

راجہ کے وہ لشکر جو دوسرے کاموں میں لگے تھے وہ بھتیار بھی نہ اٹھا پائے تھے کہ حیدر علی خاں کے سواروں کے ہاتھوں مارے گئے۔

ہندی کا میدان جنگ پیچھے رہ گیا تھا اور راجہ مراری راؤ کے لشکر گاہ کے اندراب جنگ ہو رہی تھی۔ راجہ کے لشکر کی بدحواسی تھی اور اسی بدحواسی میں لڑ کر قتل ہو رہے تھے۔

راجہ اور اس کے سردار اپنے لشکریوں کو نہ تو لڑا سکے اور نہ ان میں کوئی ترتیب اور جرات پیدا کر سکے۔ انہیں اپنی فکر پر لگی تھی۔

راجہ کے گرد اس کے سرداروں نے حلقہ سا بنایا تھا مگر اس حلقہ پر حیدر علی خاں کے سواروں کا دباؤ

اپنے ایک سردار سے کہا۔

سردار جانے لگا تو راجہ نے اسے روک کر مزید تاکید کی:

’اپنے آدمیوں کو سمجھا دینا کہ حیدر علی بہت چالاک ہے۔ اسے بالکل خبر نہ ہونی چاہیے۔‘

’ٹھیک ہے۔ میں ان کو سمجھا دوں گا۔‘

یہ کہہ کر سردار آگے بڑھا۔ ابھی دو چار قدم چلا تھا کہ راجہ کی پھر آواز آئی:

’ادھر آؤ۔ ایک بات اور سنتے جاؤ۔‘

سردار واپس آگے اس کے سامنے کھڑا ہو گیا:

’فرمائیے۔ اور کیا حکم ہے؟‘

’اپنے آدمیوں سے کہنا کہ یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ حیدر علی جنگ کرے گا یا صلح کی کوشش کرے گا۔‘

راجہ مراری راؤ کا یہ ایک احمقانہ سا حکم تھا۔

’جی۔ بہت بہتر۔‘ سردار نے کہا مگر جانے کے بجائے وہیں کھڑا رہا۔

’تم جانتے کیوں نہیں؟‘ راجہ نے دریافت کیا۔

’راجہ بہادر۔ میں اس لیے رک گیا ہوں کہ شاید آپ کوئی اور حکم صادر فرمائیں۔‘ سردار نے جمل کر کہا۔

’تم جاؤ۔‘ راجہ کو اس کے جواب پر غصہ آ گیا:

’ہم نے جو حکم دینا تھا، اسے چکے ہیں۔‘

مگر یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ سردار صرف چند ہی قدم چلا تھا کہ راجہ کی آواز پھر سنائی دی:

’مخدوم سردار! آؤ۔ ادھر واپس آؤ۔‘

راجہ کی آواز میں بڑا اضطراب تھا اور ایک طرح کا خوف بھی۔ سردار پلٹ کے اس کے پاس

آچکا تھا۔

راجہ مراری راؤ نے کہا:

’دیکھو۔ ادھر دیکھو۔‘

سردار بھی گھبرا گیا تھا۔ اس نے راجہ کے اشارے پر اس طرف دیکھا اور جو دیکھا اس سے اس کے

رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

سامنے کی طرف کافی دور پر حیدر علی خاں کا لشکر جہاں کچھ دیر پہلے اپنے نیچے نصب کر رہا تھا اب وہاں

بڑھ گیا تھا۔

”راجہ ہلار۔ آپ میدان سے نکل جیئیں۔“ ایک سردار نے مشورہ دیا۔

راجہ مراری راؤ کو تو اپنی موت سامنے نظر آرہی تھی۔ اگر سردار سے مشورہ نہ بھی دیتا تو وہ خود ہی میدان چھوڑ بھاگنے کی فکر میں تھا۔

سردار کی آواز سننے ہی راجہ نے اپنا گھوڑا موڑا اور ایڑے کر پک بھکتے میں میدان جنگ سے فرار ہو گیا۔

راجہ کے جانے کے بعد سرداروں نے بھی پیٹھ دکھائی اور میدان چھوڑ بھاگے پھر لشکر کیوں کھڑے رہتے۔ وہ بھی بھاگ اٹھے۔

حیدر علی خان خود ان حملہ آوروں کے دستوں میں شامل تھا۔ اس نے اپنی حکمت علی سے راجہ مراری راؤ سے جنگ ہونے سے پہلے ہی جنگ جیت لی تھی۔

راجہ تین توپیں اور دوسرا بہت سا سامان جنگ چھوڑ بھاگا تھا۔ اس کے سوسے زیادہ آدمی اس یلغار میں مارے گئے تھے۔

میدان سے سامان اکٹھا کرنے کے بعد حیدر علی خان نے لشکر کو ایک دن اور ایک رات آرام کرنے کا حکم دیا اور جاسوسوں کو آگے روانہ کیا کہ وہ پتہ لگائیں کہ راجہ مراری راؤ اپنی ریاست پنگنڈہ پہنچ گیا ہے یا نہیں اور اب اس کے کیا ارادے ہیں؟

دوسرے دن صبح کو جاسوسوں نے واپس آ کر اطلاع دی کہ راجہ مراری راؤ اپنے لشکر خورہ لشکر کے ساتھ گوری بندہ میں ٹھہرا ہوا ہے اور اس کے لشکر کی خود کو حالت جنگ میں رکھے ہوئے ہیں۔ راجہ کو اپنے تعاقب کا خطرہ ہے اس لیے اس نے پنگنڈہ سے تازہ دم فوج بھی منگوائی ہے۔

حیدر علی خان ۳۶ گھنٹے اپنے لشکر کو آرام دینے کے بعد گوری بندہ کی طرف روانہ ہوا تاکہ راجہ مراری راؤ پر یہ واضح کر دے کہ حیدر علی کی یلغار کو اگر روکنا ہے تو اس سے میدان میں مقابلہ کے بجائے اپنے اپنے قلعوں میں چھپ کے مدافعتی جنگ کریں اور اپنی سلامتی کی دعا مانگیں۔

ہندی کے میدان میں بھڑپ کے چوتھے دن حیدر علی خان اور راجہ مراری راؤ کا گوری بندہ کے مقام پر ایک زبردست محاصرہ ہوا۔ ہندی کی بھڑپ کے سلسلے میں راجہ کو یہ شکوہ تھا کہ اس کا لشکر دھوکے میں ٹکست

کھا گیا کیونکہ اسے تیاری کا موقع ہی نہ مل سکا اور نہ وہ صف بندی کر سکا۔

اس چار دن کے وقفے کے دوران راجہ مراری راؤ نے پنگنڈہ سے تازہ دم فوج اور پانچ توپیں بھی منگوائی تھیں۔ اس کا لشکر خورہ لشکر بھی زخمی شیر کی طرح اپنے زخم چاٹ رہا تھا اور اس نے قسم کھائی تھی کہ گوری بندہ میں پچھلی ٹکست کا پورا پورا انتقام لے گا۔

حیدر علی خان کو جاسوسوں نے اطلاع دے دی تھی کہ راجہ مراری راؤ نہ صرف پہلے سے زیادہ لشکر میدان میں لایا ہے بلکہ اب وہ ہمہ وقت جنگ کے لیے تیار ہے اس لیے نہ اس پر اچانک حملہ ہو سکتا ہے اور نہ شب خون مارا جاسکتا ہے۔

شب خون اور اچانک حملہ اگرچہ حیدر علی کی جنگی حکمت علی کے دو بڑے ہتھیار تھے مگر اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ وہ صرف انہی دو طریقوں سے جنگ کر سکتا تھا۔ کھلے میدان میں جھپٹ پلٹ کے حملہ کرنا بھی اس کی ایک زبردست حکمت علی تھی اور اسی حکمت علی پر اس نے گوری بندہ کے میدان میں علی کیا۔

گوری بندہ کے میدان میں بالکل روایتی انداز میں جنگ شروع ہوئی۔ دونوں طرف کے لشکر آمنے سامنے تھے۔ حیدر علی کے پاس تین چھوٹی توپیں تھیں جو اسے ہندی کے میدان میں حاصل ہوئی تھیں۔ راجہ مراری راؤ کے پاس پانچ توپیں تھیں۔

دونوں طرف کے لشکروں میں صف بندی ہوئی۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے دونوں طرف سے آغا ز جنگ کے بلبل بچے اور توپوں نے دھاڑنا شروع کر دیا مگر یہ چھوٹی توپیں تھیں اور ان کی مار دھڑک نہیں تھی۔ گولے مخالف لشکر کے سامنے گر کر گر بیکار ہو رہے تھے۔

نصف گھنٹے ٹیک گولے برسنے رہے اور میدان میں دھول اٹھ رہی۔ پھر حیدر علی خان کے اشارے پر اس کے لشکر کا دایاں اور بائیں بازو متحرک ہوا مگر بجائے آگے بڑھنے کے یہ دونوں بازو پسپا ہونے لگے جیسے وہ میدان سے ہٹ رہے ہوں۔

کچھ دُور جانے کے بعد دونوں بازو نیم دائرہ بنا کر دشمن پر پکے۔ حیدر علی دراصل دشمن کی توپوں سے اپنے لشکر کو بچانا چاہتا تھا۔ جب اس کے دونوں بازو توپوں کی پہنچ سے دور نکل گئے تو انہوں نے چکر کاٹ کر راجہ مراری راؤ کے دائیں اور بائیں بازو پر حملہ کر دیا۔

دونوں طرف کے قبلی لشکر میدان میں بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ توپیں بھی خاموش تھیں مگر راجہ کی فوج کے دائیں بائیں حصوں میں شدید جنگ شروع ہو گئی تھی اور دونوں لشکر ایک دوسرے پر

بہنے لگا۔ چوریاں بڑھ گئیں۔ چوریوں میں مال اسباب کوئی نہ چراتا بلکہ اُٹا ڈال اور چاول چوری ہوتے۔ بازار میں غلہ کی دکانوں پر خاک اڑنے لگی۔ راجہ کے محل پر صبح سے شام تک فزادیوں کا جمع لگا رہتا۔

راجہ نے سرکاری گوداموں سے لوگوں کو غلہ دیا مگر کہاں تک؟ آخر کئی گودام خالی ہو گئے مگر لوگ مرتے رہے۔

راجہ کو خطرہ پیدا ہوا کہ کیس لوگ محل پر حملہ کر کے اسے ختم نہ کر دیں۔ آخر ایک ماہ کے سنت محاصرے کے بعد راجہ، قلعہ کا دروازہ کھلوا کر خود حیدر علی کے پاس آ گیا۔ وہ زار زار روتا ہوا تھا۔ حیدر علی خاں نے اسے تسلی دی۔

خان صاحب۔ آپ میری فکر نہ کیجیے۔ عوام بھوکوں مر رہے ہیں۔ ان کے لیے قلعہ کے اندر غلہ بچھوائیے۔
راجہ حیدر علی خاں کے سامنے گڑ گڑا رہا تھا۔

حیدر علی نے محاصرہ اٹھایا۔ قلعہ کے تمام دروازے کھول دیئے گئے۔ عوام "حیدر علی زندہ باد" کے نعرے لگاتے قلعہ سے باہر نکلے اور باہر سے سامان خورد و نوش حاصل کیا۔

بغیر اڑے بھڑے قلعہ نواب حیدر علی خاں کے حوالے ہو گیا۔ راجہ نے اعانت قبول کر لی تھی۔ حیدر علی نے اس کی ریاست بحال رکھی۔

حیدر علی خاں نے ایک مختصر سی فوج علی رضا خاں کی سرکردگی میں ہندی کی طرف روانہ کر دی۔ علی رضا نے قلعہ ہندی کا محاصرہ کر لیا۔

راجہ ہندی کچھ روز قلعہ بند رہا۔ پھر خود ہی حاضر ہو گیا۔ علی رضا نے راجہ اور چند بڑے سرداروں کو گرفتار کر کے بنگلور بھیج دیا اور حیدر علی خاں کے حکم سے بدرائیاں کو، جو نائٹوں کا ایک سردار تھا، ہندی کا قلعہ دار مقرر کر دیا۔



حیدر علی خاں جیسے جیسے ڈنگ بھرتے باہر بیٹھک میں چلے گئے۔

بالاپور اور پنڈتہ کی فتح کے بعد سے ان کی بیٹھک ہر وقت آنے جانے والوں سے بھری رہتی تھی۔ جب تک وہ سرنگاپٹم میں راجہ میسور کی ملازمت میں تھے ان کے دماغ پر اتنا بوجھ نہ تھا مگر

غالب آنے کی کوشش کر رہے تھے۔

حیدر علی قلب فوج میں موجود تھا۔ اس نے توپچیوں کو پھر سے گولے برسانے کا حکم دیا۔ جو آسمان میں دوسری طرف سے بھی گولے چلنے لگے اور میدان میں اس قدر گرد اڑی کہ آگے کچھ بھی نہ نظر آتا تھا۔ اس وقت حیدر علی نے گولہ باری رکوا کر قلب کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔

حیدر علی اپنے قلب لشکر کے ساتھ تیزی سے آگے بڑھا اور دم کے دم میں دشمن کے سپر پہنچ گیا۔ دشمن کو میدان میں اڑتی ہوئی گرد کی وجہ سے حیدر علی کے آنے کی خبر اس وقت ہوئی جب وہ گرد کی چادر چاک کر کے اس کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ اس وقت گولہ باری بیکار تھی اس لیے راجہ کے قلب کے سواروں نے آگے بڑھ کر حیدر علی کو روکنے کی کوشش کی مگر طوفان بھی کہیں کسی کے روکے سے رکا ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ مراری راؤ کے لشکر میں ابتری پیدا ہوئی اور فوج گھبرا کر بھاگنے لگی۔ راجہ کو بھی اپنی جان بچانے کے لیے میدان سے بھاگنے ہی میں ہنتری دکھائی دی اور اس نے گھوڑا گھما کر راسیں اٹھا دیں۔

دوسرا میدان بھی حیدر علی خاں کے ہاتھ رہا۔
اس مرتبہ اس نے راجہ کا تعاقب نہیں کیا بلکہ جاسوسوں کو اس کی خبر لانے کے لیے اس کے پیچھے لگا دیا۔

حیدر علی دو دن وہیں پڑاؤ ڈالے پڑا رہا۔ تیسرے دن جاسوسوں نے خبر دی کہ راجہ مراری راؤ پنڈتہ پہنچ کر قلعہ بند ہو گیا ہے۔

حیدر علی خاں نے سوچا کہ چلو اچھا ہوا۔ وہ اپنے گھر پہنچ گیا۔ وہاں سے تو کہیں اور جانیں سکتی۔ یہ سوچ کے اس نے کوچ کا حکم دیدیا اور اس کا لشکر خیمے اکھاڑ کے تیار ہو گیا۔ اب حیدر علی کا رخ پنڈتہ کی طرف تھا۔

پنڈتہ میں راجہ مراری راؤ کا گھر بھی تھا اور وہی اس کا صدر مقام بھی تھا۔ حیدر علی نے وہاں پہنچ کر قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

ایک ہفتہ تک تو خاموشی رہی۔ پھر قلعہ میں راشن پانی ختم ہونا شروع ہو گیا۔ لوگوں میں دنگاؤ

میں آپ کے پاس یہ امید لے کے آیا ہوں کہ آپ مجھے ریاست بد نور سے انصاف دلائیں۔
میرے ساتھ جو ظلم ہوا ہے اس کا بدلہ لیں اور قاتلوں کو سولی پر چڑھائیں۔
”جوان۔ تمہاری باتیں اچھی اچھی ہیں۔“

حیدر علی خود بھی اس کی باتوں سے الجھن میں پڑ گئے۔ اپنی الجھن دور کرنے کے لیے انہوں
نے بات بڑھاتے ہوئے مزید کہا:

”ایک طرف تم ظلم کرنے والے سے بدلہ لینے کے خواہش مند ہو۔ دوسری طرف تم کہہ رہے
ہو کہ تمہارے قاتلوں کو سولی پر چڑھایا جائے جبکہ تم اس وقت زندہ ہو اور تمہیں کسی نے قتل
نہیں کیا۔“

”محترم سردار۔ میں سچ کہہ رہا ہوں کہ مجھے قتل کر دیا گیا تھا اور یہ محض ایک اتفاق ہے کہ میں
اس وقت آپ کے سامنے زندہ موجود ہوں۔“

جوان کی گفتگو میں اب بھی الجھاؤ تھا۔

حیدر علی خاں نے الجھتے ہوئے کہا:

”جوان۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص مصیبت یا صدمے نے تم پر گہرا اثر کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں
کہ تم تنہی اور اطمینان سے اپنے حالات بیان کرنا کہ میں کسی نتیجے پر پہنچ سکوں اور ممکن ہو تو تمہاری
مدد کر سکوں۔“

”سردار بہادر۔ میرا نام جاہدی ہے۔“

جوان نے پرسکون جگہ میں کہنا شروع کیا

”بد نور کی رانی کی شادی کو جب بارہ سال گزر گئے اور ان کے کوٹی بچہ نہ ہو تو راجہ کو مت نگر ہوئی
پھر اس خیال سے کہ کہیں ریاست ان کے ہاتھ سے نہ نکل جائے انہوں نے مجھے متبئی کیا۔ میری عمر
اس وقت آٹھ سال تھی۔“

متبئی کے انتخاب کے لیے راجہ نے پوری ریاست میں اعلان کر دیا کہ جن لوگوں کے بچے آٹھ
اور دس سال کی عمر کے درمیان ہوں وہ اپنے بچوں کو ساتھ لے کر فلاں تاریخ کو راج محل کے میدان
میں جمع ہوں۔

مردار محترم۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے کیونکہ اسی دن میں ایک کسان کے بیٹے سے ریاست
بد نور کا راجہ دار ولی مدینہ گیا تھا۔

اب وہ مرا کے گورنر کی حیثیت سے مرزا ٹپ سے مرا متعلق ہو گئے تھے اور پورے صوبے کا در و سر
ان کے سپرد تھا۔ روز ایک یا جھگڑا کھڑا ہوتا اور روز ایک یا مقدمہ پیش ہوتا تھا۔
ایک وں حیدر علی خاں صبح کے وقت جب مرا کے دربار میں پہنچے تو ناظم دربار نے انہیں

بتایا:

”مالی مقام گورنر بہادر۔ ریاست بد نور کا ایک خوبصورت جوان آپ کے پاس فریاد لے کر
آیا ہے اور فوراً پیش ہونا چاہتا ہے۔“

بد نور کے نام پر حیدر علی خاں کے کان کھڑے ہوئے۔

یہ دولت مند ریاست میسور کے شمال میں صوبہ بھٹی کی حدود میں تھی۔ ریاست کی خوبصورتی اور
دولت مندی اس علاقہ میں زبان زد خاص و عام تھی۔

حیدر علی خاں نے فوراً اس جوان کو طلب کیا۔

چند لمحوں کے بعد ناظم دربار اس جوان کو لیے ہوئے اندر آیا۔ جوان نے سر جھکا کر نہایت ادب
سے حیدر علی کو سلام کیا۔ حیدر علی کی نظر میں اس پر ٹپ کے رنگیں۔

اس نے نرم لہجے میں دریافت کیا:

”جوان۔ میں بتایا گیا ہے کہ تمہارا تعلق ریاست بد نور سے ہے؟“

”جی ہاں سردار۔ میں اسی ریاست بد نور کا ایک بد نصیب انسان ہوں جس کی دولت مندی کا چرچا
دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔“ خوبصورت جوان نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔

حیدر علی نے وضاحت کی:

”میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر تم ریاست بد نور کے رہائشی ہو تو پھر تم ہمارے پاس فریاد
لے کر کیوں آئے ہو؟ ریاست بد نور ہماری ماتحت نہیں کہ ہم اس پر کوئی زور ڈال سکیں۔ ہاں اگر ہمارے
صوبے اور علاقے کے کسی شخص نے تم پر کوئی ظلم کیا ہے تو اسے ہم فوراً سزا دینے پر آمادہ ہیں۔“

”محترم سردار۔“

جوان نے بھی وضاحت کی:

”آپ ایک رحیم اور انصاف پروردار ہیں اور ایک انصاف پسند انسان کہی یہ برداشت
نہیں کر سکتا کہ کسی کے ساتھ بے انصافی کی جائے۔“ خواہ اس کا تعلق اس کے علاقے سے ہو یا غیر علاقے

راجہ بہادر جنہیں میں اپنے باپ سے زیادہ چاہتا تھا، ایک صبح کو اک دم محل میں اعلان ہوا کہ وہ سوتے میں مر گئے ہیں۔ مجھ پر تو قیامت ٹوٹ پڑی۔ میں ان کی لاش کے ساتھ لیٹ کر خوب خوب رویا۔

راجہ بہادر کی لاش کو راج محل کے میدان میں لوگوں کے سامنے جلادیا گیا اور ان کی راکھ دریا میں بہادی گئی۔

میں دن بھر محل میں اداس اداس گھومتا رہتا تھا۔ اسی دوران محل کی کینیزوں اور غلاموں کی سرگوشیوں سے مجھے معلوم ہوا کہ راجہ بہادر خود نہیں مرے بلکہ انہیں زہر دے کر مارا گیا ہے۔ یہ قتل رانی اور اس کے ایک برہمن وزیر نے ہی کیا ہے۔

راجہ کے مرتے ہی برہمن منتری کا راج محل میں بے دھڑک آنا جانا شروع ہو گیا اور جلد ہی مجھ پر یہ راز کھل گیا کہ ان دونوں کے ناجائز تعلقات ہیں۔

مجھے یہ بات بہت بری معلوم ہوئی۔ میں نے رانی ماں کو بند بند انفاذ میں کئی بار اس کام سے منع کیا مگر وہ میری کب سنتیں۔ ان پر تو بدکاری کا بھوت سوار تھا۔

پھر یہ بات راج محل سے نکل کر عام لوگوں تک پہنچ گئی اور لوگوں نے مطالبہ کیا کہ متنبی یعنی مجھے راجہ بنایا جائے۔ رانی اور وزیر اس سے بہت پریشان ہوئے اور ایک رات انہوں نے چند آدمی میرے پاس بھیجے جنہوں نے میرا گلا دبا کر مجھے مار ڈالا۔

”تمہیں مار ڈالا۔“ حیدر علی نے حیرت سے پوچھا:

”تو پھر تم زندہ کیسے ہو گئے؟“

معاذی نے جواب دیا:

”اے میرے رحیم ہر دار۔ میرے زندہ ہونے کی کہانی اس طرح ہے کہ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک کوٹھڑی میں پایا۔ کوٹھڑی میں ایک چراغ ٹنٹا رہا تھا۔ جوگی مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے محبت کے مارے مجھے سینے سے لگایا۔

میں سخت پریشان تھا کہ میں کہاں ہوں اور یہ جوگی کون ہے؟ پھر آہستہ آہستہ مجھے اپنے سابقہ حالات یاد آئے اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے جوگی سے پوچھا:

”بابا۔ مجھے تو کچھ لوگوں نے گلا دبا کر مار ڈالا تھا مگر اب میں زندہ ہو گیا ہوں۔ یہ سب کیسے ہوا؟“

ریاست کے دوسرے لڑکوں کی طرح میرا باپ بھی مجھے پناٹھا کے میدان میں لایا اور دُرور تک لگی کٹی تھاروں میں ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ میں اس دن بہت خوش تھا اور میرا دل کہہ رہا تھا کہ میں ہی بد نور کا راجا رہوں گا۔

کچھ دیر بعد بد نور کے راجہ اور رانی اپنے منتریوں کے ساتھ وہاں آئے اور تھاروں میں گھومتے گھومتے میرے پاس پہنچے۔

بد نور کے راجہ کے سر پر ریشم کی پگڑی بندھی تھی اور آگے کی طرف اس میں ایک بڑا سا میرا دیک رہا تھا۔

مجھے راجہ کی پگڑی ایسی اچھی معلوم ہوئی کہ دل چاہا میں راجہ سے وہ پگڑی مانگ لوں مگر ڈر کے مارے میرے من سے آواز نہ نکلا اور میں بس ٹھٹھکی بلند سے راجہ کی پگڑی کو دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ راجہ میرے سامنے آکر رک گئے۔

میرے باپ نے غصے سے حکم دیا کہ ہاتھ جوڑ کر راجہ کو پر نام کروں مگر میں پگڑی کا ہیرا دیکھنے میں ایسا لگن تھا کہ باپ کی آواز مجھے سنا ہی نہ دی۔

میرا باپ شاید میری اس حرکت پر ناراض ہوا۔ اس نے میرا شانہ پکڑ کر ہلایا مگر راجہ نے اسے منع کیا اور مجھ سے پوچھا:

”اے لڑکے تو کیا دیکھ رہا ہے؟“

میرے من سے فوراً نکلا:

”راجہ بہادر۔ مجھے آپ کی پگڑی بہت اچھی لگ رہی ہے؟“

انہوں نے کہا:

”کیا پگڑی دینا چاہتے ہو؟“

میرے من سے اک دم ”ہاں“ نکلا۔

میری ہاں پر راجہ مسکراتے اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے اعلان کیا کہ میں نے اس بچے کو اپنا منتنبی بن لیا ہے۔ میرا باپ خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ وہ بار بار میرا منہ چومنا تھا۔

چناؤ کے بعد میں راجہ رانی کے ساتھ راج محل میں آ گیا۔ میرے دن پھر گئے اور میں واقعی راجا بن گیا۔ میرے کہنے پر راجہ نے میرے باپ کو دولت سے لالال کر دیا۔ پھر راج محل ہی میں میری پرورش ہوئی۔ میں وہی جوان ہوا مگر جوانی آتے ہی میری قسمت بدل گئی۔

اس نیک اور انسان دوست جوگی نے بتایا،
 رانی اور اس کے آشناد وزیر نے تمہیں گلا گھونٹ کے مردادیا تھا۔ ان کے آدمی تمہیں
 مندر کے احاطے میں دفن کر گئے تھے۔ جب وہ واپس گئے تو میں نے مٹی ہٹا کر گڑھ میں سے
 تمہیں نکالا۔ تم زندہ تھے اور تمہاری ماسں چل رہی تھی۔ میں تمہیں یہاں لے آیا اور تمہارا علاج کیا۔
 اب تم اچھے ہو گئے ہو۔

پھر اس جوگی نے مجھے رائے دی کہ:

اس ریاست سے فوراً نکل جاؤ اور کسی اور جگہ جا کر اپنی زندگی گزارو۔

میں آپ کی رحمدلی اور انسان دوستی کا چرچاس کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ میری داد دے
 کیجیے۔ میرا حق مجھے دلائیے اور ظالموں اور قاتلوں کو مناسب سزا دیجیے۔

حیدر علی نے مہادی کے حالات سن کر اسے تسلی دی اور کہا:
 میں انسانیت کے نام پر تمہاری مدد کر دوں گا۔

پھر انہوں نے مہادی سے بد نور کے قلعہ تک جانے کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی۔ انہیں
 یہ تو معلوم تھا کہ بد نور کا خوبصورت شہر اپنے باغات اور میٹھے پانی کی نہروں سے آراستہ ہے مگر اس
 میں داخلے کا صرف ایک تنگ راستہ ہے۔ مہادی نے حیدر علی کے لشکر کی رہنمائی کرنے کی
 پیش کش کی۔

حیدر علی خاں اس خوبصورت جوان کی رہبری میں بد نور روانہ ہوئے۔ راستہ واقعی بہت تنگ
 اور خطرناک تھا اور بغیر کسی رہبر کے راجہ کے محل تک پہنچنا ناممکن تھا۔

مہادی راستے سے واقف تھا۔ لشکر کو کوئی دقت پیش نہ آئی۔ تنگ راستہ پار کر کے
 پہلوی بد نور کی حدود میں داخل ہو گئے۔ وہاں کے لوگ مہادی کو پہچانتے تھے۔ جو بھی اُسے دیکھتا یا
 سنتا اس کے سلام کو دوڑا چلا آتا۔

حیدر علی خاں کو وہاں کے لوگوں کے رویے سے معلوم ہو گیا کہ وہ رانی کے خلاف ہیں اور اس کی
 بدکاری کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اسی لیے انہوں نے حیدر علی کے لشکر کو رد کرنے کی کوشش
 نہیں کی۔

راجہ کے قلعہ تک پہنچنے کے دوران حیدر علی کا لشکر آٹھ چھوٹے بڑے قلعوں کے سامنے سے گزرا جو
 شاہی قلعے کی حفاظت کے لیے تعمیر کیے گئے تھے۔ وہاں ریاست کی فوج بھی موجود تھی لیکن مہادی کو دیکھ کر
 کسی نے لشکر کو رد کرنے کی کوشش نہ کی۔

حیدر علی خاں کا لشکر تنگ راستوں سے گزر کر سطح مرتفع پر پہنچ گیا تھا۔ یہاں خوبصورت باغات
 اور نہریں تھیں۔ اشجار پھلوں سے لدے ہوئے اور کھاریاں پھلوں سے بھری ہوئی تھیں۔

راجہ کے قلعہ کے سامنے حیدر علی کا لشکر ٹھہرا اور انہوں نے ایک آدمی کے ذریعے رانی کو یہ
 پیغام بھیجا:

"قلعہ کے سامنے حیدر علی خاں گورنر سسر کا لشکر موجود ہے۔ رانی
 بد نور کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ قلعہ سے نکل کر گورنر کے خیمے میں آئیں اور ان
 پر ریاست کے منتہی مہادی نے جو الزامات عاید کیے ہیں، ان کی حفا
 پیش کریں۔"

صرف دو گھنٹے جواب کا انتظار کیا جائے گا اس کے بعد قلعہ پر
 حملہ کر دیا جائے گا۔

رانی بد نور کا ضمیر گنے گا اور ذہن مجرم تھا۔ اس نے حیدر علی خاں کے سامنے آنے سے گریز کیا اور
 قلعہ میں موجود فوج کو حکم دیا کہ باہر سے حملہ کا مقابلہ کیا جائے۔

رانی بذاتِ خود تو یہ چاہتی تھی کہ حیدر علی خاں کے پاس جا کر اپنے کڑوتوں کی معافی مانگ
 لے لیکن اس کے آشناد برہمن وزیر نے اس پر مقابلہ کرنے کے لیے زور دیا۔

حیدر علی کو دو گھنٹے تک جواب موصول نہ ہوا تو انہوں نے حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ قلعہ کے اندر
 اندازے سے کہیں زیادہ فوج موجود تھی۔ حیدر علی کے لشکر نے یلغار کی تو قلعہ کی فصیل سے پتھر
 لڑھکائے گئے۔ باہر ڈھلوان ہونے کی وجہ سے لڑھکے پتھروں نے حملہ آور فوج کے قدم چند لمحوں
 کے لیے روک دیے مگر زار دیر بعد پھر کوشش کی گئی لیکن پتھروں کی بارش کی وجہ سے فصیل تک
 پہنچنا مشکل ہو گیا۔

کچھ لشکر کی فصیل تک پہنچ گئے مگر ان پر اوپر سے توڑے دار بند دتوں سے گولیاں برسائی
 گئیں۔

تھوڑے تھوڑے وقفے سے تمام دن جنگ ہوتی رہی۔ جب شام کا دھند لگا ہوا تو مہادی، حیدر

’ادشطان۔ درندے! تجھے ریاست کے وارث کو قتل کرتے ذرا بھی رحم نہ آیا۔‘
وزیر ”رحم۔ رحم۔ چلانے لگا۔“
”تجھ پر رحم کرنا، رحم کی توہین ہے۔“

حیدر علی خاں گرہے:

”خون کا بدلہ خون ہے۔ اسے لے جاؤ اور قتل کر دو۔“

حیدر علی خاں کے ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر وزیر کی بدن پٹری اور گھینٹا ہوا ایک طرف لے گیا۔

ریاست کی رانی تتر تتر کانپ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ حیدر علی نے اسے مود کر دیکھا تو رانی ان کے پیروں پر گر پڑی:

”مجھ سے غلطی ہو گئی حیدر علی خاں۔ مجھے شام (معاف) کر دو۔“ رانی نے بھرائی ہوئی آواز میں ان سے التجائی۔

حیدر علی خاں نے عابدی کی طرف دیکھا:

”تم کیا کہتے ہو عابدی؟“

عابدی کو رانی پر رحم آ گیا۔ اس نے کہا:

”گود بے اور۔ میں نے رانی کو ہمیشہ رانی مانا ہے۔ اگر آپ انہیں معاف فرمائیں تو یہ مجھ پر صاف ہو گا۔“

”تم کیا کہتی ہو رانی؟“

”یہ میرا بیٹا ہے گود بے ہلار۔“ رانی جلدی سے بولی:

”اگر آپ مجھے معاف فرمائیں تو میں اسے سینے سے لگاؤں گی اور اس کے سر پر ریاست بد نور کا اہج سجاؤں گی۔“

”رانی۔ تم عابدی کی مجرم ہو۔ اس نے تمہیں معاف کر دیا تو میں بھی معاف کرتا ہوں۔“ حیدر علی نے فراخ دل کا ثبوت دیا:

”مگر اسے اس کا حق ملنا چاہیے۔“

”میں آپ کی شکر گزار ہوں حیدر علی خاں۔“ رانی نے کہا اور احساسِ مذمت سے اپنی گردن ہکا دی۔

کو ایک ایسے راستے سے قلعہ کی طرف لے گیا جو گھوم کر فصیل تک جاتا تھا۔ وہاں فصیل کی اونچائی بھی خاصی کم تھی۔

حیدر علی خاں نے وہاں سے واپس آ کر ڈیڑھ سو جوانوں کو منتخب کیا اور انہیں ساتھ لے کر عابدی کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچے۔

شکریوں نے فوراً فصیل پر کھیندیں پھینکیں اور اوپر چڑھ گئے۔ حیدر علی خاں ایک ہاتھ میں ننگی تلوار اور دوسرے ہاتھ میں سلطنت مغلیہ کا پرچم لیے آگے آگے تھے۔

قلعہ والوں نے فصیل پر چراغ جلا رکھے تھے۔ چراغوں کی روشنی میں جب انھوں نے سلطنت مغلیہ کا پرچم دیکھا تو ان کے ہوش اڑ گئے۔ ریاست بد نور کے ایک سپاہی نے حیدر علی کو پہچان لیا۔ وہ اس قدر خوفزدہ ہوا کہ:

”حیدر علی آ گیا۔ حیدر علی آ گیا۔“

کہتا ہوا بھاگ پڑا۔

اس کی دیکھا دیکھی فصیل کے دوسرے محاذوں نے بھی بھاگنا شروع کر دیا۔ حیدر علی خاں اپنے شمشیر برداروں کے ساتھ فصیل سے اترے اور قلعہ کے صدر دروازے کے محاذوں پر حملہ کر دیا اور انہیں مار دھکایا۔ قلعہ کا صدر دروازہ کھول دیا گیا اور حیدر علی خاں کا لشکر فاتحانہ اندر داخل ہوا۔

حیدر علی خاں نے دیں کچھری لگا دی اور حکم دیا کہ ریاست کی رانی اور اس کے برہمن وزیر کو حاضر کیا جائے۔

تھوڑی دیر بعد قلعہ کے لشکر کا خود ہی رانی اور وزیر کو کپڑے لے آئے۔ اس وقت عابدی حیدر علی کے پاس بیٹھا تھا۔ رانی اور وزیر نے اسے دیکھا تو ان کی جینیں نکل گئیں۔

”عابدی بھوت ہو گیا ہے۔“ رانی چیخنے لگی۔

”عابدی نرک و جہنم سے واپس آ گیا ہے۔“ وزیر چلا یا۔

حیدر علی نے غصے سے کہا:

”عابدی نہ بھوت نہ ہے اور نہ جہنم سے لوٹا ہے۔ تم دونوں نے اسے قتل کیا تھا مگر یہ بھول گئے تھے کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے۔ عابدی ریاست بد نور کا متبلی اور اصل راجہ ہے۔ یہ حق اسے دیا جاتا ہے۔“

اس کے بعد حیدر علی وزیر سے مخاطب ہوئے:

اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا:

”پیارے بیٹے راجہ بدی۔ مجھ سے ایسی غلطی ہوئی تھی جسے تم شاید عمر بھر معاف نہ کر سکو۔“
”نہیں نہیں راجہ ماما۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“

راجہ مہادی نے جلدی سے کہا:

”مجھ ہو چکا ہے اس پر خاک ڈالیے۔ میں نے آپ کو دل سے معاف کر دیا ہے۔ آپ میری طرف سے بالکل اطمینان رکھیے۔“

راجہ بیٹے۔ تم کہتے ہو تو ماننے لیتی ہوں۔“

راجہ ماما نے سر دھکے کھینچی:

”مجھے اس کیلئے دیوان (وزیر) نے ایسا بھڑکایا کہ میں اپنے بیٹے کے خلاف ہو گئی۔ ہاٹے میری آنکھوں پر بالکل پردہ پڑ گیا تھا۔ اچھا یہ بتاؤ حیدر علی کب واپس آ رہے ہیں؟“

”یہ تو انہوں نے نہیں بتایا تھا۔ راجہ مہادی نے کہا:

”مگر صوبہ بھی آئیں گے۔ ادھر ہی سے گزریں گے۔ منگور سے مرا جانے کا راستہ ہماری ریاست ہی سے گزرتا ہے۔“

”ہوں۔“ رانی نے لمبی سی ”ہوں“ کہہ کر سانس لی اور خاموش ہو گئی۔ مہادی کچھ دیر اسی منہ تکتا رہا۔ پھر پوچھا:

”راجہ ماما۔ آپ کچھ پریشان معلوم ہوتی ہیں۔ کیا ہوا ہے آپ کو۔ مجھے بتائیے۔“

”میرے بیٹے! رانی نے ایک اور ٹھنڈی سانس بھری:

”تمہارے سوا میرا اور کون ہے نہ مرد نہ بیٹا بیٹی۔“

پھر چند لمحے ٹھہر کر بولی:

”تم نے دیوان سے قوریاست پہچانی لیکن۔“

وہ پھر خاموش ہو گئی۔

راجہ مہادی گھبرا گیا:

”آپ کہتے کہتے رک کیوں گئیں۔ بتائیے کیا بات ہے؟“

راجہ بیٹے! تم نے منگور حیدر علی خاں کو دے دیا۔ یہ تو اچھا کیا۔ اسے بد نور سے دور دور

ہی رکھنا اچھا ہے۔“ رانی سانسوں کی سرسراہٹ میں کہہ رہی تھی۔ ”وہ اگر بد نور کی طرف سے واپس نہ

اگلی صبح مہادی کی تاج پوشی ہوئی۔

رانی نے بڑے پیار سے اسے دھما بنایا۔ تاج پوشی کے بعد عزیزین اور عوام نے راجہ مہادی کی خدمت میں نذرانے پیش کیے۔ نقد رقم اور پیش قیمت مخالف۔

حیدر علی خاں کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ کئی لاکھ نقد رقم تھی اور لاکھوں کے نذرانے۔ انہوں نے سوچا کہ لوگوں نے بد نور کی دولت مندی کے بارے میں سچ ہی کہا ہے۔ اتنی دولت تو بڑے بڑے راجاؤں میں نہ ہوگی۔

راجہ مہادی نے کھڑے ہو کر اعلان کیا:

”حیدر علی خاں نے جس بد کردار اور ننگ حرام وزیر سے مجھے اور بد نور کے باسیوں کو نجات دلائی ہے۔ وہ گورنر ہونے کے باوجود ہمارے مفاد کے لیے شکر کے نذرانے میلا آئے تکلیف اٹھائی۔ اس کے صلہ میں حیدر علی خاں کی خدمت میں منگور کی بندرگاہ مع اس کے متعلقہ مصافحات کے پیش کرتا ہوں۔ امید ہے کہ وہ میری اس ناچیز پیش کش کو شرف قبولیت عطا فرمائیں گے۔“

حیدر علی خاں نے وہاں مزید ایک روز اور قیام کیا۔ پھر منگور کا قبضہ لینے کے لیے لگے بڑھے۔ چونکہ واپسی کا راستہ بد نور ہی سے ہو کر گزرتا تھا اس لیے انہوں نے مہادی سے کہا:

”راجہ مہادی۔ اس وقت تو میں منگور جا رہا ہوں اس لیے تمہاری خوبصورت ریاست کی سیر نہیں کر سکتا لیکن واپسی پر دو چار دن تمہارے پاس ٹھہروں گا۔ پھر ریاست کی سیر ہوگی۔“

راجہ مہادی خوش ہو گیا۔ حیدر علی خاں نے اسے خدمت کا موقع دیا تھا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ جب حیدر علی منگور سے واپس آئیں تو ان کا شاندار استقبال کیا جائے۔

اعلان ہوتے ہی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ بد نور کے عوام بھی حیدر علی کے احفاند تھے۔ برہمن وزیر نے پوری ریاست کو الٹ پلٹ کر دیا تھا۔ اگر حیدر علی، مہادی کو واپس لا کر راجہ نہ بناتے تو یہ نہیں وزیر اور کی لگھلگاتا۔ اچھا ہو کہ وزیر، حیدر علی کے حکم سے مارا گیا۔

حیدر علی خاں کے بد نور سے نکلتے ہی رانی ماں نے پھر سازش کا جال بچھایا۔ اس مرتبہ اس نے کسی اور کے بجائے بد نور کے نئے راجہ مہادی کو اپنے بال میں پھانسا۔ وہ راجہ کے پاس گئی

نہ جائے تو بہت اچھا ہو۔

”کیوں کیوں راج مانا۔ بات کیا ہے۔ آپ مجھے بتائیے نا!“ عابدی کو اور زیادہ فکر ہو گئی۔
”راج بیٹے۔ چاہے تم یقین کرو یا نہ کرو مگر میں یہی چاہتی ہوں کہ ایک بار تمہارے ہاتھ میں
ریاست کی باگ ڈور آگئی ہے اور اب نہ ٹھٹھا چلے گا۔
راج مانا چاہا اور الفاظ کو دبا دبا کر بول رہی تھی۔
”کیا کروں۔ میری زبان رکتی ہی نہیں۔ میرے آدمیوں نے بتایا ہے کہ حیدر علی خاں کے ارادے
کچھ اچھے نظر نہیں آتے۔“

عابدی چونک پڑا۔
”سچ بتائیے راج مانا۔ کیا ارادے ہیں حیدر علی خاں کے۔ آپ کے آدمیوں نے آپ کو
کیا بتایا ہے؟“
”ہاں۔ میں تمہیں ضرور بتاؤں گی۔ چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔“ راج مانا نے بڑے

عزم سے کہا،
”میرے آدمیوں نے حیدر علی خاں کو اپنے مافیوں سے کہتے سنا ہے کہ وہ واپسی پر بد نور پر قبضہ
کر کے تمہیں معزول کر دے گا۔“
”نہیں نہیں راج مانا۔ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ انہوں نے خود مجھے راج گدی دلائی ہے۔ وہ ایسا کیوں
کرے گی؟“

عابدی بے چینی ماہو گیا۔
”تم بہت بھولے ہو راج بیٹے۔“ رانی گھل کے بولنے لگی:

”کیا تم نہیں جانتے کہ یہ وہی حیدر علی ہے جس نے راج میسور کو معزول کر کے مرگٹا پٹم پر قبضہ
کر لیا ہے۔ اس نے سرائی صوبہ دار کی بھی چالبازی سے حاصل کی ہے۔ ندی پر اس نے قبضہ کیا۔ بالاپو
کو اس نے شایا۔ پگنڈہ کے راج مرادی راؤ کو گرفتار کر کے قید کیا اور دہان اپنا مسلمان گورنر مقرر کر دیا
پھر بھلا وہ بد نور جیسی ریاست کو کیسے چھوڑ سکتا ہے۔“

”تم یہ بھی جانتے ہو کہ منگھور کو راستہ بد نور سے ہو کر جانا ہے۔ وہ اپنے راستے میں کسی ہندو
کی ریاست کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ اس نے تو میسور کے وزیر برادران کو بھی مرگٹا پٹم سے نکال باہر
کیا۔ حالانکہ وزیر مند راج کے اس پر ہزاروں احسان تھے۔ اسی کی کوششوں سے حیدر علی، نواب حیدر

خاں بنا تھا۔

راج مانا نے ایسا زہر گدلا کہ عابدی کے کان اور آنکھیں بالکل بند ہو گئیں اور وہ پوری طرح
اس کے قبضے میں آگئی۔

”راج مانا پھر تم ہی کچھ اس علاج کر دیجئے اس زہریلے ناگ سے بچاؤ۔“
رانی آنکھوں میں آنسو برساتی۔ پھر دندھے گلے سے بولی:

”میرے راج بیٹے۔ کان میں تمہارے لیے کچھ کر سکتی۔ میرے پاس تو بس ایک جان رہ گئی
ہے۔ وہ میں تم پر بھروسہ کر سکتی ہوں۔“

”پھر تم مجھے بناؤ راج مانا۔ میں کیا کروں۔ اس مصیبت سے کس طرح چھٹکارا پاؤں۔“ عابدی
کھڑا ہو کر ٹپکنے لگا۔

”بیٹے۔ میں تو یہی کہہ سکتی ہوں کہ ریاست کے عقلمندوں اور فوج کے بڑے بڑے افرادوں سے
مشورہ کرو۔ وہی کوئی راستہ بتا سکتے ہیں۔“ راج مانا نے آخر اسے ہکا کے دمبا اور راستہ بھی
خود ہی بتایا۔

”مگر راج مانا۔ میں افرادوں سے حیدر علی کے خلاف کیسے کہہ سکتا ہوں۔“
عابدی گھبرا گیا:

”وہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ میں نے خود ہی حیدر علی کو بلایا ہے۔ راج مانا! میری ماں! تم ہی ان
لوگوں سے بات کرو نا!“

”یہی تو راج مانا چاہتی تھی۔ وہ ٹھنڈی مائیس لے کر بولی:

”اچھا راج بیٹے۔ میں کوشش کرتی ہوں۔ دیکھو کیا ہوتا ہے!“

مذہب کے نام پر بڑے بڑے فتنے ابھارے گئے۔ سازشوں کے جال بنے گئے اور خوب خوب
قتل و غارت ہوئی۔ خاصی طور پر ہندو مسلم قوموں کے اختلاف نے تو تخت و تاج تک الٹ کے
رکھ دیے ہیں۔

حیدر علی خاں کے معاملہ کو دیکھیے۔

ان کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ وہ مسلمان تھے اور برصغیر میں اکثریت ہندو قوم کی تھی اس لیے

پورا انتظام خود سنبھال لیا۔ پھر سراکھو بیدار بن بیٹھا۔ نندی، بالاپور اور چنگڑہ کے راجاؤں کو قید کر کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ سب وہ بدلتے پرتقبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اگر اس نے ایک بار قبضہ کر لیا تو پھر وہ یہاں سے نہیں نکلے گا۔

اگر آپ سب لوگ ساتھ دیں تو اس بلا کو ٹالا جاسکتا ہے ورنہ پھر اس ہندو ریاست پر ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے گا۔

ہندو قومیت کے نام پر پنڈت بھڑک اٹھے۔ حیدر علی خاں کے بارے میں اگرچہ انہیں کچھ بھی خبر نہ تھی۔ برخلاف اس کے وہ رانی کے گھناؤنے کردار سے اچھی طرح واقف تھے۔ رانی اور اس کے دیوان کی عیاشیوں اور عشرت پسندیوں کے نظارے انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے مگر وہ اول و آخر ہندو تھے۔ حیدر علی خاں نے انہیں ایک بدکار رانی اور زانی دیوان سے نجات دلائی تھی مگر اس وقت وہ اسی بدکار رانی کو ریاست کا سب سے بڑا ہی خواہ سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے نہ صرف رانی کی بل میں بل ملانی بلکہ اسے اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا۔

رانی کے بعد ریاست کے نئے راجہ مہادی نے تقریر کی۔ اس نے رانی کی باتوں کو سراہا اور لوگوں کو بتایا کہ وہ راج مائے کے ساتھ ہے اور اس سلسلے میں وہ جو بھی قدم اٹھائیں گی وہ ان کے ساتھ ہوگا۔

پنڈتوں نے جب راجہ مہادی کو بھی رانی کے ساتھ دیچی توان کے دلوں میں اگر کچھ شک و شبہ تھا تو وہ بھی ختم ہو گیا۔ اب رانی نے پنڈتوں کی مدد سے سازش کی کڑیاں جوڑنا شروع کر دیں۔ سازش کا ناما بنایا گیا۔

ہر پہلو پر غور کیا گیا کیونکہ یہ زندگی اور موت کا کھیل تھا۔ سازش کا میاب ہوتی تو راج مانا کے پڑاواہ اور اگر سازش پکڑی گئی تو کچی گردنیں حق سے جدا ہو جائیں گی۔

پھر جب سازش مکمل ہوئی تو اس میں ناکامی کا ایک فیصد بھی امکان نہ تھا۔ اس سلسلے میں بڑی راز داری برقی گئی تھی۔

سازشیوں کا ہر اجلاس کسی مندر میں ہوتا تھا جس میں راجہ بد نور راج مانا اور چھ پنڈت شریک ہوتے۔ کہا یہ جانا کہ راجہ اور راج مانا مندر میں پرا دھنا کرنے آئے ہیں جبکہ اس پرا دھنا کی آڑ میں اس منصوبے کی عملی صورتوں پر غور ہوتا تھا۔

وہ مسلم اقلیت کی حکمرانی کسی طور برداشت کرنے پر آمادہ نہ تھی۔

یسو میں پہلے گنگا رام نے بغاوت کی تو اس نے سب سے پہلے حیدر علی خاں پر یہ تہمت دھری کہ وہ مقصد ہیں اور ہندوؤں سے نفرت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یسور میں ہندوؤں کی اکثریت تھی اس لیے وہاں کا سب سے سالار مسلمان کے بجائے ہندو ہونا چاہیے۔

اس بغاوت کا خاتمہ ہوا تو کھانڈے راؤ کھڑا ہو گیا۔

کھانڈے راؤ حیدر علی خاں کا نائب تھا۔ حیدر علی نے خود اسے یسور کا وزیر بنایا تھا مگر اس نے نیک حاکمی کی اور بغاوت پر اثر آیا۔ مگر حیدر علی حتیٰ پر تھے۔ فتح ان کی ہوئی اور کھانڈے راؤ اپنے انجام کو پہنچا۔

اب بد نور کا معاملہ درپیش تھا۔

بد نور کا متنبی مہادی خود فوجی مدد حاصل کرنے حیدر علی خاں کے پاس آیا۔ حیدر علی خاں نے اس کی مدد کی اور اسے بد نور کا راجہ بنوا دیا۔ مگر جب بدکار رانی نے اس کے سامنے "مسلمان" کا لفظ رکھا تو وہ ہلک گیا۔

اس نے یہ نہ سوچا کہ اگر حیدر علی خاں کو بد نور پر قبضہ کرنا ہی تھا تو اس نے مہادی کو راج گدی پر کیوں بٹھایا۔ بد نور اس نے بزورِ شمشیر حاصل کیا تھا۔ وہ بد نور پر قبضہ کر کے وہاں کی تمام دولت اپنے ساتھ لے جاسکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا!

حیدر علی کے اس سلوک، نیکی اور احسان کا بدلہ یہ دیا گیا کہ احسان فراموش مہادی ریاست کی بدکار رانی کی سازش میں شریک ہو گیا اور سازش بھی اس قدر خطرناک کہ حیدر علی خاں کی گودری تو الگ رہی، خود اس کی زندگی کا تختہ ہی الٹ دینے کا منصوبہ بنایا گیا۔

رانی نے مندر دلوں کے بڑے بڑے پنڈتوں کو اکٹھا کیا اور ان کے سامنے ایک زہر آلود تقریر کی۔ اس نے کہا:

"حیدر علی خاں نہ صرف ایک نیرملک کا ہے بلکہ اس کا مذہب بھی ہم سے الگ ہے۔ وہ مسلمان ہے اور مسلمان جس ملک میں گھس جاتا ہے پھر وہاں سے نہیں نکلتا۔

حیدر علی کی گودری زندگی ہمارے سامنے ہے۔ مرزا گاپٹم پر اس نے قبضہ کیا۔ ہزار سال کے حکمران راجہ خاندان کو بے دخل کر کے ریاست یسور کا

آخر ایک دن سازشیوں کی محفل میں اعلان ہوا کہ تمام کام مکمل ہو گیا۔ پس اب حیدر علی خاں کے آنے کی دیر ہے۔ اس کے آتے ہی وہ کچھ حاصل ہو جائے گا جس کے لیے وہ لوگ اتنے دنوں سے جدوجہد کر رہے تھے۔ پس حیدر علی خاں کے منگور سے واپس آنے کا شدت سے انتظار ہونے لگا۔

حیدر علی خاں ایک صاف دل سپاہی تھے۔ ان کے دل میں چل کیٹ نہ تھی۔ راجہ مہادی نے اسے منگور کا بندرگاہ کا علاقہ اور اس کے متعلقہ مضافات اس کی گراں مہاندات کے صلہ میں دیے تھے۔ اس نئے علاقہ کے انتظام و انصرام کے لیے حیدر علی خاں نے اپنے لشکر کے منگور کئے راجہ مہادی کا فرمان ان کے پاس تھا اس لیے انہیں بندرگاہ کی طرف سے کسی مزاحمت کا خیال نہ تھا۔ ناظم بندرگاہ ایک لشکر کے بندرگاہ کی طرف آنے کی اطلاع سے بہت پریشان تھا۔ اس نے اپنے جاسوسوں سے معلومات حاصل کیں۔ اسے صرف یہ بتایا گیا کہ یہ لشکر مراٹھے گورنر حیدر علی خاں کا ہے۔ ان کے آنے کا مقصد بالکل معلوم نہ ہو سکا۔ بندرگاہ کا ناظم پریشان تھا کہ آخر حیدر علی خاں کو منگور کرنے کی کیا ضرورت پڑی۔ منگور ریاست بد نور کے ماتحت تھا۔ ریاست چونکہ امیر تھی اس لیے منگور میں ایک مختصر سی بحری فوج موجود تھی جو منگور کی سول آبادی کی انتظامیہ کی بھی ذمے داری تھی مگر اس مختصر فوج اور حیدر علی خاں کے لشکر کا کیا مقابلہ تھا!

ناظم اسی ادھیڑ میں تھا کہ اس کے ملازم نے اطلاع دی:

”نواب حیدر علی خاں گورنر صاحبہ سرا کا ہر کارہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

ناظم خوش ہو گیا!

اسے عزت سے اندر لے آؤ!

اس کی مشکل آسان ہو گئی تھی۔ حیدر علی خاں نے خود اپنا آدمی اس کے پاس بھیج دیا تھا۔ اب اس کی تمام الجھنیں دور ہو جائیں گی۔

ناظم کا ملازم دوبارہ اندر آیا تو اس کے ساتھ ایک فوجی سپاہی تھا جس کی کمر میں ایک طرف بجنر اور دوسری طرف تلوار لگی ہوئی تھی۔

ناظم نے اسے دلچسپی سے دیکھا۔ فوجی نے اسے وحشیانہ سلام کیا اور بغیر کچھ کہے ایک بند لٹافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

ناظم نے لاپرواہی سے لٹافہ لیا اور اسے چاک کر کے خراب پڑھنے لگا۔ جوں جوں وہ خراب پڑھتا تھا اس کے چہرے کا رنگ بدلتا جاتا تھا۔

خراب پڑھنے کے بعد وہ گھبراہٹ سے نکل گیا۔ ناظم کا ملازم اور حیدر علی کا سپاہی اس کی بوکھلاہٹ پر مسکرائے بغیر نہ سکے۔

اسی وقت بندرگاہ کا گھنٹہ زور زور سے بجنے لگا۔ یہ گھنٹہ انسانی ضرورت کے وقت بجا جاتا تھا۔ اس کی آواز سننے ہی برہم اور بحری افسر کا فرض ہوتا تھا کہ وہ جلد سے جلد ناظم بندرگاہ کے دفتر پر پہنچ جائے۔

گھنٹے کی آواز اس کے ملازم اور سپاہی بھی باہر آ گئے۔ ناظم اس وقت بھی سرگھ کاٹے خط پڑھ رہا تھا اور بندرگاہ کے افسران ایک ایک دودھ کر کے تیر نیز قدموں سے دفعت کی طرف آ رہے تھے۔

ناظم نے خط پڑھنا بند کر دیا۔ تمام افسر اکٹھے تھے اور ان کی نظریں ناظم پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے سکوت توڑا:

”اے منگور کے بری اور بری افسران! آپ کو یہ جان کر یقیناً خوشی ہوگی کہ آپ کی بندرگاہ منگور اور اس سے ملحقہ تمام مضافات اب ریاست بد نور سے نکل کر صوبہ سرا کے گورنر نواب حیدر علی خاں کے قبضہ اقتدار میں آ گئے ہیں۔ ریاست بد نور کے نئے راجہ مہادی نے اپنے ایک فرمان کے ذریعے اس امر کی اطلاع ہمیں بخوائی ہے۔“

اس کے علاوہ آپ اور ہم سب کے لیے ایک اور خوشی کی بات یہ ہے کہ منگور کے نئے حکمران یعنی نواب حیدر علی خان بہادر اپنے نئے علاقے کا دورہ کرنے آپ کے ہمیں اور کوئی دم میں یہاں پہنچنا چاہتے ہیں۔ آپ ان کے استقبال کے لیے تیار ہو جائیے میں انہیں لینے جا رہا ہوں۔

ایک افسر نے چلا کر کہا:

”ہم اپنے نئے حکمران کو لینے کیلئے آپ کے ساتھ چلیں گے۔“

ناظم نے ایک لمحہ سوچا پھر بولا:

”ٹھیک ہے آپ بھی چلیے مگر راستے والوں کو خبر کرتے چلیے تاکہ وہ اپنے حاکم کے استقبال کے لیے تیار رہیں۔“

ذرا دیر میں منگور کے نئے حاکم کے آنے کی خبر بندرگاہ والوں کو ہو گئی اور پھر یہ جزر منانات تک پہنچ گئی۔

پھر کیا تھا! ناظم بندرگاہ کے دفتری طرف لوگوں کا ایک سیلاب امڈ پڑا۔ ایک تو لوگوں کو اس بات کی خوشی تھی کہ انہیں ریاست بد نور کی بدکارانی اور عیاش دیوان سے چھٹکارا ملا۔ دوسری خوشی یہ کہ ان کا نیا حاکم ایک مشہور و معروف سردار تھا جس نے مرہٹوں جیسے مضبوط لشکر کو شکست دی تھی۔

ناظم بندرگاہ نے حیدر علی خاں کے پڑاؤ پر پہنچ کر اپنے آنے اور حاضر ہونے کی درخواست کی۔ ناظم بندرگاہ ہی اس علاقے کا حاکم تھا۔ حیدر علی خاں نے اسے بلایا اور عزت سے بٹھایا۔

ناظم نے منگور اور اس پاس کے علاقوں کے حالات سے بھی حیدر علی کو آگاہ کیا۔ خاص طور پر ناظم نے پزیرگیوں کا ذکر کیا جو بد نور کے علاقوں پر اکثر تاخت و تاراج کرتے رہتے تھے اور کبھی کبھی منگور تک بھی پہنچ جاتے تھے۔

ناظم کے اصرار پر حیدر علی مع اپنے لشکر کے بندرگاہ کے دفتری طرف چلے۔ ان کی منظم اور بزرگ فوج نے جب باجوں کے ساتھ کوچ کیا تو سناں بندہ گیا۔

دور درہ منگور کے عوام کھڑے تائیاں بجا رہے تھے اور نئے حاکم کی جے کا دروہے تھے۔ بعض لوگ فوج پر پتوں کی بیتیاں بچھا کر رہے تھے۔

حیدر علی خاں گھوڑے پر سوار فوج کے آگے آگے تھے۔ ان کے برابر منگور کا ناظم تھا جو بلد میں گھبرا کر پیدل ہی حیدر علی کے پڑاؤ پر بھاگا چلا آیا تھا۔ حیدر علی نے اسے گھوڑا دیا تھا اور وہ ان کے ساتھ ہی آگے چل رہا تھا۔

یہ جلوس اسی شان سے چلتا ہوا سمندر کے کنارے ناظم کے دفتر پر پہنچا۔ ناظم نے دفتر والوں کا حیدر علی سے تعارف کرایا۔

حیدر علی نے تمام ملازمین کو ایک ایک ماہ کی تنخواہ معاف تھیں کرائی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ حیدر علی صرف بلاور ہی نہیں اور بادل بھی ہیں۔

حیدر علی خاں منگور میں دو تین دن سے زیادہ ٹھہرا نہیں چاہتے تھے لیکن منگور والے اس قدر

پُر خلوص تھے کہ انہیں وہاں ایک ہفتہ قیام کرنا پڑا۔

اس دوران انہوں نے ناظم کے مشورے سے منگور اور منانات میں نئے لوگ مقرر کیے۔ اس کے بعد بد نور واپس ہوئے۔

انہوں نے راجہ عابدی کو اپنی واپسی کی اطلاع دے دی تھی۔ وہاں ان کے لیے حال چچایا جا چکا تھا بس ان کے پہنچنے کی دیر تھی۔

جس روز حیدر علی واپس جانے والے تھے، اس سے پہلے کی رات ان کے پاس سراسر ایک قاصد آیا۔ اس نے فوراً حیدر علی سے ملنے کی ہتھاک۔

سراسر قاصد کے آنے سے حیدر علی کچھ پریشان ہو گئے۔ پھر جب انہوں نے قاصد کو اپنے سامنے بلوایا تو اسے دیکھ کر انہیں تعجب سا ہوا۔

”تم سراسر آئے ہو؟“ حیدر علی ناں نے اسے گھور کر دیکھا۔

”جی صوبہ دار بہادر۔“ قاصد نے مختصر سا جواب دیا۔

”تمہیں کس نے بھیجا ہے اور کیا پیغام لائے ہو؟“ حیدر علی خاں کے لہجے میں ہلکی سی تلخی پیدا ہو گئی تھی۔

”صوبہ دار بہادر۔ میں سب کچھ تمہاری ہی عرض کر دوں گا۔“ قاصد نے جرات سے کہا۔

حیدر علی خاں نے پاس بیٹھے لوگوں کو اشارہ کیا۔ وہ سب اٹھ کر باہر چلے گئے۔

”ہاں اب بتاؤ تم کس کا اور کیا پیغام لائے ہو؟“ حیدر علی خاں کی آواز میں پوری گئی گرج پیدا ہو گئی تھی۔

”صوبہ دار بہادر۔ آپ مجھے اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے میں کوئی دشمن کوک آدمی ہوں۔“ قاصد نے اور زیادہ جھٹلے سے کہا۔

حیدر علی نے جواب میں کہا:

”تمہارا چہرہ اور حرکتیں کچھ ایسا ہی ظاہر کر رہی ہیں مگر یاد رکھو اگر تم نے مجھے فریب دینے کی کوشش کی تو میں تمہیں معاف نہیں کر دوں گا۔“

”صوبہ دار بہادر۔ میں نے جیسا سنا تھا آپ کو دیا ہی پایا۔“ قاصد نے کہا اور سر سے اپنی کپڑی اتار دی۔

اس کا سر منڈا ہوا تھا اور پہنچا پیر بالوں کا ایک گچھا اور چوٹی تھی۔ ہندو عام طور پر سر پر چوٹی رکھتے ہیں۔

حیدر علی نے اسے حیران نظروں سے دیکھا:

"اُس کا مطلب ہے تم ہندو ہو؟"

"جی صوبیدار بہادر۔ میں ہندو ہوں اور سراسے نہیں بلکہ بد نور سے آیا ہوں۔"

قاصد نے پُر سکون لہجے میں کہنا شروع کیا:

"میں نے اپنے آپ کو اس لیے چھپایا تھا کہ کہیں آپ کے فوجی مجھے گرفتار نہ کر لیں اور میں آپ کو اسی بات سے آگاہ نہ کر سکوں جس کے لیے میں اپنی جان، عقلی پر رکھ کر آ رہا ہوں۔"

"قاصد۔ تمہاری باتیں اب تک بہت پر اسرار ہیں۔ اپنی سچائی ثابت کر دو ورنہ تمہیں سخت سزا دی جائے گی۔"

حیدر علی خاں کا استعجاب اب تک ختم نہ ہوا تھا۔

بحر جہ ہندو قاصد نے راز پر سے پردہ ہٹایا تو حیدر علی پر ایک ساتھ کئی جذبے طاری ہوئے

اس کی جہت میں اضافہ ہوا۔

آنکھوں میں غضب کی ایک لہر دوڑی۔

پھر کمال غصہ سے اس کا جسم کانپنے لگا۔

ہندو قاصد کی نظریں حیدر علی پر قابو نہ رہیں جو خلا کو خالی خالی نظروں سے گھور رہے تھے۔ ان کی

یہ کیفیت، جسے کوئی نام نہیں دیا جاسکتا، کافی دیر تک قائم رہی۔

جب حیدر علی کو خود پر قابو حاصل ہوا تو انہوں نے اس ہندو جگت سے پوچھا:

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"کشن داس۔"

"شادی ہوئی ہے؟"

"جی نہیں!۔"

"نکاح باب، بہن بھائی، آگے پیچھے کوئی ہے؟"

"ایشور کی کراہے ماں باپ ٹوڈ بہنیں اور دو بھائی ہیں۔"

حیدر علی نے ایک ٹھنڈی سانس لی:

"کشن داس۔ خیال رہے اگر تمہاری بات غلط ثابت ہوئی تو تم اور تمہارا پورا خاندان قتل کر دیا جائے گا۔"

"صوبیدار بہادر۔"

"کشن داس بالکل پُر سکون تھا:

"جھوٹ کی یہ مزاحمت کم ہے۔ لیکن میں سچا ثابت ہوا تو صوبے دار بہادر کس حد تک سخاوت کا اظہار فرمائیں گے۔"

"کشن داس۔ اگر تو سچا ثابت ہوا تو حیدر علی کو قسم ہے وحدہ لا شریک کی کہ وہ اپنے عمن کا گھر دولت سے بھر دے گا۔ تو جو مانگے گا نہیں دوں گا! حیدر علی نے بڑے جوش سے کہا۔

حیدر علی خالد نے تالی بجا کر اپنے ساتھیوں کو بلایا اور ان کو بتایا:

"اس شخص کا نام کشن داس پنڈت ہے۔ یہ بد نور سے ایک ایسی جبر لایا ہے کہ جس سے

بے خبری مجھے اس چہان خانی سے اٹھا سکتی تھی۔ احسان فراموش نہادی اور بد نور کی آوارہ رانی نے ہمارے

احضادوں کا بدلہ ہماری موت کی صورت میں دینے کے لیے ایک زبردست جال بچھایا اور یہ شخص جس کی بات

قبیلہ نہ کہنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوئی، اگر ہمیں اس خوفناک منصوبے سے آگاہ نہ کرتا تو خدا ہی

بستر جاننا ہے کہ بد نور پہنچنے پر ہمارا کیا حشر ہوتا!۔"

حیدر علی خاں کے سرداروں پر سننا چھلکا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک جوشیلے مردار نے کہا:

"خدا آپ کو سلامت و زندہ تاقیامت رکھے لیکن ان تک حراموں کو عبرت ناک سزا ملنی چاہیے

اور کشن داس کو اتنا بڑا انعام ملنا چاہیے جس کا یہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"ایسا ہی ہوگا۔ انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ حیدر علی خاں نے کہا۔ پھر اسی مردار کو حکم دیا:

"یہ محترم پنڈت تمہارے حوالے ہیں۔ ان کی حفاظت کی جائے اور پوری طرح احترام برتا جائے

بد نور میں زندہ و سلامت ہمارے سامنے انہیں پیش کرنا۔"

صبح کو لشکر بد نور کی طرف روانہ ہوا۔

حیدر علی خاں نے روانگی سے پہلے ایک مردار کو حکم دیا کہ وہ بد نور پہنچے ہی راجہ مہادی اور راج مانا

کو حراست میں لے لے۔

دوسرے کو حکم ہوا کہ وہ ان پانچ پنڈتوں کو گرفتار کر لے جن کے نام کنش داس نے بتائے تھے۔
تیسرے سردار کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ وہ اس مندر کو گھیرے میں لے لے جس کی
نشان دہی کنش داس نے کی تھی۔

ان مرداروں کے کام کی ترتیب یہ رکھی گئی کہ سب سے پہلے مندر کو گھیرے میں لیا جائے۔ پھر
پنڈت گرفتار ہوں اور آخر میں راجہ اور راج مانا کو حراست میں لیا جائے۔

ان احکامات کے بعد لشکر بڑی تیزی سے دیاست بد نور کی طرف چلا۔ لشکریوں کو ان اندازات
سے یہ اندازہ فہم ہو گیا تھا کہ ان کے سردار کے خلاف کوئی زبردست سازش کی گئی ہے جس میں راجہ
راج مانا اور بد نور کے یہ پانچ پنڈت بھی شریک ہیں مگر سازش کی تفصیل انہیں معلوم نہ ہو سکی۔

حیدر علی خاں اپنے لشکر کے ساتھ شام کے وقت بد نور پہنچے۔

ان کے استقبال کی روایتی انداز میں تیاریاں کی گئی تھیں۔ استقبال کرنے والوں میں راجہ ہابدی،
راج مانا، تمام سرکاری عہدیدار اور عزیز بن شہر موجود تھے۔

حیدر علی خاں اپنے لشکر کے ساتھ اسی مکان پر پہنچے جہاں انہوں نے منگور جانے سے پہلے قیام کیا
تھا۔ اب اس مکان کو اندر باہر سے خوب آراستہ کیا گیا تھا مگر حیدر علی نے مکان سے کچھ دور پر اپنا
خیمہ لگوا دیا اور اس میں دربار لگایا۔

جب حیدر علی مکان کے اندر جانے کے بجائے خیمہ کی طرف پہلے تو راجہ ہابدی نے کہا:

"گورنر ہلوار۔ مکان میں آرام اور ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ پھر خیمہ میں ٹھہرنے کی کب
ضرورت ہے؟"

حیدر علی نے لاپرواہی سے کہا:

"ہابدی۔ میں معلوم ہے کہ تم نے مکان میں ہمارے آرام کی ہر چیز جیسا کہ رکھی ہے۔ اطمینان رکھو
مکان کہیں بھاگ نہیں جاتا۔ رات کو ہم وہیں قیام کریں گے۔"

ہابدی کے دل میں کوٹ تھا۔ حیدر علی خاں کا ہر لفظ اسے چھتا ہوا محسوس ہوا مگر وہ انہیں مکان
میں ٹھہرنے پر زور بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے کنکھیوں سے راج مانا کی طرف دیکھا جو اس سے زیادہ
پریشان تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔

حیدر علی کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے مگر راجہ ہابدی اور راج مانا کے دلوں میں پکھلے گئے

ہوئے تھے۔ وہ ہوں ہاں کرتے رہے۔

لتنے میں باہر ہلکا سا شور ہوا اور ایک محافظ نے خیمے میں داخل ہو کر عرض کیا:
"صوبے دار محترم۔ آپ کے حکم کے مطابق پانچوں پنڈتوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور انہوں
نے اقبال جرم بھی کر لیا ہے۔ مجرموں کو پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔"

راجہ ہابدی اور راج مانا کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا شاید وہ بھاگنا
چاہتے تھے۔ اسی وقت ایک سردار جو ان دونوں کی پشت پر کھڑا تھا بلولا:

"موجودہ بادلوں۔ مجھے راجہ اور راج مانا کو گرفتار کرنے کی اجازت دی جائے۔"
"ہم ان کی گرفتاری کا حکم پہلے ہی دے چکے ہیں۔ دوبارہ حکم دینے کی ضرورت نہیں۔" پھر
حیدر علی نے اطلاع دینے والے محافظ سے کہا:

"مجرموں کو اندل لانے کی ضرورت نہیں۔ ہم خود باہر آرہے ہیں۔ ان سب کی قسمت کا فیصلہ
میدان میں عوام کے سامنے کیا جائے گا۔"

حیدر علی خاں اپنے سرداروں کے ساتھ باہر آگئے۔ راجہ اور راج مانا نے بھی باہر جانے کا
ارادہ کیا مگر وہاں کھڑے سردار نے حکم دیا:
"تم دونوں ملزم ہو۔ اپنے آپ کو حراست میں سمجھو۔"

اس نے اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے بڑھ کر راجہ اور راج مانا کی مشکلیں کس دین
سرداران کو گرفتار کر کے باہر لایا۔
باہر ایک اور سی تماشہ نظر آیا۔

وہ مکان جس میں حیدر علی خاں کو رات میں قیام کرنا تھا اس مکان کے صحن اور تمام کمروں کے
فرش کھودے جا رہے تھے۔ درجن بھر سے زیادہ مزدور لگے تھے اور رٹے زور و شور کے ساتھ
کھدائی ہو رہی تھی۔

حیدر علی خاں کو یہ تو سنا دیا گیا تھا کہ سازش میں شریک پانچوں پنڈت گرفتار ہو گئے ہیں
اور انہوں نے اقبال جرم بھی کر لیا ہے۔ نیز اس مندر کو بھی گھیرے میں لے لیا گیا ہے جہاں سے ہر گز
کھود کے اس مکان تک لانا ہی تھی۔ پھر بھی وہ مرنگ اور مکان کے نیچے پھانٹے گئے بادلوں
کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے۔

حیدر علی خاں کے یہ لمحات بڑی بے چینی سے گزر رہے تھے کہ اچانک کسی طرف سے

”بارود — بارود — بارود“

حیدر علی خاں تیزی سے کھڑے ہوئے اور آواز کی طرف بڑھے۔
مکان کے کمرے، آنگن، برآمدے غرضیکہ مکان زمین کے جتنے رقبے پر تعمیر کیا گیا تھا اسے
جس جگہ سے بھی کھودا گیا، اس کے نیچے بارود بھرا ہوا تھا۔

اس وقت حیدر علی خاں کے لشکر کے علاوہ بد نور کے حامدین اور سرکاری افسر بھی وہاں موجود
تھے۔ حیدر علی نے ان سب کو حکم دیا کہ وہ بارود کو ہاتھ سے چھو کے دیکھیں کہ وہ اصلی ہے یا نقلی۔
اور پھر اپنے راجہ اور راجا کی غداری و غلامی پر آنسو مائیں۔

حیدر علی خاں نے کشن داس کو بلا کر اپنے پاس کھڑا کر لیا تھا۔ پھر وہ شہر کے معززین کے
ساتھ اس مندر تک گئے جہاں سے سرنگ کھود کر اس مکان کے نیچے تک لائی گئی تھی۔
کشن داس نے سرنگ میں اتر کر حیدر علی خاں کو وہ فلیٹ بھی لاکر دکھایا کہ جس میں آگ لگا

کر پورے مکان کو اڑا باٹا تھا۔

حیدر علی خاں کے حکم پر کشن داس نے مازشی کی تفصیل اس طرح بیان کی:

”صوبے دار بہادر کے منگور جانے کے بعد راجا مانا نے راجہ جہادی
کو یہ کہہ کر بھڑکایا کہ حیدر علی خاں منگلور سے واپس آکر بد نور پر قبضہ کر
لیں گے اور راجہ کو نکال باہر کریں گے۔“

راجا مانا نے راجہ سے یہ بھی کہا کہ حیدر علی خاں مسلمان ہیں اور تم
ہندو ہو۔ اس لیے حیدر علی نہیں راجہ نہیں رہنے دیں گے۔ بہتر یہ ہے
کہ حیدر علی کو بد نور واپس آتے ہی بارود سے اڑا دیا جائے۔

راجا مانا نے مازشی کو کامیاب بنانے کی ذمہ داری خود اٹھائی۔ راجہ
جب خود بھی اس مازشی میں شریک ہو گیا تو پانچ بڑے مندروں سے
ایک ایک پنڈت بلا یا گیا اور ان سے کہا گیا کہ وہ (رافی) بد نور پر
کسی مسلمان کی کھراڑی بھول نہیں کرے گی اور حیدر علی کو بد نور آتے
ہی قتل کر دیا جائے گا۔

تمام پنڈتوں نے رافی کو اپنے نفعان کا یقین دلایا اور پتہ توڑوں کی

قسمیں کھائیں۔

میں اس مندر کا کچھ ٹاپنڈت ہوں۔ میرے بڑے پنڈت کو مازشی
میں شریک کیا گیا۔ راجہ اور پنڈتوں کی میٹنگ اسی مندر
میں ہوئی تھی۔

طے یہ پایا کہ اس مندر سے اندر ہی اندر اس مکان تک سرنگ
کھودی جائے جہاں حیدر علی ناں کو قید کرنا ہے۔ پھر اس سرنگ سے
بارود کے قیلے مکان کے نیچے پہنچا دیے جائیں۔ جب یہ کام ہو جائے
تو بارود کے ڈھیر سے اس مندر تک ایک فلیٹ لگا دیا جائے اور ایک
مقررہ وقت پر اس میں آگ لگا دی جائے۔ فلیٹ جلتا ہوا جب بارود تک
پہنچے گا تو مکان کے نیچے بچھا ہوا یہ بارود ایک دھماکے کے ساتھ پھٹے
گا اور پورا مکان اڑ جائے گا۔

اگر یہ مازشی کامیاب ہو جاتی تو بد نور کے رہنے والوں کے منہ
پر ہمیشہ کے لیے کالک لگ جاتی۔ بد نور کا اگر کوئی باقی کسی اور ملک
میں جاتا تو لوگ اس کے منہ پر تھوکتے اور کہتے کہ یہ اس ملک کا باقی
ہے جس نے اپنے ممان کو گھر ملا کر قتل کر دیا۔

مجھے جب پورے حالات کا علم ہو گیا اور مکان کے نیچے بارود
بچھایا جا چکا تو میرے ضمیر نے ملامت کی اور میں فوراً منگلور پہنچا اور میں
نے صوبے دار بہادر کو مازشی سے آگاہ کر دیا۔

یہ اتنی بڑی اور مکمل مازشی تھی کہ اگر کشن داس پنڈت منگلور پہنچ کر حیدر علی خاں کو آگاہ نہ
کرتا تو وہ گھناؤنی مازشی کا شکار ہو جاتے۔

عامدین شہزادہ معززین نے جب یہ باتیں سنیں اور مکان کے نیچے بارود کے قیلوں کو بچھا
ہوا دیکھا تو انہوں نے راجہ اور راجا مانا پر لعنتیں بھیجیں اور ان کے قتل کا مطالبہ کیا۔

حیدر علی خاں تمام لوگوں کے ساتھ پھر اس جگہ واپس آ گئے جہاں تمام مجرم موجود تھے۔ کشن داس
نے ایک بار پھر مازشی کی تفصیل ان لوگوں کے سامنے بیان کی۔

حیدر علی خاں نے مازشی کی سرغند راجا مانا کو قتل کرنے کا حکم دیا اور راجہ جہادی کو قید کی سزا

بادشاہ کی حیثیت سے یہ ان کا پہلا قدم تھا، اگرچہ انہوں نے شاہ یاسا خان کا لقب اختیار نہیں کیا۔

حیدر علی خاں جس وقت منگلوں میں تھے تو وہاں کے ناظم نے پرتگیزیوں کی شکایت کی تھی کہ وہ گاہے گاہے منگلوں پر حملہ کر کے لوٹ مار کرتے رہتے ہیں۔ پھر بد نور (حیدرنگم) میں انہیں بتایا گیا کہ پرتگیزیوں نے بد نور کے بعض علاقوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ نواب حیدر علی یہ بات کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ انہوں نے فوراً ایک لشکر تیار کیا اور پرتگیزیوں کے مرکز جزیرہ گوا پر حملہ کر دیا۔ گوا والے یہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ کوئی ان پر حملہ کر سکتا ہے۔ وہ علاقے کے چودھری بنے ہوئے تھے اور آٹھ دن ادھر ادھر لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ گوا جزیرہ تھا اس لیے وہ خود کو بالکل محفوظ سمجھتے تھے۔ آج تک اس جزیرے کی طرف کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔

جب گوا پر حیدر علی خاں نے حملہ کیا تو وہ آنکھیں مل مل کے دیکھ رہے تھے کہ وہ کونسی مخلوق ہے جس نے چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر سوار ہو کر پرتگیزی مرکز پر حملے کی جرأت کی ہے۔

پرتگیزی جو کچھ ہمیشہ دوسروں پر حملے کرتے تھے اس لیے انہوں نے جزیرے کی حفاظت کا کوئی مستقل اور معقول انتظام نہ کر رکھا تھا۔ حیدر علی کے لشکر کی کشتیوں سے اتر کر جزیرے میں داخل ہو گئے اور انہوں نے پرتگیزیوں کو تلوار کی دھار پر رکھ دیا۔

ظالم صرف ظلم کرنا جانتا ہے۔ اسے یہ خیال ہی نہیں ہوتا کہ اس پر بھی کبھی وار ہو سکتا ہے اور وہ بھی مکافات عمل کی زد میں آ سکتا ہے۔

حیدر علی خاں کے حملے کو پرتگیزیوں نے پہلے تو کوئی اہمیت نہ دی۔ وہ یہ سمجھے کہ یہ ساحلی پھیرے اور لیٹے ہیں جو بھٹی کا شکار کرتے کرتے جزیرے پر چڑھ آئے ہیں۔ پس وہ انہیں ڈرانے اور بھاگانے کے لیے تلواریں اور بند دقیں لے کر دوڑ پڑے۔

گم۔

پندرہ منٹ کے بعد ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ یہ پھیرے یا لیٹے نہیں بلکہ خدا کا قہر ہے جو ان پر نازل ہوا ہے اور ان کے مظالم کا بدلہ لے رہا ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ پرتگیزی پورے جزیرے میں بھاگتے اور چھپتے پھرے اور حیدر علی خاں کے لشکر انہیں قتل کرتے رہے۔

دی گئی۔

اس سائش میں جو پانچ پنڈت شامل تھے ان کے لیے حیدر علی نے کہا: "بد نور کے یہ پانچوں پنڈت اگرچہ کسی رحم کے مستحق نہیں کیونکہ یہ پوری طرح سائش میں شریک تھے لیکن میں مسلمان ہوں اور میرے مذہب اسلام کا حکم ہے کہ نہ تو کسی غیر مذہب کی عبادت گاہ کو نقصان پہنچایا جائے اور نہ کسی مذہب کے پیشوا کو تکلیف دی جائے بلکہ ان کی خطاؤں سے درگزر کیا جائے۔ اس لیے میں ان پنڈتوں کو صرف ملک بدر کرتا ہوں۔ وہ صبح ہونے سے پہلے بد نور کی حدود سے نکل جائیں۔

پنڈت کشن داس جس نے اپنی کوشش سے اس سائش کو ناکام بنایا ہے، میں اور میرے لشکر اس کے احسان مند ہیں۔ میں پنڈت کشن داس کو بد نور کے تمام مندروں کا ناظم علیاً مقرّر کرتا ہوں و دوسری طرف میں بد نور کو ایک بادشاہت میں تبدیل کرتا ہوں جس کا دار السلطنت بد نور رہے گا اور اس کے ماتحت ہر نگاہم، سزا اور میرے تمام مضبوط و مقبوضہ علاقے ہوں گے۔ کشن داس کو اس نئی سلطنت میں تمام غیر مسلم اقوام کا وزیر مقرر کیا جاتا ہے۔

غیر مسلم اقوام کے مذاہب میں کسی قسم کا دخل نہ دیا جائے گا اور ان کی ترقی اور بہبود کے لیے کشن داس جیسے میں راجہ کا لقب دیتا ہوں، کی ہر سفارش قبول کی جائے گی۔

حیدر علی خاں کو بد نور سے تقریباً بارہ کروڑ روپیہ کا خزانہ حاصل ہوا۔ بورنگ "ناریج حیدی" میں لکھتا ہے:

"اس فتح کی خوشی میں نواب حیدر علی خاں اپنی تمام سپاہ کو اور قلعہ داروں کو ڈیڑھ ڈیڑھ سال کی تنخواہ بطور انعام تقسیم کی اور تخت بد نور پر بحیثیت بادشاہ کنار جلوہ افروز ہوا۔"

ایک دوسرا انگریز مؤرخ لکھتا ہے:

"حیدر علی خاں کو یہ خدا داد فتح ایسی حاصل ہوئی کہ اس نے حیدر علی کو دفعۃً کسی سے تخت پر بٹھا دیا۔ تخت نشین ہو کر نواب حیدر علی خاں نے بد نور کا نام اپنے نام پر "حیدرنگر" رکھا اور اس کو بایہ تخت بنانے کے خیال سے وہاں جدید تعمیرات کی بنیاد رکھی۔"

نواب حیدر علی خاں نے حیدرنگر میں ایک محفل قائم کیا اور اپنے نام کے سکے ڈھلائے۔ ایک

آخر پرتگیزیوں نے صلح کی بات چیت کرنے کا فیصلہ کیا۔ دو رکنی ایک مصالحتی سفارت تیار ہوئی جسے گفتگو کے لیے جھولے میں بٹھا کر قلعہ کے باہر اتارا گیا۔ وہاں سے یہ سفارت حیدر علی خاں کے لشکر کی طرف چلی۔ ان کے ہاتھ میں سفید بھندے تھے اس لیے ان سے کوئی تعرض نہ کیا گیا۔ سفارت حیدر علی خاں کے لشکر میں پہنچی اور اسے باعزت طریقے سے حیدر علی کے خیمے میں پہنچا دیا گیا۔

حیدر علی کو پرتگیزیوں پر سخت غصہ تھا۔ انہوں نے سخت لہجے میں کہا: "ادبدبسی بد محتو! تم خود کو ناجبر مانتے ہو مگر ہندوستانیوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اپنی حکومت بنانے کے خواب دیکھتے لگتے ہو؟" اُسے بد نور کے بادشاہ! "دخدا کا ایک دن کر ڈر آیا، تمہیں معاف کیا جائے۔ ہم غلطی پر تھے۔ ہم اپنی خطا مانتے ہیں۔ آپ جو حکم دیں گے ہم اس پر عمل کریں گے۔"

دشمن پیردوں پر گر پڑا تھا۔ حیدر علی خاں نرم ہو گئے: "تمہیں ضمانت دینا ہو گی کہ تم گوا کے علاوہ سب حمل پر کسی اور جگہ قابض ہونے کی کوشش نہ کرو گے!"

"ہم ہر طرح سے ضمانت دینے کو تیار ہیں شاہ بہادر۔" سفیر نے کہا: "آپ جو طرح فرمائیں گے۔ ہم ضمانت دیں گے۔" "اچھا۔ پہلے سپاہیں ہندو قبیلے پیش کی جائیں۔" حیدر علی نے حکم دیا۔ انہوں نے جواب میں کہا:

"ہندو قبیلے ہم قلعہ سے جا کر لا دیں گے۔ اور کوئی شرط ہو تو فرمائیے!" "تم لوگوں نے گوا کے ساحل پر کاردار کے علاقہ پر قبضہ کر رکھا ہے۔ وہ ریاست بد نور کا حصہ ہے جسے ہم نے حیدرنگم کا نام دیا ہے۔ اس ساحلی علاقے کو فوراً خالی کر دیا جائے! حیدر علی خاں نے دوسری شرط پیش کی۔

سفارت نے یہ شرط بھی مان لی اور کہا: "کاردار کا علاقہ ہم خالی کر دیں گے مگر اس کے لیے ہمیں دو دن کا وقفہ دیا جائے۔"

اس بھاگ دوڑ اور مار کٹائی میں ایک گھنٹہ گزر گیا۔ اس وقت گوا کے پرتگیزی قلعہ داروں کو معلوم ہوا کہ ان کے جزیرے پر حملہ ہو گیا ہے اور منظم فوجی دستے پرتگیزیوں کا غایا کرتے ہوئے بڑھ رہے ہیں۔ پرتگیزی فوجی جلدی جلدی تیار ہو کر قلعہ سے باہر نکلے اور فوراً مورچہ بند ہو گئے۔ حیدر علی خاں اپنے دستوں کے ساتھ ہاتھ کاٹتے اور یلغار کرتے قلعہ داروں کے سامنے پہنچ گئے قلعہ کے باہر انہوں نے پرتگیزیوں کو مورچہ بند پایا۔

ایسے مورچوں کی وہ کب پر داہ کرتے تھے۔ انہوں نے ذرا اگلے حکم دیا۔ حیدر علی خاں کے لشکر بھوکے شیروں کی طرح پرتگیزی مورچوں پر ٹوٹ پڑے۔ دشمن کی تمام مورچہ بندی دھڑکی دھڑکی پرتگیزیوں کو ایسے جنگجو فوجیوں سے اب تک مبالغہ نہ پڑا تھا۔ وہ مدافعت میں قطعاً کام ہو گئے اور مورچے چھوڑ کر قلعہ کی طرف بھاگے۔

حیدر علی خاں نے بھاگنے والوں کا قلعہ کی دیواروں تک تعاقب کیا۔ اس سپاہی پر پرتگیزیوں کے بہت سے سپاہی مارے گئے اور بچے کچھ سپاہی قلعہ میں داخل ہو گئے اور دروازہ بند ہو گیا۔

حیدر علی اپنے ساتھ قلعہ شکن سامان نہیں لائے تھے اس لیے انہوں نے حکم دیا کہ قلعہ کی فسیل کے نیچے سڑنگ کھود کر اس میں بارودی کھڑیاں بھری جائیں اور کھڑیوں میں آگ لگا کر فسیل کو اڑا دیا جائے۔

حیدر علی کے حکم پر ایک وقت دوسرے سڑنگیں کھودنا شروع کی گئیں۔ ایک دن اور ایک رات کی محنت سے دونوں سڑنگیں فسیل تک پہنچ گئیں۔ پرتگیزی یہ سب کچھ فسیل پر کھڑے دیکھ رہے تھے۔ وہ بے بس تھے۔ نہ قلعہ سے باہر آ کر لڑ سکتے تھے اور نہ سڑنگ کھودنے والوں کو روک سکتے تھے کیونکہ سڑنگیں زمین کے اندر ہی اندر کھودی جا رہی تھیں اور مٹی نکال نکال کر باہر جمع کی جا رہی تھی جس سے ایک ٹیلہ مابین لگا تھا۔

پرتگیزیوں نے مٹی کے ٹیلے سے اندازہ لگایا کہ سڑنگیں تقریباً مکمل ہو گئی ہیں۔ پھر جب انہوں نے یہ دیکھا کہ حیدر علی خاں کے لشکر کی پہاڑیوں پر سے سوکھے درخت کاٹ کاٹ کر لا رہے ہیں اور ان کے ٹکڑے کر کے ایک جگہ ڈھیر کر رہے ہیں تو انہیں پورا یقین ہو گیا کہ اب کھڑیاں سڑنگوں میں بھری جائیں گی اور ان میں آگ لگا کر فسیل کو اڑا دیا جائے گا۔

اس صورت حال نے ان میں کھلبلی مچادی اور پرتگیزیوں کے بڑے بڑے سردار سر جوڑ کے بیٹھ گئے۔

”وقفہ دیا جاسکتا ہے مگر وہاں سے سوائے اسلمہ کے اور کوئی سامان لانے کی اجازت نہ ہوگی
سارا سامان وہیں چھوڑنا ہوگا۔“

حیدر علی خاں کی یہ شرط بہت سخت تھی مگر پرتگیزیوں کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑا۔ یہ ان کی زندگی اور موت
کا سوال تھا۔ اگر وہ ایک شرط بھی قبول نہ کرتے تو قلعہ رام کی تفصیل کہ مرنگوں میں آگ بھڑکنا شروع ہوجاتا
اور قلعہ جو پرتگیزیوں کی آخری پناہ گاہ تھی، تباہ ہوجاتا۔

چنانچہ —

پرتگیزیوں نے حیدر علی خاں کی تمام شرائط کو بلا چون و چرا تسلیم کر لیا۔

پرتگیزی سفارت واپس گئی اور دو گھنٹے کے اندر عداوت ۵۰ ہندوئیں حیدر علی خاں کو بھجوا دی
گئیں۔

حیدر علی خاں کا لشکر قلعہ کے سامنے میدان میں بیٹھ گیا۔ ٹھہرا ہوا تھا۔ انہوں نے اعلان کر دیا
تھا کہ جب تک لہروار کا علاقہ خالی نہ کر دیا جائے، اس وقت تک شکر جزیرے سے ہرگز واپس
نہ جلتے گا۔

حیدر علی خاں نے اپنا ایک سردار اور کچھ لشکری ہاردار بھیج دیے تھے جو پرتگیزیوں کے انخلا کی
نگرانی کر رہے تھے۔ انہوں نے علاقہ سے سوائے اسلمہ کے کوئی سامان نہ اٹھانے دیا۔
پرتگیزیوں کا انخلا ایک ہی روز میں مکمل ہو گیا۔ اس کے بعد کاردار کا علاقہ متقی لوگوں کے سپرد
کر دیا گیا اور انہیں خوشخبری سنائی گئی کہ وہ اب نواب حیدر علی خاں، جو حیدرنگر کے تخت کے مالک
ہیں، کی رعیت ہیں۔

نواب حیدر علی خاں نے گواسے واپسی پر چند گھنٹے کاردار کے علاقے میں بھی گزارے۔ علاقہ
کے لوگوں سے ان کی ضروریات پوچھیں اور انہیں ضروری امداد دی۔ جو کام اور ضرورتیں فی الفور پوری نہ
ہو سکیں، ان کے لیے حیدر علی نے احکامات صادر کیے اور وہاں ایک ذیلدار مقرر کر کے اسے تاکید کی
کہ وہ حیدر علی خاں کو علاقہ کے حالات سے گاہے گاہے آگاہ کرتا رہے۔
ان تمام کاموں سے فارغ ہو کر حیدر علی خاں اپنی نئی مملکت حیدرنگر واپس آئے۔

موسم بہت حسین تھا۔

پھر سمندر کا کنارہ۔ تیز اور خشک ہوا کے چلتے ہوئے جھونکے۔ مگرے بادلوں کی اوٹ سے کبھی
بھی چہرہ دکھاتا ہوا چاند اور دور دور تک پھیلا ہوا سناٹا۔

ایسے موسم میں اور ایسے ماحول میں تو عشق کے ماردوں کی عید ہو جاتی ہے۔ مگر در دل اس موسم
میں گھر سے قدم نہیں نکالتے مگر عشق بیشتہ جوان اور لہو جوا نیاں تو موسم کا مزہ لوٹنے ساحل سمندر پر
بیر کرنے پہنچ جاتے ہیں۔
کیسے دور بجلی چمکی۔

بادلوں کی گود گرڈ اپٹ سے ساحل مالا باری پہاڑیاں گونج اٹھیں تو فوجوان نے قریب بیٹھی
دشیزہ کو مخاطب کیا:

”اب واپس جاؤ راجکمار دی بارش شروع ہونے والی ہے!“
بارش۔

اور راجکمار کی کھلکھلا کے ہنسی پڑی:

”علی! تم بارش سے ڈرتے ہو کیا؟“

”میں تمہاری وجہ سے کہہ رہا ہوں راجکمار!“ علی نے جواب دیا:

”میں گھوڑے پر دم کے دم میں پہاڑیاں پار کر جاؤں گا مگر تم بارش میں گھر جاؤ گی۔ تم راجکمار

راج محل جانا مشکل ہو جائے گا۔

”ضروری تو نہیں کہ میں راج محل واپس جاؤں۔“

راجکاری شوخی سے بولی:

”کیا تمہارا گھوڑا تمہارے ساتھ میرا وزن نہیں اٹھا سکتا۔ ایک دن تو تمہارے ساتھ جانا ہی ہے“

پھر آج ہی کیوں نہ چلی جاؤں؟

”نہیں راجکاری!“

علی نے نرمی سے سمجھایا:

”حالات ہمارے قابو میں ہیں۔ ہم انہیں بے قابو کیوں ہونے دیں۔ تم جلد سے جلد راج

بابا سے بات کرو۔“

علی۔ میں کیسے بات کروں؟

راجکاری بے بسی سے بولی:

”وہ مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں۔ اتنی محبت کرتے ہیں کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ اگر

انہوں نے انکار کر دیا تو میں جان دیدوں گی۔“

”واہ بہ کیا بات ہوئی!“

علی نے منہ بنایا:

”ایک طرف تم کہتی ہو وہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ دوسری طرف یہ ڈر بھی ہے کہ وہ

انکار نہ کر دیں۔ یہ بات ایک دن تو کھلنا ہی ہے۔ پھر دیر کیوں کرتی ہو؟“

”میری زبان نہیں کھلتی ان کے سامنے۔ ہاں اگر تم میرے ساتھ چلو تو۔“ راجکاری نے

بات ادھوری چھوڑ دی۔

”میں چلوں۔ اور تمہارے ساتھ؟“

علی نے راجکاری کو حیران نظروں سے دیکھا:

”کہیں تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟“

”بس ڈر گئے!“ راجکاری نے مذاق کہا:

”محبت کا سا رشتہ اتر گیا؟“

”میں تو نا نہیں راجکاری۔ لیکن کتنی موت مرنا نہیں چاہتا! علی نے بڑے عزم کے

ساتھ جواب دیا:

”تمہارے باپ کتنا نور کے راجہ ہیں راجہ۔ میں ان کے سامنے کوئی الٹی سیدھی بات کر بیٹھا

تو بھگے گرفتار کر کے جوتے لگوانے لگے۔ سمجھی کہ نہیں؟“

”مگر تم الٹی بات کر دے کیوں؟“

راجکاری نے اسے اور بنایا:

”سیدھی طرح کہہ دینا کہ میں آپ کی بیٹی سے محبت کرتا ہوں اور اس سے شادی کرنے کی آپ مجھے

اجازت دے دیں۔“

”ٹھیک کہتی ہو۔ بڑا اچھا راستہ دکھا رہی ہو۔“

علی نے جل کے کہا:

”ان کے پاس جانے سے تو یہ زیادہ آسان ہے کہ میں سمندر میں کود کے جان دیدوں!“

اس کے ساتھ ہی ایسی کڑا کے کی بجلی چلی اور بادل گر بے کہ خدا کی پناہ۔ پھر جو جھانچم بارش

ہوئی ہے تو بس اللہ سے اور بندہ ملے۔ چاروں طرف جل نکل ہو گیا۔ ندی نالے بہ نکلے۔

علی نے کہا:

”اتنی دیر سے کہہ رہا تھا کہ چلی جاؤ۔ بارش آنے والی ہے مگر تم کب سنٹی ہو کسی کی؟“

کنا نور کے راجہ کی بیٹی کے جسم پر اعلیٰ درجے کے ریشمی کپڑے تھے۔ بارش کی دھبہ سے لباس

اس کے جسم سے چپک گیا تھا اور علی اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”بڑے بے شرم ہو۔ دوسری طرف دیکھو۔“ راجکاری شرٹے جارہی تھی۔

علی کے جسم پر ایک مٹاؤنی کوٹ تھا۔ اس نے کوٹ اتار کر راجکاری کی طرف بڑھایا اور شرارت

سے بولا:

”لو۔ اسے پہن لو۔ شرم نہیں آئے گی۔“

راجکاری نے جلدی سے کوٹ لے کر پہن لیا۔ اسی وقت دو عورتیں اور دو مرد چھڑپاں اور بڑے

چھاتے لیے آتے دکھائی دیے۔

علی نے اشارہ کرتے ہوئے کہا:

”لیجیئے راجکاری صاحبہ۔ آپ کے درباری آگئے۔ اب میری ضرورت نہیں رہی۔ اجازت ہو تو

چلا جاؤں؟“

بزرگ نہیں: راجکمار نے جیسے حکم دیا:

”تم کہیں نہیں جا سکتے علی!“

”اچھا جناب۔ کہیں نہیں جائیں گے۔“ علی نے بڑی سعادت مندی سے ہتھیار ڈال دیے۔

کنا نور کی ہندو ریاست جزیرہ ہند کے مغربی حصے میں ساحل کے ساتھ ساتھ واقع تھی۔ اس علاقے کو کرا لیاچر والا کہنے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ یہاں مسلمانوں کی آمد آغاز اسلام ہی سے شروع ہو گئی تھی۔ عرب کے تاجر اور ملاح اس علاقے میں آتے اور آباد ہوتے دہتے تھے علاقہ زرخیز تھا اس لیے مسلمان یہیں آباد ہو گئے تھے۔

ان مسلمانوں نے ہندو آبادی پر بھی اثر ڈالا اور بہت سے خاندان مسلمان ہو گئے تھے۔ ان مسلم خاندانوں کو پالہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

جب پالہؤں کی طاقت بڑھی تو انہوں نے اس علاقے میں کئی چھوٹی چھوٹی زمینداریاں اور ریاستیں بنائیں لیکن مقامی ہندو آبادی اور ریاستیں انہیں پریشان کرتی رہتی تھی۔ مشہور مسلم سیاح ابن بطوطہ نے ان کے مفصل حالات لکھے ہیں۔

راجکمار مالابار کی سب سے طاقتور ہندو ریاست کنا نور کے راجہ کی پیاری اور لاڈلی بیٹی تھی۔ لاڈ پیار کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ راجہ کے صرف بی ایک اولاد تھی۔ راجکمار صرف پانچ سال کی تھی کہ اس کی ماں مر گئی تھی۔ راجہ بالکل اکیلا تھا۔ بے دے کے بھی ایک لڑکی تھی۔ ننھی سی جان۔ راجہ پریشان کہہ کرے تو کیا کرے۔

وہ چاہتا تو دوسری شادی کر سکتا تھا۔ مشکل سے ۱۰ سال کی عمر تھی مگر ننھی سی بچی کا چہرہ دیکھتا تو اٹھتے ہوئے جذبات سینے ہی میں گھٹ کر دم توڑ دیتے۔

پھر راجہ نے ایک فیصلہ کیا۔ یہ کہ وہ دوسری شادی نہ کرے گا۔ اس فیصلہ کے ساتھ ہی ننھی راجکمار اس کی تمام آرزوں، امیدوں اور محبتوں کا مرکز بن گئی۔

اس طرح راجکمار کی کمزوروں سے زیادہ خود راجہ کی گود میں پل کے جوان ہوئی۔ اس نے راجکمار کے ماتھے پر کبھی بل نہ پڑنے دیا۔ اس کی ہر خواہش پوری کی۔ اس لاڈ پیار نے راجکمار کی خوش خوش و خوش تو بنایا مگر بدتمیزی یا بے ہودگی کا اس میں شائبہ بھی پیدا نہ ہوا۔ راجکمار علی کے اندر باہر بھانگتی

دوڑتی پھرتی۔ جس طرف جاتی، ہاتھوں، تھلی جاتی۔

ایک سال پہلے بھی ایسا ہی بھگتا موسم تھا۔ بادلی گھر سے ہوئے تھے اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ راجکمار گھوڑے پر سوار۔ جنگلی ہرن کی طرح اڑتی پھر رہی تھی کہ اچانک اس کے سامنے علی آگئی۔

نوجوان، سبیلہ جوان، سرخ و سفید رنگ، چوڑا سینہ، نکلا ہوا قد، منگنی گھوڑے پر سوار، ایک طرف لٹکتی تلوار، دوسری جانب اڑسا ہوا خنجر۔ ہاتھ میں کمان اور کمان میں جڑا ہوا نیزہ۔ وہ شکار کا پیچھا کرتا ہوا راجکمار کی کے سامنے آگئی۔

دوڑنے کی اڑتی جوانی، چلتے جذبات، نظروں میں حجاب اور بے حجابی کی بل کھاتی لہریں۔ جوان نظریں ٹکرائیں اور دل میں اترتی چلی گئیں۔

”محبت بیک نظر“ اسی کو کہا جاتا ہے۔

دو گھوڑے ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے۔ راجکمار کا اس پیہ تازی سفید تھا اور علی کا شہوار شب و بچہ کی طرح سیاہ!

”آپ شاید کنا نور کی راجکمار ہیں؟“ یہ ایک جوانی کا دوسری جوانی سے سوال تھا۔

”ہوں۔“ راجکمار جیسے نیند میں بولی:

”مگر تم کس دیہس کے راجکمار ہو؟“

”میں پالہ پالیکار کا بیٹا ہوں۔“

”پالہ۔“ راجکمار نے اسے پریشان نظروں سے دیکھا:

”تو تم ہمارے مذہب کے نہیں ہو۔“

”جی ہاں راجکمار۔ میں ہندو نہیں ہوں۔“

”تو تمہارا نام بھی ہمارے جیسا نہیں ہوگا؟“ راجکمار نے دلچسپی سے پوچھا۔

”نما تو ایک شناخت ہوتا ہے۔ آپ مجھے کسی بھی نام سے پکار سکتی ہیں۔“

”پھر بھی تمہاری ماں نے کوئی نام تو رکھا ہوگا؟“

”میری ماں زندہ نہیں ہیں راجکمار۔ وہ میرے بچپن میں مر گئی تھیں۔“

”میری بھی ماں نہیں ہیں۔ وہ بھی بچپن میں مر گئی تھیں۔“

علی کی زمینداری کوئی بڑی نہ تھی۔ راجہ کننور کے مقابلے میں تو اس کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی۔
پھر علی مسلمان اور راجہ مالابار ذات کا نام نہ دند۔ نہ ایک مذہب اور نہ برابر کی حیثیت مگر دونوں
اس طرح ملتے جیسے ایک ہی خاندان کے ہوں۔ ایک ساتھ گھر مٹا پھڑا کھا پینا۔ اٹھا بیٹھا۔

یہ خبر شدہ شدہ علی کے باپ تک پہنچی تو انہوں نے بیٹے کو سمجھا۔
بیٹے! میں سمجھا تھا کہ تم سن شو رو کو پہنچ چکے ہو مگر۔۔۔

انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ علی بھی باپ کو بہت پیارا تھا۔ اکیلا بیٹا تھا۔ انہوں نے آج
تک اسے ٹیڑھی نظر سے نہ دیکھا تھا مگر آج ان کے الفاظ میں تلخی گھٹی ہوئی تھی۔

”بابا! میں سمجھی نہیں۔ کوئی غلطی ہو گئی مجھ سے؟“ علی نے نرمی سے پوچھا۔

”غلطی کوئی نہیں بیٹے مگر یہ ضرور خیال رکھو کہ آگ اور پانی ایک جگہ جمع نہیں ہوتے۔“
باپ نرم پڑ گئے۔

”راجہ کننور بہر حال راجہ ہے۔ ہم اس کی برابری نہیں کر سکتے۔ پھر وہ نائرا اور ہم مسلمان۔
میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم راجکاری سے نہ ملو مگر یہ خیال رکھو کہ ہو ا کا دامن کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ راجکاری
ایک خوبصورت کھلونے کی طرح دیکھی تو جاسکتی ہے مگر ایک مسلمان پالنگا، ایک نائرا راجکاری کو اپنا
نہیں سکتا۔ وہ تمہاری پہنچ سے دور ہے بیٹے!“

”بابا! آپ اگر مجھے حکم دیں کہ راجکاری سے ملنا چھوڑ دو تو یہ بات تسلیم کی جاسکتی ہے لیکن میں
آپ کے اس خیال سے اتفاق نہیں کر سکتا کہ راجکاری میری پہنچ سے باہر ہے۔“

”علی! میں نہیں منع تو نہیں کرتا مگر احتیاط کی تاکید ضرور کروں گا۔“

علی اور اس کے باپ میں اس سلسلے میں اکثر گفتگو ہوتی اور علی ہر مرتبہ پیسے سے زیادہ پرہیز
اور مستقل مزاج دکھائی دیتا۔

ادھر علی اور راجکاری کی محبت میں غنٹگی پیدا ہو رہی تھی اور دوسری جانب علی کی زمینداری اور
کانوڑ کی ریاست میں اس محبت کے چرچے بڑھتے جا رہے تھے۔

پورے مالابار میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہر دم سنی رہتی تھی۔ پھر ہلاکانور والے یہ کیسے
برداشت کرتے کہ ان کی راجکاری ایک مسلمان رئیس زادے سے محبت کی بیگنیں بڑھائے۔

پھر وہ وقت بھی آیا کہ کننور والوں نے علی کا داخلہ اپنی ریاست میں بند کر دیا۔ راجکاری روز کی
طرح ملاقات کی مخصوص گھر پہنچی تو علی غائب تھا۔

”کیا آپ میاں روزانہ آتی ہیں؟“

”نہیں۔ کبھی کبھی آتی ہوں۔“ راجکاری کی دلچسپی بڑھی۔

”کیا تم روز آتے ہو یہاں؟“

”جی نہیں راجکاری۔ یہ آپ کی ریاست کا علاقہ ہے۔ میں شکار کے پیچھے ادھر آ گیا اور ڈر رہا
تھا کہ کوئی مصیبت نہ آجائے۔“ پالنگہ نوجوان نے جواب دیا۔

”کیا تم روز آ سکتے ہو یہاں؟“ راجکاری نے کھوٹے کھوٹے انداز میں کہا۔ معلوم ہونا تھا جیسے اس
نے پالنگہ نوجوان کی پوری بات سنی ہی نہیں۔

”روز۔۔۔؟“ جوان نے اسے حیرانی سے دیکھا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ راجکاری کا یہ سوال بالکل ہی بے ربط تھا۔

”اوہ۔ میں نام نہانا تو بھول ہی گیا۔“ پالنگہ نوجوان مسکرایا۔

”میرا نام علی ہے۔ آپ مجھے پالنگہ بھی کہہ سکتی ہیں۔“

راجکاری بھی مسکرائی۔

”علی بھی بڑا پیارا نام ہے۔“

اس دوران راجکاری کی سکیلیاں، سیلیاں اور کینزیریں اسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں آ گئیں مگر
راجکاری کو ایک نوجوان سے باتیں کرتے دیکھ کر دور ہی رک گئیں۔

”یہ سب بلائیں آئیں میرے پیچھے۔“ راجکاری نے منہ بنایا۔

”بلائیں نہیں۔ آپ کی سیلیاں میں شاید۔“ علی نے خیال ظاہر کیا۔

”اچھا تم یہ بتاؤ۔ کل آؤ گے میاں؟“ راجکاری نے اچانک سوال کیا۔

”آپ حکم دے رہی ہیں تو ضرور آؤں گا۔ بشرطیکہ کوئی روک ٹوک نہ ہو۔“ علی بولا۔

”کوئی روک ٹوک تو کہہ دینا راجکاری نے ملایا ہے۔“

اس کے ساتھ ہی راجکاری گھوڑا گھا کر اپنی سیلیوں کی طرف بڑھ گئی۔

جب سے۔۔۔

یہ ڈرامہ روزانہ جگہ جگہ جاتا تھا۔

جاڑا اگر ہی برسات، یہ محبت کے مارے ہر موسم میں یہاں اکٹھا ہوتے اور اس طرح گھل مل کر

بات کرتے جیسے انہیں آج ہی پیار ہوا ہو۔

راجکاری نے اس جگہ جانا چھوڑ دیا تھا جہاں اسے پہلی اور آخری محبت ہوئی تھی۔ دن بھر ایک کمرے میں پڑی رہتی۔ سیلیاں آتیں تو بیماری کا ہاتھ نہ کر کے ان سے ملنے سے انکار کر دیتی۔ محبت کا مارا راجہ کنا نور بھی اپنی بیٹی کے بارے میں پہلے ہی سمجھتا رہا کہ راجکاری کچھ بیمار ہے اس نے پوری سیاست کے دید اور حکیم اکٹھا کر دیے۔ ہر ایک نے اسے الگ دیکھا اور راجہ کنا نور کو اپنی رائے سے آگاہ کر دیا۔

عجیب بات یہ تھی کہ تمام اُمیدوں اور حکیموں نے راجہ کو بتایا کہ راجکاری کو کوئی بیماری نہیں ہے اس کا علاج کیا کیا جائے۔ راجہ نے خود تو اس رائے سے اتفاق کر لیا مگر رعایا کو یہی ظاہر کیا کہ راجکاری بیمار ہے۔

راجہ کو یہ ڈر تھا کہ اگر اس نے لوگوں کو بتایا کہ راجکاری کو کوئی بیماری نہیں تو لوگ ہتھ نہیں کیا کیا باتیں بتائیں اور کیسے کیسے افسانے تراشیں۔ اس لیے اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ مگر۔

کہا جاتا ہے کہ عشق اور مشک چھپا نہیں کرتے۔ راجہ کو اگرچہ راجکاری کی بیماری کا علم نہ ہو سکا مگر بہت سے لوگ جانتے تھے کہ راجکاری کی بیماری اس کا ایک مسلمان امیر زادے سے عشق ہے۔ وہ جانتے کیوں نہ! راجکاری علی الاعلان علی سے ملتی تھی اور دونوں گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے۔ اس نے جانے والوں کی نظر ان پر پڑتی تھی اور وہ سب کچھ جان گئے تھے۔

راجہ کنا نور راجکاری کی طرف سے پریشان رہنے لگا تھا مگر رعایا میں سے کسی کی محبت نہ پڑتی تھی کہ راجکاری کا راز کھولے۔ اس قسم کا راز کھل جانے سے بڑا فتنہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ پالاؤں اور کناوروں کے نامزدوں کے درمیان جنگ ہو سکتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ راجہ اسے راجکاری پر تہمت سمجھ کر راز کھولنے والے کو قتل کرادے۔

بہر حال راز عشق کھل کے رہا۔

ایک ہفتے سے زیادہ ہو چکا تھا اور راجکاری نے اپنے کمرے سے قدم باہر نہ نکالا تھا۔ اس کی سیلیاں روز آتیں اور بے نیل و مرام واپس چلی جاتی تھیں۔

راجکاری دراصل اپنی سیلیوں سے شرمندہ تھی۔ انہوں نے اسے سمجھا تھا کہ مرد بے وفا ہوتے ہیں مگر راجکاری نے ان کا مذاق اڑایا تھا۔ اگر اب وہ سیلیوں کا سامنا کرتی تو ممکن تھا کوئی سیلی

یہ پسند نہ کرتا تھا کہ علی غیر حاضر ہوا تھا۔ اس کا گھوڑا راجکاری کے آنے سے پہلے ہی وہاں پہنچ جاتا تھا۔

راجکاری کے ساتھ آنے والے محافظ اور سیلیاں حسب معمول اس سے کچھ دور ٹھہر گئی تھیں۔ جب کافی انتظار کے باوجود علی نہ پہنچا تو راجکاری اپنی سیلیوں میں واپس پہنچی۔

"پتہ نہیں آج علی کیوں نہیں آیا؟" راجکاری کی آواز پر شرمندہ تھی۔

"بیمار نہ ہو گئے ہوں کہیں؟" ایک سیلی نے جواب میں کہا۔

"مرد کی ذات بے مروت ہوتی ہے۔ اس پر اعتبار نہ کرنا چاہیے۔" یہ رائے دوسری سیلی کی تھی۔

پہلی نے تردید کی:

"صرف مرد بے وفا نہیں ہوتا۔ عورت بھی بے وفا ہو سکتی ہے۔"

"عورت تو وفا کی پتلی ہے۔ اس سے بے وفائی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔"

راجکاری کی دو سیلیوں میں بحث شروع ہو گئی۔ دونوں طرف سے دلیلوں کے ہند لگا دیے گئے

مگر کوئی اُرا بننے پر تیار نہ تھی۔ آخر راجکاری کو انہیں ڈانٹنا پڑا:

"تم لوگوں کو اپنی راجکاری کی کوئی فکر نہیں۔ صرف بحث کرنا جانتی ہو؟"

دونوں خاموش ہو گئیں۔ پھر تیسری سیلی بولی:

"راجکاری۔ اجازت ہو تو کسی کو علی کے گھر بھیجا جائے۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔ وہ نہیں آتا تو ہم اس کی کیوں فکر کریں؟"

راجکاری کہنے کو تو کہہ گئی مگر اس کا بے حسینی ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ سیلیاں چپ چاپ کھڑی

اس کا منہ دیکھ رہی تھیں۔

واپس چلو۔ اب وہ نہیں آئے گا۔

راجکاری بہت مضطرب ہو گئی تھی!

دو دن کے کرہنک انتظار کے بعد راجکاری کنا نور نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دینا شروع کیا کہ

علی بے وفا تھا۔ مرد بے وفا ہوتے ہیں۔ اس کا علاج صرف صبر ہے۔ صبر کے سوا اب کوئی چارہ نہیں۔

اسے طعنہ دیتی اور اسے اور زیادہ شرمندہ ہونا پڑتا۔

آج چار سیلیاں ایک ساتھ آئی تھیں اور یہ نقد کر کے آئی تھیں کہ راجکاری سے ملے بغیر نہیں جائیں گی۔

راجکاری نے کمرے کے دروازے پر ایک کینز کو مقرر کر دیا تھا کہ وہ ملاقات کے لیے آنے والوں سے کہہ دے کہ راجکاری کی طبیعت خواب ہے اور وہ کسی سے ملاقات نہیں کر سکتیں جب معمول پرے پر موجود کینز نے آنے والی سیلیوں کو مطلع کیا:

”راجکاری کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ کسی سے نہیں مل سکتیں!“

چاروں میں سے ایک سیلی نے کینز سے کہا:

”ہم جانتے ہیں کہ راجکاری کسی سے نہیں مل سکتیں مگر ہم چاروں کو تو راجکاری نے اپنے ملازم کے ہاتھ بلوایا ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ راجکاری نے سختی سے منع کیا ہے کہ کسی کو بھی اندر نہ آنے دیا جائے۔“

کینز نے فوراً انکار کر دیا:

”تم ہمیں نہیں روکی سکتیں۔ راجکاری نے ہمیں خود بلایا ہے۔“

لڑکی نے زور دے کر کہا:

”اگر ہم ملے بغیر واپس گئیں تو تمہاری خیر نہیں۔ ہم ان سے صاف کہہ دیں گی کہ پہرے پر موجود کینز نے ہمیں اندر جانے نہیں دیا تھا۔“

”تم کچھ بھی کہو۔“ کینز ٹس سے مس نہ ہوئی:

”مگر میں تمہیں اندر نہ جانے دوں گی۔“

اسی وقت راجہ کناؤر وہاں پہنچ گیا۔ انوں نے کینز کو سیلیوں سے جھگڑتے دیکھا تو قریب آ کر بولا:

”کیا بات ہے۔ تم سب کیوں جھگڑ رہی ہو؟“

کینز نے راجہ کو جواب دیا:

”ان داتا۔ یہ کہہ رہی ہیں کہ راجکاری نے انہیں ملازم بھیج کے بلوایا ہے مگر میرے لیے حکم یہ ہے کہ کسی کو بھی اندر نہ جانے دوں۔“

”ہاں بھئی تم کیا کہتی ہو؟“ راجہ نے چاروں لڑکیوں کو مخاطب کیا۔

”جی اُن داتا۔ ہم سب راجکاری سے ملنے آئی ہیں۔“ ایک سیلی نے کہا:

”تین دن ہو گئے راجکاری اپنے کمرے سے نہیں نکلیں۔ وہ بیمار ہو جائیں گی اُن داتا۔“

”ہو کیا جائیں گی وہ بیمار ہے۔“

راجہ نے جواب میں کہا:

”جب وید جگم اسے دیکھ چکے ہیں۔ کوئی اس کی بیماری جان ہی نہیں سکتا۔“

”راجکاری کا علاج دیدوں کے پاس نہیں ہے، اُن داتا۔ دوسری سیلی بولی۔ یہ کچھ زیادہ ہی تیز دھڑا رہتی۔“

”ہاں نہیں۔ یہ کیا کہا تم نے؟“

راجہ نے چونک کر اسے دیکھا:

”پھر کون کرے گا اس کا علاج؟“

”میں بتاؤں۔ اُن داتا!“ اس نے اپنی مانتی لڑکیوں کی طرف دیکھا:

”ہاں ہاں بتا دو۔“ ایک اور سیلی بولی۔

”راجہ ناراض ہو گئے تو۔“ وہ بتانے سے گھرا رہی تھی۔

راجہ کناؤر ان کی باتوں کے متع کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے اعلان کیا:

”جو لڑکی راجکاری کا علاج تائے گی اسے ہم منہ مانگا انعام دیں گے۔“

دوسری لڑکی بڑھ کے راجہ کے پاس آئی اور آہستہ سے بولی:

”راجہ جی۔ علی کو بلوائیے۔ راجکاری اچھی ہو جائے گی۔“

راجہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

”تم لڑکیاں میرے ساتھ آؤ۔“ اس نے کہا۔

راجکاری کی سیلیاں راجہ کے ساتھ ایک کمرے میں پہنچیں اور انہوں نے راجہ کو راجکاری اور علی باپتہ امیر زادے کی جھگڑ کی پوری داستان سنا دی اور راجہ سے یہ سفارش کی کہ راجکاری کو ان میں سے کسی کا نام نہ بتایا جائے۔

راجہ نے انہیں تسلی دی اور انعام کا وعدہ کر کے رخصت کر دیا اور خود راجکاری کے کمرے میں پہنچ گیا۔

راجکاری بستر پر چٹ لیٹی چھت کو تنک رہی تھی۔ راجہ کو اندر آتے دیکھ کر وہ بستر سے اٹھ کر

راجکاری ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی نے سہیلی کے خیال کی تصدیق کر دی۔

بیٹھ گئی۔

"کیسی طبیعت ہے راجکاری؟" راجہ نے پوچھا۔

"اچھی ہوں راجہ بتانا۔ راجکاری نے کھٹی کھٹی آواز میں جواب دیا۔

راجہ نے بڑے دکھ سے کہا:

"راجکاری۔ مجھے افسوس ہے کہ تم نے باپ کی بخت پر اعتبار نہیں کیا؟

جی۔" راجکاری نے حیران نظروں سے باپ کو دیکھا۔

"علی ایک زندہ دل جوان ہے۔ وہ ہماری ریاست کے قریب ہی ایک پالیگار کا بیٹا ہے مگر تم نے یہیں اس کے بارے میں کیوں نہیں بتایا۔

راجکاری۔ ہم نے آج تک تمہاری کون سی خواہش پوری نہیں کی۔ تم نے ہم سے کہہ کے تودیکھا

ہوتا۔"

راجہ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

راجکاری بھی رو پڑی اور باپ کے گلے لگ کر سسکیاں لینے لگی۔ جب رونے سے اس کا دل کچھ

ہلکا ہوا تو باپ بیٹی میں گفتگو شروع ہوئی۔

دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر راجہ جلا گیا اور راجکاری کی سہیلیوں کو ملاقات کی اجازت

مل گئی۔

سہیلیوں نے بہت گلے شکریے کیے۔ راجکاری کی طبیعت اس وقت بحال تھی۔ وہ سہیلیوں سے

ہنس ہنس کے باتیں کرتی رہی۔

سہیلیاں بھی اپنی راجکاری کو پاکے بہت خوش تھیں۔ اتنے دنوں سے ان کا کھانا پینا حرام تھا۔ وہ

بہت دیر تک راجکاری سے باتیں کرتی رہیں۔

سہیلیاں جانے لگیں تو راجکاری نے کہا:

"کل صبح ذرا جلدی آنا۔"

"کیوں۔ خیریت تو ہے؟" ایک سہیلی نے پوچھا۔

"اُم۔ خیریت ہے۔ مجھے کیس جانا ہے۔ تم سب میرے ساتھ چلو گی۔" یہ کہتے ہوئے اس کا

چہرہ خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔

"کہیں علی کے پاس جانے کا ارادہ تو نہیں؟" ایک سہیلی راز پانگئی۔

دوسرے دن صبح کو دو گاڑیاں راج محل کے دروازے پر کھڑی تھیں۔ ایک گاڑی کھلی تھی اور

دوسری پر پردے پڑے ہوئے تھے۔

ایک گاڑی پر راجکاری سوار ہوئی اور اس کے ساتھ چار مسلح عورتیں بیٹھ گئیں۔ دوسری گاڑی

میں راجکاری کی سہیلیاں تھیں۔

گاڑیوں کے ساتھ چار مسلح سوار تھے جن کی پگڑیوں پر ریاست کناؤر کے ریاستی نشان لگے تھے۔

راجہ کناؤر راجکاری کو رخصت کرنے کے لیے موجود تھا۔

دو گاڑیوں اور چار سواروں پر مشتمل یہ مختصر قافلہ کناؤر سے صبح کے وقت روانہ ہوا اور شام

کے وقت کناؤر کی سرحد پار کر کے علی کی زمینداری میں داخل ہوا۔

دوسری سرحد میں داخل ہوتے ہی دونوں گاڑیاں رک گئیں۔ چار سواروں میں سے ایک سوار

آگے بڑھا۔ اس نے ایک شخص سے علی کا پتہ پوچھا اور گھوڑا بٹھکاتا ہوا لفٹ کھنٹے میں علی کی حویلی پر

پہنچ گیا۔

علی گھر پر موجود نہ تھا۔

سوار اس کے والد کے سامنے پیش ہوا اور بڑے ادب سے کہا:

"ریاست کناؤر کی راجکاری آپ کی زمینداری میں تشریف لائی ہیں۔ وہ اس وقت آپ کی

حدود میں داخل ہو چکی ہیں اور یہاں آنے کے لیے آپ کی اجازت چاہتی ہیں۔"

علی کے والد کناؤر کا نام سننے ہی معاملہ کی تہ کو پہنچ گئے تھے۔ علی نے انہیں بتا دیا تھا کہ کناؤر

کے محافظوں نے اسے کناؤر میں داخلے سے روک دیا ہے۔

انہوں نے بڑے اخلاق سے سوار کو جواب دیا:

"زہے نصیب۔ راجکاری کی آمد ہمارے لیے باعثِ فخر ہے۔ ہم انہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔"

یہ کہہ کے علی کے والد نے اپنا گھوڑا منگا لیا اور پانچ سواروں کے ساتھ راجکاری کے استقبال

کو جانے کے لیے تیار ہوئے۔

اسی وقت علی بھی آگیا۔ اس نے باپ کے ساتھ چلنے پر امر کیا مگر باپ نے اسے بخت سے

سمجھا کے روک دیا۔ چنانچہ علی کے والد راجکاری کے استقبال کے لیے کناور کے سوار کے ساتھ
مرحد کی طرف چلے۔

راجکاری بڑی بے چینی سے علی کے آنے کا انتظار کر رہی تھی مگر جب علی کے بجائے استقبال
کے لیے اس کے والد آٹھے تو وہ بہت یاکوس ہوئی۔ پھر بھی اس نے گاڑی سے اتار کر علی کے والد کو
ادب سے سلام کیا۔

علی کے والد نے راجکاری کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے دعا دی۔ راجکاری نے پوچھا:
"علی کیسے ہیں۔ وہ آپ کے ساتھ نہیں آتے؟"

"علی بالکل اچھا ہے۔ جہاں تک اس کا میرے ساتھ آنے کا تعلق ہے تو وہ آئے گا خواہش مند
تھا مگر میں نے حمد سے روک دیا۔"

علی کے والد نے سپاٹ لیے ہیں جواب دیا:

"میرے روکنے کی وجہ یہ تھی کہ آپ کے مرحدی محافظوں نے اسے کناور میں داخلے سے روک
دیا ہے۔ اس لیے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ آپ سے اس سلسلے میں گفتگو سے پہلے اسے یہاں لاؤں۔"

"میرے محافظوں نے علی کو روکا تھا؟"

راجکاری نے کمال حیرت سے کہا:

"مجھے اس واقعہ کا کوئی علم نہیں۔"

"میں درست کہہ رہا ہوں راجکاری۔" علی کے باپ نے کہا:

"وہ روزانہ کناور جایا کرتا تھا مگر ایک دن کناور کے محافظ سواروں نے اسے روک کے کہا کہ
اسے کناور میں داخلے کی اجازت نہیں۔ نیز اسے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر وہ کناور میں بغیر اجازت کے
داخل ہوا تو اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

"آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔" راجکاری نے ان کی بات کی تائید کی:

"لیکن علی کے کناور میں داخلے کو روکنے کا حکم میرے راج بابا نے ہرگز نہیں دیا۔ اگر انھوں نے یہ

حکم دیا ہوتا تو آج وہ مجھے خود آپ کے پاس نہ بھیجتے۔"

"ممکن ہے یہ حرکت کناور کے کسی اور با اثر آدمی نے کی ہو جو علی کا آپ سے ملنا پسند نہ کرتا ہو؟"

علی کے والد نے اپنا خیال ظاہر کیا:

"میں امید کرتا ہوں کہ یہاں گفتگو کرنے سے یہ بات زیادہ بہتر ہوگی کہ آپ غروب خانہ کو

رونی بخش کے مجھے همان نوازی کا شرف عطا فرمائیں۔ اس عزت افزائی کے لیے میں اور میرا بیٹا
آپ کے شکر گزار ہوں گے۔"

"میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے میرے لیے یہاں تک آنے کی تکلیف گوارا کی۔"

راجکاری نے جو اس زمانے کے مردانہ علوم سے آراستہ تھی، بتسم انداز میں کہا۔

"بیٹیاں باپ کے گھر آنے پر شکر یہ ادا نہیں کرتیں راجکاری۔" یہ کہہ کر علی کے والد نے اسے
بند گاڑی میں سوار کر دیا۔

خوبصورت همان کے اس قافلہ کو منزل پر پہنچتے پہنچتے کافی رات گزر چکی تھی مگر وہاں علی نے راجکاری
کے استقبال کے لیے جشن کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ ہر طرف تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی اور پوری آبادی
جگ جگ جگ مگ مگ کر رہی تھی۔

راجکاری کا بڑا شاندار استقبال کیا گیا۔ علی، اس کے دوستوں اور معززین نے اسے خوش آمدید
کہا اور اسے ایک آراستہ دیر راستہ حویلی میں اتارا گیا۔

قارئین کرام!

آپ شاید ان باتوں اور تفصیل کو شاعرانہ خیال آرائی یا کوئی افسانوی بیان سمجھ رہے ہوں مگر ایسا
نہیں ہے بلکہ یہ ایک خالص تاریخی حقیقت ہے اور سلطنتِ خدا وادیسور کی تمام تاریخیں اس بات کی
شاہد ہیں کہ پانچ پانچ گیارہ کے ایک امیر زادے علی اور راجہ کناور کی بیٹی کے درمیان بالکل ہی واقعات
پیش آئے تھے جن کا ذکر اس باب میں کیا جا رہا ہے۔

قارئین اس بات کو بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ اب تک جو واقعات اس داستانِ عشق میں
بیان کیے گئے ہیں وہ اس قدر حیرت انگیز نہیں جتنے آئندہ پیش آنے والے ہیں۔ مجھے یہ بات کہنے میں
ذرا بھی باک نہیں کہ امیر زادے علی اور راجکاری کناور کی داستانِ محبت، دنیا کی چند معروف سچی عشقیہ
داستانوں میں سے ایک ہے۔

امید ہے آپ مجھے اس جملہ معزز منہ کے لیے معاف فرمائیں گے اور آئیے اب آگے کے حالات
ملاحظہ کیجیے۔

علی ایسا نہیں ہے۔ اس لیے مجھے یقین نہ آتا تھا مگر جب ہنستہ بھر سے زیادہ گزر گیا تو مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔

”خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ کہ تم اک دم کیسے آگئیں؟“ علی نے دریافت کیا۔

”تمہارے ابا جان نے بتایا نہیں تمہیں؟“

راجکاری نے جواب دیا:

”تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے پتاراجہ کناور کی اجازت سے آئی ہوں۔“

”یہ تو بتایا تھا مجھے ابا جان نے؟“ علی نے کہا:

”مگر تمہارے بتانے نہیں اجازت کیسے دے دی۔ نائروں اور مسلمانوں میں تو ہمیشہ جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو بالکل پسند نہیں کرتے۔“

”یہ سب ٹھیک ہے علی مگر راجہ کناور بڑے فراخ دل ہیں۔“

راجکاری نے بتایا:

”تمہارے نہ آنے سے میں بیمار ہو گئی تھی۔“

”واقعی بیمار ہو گئی تھیں راجہ کو دکھانے کے لیے کہہ کیا تھا۔“ علی نے مسکرا کر بات کاٹی۔

”ٹھیک ہے ارٹو میرا مذاق۔“

راجکاری نے منہ بنایا:

”بس اب اس معاملہ پر کوئی گفتگو نہیں ہوگی۔“

راجکاری ناراض ہو گئی۔

اُسے تم تو ناراض ہو گئیں۔ اچھا معاف کر دو۔ میں تمہارے لٹھ جوڑتا ہوں۔“ علی نے ایسی

محبت سے کہا کہ راجکاری مسکرا دی اور اس کی ساری ناراضگی ددر ہو گئی۔

”ہاں اب بتاؤ۔ تم بیمار ہو گئیں۔۔۔۔۔ پھر کیا ہوا؟“ علی نے پوچھا۔

”میں بیمار ہوئی تو جیسے پورا محل اور کناور کی پوری آبادی بیمار ہو گئی۔“

راجکاری نے بتانا شروع کیا:

”پتاجی نے راج محل سے نکلنا چھوڑ دیا۔ تمام تقریبات، محفلیں، مجلسیں بند۔ رعیت نے شادیوں کی تار بیں آگے بڑھا دیں۔“

مجھے دو بچپنوں نے گھیر لیا۔ کوئی نبض دیکھتا تو کوئی آنکھوں میں جھانکتا مگر میرا مرض کسی کے

راجکاری کناور کو جس حویلی میں بٹھرایا گیا تھا اس حویلی کا ایک طویل دھڑیل باغچہ تھا جسے محلات کے باغیں باغ سے تشبیہ دی جاسکتی تھیں۔ یہ باغیں باغ بھی روشنیوں سے بفقہ نور بنا ہوا تھا۔

پہلے راجکاری کو کھانا دیا گیا۔ یہ رات کا کھانا نہیں تھا بلکہ نصف شب گزرنے کے بعد کھانا لگایا گیا تھا۔ راجکاری کناور صرن تعلیم یافتہ ہی نہ تھی بلکہ مجلسی قواعد و قوانین سے بھی پوری طرح بہرہ ور تھی جسے ہم آج کی زبان میں مہذب یا کلچرڈ کہتے ہیں۔

کھانے یا دعوت میں علی، اس کا باپ اور آبادی کے تمام معتبر زمین اور معرزمین شامل تھے اور راجکاری اختیاری بے تکلفی سے دعوت میں شامل تھی۔ امیر زادہ علی اس کے بالکل مقابل بیٹھا تھا اور علی کے والد راجکاری کے برابر بیٹھے تھے۔

یہ شاندار دعوت مسکراہٹوں اور تمغوں کے درمیان ختم ہوئی رکھانے کے بعد تمام لوگ پائیں باغ میں جا بیٹھے۔ علی اور راجکاری بھی ان کے ساتھ ہی تھے۔

دہان بھی دیر تک دلچسپ گفتگو ہوتی رہی۔ راجکاری کی ذہانت اور عیبت بھری گفتگو نے حاضرین کو بہت متاثر کیا۔

رات کافی جا چکی تھی۔

سماں ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے صرن راجکاری اور علی باقی رہ گئے۔ ان کے دل زور زور سے اچھل رہے تھے۔

چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دور راہدار یوں میں مسلح خواتین پہرہ دے رہی تھیں گفتگو کا آغاز راجکاری نے کیا۔

”علی!“

راجکاری نے اس قدر محبت سے کہا کہ علی کا دل تڑپ اٹھا:

”میں تو یہ بھی سمجھتی تھی کہ تم نے مجھ سے بے وفائی کی اور اپنے آرمیوں کے منہ کرنے پر تم نے کناور آنا چھوڑ دیا مگر تمہارے والد نے تو اس کی کچھ اور ہی وجہ بیان کی۔“

علی ہجول سے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا، بولا:

”تو تمہیں ابا جان کی بات کا یقین آیا کہ نہیں؟“

”یقین تو آگیا۔“ راجکاری نے جواب دیا:

”جب میں سوچتی تھی کہ علی نے بے وفائی کی تو ایک دم میرے دل سے آواز اٹھتی کہ نہیں نہیں

ریاستی نشان تھے۔

علی نے راجکاری کو مزید بتایا:

”مجھے بھی شبہ ہوا تھا کہ یہ کوئی اور لوگ ہیں مگر میں نے تمہاری سرحدیں جھگڑا کر نامناسب نہ

سمجھا اور واپس آگیا۔

راجکاری سوچتے ہوئے بولی:

”یہ تو طے ہے کہ دور ریاستی لشکر کے سوار نہیں تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو تاجی مجھے مزور بتاتے۔

بہر حال علی! تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ تاجی تمہیں بالکل اسی طرح پسند کرتے ہیں جیسے میں۔“

”کیا سچ؟“ علی نے حیرانی سے پوچھا۔

”سچ نہیں تو اور کیا جھوٹ۔“

راجکاری مسکرائی:

”انہوں نے ہی تو مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔“

”اچھا یہ بات ہے۔“ علی بڑی مسرت سے بولا:

”اباجان تمہارے آنے سے جس قدر خوش ہیں اسی قدر پریشان بھی ہیں۔ میں یہ بات

انہیں بتاؤں گا تو وہ خوش ہو جائیں گے۔“

اسی وقت چار کینز بن ان کی طرف آئیں۔ ایک علی کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ دوسری کینز بن

راجکاری کے پاس پیچھے کے رک گئیں۔

علی نے متحسّس نظروں سے کینز کو دیکھا۔

کینز نے ادب سے کہا:

”آقا آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ فرمایا ہے کہ رات زیادہ ہو گئی ہے۔ آپ آگے آرام کریں۔“

علی نے ”اچھا“ کہہ کر راجکاری کی طرف دیکھا۔

راجکاری کے پاس کھڑی کینزوں میں سے ایک نے کہا:

”راجکارا صبح آپ کو زنا خانے میں بلا یا جا رہا ہے۔ رات زیادہ ہو گئی ہے۔ آپ بھی چل کے

آرام فرمائیے۔“

راجکاری نے پلٹ کر علی کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی اس کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو

دیکھ کر مسکرائے اور سنجیدہ ہو گئے۔ وہ سمجھ گئے کہ ان دونوں کے سونے کا الگ الگ انتظام

پلے نہ پڑا۔

”مگر تمہیں مرن کیا تھا؟“ علی نے پھر اس کی بات کاٹی اور ساتھ ہی مسکرایا بھی۔

”پھر پھر اتم نے؟“ راجکاری پھر ناراض ہوئی:

”جاؤ۔ میں کچھ نہیں بتاتی۔“

”اچھا اچھا۔ اس بار اور معاف کر دو۔ اب بات نہیں کاٹوں گا۔“ عاشق صادق نے صحن کے حضور

معافی نامہ پیش کیا جو فوراً قبول ہوا۔

راجکاری، جس دی اور بات پھر وہیں سے شروع کی:

”وہاں اور حکیم مرن جاننے میں ناکام ہو گئے تو راجہ کنور پرغوں کے پٹاڑ ٹوٹ پڑے۔ دوسری

طرف میری سہیلیوں کا میرے بغیر راجال تھا میں نے ان سے ملنا جلنا بالکل ہی ترک کر دیا تھا۔ دن رات

اپنے کمرے میں گھسی رہتی اور تم کو کوسنے اور گایاں دیتی رہتی تھی۔“

”ہائے ہائے۔ کیسی پُر درد داستان ہے راجکاری کنور کی۔“ علی نے بیچ میں نقطہ دیا۔

”تم تو بے فکر تھے نا؟“ راجکاری چڑ گئی:

”دوستوں کے ساتھ خوب گھومتے پھرتے ہو گئے۔“

”قسم لے لو راجکاری جو ایک دن بھی کسی دوست کے ساتھ گیا ہوں۔“

علی سنجیدہ ہو گیا:

”جس دن مجھے کنور کی سرحد پر روکا گیا تھا میرا دل چاہا تھا ان سے لڑ بیٹھ کر اپنی جان ختم کر دوں

مگر فوراً جیل آگیا کہ میری اس حرکت سے تم بدنام نہ ہو جاؤ۔ اس لیے دل مسوس کر رہ گیا اور چپ چاپ

واپس آگیا۔“

”ارے ہاں۔“ راجکاری کو جیسے کچھ یاد آیا:

”یہ تو بتاؤ۔ تمہیں روکا کس نے تھا۔ کتنے آدمی تھے وہ؟“

”چار سواروں نے مجھے گھیرا تھا۔ کچھ سوار دور پر کھڑے تھے۔“ علی نے بتایا:

”انہوں نے کہا کہ تمہیں کنور میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ اگر میں نے اب کیا تو نقصان

اٹھانا پڑے گا۔“

”سواروں کی پگڑیوں پر ریاستی نشان تھا؟“

”میں ان نور کے ریاستی نشان کو پہچانتا ہوں۔ وہ سرکاری سوار نہیں تھے۔ نہ ان کی پگڑیوں پر

کیا گیا ہے۔

رات راجکماری زمان خانے میں خواتین کے ساتھ سوئی اور علی مردانے میں باپ کے ساتھ سو۔
صبح ہوئی تو راجکمار کی وابستگی کی تیاری شروع ہو گئی۔

علی صبح ہی سے گھرا ہوا پھر رہا تھا کہ کسی طرح راجکمار سے دو منٹ گفتگو کا موقع مل جائے
مگر خواتین راجکمار کو گھیرے ہوئے تھیں۔

وقت گزرتا جا رہا تھا اور علی کی بے چینی بھی بڑھ رہی تھی۔ پھر اطلاع آئی کہ راجکمار کی سواری
نیا ہے۔

علی نے ایک جاتی ہوئی کینز کو روک لیا:

"تم میرا ایک کام کر دو گی؟" اس کا بوجھ خوشامد نہ تھا۔

"کام کیوں نہیں کروں گی امیر زادے۔ آپ کی کینز ہوں۔" کینز نے ادب سے جواب دیا۔

"راجکمار کو جاننی ہو۔ دبی جو سامنے کھڑی ہیں۔" علی نے اشارے سے بتایا۔

"انہیں کون نہیں جانتا۔ وہ تو ہماری گمان میں اور۔" کینز گھبرا کے چپ ہو گئی۔

"ان سے جاکے کہو کہ میں بلارہ ہوں۔" علی نے جلدی سے کہا۔

"ابھی کہتی ہوں۔" کینز نے قدم بڑھائے۔

"سو تو۔" علی نکلے پھر روک لیا۔

"فرمائیے مہربان۔"

"آہستہ سے کہنا کوئی اور نہ سننے پائے۔"

"مگر مہربان۔"

"مگر اگر نہیں۔ جیسا میں نے کہہ دیا وہ کرو۔"

کینز ہوشیار رہی۔ وہ راجکمار کے پاس پہنچی اور موقع پا کر مرگوشیوں میں علی کا پیغام

پہنچا دیا۔

راجکمار نے کنگھیوں سے علی کی طرف دیکھی۔

"میں ابھی آئی۔" راجکمار نے کہا اور تیزی سے چلتی ہوئی علی کے پاس پہنچ گئی۔

علی راجکمار کو لے کر ایک طرف ہڑ میں ہو گیا۔

تم مجھے تو پہلے ہی بھول گئیں۔ اس نے شکایت کی۔

"کیا کروں میں۔ عورتیں چھوڑتی ہی نہیں۔"

"یہ بتاؤ۔ اب کب ملاقات ہوگی۔ علی بہت پریشان تھا۔

"پتا بھی نہ ہمارے ابا جان کو بلایا ہے۔ میں نے انہیں کناور آنے کی دعوت دے دی

ہے۔" راجکمار نے بتایا۔

"کیا مجھے بھی بلایا گیا ہے؟"

"نہیں۔ ابھی نہیں۔"

پھر چاروں طرف سے راجکمار، راجکمار کی آوازیں آنے لگیں اور وہ تیز تیز قدموں سے

اُتھر چلی گئی۔

راجکمار ایک ایک سے گلے مل کے رخصت ہوئی۔ علی کے والد نے راجکمار کے سر پر ہاتھ

بھیر کر اسے بہت سی دعا مانگی۔ علی دور ہی کھڑا رہا۔

راجکمار بند گاڑی میں سوار ہوئی۔ پھر دونوں گاڑیاں کناور کے محاذی مرداروں کے پہرے میں

روانہ ہوئیں۔

راجکمار پر وہ ہٹا کرتا حد نظر ہاتھ ہلاتی رہی۔ اس طرح ایک رات کا گمان رخصت ہو گیا اور علی کا

دل جیسے ڈوبنے لگا۔

"میں پر سوں کناور جا رہا ہوں۔" اس کے والد کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

"جی۔" گھبراہٹ میں علی کے منہ سے نکل گیا:

"جی ہاں آپ کناور جا رہے ہیں۔"

اس کے والد نے اسے گھورا:

"تمہیں کس سے معلوم ہوا۔"

علی کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بات بنانے کے لیے بولا:

"حمادہ۔ آپ ہی نے تو بتایا ہے ابھی۔"

پھر رک کے کہا:

"کیا میں جس آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

فورا مان لیں۔ کسی بات میں بحث نہ کریں۔
میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میرے پتی آپ کے سامنے کوئی ایسی شرط نہیں رکھیں گے جس سے آپ کو نقصان پہنچنے کا امکان ہو۔
ٹھیک ہے بیٹی! علی کے والد نے کہا:
"میں ایسا ہی کروں گا۔"

کھانے پر صرف راجہ کننور اور علی کے والد تھے۔ انہیں تعجب تھا کہ راجہ کننور نے کسی اور کو کھانے پر کیوں نہیں بلایا۔ پھر وہ یہ سوچ کے مطمئن ہو گئے کہ شاید راجہ ان سے راجکاری اور علی کے متعلق کچھ بات کرنا چاہتا ہو۔

کھانا شروع ہوا۔ راجہ کننور اور علی کے والد آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ علی کے والد انتظار میں تھے کہ راجہ اب بات شروع کرے گا مگر راجہ دیر تک کچھ نہ بولا اور علی کے والد نے گفتگو میں پہل کرنا مناسب نہ سمجھا۔

کھانے کے بعد راجہ اور علی کے والد مہمان خانہ میں جا بیٹھے۔ راجہ نے اپنے غلام خاص کو حکم دیا کہ وہ کسی کو اندر نہ آنے دے۔ غلام سلام کر کے باہر چلا گیا۔

راجہ کننور نے علی کے والد کی طرف دیکھا۔ چند منٹ دیکھتے رہنے کے بعد وہ ایک دم بولا:
"علی آپ کا بیٹا ہے؟" انداز سوالیہ تھا۔
علی کے والد نے جواب دیا:

"جی ہاں۔ علی میرا ہی بیٹا ہے۔"

"راجکاری کننور میری بیٹی ہے؟" اس بار بھی انداز سوالیہ تھا۔

علی کے والد نے پہلے ہی کی طرح جواب دیا:

"جی ہاں۔ راجکاری راجہ کننور کی بیٹی ہے۔"

"علی خوبصورت اور ایک عالی ظرف جوان ہے۔"

"میں راجہ کننور کے خیال کی تائید کرتا ہوں۔"

"اور راجکاری کننور؟"

"وہ میرے لیے دنیا کی تمام دشواریوں سے زیادہ خوبصورت اور پیاری ہے۔" علی کے والد نے فوراً جواب دیا۔

"ابھی نہیں۔ راجہ کننور نے صرف مجھے دعوت دی ہے۔" والد نے صاف کہہ دیا۔
تیسرے دن علی کے والد بھی صرف چار سواروں کو لے کر کننور روانہ ہو گئے۔ انہیں رخصت کرنے کے لیے علی کے علاوہ علاقہ کے تمام بڑے بڑے رئیس موجود تھے۔
یہ پہلا موقع تھا کہ ایک پاپٹہ پادیکار کسی ناٹک راجہ کے بلاوسے پر صرف چار سواروں کے ساتھ اس کے پاس جا رہا تھا مگر کسی بھی شخص نے اس پر اعتراض نہ کیا۔ اس لیے کہ ناٹک راجکاری بھی تنہا ایک پاپٹہ امیر زادے کے گھر بے خوف و خطر آگئی تھی۔

راجہ کننور کو علی کے والد کی آمد کی اطلاع ایک قاصد کے ذریعے ایک دن پہلے مل گئی تھی۔ اس نے مہمان کے استقبال کا انتظام کیا اور جب علی کے والد کننور کے محل پر پہنچے تو راجہ کننور اور اس کے تمام معزز درباریوں نے مسلمان پاپٹہ رئیس کا بڑی خوشنودی سے استقبال کیا۔ راجہ کے درباریوں نے پاپٹہ رئیس کے گلے میں پھیروں کے ہار ڈالے اور اس پر زرد جو اہر بچھلا رکھے۔

علی کے والد کننور والوں کے ردیہ سے بہت خوش ہوئے۔ راجہ نے انہیں اپنے محل میں اتارا۔ پھر رات کے کھانے سے پہلے راجکاری نے علی کے والد سے ملاقات کی اور انہیں خوش و خرم دیکھ کے وہ بہت خوش ہوئے۔

پھر چلتے وقت اس نے علی کے والد سے کہا:

"آپ علی کے ابا جان ہیں۔ میں بھی آپ کو اپنے پتا جی کے مانند سمجھتی ہوں اس لیے آپ سے ایک درخواست ہے۔ امید ہے آپ اسے قبول فرمائیں گے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو راجکاری۔ تمہاری درخواست سننے سے پہلے ہی میں قبول کرتا ہوں۔" علی کے والد جذباتی ہو گئے:

"یہ بات میرے تصور میں بھی نہ تھی کہ ناٹک راجہ اور ان کے درباری مجھے اس قدر عزت بخشیں گے۔"

"ابا جان! راجکاری بھی جذباتی ہو گئی:

"جو لوگ عزت کے قابل ہوتے ہیں وہ کوئی بھی ہوں اور کہیں کے بھی ہوں ان کی عزت ضرور کی جاتی ہے۔ میری آپ سے صرف اتنی درخواست ہے کہ پتی آپ سے جس بات کے لیے کہیں آپ اسے

بالکل ٹھیک۔" راجہ مسرت سے بولا:

"اب میں آپ سے علی کو مانگتا ہوں۔"

"مجھے کوئی مذرا نہیں۔ علی آپ ہی کہے۔"

"اب آپ راجکمار کی کوچھ سے مانگیے۔" راجہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"اے کنانور کے عظیم راجہ۔ میں راجکمار کو اپنی بیٹی بنانا چاہتا ہوں۔" علی کے والد نے بھی بیٹے

کا پیغام دیا۔

راجہ کھڑا ہو گیا۔ علی کے والد بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

راجہ نے کہا:

"اے میرے دوست۔ پاپہ پالیکا رامیر۔ میں نے یہ رشتہ قبول کیا۔"

علی کے والد نے کہا:

"اے راجہ کنانور۔ آپ نے مجھے سب کچھ دے دیا۔ میں خوش ہوں مگر آپ افسردہ نہ ہوں۔"

راجکمار ہمیشہ آپ کے پاس رہے گی۔ میں اسے آپ سے جدا نہیں ہونے دوں گا۔"

"اے پالیکا رامیر!"

راجہ کنانور کی آواز بھرا گئی:

"راجکمار میرے پاس رہے گی نہ علی تمہارے پاس۔ وہ دونوں اپنی ریاست کنانور میں رہیں

گے۔ میں راجکمار کے جیمز میں کنانور کی ریاست علی کو دے کر تیر تھو یا ترا (زیارتوں) پر پہلا جاؤں

گا۔ علی راجہ کنانور اور راجکمار، رانی کنانور کی حیثیت سے یہاں رہیں گے۔"

علی کے والد یہ سن کر سناتے میں آگئے۔ انہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ راجہ کنانور

اپنے خیالوں میں ڈوبا رہا۔

علی کے والد اس انتظار میں تھے کہ راجہ ہٹائے کہ وہ علی اور راجکمار کی شادی کو پایہ تکمیل

تک کس طرح پہنچے گا۔ ماٹروں اور پاپہ پالیکا رامیر میں آٹھ دن جھگڑے فساد ہوا کرتے تھے۔ وہ

ایک دوسرے کو برداشت کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ پھر اس صورت حال میں بظاہر تو یہ ملاپ ممکن نظر

نہ آتا تھا۔

آخر راجہ کنانور اپنے خیالوں سے چونکا اور اس نے بڑی سنجیدگی سے علی کے والد کو مخاطب کیا:

"آپ کے خیال میں علی اور راجکمار کی شادی کی رسومات کس طرح ادا ہونی چاہئیں؟"

"میں ہر طرح آمادہ ہوں۔ جس طرح آپ مناسب سمجھیں وہ صورت اختیار کی جاسکتی ہے۔"

راجہ کنانور نے کہا:

"مشرقی ممالک میں عام طور سے دلہا کے گھر سے بارات چڑھتی اور دلہن کے گھر جاتی ہے اور

وہیں شادی کی رسومات ادا ہوتی ہیں۔"

جی ہاں۔ ہوتا تو ایسا ہی ہے۔" علی کے والد نے تائید کی۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ بارات لے کر آئیے۔ ہم رسومات ادا کر کے راجکمار کی کو علی کے ساتھ

رضعت کر دیں گے مگر علی کو دوسرے دن راجکمار کی کے ساتھ کنانور واپس آنا ہوگا۔" راجہ کنانور نے

مختصر تفصیل بنائی۔

"ہوتا تو ایسا ہی ہے لیکن فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے دوسرے ہی دن واپس آنے میں

راجکمار کی کوتاہی ہوگی۔ سفر کی تنگن بھی نہ اترے گی کہ پھر سفر درپیش ہوگا۔ کیا یہ ممکن نہ ہوگا کہ

راجکمار اور علی ہفتہ دو ہفتہ کے بعد کنانور واپس آئیں۔"

علی کے والد کی تجویز معقول تھی۔ اتنے طویل سفر سے دلہا دلہن کی صحت پر خراب اثر پڑنے کا

بہت امکان تھا۔

مگر۔

راجہ کنانور نے اس کی سخت مخالفت کی۔

"نہ میرے دوست۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔" اس نے کہا:

"شادی کی صبح یعنی دوسرے دن مجھے علی کی بحیثیت راجہ کنانور تاجپوشی کرنا ہے۔ یہ پروگرام

تو کسی صورت منسوخ نہیں کیا جاسکتا۔"

علی کے والد کے ذہن سے تاجپوشی والی بات تو بالکل ہی نکل گئی تھی۔ اس مسئلہ پر انہیں راجہ

سے تفصیلی گفتگو کرنا تھی۔

علی کے والد نے کہا:

"اے کنانور کے عظیم راجہ۔ کیا آپ کو امید ہے کہ آپ کی ماٹروں یا راجکمار کی ایک پاپہ

امیر زادے کے ساتھ شادی کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گی؟"

راجہ کنانور ہنس پڑا۔ اس نے اپنی لالچی مونچھوں کو تان دیا:

"پاپہ امیر! میں پالیکا رامیر نہیں بلکہ کنانور کا راجہ ہوں۔ یہاں کا دھرم نامی ہوں۔ جو جس کو

بارات کیا تھی ایک جیتی پھرتی بستی معلوم ہوتی تھی۔ لوگ چھوٹی بڑی گاڑیوں پر سوار تھے۔ زیادہ آدمی گھوڑوں پر تھے اور ایک کے بجائے دو دو بیٹھے تھے۔

فاصلہ طویل تھا اس لیے خواتین کو بارات میں جانے سے روک دیا گیا تھا۔ راجہ کنانور کی طرف سے عورتوں کے لیے کوئی پابندی نہ تھی۔ اس نے تو ذاتیں کے آنے پر خوشی کا اظہار کیا تھا اور ان کی حفاظت کے لیے ریاستی فوج کو علی کی بستی تک بھیجے کی ہش کش کی تھی مگر علی کے والد نے احتیاط کے طور پر خواتین کو بارات میں جانے سے منع کر دیا تھا۔

دھماکی کو آٹھ گھوڑوں والی گاڑی میں سوار کیا گیا جس میں اس کے تمام دوست سوار تھے۔ اس گھوڑا گاڑی کو جھنڈیوں، کانڈی اور اصلی پھولوں سے سجایا گیا تھا۔

بارات کے ساتھ بہت سے خواجہ فروش بھی ہوئے تھے جن کے پاس ایسے موافق کی تمام مزدوری چیزیں موجود تھیں۔ وہ بارات کے ساتھ آوازیں لگاتے چل رہے تھے۔ ایک عجب شان تھی اس بارات کی!

بارات عجب اس لیے تھی کہ سید و مخالف قوموں کی تہذیب و تمدن کے درمیان کا ایک پتھر تھا ایک راستہ تھا۔ ایک پہل تھا۔ یہ شادی دو قوموں کے ملاپ کا سبب بن سکتی تھی اور اختلاف کی صورت میں ایک میسب جنگ کا پیش خیمہ بھی بن سکتی تھی۔

اس دور میں تیر اندازی اور شمشیر زنی کا عام رواج تھا۔ توڑے دار بند و قبیلے بھی تھے مگر ان کا رواج کم تھا۔ ہر بار رانی شمشیر اور تیر کمان سے آراستہ تھا۔ علی کے والد کے دل میں جو سو سے تھے وہ راجہ کنانور کی گفتگو سے تقریباً ختم ہو چکے تھے مگر پھر بھی ان کے کسی کونے سے ایک نامعلوم خون جھانکتا تھا۔

راجہ کنانور اپنے عائدین اور معزین کے ساتھ بارات کے استقبال کے لیے شہر سے ۵ میل آگے بڑھ آیا تھا۔ اس کے ساتھ تقریباً ۲۰-۱۰ ماراڑھا اور عائدین ریاست آئے تھے۔ ان سب کے لیے چھ لڑائیاں اور خیمے لگا دیے گئے اور وہاں بھی خیموں کی ایک بستی آباد ہو گئی تھی۔

یہ کوئی اضافی شادی نہیں بلکہ حقیقی اور تاریخی شادی تھی۔ دونوں طرف کے برائیتوں کے دل اگرچہ کبھی کبھی دھڑک اٹھتے تھے مگر وہ اس بات سے خوش تھے کہ اس شادی کے نتیجے میں ناڑوں اور ماہی قوموں کی روزانہ کی بھیڑ چھاڑ اور لوٹ مار میں یقینی کیا واقعہ ہو جائے گی۔

پھر جب دو مختلف تہذیبوں اور قوموں کا ایک مقام پر ملاپ ہوا تو وہ تاریخی منظر بھی دیکھنے

وہی ہو گا۔ میری مخالفت کرنے والا کنانور کی سرزمین پر سانس نہ لے سکے گا۔

علی کے والد کو مزید گفتگو کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ وہ راجہ کنانور کے عزم و حوصلہ سے مطمئن ہو گئے۔ انہوں نے دوسری بات پھیر دی:

بارات میں کتنے آدمی ہونے چاہئیں؟

راجہ کنانور دوبارہ ہنسنا:

اے امیر! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ بارات کسی کے گھر نہیں بلکہ ریاست کنانور آرہی ہے۔ اس ریاست میں جتنی زمین ہے اور اس پر جتنے آدمی ساکن ہیں آپ لے آئیے، ہم مرہٹوں پر بٹھا دیں گے۔

علی کے والد پھر راجہ کامنہ دیکھ کر رہ گئے۔ پھر کچھ سوچ کے بولے:

بارات کس دن یہاں پہنچنا چاہیے؟

جس قدر جلد ممکن ہو سکے بارات لے آئیے تاکہ میں اس فرض کو ادا کر کے اپنی منزل کی

طرف روانہ ہو جاؤں۔

راجہ نے یہ بات بھی علی کے والد پر چھوڑ دی:

آج پیر وار ہے۔ مناسب ہو تو آگے پیر وار کو بارات لے آئیے۔ ہم ہمہ وقت آپ کی آمد کے منتظر ہیں۔

تمام معاملات بغیر جیل و جت کے طے پا گئے۔

پچھلے اگر دو دنوں فزیتی کسی فیصلے پر پہنچنے کے آرزو مند ہوں تو ان کے راستے میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔ اور اگر دونوں میں کھوٹ ہو تو ہر بات میں کوئی نہ کوئی پیچ نکل آتا ہے۔

علی کے والد کا خیال تھا کہ انہیں اس اہم معاملے کو طے کرنے میں نہ معلوم کتنے دن لگ جائیں۔ مگر سارے معاملات ایک ہی دن میں طے پا گئے اور دوسری صبح وہ اپنی بستی کی طرف روانہ ہو گئے۔



ماہیہ یا لیگار امیر زاد سے علی کی بارات بڑی دھوم دھام سے چڑھی۔

اتوار کے دن علی کی سہرا بندی ہوئی۔ پھر کم و بیش بارہ سو آدمیوں کی بارات کنانور کی طرف

روانہ ہوئی۔

کے قابل تھا۔

یہ رات کا کوئی پہر تھا مگر دونوں طرف سے روشنی کا اس قدر معتدل انتظام کیا گیا تھا کہ رات پر دن کا شبہ ہوتا تھا۔

استقبال کرنے والے اپنے خیوں سے نکلے۔ ان کے ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے تھے۔ دوسری طرف بارات گاڑیوں اور گھوڑوں سے اتری۔

جب یہ دونوں قومیں، دو تہذیبیں متقابل ہوئیں تو سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ بارات کے ساتھ آنے والے تقریباً تمام ماہر تھے، جن کا لباس کنا نور کے استقبال کرنے والوں سے بالکل مختلف تھا۔

مگر۔

جب استقبال کرنے والے باراتیوں کے گلے میں ہار ڈال کے ان سے گلے تلے تو ملاپ، محبت اور دوستی کا جیسے سمندر ابل پڑا۔

وہ ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے۔ ایک دوسرے کے ہاتھوں کو چومنا اور بعض نے تو ایک دوسرے کے منہ تک چوم لیے۔

علی کے والد اور راجہ کنا نور تو ایسی چھٹی مار کے گلے ملے کہ جب تک لوگوں نے انہیں الگ نہ کیا وہ ایک دوسرے سے چمٹے ہی رہے۔

بارات کو یہاں تھوڑی دیر کے لیے ٹھہرایا گیا۔ منہ ہاتھ دھونے کے لیے پانی کا وافر انتظام تھا اور نکلن دور کرنے کے لیے دور دراز فرشتے بچا دیے گئے تھے۔ پھلوں اور میوؤں کا بھی انتظام تھا۔ باراتی منہ ہاتھ دھو کر کمر تکا کے فرش پر لیٹ گئے۔ اس وقت پھلوں اور میوہ جات کے جوان ان کے سامنے رکھے گئے۔ یہ رات کا ناشتہ تھا۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد بارات دوبارہ روانہ ہوئی۔

اس کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ بارات کے ساتھ آنے والے تمام لوگوں میں خواجه فردش بھی تھے، سب کی یکساں طور پر خاطر برداشت کی گئی تھی۔ یہی نہیں بلکہ علی کے والد، علی اور راجہ کنا نور باراتیوں کے ساتھ، بھارتیہ فرشتے اور ان کے ساتھ ہیں اور میوؤں سے لطف اٹھایا۔

کنا نور شرم میں استقبال کرنے والوں کا ایک ازہام تھا۔ علی کے والد کے تمام دوسروں سے اور شبہات غلط ثابت ہوئے۔ ان کا یوں استقبال کیا گیا جیسے ماہر اور ناٹر ایک ہی قوم کے باشندے

ہوں۔

راجکاری اور علی کی شادی کی تشریف پورے کنا نور میں ڈھول اور تاشوں کے ذریعے کی گئی تھی تین روز تک پورے کنا نور میں جو کچھ جلانے کی ممانعت کر دی گئی تھی اور یہ اعلان کیا گیا تھا کہ جس گھر سے دھواں اٹھتا دکھائی دیا اس گھر کے رہنے والوں پر جرمانہ کیا جائے گا۔

راجہ کی طرف سے کنا نور کی پوری آبادی کی دعوت تھی۔ سب کو دعوت میں صبح و شام شریک ہونا تھا۔ بچوں اور عورتوں اور گھر آنے والے نمازیں کے لیے گھر دہاں پر کھانا پہنچانے کا انتظام تھا۔ بارات پہنچی تو منڈپ تیار تھا۔

دور دراز تک فرشتے بچا تھا۔ شاہیانے لگے تھے۔ درمیان میں ایک الاؤ چل رہا تھا جس میں خوش بوئیں ڈالی گئی تھیں اور نفاہک رہی تھی۔

الاؤ کے ایک طرف لٹی ہوئے تازے پنڈت صرف دھوقے بانڈھے اور جنیو گلیے میں کمرنگ ڈال بیٹھے تھے۔ دوسری جانب دہا دمن کو بیٹھنا تھا۔ پورا پنڈال دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں سے بھر گیا۔ دہا جن کپڑوں میں آیا تھا اسی لباس میں منڈپ میں لایا گیا۔ پھر راجکاری دمن بنی ہوئی آئی اور دہا علی کے برابر بیٹھ گئی۔

علی سے گانے بجانے والی عورتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ کھیل تماشے والے پنڈال کے چاروں طرف جمع لگائے لوگوں کو محفوظ کر رہے تھے۔

پنڈتوں نے راجہ سے اجازت مانگی اور ہندو رواج کے مطابق جنم منتر پڑھنا شروع کیے۔ وہ پڑھتے جاتے اور پڑھ پڑھ کے دہا دمن پر پھونکتے جاتے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد پھر یہ ہوئے دہا کے پیچھے دمن کا بلو دامن سے بانڈھا گیا۔ اس طرح آگے دہا اور پیچھے دمن آگے پیچھے منڈپ کے گرد گھومنے لگے۔

ہندو مذہب میں نکاح کی یہ آخری رسم ہوتی ہے۔ سات پھیرے جسے پھیر دی گھومنا بھی کہتے ہیں، لگانے کے بعد نکاح چکا ہو جاتا ہے۔

پھر پورے ہونے ہی مبارک، مبارک کی صدائیں بلند ہوئیں۔ علی کے والد اور راجہ کنا نور ایک بار پھر پر جوش طریقے سے بغل گیر ہوئے۔

اس وقت ماحول بالکل ہندوستانہ تھا۔ دیکھنے والا یہ اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ اس میں ناٹروں کے علاوہ کثیر تعداد میں مسلمان بھی موجود ہیں۔ ناٹر اور ماہر بڑی محبت سے ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔

عالم دین نے ہاتھ بلند کیے اور سب نے دہما دہمن کے لیے دھماٹے خیر کی۔
اس کے ساتھ ہی مبارکباد کی آوازیں بلند ہوئیں۔ دھماٹے اور اس کے والد برابر کھڑے ہو گئے
ایک ایک آدمی اپنی جگہ سے اٹھا اور علی اور اس کے والد سے گلے مل کر مبارکباد کہتا۔ راجہ کنا نور
یہ سب بڑے غور اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔
لوگوں کی مبارکباد کا سلسلہ ختم ہوا تو علی اور اس کے والد راجہ کے پاس گئے اور دونوں اس
سے بغل گیر ہوئے۔

اس طرح نکاح کی محفل اختتام پذیر ہوئی۔ شروع سے آخر تک کسی موقع پر ہنسی نہ ہوئی اور
ہر کام بخیر و خوبی انجام پایا۔



شادی کے بعد دہمن کی طرف سے شریک ہونے والے افراد اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور
دہما کے ساتھ آنے والوں کو وہاں پہنچا دیا گیا جہاں ان کے لیے انتظام کیا گیا تھا۔
دہمن اپنی سیلیوں کے ساتھ ایک آراستہ و پیراستہ کمرے میں پہنچا دی گئی۔ راجہ کے ایک
بڑے کمرے کو اس مقصد کے لیے جگہ مقرر کی گئی تھی۔
دوسرے کمرے میں دھما علی، اس کے والد اور ساتھ آنے والے معززین کے قیام کا انتظام تھا۔
چونکہ باراتی زیادہ تھے اس لیے ان کے لیے میدان میں بڑے بڑے خیمے نصب تھے۔
کنا نور والوں کو بھی معلوم تھا کہ راجہ کی شادی ایک باہد مسلمان امیر زادے علی کے
ساتھ ہو گئی ہے اور بارات ایک دو دن کنا نور میں گزار کر واپس چلی جائے گی۔ انہیں اس بات کا علم نہ تھا
کہ راجہ کی مسلمان ہو گئی ہے اور اس کا اسلامی طریقے سے علی کے ساتھ نکاح پڑھایا گیا ہے۔ اس
سلسلے میں راجہ نے اپنے سینا پتی (سہ سالار) کو اعتماد میں لے لیا تھا اور اس نے راجہ کو اپنے پورے
نقادان کا یقین دلایا تھا۔

طے یہ ہوا تھا کہ شادی کے فوراً بعد سہ سالار کنا نور کے علاوہ چند اور اہم ہستیوں کو اعتماد
میں لے کر یہ اعلان کر دیا جائے گا کہ دوسرے دن صبح کو کنا نور کے نئے راجہ کی تاج پوشی ہوگی اور
یہ راجہ کوئی اور نہیں، کنا نور کی راجہ کی کا شوہر علی ہوگا۔

راجہ نے اس سلسلے میں دہن کی دعوت کے فوری بعد ان لوگوں کو محل میں روک لیا۔

ہندو نہ نکاح ہونے کے بعد راجہ کے محل کے ایک بڑے حصہ میں مسلمان باراتیوں کو پہنچایا
گیا۔ پھر دہما دہمن محفل میں لائے گئے۔ یہاں صرف مسلمان تھے اور کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی۔
دہما دہمن کو ایک دوسرے سے الگ بیٹھایا گیا۔

دہمن کو اس کی سیلیوں اور دہما کو اس کے دوستوں نے گھیر رکھا تھا۔ جب سب لوگ بیٹھ
گئے تو سب سے آخر میں راجہ کنا نور اور علی کے والد مسکراتے ہوئے آگے آکر برابر برابر
بیٹھ گئے۔

اس وقت علی کے والد اٹھ کر ایک بزرگ شخص کے پاس گئے۔ انہیں علی کے والد اپنے
ساتھ ہی لائے تھے۔ ان سے چند باتیں کرنے کے بعد دونوں اٹھ کر دہمن کے پاس گئے۔ راجہ کی
سیلیاں ایک طرف ہو گئیں۔

یہ بزرگ پانڈتوں کے بڑے عالم دین تھے۔ وہ دہمن کے سامنے بیٹھ گئے۔
"بیٹی راجہ کی۔ آپ اپنی مرضی سے دین اسلام قبول کر رہی ہیں؟" عالم دین نے راجہ کی
سے دریافت کیا۔

"جی ہاں، راجہ کی نے جواب دیا۔

"میں جو الفاظ کہتا ہوں وہ آپ دہرائی جاتیے۔"

"بہتر ہے۔"

عالم دین نے راجہ کی کو کلمہ پڑھا کر مسلمان کیا اور اس کا نام سلمہ رکھا۔ پھر علی کے والد سے مخاطب
ہو کر کہا:

"آپ دیکھیں اور دونوں کو ابوں کو ساتھ لے آئیے۔"

راجہ کی کا مسلمان ہونا اور وکیلوں اور گواہوں کے نام پہلے سے طے شدہ تھے۔ علی کے والد نے
وہیں سے ان کو اشارہ کیا۔ وہ آگے اور ان میں سے ایک نے دہمن راجہ کی سلمہ سے ایجاب و قبول
کا سوال کیا۔

راجہ کی نے "ہاں" کہہ کر علی کو اپنا شوہر قبول کیا۔ یہ الفاظ تین مرتبہ دہرائے گئے۔ چونکہ
عالم دین نے خود اپنے کانوں سے راجہ کی کے منہ سے "ہاں" کا لفظ سنا تھا اس لیے وہ اور وکیل و
گواہ دہمن کے پاس سے اٹھ کے محفل میں آئے۔

پھر دہما سے ایجاب و قبول کے بعد عالم دین نے بلند آواز سے خلیفہ عقد پڑھا خطبہ کے بعد

سپہ سالار نے دفاحت کھتے ہوئے کہا:

”اگرچہ راجکاری اور علی کی شادی سے فی الحال ریاست کنا نور چل گئی ہے مگر نواب حیدر علی کی بڑھتی ہوئی طاقت نے مشرقی سائل سے مغربی سائل تک تمام علاقے اپنے قبضے میں لے لیے ہیں اس لیے صرف ایک غیر مسلم ریاست کنا نور اس کی آنکھوں میں ضرور گھسائی رہے گی اگر وہ اس ریاست پر قبضہ نہ بھی کرے تو ریاست میں اپنا گورنر مقرر کرنے سے اسے کون روک سکتا ہے؟ اس وقت ہماری پوزیشن کیا ہوگی؟ کیا ہم اپنے مددوں سے معزول نہ کر دیے جائیں گے؟“

شہر کو تال نے کھڑے ہو کر سوال کیا:

”سینا پتی جی، پھر آپ نے ہماری اور اپنی ملازمتوں کو بچانے کا کیا آپ نے (حل) سوچا ہے؟“

سپہ سالار نے فوراً جواب دیا:

”اس کا حل آپ کے اور میرے راجہ کنا نور نے بے مثال قربانی دے کر نکالا ہے۔ ہمارے پیارے راجہ نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ راج سنگھاسن (راج گدی) چھوڑ کے راجکاری کے شوہر علی کو کنا نور کی راج گدی پر بٹھا دیں گے اور اس کا نام ”راجہ علی“ ہوگا۔ پھر راجہ چونکہ اپنی راجکاری کا پتی ہوگا اس لیے وہ حکومت کے کارکنوں میں کوئی تبدیلی نہیں کرے گا۔“

شہر کو تال خوش ہو گیا:

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ راجکاری اور راجہ کنا نور دونوں نے ہمارے لیے قربانی دے دی ہے۔ ہم ان کے بے حد شکریہ ادا کرتے ہیں۔“

لیکن سینا پتی جی۔ یہ کام جلد ہی ہو جانا چاہیے۔ کہیں نواب حیدر علی خاں کا نیت تبدیل نہ ہو جائے۔ ورنہ اور مشکل ہو جائے گی۔“

”آپ لوگ تیار ہوں تو ہم کل ہی علی کو راج گدی پر بٹھا دیں؟“ سینا پتی نے کہا۔

”یہ تو اور بھی اچھا ہے۔“

شہر کو تال اول نے کہا:

”اس طرح خلوہ ہمیشہ کے لیے ٹل جائے گا۔“

اسی دن شام کو شہر کے بڑے چوک میں ڈگ بیتی جاری تھی:

”سنو سنو۔ ریاست کنا نور کے باسیرو! سنو!“

ہمارے پیارے راجہ کنا نور دون بعد تیرہ اتر اپریل ریاست سے

انٹا دیں لیا جانا تھا۔

یہ کام راجہ نے سپہ سالار کے سپرد کیا تھا اور اس نے فرداً فرداً مخصوص آدمیوں کو مرگوشیوں میں دربارِ خاص کے لیے رکھنے کو نہ دیا تھا۔

دعوت ختم ہوئی تو محل کے دربارِ مل میں دربارِ خاص منعقد ہوا۔ سپہ سالار نے دربارِ مل کے دروازے اور محل کے گرد سخت فوجی پہرہ لگا دیا تھا اور فوجیوں کو حکم دیا تھا کہ دربارِ مل سے کسی کو باہر نہ نکلنے دیا جائے۔

راجہ کنا نور اور سپہ سالار کو دربار میں سخت مخالفت کا خطرہ تھا۔ کیونکہ یہ معاملہ ایک ناگزیر ریاست کو ایک پائے امیر زادے کے سپرد کرنے کا تھا۔ راجہ کنا نور نے اپنے سپہ سالار کو یہ کہہ کر اتفاقاً دیا تھا کہ ریاست بھوسور کا حکمران اور صوبہ دار سران نواب حیدر علی خاں کا لشکر کنا نور پر حملے کے لیے تیار ہو رہا ہے۔ راجہ نے اس کی وجہ یہ بیان کی تھی کہ مسلمانوں کو مقامی ہندوؤں نے اس قدر تنگ کیا ہے کہ انہوں نے حیدر علی خاں سے درخواست کی ہے کہ وہ مسلمانوں کو غیر مسلم آبادیوں سے بچانے کے لیے آئے اور اس درخواست کے جواب میں اس نے غیر مسلم ریاستوں پر حملے شروع کر دیے ہیں۔ نواب حیدر علی نے پہلے بدزور پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا ہے اور راجہ کنا نور کی طرف حملے کے لیے بڑھ رہا ہے۔

راجہ نے اپنے سپہ سالار کو یہ بھی بتایا کہ راجکاری کا دھما علی اور اصل حیدر علی خاں کا ایک بہت قریبی عزیز ہے اور علی اور راجکاری میں ایک عرصے سے دوستی ہے اس لیے میں نے علی سے راجکاری کو بیاہ کر اور اصل ریاست کنا نور کو حیدر علی خاں سے بیاہا ہے۔

یہ بات قابلِ یقین تھی۔ بدزور پر حیدر علی کا لشکر قابض ہو چکا تھا۔ پھر کنا نور اس سے کب بچ سکتا تھا۔ جب کنا نور نہ ہوتا تو پھر سپہ سالار کہاں رہتا۔ اس کا بھی منامہ ہو جاتا۔

دربارِ خاص میں راجہ کنا نور خاموش بیٹھا رہا اور اس کے سپہ سالار نے غائبین ریاست کو دبی باتیں بتائیں جو راجہ نے اس سے کئی قہقہے۔

نواب حیدر علی خاں کے حکم کی بات سن کے کنا نور داؤں کے پیردن تلے سے زمین نکل گئی۔ سپہ سالار نے آخر میں کہا:

”میں طرح راجکاری نے پائے امیر زادے کے ساتھ شادی کرنے کا رضامندی دے کر ریاست کنا نور کو نواب حیدر علی خاں کے ہاتھوں میں جانے سے روکا ہے اسی طرح راجہ کنا نور بھی ایک زبردست قربانی دے رہے ہیں۔“

کے ساتھ ہی عوام نے بھی راجہ علی کی دوازی میں ٹھہر کر دعاؤں مانگیں اور اسے مبارکباد دی گئی۔
اس کے بعد نئے راجہ کو نذرانے پیش کیے گئے۔ ان میں خزانوں میں بچے ہوئے سونے چاندی
کے ٹکڑے اور جڑاؤ ہار تھے۔ ہیرے جواہرات اور زیورات تھے۔ یہ رسم کوئی دو گھنٹہ میں ختم ہو گئی۔
لوگوں کا میلہ شام تک میدان میں جاری رہا۔

بامبارک ہے میں۔ انھوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ان کی نذر جاسری میں راجہ بھاری
کے پتی یعنی راجہ کنانور کے جوائی (دوان) علی راجہ کی گدی سنبھالیں
گئے اس لیے کل صبح راجہ علی کی تاجپوشی ہوگی۔

اس مبارک رسم میں شریک ہونے کے لیے سب لوگ راج محل کے
ماتے والے میدان میں جمع ہو جائیں۔

اس اعلان پر کھلنے والی کوئی خاص رد عمل ظاہر نہ کیا۔ جب راجہ اور اس کے تمام درباریوں نے
راجہ بھاری اور علی کی شادی کر دی ہے تو پھر علی کو راجہ بنانے پر کیوں اعتراض کیا جائے؟

ایک دو آدمیوں نے اس اعلان پر ہلکے بھونچے ہوئے جواب دیے۔ اس اطلاع پر شہر کو تو اس نے ایک درجن
سے زیادہ آدمیوں کو بازاروں میں سرکس اور قہوہ خانوں پر بھیج دیا جنہوں نے عوام کو یہ بنا ناشر دیا
کہ راجہ بھاری کی علی کے ساتھ شادی اور علی کا راجہ سنگھاسن پر بیٹھنا، یہ سب کچھ ریاست کنانور کو نذر
میدرمل ناں سے بچانے کے لیے کیا گیا ہے اس لیے کہ علی، حیدر علی خان کا قریبی عزیز ہے اور اس نے
نواب کو کنانور پر حملہ کرنے سے روک دیا ہے۔

جب یہ باتیں لوگوں میں عام ہوئیں تو راجہ بھاری اور راجہ کنانور کی قربانیوں سے وہ بہت متاثر
ہوئے۔

دوسرے دن راج محل کے سامنے والا میدان تماشائیوں سے کچی کچھ بھرا ہوا تھا۔ تختوں کے ایک
اونچے سیڑ پر کنانور کے راجہ علی کے والد علی اور دوسرے عمامہ بن ریاست بیٹھے تھے۔ وہاں اور
منتر جنت پر ہنسنے کے لیے سیڑ کے دونوں طرف دو چھوٹے چھوٹے سیڑ اور بنائے گئے تھے۔ ایک پر
جسٹس ہری چند اور دوسرے پر بارات کے ساتھ آنے والے عالم دین براجمن تھے۔

شام کے اعلان کے بعد ہی میدان کے کنارے کنارے دکھائی دے گئی تھیں۔ کھیل تماشے والے
اپنی منڈیاں لے کر آ رہے تھے۔ راجے گاہے گاہے الگ ٹھور بجا رہے تھے۔ یہ میلہ اور جشن، سورج
نکلنے ہی شروع ہو گیا تھا اور اس وقت تک زور شور سے جاری رہا جب تک تاجپوشی نہ ہو گئی
تاجپوشی کی رسم مالدی سے ادا کی گئی۔

راجہ کنانور نے کھڑے ہو کر اپنی زرنگار پہنٹی (ماج) علی کے سر پر رکھا۔ پھر پندرہ اور عالم دین

دیکھیے۔ جب یہ اچھی طرح جم جائیں تو پھر یہ چاہے جہاں رہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔
یہ بات تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔

علی کے والد بھی سوچتے ہیں پڑ گئے : پھر ذرا رک کے ہوئے :
مگر جب ہم بیچر دہادہن کے بارات سے کے داہن گھر پہنچیں گے تو وہاں کیا جواب دیں گے ؟
"آپ بھی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"
راجہ بھی نکر مند ہو گیا :

مگر یہ بھی تو ایک مجبوری ہے علی کا فوراً واپس رہنا کسی طرح مناسب نہیں :
علی کے والد کے ذہن میں ایک ترکیب آئی رانوں سے منکر کر کہا :
"مسئلہ حل ہو گیا۔"
"وہ کیسے ؟"

"میں نے ترکیب سوچ لی۔" ان کا پہرہ مسرت سے دمک اٹھا۔
"کیا ترکیب نکالی آپ نے ؟" راجہ نے انہیں دلچسپی سے دیکھا۔
علی کے والد مسکراتے ہوئے ہوئے :
"ہم علی کو لے کر آئے تھے۔ اب علی کو یہاں چھوڑ دیں گے اور راجہ کو اپنے ساتھ لے جائیں گے
اس طرح گھر والوں کو کوئی شکوہ نہ ہو گا۔"

"ٹھیک ہے۔" راجہ نے اس دن اپنی روانگی منسوخ کر دی اور کہا :
"میں راجہ کی رضعتی کے بعد جاؤں گا۔"
علی کے والد کو اچانک یاد آیا۔ وہ ہوئے :

"میرے باراتوں میں دوسو کے قریب ملاح ہیں۔ یہ اگرچہ کشتی رانی کرتے ہیں مگر جنگ کے
وقت سپاہی بن جاتے ہیں۔ میں انہیں احتیاطاً ساتھ لایا تھا۔ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ میں ان ملاحوں کو یہاں
چھوڑ جاؤں اور انہیں ریاست کی فوج میں بھرتی کر دیا جائے۔"
"آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا۔"

راجہ نے سر ہلایا :

مگر اب یہ کام آپ کیا راجہ علی کا ہے آپ لوگ جیسا مناسب سمجھیے :
راجہ علی اور زانی سلمہ کے دل کے ابھی ارمان بھی نہ نکلے تھے کہ وقتِ رضعت آگے علی کے والد نے

راجہ کنا نور دعوتِ ولیمہ کے اگلے دن ہستی چھوڑنے پر آمادہ ہوا۔ علی کے والد نے اسے روکا :
"راجہ بہادر۔ تیرے پر جانے کی ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی تو یہاں بارات بھی رخصت نہیں
ہوئی ہے۔"

راجہ نے ہنس کر کہا :
"تسے امیر۔ آپ نے وہ مثل نہیں سنی کہ ایک پیام میں دو نکواریں اور ایک ملک میں دو بادشاہ
نہیں رہ سکتے۔"

"مگر یہ بادشاہت تو آپ نے خود ہی علی کو دی ہے۔"
علی کے والد بھی مسکرائے :

"کل ارات واپس بلائے گی۔ آپ دہادہن کو رضعت کرنے کے بعد چلے جائے گا۔"

"یہ کیا فرمایا آپ نے ؟" راجہ نے گہرا کر کہا :

"کیا دہادہن آپ کے ساتھ جائیں گے ؟"

"کیا آپ راجہ کی سلمہ کو رضعت نہیں کریں گے ؟" علی کے والد بھی گہر گئے :

"امیر۔ آپ تو عقلمند آدمی ہیں۔ راجہ نے کہا :

"علی ابھی راج گدی پر بیٹھے ہیں۔ ریاست کے بڑے بڑے سردار اور امیر تو ہیں پسند کرتے ہیں
لیکن رعایا کا دل بہت آہستہ ہی ہاتھ پیریا جاتے گا۔ راجہ علی کو آپ ہیمنہ دو ہیمنہ کنا نور میں رہنے

اسے سمجھا دیا تھا کہ علی کو کنوڑ میں جھوٹے اور راجکاری کو اپنے ساتھ لے جانے میں کیا مصلحت تھی۔
 علی کو بھی حالات کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور تھا۔ اس لیے اس نے بھی اس تہذیب کو پسند کیا۔
 بارہائیوں میں سے دو سو بکری (ملاح) فوجی علی کے پاس جھوڑے گئے۔ اپنی ایک ہزار رانی اور
 رانی سلمہ علی کے والد کے ساتھ واپس ہو لیے۔

علی کے گھر والے اور بستی کے لوگ بے یمنی سے رات کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے جب انہیں
 بتایا گیا کہ علی کو کنوڑ کی راج گدی عطا ہوئی ہے اور وہ ریاست کے انتظامات میں مشغول ہے تو سب کے
 دل کو اطمینان ہوا۔

دھن کو جو بی بی بنانا لگا۔

بستی کی ساری عورتیں اسے دیکھنے کو ٹوٹ پڑیں۔ سلمہ رانی کچھ دن پہلے راجکاری کی حیثیت سے
 بستی میں آچکی تھی مگر اس وقت اسے کسی نے دیکھا اور کسی نے نہ دیکھا تھا۔ اب وہ بستی کی بیویں کے آئی تھی تو
 سب اسے دیکھا۔

رانی سلمہ چند سے آفتاب چند سے ماہتاب تھی۔ جس نے دیکھا اس نے پسند کیا۔ علی کے والد نے
 بستی والوں کو بھی ولیمہ دیا اور علی کے نام نے کی مجوری بیان کی۔

بستی والوں نے انہیں مبارک باد بھی اور کہا کہ یہ تو بستی والوں کی عزت افزائی ہے کہ ایک پابنگار
 امیر کا بیٹا ایک ریاست کا راجہ بنے۔

اس خوشی میں بستی والوں نے علی کے راجہ ہونے کے جشن کو اپنے طور پر منایا جس میں رانی سلمہ اور
 علی کے تمام عزیزوں کو دعوت دی گئی۔ رانی سلمہ اس محفل کی عین خصوصی تھی۔

دو بار دن بعد ہی رانی سلمہ کی اہنیت ختم ہو گئی اور وہ بستی کی عورتوں اور لڑکیوں میں گھل مل گئی۔
 یوں معلوم ہونے لگا جیسے وہ اسی بستی کی رہنے والی ہے۔

اب آجیسا ناول کے ہیرو یعنی نواب حیدر علی خاں کی طرف چلتے ہیں۔
 مغربی ساحل پر ان کی آخری فتح ریاست بدوڑ کی تھی۔ اس فتح نے حیدر علی کی شہرت میں چار

ہجارت لگا دیے۔ انہیں بدوڑ سے اس قدر دولت حاصل ہوئی کہ ایک انگریز مورخ کی زبان میں

"بدوڑ کی فتح نے حیدر علی خاں کو کمر سے تخت پر بٹھا دیا۔ تخت نشین

ہونے کے بعد نواب حیدر علی خاں نے بدوڑ کا نام بدل کر اپنے نام پر "حیدرنگر"
 رکھا اور اسے اپنا پایہ تخت بنایا۔

حیدرنگر میں نواب نے سکے ڈھالنے کی محکمات تعمیر کرائی اور اپنے نام
 کے سکے ڈھلائے۔

پھر حیدر علی خاں نے خشکی سے نکل کر پرتگالی جزیرے گوآ پر شدید
 حملہ کیا اور ان کے قلعہ کا دارلہذا ان کو مار بھگا یا۔ انہوں نے مجبور ہو کر
 صلح کی درخواست کی اور بدوڑ کے جن ساحلی علاقوں پر انہوں نے قبضہ
 کیا تھا وہ علاقے خالی کر کے نواب حیدر علی خاں کے زیرِ سرن حوالے کیے بلکہ
 ان سے معافی مانگی اور انہیں یقین دلایا کہ اب وہ کسی ساحلی علاقے پر قبضہ
 نہیں کریں گے۔

نواب حیدر علی خاں کی اس فتح نے ایک طرف انہیں دولت، شہرت اور بادشاہت دی تو دوسری
 طرف مالابار کے علاقے میں سدبوں کے کچلے ہوئے پلاؤں دسکانوں نے سراٹھا کر چلنا شروع کیا۔
 یہ مسلمان طور پر اسلام کے ساتھ ہی تاجروں اور ملاجوں کی صورت میں مالابار آئے اور بسا بے گنت
 پھر انہوں نے یہاں اپنی چھٹی چھوٹی ریاستیں بنائیں مگر مقامی آبادیاں انہیں پریشان کرتی اور ان کے
 علاقوں میں تاخت و تاراج کرتی رہتی تھیں۔

بدوڑ میں نواب حیدر علی کی بادشاہت قائم ہوتے ہی مالابار کی ان پلاؤں ریاستوں نے ہڑادھر
 اپنے وفد نواب کے دربار میں بیٹھنے شروع کر دیے۔ انہوں نے مقامی غیر مسلم حکمرانوں کے ظلم و ستم سے محفوظ رکھے
 جانے کی درخواست کی تھی۔

نواب نے ہر سفارت کو اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا اور صرف طور پر کہا تھا کہ جیسے ہی کسی مسلم
 ریاست پر کوئی غیر مسلم حملہ کرے یا انہیں پریشان کرے تو اس کی اطلاع حیدرنگر بھیجی جائے تاکہ حکم آور
 کی سرکوبی کے لیے حیدر علی شکر بھیجا جائے۔

راجہ علی کی ریاست کنوڑ بھی ایک ناؤ ریاست تھی۔ کنوڑ کے پرانے راجہ نے اپنی رعایا کو خبردار
 کر دیا تھا کہ راجہ علی کو قطعاً پریشان نہ کی جائے ورنہ نواب حیدر علی کا حیدر علی شکر کا نور پیچ کر پوری ریاست
 کو تہہ بالا کر دے گا۔

کنوڑ کے لشکر کو بدوڑ سے بڑے سرداروں نے تو راجہ کی بات کو تسلیم کر لیا تھا مگر راجہ کے ریاست

سے رخصت ہوتے ہی ریاست کے کچھ بد نما ہوں نے ربابا کو بھڑکا کر شروع کر دیا۔ اس طرح راجہ علی کو راجہ لکھری سے بے دخل کرنے کا مطالبہ شروع ہوا۔

راجہ لکھری نے کچھ دن سسرال میں رہ کر کانورڈا لیس آئی تو اسے راجہ علی نے حالت سے آگاہ کیا۔ وہ تو پہلے ہی علی پر عاشق تھی۔ اب تو وہ اس کا شوہر تھا۔ اس نے راجہ علی کو جو مسدود کیا کہ بھڑانے کی بالکل ضرورت نہیں۔ اگر ربابا نے بغاوت کی تو وہ بھی تلوار اور بندوق کے ساتھ راجہ علی کے ساتھ نشانہ بانیوں کا مقابلہ کرے گی۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ کانورڈا کے تمام مندروں کا پستونو جسے گرد پندت کہا جاتا تھا ایک سو آدمیوں کا وفد لے کر سیناپتی کے پاس پہنچا۔

سیناپتی ان لوگوں کو دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ اس کے جاسوس کئی روز سے اطلاع دے رہے تھے کہ غلام میں بے چینی، ٹرھہری ہے اور کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ یہ گرد پندت، اجال اور متعصب ناژوں کا گرد گھنٹال تھا اور راجہ علی کی حکمرانی کو غیر قوم کی حکومت سمجھتا تھا۔ وہ پہلے ہی دن سے اس ناک میں تھا کہ اسے ذرا سا موقع ملے اور وہ ماہٹر راجہ علی کو کانورڈا سے نکال باہر کرے۔

کانورڈا سیناپتی ایک عقلمند اور سجدہ دار انسان تھا۔ اس نے وفد کا خوش روی سے استقبال کیا اور گرد پندت سے دریافت کیا:

”پندت ہمارا راجہ بہریت تو ہے آپ نے کیوں تکلیف فرمائی۔ مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے میں نے یار ریاست کے کسی رکن نے کنورڈا کے مذہبی معاملات میں کوئی دخل اندازی نہیں کی، پھر آپ کو کیوں زحمت کرنا پڑی؟“

گرد گھنٹال لیڈرین کے آگے تھا۔ اس نے سخت لہجہ میں کہا:

”ہم جس کام کے لیے آئے ہیں وہ مذہبی ہے اور ریاستی بھی۔ آپ کو ہماری باتیں کانکول کر سنا ہوں گی۔“

اس وقت سیناپتی کے پاس پندرہ بیس لشکر کی اکٹھا ہو گئے اور اس مجمع کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی مجمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔

گرد پندت کی سخت کلامی پر سیناپتی نے بھی اپنا لہجہ تبدیل کرتے ہوئے کہا:

”پندت ہمارا راجہ اگر کوئی مذہبی معاملہ ہے تو میں آپ کی بات سننے پر تیار ہوں اور اگر اس پر تعظ

کسی انتظامی معاملہ ہے تو میں آپ کی بات سننے کو تیار نہیں اور نہ آپ کو یہ حق دے سکتا ہوں کہ آپ ریاست کے سپہ سالار کو دھمکانے کے لیے آدمی لے کر آئیں۔“

گرد پندت نے نظر میں گھا کر چاروں طرف دیکھا۔ وہاں لشکریوں کی تعداد چالیس پچاس بیس پینچ چھی تھی۔ اسے خوف پیدا ہوا کہ کیس بھگڑے کی صورت میں وہ خود ہی نہ مارا جائے۔ اس پر وہ ٹھنڈا ہو گیا اور مومو بانہ انداز میں بولا:

”سیناپتی جی۔ ہم کسی انتظامی معاملے کی نہیں بلکہ مذہبی بات کرنے آئے ہیں۔ آپ ہماری بات تو سنیے۔“

”ٹھیک ہے۔ مذہبی معاملے پر میں ضرور بات کر دوں گا۔“

سیناپتی بھی نرم پڑ گیا:

”آپ دو چار آدمیوں کو ساتھ لے کر اندر آجائیے اور اس مجمع سے کہیے کہ وہ باتو خاموشی سے آپ کی داپسی کا انتظار کر کے یاد آپس چلا جائے۔“

گرد پندت نے مجمع کو مخاطب کیا:

”جی ہاں! میں سیناپتی سے گفتگو کرنے جا رہا ہوں۔ آپ لوگ خاموشی سے میری داپسی کا انتظار کیجیے۔“

گرد پندت کے ساتھ آنے والوں نے بھی دیکھ بیاق کر لشکریوں کی تعداد بڑھتی چلی۔ اگر انہوں نے کوئی حرکت کی تو انہیں نقصان پہنچے گا۔ وہ تو خاموش ہو گئے اور بعض پالاک لوگ جو محض تماشاہ دیکھنے کے لیے ساتھ چلے آئے تھے وہ آہستہ آہستہ کھسکا کر شروع ہو گئے۔ گرد پندت اپنے ساتھ پانچ مندروں کے پانچ پندتوں کو لے گیا۔

جب یہ سب ایک کمرے میں بیٹھ گئے تو سیناپتی نے پوچھا:

”فرمائیے گرد ہمارا راجہ موجودہ راجہ نے آپ پر اور آپ کے مذہب پر کیا غضب ڈھا دیا ہے کہ آپ جلوس لے کر ریاست کے سیناپتی کو دھمکانے آئے ہیں۔“

سیناپتی جی: ”گرو نے جواب دیا:

”ہم آپ سے صرف ایک مطالبہ کرنے آئے ہیں۔ آپ اسے پورا کر دیں، ہم خاموش ہو جائیں گے۔“

”تمہیں باندھنے کی ضرورت نہیں۔“ سیناپتی کا لہجہ ایک دم سخت ہو گیا۔ ”کھل کر ہمارا کیا

”اچھا تو سنو“

سیدنا بیٹی نے گرج کر کہا:

”اس عظیم ہستی اور فاتح کا نام ہے نواب حیدر علی خاں جو اس وقت مرزا کا پٹنم ریاست میسور ریاست بدنور اور تمام جنوبی وسطی علاقوں کا بادشاہ ہے اور بہارا راجہ علی، حیدر علی خاں کا عزیز دار ہے۔“

جب نواب حیدر علی خاں نے بدنور کے بعد کناور پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تو ہمارے راجہ علی اور ان کے آپ نے نواب کو روک دیا اور یہ طے پایا کہ راجہ علی کا نور اور امیر زادے علی کی شادی کر دی جائے اور علی کو کناور کا راجہ بنادیا جائے۔ اس طرح کناور تباہی سے بچ گیا ورنہ کناور کی اینٹ سے اینٹ بچ جاتی۔

غیبیہ تو راجہ علی کا احسان غد ہونا چاہیے لیکن تم تو اس انیس راج گدی سے ہٹانے کی کوشش کر رہے ہو۔“

”یہ بات تو ہمیں معلوم نہیں تھی سیدنا بیٹی جی۔“ گرد پندت مردہ آواز میں بولا۔

”اب تو سب کچھ معلوم ہو گیا نہیں؟“ سیدنا بیٹی نے کہا۔

”اب باڈ اور خاموش ہو کے بیٹھو۔ بنبردار جو راجہ علی کے خلاف ایک لفظ بھی تم لوگوں نے منہ سے نکالا تو۔“

راجہ علی کے خلاف کناور کے پندتوں نے جو شور مچا رہا کہ ناچا بیٹی بھی وہ بٹا ہر ختم ہو گئی مگر کناور کے چاروں طرف کے علاقوں میں نواب حیدر علی خاں کے خلاف ایک نیا محاذ قائم کرنے کی کوشش جاری رہی جس میں عام طور سے وہ راجے ہمارے اور پادشاہ شامل تھے جن کے علاقوں اور ریاستوں پر نواب نے قبضہ کر لیا تھا۔ ایسے لوگوں کے لیے راجہ علی کا کناور کی گدی پر بیٹھنا، ان کی سرک کے خلاف تھا۔

حیدر علی خاں اور راجہ علی میں کوئی خاندانی رشتہ نہ تھا بلکہ علی کے والد نے کناور کی راجکاری اور علی کی شادی کے سلسلے میں یہ نکتہ پیش کیا تھا اور راجہ نے کسی موقع ہنگامے سے بچنے کے لیے علی کے والد سے مخالفت کی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ راجہ کو اپنی اکلونی اولاد راجکاری کناور سے بے انتہا محبت تھی ماسے معلوم ہو چکا تھا کہ علی اور راجہ کی میں محبت اس قدر بڑھ چکی ہے جسے ختم کرنا اب نامکن ہے۔ اس لیے

کہنا چاہتے ہو؟

”ہم چاہتے ہیں کہ کناور کی راج گدی پر کوئی نادر راجہ بیٹھے۔“ گرد نے اکرٹ کر کہا اور باقی پندتوں کی طرف دیکھا۔

”تم ریاست کناور کے بایا ہو چاہا ہو، کیا ہو؟ کون ہوتے ہو تم راجہ کو بدلنے والے! پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ مقابلہ کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟“

سیدنا بیٹی کو طیش آگئی:

”تم ریاست کے ملازم ہو۔ ریاست نے مندروں کے لیے زمین وقف کی ہے جس سے مندروں کے اخراجات پورے ہوتے ہیں۔ تمہیں تنخواہ ملتی ہیں۔ تم لوگ مندروں میں بیٹھ کر سوائے لوگوں پر رعب ڈالنے کے اور کیا کرتے ہو؟“

گرد پندت نے سیدنا بیٹی کے گڑبڑتے پور دیکھے تو اس کی جان نکل گئی۔ وہ گھجکا کے بولا:

”سیدنا بیٹی جی۔ آپ ناراض نہ ہوئے۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ کناور کی راج گدی پر ہماری ذات اور ہماری ریاست کا کوئی راجہ ہونا چاہیے۔ آپ راجہ بن جائیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

”تم مجھے لالچ دے رہے ہو۔ بغاوت پر آمادہ کر رہے ہو۔ لعنت ہے تم لوگوں پر“ سیدنا بیٹی

بسیج پڑا:

”تم تو کنوئیں کے مینڈکی ہو۔ تمہیں کیا خبر کہ زمانے میں کیا ہو رہا ہے۔ یہاں سے سوچا میں باہر جا کے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ کالا بار کی تمام چھوٹی چھوٹی ریاستیں اور پادشاہ زمیندار یا ختم ہو گئی ہیں۔ ان ریاستوں کو ختم کرنے والا وہ شخص ہے جس نے مرہٹوں کو شکست دی ہے۔ نانا کن اور اراکٹ کے نوابوں کا منہ پھیر دیا ہے۔ اگر مرہٹوں اور فرانس جیسی جس کے نام سے گھبراتے ہیں اس نے پرتگالیوں کے جزیرہ گو ابراہم کے ان پادشاہوں کو نکال دیا ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ شخص کون ہے؟“

گرد پندت نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

انہیں بلکہ کیا معلوم تھا کہ جنوبی ہند میں کسی کیسی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ وہ تو راجہوں میں کھٹا بھانا اور دان (خیرات) وصول کرنا ہی جانتے تھے۔

”جس میں معلوم سیدنا بیٹی جی۔“

گرد پندت نے ہتھیار ڈال دیے:

”ہمارے مندروں میں سوائے دیوی دیوتاؤں کے اور کسی کی بات نہیں ہوتی۔ آپ ہر بتائیے۔“

اور ناز میرے رشتے دار بن گئے ہیں مگر اس کے باوجود ان لوگوں نے مجھے دل سے اپنا راجہ تسلیم نہیں کیا ہے۔

سیناپتی راجہ علی کے خاموش ہونے پر بولا:

”انہی حالات سے آگاہ کرنے کے لیے میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں میرے محبوب راجہ۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ ملکی اور غیر ملکی حالات سے خود کو پوری طرح باخبر رکھتے ہیں۔

مجھے یہ بھی یقین ہے کہ جب راجہ علی تمام حالات سے پوری طرح واقف ہیں تو انہوں نے اس کی درستی اور اصلاح کے لیے بھی کوئی تدبیر ضرور سوچی ہوگی۔

”کیوں نہیں۔ میں آخر نائٹ کا بائزر راجہ اور منتخب حکمران ہوں۔ راجہ علی نے بڑے عزم اور استقلال سے کہا:

”میں نے اس سلسلے میں جو فیصلہ کیا ہے اس میں تمہارا مشورہ ضروری ہے۔ اچھا ہوا کہ تم نے آج خود ہی یہ بات چھیڑ دی۔“

راجہ علی نے ایک گہری سانس لی۔ پھر چند لمحے غور کے بعد بولا:

”تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھے کتنا نور کے راجہ ہونے کے سلسلے میں نواب حیدر علی خاں فرما کر دل سے ریاست میسور، گورنمنٹ سرائے اور حاکم سلطنت خداوادی پوری پوری حمایت حاصل ہے۔ پورے مالابار اور خاص کر کنا نور میں پلاؤں پر جو ستم ڈھائے جارہے ہیں ان کی اصلاحات سلطنت خدا داد کے مرکز حیدر نگر پہنچ چکی ہیں اور حضرت نواب بہادر نے مجھے حالات کی تصدیق کے لیے بلوایا ہے۔“

”یہ تو آپ نے بڑی اچھی خبر سنا لی راجہ بہادر۔“

سیناپتی خوش ہو گیا:

”اب کس بات کی نکر۔ آپ تشریف لے جائیے اور نواب بہادر کو تمام حالات سے نہ صرف آگاہ کیجیے بلکہ فوج کے ہراول دستے اپنے ساتھ لے آئیے تاکہ شہر ندوں کے مرغناؤں کا دماغ سمجھ گیا جائے۔“

”میرا بھی کچھ ایسا ہی ارادہ ہے۔“ علی نے جواب دیا:

”اب سوال یہ ہے کہ میں خود سید رنگ جاؤں یا نواب بہادر کی خدمت میں سنارت روانہ کروں تمہارا کیا مشورہ ہے؟“

اس نے علی کے والد کے منسوبے پر عمل کرتے ہوئے اپنے داماد علی کو راجہ کنا نور بنایا اور خود راجہ گدی سے کنارہ کش ہو گیا۔

یہ منصوبہ اس قدر مکمل تھا کہ سیناپتی کو یوں اسی میں بہتری معلوم ہوئی کہ علی کو راجہ تسلیم کر لیا جائے اور کسی قسم کا خطرہ نہ مول لیا جائے۔ اسی لیے اس نے بندہ توں کو ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کر دیا تھا پھر بھی راجہ علی کے خلاف دوسرے ملاقوں میں تحریک شروع ہوئی تو کنا نور کا سیناپتی گھبرا گیا۔

ایک دن اس نے راجہ علی سے کہا:

”آج کنا نور کے مہربان راجہ! آپ کو معلوم ہے کہ پچھلے دنوں کنا نور کے تمام پندتوں نے آپ کے خلاف علم بغاوت اندک کرنے کی کوشش کی تھی اور میں نے انہیں ڈرا دھمکا کر خاموش کر دیا تھا مگر اب۔۔۔“

ڈراٹھریے سیناپتی جی۔“ علی نے اسے رد کیا:

”میں اس سلسلے میں آپ سے خود بات کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ پچھلے دنوں جو کچھ ہوا اس کا مجھے علم ہے اور آپ کی کوششوں کا میں اور ریاست کنا نور کے تمام باشندے شکر گزار ہیں۔ مگر وہ فتنہ جو اب کنا نور کے خلاف دوسرے علاقوں میں سر اٹھا رہا ہے میں اس سے بھی پروردی طرح باخبر ہوں۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ آپ نے خود اس کی پہل کر دی۔“

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ کنا نور کے لشکر کا سپہ سالار نہ صرف اپنی ریاست کی ذمہ داریوں پر پوری نظر رکھتا ہے بلکہ اس کی نگاہ قرب و جوار میں سر اٹھاتے فتنوں پر بھی رہتی ہے۔“

”میرے مہربان راجہ۔“ سیناپتی نے کہا:

”اگر آپ کو باہر کے حالات کا علم ہے تو پھر آپ نے اس سلسلے میں کوئی نہ کوئی تدبیر ضرور اٹھایا ہوگا۔“

”سیناپتی نے صحیح اندازہ لگا لیا۔“ راجہ علی مکمل کے بولا:

”مجھے معلوم ہے کہ کنا نور اور قرب و جوار کے نائٹ میرے بانی دشمن بن گئے ہیں۔ انہوں نے پلاؤں کا سینا حرام کر دیا ہے۔ جو میری شادی کے بعد کنا نور میں آکر آباد ہو گئے ہیں۔ ان کی شکایت متواتر میرے پاس پہنچ رہی ہیں۔ میں اب تک یوں طرح دیتا رہا کہ میری شادی انہوں میں ہوئی ہے۔“

"اور ہاں سینا پتی - ایک بات کا خیال رکھنا۔"
"مکرم راجہ علی؟"

"میں رانی سلمہ سے یہ کہہ کے ہوں گا کہ میں اپنے گھرواروں سے ملنے باؤں گا۔ یہ بات آپ بھی
کہیے گا۔"

"بہتر ہے راجہ بہادر۔" سینا پتی نے جواب دیا:

"میں خیال رکھوں گا کہ آپ کے حیدر نگر جانے کی اطلاع کسی کو نہ ہو سکے۔"

راجہ علی دوسرے دن کنا نور سے حیدر نگر کی طرف روانہ ہوا لیکن اس نے راستہ ایسا اختیار
کیا جو اس کی بستی سے ہو کر گزرتا تھا۔

اس کے ساتھ صرف دس سوار تھے۔ یہ سب کے سب ہاتھ ملحق تھے جنہیں راجہ علی نے فوج میں
سب اہی بھرت کر لیا تھا۔

راجہ علی سرن چند گھنٹوں کے لیے اپنی بستی میں ٹھہرا۔ باپ کو کنا نور کے حالات سے آگاہ کیا اور
حیدر نگر جانے کا سبب بتایا۔

راجہ علی کو اس کے باپ نے اپنی دعاؤں اور شوروں کے ساتھ حیدر نگر روانہ کیا۔

نواب حیدر علی خاں ان دنوں حیدر نگر ہی میں تھے۔ مالا بار کی اس بڑی اور امیر ریاست بد نور
کو فتح کرنے کے بعد انہوں نے اسے حیدر نگر کے نام سے موسوم کر دیا تھا۔

اس شہر کو نواب نے اپنا یعنی مملکت، خداداد کا دارا سلطنت بنایا اور وہاں جدید قسم کی عمارتوں
کی تعمیر شروع ہو گئی تھی۔ مگسالی کی تعمیر مکمل ہو گئی تھی اور حیدر علی خاں کے نام سے کیے گئے مغلانی شہر درج
ہو گئے تھے۔

بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ راجہ علی اور حیدر علی خاں میں کوئی رشتہ داری نہ تھی بلکہ علی کے والد
کے راجہ کنا نور پر رعب ڈالنے کے لیے نواب حیدر علی خاں کو اپنا قریبی عزیز بنایا تھا مگر اس بات سے
واقعات کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا اس لیے کہ راجہ علی جب نواب حیدر علی خاں کے محل پر پہنچا اور
اس نے حاجب دربار سے درخواست کی کہ نواب بہادر کو اطلاع دی جائے کہ کنا نور کا راجہ علی سلام
کے لیے حاضر ہے تو اسے فوراً ہی طالب کر لیا گیا۔

"میرے راجہ علی! سینا پتی مسرت سے بولا:

"نواب بہادر نے آپ کو طلب کیا ہے اس لیے آپ کا جانا ہی زیادہ مفید ہو گا تاکہ شہر بد
کے خلاف کوئی فوری قدم اٹھایا جاسکے۔"

"اس کا مطلب ہے مجھے خود جانا پڑا ہے۔"

راجہ علی نے سینا پتی کو پوری طرح اعتماد میں لے لیا تھا:

"دوسرا حوالہ یہ ہے کہ میں حیدر نگر کی طرف کب روانہ ہوں؟"

"فوراً" راجہ بہادر - سینا پتی نے کہا:

"نیک کاموں میں جلدی کرنی چاہیے۔ میرا خیال ہے آپ کل روانہ ہو جائیں۔"

"اچھا۔ اب میں امید کر سکتا ہوں کہ میری عدم موجودگی میں آپ کسی فتنہ کو سر نہ اٹھانے دیں گے؟"
اسی کی آہ نکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

دراصل یہی وہ بات تھی جس کے لیے راجہ علی نے اتنی جلدی چھڑی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ
اس نے اپنے طور پر حیدر علی خاں کو مالا بار کے حالات سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ یہ کام کسی
سفارت کے ذریعے بھی کر سکتا تھا لیکن سفارت کے آنے جانے میں کافی دقت لگ سکتا تھا اور اس
دوران کنا نور میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

راجہ علی نے اسی وجہ سے سفارت کے ساتھ خود جانے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن وہ جانے سے پہلے
کنا نور کے سپہ سالار کو پوری طرح اپنی گرفت اور اعتماد میں لینا چاہتا تھا تاکہ اس کی غیر موجودگی میں
بغاوت نہ ہو سکے۔

سینا پتی نے سینہ تان کے جواب دیا:

"اے ریاست کنا نور کے محبوب راجہ علی! آپ اطمینان سے حیدر نگر تشریف لے جائیے۔ کنا نور
کا میں ذمے دار ہوں۔ یہاں جو مافوق آپ کے خلاف اٹھے گا تو اسے مار دیا جائے گا۔ جو مریہ بلند ہو گا،
کاٹ دیا جائے گا۔"

"شاہنشاہ سینا پتی مجھے اسی نواب کی امید تھی"

راجہ علی نے واقعی اطمینان کا سانس دیا:

"میں کئی حیدر نگر روانہ ہو جاؤں گا اور پھر افتاد اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

پھر جیسے اس نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا:

”بات تو ایک ہی ہوئی نا!“ حاجب اڑ گیا؛

”حکمران یا بادشاہ ہی تو راجہ ہوتا ہے؛

علی کو اس کچ بھٹی پر غصہ آ گیا۔ اس نے سخت لہجے میں سوال کیا؛

”کیا نواب حیدر علی خاں بہادر سلطنتِ خدا داد کے بادشاہ یا سلطان نہیں ہیں؟“

حاجب مسکرایا؛

”ہمارے نواب بہادر کا مرتبہ تو سلطان سے بھی بڑا ہے۔“

”تو پھر آپ انہیں سلطان کیوں نہیں کہتے؟“ علی نے دوسرا سوال کیا۔

حاجب بھڑک گیا؛

”وہ..... وہ..... نواب بہادر خود کو سلطان کہلوانا پسند نہیں کرتے۔“

علی نے بڑے رعب سے کہا؛

”اسی طرح میں بھی فرماؤں یا بادشاہ کہلوانا پسند نہیں کرتا۔ براہِ کرم آپ نواب حیدر علی خاں کو

راجہ علی کے آنے کی اطلاع دیں۔“

حاجب بڑا مغرور معلوم ہوتا تھا مگر راجہ علی کا رعب کھا گیا اور اسی وقت اندر جا کر نواب بہادر کو

کنا نور کے راجہ علی کے آنے کی اطلاع دی۔ پھر حاجب کا منہ اس وقت کھلے کا کھلا رہ گیا جب نواب

بہادر نے حاجب کو حکم دیا؛

”کنا نور کے جوان عمر راجہ علی کو عزت کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کر دو۔“



اس سلسلے میں حاجب دربار اور راجہ علی میں جو گفتگو ہوئی، وہ قارئین کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگی اس لیے درج کی جا رہی ہے۔

نواب حیدر علی خاں نے حیدرنگر میں یوں تو بہت سی تعمیرات کرائی تھیں۔ کمال کے علاوہ کئی شہنائے اور دیسی مدارس تعمیر کرائے تھے۔ سرکاری دفاتر کے لیے بھی جو عمارتیں اور باغات بنوائے تھے۔

مگر وہ خود راجہ بد نور کے قلعہ ہی میں رہتے تھے۔ اپنے لیے انہوں نے کوئی آگے عمل نہیں بنوایا تھا۔

ریاست بد نور کے بارے میں پہلے کہا جا چکا ہے کہ یہ ایک بلند پیڑی پر آباد تھی اور وہاں جانے کے لیے صرف ایک تنگ راستہ تھا۔ حیدر علی خاں نے اسے بہت زنگ میں تبدیل کرتے ہی وہاں تک پہنچنے کے لیے کئی راستے بنوا دیے تھے اور اب لوگ وہاں آسانی سے آجاسکتے تھے۔

نواب حیدر علی خاں اگرچہ بادشاہ نہ تھے مگر ان سے ملاقات کے لیے ایک مختصر ماحول تیار بنایا گیا تھا۔ باہر سے آنے والے ملاقاتی اس دفتر پر رپورٹ کرتے تھے اور ان کا دفتر حاجب ہوا کرتا تھا۔

راجہ علی جب حاجب کے سامنے پیش ہوا تو حاجب نے حسبِ معمول سوال کیا؛

”تمارا نام؟“

علی نے جواب دیا؛

”راجہ علی!“

راجہ ہمارے نام کا حصہ ہے یا تم واقعی راجہ ہو؟“

”ہم مہاراجا ہے مگر ناموں کی ریاست کنا نور کا حکمران ہوں اس لیے مجھے راجہ کہنا پاتا ہے۔“

علی نے وضاحت کی۔

”اس کا مطلب ہے تم کنا نور کے فرمانروا اور بادشاہ ہو۔“ حاجب نے معلوم کیوں بات کو اس قدر طول دے رہا تھا۔

”نہیں۔ نہ میں بادشاہ ہوں نہ حکمران۔“ علی نے تردید کی؛

”کنا نور ایک ریاست ہے۔ ریاست کا مالک راجہ کہلاتا ہے۔ جب وہاں کے راجہ نے مجھے اپنا راج گدی پر بٹھایا تو میں بھی راجہ ہوا اور اب تک راجہ کہلاتا ہوں!“

راجہ کے معنی منتری، نگہبان، پاسبان اور ڈپٹی سرکھڑا ہونے والا یا داروغہ کے ہیں۔ بدلت خانہ مصر میں وزیرِ سلطنت جو تالیف کے بعد سب سے بڑا غمخوار تھا اسے بھی حاجب کہہ کر پرکارا جاتا تھا۔

راجہ علی کو حیدر علی خاں کی بیدار مغزی کا ثبوت اس وقت مل گیا جب نواب حیدر علی خاں نے
ماجب کے ساتھ بک بک جھک جھک کے بعد اس کا ام اندر بھیجا گیا اور فوراً ہی اسے اندر
طلب کر لیا گیا۔

حیدر علی خاں بجائے تخت پر بیٹھنے کے فرش پر ایک گاؤٹیا کے سہارے بیٹھے تھے۔
ہواں عکراہ علی نے دربار میں داخل ہو کر نواب بہادر کو سلام پیش کیا۔

نواب بہادر مسکرائے اور بولے:

”آؤ رہے علی ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ اگر اس سبب سے تم خود ہستے تو ہم تہیں
سرکاری لڑ پر لڑا لیتا۔“

راجہ علی چپ چاپ نظر میں نیچے کیے کھڑا تھا۔

یہ ایک بڑا مل تھا جو پرانے طرز پر آراستہ تھا۔ نواب نے اس میں کچھ زیادہ تبدیلی نہ کی تھی۔
یہ دراصل راجہ بدوڑ (حیدرنگر یا پراگ) کا دربار ہاں تھا۔ نواب نے وہاں سے دیوبندو اور
سورنہ اور نساہر بھاری نہیں، باقی سامان ویسے ہی رہنے دیا تھا۔ راجہ کا سنگھاس ایک چاندی کا
تخت تھا جس کے چاروں پایوں پر سونے کا مورچہ لگی تھیں۔ نواب نے اس تخت کو سنگھاس میں بچ کر
چاندی سونے کے سکے ڈھلوا دیے تھے۔

نواب نے تخت ہٹوا کر پورے ہاں میں پلاندی کا فرش کچھ دیا تھا اور شمال کی جانب درمیان
میں ایک قالین پر گھاؤ تکبہ کے ساتھ اس کی نشست تھی۔

نواب نے راجہ علی کو گم سم کھڑے دیکھا تو مسکرائے:

”اے راجہ علی تم اب تک کھڑے ہو۔ آخر تم کھانور کے راجہ ہو۔ رانی سلمہ تمہاری بیگم ہے۔
کیا ہوا اس وقت تمہاری راست کے حالات گم ہوئے ہیں۔ تم نے اور تمہارے باپ نے ہم سے
اینا تعلق قائم کیا ہے۔ یوں جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے تم ہمارے بھائی ہو۔ اور اگر اس
بگہ ہمارے عزیز ہو۔“

راجہ علی فوراً بولے ”اگر آگے بڑھا اور اس بگہ ہاں کے بیٹے گئے ہاں نواب حیدر علی خاں نے اشارہ
کیا تھا۔“

مگر۔

اس کی سیرانی کا یہ ماطہ تھا کہ وہ سیر کی دیر نہ میں دوتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے نواب حیدر علی خاں

حیدر علی خاں نے اگرچہ بدوڑ کا نام تبدیل کر کے حیدرنگر رکھ دیا تھا۔ حیدرنگر کو انھوں نے
دارالسلطنت خداداد میسور کا نام بھی دیا تھا۔ وہاں دفاتر اور محکمات قائم ہوئی تھی اور حیدر علی کے
نام کے سکے بھی ڈھالے جا رہے تھے۔ ایک روایت کے مطابق حیدر علی خاں حیدرنگر کے بطور
بادشاہ تخت نشین ہوئے تھے مگر انھوں نے اپنی بادشاہت کا اب تک کوئی باقاعدہ اعلان نہیں
کیا تھا۔

بدوڑ کی حالت حیدرنگر ہوتے ہی بدل گئی تھی۔ بڑے دفاتر اور محکمات کے علاوہ کتنے ہی
احکام اور شفا خانے بھی قائم کیے گئے تھے۔ حیدر علی خاں نے اپنے لیے نیائل نہیں بنوایا تھا۔ ان کا
قیام پرانے ہی محل میں تھا مگر اس محل کی صورت بھی تبدیل ہو گئی تھی۔

حیدر علی خاں نے محل کے ایک حصے میں عدالت قائم کی تھی جہاں قاضی القضاۃ بیٹھتے تھے اور
دن بھر مقدمات سنتے تھے۔ یہ عدالت شرعی قوانین کی پابندی کوئی تھی۔

کھانور کا راجہ علی دارالسلطنت حیدرنگر پہنچا تو شاہی ٹھٹھا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اسے
خیال گزرا کہ شاید حیدر علی تک اس کا رسائی مشکل ہی سے ہوگی مگر اس کے باپ نے اسے بتایا تھا
کہ حیدر علی خاں ایک بیدار مغز حکمران ہے اور وہ اپنی سلطنت کے تمام حالات سے خود بخوبی
رکھتا ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ کھانور میں ابھرنی ہوئی بغاوت کھانوں اس کے گوش گزار ہو
چکا ہو۔

طاری ہو گئی ہے۔

دراصل نواب حیدر علی خاں کو نوجوان راجہ علی کو دیکھ کر اور اس کی ذہانت، مہر کی گفتگو سن کر اچانک اپنے بیٹے شہزادہ بیجو کا خیال آ گیا تھا۔
شہزادہ اس وقت یارہ سال کا تھا مگر اس کی اچانک اور قدر پانچ فٹ سے ادینا ہو گیا تھا۔

بہدر علی خاں کو بہر علی کی آنکھوں میں وہی جوش و جذبہ دکھانے لگا جو اس نے اپنے بیٹے شہزادہ بیجو کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔
آخر نواب بہادر نے سراٹھایا۔
”راجہ علی! انہوں نے گلوگیر آواز میں کہا۔

راجہ علی، نواب بہادر کو جواب دینے کے بعد اب تک اسی طرح خاموش بیٹھا تھا۔ وہ نواب کی آواز پر چونک کر بولا:
”غلام حکم کا منتظر ہے نواب بہادر۔“
”ہم نے سنا ہے کہ پادشاہ کے افراد ماعل و سمندر سے شہنشاہی رکھتے ہیں!“ نواب نے مجتہد نظر سے علی کو دیکھا۔

”نواب بہادر کی اطلاعات درست ہیں!“

راجہ علی نے سر کو ذرا سا خم کیا:

”پادشاہ قوم کا بچہ بچہ پیدا کتنی ملاح ہوتا ہے۔ میری قوم ہندو ملاحوں کی قوم ہے مگر بھوج کے جزیروں پر ہندو راجہ کا قبضہ ہے اور وہ آٹھ دن سلاطین پر حملہ کر کے قتل و غارت کا بازار گرم کرتا رہتا ہے۔“

”ان حالات میں کس بات کی سب سے زیادہ ضرورت ہے؟“ نواب حیدر علی خاں نے جیسے چونک کر سوال کیا۔

راجہ علی نے چند لمحے سوچ کر جواب دیا:

”ضرورت ہی نہیں بلکہ برائی سخت ضرورت ہے نواب بہادر۔“

”مہر کس بات کی؟“ نواب نے اپنا سوال دہرایا۔

”نواب بہادر کے ایک سدا جی بیڑے کی۔ جو بحر عرب کے جزیروں کے راجہ کو اس کے

کا صرف نام سنا تھا، ان کے عادات و اطوار سے بالکل ناواقف تھا مگر نواب نہ صرف اس کے نام و نسب بلکہ اس کی ریاست کے استرسلالات سے بھی واقف تھے۔ یہی نہیں انہیں علی کی بیوی کا وہ نام بھی معلوم تھا جو مسلمان ہونے کے بعد اُسے دیا گیا تھا۔

راجہ علی، ہمیں انہوں سے کہ ہم پہلے تمہاری شہر نہ لے سکیں۔ دراصل ہمارے پاس سوسوں نے بہت دیر کر دی۔“

نواب نے علی کو غور سے دیکھا:

”کناور، بے کیے ہمارے فوج دستے تیار ہیں۔ ہم ایک سو دو دن بعد فوراً ہی تمہیں فوج ملے گی۔ تم مگر ہمیں تعجب تھا کہ غدارانہ طرف سے ہمیں بلا واسطہ کوئی اطلاع ہو سکتی نہیں ہو۔ کیا ہم اس کی وجہ دریافت کر سکتے ہیں؟“

”کناور میں ناٹروں کی بغاوت بخاطر ہمارا انا معاملہ ہے اور ہمیں اس میں دخل نہ دینا چاہیے تھا مگر ہمیں کناور کے معاملات سے محض اس وجہ سے دلچسپی پیدا ہوئی کہ تمہاری طرف سے ہمارا نام استعمال کیا گیا تھا اور جس مقام پر ”حیدر علی“ کا نام لیا جائے وہاں کی پوری ذمہ داری ہم اٹھا لیتے ہیں۔ مگر تم نے کیوں خاموشی اختیار کی راجہ علی؟“

”نواب بہادر حیدر علی خاں! علی نے ادب سے عرض کیا:

”یہ دراصل میری کوتاہی نہیں بلکہ شرم اور ندامت تھی کہ میں نے کناور کا راجہ ہوتے ہی آپ کی سلاطین کو کیوں حاضری نہیں دی۔ میری حجت نے گوارا نہ کیا کہ اس مشکل وقت میں آپ کے پاس قاصد بھیج کر مدد کی درخواست کروں! اس لیے خود حاضر ہندمت ہوا ہوں تاکہ کمک کی درخواست کے ساتھ ساتھ اپنی ندامت اور لاپرواہی کی معافی مانگوں۔“

نواب حیدر علی خاں بڑے غور سے راجہ علی کی باتیں سن رہے تھے۔ جب وہ خاموش ہوا تو نواب نے کہا:

”راجہ علی۔ تمہاری وضاحت ہم نے قبول ہی نہیں کی بلکہ ہمیں پسند ہی آئی۔ تمہاری باتوں سے یہ بھی ظاہر ہے کہ تم ایک ذہین جوان ہو۔“

اس کے ساتھ ہی نواب حیدر علی خاں ایک ٹھنڈی ماس لے کر کسی سوچ میں گم ہو گئے۔ جب اس عالم میں انہیں زیادہ دیر گزری تو وہاں بیٹھے والے دوسرے لوگوں کو خبر ہوئی۔ راجہ علی اپنی جگہ پریشان تھا کہ شاید اس کی کسی بات سے نواب بہادر کو صدمہ پہنچا ہے جو ان پر ناموشی

جزیروں ہی میں غرق کر کے رکھ دے۔
شاہنشاہ راجہ علیؑ: نواب بہادر بیچ اٹھے:
”تم نے ہمارے دل کی ترجمانی کی۔ تم ہمارے خواب کی تعبیر بن گئے ہو۔ ہم تمہیں

سناٹے نہیں کریں گے بلکہ تمہیں تمہارا اصل مقام دیں گے۔“
راجہ علیؑ حیران نظروں سے نواب بہادر کو دیکھ رہا تھا اور اس کا منہ سیرت کے عالم میں آکھ سے زیادہ کھلا ہوا تھا۔

نواب بہادر نے اسے حیران دیکھا تو کہا:

”تم اس قدر حیران کیوں ہو رہے ہو راجہ علیؑ کیا تمہیں ہمارے کہنے کا یقین نہیں؟“
”نہیں نہیں نواب بہادر۔ میں اس بات کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا۔ راجہ علیؑ نے خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا:

”میں تو یہ سوچ کے حیران ہو رہا ہوں کہ کیا میں واقعی اس قابل ہوں کہ والی میسور نواب حیدر علیؑ ناں مجھ پر اس قدر نوازش فرمائیں۔ میں تو آپ کا ایک سیر خادم ہوں نواب بہادر۔“

نواب بہادر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا:

”اب تم غور سے سنو کہ ہم تمہیں کیا جانا چاہتے ہیں۔“

”میں گوش برآواز ہوں اسے والی میسور۔“

راجہ علیؑ اظہارِ اطاعت میں ذرا اور نرم ہو گیا:

”مگر میری نواب بہادر سے ایک درخواست ہے۔“

”کوہے خوف ہو کے کہو۔ ہم تمہارے تمام شکوک و شبہات دور کر دینا چاہتے ہیں۔“ نواب

نے اسے جو سہل دیا۔

”اے والی میسور۔“ راجہ علیؑ نے رک رک کے کہنا شروع کیا:

”میں اپنے جو سہلے اور برائے پر غر کر سکتا ہوں مگر یہ ضرور چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اسی بگہ

لگانے کی کوشش کریں جس کی ذمہ داریاں میں پوری طرح ادا کر سکوں۔“

”تمہاری درخواست نامنظور کی جاتی ہے راجہ علیؑ۔“

نواب بہادر کا پرہ شکن آور ہو گیا:

”تم نے اپنی بزدلی کا اظہار کر کے ہماری طبیعت کھد کر دی ہے۔ دوسرے مذہبوں کی تخریب

ہمیشہ پہاڑ کی باندیوں پر رستی ہیں۔ شجاع وہ ہوتا ہے جو خطروں کو دعوت دیتا ہے اور موت کو سامنے دیکھ کر قہقہے لگاتا ہے۔“

”بکافریا نواب بہادر نے۔“

راجہ علیؑ کی آنکھوں میں مذمت کے آنسو چھلک آئے:

”میں اپنے خیالات اور الفاظ پر شرمندہ ہوں۔“

”تمہاری شرمندگی سے ہم خوش ہوئے۔“ نواب بہادر نے کہا:

”خوش ہو جاؤ کہ ہم تمہیں سلطنت میسور کے بحری بیڑے کا امیر البحر بناتے ہیں۔“

”بحری نواب بہادر۔“ راجہ علیؑ بدحواس ہو گیا۔

”مہوشی میں آؤ راجہ علیؑ۔ تم ہمارے سامنے ہو۔ خود کو سنبھلاؤ اور ہماری نوازشات کو اپنے مضبوط دامن میں سمیٹ لو۔“

نواب بہادر نے متانت سے کہا:

”ہم اپنے الفاظ واپس نہیں لیا کرتے۔ تم ریاست میسور کے امیر البحر ہو۔ جاؤ اور ایک مضبوط بحری بیڑا تیار کرو۔ جنگی جہازوں اور کشتیوں کے لیے جس قدر رقم کی ضرورت ہو حیدر نگر کے خزانے سے حاصل کر سکتے ہو لیکن خیال رہے کہ بحری بیڑا ایک ماہ میں تیار ہو جانا چاہیے تاکہ اگلے ماہ تم اپنے ادھر مل کر نئے دلوں پر خود حملہ آور ہو کر ان کی کشتیاں دبو دیا جلاؤ۔“

پھر۔

نواب حیدر علیؑ خاں نے خزانچی کو بلا کر حکم دیا کہ راجہ علیؑ کو جب اور مثنیٰ رقم کی ضرورت ہو اسے بغیر کسی حساب کے فوراً مہیا کی جائے۔

راجہ علیؑ کے پاس اب کہنے سننے کو کیا رہ گیا تھا۔ اس نے نواب بہادر کو رخصتی سلام کیا:

”سلام،“ نواب بہادر کے احکامات کی پوری پوری تعمیل کرے گا۔ اب خادمِ اجازت کا طلب گار ہے۔“

”تم جاسکتے ہو راجہ علیؑ۔“ نواب بہادر حیدر علیؑ خاں نے راجہ علیؑ کو واپس جانے کی اجازت دیتے ہوئے کہا:

”ہمیں توقع ہے کہ تم اپنے عقیدے میں کامیاب ہو گے۔“

راجہ علیؑ تعظیم پیش کر کے دربار سے نکلنے لگا کہ اچانک اسے کچھ خیال آیا اور اسے

واپس آکر لڑنا کیا۔

نواب بہادر میں اپنے اعزازات اور آپ کی کرم نوازیوں کی خوشی میں بالکل بھول گیا کہ اس دربار میں نہیں اپنی ریاست کناؤر کے لیے فوجی ملک کی درخواست کرنے آیا تھا۔ اور کے لیے بھی احکامات جاری فرمائے بائیں۔

تم ملک مانگنا بھول گئے راجہ علی مگر ہم نہیں بولے۔

نواب بہادر نے جواب دیا:

ہم نے اپنے صاحب کو حکم دے دیا ہے کہ راجہ علی کے امیر البحر سلطنت میسور بنائے جانے کا اعلان پورے سلطنت میں اعلیٰ چوٹی اور ڈھنڈور چوٹی کے ذریعے فوری طور پر کر دیا جائے۔ تمہاری ریاست میں یہ اعلان تمہارے دل پہنچنے سے پہلے ہو چکا ہوگا۔

اس کے علاوہ ہمارے محافظ دستوں میں سے ایک سوموار تمہارے ساتھ جا رہے ہیں جو کناؤر میں ہمارے نمائندے بن گئے۔

یہ سوموار چار ہزار ناموں کے لیے کافی ہوں گے۔ اگر ضرورت محسوس ہو تو ہم مزید لشکروں بھیج دیں گے۔

راجہ علی کناؤر سے چلا تھا تو اس کے اٹھنا ہی تھے اور واپس ہوا تو "امیر البحر سلطنت میسور" کا فرمان اس کے پاس تھا اور شاہی دستے کے سوموار اس کے ہمراہ تھے۔

راجہ علی کا کناؤر میں بڑا شاندار استقبال کیا گیا۔ کناؤروں کے بڑے بڑے راجہ علی کی قد موسیٰ کے لیے حاضر تھے۔ وہ جس علاقے سے بھی گزرا اسے بتایا گیا کہ شاہی اعلیٰ چوٹی اس کے امیر البحر بنائے جانے کا اعلان کر چکے ہیں۔

کناؤر میں راجہ علی کے پہنچنے سے دو دن پیشتر ہی اس کے بحیثیت امیر البحر سلطنت میسور کے تقرر کا اعلان ہو چکا تھا۔

اس اعلان کا باغی ناموں پر ایسا اثر پڑا کہ وہ بیگی بی بی گئے اور اپنے اپنے ٹھکانوں سے نکل کے راجہ علی کے استقبال کو کناؤر آئے۔

راجہ علی کے تمام ہی خواہوں کو اس کے امیر البحر ہونے کی بہت خوشی ہوئی۔ اس کی رانی سلمہ اور

ریاست کے سینا پتی کی خوشی کی تو کوئی حد ہی نہ تھی۔

ریاست کے سینا پتی نے بڑی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے راجہ علی کی عدم موجودگی میں نائروں کو سختی سے دباؤ رکھا تھا۔ بایں نے اس کو اپنے ساتھ لگانے کی بہت کوشش کی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

راجہ علی کی آمد کے چوتھے دن اس کے والد اور دیگر عزیز و اقارب اس کے گاؤں سے اسے مبارک باد دینے پہنچ گئے۔ راجہ علی ان لوگوں سے بڑی خوش دلی سے ملا اور مستحق عزتوں کے ساتھ دایے اور مے اسٹھ حسن سلوک بھی کیا لیکن وہ انہیں زیادہ وقت نہ دے سکا۔ اسی کا لمحہ بے حد قیمتی تھا۔ نواب بہادر سید علی خاں نے ایک ماہ کے اندر اسے بڑی بیڑا تیار کرنے کا حکم دیا تھا۔ وہ اس سلسلے میں دن رات لگا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی محبوب بیوی سلمہ کے ساتھ بھی سکون سے بیٹھ کے بات نہ کر رہا تھا۔

سلمہ ایک بھجدار اور ذمے دار عورت تھی۔ اسے راجہ علی کے نئے بندے اور اس کی ذمہ داریوں کا پورا احساس تھا۔ وہ کوشش کرتی تھی کہ راجہ علی کو اپنے ارادوں کی تکمیل اور ذمے داریوں سے مددہ برا ہونے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت ملے۔ اسی لیے مہاندروں کو اس نے سنبھال رکھا تھا اور انہیں راجہ علی کا وقت ضائع نہ کرنے دیتی تھی۔

راجہ علی کے ساتھ ریاست کناؤر کا سینا پتی بھون رات کام کر رہا تھا۔ راجہ علی نے اسے اپنا نائب مقرر کر لیا تھا۔

راجہ علی اور سینا پتی کی کوششوں سے ایک ہفتے کے اندر اندر چھوٹی بڑی کشتیوں کی تیاری کے لیے اعلیٰ اقسام کی لکڑی کا انتظام ہو گیا تھا اور کافی نقد ادین لکڑی اور دیگر ضروری سامان ماحول مند پر پہنچا دیا گیا۔

رقم کی کمی نہ کام کرنے والوں کی۔ دسویں دن کشتیاں بنا شروع ہو گئیں۔ راجہ علی نے سودو کارگیروں سے کام شروع نہیں کرایا بلکہ اس نے کناؤر کے ارد گرد سومیں تک جتنے بھی کاریگر مل سکے سب منگوا لیے اور بڑی تیز رفتاری سے کام شروع ہو گیا۔

کشتی سازی اور پھرنے جہاز بنانے کا کام ایک ساتھ ہی شروع کیا گیا۔ کام رات دن ہوتا تھا آٹھ گھنٹوں کی تین شفٹیں لگتی تھیں۔

راجہ علی اور سینا پتی نے اپنے خیمے ماحول پر لگو لیے تھے اور وہ ہر وقت کاریگروں اور مزدوروں

کے ساتھ رہتے تھے۔

ان کا ریکارڈ میں اکثریت مسلمان پائلاؤں کی تھی۔ پھر جب انہیں بتایا گیا کہ یہ مسلمان بیڑا ان لوگوں کی سرکوبی کے لیے بنایا جا رہا ہے بن کا قبضہ بحیرہ عرب پر ہے اور جو روز سالوں پر حملے کرتے رہتے ہیں تو کارگیروں نے مزید دل لگا کر کام کرنا شروع کر دیا۔

دوسری طرف بحری فوجی حملہ بھرتی کیا گیا۔ ان کی تربیت کے لیے فرانسیسی اور پرتگیزی بحریہ کا رطلہ ملازم رکھا گیا۔

پائلہ پیدا ہوتی ملحق ہوتے تھے۔ انہیں تربیت ملی تو ان کے جوہر کھلے۔ بحری فوج اور کشتی سازی کا کام ایک ساتھ ہو رہا تھا۔

آخر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ پہلے ماہ کے اختتام پر تقریباً دو سو جنگی کشتیاں پورے جنگی اسلحہ اور بحری فوجیوں سے لیس، سمندر میں اتاری گئیں۔

اس دن ایک مختصر سا جشن منایا گیا جس میں نواب بہادر حیدر علی خاں کو مدعو کیا گیا۔ نواب بہادر خود تو اس جشن میں شریک نہ ہو سکے البتہ ان کی نیابت ایک نائب نے کی۔

بظاہر یہ ایک عام سا جشن تھا مگر مالا بار کے ناظر یہ سمجھ رہے تھے کہ حیدر علی شکر بارخ نشکی سے سمندر کی طرف ہو رہے۔ یہ سمندر بحیرہ عرب تھا جو آج بھی پاکستان کا سمندر ہے۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۰۷ء میں بڑا بڑا بحریہ عرب پر مسلمان تاجروں کا قبضہ تھا۔ پھر بحری قزاقوں نے سندھ کے راجہ داہر کی شہرہ پاکر مسلمانوں کے سامان سے بھرے ہوئے جہازوں (بڑی کشتیوں) پر قبضہ کر لیا۔ ان کشتیوں پر مسلمان مرد، خواتین، بچے اور بوڑھے مٹی سوار تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جب ملاوٹ اور ان کے اہل و عیال کو گرفتار کر کے اندرون سندھ پہنچایا گیا اور ایک مسلم خاتون پر کچھ زیادہ جی ظلم و ستم توڑے گئے تو اس مجبور خاتون نے بے ساختہ نعرہ بلند کیا،

”حاج بن یوسف المدد“

مشہور ہے کہ مجبوروں، یتیموں اور مظلوموں کی آہیں آسمانوں کا سینہ چاک کرتی ہوئی عرش الہی سے جا ملے لاتی ہیں۔ جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے:

بترس از آدم مظلومان کہ ہنگام دہا کو دن

بانت از در حق بہر استنبال می آید

ترجمہ:

اے لوگو! مظلوموں کی آہوں سے خوف کھاؤ۔ اس لیے کہ جب مظلوم ادب

کرنے کا ہے تو عرش کے دروازے کھل جاتے ہیں اور مظلوم کی دعا کا

قبولیت آگے بڑھ کر استقبال کرتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مظلوم کی دعا فوراً قبول ہو جاتی ہے۔

پس اس خاتون کے ”المدد“ کے نعرے سے عرش و فرس تھرا اٹھے۔ اس وقت بنی امیہ کا خلیفہ ولید بن عبدالملک تھا اور حجاج بن یوسف خراسان کا گورنر تھا۔ سندھ کا علاقہ اس کے علاقہ سے متصل تھا۔ چنانچہ جب

”المدد یا حجاج بن یوسف“

کی صدا حجاج کے کانوں تک پہنچی تو وہ تلوار بلند کر کے کھڑا ہو گیا اور سپر اپر دھنک برہنہ پابھگت چل گیا۔

درباریوں نے بڑی مشکل سے اسے سنبھالا اور جوش کو ٹھنڈا کیا۔ پھر حجاج، جس کا تعلق عرب قبیلہ ثقیف سے تھا، نے اس وقت سندھ پر فوج کشی کا حکم دیا اور اتنا مہمت کے لیے ایک سفیر راہ کے دربار میں بھیجا۔

سفیر نے راجہ داہر سے بحری قزاقوں کی گرفتاری اور بے گناہ مسلمانوں کی قید سے رہائی کا مطالبہ کیا۔

مغرور راجہ داہر نے ہلٹے کوئی معقول جواب دینے کے صاف جواب دے دیا: ”تجارتی سامان کی کشتیوں اور مسلمان خواتین اور مردوں کو بحری قزاقوں نے لوٹا اور قید کیا ہے ہمارا بحری قزاقوں پر کوئی اختیار نہیں۔ اس معاملہ میں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔“

یہ متکبرانہ جواب سن کر حجاج بن یوسف کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ جنگی تیاریاں تو مکمل ہو ہی چکی تھیں۔ حجاج نے اپنے بیٹے اور داماد محمد بن قاسم، جو ابھی ایک نوجوان تھا، کو سردار لشکر بنا کر حشکی اور سمندر دونوں طرف سے سندھ پر حملہ کا حکم دیا۔

ایک تاریخی حوالہ کے مطابق بڑی اور بری افواج دہل کے مقام پر آئیں۔ پھر سندھ پر ایسا زبردست حملہ ہوا کہ ملتان تک اس نوجوان سپہ سالار کو کوئی نہ روک سکا۔

مسلمانوں کا بھارت میں یہ پہلا قدم تھا۔ اسی وجہ سے کراچی (سندھ) کو ”باب الاسلام“

۱۔ تیسرے خلیفہ جناب عثمان غنی کی مدتِ خلافت ۲۳ھ سے ۳۵ھ تک بیان کی گئی جو ۱۲ سال ہوتی ہے۔

۴۔ چوتھے خلیفہ سیدنا علی مرتضیٰ ۳۵ھ میں برسرِ خلافت آئے۔ خلافتِ راشدہ کی مدت ایک اندازے کے مطابق ۲۵ سال ہوتی ہے۔ یوں جناب علی کی مدتِ خلافت تقریباً ۶ سال ہے۔

خلافتِ راشدہ کے بعد خلافت بنو امیہ اور پھر خلافت عباسیہ قائم ہوئی۔ یہ دونوں خلافتیں اہل سنت کی تھیں۔

اسی دوران مصر اور افریقہ میں اہل تشیع ایک زبردست خلافت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے جسے ناظمی خلافت کہا جاتا ہے۔

خلافت بنو امیہ اگرچہ مدتِ خلافت میں سو بائیس سے کم رہی مگر بنو امیہ نے اسلامی سلطنت کو اس قدر وسعت دی جس کی تقریباً سو گنتی حصہ بنو امیہ کے خلیفہ ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں یہ خلافت پامال گردن پر تھی۔

تشریح یہ کہ یہ دہائی ولید بن عبدالملک سے جس کے عہد میں عراق اور خراسان کا گورنر حجاج بن یوسف تھا۔

حجاج بن یوسف کی طبیعت عجیب طرزِ شائستگی۔ ایک طرف تو اسے تاریخِ اسلام کے قائم ترین اشخاص میں شمار کیا جاتا ہے جس نے کئی ہزار عوامی بڑی بڑی جتید بستنیوں کو بے دریغ تہ تیغ کر دیا اور دوسری طرف اس عظیم جہل اور گورنر نے چار ایسے سپہ سالار مقرر کیے جو تاریخ کے عظیم ترین مشاہیر میں شمار ہوتے ہیں۔

تاریخ کے یہ عظیم سپہ سالار اور بے نظیر فاتح مندرجہ ذیل تھے:

۱۔ محمد بن قاسم:
اس جوان عمر سزل نے برصغیر پر حملہ کیا اور سندھ کی فتح کے بعد ملتان تک پہنچ گیا۔

۲۔ موسیٰ بن نصیر:
اس جہل نے شمالی افریقہ میں فتوحات کا سلسلہ شروع کیا اور اسلام کی مدین شمالی افریقہ کے مغربی کنارے تک پہنچ گئیں۔

کہا جاتا ہے۔
تعب ہے کہ بعض لوگ آج بھی "جوش قومیت اور ثقافت" میں راجہ واہر کو جس نے مسلمانوں پر ظلم کیا، ان کا راستہ رد کا دہرایا گیا، قومی ہیرو کا درجہ دیتے ہیں۔

یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ موہن جو دڑو اور ہڑپہ وغیرہ پاکستان کے قدیم علاقائی محسوسات کی ثقافت کے آئینہ دار ہیں مگر ان تہذیبوں کو پاکستانی ثقافت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

یہاں حجاج بن یوسف ثقفی کا ذکر آگیا تو اس کی تھوڑی سی تفصیل بیان کر دی جائے۔ اگرچہ حجاج کا اس ناول اور واقعات سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں لیکن اس کی شخصیت تاریخِ عالم میں متنازعہ ہے اس لیے قارئین اس کی تھوڑی سی تفصیل دلچسپی سے ملاحظہ فرمائیں گے۔

تاریخِ اسلام سے دلچسپی رکھنے والے جانتے ہیں کہ خلافتِ راشدہ کے بعد اسلامی مملکت کی تین اور خلافتیں اپنی وسعت، طاقت اور شان و شوکت کی وجہ سے بہت مشہور ہوئیں۔
خلافتِ راشدہ میں چار خلفائے شامل تھے:

۱۔ سیدنا ابوبکر صدیقؓ

۲۔ سیدنا عمر فاروقؓ

۳۔ سیدنا عثمان غنیؓ

۴۔ سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ

ان میں پہلے دو خلیفہ جناب سیدنا ابوبکر صدیقؓ اور سیدنا عمر فاروقؓ، شیخین کہلاتے ہیں۔ ان دونوں کا تعلق قبائلِ قریش سے تھا۔ تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنیؓ قریش میں سے نہیں تھے بلکہ ان کا تعلق بنو امیہ سے تھا۔

حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد سیدنا علی مرتضیٰ خلیفہ ہوئے مگر شام کے اموی امیر معاویہ بن ابوسفیانؓ نے جناب علی مرتضیٰ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور "جنگِ صفین" ہوئی جس میں دونوں طرف سے ہزاروں مسلمان کام آئے۔

پھر جناب علی مرتضیٰ کی شہادت کے بعد خلافت خاندان بنو امیہ یعنی شام کے امیر معاویہؓ کو منتقل ہو گئی اور یہ اموی خلافت کہلائی۔

۱۔ خلیفہ اول جناب سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی مدتِ خلافت ۲ سال ۳ ماہ ۱۰ دن ہے۔

۲۔ خلیفہ دوم سیدنا عمر فاروقؓ نے ۱۰ سال ۶ ماہ ۴ دن خلافت کی۔

۲۔ طارق بن زیاد:

حجاج بن یوسف کے اس سالار نے بحرہ دم کو عبور کیا اور کشتیاں جلا کر سپاہ
(اندلس اسپین) میں فاشانہ داخل ہوا اور دہاں مسلمانوں کی اتنی زبردست سلطنت قائم کی
ہو سدیوں تک باذری
۳۔ قتیبہ بن مسلم:

اس جنرل نے اپنی فتوحات سے اسلامی سلطنت کی سرحدیں چین تک وسیع کر دیں۔
تاریخیں کرام مجھے معاف فرمائیں گے کہ میں ہمہ معترضہ میں تاریخ اسلام کا پورا باب جستہ جستہ
بیان کر گیا۔ بات صرف اتنی تھی کہ ہندوستان کے جنوب مغربی علاقہ مالابار میں آغاز اسلام ہی سے مسلمان
باہر آ کر آباد ہوا۔ ہندوؤں کو گھسنے تھے۔ ان مسلمانوں کو پائندہ کہا جاتا تھا۔
بحرہ دم کے بہت سے براہ ہندوؤں اور درہن شیر قوموں کے قبضے میں تھے اور مسلمان صرف
ساحل ہند تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔

بحری بیڑے کی تیاری اور فوجی بھرتی کے سلسلے میں راہر علی ساحل سمندر پر موجود تھا۔ اسے ایک
دن بحر ایسا نہ ملا تھا کہ وہ دد گڑھی کے لیے کناور جا کر اپنی پیاری بیوی سے بات کرتا۔ اس نے جان
لو تو جو کہ ایسا نہیں کیا تھا بلکہ اس کی بڑھی ہوئی مسرت دنیا، اس کے راستے میں حائل تھیں۔
کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ وہ اپنی بیوی سے غفلت اور بے اعتنائی کرتا رہا ہے مگر پھر اپنے
دل کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیتا کہ سلمہ تعلیم یافتہ (ردائی خاندانی تعلیم سے بہرہ ور) اور بھدار خاتون ہے
وہ حالات کو ضرور سمجھتی ہوگی۔

بحری بیڑے کی تیاری کے بعد ایک شب وہ ساحل سمندر پر لگے اپنے خیمے میں قدرے سکون
سے بیٹھا تھا۔ ملا بار ساحل کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی فوجی سرکیں اس نے تعمیر کرادی تھیں اور بحری
سپاہیوں اور ملاہوں کو سکون دیا تھا کہ وہ اپنے اہل ناندان کے ساتھ وہاں منتقل ہو جائیں مگر وہ خود اب
تک خیمہ ہی میں رہتا تھا۔

صبح شام ہی سے اس کا دل گھبرا رہا تھا اور ایک نامعلوم سی الجھن اسے بے چین کیے ہوئے تھی
اس کی سچ میں نہ آتا تھا کہ ایسا کیوں ہے؟

اسی گھڑی ایک محافظ نے خیمہ میں داخل ہو کر عرض کیا:

امیر البحر راجہ بہادر۔ راج محل سے ایک تیز رفتار قاصد آیا ہے اور راجہ بہادر سے فوراً ملنا
چاہتا ہے۔

رانی سلمہ! بے ساختہ اس کے منہ سے لگی گئی۔

محافظ کی موجودگی سے ایک لمحہ کے لیے وہ جھل سا ہو گیا۔ پھر فوراً ہی سنبھل کر بولا:
اسے فوراً اندر بھیجو۔

محافظ باہر گیا اور فوراً ہی قاصد کو ساتھ لے اندر آ گیا۔ امیر البحر راجہ علی نے محافظ کو باہر جانے
کا اشارہ کیا۔

جب محافظ باہر چلا گیا تو راجہ علی نے بے چینی سے دریافت کیا:
"رانی نہرت سے تو ہیں؟"

اس کی پریشانی الفاظ کے الجھاؤ سے ظاہر ہو رہی تھی۔

نہارتانی بالکل کھل (بیریت) میں امیر البحر راجہ بہادر۔ قاصد نے پڑ سکوں بجے میں جواب دیا۔
راجہ علی نے اطمینان کا سانس لیا:
"پھر کیا خبر لائے ہو تم؟"

تیسرے پاس نہارتانی تو کوئی خبر نہیں ہے راجہ بہادر۔ قاصد نے کہا:

"ہاں نہارتانی نے ایک بند لفظ آپ کے لیے بھیجا ہے اور مجھے تاکید کی تھی کہ آپ جہاں بھی ہوں،
آپ کو یہ لفظ فی الفور دہاں پہنچا دوں۔"

یہ کہتے ہوئے قاصد نے لفظ راجہ علی کی طرف بڑھا دیا۔

راجہ علی نے لفظ لے کر بے تابی سے کھولا مگر اس میں جھٹ کے بجائے ایک پھوٹا سا رد مال تھا۔
اس نے احتیاط کے طور پر لفظ کو جھاڑ کر دیکھا مگر اس میں کوئی اور چیز موجود نہیں تھی۔
راجہ علی نے سر اٹھا کر قاصد کو دیکھا۔

قاصد نظریں جمائے بڑے غور سے راجہ کو دیکھ رہا تھا۔ راجہ نے اسے باہر جانے کا اشارہ کیا
وہ باہر گیا تو راجہ نے رد مال کو الٹ پلٹ کے دیکھا۔
رد مال ختم تھا۔

معاذ پورا راسخہ اس کی ذہن میں آ گیا۔ رانی سلمہ نے اسے خط کے بجائے اُسٹروں سے بھیجا ہوا

رد مال بیجا تھا۔

راجہ علی کے دل پر چوٹ لگی۔ اس کی آنکھیں بھی نمناک ہو گئیں۔

وہ ٹھنڈی سانس لے کر کھڑا ہو گیا اور دربان کو بلا کر گھوڑا تیار کرنے کا حکم دیا۔ دربان جانے لگا تو اس نے اسے روک کے کہا:

"قاصد سے کہو کہ ہم اس کے ساتھ کنا نور چل رہے ہیں۔"

گھوڑا تیار کر کے خیمہ پر پہنچا یا گیا۔ راجہ علی جن کپڑوں میں تھا اپنی میں سوار ہوا:

"ہم صرف ایک دن کے لیے کنا نور جا رہے ہیں۔"

راجہ علی نے رگائیں کھینچ کر ڈھیلی چھوڑ دیں اور گھوڑا کنا نور کی طرف اڑنے لگا۔ رانی سلمہ کا قاصد اس کے عقب میں آ رہا تھا۔

رانی سلمہ خیالوں میں گم اداس بیٹھی تھی کہ راج علی کی کینز نے دوڑ کر اسے اطلاع دی:

"راجہ بہادر تشریف لا رہے ہیں۔"

رانی کا کلا یا ہوا چہرہ گلاب کی طرح کھل گیا اور وہ بے تابانہ محل کے صدر دروازے کی طرف دوڑ پڑی۔

راجہ علی منہ سے بھاگ اڑاتے گھوڑے سے اتر رہا تھا۔ رانی سلمہ کا دل چاہا کہ وہ باہر نکل کے اپنے محبوب سے مل جاتے مگر بلہارا کی رباست نے راجہ کو گیر لیا تھا۔

راجہ علی ابابیل ریاست سے جلدی جلدی فارغ ہو کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندر کی طرف چلا۔ زینخانے کے دروازے پر پہنچے کینزوں اور غلاموں نے اس کا استقبال کیا۔ پھر وہ کینزوں کے جلو میں اندر داخل ہوا۔

رانی سلمہ دروازے کے پٹ سے لپٹی کھڑی تھی۔ کینزوں نے رانی کو دیکھ کر سچے بٹ گئیں۔

راجہ علی اندر داخل ہوا اور رانی سلمہ اٹھ کھڑی ہو کر اس کی منبوسا پاؤں میں جھولی گئی۔

"سلمہ! میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔" راجہ علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"سرتاج! میں آپ کی مجبوریوں کو سمجھتی ہوں مگر کیا کرتی؟" رانی نے گلو گیر آواز میں جواب دیا:

"دل تو دل ہے یہ کسی طور مانتا ہی نہیں تھا۔"

راجہ علی خوش ہو گیا۔

"اس کا مطلب ہے تم نے مجھے معاف کر دیا؟"

"آپ سے مجھے شکوہ تھا۔" رانی اس سے الگ ہوتے ہوئے بولی:

"مگر آپ کے اس قدر ملہ آنے سے سارے گلے شکوے ختم ہو گئے ہیں۔"

"میں تو اڑ کر تمہارے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔" راجہ بولا:

"بھلا تمہارے آنسوؤں سے بھیگا ہوا رد مال میں کیسے دیر کر سکتا تھا؟"

"پیارے علی!"

رانی سلمہ نے پیار میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا:

"مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تمہارے نئے اعزاز نے تمہیں مجھ سے بچھین لیا ہے۔"

"ایسا کبھی نہ سوچنا رانی سلمہ!"

راجہ علی بھی جذباتی ہو گیا:

"میں علی سے راجہ علی ہوا تو تمہارے طفیل۔ اور اب امیر البحر ہوں تو یہ بھی تمہاری قسمت سے ہے۔ اتنا بڑا اعزاز تو میرے دم دگان میں بھی نہ تھا۔"

اُسے حیدرنگر کی کوئی بات نہ آئی۔

سلمہ نے بات ٹھان چاہی:

"جب سے تم امیر البحر ہوئے ہو مجھ سے تو بات ہی نہیں ہوئی۔ آخر نواب بہادر نے تم میں کیا خوبی دیکھی جو حیدرنگر جلتے ہی تمہیں امیر البحر بنا دیا؟"

"کہنا نہیں نے۔ یہ سب تمہارے ستاروں کا فیض ہے۔"

راجہ علی ہنس کے بولا:

"یگانہ تھا فوجی کمک مانگے اور نواب بہادر نے مجھے امیر البحر بنا دیا۔ میں جب بھی سوچتا ہوں تو تعجب سا ہوتا ہے۔ مجھے خود نہیں معلوم کہ نواب بہادر نے کیا سوچ کے مجھے اتنا بڑا اعزاز دے دیا؟"

"پیارے علی! میرے تم سے پوچھ رہی ہوں کہ میں یہ عمدہ کیوں اور کیسے ملا۔ حالانکہ میں اور صرف میں شاید اس کا جواب جانتی ہوں۔"

رانی سلمہ صبر سے مکرادی:

سمجھدار جنرل نے یہ بات ضرور سوچی ہوگی کہ ان کے پاس بھی بحری طاقت ہونی چاہیے تاکہ وقت پر آنے پر وہ اسے کام میں لاسکیں۔

راجہ علی منہ کوڑے رانی سلمہ کا منہ تک رہا تھا۔

وہ خاموش ہوئی تو راجہ علی نے لہجہ ہنس لے کے کہا:

آب کی دفعہ میں جب نواب بہادر کو انیس مشورہ ددں لگا کہ سلطنت میسور کا امیر البحر میری بجائے میری رانی سلمہ کو ناروا باجائے۔

یہ کہہ کے وہ خاموش ہوا اور مسکرا کے رانی سلمہ کو دیکھنے لگا۔ سلمہ نے اس کی نگاہ سے کچھ نہ بولی۔

اس راجہ علی نے خود ہی کہا:

’رانی سلمہ! تم نے یہ نہیں پوچھا کہ میں نواب بہادر کو کیا مشورہ کیوں ددں لگا؟‘
رانی سلمہ ہنس پڑی۔

’علی! میں جانچتی ہوں کہ تم نے ایسا کیوں کہا لیکن میں خود بتانے سے پہلے تم سے ہی پوچھوں گی کہ تم نواب بہادر کو یہ مشورہ کیوں دینا چاہتے ہو؟‘
’اچھا۔ میں بتاؤں۔‘ راجہ علی نے کہا:

’اس کی وجہ یہ ہے کہ تم اپنی ریاست کے علاوہ مالا باری کی دوسری تمام ریاستوں اور خاص کر نواب بہادر کی ریاست میسور کے بارے میں اس قدر معلومات رکھتی ہو کہ خود نواب بہادر کو بھی اس قدر معلومات حاصل نہ ہوں گی۔‘

اس صورت میں اگر میری جگہ غنیمت امیر البحر مقرر کر دیا جائے تو نواب بہادر کو ایک بہتر افسر مل جائے گا۔‘

’تمہارا خیال صحیح ہے لیکن اس میں میری ذہانت اور عقل مندی کا زیادہ دخل نہیں ہے۔‘ رانی سلمہ نے ہنسی سے لہجہ میں کہا۔

’نیرے پتلایا جئے بہت چاہتے تھے مگر یہ غم انہیں ہر وقت ستاتا رہتا تھا کہ ان کے بعد ان کی ریاست کا فوراً اور پیاری را جھاری کا کیا بنے گا۔‘ میرا ایک دن انہوں نے مجھے سمجھایا کہ ان کے کوئی بیٹا نہیں ہے اس لیے ان کے بعد مجھے راجہ گدی پر بٹھایا جائے گا اس لیے مجھے ریاست کے کام کاج میں بھرپور حصہ لینا چاہیے۔

’جس وقت وصول تاشہ پر ہمارے امیر البحر ملے جانے کا اعلان ہو رہا تھا۔ میں اسی سمجھ گئی تھی کہ نواب بہادر نے تمہارا انتخاب کیوں کیا ہے۔‘

راجہ علی نے حیران نظروں سے رانی کو دیکھی:

’بیاری رانی۔ اگر تم جانتی ہو تو پھر تم نے مجھ سے کیوں پوچھا؟‘

’پوچھا اس لیے تھا کہ شاید اس کی کوئی دوسری وجہ ہو۔‘ رانی سلمہ نے راجہ علی۔
جواب میں کہا:

’مگر جب تم نے بتایا کہ تم خود بھی اس بات کو نہیں سمجھ سکتے تو مجھے یقین ہو گیا کہ میرا خیال درست ہے۔‘

’اب مجھے زیادہ نہ سناؤ میری عظمت رانی!‘

راجہ علی کھسک کر راجہ علی کے کچھ اور ترپ ہو گیا:

’تمہاری ذہانت کا تو میں پہلے ہی سے قائل تھا اب اگر تمہاری اندازہ بھی درست ہوتا تو تمہاری شاگردی کو لوں گا۔ ہاں تو کیا وجہ ہو سکتی ہے میرے امیر البحر بنائے جانے کی؟‘ راجہ علی نے اشتیاق سے پوچھا۔

’میرا اندازہ ہے اور یہ اندازہ درست بھی ہے کہ نواب بہادر ایک زبردست بحری بیڑا تیار کرنا چاہتے تھے۔‘

راجہ علی نے اس کی بات سچ ہی میں کاٹ دیا:

’پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے یہ اندازہ کیسے لگا یا؟‘

’پیارے علی! اگر تم ذرا سا بھی دماغ پر زور دیتے تو تم کو بھی اندازہ ہو جاتا۔‘
رانی سلمہ سنبیدہ ہو گئی:

’تم دیکھتے نہیں کہ نواب بہادر کے ارد گرد جو طاقتیں ہیں ان سب کے پاس بحری طاقت ہے فرانسیسیوں کے پاس بحری فوج ہے۔ پرنگالیوں نے جزیروں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ایک قوم انگریز بھی ہے جو صامت سمندر پار سے بھارت آئی ہے اور فرانسیسیوں اور انگریزوں میں کئی بار بحری لڑائیاں ہو چکی ہیں۔‘

اس طرح نواب بہادر کو جو طاقتیں آنکھیں دکھا رہی ہیں ان سب کے پاس سمندری فوج موجود ہے۔ نواب بہادر نے کشیتوں ہی کی مدد سے پر تگیز یوں کے جزیرے پر چڑھائی کی تھی۔ ان جیسے

میری سمجھ میں ان کی باتیں نہ آتی تھیں مگر میں ان کی ہاں میں ہاں ضرور ملاتی تھی۔ اس دوران انہوں نے مجھے مالابار، کالی کٹ، میسور وغیرہ کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتایا تھا۔ انہوں نے نواب حیدر علی خاں کے بارے میں فاش الفاظ میں کہا تھا کہ میسور کا یہ جہز ایک دن پورے جنوبی بھارت کا بادشاہ ہو گا اور اس کی بری اور بحری طاقت کا کوئی بھی مقابلہ نہ کر سکے گا۔

پتاجی کی باتوں سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ نواب بہادر نے امیر البحر کے طور پر ہمارا انتخاب کر کے بڑی عظمت کی کاپتوت دیا ہے۔ کیونکہ پالاؤں کے خاندان کے ایک بہادر فرد ہو۔ سمندروں سے آنکھ مچول کیلنا ہمارے خاندان کا پیشہ بھی ہے اور مشغلہ بھی۔

کمال ہے رانی سلمہ۔

راجہ علی نے سانس کیپنچ کے کہا:

تاہم میں نے بھی بہت سنی ہیں مگر اصل ذہانت تو اس سے صحیح نتیجہ نکالنا ہوتا ہے اور تمہیں اس میں کمال حاصل ہے۔

"ایک بات میں تمہیں اور بناؤں میرے راجہ۔"

رانی سلمہ نے شونجی سے کہا:

"نواب بہادر نے تمہیں امیر البحر مقرر کر کے ایک تیرے دوست کا رکھے ہیں۔"

راجہ علی چونکا:

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ ایک طرف تو ان کا بحری بیڑا تیار ہو گیا اور دوسری طرف ہمارے نئے اعزاز کی ڈگی پٹے ہی کنوئیر کے باغیوں کے ارادوں پر ادس پڑ گئی ہے۔ کلی تک جو پانڈے (پنڈت) ہمارے سیناچی کو تمہیں دکھاتے تھے اب وہ ان کے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں اور لاکھ لاکھ قسمیں کھا کر اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہیں۔"

تم نے ٹھیک کہا رانی سلمہ۔

راجہ علی کھڑا ہو گیا:

"مگر تم نے میرا خیال کہ نابھوں چھوڑ دیا ہے۔ میں اتنی دیر سے آ رہا ہوں۔ آٹے ہوئے بھی اتنی دیر ہو گئی ہے اور تم نے مجھے کھانے پینے کو نہیں پوچھا۔"

"بھوک تو مجھے بھی لگی تھی مگر تمہاری صورت دیکھ کر میں سب کچھ بھول گئی۔ اور رانی سلمہ نے

ایک ہلکا سا تھمہ لگایا۔

راجہ علی پھر بیٹھ گیا:

"اچھا بھئی۔ تمہیں دیکھ کے میری بھوک بھی اڑ گئی ہے۔ آج ہم دونوں ہی بھوکے رہیں گے۔"

اس طرح دونوں میاں بیوی ہنستے بولتے اور جبر و فراق کے دنوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے وصل کے لمحات سے شاد کام ہوتے رہے۔

رانی سلمہ اپنے شوہر کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتی تھی۔ راجہ علی نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ ایک شب سے زیادہ کنوئیر میں نہیں ٹھہر سکتا مگر اس کی معذرت کنوئیر میں آکر پھر بڑھ گئی تھی۔

اسی دن شام کو اس کے والدین اس سے ملنے آگئے۔ علی نے انہیں کنوئیر چلتے وقت اطلاع کرادی تھی۔ بے چارے ماں باپ بھی بیٹے کو دیکھنے کو ترس رہے تھے۔ علی نے انہیں اطلاع دی تھی کہ وہ صرف ایک دن کے لیے کنوئیر آ رہا ہے اور واپسی میں ان سے ملاقات کی گنجشش کرے گا مگر وہ لوگ یہ سوچ کر کہ کہیں راجہ علی کنوئیر سے سیدھا اپنے مستقر پر نہ چلا جائے، خود ہی بھاگ بھاگ کنوئیر آگئے تھے۔

رانی سلمہ اپنے شوہر کو ملاقاتیوں کے ساتھ معروف دیکھتی تو دل موس کے رہ جاتی۔ اب تو اس کے والدین بھی آگئے تھے مگر سلمہ نے خود کو سنبھالا اور راجہ علی کو دوسرے دن خوشی خوشی رخصت کر دیا۔ اور راجہ علی اپنے دلدے کے مطابق دوسرے دن اپنے بحری بیڑے میں واپس پہنچ گیا۔

اسلامی بحری بیڑے کی تیاری کے سلسلے میں جو جشن منایا گیا اس میں قریب اور دور کے بہت سے مسلمانوں نے شرکت کی اور بحری فوج کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔

خشکی کی غیر مسلم آبادی جو زیادہ تر ناٹروں پر مشتمل تھی، اسے تو یہ یقین ہو گیا تھا کہ حیدری بحری بیڑہ صرف پورے ساحل پر اسلامی پرچم لہانے کا بلکہ ان مقبوضہ جہاز پر بھی حملہ آور ہو گا جو آٹے دن ساحلی مکانات پر ظلم توڑتے رہتے تھے اور جن کے ساتھ ساحلی علاقوں کے ناٹ بھی شامل ہو جاتے تھے۔

ناٹھ ہندو قوم کے برہمنوں کی ایک ذات ہے جس طرح مسلمانوں میں شیعہ اور سنی دو مشہور فرقے ہیں اس طرح ہندو چار بڑی بڑی ذاتوں میں بٹے ہوئے ہیں۔

مسلمان فرقوں میں صرف خیالات کا اختلاف ہے ورنہ سب مسلمان برابر کا درجہ رکھتے ہیں لیکن ہندو قوم کی ذاتیں درجات میں تقسیم ہیں۔ یہ درجے اور ذاتیں ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ وہ بالکل الگ نظر آتی ہیں۔

یہ درجاتی اور طبقاتی تقسیم اس طرح ہے:

۱۔ برہمن:

یہ ہندوؤں کی سب سے اونچی ذات ہے۔ برہمنوں کا ہندو مذہب پر پورا قبضہ ہے۔ ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ بھگوان (خدا) کا حکم ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ صرف برہمن ہی مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے مجاز ہیں۔ ان کی عزت باقی ذاتوں پر فرض ہے مگر یہ کسی کی عزت کرنے پر مجبور نہیں۔ مالابار کے ناٹھ اسی ذات سے تعلق رکھتے تھے۔

۲۔ راجپوت (دھتری)

یہ ہندوؤں کی لڑنے والی ذات ہے۔ راجہ، ہمارا جہ اور لشکر اسی ذات سے ہوتا تھا۔ سولے برہمنوں کے یہ سب سے مفید ذات ہے۔

۳۔ ویش (دبئیے)

یہ تاجر پیشہ ہندوؤں کی ذات ہے۔ ملکی تجارت اور حکومت کے خزانوں کا سارا حساب کتاب انہی کے سپرد تھا۔

۴۔ شودر (دبج ذات)

یہ قوم ہمیشہ سے پسماندہ اور ذلیل ہے۔ کہنے کو تو یہ ہندو ہیں مگر یہ نہ تو تعلیم حاصل کر سکتے ہیں اور نہ مندروں میں داخل ہو سکتے ہیں۔ بھٹی، دھوبی، چوڑھے اور تمام ذلیل قسم کے لوگ اسی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا کوئی پرمان حال نہیں۔ اوپر کی ذاتوں کی خدمت ہی ان کی عبادت ہے۔

یہ دوسری ذاتوں کے سامنے اونچی جگہ یا چارپائی پر نہیں بیٹھ سکتے۔ دوسروں کی عزت کرنا ان کا مذہبی فریضہ ہے مگر ان کی اپنی کوئی عزت نہیں۔

معاف کیجیے قارئین! میں پھر ہل گیا۔

دل توڑ کر ہو رہا تھا ناٹھ قوم کا ساحل مالابار پر ان کی اکثریت تھی اور بحر عرب کے جزائر پر بھی ان کا قبضہ تھا۔

ساحل والوں کو تو احساس ہو گیا تھا کہ حیدری بیڑہ قیامت برپا کرنے والا ہے مگر جزائر کے ناٹھوں کو یا تو اسی کی خبر نہ تھی یا پھر وہ مسلمانوں کو اہمیت نہ دیتے تھے اور ان کے خیال میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ مالابار کی ماپتہ قوم جو صدیوں کی کچلی ہوئی ایک کمزور قوم تھی، وہ کوئی بحری بیڑہ بھی تیار کر سکتی ہے۔

پھر جب —

حیدری بحری بیڑہ سمندر میں اترا اور جنگی کشتیاں اور چند جھوٹے جہاز سطح سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے آگے بڑھے تو موجوں نے مسرت ہو کر کشتیوں کے قدم چومے۔ جزائر کے ہندوؤں نے جب اجنبی کشتیوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو پیسے وہ حیران ہوئے پھر جب ہوش کچھ ٹھکانے آئے تو ساحلوں سے آبادی کی طرف چپختے چلتے بھاگے۔ لحوں میں جزیرے والوں کو معلوم ہو گیا کہ نا معلوم حملہ آور ان کی طرف آ رہے ہیں۔

جزیرے کے ہندو صدیوں سے ساحلوں پر حملے کرتے چلے آ رہے تھے۔ انہیں تعجب تھا کہ الٹی گنگا کیسے بہنے لگی اور ان کے مقابلہ پر آنے کی جرأت کس نے کی؟

پھر جب دونوں طرف کی کشتیاں قریب آئیں تو ہندوؤں کو معلوم ہوا کہ کشتیوں میں دیہی ماپتہ (مسلمان) سوار ہیں جن کی کشتیوں کو وہ غارت کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے ماپتہ ملاحوں اور بحری فوجیوں کا مذاق اڑایا اور زور شور سے ان پر حملہ آور ہو گئے۔

پہلے دونوں طرف سے تیروں کی بارش ہوئی۔

پھر کشتیاں مل گئیں اور بحری فوجی ایک دوسرے کی کشتیوں پر کود پڑے۔ تلواروں، بھالوں اور خنجروں کا استعمال شروع ہو گیا۔

مسلمان ملاحوں کو شمشیر زنی کی تربیت دی گئی تھی۔ وہ پہلے بھی اس فن سے واقف تھے۔ ایک ماہ کی تربیت نے ان کے فن کو اور نکار و باقتار چنانچہ انہوں نے جزیرے کے ناٹھ فوجیوں کو تلوار کی دھار پر رکھ لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سمندر خون سے رنگیں ہو گیا۔

ساحل مالابار کے قریب وہ جزیرے تھے جہاں اب تک مسلمانوں کے قدم نہیں پہنچے تھے اور

وہاں کے باسی اللہ اکبر کی صدا سے نا آشنا تھے مگر ایک ہی شدید حملہ نے ان کے ہوش بٹھکانے لگا دیے اور پلاٹوں نے انہیں بے دریغ قتل کرنا شروع کر دیا۔
دراصل پلاٹوں کا یہ بے رحمانہ سلوک اس ظلم و ستم کا رد عمل تھا جو صدیوں سے ان پر توڑا جا رہا تھا۔

ایک جزیرے پر قبضہ ہونے کے بعد تویہ حال ہو گیا کہ اللہ اکبر کی صدا ناٹروں کے لیے موت کا پیغام بن گئی۔ راجہ علی حسن جزیرے پر حملہ کرنا وہاں مقتولین کے انارنگ جلتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند جزائر میں معمولی مداخلت کے بعد باقی جزیروں نے بغیر جنگ کے ہتھیار ڈال دیے۔

اس طرح تمام جزائر پر نواب بہادر حیدر علی خاں کا پرچم لہرا دیا گیا۔ یہ سب جزائر ایک ہندو راجہ کے قبضہ و اقتدار میں تھے۔ راجہ نے اپنی شکست تسلیم کر لی اور اپنے آپ کو حیدری فوج کے حوالے کر دیا۔

راجہ کے ساتھ ہی اس کی رانی اور بچوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

پاٹھ فوجیوں کا مطالبہ تھا کہ ہندوؤں کے صدیوں کے مسلمانوں پر ظلم و ستم کی یادداشتیں راجہ اور اس کے اہل و عیال کو سولی پر چڑھا دیا جائے مگر راجہ علی نے فوجیوں کی اس بات سے اتفاق کیا کہ جزائر کے ہندوؤں نے پلاٹوں پر لا تعداد ستم توڑے ہیں۔ ان کی آبادیوں کو نہ دبا لیا اور بستیوں کو جلا کر خاکستر کر دیا ہے۔ مگر اس ظلم و ستم میں راجہ کے اہل و عیال کا کوئی قصور نہیں اس لیے رانی اور اس کے بچوں کو کوئی سزا نہیں دی جاسکتی۔
راجہ علی کی دلیل معقول تھی۔

یوں ہی اسلام سلامتی کا مذہب ہے اور اعلان کرتا ہے کہ انتقام اور بدلہ لے سکتے ہو لیکن درگزر کرو تو اللہ کی نظر میں اس کا بڑا مقام ہے۔

مگر۔

ایک زمانے کے ستم ریدہ پاٹھ فوجی انتقام کی آگ میں جلی رہے تھے اور ان کی تسلی صرف اس طرح ہو سکتی تھی کہ راجہ اور اس کے بال بچوں کو مرعہ قتل کر دیا جائے۔

راجہ علی نے فوجیوں کے جذبات ٹھنڈے کرنے کی بہت کوشش کی لیکن فوجی اپنی بات پر اڑ گئے اس وقت راجہ علی نے ایک حکمران کی حیثیت سے اعلان کیا:

اسلام نے جنگ میں بوڑھوں، بچوں اور عورتوں پر ہاتھ اٹھانے سے منع کیا ہے ہمارے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر غزوہ اور سریہ میں اپنے سرداروں کو اور لشکریوں کو یہی حکم دیا تھا کہ ہتھیار ڈالنے والوں پر رحم کرنا۔ ضعیفوں، بچوں اور عورتوں پر ہاتھ نہ اٹھانا۔ اس لیے میں رانی اور اس کے بچوں کو رہا کرنے کا حکم دیتا ہوں۔ وہ بالکل آزاد ہیں۔ وہ جس جگہ چاہیں۔
سرکاری خرچ پر انہیں اس مقام تک بھٹا لٹ پھینچا جائے۔ راجہ راجہ، تو اس کی قیمت کا فیصلہ ہم بعد میں کریں گے۔

پاٹھ فوجی، رانی اور اس کے بچوں کے معاملہ میں تو خاموش ہو گئے لیکن راجہ کے قتل کے لیے اڑ گئے۔

راجہ علی نے رانی اور اس کے بچوں کو اپنے پاس بلوایا۔ رانی اپنے بچوں کے ساتھ راجہ علی کے سامنے آئی اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

راجہ علی نے حکم دیا:

”رانی اور اس کے بچوں کے لیے نشست کا انتظام کیا جائے۔“

اسی وقت خیمے کے سامنے آرام دہ کرسیاں لاکر رکھی گئیں۔ رانی، علی کا شکریہ ادا کر کے اپنے بچوں کو لے کر کرسیوں پر بیٹھ گئی۔

راجہ علی نے نرم لہجے میں کہا:

”کیا رانی کو معلوم ہے کہ میں نے انہیں اور ان کے بچوں کو آزاد کر دیا ہے؟“

رانی نے عرض کیا:

”اے امیر البحر علی! آپ نے مجھے اور میرے بچوں کو آزاد کیا اس کے لیے میں آپ کی شکر گزار ہوں لیکن میں کہاں جاؤں؟ کس کے پاس جاؤں؟ میرا مال اور میرا سہارا تو میرا راجہ چٹی ہے آپ نے انہیں قید کر رکھا ہے اور نہ جانے انہیں کیا سزا دیں گے؟“

”معزز رانی! یہ راجہ فیٹی کی باتیں ہیں۔ اس بارے میں تمہیں کچھ نہ کہنا چاہیے۔“ راجہ علی تختی سے بولا:

”فوج راجہ کے حکم سے لڑتی ہے، جنگ کا ذمے دار ملک کا راجہ ہی ہوتا ہے۔ اسے ہم جو چاہیں سزا دے سکتے ہیں۔“

”مگر آپ انہیں کیا سزا دیں گے؟“ رانی بے چین ہو گئی۔

تم یہ پوچھنے کا حق نہیں رکھتیں رانی
راجہ علی قحور اس پر ٹپکا:

"پھر ابھی ہم نے اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا۔"

راجہ بہادر رانی نے افسردگی سے کہا:

"مجھے بتایا گیا ہے کہ میں جہاں جانے کی خواہش کروں گی وہاں مجھے بھیج دیا جائے گا۔"

"تمہیں درست بتایا گیا ہے معزز رانی۔ علی نے کہا کہ ہمدردی سے کہا:

"میں نے ہی اعلان کیا تھا کہ رانی جہاں جانا چاہیں گی انہیں حفاظت پہنچایا جائے گا۔"

"آپ مجھے حیدرنگر بھجوا دیجیے۔ رانی نے فیصلہ کن انداز میں کہا:

"میں آپ کی شکر گزار ہوں گی۔"

راجہ علی چونک پڑا۔

حیدرنگر نواب بہار حیدر علی خاں کا دارالسلطنت تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ رانی وہاں کیوں

جانا چاہتی ہے مگر اب وہ اسے روک نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ رانی کو اس کی مرضی کے مطابق اس

مقام تک پہنچانے کا اعلان کر چکا تھا۔

ایک لمحہ کے لیے اسے دھڑکا یہ ہوا کہ ممکن ہے رانی حیدرنگر جاکے نواب بہادر سے اس کی

تشکایت کرے لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی کہ نواب بہادر نے اسے

امیر البحر بناتے وقت وہ تمام اختیارات دے دیے تھے جو ایک جنرل کو حاصل ہوتے ہیں۔

آخر اس نے رانی کو حیدرنگر جانے کی اجازت دے دی:

"معزز رانی۔ تمہیں عزت اور احترام کے ساتھ دارالسلطنت پہنچا دیا جائے گا۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے نائب کو حکم دیا،

رانی اور اس کے بچوں کو فوجی پھرے میں خوراک حیدرنگر روانہ کیا جائے۔"

اس کے حکم کی فوراً تعمیل کی گئی اور رانی کو دارالسلطنت روانہ کر دیا گیا۔

رانی اور اس کے بچوں کو حیدرنگر بھیجتے ہی بحری فوج میں ایک افواہ پھیل گئی۔ افواہ کچھ اس

طرح تھی کہ:

"راجہ علی نے ظالم ہندو راجہ کی رانی اور اس کے بچوں کو نہ صرف آزاد کیا ہے

بلکہ انہیں نواب بہادر کے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ وہ نواب بہادر

سے راجہ کی رہائی کی درخواست کرے تاکہ راجہ قتل ہونے سے بچ جائے۔"

یہ افواہ اور اسی قسم کی کچھ اور باتیں تاکہ پابلاؤں اور فوجیوں میں بڑی تیزی سے پھیلیں اور
ان میں ایک عجیب سی بے چینی پیدا ہو گئی۔

اس سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں بحری فوج بغاوت نہ کر دے۔ پابلاؤں کو دراصل راجہ سے
شدید نفرت تھی اور اس نفرت کو وہ راجہ کے خون سے دھونا چاہتے تھے۔

راجہ علی نے فوراً اپنے والد اور کاناؤر کے سیناپتی کو، جسے اس نے اپنا نائب بنایا تھا اور
جو اس وقت جھڑی پر کاناؤر گیا ہوا تھا، فوراً بلوایا تاکہ دونوں سے مشورہ کر کے اس مراٹھاتی
بغاوت کو کچل دیا جائے۔

راجہ علی کے والد اور سیناپتی آگئے۔ صلاح مشورے شروع ہوئے۔ مشوروں کے دوران
پابلاؤں کا تین آدمیوں پر مشتمل ایک وفد راجہ علی سے گفتگو کے لیے آگیا۔

راجہ نے وفد کو بلوایا اور اس کی بات سنی۔

وفد نے مطالبہ کیا کہ جہاز کے ہندو راجہ کو ان ہزاروں مسلمانوں کے قحاص میں پابلاؤں کے
حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اسے قتل کر کے اپنے بزرگوں کا انتقام لیں۔

راجہ علی نے اس مطالبے کو یکسر مسترد کر دیا مگر اس کے والد نے مصیبت وقت کے تحت زہم
ردیہ اختیار کیا اور کہا:

"دیکھو۔ تم لوگ بحری فوج کے ملاح ہی نہیں بلکہ مسلمان پابلاؤں کے افراد بھی ہو اور اسی قوم سے

میرا اور تمہارے راجہ کا تعلق ہے۔ پابلاؤں کے ناپٹے ہم اور تم دونوں کو راجہ سے یکساں طور پر

نفرت ہے اور ہم اس سے بدلہ لینا چاہتے ہیں لیکن ریاست کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ اگر فیصلہ

تمہارے ہاتھ میں دے دیا جائے تو پھر امیر البحر کس مرضی کی دوا رہ جاتا ہے۔

اس کے علاوہ تمہارے مطالبے سے بغاوت کی ٹو آتی ہے۔ یاد رکھو اگر تم نے راجہ علی کے خلاف

فاوت کی تو یسویں گامرد آہن نواب بہادر حیدر علی خاں تمہاری آبادیوں کو تیس تیس کر دے گا اور تمہاری

ام کو خاک میں ملا دے گا۔"

پابلاؤں کے والد کی یہ تقریر سن کر گھبرا گیا۔ اس میں سے ایک جو ذرا عقلی مزاج نظر آتا تھا،

اب میں بولا:

"ہم لوگ دراصل یہ چاہتے ہیں کہ راجہ کو زندہ نہ چھوڑا جائے۔ اگر اسے رہا کر دیا گیا تو وہ پھر

یہ وہ وقت تھا کہ حیدرنگ میں امیر البحر راجہ علی کی فتوحات کا "جشنِ نصرت" منایا جا رہا تھا۔ نواب بہادر نے دربار لگایا تھا اور تمام عاملینِ سلطنت مدعو تھے۔

نواب بہادر کے پاس امیر البحر کا قاصد ایک ہفتہ پہلے "نوبہ فتح" لایا تھا مگر نواب نے دربار آج اس لیے لگایا تھا کہ قاصد ہندو جزائر کی فتح اور ان پر حیدری پرچم لہرائے جانے کی تفصیلات تمام درباریوں کے سامنے بیان کرے۔

صبح ہی سے لوگوں نے دربار میں آنا شروع کر دیا تا اور دن چڑھے تمام مدعوین دربار میں اپنی اپنی جگہ بیٹھ چکے تھے۔ نواب بہادر بھی اپنی نشست میں بحال بیٹھ چکے تھے۔

نواب کا قد چھ فٹ سے بھی زیادہ بلند تھا۔ اس پر ان کا طرہ دار صاف عجب بہار دکھاتا تھا۔ ان کا چہرہ بڑا پٹھان رعب تھا۔ آج "جشنِ فتح" تھا اور مسرت سے ان کا کندھی چہرہ گنار ہو رہا تھا۔ واضح ہے کہ شکست خوردہ ہندو راجہ کی رانی اپنے بچوں کے ساتھ حیدرنگ پہنچ چکی تھی اور نواب بہادر نے ایک آراستہ حویلی اسے عطا کر کے مالانہ وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا۔

اس طرح حیدرنگ والوں کو یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ امیر البحر راجہ علی کو فتح حاصل ہوئی ہے مگر انہیں ابھی اس کی اطلاع نہیں ہوئی تھی کہ راجہ علی نے ہندو راجہ کو اندھا کر دیا ہے جبکہ رانی کو یہ خبر اس کے آدمیوں نے پہنچادی تھی۔

چنانچہ رانی اپنی زیادہ لے کر اسی وقت دربار میں پہنچی جہاں اس وقت جشنِ فتح منانے کے لیے سب عاملین جمع تھے۔

دربار کا منظر بڑا دلنویس تھا۔ ہر چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ نواب بہادر کو زیادہ خوشی اس لیے تھی کہ ان کے جوان عمر امیر البحر نے ان جزائر کے ہندو راجہ کو شکست دے کر گرفتار کر لیا ہے جہاں کے ہندو ساحل مالابار کے پٹلاؤں کی آبادیوں کو تاخت و تاراج کرتے رہتے تھے۔

جشن کی تقریب ابھی شروع نہ ہوئی تھی کہ ایک دربان نے داخل ہو کر نواب بہادر سے مرگوشی کی۔ جواب میں نواب بہادر نے اثبات میں سر ہلایا۔

یہ دراصل ہندو راجہ کی اس رانی کے آنے کی اطلاع تھی جو حیدرنگ میں نواب کی عطا کردہ حویلی میں مقیم تھی۔

نواب بہادر کی اجازت پا کر رانی دربار میں آئی اور سلام کر کے چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ جب کچھ دیر تک رانی نے کلام نہ کیا تو نواب بہادر نے خود اسے مخاطب کیا:

طاقت حاصل کر لے گا اور ہمارا پسے جیسا حشر کرے گا۔

اس موقع پر راجہ نے دخل دیا:

"میرے ساتھیو! تمہاری طرح میں بھی مایہ ہوں۔ میں بھی نہیں چاہتا ہوں کہ راجہ کو اس قابل نہ رہنے دیا جائے کہ وہ دوبارہ سراٹھ سکے۔"

سینا پتی نے مشورہ دیا:

"راجہ کی دونوں آنکھیں نکلوا دی جائیں تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے معذور ہو جائے۔"

مایہ و فدا اس بات سے خوش ہو گیا۔ اس نے کہا:

"راجہ بہادر۔ تمام مایہ آپ کے اپنے بھائی ہند اور غلام ہیں۔ وہ آپ سے بغاوت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ آپ کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں۔ ہم سینا پتی کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں اور آپ سے درخواست ہے کہ راجہ کو اندھا کر دیا جائے۔"

راجہ علی نے باپ سے مشورہ کیا۔ انہوں نے بھی سینا پتی کی رائے کی تائید کی۔ راجہ نے اسی وقت ہندو راجہ کی آنکھیں نکال دینے کا حکم دے دیا۔ اس حکم کے دو گھنٹے بعد راجہ کی دونوں آنکھیں نکال کر اسے اندھا کر دیا گیا۔



راجہ کے اندھا کیے جانے سے پٹلاؤں میں بڑھتی ہوئی بے چینی ختم ہو گئی اور پورے بحری برٹے پر سکوت طاری ہو گیا لیکن اس سکوت نے ایسا طوفان برپا کیا جس میں راجہ علی کو امیر البحر کی تنکے کی طرح بہ لگئی۔

یہ طوفان حیدرنگ میں اٹھا اور امیر البحر علی کو اپنے ساتھ اڑ لے گیا۔

ناہینا ہندو راجہ کی مینا رانی نے حیدرنگ میں فریاد کی:

"اے مالابار کے مشرق و مغرب کے تاجدار۔ اے سلطنتِ میسور کے بادشاہ! کیا آپ نے اپنے امیر البحر راجہ علی کو حکم دیا تھا کہ وہ جزیروں میں رہنے والی ہندو آبادی کو تہ تیغ کرے اور جو لوگ زندہ بچ جائیں انہیں اندھا کر دے۔"

رانی کی پشیمردہ گھر گرتی ہوئی آواز نے حیدرنگ کے ایوانوں کی دیواریں ہلادیں۔

نواب بہادر حیدر علی خاں کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور ان کی آنکھیں غصہ سے خون ہو گئیں۔

کرنا چاہتی تھیں تو تم نے اس قدر تاخیر کیوں کی۔ ہمارے کان ہر دقت "فریادی" کی آواز پر لگے رہتے ہیں۔

"اے عادل بادشاہ!"

رانی نے سنبھل کر کہنا شروع کیا:

"جس وقت میں دارالسلطنت حیدرنگر میں آئی تھی اس وقت میں آپ کے امیر البحر راجہ علی کے احسانات سے دہی ہوئی تھی۔ راجہ علی نے مجھے نہ صرف فوجیوں کی قید سے رہائی دلائی تھی بلکہ مجھے دارالسلطنت تک عزت و احترام سے بھیجے گا انتظام بھی کیا تھا۔

میں خوش تھی کہ جب فاتح جزل نے مفتوح راجہ کی دھم پیتی کہ اتنی عزت دی۔ دارالسلطنت میں آنے کے بعد آپ نے میرے حسبِ مرتبہ سوجلی اور دیگر مراعات عطا فرمائیں اور میں آپ کے احسانوں تلے دب کر رہ گئی۔"

یہ کہہ کے رانی پھر خاموش ہو گئی۔ یہاں تک کہ نواب بہادر کو خود بولنا پڑا:

"رانی! تم نے ہمارے امیر البحر کی تعریف کی۔ اس سے ہم خوش ہوئے۔ پھر تم نے ہماری نوازش کا ذکر کیا جو اگرچہ احسان سے زیادہ ہمارے فرائض میں داخل ہیں۔ پھر بھی تمہاری باتوں سے ہمیں خوشی حاصل ہوئی مگر ان باتوں کے باوجود تم ہمارے امیر البحر کے خلاف خود کو فریادی کہہ رہی ہو۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟"

"اے کم نواز حکمران!"

رانی کی آواز میں تلخی اور سختی پیدا ہو گئی:

"میں اب تک آپ اور آپ کے امیر البحر کی احساندہ تھی مگر اب صورت حال بدل گئی ہے اور میں آپ کے پاس فریادی بن کر آئی ہوں۔ آپ کے امیر البحر نے میرے شوہر کے ساتھ اس قدر گھناؤنا اور ظالمانہ سلوک کیا ہے جو کسی جزل، حکمران یا بادشاہ کو قطعی زیب نہیں دیتا۔"

رانی نے پھر خاموشی اختیار کی۔ نواب بہادر کو پھر پوچھنا پڑا:

"رانی! تم بے خوف ہو کے بتاؤ کہ راجہ علی نے تمہارے شوہر کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟"

رانی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ پھر اس کی بیچ نکل گئی:

"اے حکمران! تیرے عالم امیر البحر نے میرے راجہ جی کی دونوں آنکھیں نکلوا کے انہیں ہمیشہ کے لیے اندھا کر دیا ہے۔ اور رانی اپنے بال نوچ کے رونے لگی۔

"رانی کو اجازت ہے وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں بے خوف کہیں۔"

اذن گویائی پا کر رانی نے فریادی:

"اے مالابار کے مشرق و مغرب کے تاجدار۔ اے سلطنتِ میسور کے بادشاہ! کیا آپ نے اپنے امیر البحر کو یہ حکم دیا تھا کہ ساحل مالابار کے جزائر میں رہنے والی ہندو آبادیوں کو تہ تیغ کرے اور جو لوگ زندہ بچ جائیں انہیں اندھا کر دے۔"

رانی کا نواب بہادر سے یہ سوال نہ تھا بلکہ ایک نشتر تھا جو نواب کے آہنی سینے میں اترتا چلا گیا۔ نواب، رانی کے تلخ و ترش الفاظ برداشت نہ کر سکے اور غصے سے ٹپ کر اپنی نشست سے کھڑے ہو گئے۔

"ہم نے تم پر رحم کیا۔ تمہاری اور تمہارے بچوں کی رہائش کا انتظام کیا۔ ضروری مصارف کے لیے تمہارا وظیفہ مقرر کیا۔ کیا تم ہماری ان نوازشوں سے انکار کر سکتی ہو؟"

نواب حیدر علی خاں کے لہجے میں حاکنانہ جاہ و جلال تھا۔ درباری پہلے ہی رانی کے سخت جہے سے حیران ہو رہے تھے اور اب نواب بہادر کا حکمانہ انداز۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے؟

رانی بالکل پرسکون تھی۔ اس پر نواب بہادر کی گرج نے کوئی اثر نہ کیا۔ وہ پہلے ہی کی طرح کڑکتی آواز میں بولی:

"اے مسلمانوں کے عظیم بادشاہ! کیا آپ اپنی نوازشوں کا ذکر کہ میرے لبوں پر آئی ہوئی فریاد کو رد کر دینا چاہتے ہیں؟"

"فریاد؟" نواب بہادر نے اس لفظ کو دہرایا۔

رانی کا انداز اگرچہ پہلے سے زیادہ تلخ تھا مگر نواب بہادر "فریاد" کا لفظ سن کر موم ہو گئے اور منہ پر بیٹھتے ہوئے بولے:

"اے معزز رانی! ہم تمہارے پہلے فقرے پر یہ شبہ ہوا تھا کہ شاید تم ہمارے امیر البحر راجہ علی کی شکایت لے کر آئی ہو جس نے تمہارے راجہ جی کو شکست دے کر گرفتار کیا ہے۔ مگر تم نے اپنے دوسرے سوال میں "فریاد" کا نام لیا ہے۔ یقین کر دانی۔ فریاد کے معاملے میں تو ہم خود اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکتے۔ پھر ہمارے امیر البحر کی کیا حقیقت ہے۔

ہمیں انوس ہے کہ اگر تمہیں ہمارے امیر البحر سے شکایت تھی یا تم اس کے ظلم پر فریاد

پورا دربار تھرا گیا۔

نواب بہادر کو ایک بار پھر کھڑا ہونا پڑا:

”اے مظلوم و مظلوم رانی۔ تیرے دکھ درد اور غم میں خدا کا ستر بندہ حیدر علی برابر کا شریک ہے۔ میرے خیال میں یہ سراسر ظلم ہے اور امیر البحر راجہ علی نے اپنی حدود سے تجاوز کیا ہے لیکن قبل اس کے کہ میں اس سلسلے میں کوئی حکم دوں، مجھے کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کی ضرورت ہے۔ تم ذرا صبر کرو۔ ہم اپنے قاضی القضاۃ کو طلب کر کے دینی احکام حاصل کر لیں۔ اسی کے ساتھ ہی ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ ہم اپنے دینی احکامات کے تحت تمہارے ساتھ پورا پورا انصاف کریں گے۔“

حیدر علی خاں نے اسی وقت ہر کارہ بھیج کر قاضی شہر کو جو قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز تھے، بلوایا۔

قاضی کے آنے پر حیدر علی خاں انہیں ساتھ لے کر دربار کے برابر ایک کمرے میں چلے گئے۔ اس تخلیہ میں انہوں نے اپنے امیر البحر کے تقرر سے لے کر ہندو راجہ کے اندھا کیے جانے تک کے تمام حالات سے قاضی شہر کو آگاہ کیا۔

”اے قاضی شہر۔ اب فرمائیے کہ دینی نقطہ نظر سے راجہ علی کا یہ فعل ظلم اور سنگین ظلم کے ذیل میں نہیں آتا۔ اگر دین کی نظر میں بھی یہ ایک سنگین ظلم ہے تو پھر اس کی سزا کیا ہو سکتی ہے؟“ قاضی شہر کو نواب بہادر سے ایسے ہی سوال کی توقع تھی۔ انہوں نے سراٹھا کر حکم وقت کو دیکھا اور کہا:

”اے سلطنتِ ہندو کے حکمران! اللہ تعالیٰ نے آپ کو اتنی طاقت اور اختیارات دیے ہیں کہ آپ اپنے امیر البحر کے خلاف کسی بھی تادیب کا حکم دے سکتے ہیں لیکن اگر آپ دینی نقطہ نظر معلوم کرنے کے خواہاں ہیں تو آپ کو یہ بات اپنے ذہن میں رکھنا پڑے گی کہ اسلام سلامتی کا دین ہے اور وہ کسی قسم کے ظلم کی اجازت نہیں دیتا۔“

قاضی شہر نے بالکل درست فرمایا: ”نواب بہادر نے بڑے ادب سے کہا:

”میں اس خدا نے ذوالجلال کا حیرت مآب بندہ ہوں جس کے قبضہ قدرت میں میری اور تمام عالم کی جانیں ہیں۔ مجھے تسلیم ہے کہ دین اللہ یعنی دین اسلام، سلامتی اور رحمت کا مذہب ہے اور میں اسی بنا پر آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ اسلام کی رو سے راجہ علی کے ظلم کی سزا کیا ہے؟“

”نواب بہادر۔ خیال رہے کہ عدل آپ کے ہاتھ میں ہے اور ایک عادل حکمران کو جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی میں آپ کو تنبیہ کرتا ہوں کہ اپنی زبان کو گناہ سے آلودہ نہ کیجیے۔“

قاضی صاحب کا لہجہ تھوڑا سا تلخ ہو گیا جس سے غائب ہوتا تھا کہ انہیں نواب بہادر کی باتیں ناگوار گزری ہیں۔

حیدر علی خاں، قاضی شہر کے لمبے سے گھبرا گئے۔ انہیں گمان ہوا کہ شاید ان کی زبان سے کوئی ایسا لفظ نکل گیا ہے جو گناہ کے زمرے میں آتا ہے۔ انہوں نے فوراً نرم لہجے میں کہا:

”بزرگ محترم۔ اگر میری زبان گنہ گار ہوئی ہے تو مجھے معاف فرمائیے اور میرے گناہ اور غلطی کی نشاندہی کر کے میری اصلاح کیجیے۔“

”اے حاکم۔ اللہ تعالیٰ اس بندے کی غلطی سے درگزر فرماتا ہے جو اپنی غلطی تسلیم کر کے آئندہ کے لیے توبہ کرتا ہے۔“

قاضی شہر نے بڑی منانت سے کہا:

”جہاں تک آپ کی غلطی اور گناہ کا تعلق ہے تو اس کے لیے میں آپ کی توجہ لفظ ”ظلم“ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ آپ کا اپنے امیر البحر راجہ علی کو ”ظلم“ کہنا اپنی زبان کو گناہ سے آلودہ کرنا اور حدودِ عدل سے تجاوز کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے۔ آپ گفتگو میں احتیاط سے کام لیجیے۔“

نواب بہادر حیدر علی خاں نے حیرت ناک نظروں سے قاضی شہر کو دیکھا۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ راجہ علی کو ظالم کہنے سے اس کی زبان گناہ سے آلودہ کیسے ہو گئی۔ آخر جب اس سے نہ رہا گیا تو وہ پوچھ بیٹھا:

”اے عالم دین۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ میری زبان گناہ سے کس طرح آلودہ ہو گئی؟“

قاضی شہر نے نواب کو تیز نظروں سے دیکھا:

”نواب بہادر۔ کیا آپ نے مجھ سے یہ دریافت نہیں کیا کہ راجہ علی کے ظلم کی سزا کیا ہے؟“

”جی ہاں۔“ نواب بہادر نے تسلیم کیا:

”میں نے یہ پوچھا تھا آپ سے۔“

عجیب اتفاق ہے کہ جس وقت نواب بہادر کا پہلا ہرکارہ راجہ علی کے سامنے نیم پر بیٹا تو اسے بتایا گیا کہ امیر البحر ایک عارضی غسل خانے میں، جو قریب ہی دوسرے خیمے میں بنایا گیا تھا، غسل کے لیے تشریف لے گئے ہیں۔

ہرکارہ نے راجہ علی کے خیمے کے محافظ سے کہا: "تم مجھے فوراً اس جگہ لے چلو جہاں راجہ علی غسل کر رہے ہیں۔" محافظ نے تیز نظروں سے اسے دیکھا مگر نرم آواز میں بولا: "شاہی قاصد آپ پسینے میں شرابو ہو رہے ہیں۔ آپ گھوڑے سے اتارے۔ تشریف رکھیے۔ میں امیر البحر کو ابھی ملائے لاتا ہوں۔" "تم مجھے فوراً راجہ علی کے پاس لے چلو۔ ہرکارہ کا لہجہ ٹھکانہ ہو گیا۔

محافظ نے پھر بھی سنجیدگی اختیار نہ کی: "میں شاہی قاصد سے پورے احترام کے ساتھ درخواست کرتا ہوں کہ وہ گھوڑے سے نیچے تشریف لے۔" "تم شاہی احکامات کی بجا آوری میں دخل اندازی کر رہے ہو۔" ہرکارہ گھوڑے سے کود پڑا اور تلوار کھینچ لی:

"اگر تم نے اب ایک لفظ بھی زبان سے نکالا تو میں تمہیں نواب بہادر حیدر علی خاں والی میو کے احکامات کی توہین کی پاداش میں فوراً قتل کر دوں گا۔" محافظ بکھر گیا اور تیز تیز ایک طرف چلنے لگا۔ ہرکارہ اسی طرح شمشیر بکٹ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ عارضی غسل خانہ قریب ہی تھا۔ دونوں دہلی پہنچے۔

محافظ نے سامنے خیمے کی طرف اشارہ کیا:

"امیر البحر اس خیمے میں غسل فرما رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم جاسکتے ہو۔"

محافظ کے جانے کے بعد ہرکارہ نے تلوار نیام میں کر لی اور خیمے کے پردے کے پاس پہنچ کر آواز دی:

"میں نواب بہادر حیدر علی خاں کا حکم راجہ علی کو پہنچاتا ہوں کہ وہ جس حال میں ہوں میرے ساتھ حیدرنگ تشریف لے چلیں۔"

قاضی شہر نے نواب سے جرح کی: "اس کا مطلب ہے آپ راجہ علی کو ظالم سمجھتے ہیں؟" "بالکل۔ اس میں کیا شبہ ہے؟"

نواب بہادر نے جواب دیا:

"راجہ علی کو ہندو راجہ کی آنکھیں نکلوانے کا حکم میں نے نہیں دیا تھا۔" "اے حکمران۔ یہ باتیں تو بعد کی ہیں کہ راجہ علی نے کیا کیا۔" قاضی شہر کا لہجہ کچھ اور سخت ہو گیا:

"دین اس بات کی اجازت کسی بادشاہ کو نہیں دیتا کہ وہ کسی شخص کو بغیر تحقیق اور پوچھ گچھ کے "ظالم" کہے۔" راجہ علی کو اس وقت تک ظالم کہنا گناہ ہے جب تک اس کا ظلم ثابت نہ ہو جائے۔ امیر البحر پر ظلم کا الزام رانی نے لگایا ہے اور یہ اس وقت تک الزام ہی رہے گا جب تک ملزم کو صفائی کا موقع نہیں دیا جاتا۔ آپ یا میں راجہ علی کو اس کا بیان سننے سے پہلے کس طرح عزم گردان سکتے ہیں۔ ہمیں اس وقت تک یہ حق حاصل نہیں کہ راجہ علی کو ظالم کہیں۔" نواب بہادر اگرچہ ان پڑھ تھے لیکن قاضی شہر نے انہیں ملزم اور مجرم کا فرق اس وضاحت سے سمجھایا کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔

نواب بہادر نے سہلا کہا:

"خدا مجھے معاف فرمائے۔"

اس کے بعد نواب بہادر نے حکم دیا کہ آگے پیچھے دو تیز رفتار قاصد ساحل مالابار روانہ کیے جائیں، اس تاکید کے ساتھ کہ کنا نور کا راجہ علی جس حال میں بیٹھا ہو اسی طرح اسے لے کر حیدرنگ واپس آئیں۔

نواب بہادر نے قاضی شہر سے درخواست کی:

"آپ اس مقدمہ کے دوران مشورے کے لیے ضرور تشریف لائیے گا۔"



”میں اس بات کی وضاحت بھی کر دوں۔“

شاہی ہرکارے نے مزید کہا:

”کہ اگر راجہ علی نے تعیل حکم میں ایک لکڑی بھی تاخیر کی تو میں خیمہ میں داخل ہو کر انہیں گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“

راجہ علی نے نواب بہادر جید رعلی خاں کا یہ حکم سنا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ صرف ایک چادر جسم کے گرد لپیٹے ہوئے باہر نکل آیا۔

شاہی ہرکارے نے راجہ علی کو سلام کیا اور کہا:

”اگر راجہ علی نے نواب بہادر کا حکم نہیں سنا تو میں اسے دہرا سکتا ہوں۔“

راجہ علی تجھ چکا تھا کہ ضرور اس کے خلاف کوئی بات ہوئی ہے ورنہ نواب بہادر ایسا سخت حکم نہ دیتے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا:

”میں نواب بہادر کے حکم پر سر جھکاتا ہوں اور شاہی قاصد کے ساتھ نواب بہادر کے پاس چلنے کو تیار ہوں۔“

”تو پھر چلیے۔“

یہ کہہ کر ہرکارے نے پیچھے گھاٹی۔

راجہ علی نے درخواست کی:

”میں کپڑے پن کے ابھی آتا ہوں۔“ اس نے عارضی غصہ نے کا رخ کیا۔

شاہی ہرکارہ پلٹا اور کرک کر بولا:

”آپ کوئی کام نہیں کر سکتے راجہ علی۔ نواب بہادر کا حکم ہے کہ میں آپ کو جس حالت میں پاؤں اسی حالت میں ساتھ لے کر جید رعلی واپس چلوں۔“

”بہتر ہے۔“

راجہ علی سما سما ہرکارے کے ساتھ چلنے لگا۔

شاہی ہرکارہ راجہ علی کو لے کر اس کے خیمے پر پہنچا تو خیمے کا محافظ بوکھلا گیا۔ اس کا آقا امیر البحر سلطنت میسر صرف ایک چادر میں لپٹا ہوا ننگے سر اور ننگے پیر شاہی قاصد کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

قاصد نے محافظ کو حکم دیا: ”راجہ علی کا گھوڑا حاضر کیا جائے۔“

محافظ نے اپنے آقا کی طرف دیکھا،

”آقا گھوڑے کے ساتھ لباس کو نسا لاؤں آپ کے لیے؟“

قبل اس کے کہ راجہ علی کوئی جواب دے، شاہی ہرکارے نے اسے ڈانٹ دیا:

”تیری زبان بند نہ ہوئی تو میں یہ زبان قلم کر دوں گا۔“

راجہ علی نے بات سنبھالی اور محافظ سے کہا:

”جا جلدی سے گھوڑا لے آ۔ ایک لفظ زبان سے نکلنے کی ضرورت نہیں۔“

محافظ ڈر کر ایک طرف چلنے لگا۔

راجہ علی اسی حالت میں صرف ایک چادر باندھے، ننگے سر اور ننگے پیر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ شاہی ہرکارہ اپنے گھوڑے پر بیٹھا۔

بب یہ دونوں سوار خیمے کے درمیانی راستہ سے گزرے تو ملاحوں اور بحری فوجیوں کا ڈور

طرف ہجوم لگ گیا۔ راجہ علی جو ان کا امیر البحر تھا قاصد کے ساتھ گردن نیچی کیے، لگا میں سنبھالے

بیٹھا تھا۔

خیوں کی قہاریں ختم ہوتے ہی شاہی ہرکارے نے لگا میں اٹھائیں اور دونوں گھوڑے

سرپٹ دوڑنے لگے۔

گھوڑے بڑی تیزی سے بیدارنگ کی طرف دوڑ رہے تھے۔

راجہ علی اپنی قسمت اور نیرنگی زمانہ پر آنسو بہا رہا تھا۔ وہ نواب بہادر جس نے اسے امیر البحر کا

اعزاز دیا تھا، آج اسی نواب بہادر نے اسے گدا گردوں کی طرح پکڑ بٹھوایا تھا

مگر کیوں؟

ایسا کیوں ہوا؟

آخر اس نے ایسا کیا گناہ کیا تھا جس کے صلے میں اسے یہ سزا دی جا رہی تھی؟؟؟

راجہ علی نے اٹلے راہ شاہی ہرکارے سے اس سلسلے میں کئی بار گنت گوی کو شش کی

لیکن ہرکارہ اسے ٹال گیا۔ جب راجہ علی نے بہت زور دیا تو اس نے صاف الفاظ میں کہا:

”راجہ علی۔ آپ زیر عتاب ہیں۔ آپ کی قسمت کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے۔ اگر آپ نے مجھے

زیادہ دقت کیا تو میں نواب بہادر سے اس کی شکایت کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔
راجہ علی کی زبان بند ہو گئی۔ اسے اپنی غلطی یا سنا کا کوئی علم نہ تھا مگر وہ شاہی ہرکار سے
کو پریشان کر کے اس میں اضافہ نہ کرنا چاہتا تھا۔

ہرکار سے کی خوجی میں خشتک میوے بھرے تھے۔ دوران سفر دونوں یہ میوے استعمال
کرتے رہے۔ راجہ علی کی بھوک پیاس اڑ گئی تھی۔ ہرکارہ بھوک کے دقت خوجی کھوٹا اور
اس کے سامنے رکھ دیتا۔

اسی طرح سفر کرتے ہوئے یہ دونوں تیسرے روز حیدرنگر پہنچ گئے۔

اس وقت نواب حیدر علی خاں اپنا دربار لگائے بیٹھے تھے۔ شاہی ہرکار سے دربار کے
دربان سے نواب بہادر کو اپنے واپس آنے اور راجہ علی کو سائنڈلے کی اطلاع دینے کو کہا۔ نواب
بہادر نے حکم دیا کہ راجہ علی کو کل تک کے لیے اس کے نائب کی جوبلی میں ٹھہرایا جائے اور دوسرے
دن دربار میں پیش کیا جائے۔

اسی رات نواب بہادر نے قاضی شہر کو پیغام بھیجا:

”مذموم امیر البحر راجہ علی حیدرنگر پہنچ چکا ہے۔ کل اس کا مقدمہ پیش ہو گا۔ آپ کی موجودگی
ضروری ہے۔“

دوسرے حکم میں نواب بہادر نے ہندو راجہ کی رانی کو دوسرے دن دربار میں حاضری کی
اطلاع بجوائی۔ اسے بتایا گیا کہ مذموم امیر البحر راجہ علی کو صفائی پیش کرنے کے لیے حیدرنگر بلوا
یا گیا ہے۔

اس دن نصف شب تک حیدرنگر انڈیا ہاؤس کی پیٹ میں رہا۔ ہر شخص اپنی بات کے مطابق
اس مقدمے پر تبصرہ کر رہا تھا۔

کٹر قسم کے لوگ امیر البحر کو حق بجانب سمجھتے تھے مگر سنجیدہ قسم کے مسلمانوں کا خیال تھا کہ
امیر البحر نے ہتھیار ڈالنے والے راجہ کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ ایک مجبور اور گرفتار شخص کی آنکھیں
نکال کر اسے اندھا کر دینا ظلم نہیں تو اور کیا ہے!

دوسرے دن صبح کو نواب بہادر نے کھلے میدان میں دربار لگایا جہاں خواص کے علاوہ عوام کو

بھی آنے کی اجازت تھی۔

مقدمہ کی سنیگیٹ کے پیش نظر عام لوگوں نے اس میں کافی دلچسپی کا اظہار کیا اور صبح ہی سے
میدان میں اکٹھا ہونا شروع ہو گئے۔ میدان میں دور دور تک فرشتے بچھا دیا گیا تھا۔ لوگ آتے
اور بیٹھتے جاتے تھے۔

نواب بہادر حیدر علی خاں اپنے سرداروں کے ساتھ راجہ کے محل سے برآمد ہوئے۔ ان کے ساتھ
سرداروں اور غلامین سلطنت کے علاوہ قاضی شہر تھے۔

نواب بہادر کی سند کے برابر قاضی صاحب کی سند تھی۔ بائیں طرف کچھ ہٹ کے مدعیہ رانی
کو بٹھایا گیا۔ نواب بہادر کے آنے پر تمام لوگوں نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ پھر اپنی جگہ
پر بیٹھ گئے۔

نواب بہادر نے بیٹھے ہی حکم دیا:

”کنا نور کے راجہ علی کو پیش کیا جائے!“

راجہ علی کو رات گزارنے کے لیے نائب کی جوبلی پر رکھا گیا تھا۔ اسے آرام دہ بستر اور ایک
خدمت گار بھی دیا گیا تھا لیکن خدمت گار کو راجہ علی سے گفتگو کرنے کی اجازت نہ تھی۔ راجہ علی جس
چادر میں پٹا ہوا آیا تھا، اب تک اسی میں بلبوس تھا۔ نائب نے اسے لباس مینا نہیں کیا تھا۔

کنا نور کے راجہ اور امیر البحر سلطنت میسور کو دربار میں لایا گیا تو لوگوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے
کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ راجہ علی صرف ایک چادر سے اپنا تن ڈھانپے ہوئے تھا۔

قاضی شہر نے چند آیات کی تلاوت کی اور دعا کے بعد دربار کی کاروائی شروع ہوئی۔ راجہ علی
کو رانی کے سامنے دوسری طرف کھڑا کیا گیا تھا۔

راجہ علی نے اگرچہ دربار پر ایک حاضرانہ نظر ڈالی تھی مگر مذمت اور ایک نامعلوم احساس گناہ
نے اس کی نظریں دھندلا دی تھیں۔ ممکن ہے کہ اس نے رانی کو دیکھی ہو مگر اس کو پہچان نہ تھا۔ اسے
ابھی تک کسی ذریعے سے یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ اس کی خطایا گناہ کیا ہے؟

نواب بہادر حیدر علی خاں نے رانی کی طرف دیکھ کر کہا:

”رانی! بہادر سے امیر البحر راجہ علی کے خلاف اپنا مقدمہ پیش کرے۔“

رانی اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت راجہ علی نے اسے پہچان اور اسے یہ بھی اندازہ ہوا کہ
رانی نے اپنے شوہر کی سزا کے متعلق نواب بہادر سے فریاد کی ہوگی اور فوراً ہی اس بات کو

نقدی بھی ہو گئی۔

رانی نے واضح لہجے میں کہنا شروع کیا:

اے عادل بادشاہ۔ دو بادشاہوں کے درمیان ہمیشہ سے جنگیں ہوتی چلی آرہی ہیں۔ جنگ میں ایک فتح حاصل کرتا ہے اور دوسرا شکست کھاتا ہے۔

آپ کے ان امیر البحر نے جو اس وقت دربار میں مکین صدمت بنائے کھڑے ہیں، ہمارے جزیروں پر حملہ کر دیا اور ایک ایک کر کے تمام جزیرے فتح کر کے ان پر آپ کا ہتھ بھرا دیا۔ جزیروں کے راجہ یعنی میرے پتی نے اپنی شکست تسلیم کر لی اور ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ راجہ اور ہمیں گرفتار کر لیا گیا۔

یہاں تک کہ جو خیریت تھی کہ آپ کے امیر البحر نے مجھے اور میرے بچوں کو رہا کر دیا اور میں آپ کی پناہ میں حیدرنگر آ گئی۔

اس وقت رانی نے ایک ٹھنڈی ماسلی اور روتے ہوئے بولی:

اے عادل حکمران! میرے یہاں آنے کے تیسرے دن میرے پتی راجہ کی دونوں آنکھیں نکل کر انہیں اندھا کر دیا گیا۔ میں آپ کی دہائی دیتی ہوں اور انصاف مانگتی ہوں۔ مجھے انصاف دیا جائے اسے میسور کے حکمران۔ راجہ علی کو سخت سزا دیجیے۔ میرے پتی نے آخر اس کا کیا بگاڑ اٹھا کہ اسے ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے محروم کر دیا گیا؟

رانی کے اس دردناک بیان سے عوام کی چیخیں نکل گئیں اور لوگوں کی سسکیوں کے درمیان، انصاف انصاف کی کھٹی کھٹی آوازیں ابھرنے لگیں۔

”راجہ علی!“ نواب بہادر شیر کی طرح گرجے،

”ہمیں بنایا جلتے کہ رانی کے بیان میں کس حد تک صداقت ہے؟“

نواب بہادر کی گرجا آواز سے راجہ علی کے ہاتھ پیر کانپ اٹھ گئے تھے۔ اس نے گلو گیسر آواز

میں جواب دیا:

اے عادل حکمران۔ رانی کا یہ بیان درست ہے کہ اس کے شوہر کی آنکھیں نکل آدی گئی ہیں۔

اس وقت قاضی شہراٹھ کے نواب بہادر کے قریب گئے اور جھک کے سرگوشی میں کچھ کہا۔

پھر اپنی جگہ واپس آ گئے۔

نواب بہادر نے دوسرا سوال کیا:

”اس کا مطلب ہے کہ تمہیں اپنے اوپر لگائے جانے والے الزام کا اقبال ہے؟“

”جی ہاں اے عادل حکمران!“

راجہ علی نے تسلیم کیا:

”میں تسلیم کرتا ہوں کہ راجہ کی دونوں آنکھیں میرے حکم سے نکالی گئیں لیکن میں درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جائے۔“

”تھیک ہے راجہ علی۔ تمہیں صفائی کا موقع ضرور دیا جائے گا۔“

نواب بہادر نے کہا:

”تم اگر درخواست نہ بھی کرتے تب بھی ہم تمہیں صفائی کا موقع ضرور دیتے اس لیے کہ ملزاکو

جب تک صفائی کا موقع نہ دیا جائے انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔“

”میں عادل حکمران کا شکر گزار ہوں۔“ راجہ علی جلدی سے بولا۔

”غرض کی ادائیگی میں کسی شکر یہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔“ نواب بہادر کے تلخ لہجے میں ایک کسک

محسوس ہوتی تھی:

”تاؤ کہ تم نے یہ گھناؤنا جرم کیوں کیا۔ کیا تم بھول گئے تھے کہ ابالار کا حکمران حیدرنگر میں موجود

ہے اور بفضلِ خدا اس کے کان کھلے اور تمہیں روشن ہیں۔ کیا تم یہ بھی بھول گئے تھے کہ حیدر علی

انصاف کے معاملے میں کسی سے رعایت نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ اگر حیدر علی پر بھی کوئی الزام لگایا جائے

تو وہ خود قاضی شہر کی عدالت میں حاضر ہو کر اپنی صفائی پیش کرے گا اور اگر قاضی شہر نے اسے ملزاکو

تو وہ تقریر کو قبول کرے گا۔“

اے عادل بادشاہ۔ میرے ذہن میں یہ باتیں روشن چراغوں کی طرح جگمگا رہی تھیں راجہ علی

نے اپنی صفائی میں کہا:

”لیکن حالات کچھ اس طرح کے ہو گئے کہ مجھے یہ اقدام کرنا پڑا۔“

”وقت ضائع نہ کرو راجہ علی۔“

نواب بہادر کی پیشانی شکن آلود ہو گئی:

”تمہیں اپنی صفائی میں جو کچھ کہنا ہے وہ صاف اور واضح الفاظ میں کہو۔“

”ٹھیک ہے اے شاہ میسور۔ میں مختصر طور پر ان حالات کو بیان کرتا ہوں۔“

”تمہیں راجہ علی۔ نواب بہادر نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا:

”ہم تمہیں اختصار پر مجبور نہیں کرتے۔ تم تفصیل سے بیان کر سکتے ہو بشرطیکہ اس تفصیل میں کچھ جان بچھوڑ نہ ہو۔“

”بہتر ہے اسے عادل بادشاہ!“

راجہ علی نے سنبھل کر اپنا بیان شروع کیا:

”اے عادل حکمران۔ مجھے بڑی بیڑا تیار کر کے جن جزائر پر حملہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، یہ وہی جزائر تھے جن پر آج تک دین اسلام کا سوچ طوع نہ ہوا تھا۔ بڑا اثر کے نام باسی اور ان کا راجہ مشرک ادبیت پرست تھے۔ انہوں نے آغاز اسلام کے وقت مالابار کے ساحلوں پر آباد مسلمان ماہلاؤں پر ظلم و ستم تو دنا شروع کر دیے تھے۔ خشکی کے ہندو نارڈ اور جہرے کے بت پرست ہندو دونوں مل کر آٹے دن مسلمانوں پر ظلم ڈھاتے اور قتل عام کا بازار گرم کرتے رہتے تھے۔ ان کا یہ علی اس وقت تک جاری رہا جب تک میں کناور کا راجہ نہ بنا۔

میرے کناور کی گدی پر بیٹھنے سے خشکی کے آثار بہت کچھ ٹھنڈے پڑ گئے مگر جزائر کے ظالموں کے ظلم میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ اس غلام نے آپ کے حکم سے بحری بیڑا بنا کر ان ظالموں کو تہ دالا کر ڈالا۔

اس دوران جزائر کے راجہ نے اپنی شکست تسلیم کر لی اور خود کو اپنے خاندان سمیت میرے حوالے کر دیا۔

جب راجہ رانی اور ان کے بچے گزندہ کر کے میرے سامنے پیش کیے گئے تو ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے دل میں رانی اور اس کے بچوں کے لیے رحم کا رجحان پیدا ہوا۔ میں نے رانی اور بچوں کو راکھ کے ان کی خواہش کے مطابق حیدر نگر بھجوا دیا۔

راجہ میری قید میں تھا اور ابھی میں اس کے باسے میں کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ بائبلہ ملاحوں نے راجہ کو ان کے حوالے کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ انہوں نے اس کی وجہ یہ بیان کی کہ راجہ کے حکم سے ماہلاؤں پر سینکڑوں حملے کیے گئے جن میں ہزاروں ماہلاؤں کا قتل عام ہوا۔ اس کے قصاص میں وہ لوگ راجہ کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنا چاہتے تھے مگر میں نے ان کا یہ مطالبہ تسلیم نہیں کیا۔

حیدر علی نے ایک بار پھر رقمہ دیا:

”تم نے ان کا یہ مطالبہ تسلیم نہیں کیا کہ راجہ کو ان کے حوالے کر دو۔ اس کے بدلے تم نے راجہ کی آنکھیں نکلوا دیں۔ کیا یہ کھلا ہوا ظلم اور اختیارات کی حدود سے تجاوز نہیں؟“

”اے عادل بادشاہ!“

راجہ علی کا گلا خشک ہونے لگا:

”میں نے خود اپنے طور پر آنکھیں نکلوانے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔“

”تو کیا ماہلاؤں نے راجہ کو اندھا کرنے کا مطالبہ کیا تھا؟“ نواب بہادر نے درشت لہجے میں اس سے پوچھا۔

”یہ بات بھی نہیں تھی نواب بہادر۔“ راجہ علی نے کونکار کر جواب دیا:

”میں نے اس سلسلے میں اپنے والد اور کناور کے وزیر جنگ، جو میرا نائب ہے اور ان سے مشورہ کیا، میرے والد نے راجہ کو معاف کر دینے کا مشورہ دیا جو میں نے تسلیم نہ کیا۔ میرے نائب نے رائے دی کہ ملاحوں کا کہنا ہے کہ اگر راجہ کو راکھ کر دیا گیا تو وہ طاقت حاصل کر کے پھر ماہلاؤں پر حملہ کرے گا اس لیے راجہ کو چھوڑ دینے یا قتل کر دینے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ اسے ہمیشہ کے لیے معذور کر دیا جائے تاکہ وہ کبھی طاقت حاصل نہ کر سکے۔

پس اس نے مشورہ دیا کہ راجہ کو اندھا کر دیا جائے تاکہ ماہلاؤں کے اللہ سے ہونے جہزات سرور پڑ جائیں۔ یہ مشورہ مجھے پسند آیا اور میں نے راجہ کی آنکھیں نکلوا دیں۔ اگر یہ میری خطا ہے تو مجھے ضرور سزا دی جائے۔“

نواب بہادر کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے:

”راجہ علی، تمہارا بیان ہمیں قائل نہیں کر سکا۔ تمہارے صفائی پیش کرنے سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ تم نے راجہ کو اندھا کرنے کا حکم خود اپنے طور پر نہیں دیا بلکہ تمہارے پیش نظر ماہلاؤں کا دباؤ اور تمہارے نائب کا مشورہ تھا جس نے تم سے یہ حکم صادر کر لیا۔“

”جی ہاں نواب بہادر۔“ راجہ علی کو جیسے کچھ اطمینان حاصل ہوا:

”میں دراصل ہی کنا چاہتا تھا!“

نواب بہادر نے قاضی شہر کی طرف دیکھا۔ وہ اٹھ کر نواب کے پاس آئے۔ نواب بہادر نے ان کا ہاتھ پکڑ کر مسند پر اپنے ساتھ بٹھایا۔ دونوں کچھ دیر آہستہ آہستہ گفتگو کرتے رہے پھر قاضی شہر واپس اپنی نشست پر جا بیٹھے اور نواب بہادر نے مقدمے کا فیصلہ سنایا:

”رانی نے امیر البحر راجہ علی کے خلاف اپنا مقدمہ درست پیش کیا۔ رانی کی بیان کردہ کوئی بات غلط نہیں اس لیے کہ راجہ علی نے اپنے جرم کا اقرار کیا ہے۔“

ہم نے راجہ علی کو صفائی کا پورا موقع فراہم کیا۔ اس نے ہمارے حکم کی تعمیل میں اس قدر عجلت کی کہ بغیر لباس تبدیل کیے غسل خانہ سے نکل کر حیدرنگر چل پڑا۔ اس کا جو حال ہے وہ سب لوگ دیکھ رہے ہیں۔

لیکن — راجہ علی نے اپنی صفائی میں جو باتیں بیان کی ہیں اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ راجہ علی میں قوت فیصلہ، شدید کمی ہے۔ وہ اگر دباؤ میں آ کر راجہ کو قتل کر دیتا تو ہمارا فیصلہ وہ نہ ہوتا جو ہم صادر کر رہے ہیں۔

قوت فیصلہ کی کمی کے ساتھ ساتھ راجہ علی صرف کنا نور کا راجہ نہ تھا بلکہ ہم نے اسے اپنی سلطنت کا امیر البحر بھی مقرر کیا تھا۔ اس طرح اس کے پاس لامحدود اختیارات تھے، لیکن وہ ان لامحدود اختیارات کو کام میں لانے میں ناکام رہا۔

اس نے پٹاؤں کے مطالبہ کو اگرچہ پوری طرح تسلیم نہ کیا مگر ان کے دباؤ میں آ کر ایک معافی مانگنے والے راجہ کی آنکھیں نکلوا دیں۔

ان تمام باتوں کے پیش نظر ہم راجہ علی میں قوت ارادی کی کمی، قوت فیصلہ میں ناکامی اور ملاحوں کی شور و شغب کو دبانے میں ناکامیابی کی بنا پر امیر البحر سلطنت میسور راجہ علی کو اس کے ہندو سے معزول کرتے ہیں اور اسے اپنے تمام اختیارات اپنے نائب کے حوالے کرنے کے بعد کنا نور جانے کا حکم دیتے ہیں۔ کنا نور ریاست کا وہ حبیب سابق راجہ رہے گا۔
اس فیصلہ کے ساتھ ہی نواب بہادر نے عوامی دربار برخواست کر دیا۔

۱۶۵۷ء کی ایک روشن صبح تھی!

سرنگاپٹم جنوبی ہند کی ایک ریاست میسور کا صدر مقام تھا۔ اس شہر کی ایک چوڑی گلی میں چند بچے کھیل رہے تھے۔ تمام بچوں کی عمریں پانچ سے سات سال کے درمیان تھیں۔ اس عمر کے بچے عام طور پر کھیلنے وقت دھول دھبہ اور مار پیٹ کرتے ہیں مگر عجیب بات تھی کہ یہ تمام بچے نہایت اطمینان اور سکون سے اپنے کھیل میں مشغول تھے۔

ان بچوں میں ایک بچہ جس کی عمر سات سال سے زیادہ نہ تھی، دوسرے بچوں سے کافی مختلف نظر آتا تھا۔ وہ چہرے مہرے سے بے عیدہ اور بردبار معلوم ہوتا تھا۔ کھیلنے ہوئے بچوں میں جب کوئی اختلاف یا جھگڑا ہو جاتا تو تمام بچے اس کے گرد آ کر کھڑے ہو جاتے اور اپنی اپنی بات کہتے۔ اس طرح اس کے گرد ایک عدالت سما لگ جاتی اور یہ بچہ سب کے بیانات سن کر فیصلہ کرتا۔
عجب کی بات یہ بھی تھی کہ اس کا فیصلہ ہر بچہ خاموشی سے تسلیم کر لیتا اور پھر وہ سب دوبارہ کھیلنے میں مصروف ہو جاتے۔

راہ پٹنے لوگ ان کی طرف کوئی توجہ نہ دیتے لیکن بچوں سے کچھ دور بیٹھا ہوا ایک درویش سورت نان بچوں کے کھیل اور خاص طور پر اس لڑکے کے فیصلہ کرنے کی حکمت علی کو بخیر و بیکہ مانتا تھا۔
اسے اس بات پر حیرت تھی کہ اس قدر کم عمر بچہ اپنے ساتھیوں پر کس قدر رعب رکھتا ہے کہ وہ اس کے ہر فیصلہ کو بے چون و چرا تسلیم کر لیتے ہیں۔

مشور ہے کہ "پوت کے پاؤں پالنے میں" یعنی دے بچے جن کا مستقبل تابناک اور روشن ہوتا ہے وہ اپنے بچپن ہی میں کچھ اس طرح کے کام یا حرکتیں کرتے ہیں کہ دیکھنے والے ان کے مستقبل کے بارے میں اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جب عام لوگ مستقبل کا اندازہ لگا سکتے ہیں تو پھر اللہ والوں سے کس بچے کا مستقبل کیسے پوشیدہ رہ سکتا ہے!

چنانچہ —

وہ درویش صفت انسان جو اپنے ظاہر و باطن دونوں ہی میں درویش تھے، نے اپنے ظاہری آنکھیں بندیں اور دل کی آنکھیں کھول کر اس بچے کے مستقبل کی کتاب پڑھنا شروع کی۔ بچے کی زندگی کے اوراق جس انداز سے درویش کے ذہن میں کھلتے جاتے اسی طرح وہ اس بچے سے اور زیادہ متاثر ہوتے جلتے۔ اسی وقت وہ بچہ کھینا ہوا اس درویش کے قریب سے گزرا۔ درویش نے اسے روک کر دریافت کیا:

بیٹا۔ تم رانام کیلے ہے؟

بچے نے جواب دیا:

"میری ماں مجھے پٹوستان اور والد مجھے پٹو سلطان کہتے ہیں۔"

درویش نے فرمایا:

"دونوں ہی ٹھیک کہتے ہیں۔ تم دل کے مستان اور دماغ کے سلطان ہو۔"

پھر درویش نے اس سے پیار بھرے انداز میں کہا:

"بیٹے۔ میری ایک بات یاد رکھنا۔ سچ تم جس طرح اپنے ماتحتی بچوں کو ہدایات دے رہے ہو

اگلی تم اسی طرح بادشاہ ہو کر اس سر زمین پر حکومت کر دگے اور یہ سب تمہارے ماتحت ہوں گے۔"

بچہ حیران حیران نظروں سے درویش کو دیکھ جارا ہوا تھا۔

"حیران نہ ہو میرے بیٹے۔ درویش نے پھر اپنی بات شروع کر دی:

"اگلی جب تم اس سرزمین کے بادشاہ ہو باؤ تو اپنے ماتحت حقیقی یعنی اس تمام دنیا کے پیدا کرنے والے اللہ تعالیٰ کو ہرگز نہ بھولنا اور آج تم جس گلی میں کھیل رہے ہو اسی گلی میں ایک مسجد بنوادینا تاکہ اس میں آ کر لوگ اللہ کی یاد کیا کریں اور تمہیں دعا دیں دیبا کریں۔"

درویش کی بات ختم ہوئی تو بچے نے مسکرا کر کہا:

"بابا۔ جب میں بادشاہ بنوں گا تو مسجد ضرور بنواؤں گا۔"

درویش نے خوش ہو کر دعا دی:

"خدا تمہاری عمر دراز —"

درویش کہتے کہتے ایک دم خاموش ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بچہ ایک بار

پھر حیران ہوا:

"بابا۔ آپ رونے کیوں گے؟"

مگر درویش نے کوئی جواب نہ دیا اور اسی طرح اشکبار آنکھوں کے ساتھ اٹھ کر ایک طرف

روانہ ہو گئے۔

بچہ منہ کھولے کھڑا نہیں دیکھتا رہ گیا۔

درویش سے باتیں کرنے والا یہ بچہ حیدر علی خاں کا فرزند اقبال مند سلطان پٹو تھا۔

سلطان پٹو بڑی منتوں، امرادوں اور دعاؤں کے بعد دیون ہلی میں پیدا ہوا تھا۔ حیدر علی کی

پہلی بیوی معدور تھی۔ پھر اسی کے اصرار پر اس نے دوسری شادی کی تھی۔ جب دوسری بیوی سے

بھی مضمرد رازیم کوئی اولاد نہ ہوئی تو حیدر علی بچہ پریشان رہنے لگے۔

ان دنوں ارکاٹ کے درویش ولی مستان پٹو کے مزار کی کرامات کا دور دورہ تک چرچا

ہو رہا تھا۔ مستان پٹو دل کے مزار پر لوگوں کا ہر وقت، ہجوم رہتا تھا۔ مشور تھا کہ جس نے اس درپر

پہنچ کے مستان پٹو دل کی دعا مانگ کر اسے دعا مانگی اس کی دعا ضرور قبول ہوتی تھی۔

حیدر علی خود صوفی اور درویش خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس لیے انہیں صوفیوں اور

درویشوں سے دلی عقیدت تھی۔ مستان پٹو دل کے آستانے کی انہوں نے بھی شہرت سنی ان کی

بیوی کے کانوں تک محل کی عورتوں نے مستان پٹو دل کے فیوضِ برکات کے قصے پہنچائے تو ایک

روز بیوی نے میاں کے کان میں یہ بات ڈالی:

"دنیا والے دور دور سے مستان پٹو دل کے مزار پر آتے اور مرادوں کی بھولیاں بھر بھر کے لے جاتے ہیں مگر آپ کو تیر کو اس سے چھٹی نہیں ملتی کہ کسی اور طرف توجہ کریں۔"

بیوی کا طرز جائز تھا حیدر علی نام ہو کے بولے:
"نیک بخت۔ میں معروف تھا تو تم نے ہی کوئی قدم اٹھایا ہوتا۔ میں نے تمہیں منع نہوڑی
کر رکھا ہے۔"

حیدر علی کی ندامت میں بھی مردانہ شان تھی۔ بیوی جل اٹھی:
"میں ایک ہی پھرتی رہوں مزاروں پر۔ لوگ تو یہی کہیں گے کہ نواب حیدر علی خاں کو تو بچے
کی تمنا نہیں اور بیوی سے کہ مزاروں کے چکر لٹتی پھرتی ہے۔"
"ناراض نہ ہو بیٹم۔ بچے کی جتنی خواہش تمہیں ہے اتنی ہی مجھے بھی ہے۔" آخر حیدر علی کو
بھتیجا ڈالنے پڑے:

"تم جب کہو میں مزار پر حاضری کو جانے کے لیے تیار ہوں۔"
جب اور کب کا کیا سوال ہے نواب بہادر۔
بیوی کو غصہ آ گیا تھا:

"اب اور ابھی کیوں نہیں۔ ارکاٹ کوئی لالے کو سوں تو ہے نہیں کہ وہاں جانے کے خصوصی
انتظامات کرنے پڑیں۔"
"تو پھر چلو۔ ابھی اٹھ جاؤ۔ دیر کس بات کی؟ حیدر علی خاں نے فیصلہ کر دیا۔
نیک بیوی تو چاہتی ہی تھی۔ حیدر علی نے بند گاڑی منگوائی اور بیوی جس طرح بیٹھی تھی اسی طرح
اٹھ کے گاڑی میں جا بیٹھی۔

دونوں میاں بیوی اور ایک گاڑی۔ نہ کوئی پہرے دار نہ پہلی۔ دونوں آستانہ مستان
پٹوولی پر پہنچے تو جمعرات کا دن تھا۔ وہ بھیڑ بھڑکی کہ خدا کی پناہ۔
حیدر علی نے آستانہ کی مسجد میں نماز پڑھی۔ پھر دونوں نے مزار پر حاضری دی۔ پتہ نہیں
ان دونوں نے کن لفظوں میں دعا مانگی۔ شاید یہی کہا ہو گا کہ:

"اے خداوند۔ بابا مستان پٹوولی کی برکت سے ایک ایسا چاند سا بیٹا عطا کر جس کی چاندنی
پر رے برصغیر میں پھیل جائے۔"

بہر حال خدا نے ان کی دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ خزاں رسیدہ جن میں بہار آئی اور ان کے
گلشن میں وہ غنچہ پھوٹا جس کی خوشبو سے حریت پسندوں اور آزادی کے متوالوں کے دل دما رہے
ملک اٹھے۔

سلطان پٹوولی کی پیدائش ۲۰ ذی الحجہ ۱۱۶۳ھ مطابق ۱۷۵۱ء کو ہوئی۔ اس سپوت نے آگے
چل کر حیدر علی خاں کی قائم کردہ سلطنت خداداد کو عروج اور استقامت بخشا۔

اس اقبال مند بچے کا نام بھی پٹوورکھا گیا۔ پٹوولی کی پیدائش اس دعا کا نتیجہ تھی جو حیدر علی
اور ان کی بیوی نے مستان پٹوولی کے مزار پر حاضری کے وقت مانگی تھی۔ اس عقیدت کے
الہام میں حیدر علی نے بیٹے کا نام مستان پٹوولی کی نسبت سے "پٹو" رکھا تھا۔ پٹو کے معنی
"نیر" کے تلمٹے جلتے ہیں۔

حیدر علی خاں کو شیر پسند تھا کیونکہ وہ خود شیر صفت تھا۔ خوش قسمتی سے پٹو کو باپ سے
کہیں زیادہ شیر سے رغبت تھی اور وہ شیر کے شکا رکا شوقین ہونے کے علاوہ شیر کی بہادرانہ
صفات کو بھی پسند کرتا تھا۔

برصغیر کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہاں موہناٹے کرام کو اکثر وہیشتر شاہ کے لقب سے پکارا جاتا
تھا جس کے معنی سلطان یا بادشاہ کے ہوتے ہیں۔ پٹو کا خاندان بھی شیوخ اور موہناٹے کرام
سے تعلق رکھتا تھا اس لیے ممکن ہے کہ پٹو کو خاندانی نسبت سے سلطان یا شاہ کا لقب دے دیا
گیا ہو مگر اس کے بچپن کے تذکروں میں "سلطان" کا لقب نہیں ملتا۔

فرانسیسی تذکروں میں پٹو کے ساتھ "صاحب" کا لفظ ملتا ہے اور عام طور پر اسے پٹو صاحب
کہتے تھے۔ خود پٹو کو بھی سلطان کا لفظ پسند نہ تھا اور وہ خود کو شہری پٹو کہلوانا پسند کرتا تھا لیکن
انگریز مصنف اسے پٹو سلطان ہی کے نام سے پکار رہے ہیں۔ وہ صرف پٹو، شہری پٹو، پٹو
پٹو صاحب ہو یا سلطان پٹو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ وہ ہر حال میں سلطان پٹو
ہی تھا۔

سلطان پٹو کوئی شہزادہ نہیں تھا۔ وہ ایک فوجی افسر کا بیٹا تھا اور اس نے ایسے ہی ماحول
میں آنکھ کھولی۔ پھر جب وہ پانچ سال کا ہوا تو اس کے والد حیدر علی خاں نے اس کی تعلیم کا معقول
انتظام کیا۔ عربی، فارسی کے علاوہ پٹو کے لیے فرانسیسی اور انگریزی تعلیم کے استاد بھی مقرر
کیے تاکہ وہ اجنبی زبانوں میں مہارت حاصل کرے۔

واقعہ رہے کہ حیدر علی خاں خود ان پڑھ تھے۔

اس زمانے میں سب سے بڑا علم اور فن سپہ گری تھا۔ حیدر علی خاں نے پٹو کے لیے غازی
خاں کو فنون سپہ گری کی تربیت کے لیے مقرر کیا اور ان استادوں کی تربیت کا ہی نتیجہ تھا کہ

سلطان پیٹو نے مستقبل میں اپنے دوست اور دشمن، ہر ایک سے اپنی صلاحیتوں کا لوٹا منوالہ پھر جب وہ پندرہ سال کی عمر کو پہنچا تو اس نے ان زبانوں میں اس قدر مہارت حاصل کر لی کہ وہ ہر مرد و زن زبان میں لکھ پڑھا اور گنت ذکر سکھاتا۔

انہی دنوں یعنی مغورانِ شباب میں اسے کتب بینی کا شوق چرایا۔ وہ ہمہ وقت مطالعے میں غرق رہنے لگا۔

ایک دن وہ اپنے کمرے میں بیٹھا کسی کتاب کے مطالعے میں اس قدر محو تھا کہ اسے یہ خبر بھی نہ ہو سکی کہ اس کا باپ حیدر علی اس کے کمرے میں داخل ہو کے اس کے قریب آ گیا ہے۔ حیدر علی ایک خالص سپاہی تھا۔ اسے بیٹے کے اس انماک پر اس قدر پیش آیا کہ وہ زور سے گرج کر بولا:

”پیٹو! تمہیں عالم فاضل بن کے کسی مدرسے کا استاذ نہیں بننا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بڑی طرح ایک نڈر اور حوصلہ مند سپاہی بنو۔ اس لیے تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ تم اپنے مطالعہ پر سبایانہ زندگی کو ترجیح دو۔“

حیدر علی خاں نے اگرچہ پیٹو کی تعلیم کے لیے بھی استاد مقرر کیے تھے لیکن انہیں اس کا مطالعے میں اس قدر گہرا انماک جو اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دے، اس قدر ناگوار گزار کہ انہوں نے پیٹو کو اس قدر غصے سے تاکید اور تنبیہ کی جس کا اظہار پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ حیدر علی خاں کا ایک اور بیٹا بھی بنایا جاتا ہے مگر واقعات اور حالات یہی بتاتے ہیں کہ ان کی امیدوں کا مرکز صرف اور صرف سلطان پیٹو ہی تھا۔

حیدر علی خاں غصے میں پھرے ہوئے پیٹو سلطان کے کمرے سے باہر نکلے تو ان کو پیٹو کی والدہ نظر آئیں۔ غلطہ بیگم عرف فخر النساء، حیدر علی خاں کی دوسری بیوی تھیں اور انہیں سلطان پیٹو کی والدہ ہونے کا فخر حاصل تھا۔ ایک تو چھٹی بیوی، پھر دلی مدد کی والدہ۔ اس لیے حیدر علی خاں ان کا بہت لحاظ کرتے تھے مگر اس وقت وہ اس قدر غصے میں تھے کہ انہیں دیکھتے ہی بولے:

”دیکھتی ہیں فخر النساء! اپنے لاڈلے کی حرکتیں؟“
فخر النساء اگرچہ حیدر علی خاں کی تمام ڈانٹ پھٹکار سن چکی تھیں مگر اس گھڑی بالکل افسان بن گئیں:

”کیا غضب ہو گیا۔ کیا باری حرکت کی ہے میرے بیٹے نے؟“

حیدر علی اسی طرح غصے میں بولے:

”آپ کے بیٹے نے تلوار کو میان میں زنگ لگنے کے لیے ڈال لیا ہے اور کتابوں کا کھڑا بن گیا ہے۔“

”میں آپ کی بات سمجھ نہیں پاتی۔ کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟“ فخر النساء صرف اور زیادہ اہٹان بنیں بلکہ مسکرا بھی دیں۔

”فخر النساء! آپ بیٹے کی حرکت پر مسکرا رہی ہیں!“ حیدر علی خاں پیٹو کو جھوڑ کر بیوی پر برس پڑے۔

فخر النساء کو شاید حیدر علی خاں کے غصے میں کچھ لطف آ رہا تھا اس لیے انہوں نے لگی میں ذرا اور گکادی۔ بولیں:

”آپ کے خیال میں مجھے اس وقت رونا چاہیے!“
فخر النساء کے الفاظ اور انداز میں گہرا طنز تھا۔ حیدر علی خاں کا چہرہ لمحہ بھر کو متغیر ہو گیا مگر وہ مضبوط کر گئے۔

”فخر النساء بیگم!“ انہوں نے زور دے کر کہا:
”ہم خاصی سمجھدار خاتون ہیں۔ آپ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتیں؟“
”یہی تو کہہ رہی ہوں۔ تجھے سمجھائیے نا!“

”میں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مہاجر دادے تلوار چھوڑ کر مطالعہ سے دل لگا بیٹھے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے پڑھ لکھ کے کسی کتب میں مدد سی کریں گے۔ حیدر علی خاں نے اپنے طور پر بیوی کو سمجھایا۔

فخر النساء بیگم پر اس کا اٹا اثر ہوا۔ بگڑ کر بولیں:
”نواب حیدر علی خاں!“

بیگم نے اتنے زور سے کہا کہ راہداری سے گزرتی ہوئی کینز ٹھٹھک کر رک گئی۔ حیدر علی خاں حیرت سے بیوی کا منہ دیکھنے لگے۔

ایک لمبی سانس لے کے فخر النساء نے اپنا جملہ مکمل کیا:
”آپ کے خیال میں پڑھنا لکھنا اور مطالعہ کرنا ایک کا باعث ہے اور جو کچھ ہے وہ صرف تلوار ہے۔ میں آپ کی اس منطق کو پسند نہیں کرتی۔ علم اپنی جگہ اور سپہ گری اپنی جگہ۔ ہاں یہ ضرور ہے

کہ فن سپہ گری، علم کو کچھ نہیں دے سکتا جبکہ علم، سپہ گری پر احسان کرتا ہے کیونکہ تعلیم ہی سے فن سپہ گری میں جلد پیدا ہوتی ہے۔ حکمتِ علمی تیار کرنے میں صرف علم کام آتا ہے۔ عقل راہ میں دکھاتی ہے اور عقل اکثر علم کی محتاج رہتی ہے۔

حیدر علی خاں خود علم سے نابلد تھے اور خطاب نہ پڑھ سکتے تھے لیکن اللہ نے انہیں عقل اور سمجھ بہت عطا کی تھی اور اسی کے زور پر آج وہ اس مقام تک پہنچے تھے۔ وہ فرانسائیسی علمی اور مدتل باتیں پوری طرح تو نہ سمجھ سکے مگر ان کی سمجھ میں یہ ضرور آگیا کہ اگر انہوں نے بات آگے بڑھائی تو بیوی انہیں "بے علمی" کا طعنہ ضرور دے دیں گی۔ اسی لیے وہ خاموشی سے باہر چلے گئے۔

قبل اس کے کہ ہم شیردکن سلطان ٹیپو کے حالات پر آگے بڑھیں، بہتر ہو گا کہ اس شیر کے خاندانی حالات اور اس کی جنوبی ہند میں آمد کے بارے میں مختصر طور پر کچھ بیان کر دیا جائے۔ تو آئیے پہلے اس طرف توجہ دیتے ہیں۔

جنوبی بھارت میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ کب شروع ہوا، اس کے متعلق صحیح طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ تاریخ سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ آغاز اسلام ہی سے مالا بار اور کوکن میں مسلمانوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ مالا بار کا ضلع میسور کے جنوب میں اور کوکن، میسور کے شمال میں واقع ہے۔

ایک قیاس یہ بھی ہے کہ جنوبی بھارت میں ملک عرب سے آنے والے اولیاء اللہ اور اسلامی مبلغین نے اسلام پھیلایا اور ان کی کوششوں سے وہاں مسلمانوں کی آبادی ہوئی۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ جزیرۃ العرب اور جنوبی بھارت میں زمانہ قدیم سے تجارت کا سلسلہ جاری تھا اور عرب تاجر یہاں اکثر آیا کرتے تھے۔ پھر جب عرب میں اسلام پھیلنا تو مسلمان عرب تاجر جنوبی بھارت یعنی مالا بار اور کوکن وغیرہ آتے جاتے رہے۔ اس طرح وہاں اسلام پھیلنا۔

ظاہر ہے ای تنازعاتی جاذبوں پر مسلمان عرب ملاح بھی جنوبی بھارت آتے تھے۔ ان میں سے کچھ وہاں آباد بھی ہو گئے اور پھر ان کی تعداد آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔

جنوبی ہند میں نواب حیدر علی خاں کے زمانہ میں مالا بار کے علاقہ میں بہت کثرت سے مسلمان آباد تھے۔ ان مسلمانوں کو پالہ کہا جاتا تھا۔ اس کا پتہ تو نہیں چل سکا کہ ان کو پالہ کیوں کہا جاتا

تھا لیکن یہ ضرور معلوم ہوا کہ پالہ مسلمان بہترین ملاح ہوتے تھے اور جب نواب حیدر علی خاں نے ایک بحری بیڑے کی ضرورت محسوس کی تو انہیں پالہ مسلمانوں کی صورت میں بہترین بحری فوجی دستیاب ہوئے تھے۔

جنوبی ہند میں مسلمانوں کی موجودگی کا پتہ مشہور سراج ابن بطوطہ کے سفر نامے سے بھی ملتا ہے جب ملک کافور نے میسور پر حملہ کیا تو دہاں کے ہندو راجہ بلال دیو سوم کے پاس ۲۰ ہزار مسلمان سپاہی موجود تھے۔

ابن بطوطہ اپنے سفر نامے میں لکھتا ہے:

”راجہ بلال دیو حاکم و ہور سمند میسور کے پاس بیس ہزار مسلمانوں کی فوج تھی جن میں زیادہ تر جنگی قیدی اور غلام تھے۔“

مسلمان جنگی قیدیوں اور غلاموں کا تذکرہ ہوئے سالاکا تاریخ میں بھی ملتا ہے جس میں لکھا ہے کہ حاکم بلال دیو یا بلال دیو نے کوکن پر کئی بار حملہ کیا تھا اور اس کی وجہ سے کوکن سے مسلمان قیدی آئے تھے۔

اس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ دکن میں ملک کافور سے پہلے بھی مسلمان آباد تھے جنہیں ملک کافور کے حملے کے بعد اسیمیت حاصل ہوئی۔

ملک کافور کا نام آیا ہے تو اس کے حملہ کی تھوڑی سی تفصیل بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ اس لیے کہ اسی حملے نے دکنی بھارت میں مسلمانوں پر بہت اثر ڈالا تھا۔

ملک کافور دراصل سلطان علاء الدین خلجی کا ایک زرخیز غلام تھا جو بعد میں اس کا جنرل بنا اور جنوبی ہند میں علاؤ فوجوں کی کمان کی۔

سلطان علاء الدین سے پہلے دہلی میں جو بادشاہ اور سلطان ہوئے انہوں نے شمالی ہند پر ہی اپنی توجہ رکھی۔ حالانکہ خاندانِ غلاماں کے سلطان الغنیش، سلطان بلبن وغیرہ بڑے زبردست بادشاہ گزرے ہیں اور وہ چاہتے تو جنوبی ہند کو فتح کر سکتے تھے مگر ان کی توجہ اس طرف نہیں گئی اور یہ اعزاز سلطان علاء الدین خلجی کے حصہ میں آیا۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ برصغیر میں دو مسلمان بادشاہ ایسے ہوئے ہیں جو بالکل ان پڑھ تھے لیکن اپنی ذاتی صلاحیتوں کی بنا پر انہوں نے بڑا عروج پایا۔

ان میں سے ایک بادشاہ مغلیہ خاندان کا جلال الدین اکبر ہے جس کے مذہبی رجحانات سے

اتفاق نہ کرتے ہوئے بھی اسے "اکبر اعظم" تسلیم کیا جاتا ہے۔ اکبر بالکل اُن پڑھ تھا اور شاید اسی بنا پر اس نے ایک نیا دین جاری کیا جسے دین الہی کہا گیا لیکن یہ خود اس کے قریب ترین احباب میں بھی مقبول نہ ہو سکا۔

اسی طرح دہلی کے مغل خاندان سے پہلے خلجی خاندان کا سلطان علاء الدین خلجی بھی تعلیم سے بالکل نااہل تھا لیکن وہ بڑا جری، نڈر اور ذہین تھا۔

علاء الدین خلجی پر بھی جلال الدین اکبر کی طرح ایک نیا مذہب جاری کرنے کا ضبط سوار ہوا۔ اس نے سنا تھا کہ مذہب اسلام جاری کرنے والے نبی آخر الزماں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چار یار یعنی چار نائب تھے جن کے زور پر اسلام پھیلا۔ چنانچہ اس نے اپنے نئے مذہب کے لیے اسکا کو جواز بنایا اس نے کہا:

"جس طرح باقی اسلام کے چار نائب حضرت ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ تھے اسی طرح میرے بھی چار نائب موجود ہیں۔"

یہ نائب تھے:

۱۔ فخر خاں

۲۔ الف خاں

۳۔ نصرت خاں

۴۔ اہپ خاں

بلکہ شبہ علاء الدین کے یہ چاروں جرنیل اپنی مثال آپ تھے اور اس کی سلطنت انہی چار ختنوں پر قائم تھی۔

نیا مذہب جاری کرنے کے علاوہ اس کا دوسرا منصوبہ یہ تھا کہ وہ سکندریہ عظمیٰ کی طرح اپنا لشکر لے کر نکلے اور تمام دنیا کو فتح کر لے۔

وہ اپنے ان دونوں منصوبوں کو بے دھڑک دربار میں بیان کرتا مگر لوگ اس کے خون کی وجہ سے اس پر نہ تو اعتراض کرتے اور نہ مخالفت کی مجال رکھتے تھے۔

جب اس کے ان منصوبوں کا چرچا دربار سے عوام میں پہنچا تو وہاں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ اور لوگوں نے اس کے منصوبوں کی مخالفت شروع کر دی۔ آخر لوگوں کو ایک ایسے شخص کی تلاش ہوئی جو سلطان تک ان کے خیالات پہنچا لے۔

اس زمانے میں علاء الملک ہی ایک ایسی ہستی تھی جس کی بابت سلطان توجہ سے سنا بھی تھا اور مانتا بھی تھا۔

پس عوام کا وہ علاء الملک کے پاس پہنچا اور ان سے عرض کیا:

"محترم و مکرم علاء الملک صاحب! آپ نے بھی سلطان معظم کے منصوبے سنے ہوں گے براہ کرم آپ سلطان کو ایسے خام خیالات سے باز رکھنے کی کوشش کیجیے ورنہ لوگوں میں بغاوت پھیل جانے کا خطرہ ہے۔"

علاء الملک عوامی نمائندوں کے خیالات اور گفتگوؤں کے پریشان ہو گئے۔ وہ خود سلطان کے ان منصوبوں کے سخت خلاف تھے۔ انہوں نے وفد کو مطمئن کر کے واپس کر دیا اور خود سلطان کے پاس پہنچے۔

علاء الملک: ہم تمہیں یاد کر رہے تھے۔ اچھا ہوا کہ تم خود آ گئے۔ سلطان نے انہیں دیکھا تو مسکرا کر کہا۔

"میں حاضر ہوں۔ ارشاد فرمائیے۔ کیا حکم ہے؟"

علاء الملک خود شکوہ کرنے آئے تھے لیکن جب سلطان کو گفتگو پر آمادہ پایا تو بات اسی پر ڈال دی۔ سلطان نے کہا:

"ہم نے دربار میں اپنے دو منصوبوں کا ذکر کیا تھا 'وہاں تم بھی موجود تھے لیکن تم نے ہمیں کوئی مشورہ نہیں دیا۔"

علاء الملک کو بولنے کا موقع مل گیا:

"سلطان معظم! اس نے ادب سے عرض کیا:

"میں آپ کو مشورہ تو نہیں دے سکتا۔ بل اس سلسلے میں کچھ گزارشات ہیں۔ حکم ہو تو عرض کروں؟"

"ضرور۔ سلطان نے بڑی شگفتگی سے کہا:

"وہی تو ہم سنا چلے تھے ہیں۔"

علاء الملک نے بڑی متانت سے کہا:

"سلطان عالی مقام! جہاں تک نئے مذہب کو جاری کرنے کا تعلق ہے اس کے لیے عرض یہ ہے کہ بنی اقتدار اور سلطنت سے نہیں ہوا کرتے بلکہ وہ مذاٹے ذوا بجلال کی طرف سے مبعوث ہوتے ہیں۔"

ہماری سلطنت دہلی یعنی غلجی حکومت تو ایک اسلامی حکومت ہے اور مسلمان ہمارے رسول محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی آخرا زماناں مانتے ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ اب کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اس لیے اگر آپ نے نبوت کا دعویٰ کیا اور کوئی یا مذہب جاری کرنے کی کوشش کی تو تمام مسلمان آپ کے خلاف بغاوت کر دیں گے۔

اب رہا آپ کا دوسرا منصوبہ یعنی تسخیر عالم کا خیال تو یہ کچھ بڑا ارادہ نہیں لیکن مکندہ عظم جس نے تسخیر عالم کا منصوبہ بنایا تھا اس کے پاس ارسطو جیسا باتدبیر وزیر اور استاد موجود تھا جس نے اس کی سلطنت سنبھالے رکھی۔ آپ کے پاس کوئی قابل وزیر نہیں جو آپ کی عدم موجودگی میں غلجی سلطنت کو سنبھال سکے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ابھی سلطنت غلجی کے تحت برصغیر کے بہت سے علاقے نہیں آئے ہیں۔ پھر کیوں نہ تسخیر عالم کے بجائے پورے برصغیر کی تسخیر کے لیے علاقائی لشکر کو استعمال کیا جائے۔

سلطان علاء الدین غلجی اُن پڑھ ہونے کے باوجود بڑا ذہین تھا۔ علاء الملک کی کئی ہونی دروں باتیں اس کی سمجھ میں آگئیں اور اس نے اپنے دو ذوں منصوبوں کو اپنے دل ہی میں دفن کر دیا اور پھر کبھی ان کا تذکرہ نہیں کیا۔

اس نے اپنے دو ذوں منصوبوں کو ختم ہی نہیں کیا بلکہ علاء الملک کے بچانے پر برصغیر کے ان علاقوں کو تسخیر کرنے کا فیصلہ کر لیا جو اب تک سلطنت دہلی میں شامل نہیں ہوئے تھے۔

شمالی ہند کی تین بڑی ہندو ریاستیں اب تک سلطنت دہلی کے ماتحت نہیں آئی تھیں۔ یہ تین ریاستیں تھیں:

۱۔ گجرات

۲۔ رنجپور

۳۔ چتوڑ

ریاست گجرات پر سلطان محمود غزنویں اور سلطان قطب الدین ایبک نے حملہ کیا تھا مگر انہیں غزنی یا دہلی کی ریاستوں میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ سلطان غلجی نے سب سے پہلے اپنے لشکر کو گجرات پہ حملہ کرنے کا حکم دیا۔

الغ غاب و نعت نہاں۔ علاقائی لشکر کے ساتھ گجرات پر حملہ آور ہوئے۔ دہلی کا راجہ کن اپنی

رافی کلا دیوی کو چھوڑ کر جنوبی ہند کی ریاست دیوی گری بھاگ گیا اور رافی کلا دیوی خود اپنی مری سے مسلمان ہو کر سلطان غلجی کے حرم میں داخل ہوئی۔

اس سے دو سال بعد یعنی ۱۲۱۹ء میں سلطان غلجی کے انہی دو درجنیلوں نے رنجپور پر حملہ کیا اس حملہ میں نصرت خاں ایک حادثے کا شکار ہو کر مر گیا تو سلطان علاء الدین خود دہلی پہنچا اور رنجپور کو فتح کر کے سلطنت میں شامل کر لیا۔

شمالی ہند کی تیسری بڑی ریاست میواڑ کی تھی۔ اس کا قلعہ چتوڑ مسلمانوں کے دست برد سے آج تک محفوظ تھا۔ اس کا محل وقوع اس قسم کا تھا کہ اسے ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ قلعہ پر حملہ میں سلطان غلجی نے خود بھی حصہ لیا اور اس حصار سے فتح کر لیا۔

قلعہ چتوڑ کے سلسلے میں بعض مؤرخین نے بغیر تحقیق کے چتوڑ کی رافی پدمنی اور سلطان علاء الدین غلجی کا اس پر عاشق ہوجانے کا ایک فرضی قصہ بیان کیا ہے۔ یہ قصہ بھی دراصل اسی سازش کا ایک حصہ ہے جس میں برصغیر کے ہندوؤں اور بدیسیم حکمرانوں یعنی انگریزوں نے گھڑ جوڑ کر کے مسلمان بادشاہوں اور سلطانوں کو بدنام کرنے کی کوشش کی تھی۔

اس قصہ کی حقیقت یہ تھی کہ فتح چتوڑ کے ۲۰ سال بعد قلعہ جاسی کے ایک شاعر نے جس کا نام ملک محمد ہالسی تھا، ایک منظوم قصہ لکھا جس میں سلطان غلجی کا رافی پدمنی سے عشق کا قصہ بیان کیا کہ سلطان غلجی آئیے ہیں رافی کا کس دیکھ کر اس پر عاشق ہوا، پھر اسے زبردستی دہلی کے قلعے میں لے جانا اور راجپوتوں کا ڈولوں میں بیٹھ کر قلعہ دہلی میں جانا اور دہلی سے رافی کو چھڑا کر واپس لانا، وغیرہ وغیرہ بیان کیا گیا ہے۔

ملک محمد ہالسی کی یہ منظوم داستان اسی طرح کی ہے جس طرح بغداد کے عباسی خلیفہ کو بدنام کرنے کے لیے الف باغی لکھی گئی تھی۔ چونکہ نظم و نظم دیکھتے تھے اس لیے ہندو اور انگریز گھڑ جوڑنے سے برصغیر کی تاریخ میں شامل کر دیا تاکہ وہ عظیم الشان سلطان جس نے پہلی مرتبہ جنوبی ہند کو فتح کیا تھا اسے بدنام کیا جائے۔

مخاتمہ شکر ہے کہ پاکستان میں کبھی جانے والی تواریخ میں اس واقعہ کو ایک نوٹ لکھ کر حزن کر دیا گیا ہے مگر بعض تاریخی افسانے لکھنے والے اب بھی اس واقعہ کو تاریخی قصہ اور تاریخ کا حصہ بنانے اور سلطان غلجی کی بدنامی کا داغ خود اپنے دامن پر لگتے ہیں۔

بہر حال —

یہ ایک الگ مسئلہ ہے اور اس پر بحث کا یہ موقع نہیں۔ سلطان علاء الدین خلجی کے ذکر سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس سلطان نے پہلی مرتبہ جنوبی ہند کی تسخیر کی۔
۱۳۰۷ء میں علاؤ الدین شکر ملک کا فوجی سرکردگی میں دیوی گری پہنچا۔ اس کی فتح کے بعد دارنگا و دارمدر اور مجر و بھرہ نے اطاعت قبول کر لی اور بہت سے مسلمان جنوبی ہند کے علاقوں میں آباد ہوئے جس کا ذکر ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں کیا ہے۔
سلطان بیٹو کے آباد اجداد کے نام دکنب لکھنؤ وطن کے بارے میں بہت سی روایتیں مشہور ہیں لیکن ہمارے خیال میں سلطان کے بزرگ مسلمان اور صرف مسلمان تھے۔ اور مسلمان ہونا ہی ایک طرہ امتیاز ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلم قوم ہی کو دنیا کی اعلیٰ ترین قوم کہا ہے۔ اس لیے کسی کو ذات برادری کی وجہ سے بلند درجہ دینا منطوق ہے بلکہ اصل بات اس کا ذاتی کردار ہے جیسا کہ حالی نے کہا ہے:

زمانہ نسب کو نہ پوچھے گا ہے کیا
مگر دمیت ذاتی کا رُنگ نہ گئے گا

سلطان کے آباد اجداد کے بارے میں مختصر آئیوں کہا جاسکتا ہے کہ ۱۶۲۰ء میں پنجاہ سے آنے والا ایک قافلہ دہلی ہوتا ہوا جنوبی ہند کے اس شہر میں پنجاہ جات شاد بندہ نواز گیسو دراز کو ملا۔
ہیں اور ان کی درگاہ مرجع خلافت ہے۔

اس قافلہ میں ایک افغان خاندان تھا۔ دلی محمد خاں نام کا ایک صوفی عشق بزرگ صورت انسان اس خاندان کا سربراہ قتلہ واضح رہے کہ بعض مورخوں نے اس خاندان کو پنجاب کا بیان کیا ہے۔
دلی محمد خاں کو حضرت بندہ نواز سے بے پناہ عقیدت تھی اور یہ عقیدت ہی انہیں پنجاب سے گلبرگہ پھینک لائی تھی۔ گلبرگہ کا علاقہ ریاست بیجا پور کے ماتحت تھا اور اس وقت بیجا پور پر عادل شاہ حکمرانی کر رہا تھا۔

دلی محمد خاں اپنے اہل و عیال کے ساتھ اس درگاہ شریف میں اترے تو ان کی درویشی اور بزرگی سے حائر ہو کر درگاہ کے متوقی نے درگاہ کی طرف سے ان کے اخراجات کے لیے وظیفہ بفرست کر دیا اور اپنی بیٹی کی شادی دلی محمد کے بیٹے محمد علی سے کر دی۔

دلی محمد خاں کا دل گلبرگہ سے اچھا ہوا تو وہ بیجا پور پہنچے۔ درجہ بیجا پور پر زوال آیا تو نقل مکانی کر کے کرناٹک کے قصبہ کولار چلے گئے۔ حاکم کولار شاہ محمد دلی نے ان کی بہت

آؤ بگت کی۔

دلی محمد خاں کے چار بیٹے تھے:

فتح محمد محمد امام محمد ایاس محمد علی

یہ تمام بیٹے درویشی کے بھاٹے سپاہیانہ زندگی کو پسند کرتے تھے۔ چنانچہ باپ کی وفات کے بعد یہ چاروں تلاش معاش میں ادھر ادھر نکل کھڑے ہوئے۔

فتح محمد خاں نے نواب ارکاٹ سعادت اللہ خاں کے اہل ملازمت کی اور اپنی ذاتی استعداد اور کارکردگی سے علم، نفاذ اور مانتی کا اعزاز حاصل کیا۔

فتح محمد نے بنجارہ کی ایک درویش زادی سے شادی کی جس سے دو بچے شہناز اور حیدر علی پیدا ہوئے۔ یہی حیدر علی خاں، سلطان بیٹو کے والد بزرگوار ہیں۔

حیدر علی خاں کے حالات زندگی اور ان کے مہماندہ کارنامے تاریخ برصغیر کا ایک الگ باب ہیں جنہیں دو پیا ر صفحات میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

چونکہ اب سلطان بیٹو کے کارناموں اور واقعات کو تفصیل سے بیان کیا جا رہا ہے اس لیے ہم گزشتہ واقعات کو نہیں دہرائیں گے۔ نواب حیدر علی خاں اور سلطنت خداداد میسور کے سلسلے میں صرف یہ بات یاد رکھیے کہ جس وقت نواب نے ریاست میسور کی ملازمت اختیار کی تو دہلی کا راجہ اوڈیر خاندان کا ہندو راجہ کرشنا اوڈیر حاکم تھا اور ریاست میسور صرف ۳۲ گاؤں پر مشتمل تھی مگر جب حیدر علی خاں نے اس ریاست کا نظام خود سنبھالا تو ۳۳ گاؤں کی یہ ریاست ۸۰ ہزار مربع میل تک وسیع ہو گئی۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ نواب حیدر علی خاں اور ان کے سپوت سلطان بیٹو نے اس ریاست کو وسعت دینے کو کیا کچھ نہ کیا ہو گا۔

سلطان کو حیدر علی خاں نے ایک بار بچپن میں سخت تنبیہ کی تھی کہ وہ کتا بی کیرا بننے کی بجائے سپاہیانہ زندگی اختیار کرے۔ شاید اس تنبیہ اور نصیحت کا ہی نتیجہ تھا کہ جب وہ پہلی مرتبہ "پہلی جنگ میسور" میں بحیثیت ایک جرنیل کے شامل ہوا تو اس نے حیدر علی پر ثابت کر دیا کہ اس نے ان کی نصیحت پر پورا پورا عمل کیا ہے۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سلطان بیٹو نے پہلی جنگ میسور سے پہلے میدان جنگ کی صورت ہی نہیں دیکھی تھی۔ ۱۷۶۲ء میں جب اس کی عمر صرف گیارہ سال تھی تو نواب حیدر علی خاں نے اپنے اس

پالیکاروں کے سردار کو جب اپنی عورتوں کی گرفتاری کی خبر ملی تو اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ وہ چند مصاحبوں کو ساتھ لے کر نواب حیدر علی خاں کے سامنے پیش ہوا اور ان سے اپنی عورتوں کی رہائی کی درخواست کی۔

نواب بہادر نے ان کی درخواست منظور کی اور عورتوں کو رہا کر دیا۔ پالیکار ان کے اس قدر احسان مند ہوئے کہ انہوں نے عورتوں کے صلے میں نواب کو کئی دانت اور جو اہرات سے لبرس ہوئے ۵۰ روٹ نذر کیے اور اطاعت و وفاداری کی قسم کھائی۔

اس سے اگلے سال یعنی ۱۷۶۶ء میں میسور کے راجہ کرشن اوڈیر کا انتقال ہو گیا۔ یہ اوڈیر خاندان کا سولہواں راجہ تھا۔

راجہ کرشن اوڈیر نے حیدر علی خاں کے خلاف کئی بار بغاوت کرائی اور اسے قتل کرانے کی کوشش کی اس لیے حیدر علی خاں نے مجبور ہو کر اسے ریاست کے انتظامی معاملات سے بالکل بے دخل کر دیا تھا تاہم اس کی شان و شوکت برقرار رکھی تھی اور اسے اخراجات کے لیے معقول وظیفہ دیا جاتا تھا۔

حیدر علی خاں نے اگرچہ ریاست کے تمام اختیارات ہاتھ میں لے لیے تھے مگر راجہ کو تمام تہواروں پر دربار منعقد کرنے کی اجازت تھی اور اسے حسب سابق نذریں پیش کی جاتی تھیں۔ خود حیدر علی خاں ایک ملازم کی حیثیت سے دربار میں پیش ہوتے اور راجہ کے حضور نذر گزارنے مگر راجہ ہمیشہ ان کا مخالف ہی رہا اور انہیں نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا۔ راجہ کرشن اوڈیر کے کوئی اولاد نہ تھی اس لیے اس کے جانشین کے انتخاب کا مسئلہ اٹھا۔ اس موقع پر نواب حیدر علی خاں نے راج محل میں دربار لگایا اور اوڈیر خاندان کے ناکم بچوں کو اس دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔

جس وقت بچے دربار میں آئے تو ان کے لیے ہزاروں قسم کے کھلونے دہاں موجود تھے۔ حیدر علی نے بچوں سے کہا کہ وہ اپنی اپنی پسند کے کھلونے اٹھالیں اور انہیں اپنے ساتھ گھر لے جائیں۔ بچے کھلونے دیکھ دیکھ کر بے حد خوش ہو رہے تھے۔ جب نواب نے انہیں اپنی پسند کے کھلونے اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی تو وہ کھلونوں پر لوٹ پڑے اور ہر ایک نے اپنی اپنی پسند کے کھلونے اٹھالے۔

نواب حیدر علی خاں اپنے سرداروں اور شہزادہ بیسور کے ساتھ کچھ ددر بیٹھ بچوں کی کھلونوں کے

شہزادے کو ہاتھ لگاتے ہوئے بد نور اور کنار وغیرہ کے میدانوں میں اپنے ساتھ رکھ کر ان جنگوں کے دوران حیدر علی لشکر کو دور دراز اور دشوار گزار پہاڑی راستوں سے گزرنے پر ابلا اور طرح طرح کے تنگ ایف اٹھانا پڑے۔ اس وقت شہزادہ بھی لشکر میں موجود تھا اور اس نے جنگ کے سرداروں کو دیکھے تھے۔

میسور کی جنگ اول سے پہلے ۱۷۶۵ء میں شہزادہ بیسور بھی ایک اور معرکہ میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ معرکہ کرگ کی سرحد پر پالیکاروں کی بغاوت کا ہے۔

شہزادہ بیسور کی عمر اس وقت پندرہ سال کی تھی۔ کرگ کی سرحد کے پالیکاروں نے متحد ہو کر نواب حیدر علی خاں کے خلاف بغاوت کر دی اور ایسی جرات کا منہ ہو گیا کہ سرنگاپٹم جو ریاست میسور کا دارالسلطنت تھا، کے علاقوں میں داخل ہو گئے۔

اس وقت حیدر علی خاں بد نور، چیتیل، دنگ، فتح کرنے کے بعد مالابار کی طرف بڑھ رہے تھے اس دوران انہیں دوبارہ مرہٹوں سے سابقہ پڑا۔ انہیں شکست دینے کے بعد حیدر علی خاں کالی کٹ کے ان پالیکاروں کی سرکوبی کے لیے بڑھے۔

سب سے پہلے حیدر علی خاں نے تعلقہ بل کے پالیکاروں پر چڑھائی کی۔ اس علاقہ کے لوگ معاہل و میل کے قریبی جنگل میں جا چھے۔ حیدر علی خاں نے بل پر قبضہ کیا اور بیڑوں کی آڑ بیٹے ہوئے جنگل میں چھپے ہوئے پالیکاروں کے عقب میں پہنچ گئے۔ وہاں سے حیدر علی لشکر پالیکاروں پر برقی کرگرا۔

اس معرکہ میں ہزاروں کی تعداد میں پالیکار مارے گئے۔ کچھ بھاگ نکلے اور باقیوں نے معافی مانگ کر پناہ حاصل کی۔

ادھر تو حیدر علی خاں اس معرکہ میں مصروف تھے اور ان سے کچھ نا صلہ پر شہزادہ بیسور ایک اور مهم سر کرنے میں مشغول تھا۔

شہزادہ تین ہزار کی فوج لے کر پیچھے جنگل میں جا گھسا اور اس نے پالیکاروں کی سپلائی لائن پر قبضہ کر لیا۔ لطف کی بات یہ تھی کہ اس سپلائی لائن پر پالیکاروں کی عورتوں کی ڈیوٹی تھی۔ شہزادے نے تمام عورتوں کو گرفتار کر کے سپلائی لائن کاٹ دی اور قیدی عورتوں کو حیدر علی خاں کے سامنے پیش کیا۔

نواب بیسور کی اس کارکردگی سے بہت خوش ہوئے اور اسے داد دی۔

تفہیم میں اس مرتبہ ان کے لباس اور ترتیب میں رنگوں کے انتخاب پر جو خاص توجہ دی تھی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں انہوں نے ایک منظم اور مضبوط لشکر تیار کر لیا۔

ان کے لشکر کے سواروں کی دردیاں اس قسم کی تھیں کہ وہ ددر سے پھر ہر سے اڑتے دکھائی دیتے تھے۔ ہندو نہیں کی دردیاں سبز، سرخ، زرد اور سیاہ بانات سے تیار کی گئی تھیں۔ حیدر علی کے لشکر میں تین ہزار سواروں پر مشتمل ایک آہن پوش دستہ تھا۔ اس کے علاوہ ایک ہزار سواروں کا ایک دستہ شتر سواروں کا تھا۔ یہ اونٹ انہوں نے دشمن کی فوجوں سے حاصل کیے تھے۔ پیادہ فوج میں سولہ ہزار باقاعدہ فوجی تھے۔ چالیس ہزار کے قریب کرناٹکی پیادے اور میں ہزار جنگی سوار تھے۔ نواب حیدر علی کے اس عظیم لشکر سے انگریز گھرانے بچے تھے۔

کرناٹک کے محمد علی خاں نے نواب ہشتنگا ہی نظام حیدر علی کی سیادت کا جوا اپنے کانڈھوں سے اتار پھینکا تھا۔ والی دکن نواب نظام علی خاں نے بھی اس منہ زور کو ہلکا دینے کے لیے شکر آباد کرنا شتر و عاکو دیا تھا مگر والا جاہ اور انگریزوں سے لگھوڑے وہ گھراٹا تھا اس لیے نواب حیدر آباد نے حیدر علی خاں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں اس نے نواب حیدر علی خاں کو ایک خط لکھا جس کا متن کچھ اس طرح تھا:

مناجر ہمیشہ انگریز کرناٹک کے سرکش صوبے دار کے ذریعے اپنی حکمرانی کے لیے زمین ہموار کر رہے ہیں۔ انہوں نے کرناٹک پر مکمل طور پر اپنا تسلط حاصل کیا ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ آپ کے تعاون سے اس علاقے (کرناٹک) کو دوبارہ اپنے قبضے میں لے لیں۔

نظام حیدر آباد کا یہ خط حیدر علی خاں کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی کرناٹک کے نواب والا جاہ محمد علی خاں کے پاس پہنچ گیا۔

نظام حیدر آباد کا یہ خط افشا ہونے اور خط والا جاہ کے پاس پہنچ جانے کے پس منظر میں ایک عجیب داستان جمت ہے۔ اس داستان میں نہ صرف عشق کی کار فرمایاں اور بوجھیاں ہیں بلکہ داستان کے کرداروں نے اپنے ذاتی مفاد کی بنا پر کچھ ایسے اقدام کیے جنہوں نے جنوبی ہند اور

سلسلے میں چھینا چھٹی بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ مکمل کرنے اٹھانے کے بعد نواب کے حکم سے تمام بچوں کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا۔ تب نواب نے ہر بچے کے ہاتھ میں کپڑے ہوئے کھلونے کو دیکھا۔ ان میں ایک بچہ ایسا تھا جس نے کسی کھلونے کے بجائے اکلون کے ساتھ پڑی ہوئی بھوٹی سی تلوار اٹھالی تھی اور اس کے دوسرے ہاتھ میں چند لیموں تھے جسے وہ بچہ تلوار سے کاٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔

نواب حیدر علی نے نئے راجہ کا اعلان کیا۔ انہوں نے کہا: "اب تمام بچوں میں صرف ایک بچہ میسور کا راجہ بننے کے قابل ہے اور وہ بچہ اپنے ہاتھوں میں تلوار اور بچوں کی پٹے ہوئے ہے۔"

غلاموں نے فوراً اس بچے کو نواب بہادر کے سامنے پیش کیا۔ نواب بہادر نے اس بچے کو مقبلی کرنے کی رسم ادا کرائی اور اس کے راجہ میسور ہونے کا اعلان کر دیا۔

اس کے باوجود ہندو اور انگریز مورخ نواب بہادر کو غائب کہتے ہیں۔ اگر نواب بہادر غائب ہوتے تو اوڈیر خاندان کے بچے کے بجائے اپنے بیٹے کو راجہ میسور بناتے۔ انہیں اس اقدام سے کون روک سکتا تھا؟

اس جگہ نواب حیدر علی خاں کے بعض واقعات کا اعادہ اس لیے ضروری ہو گیا ہے کہ ان کے ذکر کے بغیر سلطان شیو کی شخصیت پوری طرح ابھرنے نہیں سکتی۔

ان دنوں کرناٹک میں محمد علی اپنی نوابی قائم کر رہا تھا۔ وہ انگریزوں کی مدد سے اس علاقے کا حکمران بن گیا تھا۔ اس کے صلے میں اسے انگریزوں کی مدد کرنا پڑ رہی تھی۔ چنانچہ اگلے معرکوں میں وہ حیدر علی اور سلطان شیو کے خلاف انگریزوں کی مدد کرتا رہا۔ آخر مغل شہنشاہ دہلی نے اسے والا جاہ کا منصب و خطاب عطا کر دیا۔

انگریز اس سے پہلے بنگال پر قبضہ کر چکے تھے اور انہوں نے بمبئی اور مدراس سے اپنا بیڈ کو آرتھر کلکتہ منتقل کر لیا تھا۔

واضح رہے کہ بنگال کے نواب میراج الدولہ کو انگریزوں نے غدار ملک و ملت میر جعفر کی مدد سے شکست دے کر بنگال پر قبضہ کیا تھا۔

نواب حیدر علی خاں اپنے لشکر کی تنظیم و ترتیب میں پوری طرح منہمک تھے۔ انہوں نے لشکر کی

خاص کر سلطنتِ میسور کی تاریخ کے معاصر سے کوہڑی حیدر مرٹے رکھ رہا۔

ان حالات کی بنیاد پر اس داستان کا مختصر تذکرہ تاریخی دلچسپی کے لیے تحریر کیا جاتا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب حاکم کراچیکہ محمد علی خاں صرف حاکم تھا نہ تو اسے کراچیکہ کی نرائی ملی اور نہ وہ نظام حیدر شاہ کی ماتحتی سے آزاد ہوا تھا۔

اُس وقت تک کراچیکہ نظام حیدر شاہ کے ماتحت تھا اور دہلی کا حاکم نظام حیدر شاہ ہی تھے۔ کراچیکہ اور اس کی سند شہشاہ دہلی شاہ عالم ثانی دیا کرنا تھا۔

روایت ہے کہ ۵۰ء کے قریب نظام الملک نے دہلی دربار میں خفیہ طور پر اپنا ایک وفد بھیجا شہنشاہ دہلی کو تحفے تحائف کے ساتھ اس نے چھو کینیزیں اور چھوٹا ایک بھی مندر کے لیے بھیجے۔

اس زمانہ کے بادشاہوں اور حاکموں میں دستور تھا کہ وہ جب ایک دوسرے کو خط لکھتے تو قلم کے بائیں ہاتھ سے اور لوندی غلاموں کی نذر بھی روانہ کرتے تھے یہ غلام نیا بت تو ممد اور شہزاد ہوتے اور کینیزیں اپنی خود بخود یا پھر حرب ربانی کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہوتی تھیں۔

مغل شہنشاہ شاہ عالم ثانی، جس کی شہنشاہیت کی حدود دہلی بلکہ قلعہ دہلی تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں اس نے نظام الملک کے وفد کو اذن باریاں دیا اور باقاعدہ دربار منعقد کر کے مہمانداری سے خطا اور تحفے وصول کیے۔

شہنشاہ کا اقتدار اگرچہ محدود ہو گیا تھا مگر برصغیر ہند کے شمال اور جنوبی اور مشرق و مغرب پر وہ تمام صوبے جو کبھی سلطنتِ مغلیہ میں شامل رہ چکے تھے، اب بھی شہنشاہ دہلی کو اپنا شہنشاہ کہتے تھے اور پرانے دنوں کی طرح تمام بڑے عہدوں پر اپنے پسندیدہ لوگوں کو مقرر کر کے اس کی منظوری شہنشاہ سے حاصل کرتے تھے۔ برصغیر میں یہ طریقہ شاید بغداد کی عباسی خلافت کی تقلید میں اختیار کیا گیا تھا۔

بغداد میں اگرچہ خلافت عباسی خلافت کا خاتمہ ہو گیا تھا اور عباسی خلیفہ کا سکہ صرف حدود بغداد اور ایک محدود ہو چکا تھا مگر عراق، مصر اور ہندوستان تک کے تمام مطلق العنان بادشاہ اور سلطان تحت سلطنت پر قبضہ کرنے کے بعد خلیفہ بغداد سے اپنے لیے یہ خلیفہ خلافت منگواتے اور بالکل اسی طرح کا دستور رائج تھا۔

مختصر یہ کہ شہنشاہ دہلی نے نظام الملک، نظام دکن کے خواجہ ابوبکر اور جب وفد واپس جانے لگا تو حسب دستور شہنشاہ نے بھی نظام الملک کے لیے چھو کینیزیں اور دو غلام تحفہ کے طور پر بھیج دیے۔

ان بھیجنے والے غلاموں کے منعلق تو کچھ عام نہیں مگر وہ کس صورت، شکل اور عادات و اطوار کے مالک تھے مگر نظام الملک کو جو دو کینیزیں بھیجی گئیں ان میں ایک کا نام "طرحدار" تھا۔

مشہور تھا کہ طرحدار کینیز کو تو کینیز ہی مگر وہ تقریباً شاہی بیگمات پر حکمرانی کرتی تھی۔ بے انتہا ذہین تھی اور اسی قدر خوبصورت۔

اسے دیکھ کے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ طرحدار کسی اعلیٰ گھرانے کی دوشیزا ہے لیکن اس کی اصلیت کا پتہ نہ چل سکا صرف اتنا معلوم ہوا کہ حاکم بھٹنڈہ نے اس کینیز کو شہنشاہ کی نذر کیا تھا اور یہ نذر ایسی خوش نصیب تھی کہ شاہی محل میں پہنچتے ہی سب کی نظروں میں چڑھ گئی۔ کیا شہنشاہ، کیا ملکانیں، کیا شہزادے اور کیا شہزادیاں، سب ہی طرحدار کا دم بھرتے تھے۔

ذہانت اور خوبصورتی کے علاوہ طرحدار میں یہ صفت بھی تھی کہ وہ ہر ایک کام ہر وقت کرنے کو تیار رہتی اور بڑے سے بڑے اور مشکل سے مشکل کام کو چیلگیوں میں کر دیتی تھی۔ اس لیے سب اس سے محبت کرنے اور اس کی عزت بھی کرتے تھے۔

شہنشاہ دہلی نے اس خطرے کے پیش نظر کہ کہیں کوئی شہزادہ، طرحدار کی زلف گزیر کا امیر نہ ہو جائے، اس کی شادی ایک سردار سے طے کر دی تاکہ طرحدار شاہی محل سے نکل جائے۔ مگر۔

جب شہنشاہ کی کینیز خاص نے طرحدار کو بتایا کہ شہنشاہ نے اس کی شادی غلام سردار سے طے کر دی ہے اور کچھ دن بعد وہ محل سے رخصت ہو جائے گی تو طرحدار پھیل گئی اور ملکہ عالم کے پاس پہنچ کر ان کے پیر پیر کے بیٹھ گئی۔

طرحدار کو ملکہ کا برہان تھا۔ ملکہ واقعی اسے بہت مانتی تھیں۔ ان کے تمام چھوٹے بڑے کام طرحدار ہی کرتی تھی اور کام بھی اسے ملتے سے کرتی کہ ملکہ کا جی خوش ہو جاتا۔

"پیر چھوڑ طرحدار۔ بات کیا ہے؟" ملکہ نے محبت سے پوچھا۔
"پیر تو نہیں چھوڑوں گی ملکہ عالم! طرحدار نے اپنا سر بھی ملکہ کے قدموں میں رکھ دیا۔
"اری کیا ہوا بھتیجے۔ عقل ٹھکانے سے تیری؟" ملکہ نے پیر کینیز کی کوشش کی۔

"ملکہ عالم۔ مجھے اپنے قدموں سے جدا نہ کیجیے۔ میں مری جاؤں گی۔" طرحدار کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ٹھک کر شاہی رخساروں پر آ گئے۔

"تو رو رہی ہے طرحدار؟" ملکہ نے حیران نظروں سے اسے دیکھا؛

کس نے تیرا دل دکھایا ہے۔ مجھ بتا۔ پھر دیکھ میں اس کا کیا حشر کرتی ہوں؟
ملکہ سنجیدہ ہو گئی۔ اس نے جنت سے دھکا دے کر طحدار کو پیروں سے بٹایا اور خود ذرا
سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

ملکہ نے طحدار کے جواب کا بھی انتظار نہیں کیا اور آپ ہی آپ بولنے لگی:
"میں کئی دنوں سے دیکھ رہی ہوں تو چپ چاپ ہے۔ چہرے کا رنگ پھیکا ہو رہا ہے۔ چلتی
ہے تو جیسے بیمار۔ جسمی تو میں کموں کیا ہوا میری طحدار کو؟"
یہ ملکہ ہند کی طحدار کے ساتھ بڑھی ہوئی جنت تھی جو الفاظ میں ڈھل رہی تھی۔ یہ دو پہر کا
وقت تھا اور صبح سے طحدار، ملکہ کے پاس کم از کم دس مرتبہ آچکی تھی مگر اس سے پہلے وہ بالکل ٹھیک
تھی۔ ہنس بول رہی تھی۔ دوسری کینزوں کو پھینک رہی تھی۔ ملکہ ہند بھی اس کی مسکراہٹوں اور قہقروں میں
شریک رہی تھی۔ اس وقت طحدار نے کوئی شکوہ نہیں کیا تھا نہ اس کا اس طرح چہرہ اتر تھا۔
اُسے بولتی کیوں نہیں کم جنت۔ دھیرے دھیرے شوے جا رہی ہے اور منہ سے کچھ پھوٹی نہیں
گلے بھر سے ہیں کیا؟

ملکہ ہند ایک کینز کی ناز برداری میں لگی تھیں۔
آخر طحدار نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور موٹی موٹی اٹھائی اٹھائیں:
"ملکہ عالم۔"

اور وہ پھر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

"پھر وہی۔ روٹے چل جا رہی ہے کم جنت۔ بتاتی کیوں نہیں کچھ؟"

ملکہ ہند کا دل بھی شاید بھر آ رہا تھا:

"جب تک تو بتاتے گی نہیں۔ میں کیا کر سکوں گی بترے لیے؟"

طحدار جپکپوں میں بولی:

"کہہ تو رہی ہوں ملکہ عالم۔ مجھے اپنے قدموں سے جلا نہ کیجیے۔ دوسری جگہ جا کے میں مر جاؤں گی۔"

دوسری جگہ؟ ملکہ ہند کی پیوریوں پر بول پڑ گئیں:

"کون بھیج رہا ہے تجھے دوسری جگہ؟"

"غل سبجانی کا حکم ہے۔ طحدار نے پلو سے آنسو پونچھے۔ اس کی بھیگی ہوئی آنکھیں پہلے سے

زیادہ خوبصورت ہو گئی تھیں۔

غل سبجانی کے نام پر ملکہ نے چوبک کر طحدار کو دیکھا۔ پھر ذرا رک کے بولی:
"کی غل سبجانی نے تم سے کہا ہے کہ قلعہ چھوڑ کے چلی جاؤ؟"
"یہی سمجھے ملکہ عالم!"

اور۔ طحدار کے پھر آنسو چھوٹنے لگے۔

"پھر وہی۔ تو میری بات سنتی نہیں۔ چلی جا رہی ہے معوں میں باتیں کرتی۔"
ملکہ کچھ چڑھی گئی:

"صاف صاف بتا۔ کیا کہا ہے غل سبجانی نے؟"

"غل سبجانی میری شادی کر رہے ہیں، میں ملکہ عالم۔ طحدار بھڑائی ہوئی آواز میں بولی۔
ہوں۔ تو یہ بات ہے!" ملکہ مسکرائی:

"پھر وہی کیوں رہی ہے۔ یہ تو خوشی کی بات ہے!"

"خوشی کی کیا بات ہے ملکہ عالم۔ طحدار نے سنہل کر کہا:

"میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

"کیوں نہیں کرنا چاہتی۔" ملکہ نے مصنوعی غصہ دکھایا:

"کیا عمر بھر کنواری بیٹھی رہے گی؟"

"غل سبجانی میری شادی کر کے قلعہ سے باہر بھیج دیں گے۔ میں نہیں جاؤں گی۔ آپ کے
پاس سے نہیں جاؤں گی۔ طحدار گڑ گڑانے لگی۔

ملکہ کچھ موچنے لگی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ماجدار ہند کو طحدار کی شادی کی کیوں نہ پڑ گئی اور انہوں نے
بغیر ملکہ کو اطلاع دیے اس کی شادی بھی نہ کر دی۔ کیوں؟

طحدار نے ملکہ کو خاموش دیکھا تو پھر التجا کی:

"ملکہ عالم۔ آپ شہنشاہ سے کہہ کر یہ شادی رکوا دیجیے!"

ملکہ کو شاید اس پر رحم آ گیا۔

"میں کوشش کروں گی۔ اس نے کہا:

"کہ تمہیں قلعہ نہ چھوڑنا پڑے بشرطیکہ تمہاری شادی میں شہنشاہ کی کوئی سیاسی مصلحت

نہ ہو۔"

اُسی شب۔ ملکہ نے شہنشاہ کے حضور عرض کیا:

”میں نے سنا ہے کہ عالم پناہ میری کینز طرحدار کی شادی کسی سردار سے کر رہے ہیں؟“
”کیا ملکہ ہند کو کوئی اعتراض ہے؟“ شہنشاہ مسکرایا۔

”جیہ کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ عالم پناہ کا اس میں ضرور کوئی سیاسی مصلحت ہوگی۔“ ملکہ کا جواب طعنے پر ہو گیا۔

”بالکل نہیں۔ کوئی سیاسی مصلحت نہیں۔“

شہنشاہ نے انکار کیا:

”ہم دراصل قلعہ کے ماحول کو کسی غیر متوقع فتنے سے محفوظ کرنا چاہتے ہیں۔“

”کیا ایک ادنیٰ کینز قلعہ میں کوئی فتنہ پیدا کر سکتی ہے؟“

ملکہ کی آنا کو جیسے تھیں لگی:

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تاجدار ہند نے یہ فیصلہ کس کے کہنے پر کیا ہے؟“

ملکہ ناراض نہ ہوں۔ شہنشاہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا:

”دراصل ہمیں برابر شکایتیں مل رہی ہیں کہ طرحدار، شہزادگان سے بہت گھل مل گئی ہے اور کسی وقت بھی کوئی فتنہ کھڑا ہو سکتا ہے۔“

”تاجدار ہند کو معلوم ہونا چاہیے کہ میری کینز کا دامن اب تک پاک ہے۔ خود شہزادے اُسے گھرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ طرحدار تو انہیں منہ بھی نہیں لگاتی؟“

”بات ایک ہی ہے ملکہ۔“ شہنشاہ نے جواب دیا:

”چھری سیب پر رگر سے یا سیب چھری پر۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ تو ایک ہی نکلے گا۔“

ملکہ نے شہنشاہ سے کچھ ایسی اکھڑی اکھڑی باتیں کہیں کہ شہنشاہ کو اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

تاہم شہنشاہ نے ملکہ کو اس بات پر ضرور آمادہ کر لیا کہ آئندہ کسی موقع پر اس خوبصورت بلا یعنی طرحدار کو قلعے سے کہیں دور بھیج کر قلعہ کو اس کے شر سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا جائے گا۔

طرحدار کی بدقسمتی کہ شہنشاہ کو یہ موقع جملہ ہاتھ آ گیا۔ نظام دکن حیدر آباد نے شہنشاہ کے پاس ایک وفد بھیجا جو حضور شہنشاہ کچھ التماسات لے کر دہلی گیا تھا۔ حسب دستور نظام نے شہنشاہ کے لیے چھ غلام اور چھ کینز بس نذر پیشیں۔

شہنشاہ نے وفد کی واپسی پر اس کے ساتھ دو غلام اور دو کینز بس روانہ کر دیں۔ ان میں ایک

کینز طرحدار تھی۔

طرحدار کو بھیجنے کا انداز یہ تھا کہ شہنشاہ نے اسے اپنے حضور طلب کر کے حیدر آباد جانے کا حکم دیا۔ طرحدار، شہنشاہ کے حکم سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔

شہنشاہ کا حکم بھی نادر شاہی تھا:

”حیدر آباد کا وفد جانے کے لیے تیار ہے۔ جاؤ اس میں شامل ہو جاؤ۔“

طرحدار روتی ہوئی واپس آئی۔

ملکہ ہند کو اسی وقت معلوم ہو گیا تھا کہ طرحدار کو حیدر آباد جانے کا فرمان جاری ہو گیا ہے۔

انہوں نے طرحدار کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور طرحدار منہ بسورنی قلعہ دہلی ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جنوبی ہند روانہ ہو گئی۔

پتہ کہہ ہی نہیں سکتے کہ بادشاہوں اور ملکاؤں کی آنکھیں سر پر ہوتی ہیں۔ ان کی تون مزاجی مشہور ہے۔ گھڑی میں تو لگھڑی میرا مٹا۔ ایک وہ دن تھا کہ وہ طرحدار کے لیے شہنشاہ سے لڑ پڑی تھیں، اور ایک یہ دن کہ انہوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی تھی۔

طرحدار جب تک قلعہ معلیٰ دہلی میں رہی، سیدھی پلٹی رہی۔ شاید اسی لیے کہ ملکہ ہند بہت نیک اور پرہیزگار خاتون تھیں اسی لیے ان کی کینز میں بھی ادھر ادھر نہ بٹھاتی تھیں لیکن حیدر آباد دکن کا ماحول کچھ مختلف تھا۔

وہاں کے عکلات میں ہر طرح کی آزادی تھی۔ نہ ہنسنے مسکرانے پر پابندی اور نہ غلاموں اور کینزوں کی آپس میں گفت گو پر کوئی توجہ نہ تھی۔ اس لیے طرحدار، دکن میں آ کر کھل کھیلی اور ایسی کھیلی کہ دیکھنے والے انگشت بدندان رہ گئے۔

جوانیوں بھی پکا ہو آؤں ہوتی ہے۔ آؤں جب تک ڈال پر رہے، محفوظ ہے مگر جہاں اس پر کسی کا ہاتھ لگا تو یہ بس ہاتھ کے بجائے گود میں آ رہتا ہے۔

طرحدار پر جوانی ٹوٹ کے آئی تھی اور اس کی خوبصورتی ایک انسانی چیز تھی۔ طرحدار شاہی محل میں پہنچی تو جیسے طوفان آ گیا۔

محل میں گو کہ ایک سے ایک خوبصورت کینز تھیں لیکن طرحدار خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ

اس پیغام کے پس منظر میں دارودنہ محلات کی نظام دکن سے وہ درخواست کارفرما جواس نے ایک ہفتہ پیشتر نظام کے حضور اس وقت پیش کی تھی جب نظام کو کسی علاقہ کے فتح ہونے کی خبر ملی تھی اور وہ حد سے زیادہ خوش نظر آتا تھا۔

شاہی اداوار میں بلکہ آج بھی شاید یہ دسنور ہے کہ ماتحت لوگوں کی اکثر شکایاں ان کے اندرون کے توسط اور کوشش سے ہوتی ہیں۔ فرقہ واریت یہ ہے کہ اسی وقت شاہ وقت ملک کا اور ملک، مالکن کا کردار ادا کرتے تھے جبکہ آج ملک کا کردار پجود کرپٹ کے افسرین آگیا ہے اور ان کی بیگمات، مالکن کا کردار ادا کرتی ہیں۔

”شاہ دکن کا پیغام ہمارے گوش گزار ہوا۔“ نظام دکن کے پیغام کا ملکہ دکن نے پرمزور لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا:

”ہم ضرور اس پر غور فرمائیں گے۔“

نظام نے اصرار کیا:

”ہم یہ چاہتے ہیں کہ ملکہ دکن ہمارے اس پیغام کا جواب آج اور اسی وقت عنایت فرمائیں۔“ ملکہ کی پیشانی پر شکن آؤد ہو گئی:

”ہم حضور شاہ گستاخی کے مرتکب نہیں ہونا چاہتے لیکن یہ عرض کرنے پر مجبور ہیں کہ شادی بیاہ کا معاملہ بچوں کا کھیل نہیں۔ اس مسئلہ پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم اس سلسلے میں طرح طرح کی ضمانت دی کو مندم خیال کرتے ہیں۔ بغیر اس کی رضا کے ہم کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔“ نظام بھی جیسے اپنی بات پر اڑ گیا۔ اس نے مسکرا کر کہا:

”ملکہ ہند کی توجہ کے لیے ہم انہیں مطلع کرتے ہیں کہ ان کی کینز طرح حالانہ اس شادی کی پہلے ہی اجازت اور منظور دی دے دی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اب ملکہ بھی اس رشتے کی منظوری میں کسی تاخیر کو روا نہ رکھیں گی۔“

ملکہ دکن کی شکونوں میں کچھ اور اضافہ ہو گیا اور اس بات کا جواب دیتے وقت اس کے لہجے میں کچھ تلخی بھی آ گئی:

”کیا شاہ دکن اس بات کی وضاحت کرنا گوارا فرمائیں گے کہ میری کینز طرح دار نے ان کے حضور اپنی زبان سے اس بات کا اقرار کیا ہے؟“ نظام نے گفتگو میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا:

”طرح دار بھی تھی۔ یہ طرح داری دکن میں آ کے کھلی۔ وہاں اس نے آنکھیں میٹکانا اور اٹھ چلانا سیکھ لیا۔“

اور پھر۔

طرح دار جوانی کے راستوں پر چل پڑی۔

شاہی محل کی نصف کینز میں طرح دار کا دم بھرتی تھیں اور اس کی دوستی پر فخر کرتی تھیں۔ شاہی محلات کا دارودنہ بھی ایک سنبھلا اور طرح دار جوان تھا۔ پھر جب دو طرح دار نظر میں ایک دوسرے سے ملیں تو ملی ہی نہ گئیں۔

محلات شاہی میں سے ایک محل کا ڈیوڑھی طرح دار اور دارودنہ محلات کی بار بار آئی۔ وہ ڈیوڑھی اگرچہ شام کی کوند ہو جاتی تھی مگر کینزوں کا کھنا تھا کہ ڈیوڑھی بند ہونے کے بعد اصل میں جاگتی ہے اور رات گئے تک طرح دار اور دارودنہ کی موجودگی سے جاگتی رہتی ہے۔

طرح دار کے عشاق میں صرف دارودنہ ہی شامل نہ تھا بلکہ محلات کے ایک الگ نائب دارودنہ بھی اس کے تیرنظر کا شکار تھے۔ یہ سب دارودنہ محلات کے ماتحت تھے اور اپنے افسر کی وجہ سے محل کے تو طرح دار سے نفی سکتے تھے کیونکہ ان پر بڑے دارودنہ کا خوف غالب رہتا تھا۔

دوسری طرف طرح دار بھی محتاط رہتی تھی اور دارودنہ کے شکایت کا موقع نہ دیتی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ دارودنہ محلات اپنے عشق میں کامیاب ہوا۔ اس کے نائب کو ششپیں ہی کرتے رہ گئے اور دارودنہ، طرح دار کو لے اڑا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ دارودنہ، طرح دار کو لے جانا کہ ان دونوں کی شادی کی باقی ماندہ تریک ہوئی تھی میں نظام دکن اور اس کی ملکہ نے پوری پوری دلچسپی لی۔ ان کی دلچسپی کا کوئی خاص سبب نہ تھا بلکہ یہ واقعہ بالکل اسی طرح پیش آیا جس طرح چین میں بچے پچیاں گڑیا لگڑے کی شادی کرتے ہیں اور اگر وہ خوش قسمتی سے اپنی نژدت میں تو گڑیا لگڑے کی شادی تمام رسومات کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔

پس۔

ایک دن نظام دکن نے اپنی ملکہ کو پیغام دیا:

”اے ملکہ دکن! میں اپنے دارودنہ محلات کا آپ کی کینز طرح دار کے لیے پیغام کو دیتا ہوں۔ امید ہے آپ میرے دارودنہ کو اپنی غلامی میں قبول فرمائیں گی!“

ساتھ دوسرے محل میں رہتی تھی۔
نظام دکن کے محل میں اس کی رہائش کے علاوہ کئی سرکاری دفاتر بھی تھے۔ ان میں سب سے
اہم فوج اور مالیات کے دفاتر تھے۔ یہ محل "بڑے محل" کے نام سے بھی مشہور تھا۔

ملکہ دکن نے بڑے محل سے واپس آتے ہی طرحدار کو طلب کر لیا۔
طرحدار بڑی شاطر عورت تھی۔ ملکہ کی اس غیر معمولی طبلی سے اس کے کان کھڑے ہوئے۔ اس
نے ملکہ کا پیغام لانے والی کینز سے سُن گُن لینے کی کوشش کی مگر وہ سوائے اس کے اور کچھ نہ
بتا سکی کہ ملکہ بڑے محل سے بڑے محل میں واپس آئی ہیں۔ ہو سکتا ہے نظام دکن نے انہیں کچھ
سخت سست کہا ہو۔

طرحدار کو اور ہول پڑ گیا۔ وہ ڈرنے ڈرتے ملکہ کے پاس پہنچی۔
"کیوں ری طرحدار؟"

ملکہ دیکھتے ہی اس پر برس پڑی:

"تو نے داروغہ محل کو اپنے ساتھ شادی کی منظوری دیدی ہے؟"

طرحدار کے پیرد تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے ملکہ کو صرف یہ بتایا تھا کہ کئی کینزوں نے
اسے یہ بتایا ہے کہ داروغہ محلات اس کے ساتھ شادی کرنے کی کوششوں میں ہے لیکن طرحدار نے
ابھی اسے کوئی جواب نہیں دلوایا ہے۔ پس اس نے یہی بات پھر دہرائی۔

ملکہ ہنڈ۔ میری جان آپ کے صدمہ تھے۔ بھلا ایسی بے غیرت ہو سکتی ہوں کہ داروغہ سے
اپنی شادی کا اقرار کر لوں اور وہ بھی آپ کی اجازت کے بغیر۔ مجھے تو محل کی کینزوں نے بتایا تھا کہ
اس کا کچھ ایسا ارادہ معلوم ہوتا ہے۔ درجی میں نے آپ کے حضور عرض کر دیا تھا تاکہ کسی قسم کی کوئی
بدگمانی نہ پیدا ہو۔

ملکہ کو کچھ اطمینان ہوا تو نرمی سے بولی:

"مگر شاہ دکن تو یوں فرما رہے تھے جیسے تم نے اقرار کر لیا ہو؟"

میری زبان کٹ جاتے ملکہ حضور۔ اگر میں نے کسی سے بھی اقرار کیا ہو۔ میں جھاڑو پھیرتی
ہوں اس سوئے داروغہ پر جس نے میری ملکہ کا دل میلا کر دیا۔ میں اب زندگی بھر اس کی طرف رخ

ملکہ ہمارے داروغہ نے یہ خبر نہیں پہنچائی تھی۔

ملکہ دکن کی گلی میں کمی نہ ہوئی۔ اس نے کہا:

اس خبر میں داروغہ کی یہ غرض بھی پوشیدہ ہو سکتی ہے کہ وہ بالابھی بالا ہماری اور شاہ دکن
کی اجازت حاصل کر کے شادی کی تاریخ مقرر کر دے تاکہ طرحدار کو انکا دکنے کا کوئی موقع
نہ مل سکے۔

نظام دکن میں بھی کچھ چڑچڑاہٹ پیدا ہو گیا۔ اس نے ناگوار لہجے میں کہا:

"اس کا مطلب ہے کہ ملکہ کو ہماری اور ہمارے داروغہ کی بات پر اعتبار نہیں اور وہ اس
رشتہ کو منظور کرنے سے انکار کر رہی ہیں۔"

"یقیناً۔" ملکہ نے مضبوط لہجے میں کہا:

"ہم بغیر طرحدار کی اجازت حاصل کیے، یہ رشتہ منظور نہیں کر سکتے۔ ہاں اگر شاہ دکن کا رشتہ
کا پیغام پیغام نہیں بلکہ حکم ہے تو ہم اسے منظور کرتے ہیں کیونکہ شاہ کے حکم سے انکار کا ہم
تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"نہیں نہیں۔ ملکہ دکن۔ آپ ناراض نہ ہوں۔"

نظام دکن شاید شرمندہ ہو گیا:

"ہم نے کوئی حکم نہیں دیا۔ حکم دینا ہوتا تو ہم رشتہ کا پیغام کیوں دیتے۔ ہم تو اس سے
چاہتے ہیں کہ ملکہ اس رشتہ کا فیصلہ کرتے وقت اس بات کو ضرور پیش نظر رکھیں کہ ہمارا داروغہ
اور آپ کی کینز اس رشتہ کے لیے اپنے طور پر تیار ہیں۔ اب جبکہ میان بیوی راضی تو پھر کیا
کرے گا قاضی کے مصداق آپ کو اس معاملہ میں دخل نہ دینا چاہیے۔"

"ہم شاہ سے بھدا دب گزارش کرتے ہیں کہ اگر یہ حکم نہیں ہے تو پھر ہم اپنی کینز طرحدار
سے بات کرنے اور اس کی رضا مندی حاصل کرنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔ اس لیے شاہ سے
دوسری ملاقات تک اس پیغام کو تعطل میں رکھا جائے۔" ملکہ نے بڑے سلیقے سے اپنی بات
برقرار رکھی۔

نظام دکن کو خاموش ہونا پڑا۔

واقعہ یہ ہے کہ نظام دکن کی یہ ساری گفتگو نظام دکن کے محل میں اس وقت ہوئی جب ملکہ
کسی ضرورت سے نظام کے محل میں گئی ہوئی تھی ورنہ اس کا اپنا الگ محل تھا اور وہ اپنی تمام کینزوں کے

کھانے کے بعد طرحدار عرصی جوڑے میں اپنے دہا یعنی داروندہ محلات کے ساتھ رخصت ہو کے اس کی جوہلی پہنچ گئی۔

کہتے ہیں اس شب طرحدار کے چہرے پر روپ ٹوٹ کے برس رہا تھا۔ طرحدار کی شادی کا ہنگامہ ایک ہی دن میں ختم ہو گیا اور وہ اپنے گھر کی ہو گئی مگر جس طرح طرحدار کی شادی جلدی سے ہو گئی تھی اسی طرح اس نے اولاد پیدا کرنے میں بھی جلدی کی اور اس کے گھر ایک سال کے اندر ہی اندر اولاد کی خوشی آ گئی۔

یہ خوشی بھی دھڑکی تھی۔ طرحدار نے دو جڑواں بچوں کو جنم دیا تھا جن میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔

لڑکے کا نام اگلنڈا اور لڑکی کا نام گلرخ رکھا گیا۔ طرحدار اور داروندہ کے دن رات بظاہر منہ می خوشی گزر رہے تھے مگر پھر اچانک داروندہ کو طرحدار کی طرف سے ایک دھچکا لگا اور اس کے دل میں بال پڑ گیا۔

ہوایوں کہ ایک شب داروندہ خلایع معمول بڑے محل سے جلدی واپس آ گیا۔ وہ گھر کے قریب پہنچا تھا کہ اسے اپنے دو دوازے پر دو محلے لہرتے نظر آئے۔ داروندہ نے گھوڑے کی دفت ریتز کر دی۔

ادھر گھوڑے کی ڈاہیں سن کر سایوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ ایک اندر چلا گیا اور دوسرا سایہ تیزی سے مڑا کہ دوسری طرف چل پڑا۔ داروندہ نے گھوڑا وہیں جھوڑا اور پایادہ ملنے کے پیچھے بھاگا سایہ ابھی زیادہ دور بھی نہ گیا تھا کہ داروندہ نے اسے چالیا۔

داروندہ نے اس کے کانڈھے پر ہاتھ رکھ کر اسے روکنا چاہا۔ جواب میں ملنے نے پلٹ کر داروندہ پر خنجر کا دیا کیا۔ خنجر اس کے سینے میں اتر گیا نہ کوئی غل نہ شور۔ داروندہ نے ایک سسکی لی اور دھڑام سے زمین پر گر گیا۔ اسے مارنے والا بھاگ کے آگے نکل گیا۔

داروندہ کا گھر ایک بڑی رونق جگہ پر تھا لیکن رات کی وجہ سے لوگوں کی آمد و رفت تقریباً ختم ہو چکی تھی اس لیے صبح کسی کو خبر بھی نہ ہوئی کہ اس مقام پر شاہی داروندہ محلات کا قتل ہو گیا ہے۔

دوسرے دن — طرحدار جو اب طرحدار بیگم بن گئی تھی، دونوں شیرخوار بچوں کو لے کر نظام کے پاس دادرسی کے لیے پہنچی۔

بھی نہ کروں گی۔

طرحدار اپنے آپ کو بچانے کے لیے ملن مگر لگئی۔ حالانکہ حقیقت یہی تھی کہ طرحدار اور داروندہ کی گفتگو چلتی تھی اور اس نے داروندہ سے عاتق الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اگر اس نے شادی کا بیانیہ، جیسا تو وہ اسے قبول کرنے میں ذرا بھی پس دیش نہ کرے گی۔

ملکہ کچھ دل گرفتہ ہو رہی تھی۔ اس نے طبیعت، کمال کرنے کے لیے پوچھا: "کیوں ری طرحدار۔ اگر داروندہ کا بیانیہ تیرے لیے آئے تو تو کیا جواب دے گی؟" طرحدار جیسی چالاک عورت بھی ملکہ کے اس اچانک سوال سے گھبرا گئی مگر فوراً ہی سنبھلی اور بولی:

"ملکہ دکن۔ طرحدار کے لیے بیانیہ، جواب خود ملکہ دکن دیں گی کیونکہ طرحدار نے اپنی تمام خواہشات آپ کی جو تپوں تلے دبا دی ہیں۔"

یہ اتنی زبردست خفا شد تھی کہ ملکہ کا دل بارغ بارغ ہو گیا۔ "اچھا تو پھر کل ہم خود شاہ دکن سے بات کریں گے۔" ملکہ نے طرحدار کے دل کی کلی کھلا دی۔ طرحدار نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔

ملکہ دوسرے دن بڑے محل گئی اور جب واپس آئی تو اس کے محل میں اعلان ہو گیا کہ طرحدار اور داروندہ کی شادی آئندہ جمعرات کو ہو رہی ہے۔

طرحدار کی تو لڈی خوب چڑھی ہوئی تھی۔ تمام بیگمات اور کینز میں اسے پسند کرتی تھیں۔ غلاموں میں بھی اسے سب ہی پسند کرتے تھے اور اسے حاصل کرنے کے خواہش مند تھے مگر اپنے داروندہ کی دہر سے وہ طرحدار کو اپنے دل کے گوشوں میں پھیلے رکھتے تھے اور اب تو داروندہ اور طرحدار کی شادی ہو رہی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ان یادوں کو ہمیشہ کے لیے دل ہی میں دفن کر دیا اور اس شادی میں جی بھر کے حصہ لیا۔

چونکہ یہ ملکہ دکن کی کینز کی شادی تھی اس لیے اس تقریب میں محلات کے باہر سے کسی کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ نظام دکن اور ملکہ دکن کے علاوہ محلات کی تمام خواتین، کینز، اور غلام اس بارات میں شامل تھے۔

شادی کے دونوں طرف کے اخراجات شاہی خزانہ نے برداشت کیے تھے۔ تمام دکن کینز، اور غلام خوشیاں مناتے اور ادھم مچاتے رہے۔ پھر مغرب کے بعد قحنی شہر نے دونوں کا عقد کیا اور

اس نے بیان دیا کہ وہ تمام رات اپنی بوڑھی ماس اور دونوں بہنوں کے ساتھ جاگتی اور شوہر کا انتظار کرتی رہی مگر صبح کو چند آدمیوں نے دستک دے کر اس کے شوہر کی لاش اس کے حوالے کی۔ اس لیے درخواست ہے کہ قاتل کو گرفتار کر کے سزا دی جائے۔

نظام دکن نے کوڑا لے کر شہر کو تحقیقات کی ذمہ داری سونپی اور طرحدار بیگم کے لیے حکم ہوا کہ مقتول داروغہ کی تنخواہ اس کی بیوہ کو ماہ ماہ اس وقت تک پہنچائی جائے جب تک طرحدار بیگم کے دونوں بچے جوان ہو کر اس کے کفیل نہیں ہوں گے۔ یا پھر طرحدار بیگم کسی سے عقد ثانی نہیں کرتی۔

طرحدار تو شاید دل سے یہی چاہتی تھی۔ اس نے نظام کے اس فرمان کے بعد قاتل کی گرفتاری کے بارے میں کوئی درخواست نہ دی۔ اس طرح معاملہ غمزہ بود ہو گیا۔

داروغہ عیالات کی اسامی بہت اہم تھی کیونکہ عیالات کی حفاظت کے علاوہ داروغہ تمام اہلیات اور شہزادوں کی ضروریات پوری کرنے کا بھی ذمہ دار تھا۔ صبح ہوتے ہی بیگمات اور شہزادیوں کے کینیزیں ضروریات کی فہرست داروغہ کے حوالے کر دیتی تھیں۔ پھر داروغہ اس کام پر مامور ملازمین کے ذریعے تمام سامان منگوا کر فردا فردا ہر محل پر بھجوا دیتا تھا۔ اس کے حساب کتاب کے لیے منشی خانہ کے دو منشی اسے دیے گئے تھے۔

اب ایک ایسے اہم کارکن کا مدد کب تک خالی رہ سکتا تھا؟ نظام نے تیسرے ہی دن مقتول داروغہ کے نائب کو ترقی دے کر داروغہ مقرر کر دیا۔

طرحدار، تیز طرار تو پہلے ہی تھی شادی کے بعد اس میں اگر کچھ جھک تھی تو وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ اور اب تو وہ خیر سے دو بچوں کی ماں تھی۔ چنانچہ مدت کے دن پورے ہوتے ہی اس نے ہاتھ پیر نکالنا شروع کیے۔

نائب داروغہ جو اب داروغہ عیالات ہو گیا تھا اور جس کے متعلق عام لوگوں خصوصاً کینیزوں اور غلاموں کا خیال تھا کہ سابق داروغہ کا قاتل ہی ہے اور یہ کہ طرحدار بیگم اور اس میں شادی کے بعد ہی سے محبت کی پیٹلیں بڑھنا شروع ہو گئی تھیں اور جس کا انجام داروغہ کے قتل پر ہوا۔ تعلقات تو دونوں میں پہلے ہی سے تھے اب دنیا کو دکھانے کے لیے نئے داروغہ نے طرحدار سے باقاعدہ نکاح کیا اور اسے معہ بچوں کے رخصت کرا کے اپنے گھر لے آیا۔ احتیاط کے طور پر داروغہ نے

اپنی شادی کی اطلاع منشی خانہ کو بھیج دی۔

اس طرح طرحدار بیگم کی شاہی خزانے سے آنے والی تنخواہ تو بند ہو گئی مگر اس کے شوہر کے سر سے قتل کا الزام ہمیشہ کے لیے ہٹ گیا۔

طرحدار بیگم اولاد کے معاملے میں بڑی زرخیز تھی۔ پہلی مرتبہ بھی اس کے بڑے بچے ہوئے تھے اور اس بار بھی شادی کے گیارہویں مہینے میں اس کے دو بڑے بچے پیدا ہوئے۔ یہ بچے بھی ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھے۔ اس طرح طرحدار بیگم تیسرے سال چار بچوں کی ماں بن گئی۔ وہ ہر طرح سے مطمئن تھی۔ کسی طرف سے بھی اسے کوئی پریشانی نہ تھی۔

گم۔

اچانک اس کی قسمت نے ہٹا کھایا۔

خوش بختی بد بختی میں تبدیل ہو گئی اور اس کا اچھا بھلا شوہر کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو کر چٹ پٹ ہو گیا اور طرحدار بیگم دو مرا بیگم ہی نہ بدل سکی تھی کہ تیسرے دن اس کا شوہر اسے دوتا ہوا چور گیا۔ اب تو طرحدار پر جیسے غلوں کا ہار ٹوٹ پڑا۔

چار شیرخوار بچوں کا ساتھ۔ شوہر کی تنخواہ بند ہو چکی تھی۔ اس کا منہ نہ پرتا تھا کہ اپنی دوسری بار بیوگی کا رونا نظام دکن کے حضور جاکر روئے۔ نظام سرکار کی طرف سے جو دو کینیزیں اسے ملی ہوئی تھیں، دوسری شادی پر ان کی خدمات بھی سرکار کو واپس ہو گئی تھیں۔

طرحدار بیگم نے جتنا عیش کیا تھا اور رنگ روپ نکالا تھا وہ سب ختم ہو گیا۔ اس کا رنگ سیاہ پڑ گیا۔ گال پچک گئے اور آنکھیں اندر کو دھنس گئیں۔ دیکھنے والے کہتے تھے کہ اب طرحدار کو دیکھ کر خوف آتا ہے۔

وہ تو اچھا ہوا کہ اُسے اللہ نے جلد ہی اس دنیا سے اٹھایا۔ اس کے دوسرے شوہر سے جو دو بچے ہوئے تھے ان میں سے لڑکے کا نام سردار اور لڑکی کا نام کینیز رکھا گیا تھا۔ کینیز نے ہی ماں کا ساتھ جلد ہی چھوڑ دیا۔ بس وقت طرحدار کا انتقال ہوا اس کے تین بچے زندہ تھے۔ پہلے شوہر کے گھناؤ اور گھبرائے اور دوسرے شوہر کا مردار۔

انتقال کے وقت طرحدار کے سر پرانے عہد کی ایک عذرا س عورت موجود تھی۔ اسی نے طرحدار کے مرنے کی اطلاع ملکہ دکن تک پہنچائی۔ اس طرح طرحدار کے کن رفن کا انتظام سرکاری طور پر کیا گیا۔

ملکہ نے چند کینزوں اور غلاموں کو بھی طرحدار کے گھر بھجوا دیا تھا۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ طرحدار کے تینوں بچے تین کینزوں میں بٹ گئے، جو بے اولاد تھیں۔
یوں طرحدار کی کمافی تو ختم ہو گئی اور ان تین شیر خوار بچوں کی اک نئی کمافی نے جنم لیا۔ کینزوں نے ان بچوں کو اپنے بچوں کی طرح پالا اور انہیں ماں باپ سے محرومی کا احساس تک نہ ہونے دیا۔

مگر۔۔۔
جب یہ بچے جوان ہوئے تو قسمت نے انہیں مختلف شہروں میں بھیج دیا۔
گلغام تو اپنی ماں کے ساتھ شاہی محل میں رہا اور جوان ہونے پر نظام دکن کا خاص مسافر مقرر ہوا۔

اس کی بہن گلرخ کو اس کی ماں نواب کرناٹک کے پاس لے گئی اور اس کی پرورش کرنا محکم ہی میں ہوئی۔

تیسرے بیٹے سردار کی ماں کسی طرح مرنگا پٹم پہنچی۔ سردار وہیں جوان ہوا اور لشکر حیدر علی کے ملازم ہو گیا۔

واضح رہے کہ ان سب کے اور سوتیلے بہن بھائیوں میں بدائی امن و دلت ہوئی جب ان کی عمریں دسویں گیارہ سال کے قریب تھیں۔

جب تک یہ تینوں نظام دکن کے محل میں تھے تو دونوں ہی ایک دوسرے سے ملنے ملتے تھے۔ اس عمر میں عشق و محبت کا تو کوئی سوال پیدا نہ ہوتا تھا، سوائے اس کے کہ گلرخ اپنے سوتیلے بھائی سردار سے زیادہ دلچسپی لیتی تھی اور یہ بات اس کے سگے بھائی گلغام کو بہت بری لگتی تھی اور وہ سردار سے لکھی بارش چکا تھا۔

سب کے الگ الگ ہو جانے کی وجہ سے یہ سلسلہ تو ختم ہو گیا مگر گلغام کے دل میں گلرخ کی محبت کچھ ایسی بیٹھی کہ وہ گلرخ کے لیے دیوانہ ہو گیا۔ اس میں گلغام کی غلطی کے ساتھ ان کینزوں کی بھی غلطی یا بزدلی تھی جنہوں نے گلغام کے دماغ میں یہ بات ڈال دی تھی کہ گلرخ اس کی سگی نہیں، سوتیلی بہن ہے اور اس کا باپ دوسرا تھا۔

گلغام اور گلرخ کو جن کینزوں نے پالا تھا ان کا بھی انتقال ہو چکا تھا اور کوئی بھی صحیح شہادت دینے والا موجود نہ تھا کہ کون کس کا سگا اور کون سوتیلہ ہے۔

اور گلرخ کو یقین تھا اور اس نے اس بات کی دوسری کینزوں سے قسم لی تھی کہ وہ اور

گلغام ایک ہی ماں اور ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ اسی لیے وہ گلغام سے برادرانہ محبت تو کر سکتی تھی لیکن وہ اس کی اس پاگل پن کی محبت کے سخت خلاف تھی۔

دس سال کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہوتی لیکن گلرخ نے ایک دن گلغام کو ڈانٹ دیا تھا:
"گلغام! ہوش کی باتیں کرو۔ تم میرے سگے بھائی جیسے نہیں بلکہ سگے بھائی ہو۔ میں تم سے بھائیوں جیسی تو محبت کر سکتی ہوں مگر اس کے آگے کچھ نہیں۔"

مگر اس کے ہم عمر گلغام نے بڑے دالمانہ انداز میں جواب دیا تھا:
"نہیں گلرخ! تم میری سگی بہن نہیں ہو۔ میں تم سے بڑا ہوں کہ شادی کر دوں گا۔ مجھے تم سے بہت محبت ہے۔"

اور گلرخ نے غصہ سے اس کے منہ پر ایک ٹاپخہ جڑو دیا تھا۔
اس دن کے بعد گلغام نے اسے چھوڑنا اور اپنی بے نیکی باتوں سے تنگ کرنا تو چھوڑ دیا تھا مگر گلرخ کی محبت اس کے دل سے پھر بھی نہ نکل سکی۔

پھر جب وہ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تو گلغام کی محبت میں کمی ہونے کے بجائے اور اضافہ ہو گیا۔

یہ ۱۷۹۷ء کا آغاز تھا۔
نظام الملک نظام دکن نے دلی ارکاٹ والا جاہ نواب محمد علی خاں کو سزا دینے کے لیے نواب حیدر علی والی میسور کو ایک نامہ روانہ کیا جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔

یہ بات نہیں تھی کہ نظام دکن میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ والا جاہ نواب ارکاٹ کو شکست دے سکے بلکہ بات یہ تھی کہ بدلیسی تاجر یعنی انگریز والا جاہ نواب محمد علی کے حلیف تھے اور خطرہ یہ تھا کہ اگر نظام نے ارکاٹ پر حملہ کیا تو والا جاہ اپنے حلیف کو پکارے گا اور انگریزی فوجیں فوراً اس کی مدد کو پہنچ جائیں گی۔

اس متوقع اتحاد سے نظام دکن پریشان تھا اور اسی بنا پر اس نے نواب حیدر علی خاں کو خط لکھا تھا اور ان سے تعاون کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

یہ نامہ جب ملکہ کو تیار ہوا تو اس پر نظام دکن کے دستخط ہو کر مرگ گئی۔ پھر نظام نے اپنے خاص غلام گلغام کو طلب کیا۔ وہ اس کا معتقد خاص تھا۔
"گلغام! نظام نے اسے مخاطب کیا:

”تم نواب بہادر سے وہی کہو گے جو ہم تمہیں بتائیں گے۔ اگر تمہیں خلافِ کرناڑ سے تو نواب سے کہنا کہ کرناٹک کے والا جاہ نے بغاوت کر دی ہے۔ اسے ہم سزا دینا چاہتے ہیں۔ اس کام میں نواب بہادر ہم سے تعاون کریں۔“

”میں سمجھ گیا۔“ گلغام نے فوراً جواب دیا:
”بالکل سمجھ گیا شاہِ معظم۔“

نظامِ دکن نے گلغام کو ایک سرسبز لفظ دیا۔ گلغام نے لفظ لے کر نظام کو سلام کیا اور واپس کا ارادہ کیا ہی تھا کہ نظام کی آواز سنائی دی:

”گلغام! تمہیں مزید کسی تاکید کی ضرورت تو محسوس نہیں ہوتی پھر بھی دوبارہ یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ کام نہایت خفیہ اور اہم ہے۔“
گلغام نے ہلٹ کر اسی طرح سر کو خم کیا جیسے دل و جان سے حاضر ہو۔

گلغام جب نظام کا نام لے کر گھر پہنچا تو اسے کچھ اور ہی خیالوں نے گھیر لیا۔
اس نے اس بات پر پہلے غور ہی نہیں کیا تھا کہ سرنگا پٹم میں اس کا ایک بھائی سردار بھی موجود ہے۔ یہ اس کا وہی بھائی تھا جس سے اس کی چھین میں جنگ ہوا کرتی تھی اور اس جنگ کا باعث ان کی بن گمرخ تھی۔
گمرخ کا خیال آتے ہی اس کا دماغ الٹ گیا۔

پچھلے سال ایک آدمی کرناٹک جا رہا تھا تو اس نے گمرخ کو ایک محبت بھرا خط لکھا تھا۔ اسے اب تک یہ یقین تھا کہ گمرخ اس کی سونیتی بن ہے اور وہ اس سے رشتہ جوڑ سکتا ہے مگر الگ الگ مقامات پر رہنے کی وجہ سے ان کی محبت پر وہ چڑھتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔
گمرخ، گلغام اور سردار۔

اس مثلث نے اس کا دماغ گھما کے رکھ دیا۔ وہ تمام رات انہی خیالوں میں الجھا رہا اور لمحہ بھر نہ سو سکا۔

صبح کو اس کا بدن بے خوابی سے ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے نظام سے کہہ دیا تھا کہ وہ صبح ہوتے ہی سرنگا پٹم روانہ ہو جائے گا مگر وہ پہر تک وہ بستر سے نہ اٹھ سکا۔

”یہ خط بہت اہم اور خفیہ ہے۔ اسے لے کر تمہیں سرنگا پٹم جانا ہے اور مرث نواب حیدر علی خاں کے ساتھ میں دینا ہے۔ میں امید ہے کہ تم اس خط کی پوری پوری حفاظت کرو گے۔“
”شاہ بہادر! اطمینان رکھیے۔“

گلغام نے بڑے وثوق سے کہا:

”میں اس اہم نامہ کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا اور نواب حیدر علی خاں کو پہنچانے آپ کی نظروں میں سرخرو ہوں گا۔“

”میں تم سے یہی امید ہے گلغام۔“

نظام نے اپنی خوشنودی کا اظہار کیا:

”تم کافی تجددار ہو اور تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تم اس نامہ کو جسم کے کون سے حصے میں چھپاؤ گے۔“

”آپ بالکل فکر نہ فرمائیے شاہ بہادر۔“

گلغام نے سینہ تان کر کہا:

”میں اس سے پہلے بھی آپ کے اعتماد پر پورا اتر چکا ہوں۔ اسی طرح اب بھی میں اعتماد بحال رکھوں گا۔“

”ٹھیک ہے گلغام۔“

نظام کو اطمینان ہو گیا:

اب اس سلسلے میں ایک انتہائی خاص بات بھی سن لو۔ وہ یہ کہ دو بادشاہوں کے درمیان جو خط و کتابت ہوتی ہے اس کی تفصیل سمجھنا قاصد کو نہیں بتائی جاتی لیکن اس خط کے مضمون سے تمہیں آگاہ کیا جا رہا ہے اس لیے کہ اگر خدا نخواستہ میں کوئی ایسا وقت آجائے جب تمہیں یقین ہو جائے کہ یہ خط تم سے چھین لیا جائے گا، اس صورت میں تمہیں اختیار حاصل ہو گا کہ تم اس خط کو فوراً ضائع کر دو اور سرنگا پٹم پہنچ کر نواب حیدر علی خاں کے سامنے اس خط کے مضمون کو زبانی عرض کرو۔“

گلغام کی سمجھ میں نہ آیا کہ نظام دکن کیا کہنا چاہتا ہے:

”میں سمجھ نہیں سکتا شاہِ معظم۔ نواب حیدر علی خاں سے میں کیا عرض کروں گا؟“

نظام دکن مسکرایا۔ وہ سمجھ گیا کہ گلغام الجھ گیا ہے:

سوال کیا۔

”اعلیٰ حضرت والا جاہ کو صحیح اطلاع دی گئی۔“ گلفام نے مختصر جواب دیا۔

”اور یہ راز تم ہم پر ظاہر کرنا چاہتے ہو؟“

”یہ بھی درست ہے اعلیٰ حضرت!“

”مگر یہ راز تو نظام دکن کا ہے ہیں اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔“

والا جاہ بڑا ہوشیار حکمران تھا۔ وہ گلفام پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ راز معلوم کرنے کے لیے بے چین ہے۔ پس اس نے پہلو بدل کے اس انداز سے کہا جیسے یہ بات اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

”مگر اعلیٰ حضرت والا جاہ!“ گلفام گھبرا گیا۔

اس کا اندازہ تھا کہ والا جاہ راز معلوم کرنے کے لیے بے چین ہو جائے گا مگر بیاں تو معاملہ ہی الٹ تھا۔

اس نے فوراً خود کو سنبھالا اور حوصلے سے کہا:

”اعلیٰ حضرت یہ درست ہے کہ راز نظام دکن کا ہے مگر اس راز یا اطلاع کا تعلق براہ راست حکومت کرنا ملک سے ہے اور اگر وہ اطلاع آپ کے گوش گزار نہ کی گئی تو آپ کی حکومت کو درست نقصان پہنچ سکتا ہے۔“

والا جاہ پھر بھی لاپرواہ بنا رہا۔ وہ بولا:

”اچھا۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ تمہارے پاس جو راز ہے اس کا تعلق ہماری سلطنت کرنا ملک سے ہے اور تم اسے ہم پر ظاہر بھی کرنا چاہتے ہو تو بھی تم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ تم نظام دکن سے غداری کر رہے ہو۔ ایک ملک کے راز کو دوسرے ملک کے ہاتھ فروخت کرنا غداری کے سوا اور کسی نام سے نہیں پکارا جاسکتا۔ اس سلسلے میں تمہارا کیا جواب ہے؟“

”غلام کو افسوس ہے کہ اسے غلط سمجھا جا رہا ہے۔“

گلفام نے مضبوط لہجے میں کہا:

”حالانکہ میں نے اعلیٰ حضرت پر خود اس راز کو افشا کرنے کی ہمیشہ کش کی ہے۔ اسے راز کو فروخت کرنے کا نام نہیں دیا جاسکتا اس لیے کہ میں نے اس کی کوئی قیمت طلب نہیں کی۔“

شہابی محل کے اندر ہی غلام گردش میں اس کی کھڑکی تھی سب کو معلوم تھا کہ گلفام انعام کا منہ چڑھا غلام ہے اس لیے سب اس سے دور ہی دور رہتے تھے اور اس کے معاملات میں قطعی دخل نہ دیتے تھے۔

شام ہوتے ہوتے اس کا دماغ کچھ ٹھکانے لگا۔ وہ نہادھو کے تیار ہوا۔ وہ ایک نئے فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔

گلفام مختصر سفری سامان لے کر گھوڑے پر سوار ہوا مگر جب اس نے گھوڑے کو ایڑ دی تو اس کا رخ سرنگا پٹم کے بھٹے کرنا ملک کی طرف تھا۔

اس نے واقعی ایک زبردست فیصلہ کیا تھا۔

گلفام اپنی بہن گلرخ کی محبت میں اس قدر اندھا ہو گیا تھا کہ اس نے شاہی راز کو دشمن کے حوالے کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

اس نے کرنا ملک جانے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ وہ نواب والا جاہ محمد علی کے ہاتھ اس راز کو فروخت کرنا چاہتا تھا۔

گلفام نے چلنے سے پہلے اس معاملہ پر اچھی طرح سوچ بچار کر لیا تھا اس کا یہ قدم انتہائی خطرناک تھا۔ وہ کھلے طور پر اپنے آقا اور اپنے ملک دکن سے غداری کر رہا تھا کیونکہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ سرنگا پٹم کے بجائے کرنا ملک پہنچ کے نواب والا جاہ کو یہ یقین دلانے کا کہ نظام دکن اس کے خلاف نواب حیدر علی خاں کا تعاون حاصل کرنا چاہتا ہے جس کا ثبوت وہ خود یعنی گلفام ہے جو نظام کا پیغام لے کر نواب بہادر علی کے پاس جا رہا ہے۔

پھر جب گلفام نے کرنا ملک پہنچ کر نواب والا جاہ کو یہ خبر بھجوائی کہ نظام دکن کا ایک خاص ہرکارہ والا جاہ کو ایک اہم راز سے آگاہ کرنے آیا ہے تو والا جاہ واقعی چونک پڑا۔

”نظام دکن کا ہرکارہ اور کرنا ملک کے دربار میں۔“

اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔

والا جاہ نے گلفام کو فوراً اپنے پاس طلب کر لیا۔

”تمہارا نام؟“ نواب والا جاہ نے گلفام کے فرضی سلام کے جواب میں سوال کیا۔

”غلام کو گلفام کے نام سے پکارا جاتا ہے۔“ اس نے ادب سے جواب دیا۔

”ہم نے سنا ہے تمہارے پاس نظام دکن کا کوئی راز ہے۔“ والا جاہ نے اس سے دوسرا

نواب والا جاہ محمد علی خاں نے گلرخ کو طلب کر لیا۔
 وہ اس اچانک طلبی پر ہنسنے لگا۔ دربار میں پہنچ کے گلخام کو دیکھا تو بھونپکا رہ گئی۔ اُدھر
 گلخام اسے بڑے پیار بھرے انداز میں دیکھ رہا تھا۔
 ”کیوں کینز؟ والا جاہ نے سخت بے چہری میں دریافت کیا:
 ”کیا تم اس آدمی کو پہچانتی ہو؟“
 گلخام نے سر ہلاتے ہوئے ہی جی ہاں سرکار۔ یہ میرا بھائی گلخام ہے جو نظام دکن کی شہرہ
 ”کس طرح کی نوکری کرتا ہے یہ؟“ والا جاہ نے وضاحت چاہی۔
 ”اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی سرکار۔“
 گلخام نے جان چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی:
 ”یہ بہت پرانی بات ہے۔ آٹھ سال پہلے کی۔ جب میں نظام دکن کے محل میں رہتی تھی اس
 وقت میں بہت چھوٹی تھی۔ یہ بتا کر کیا کرتا تھا اور اب کیا کر رہا ہے۔“
 ”جب گلخام تمہارا بھائی ہے تو اتنے عرصے تک تم نے اس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش
 کیوں نہیں کی؟“ والا جاہ نے چھٹا ہوا سوال کیا۔
 ”سرکار۔ جھوٹے دیس کا رشتہ ہی کیا۔ میں کرنا ایک سرکار کی نمک خوار ہوں اور یہ نظام سرکار
 کا غلام۔ رشتہ تو اسی وقت ٹوٹ گیا تھا جب میں کرنا ایک آگئی تھی۔“ گلخام نے بڑی جرأت سے
 جواب دیا۔
 ”تم جاسکتی ہو کینز۔“ نواب والا جاہ نے اسے واپس کر دیا۔
 ”گلخام۔ میں تم پر پہلے ہی اعتماد ہو گیا تھا۔“
 والا جاہ نواب محمد علی خاں نے کہا:
 ”ہم نے تمہاری خواہش پر کینز کو طلب کیا تھا۔ اس نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی کہ تمہارا
 تعلقی نظام حکومت سے ہے۔ اب تم بے دھڑکی اس راز کو ظاہر کر سکتے ہو۔“
 ”جیالہ دے کہ خواہ زمانہ قدیم کے شاہی محلات، ہوں یا آج کل کے حکومتی ایوانات، وہاں ہونے
 والی تمام گفتگو کینز میں اور غلام چھپ چھپ کے سنتے تھے اور محفل معاوضہ پر دوسروں تک
 پہنچتے تھے۔ چونکہ یہ کام مشترکہ طور پر ہوتا تھا اس لیے کوئی کینز یا غلام دوسرے کی شکایت نہ

والا جاہ نے دیکھا کہ غلام تمہارے سے اکھڑا جا رہا ہے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کچھ بتائے۔ بغیر ہی
 ناراض ہو کر چلا جائے۔ اس نے فوراً نرم پڑتے ہوئے کہا:
 ”میں تمہاری صاف گوئی سے بہت خوشی ہوئی گلخام۔ دراصل ہمیں تمہارا امتحان لے رہے
 تھے۔ اس قسم کے واقعات اکثر دیکھنے میں آتے ہیں کہ ادھر ادھر کے لوگ غلط اطلاعات فراہم کر کے
 بھاری معاوضہ وصول کر لیتے ہیں۔“
 بہر حال تم وہ راز ظاہر کرو۔ ہم تمہاری خاطر خواہ خاطر مدارات کریں گے اور اگر کوئی مطالبہ کرو
 گے تو اسے بھی پورا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔“
 ”اعلیٰ حضرت۔ اس معاملہ میں چونکہ ذرا سی غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے اس لیے میں درخواست
 کروں گا کہ پہلے اسے دور کر لیا جائے۔“ گلخام نے بڑی ذہانت سے اپنی اہمیت جتائی۔
 والا جاہ جلدی سے بولا:
 ”میں کوئی غلط فہمی نہیں۔ تم بے فکر ہو گلخام۔“
 ”غلام اعلیٰ حضرت کا شکریہ ادا ہے۔“
 گلخام نے ہلت آگے بڑھائی:
 ”مگر میں بھر بھی یہ چاہتا ہوں کہ اپنی شخصیت، ادبیت اور شرافت کے ثبوت میں آپ کے
 محل سے ایک گواہ پیش کر دوں۔“
 والا جاہ نے چونک کر گلخام کو دیکھا:
 ”کیا کہا تم نے۔ گواہ اور ہمارے محل میں۔ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“ اور والا جاہ کے چہرے پر
 شکیں نمودار ہو گئیں۔
 ”جی ہاں عالی جاہ!“ گلخام نے جواب میں کہا:
 ”آپ کے محل میں گلرخ نام کی ایک کینز ہے۔ آپ اسے طلب کیجیے۔ وہ میری گواہی
 دے گی۔“
 والا جاہ کو تعجب سا ہوا:
 ”میری کینز اور تمہاری گواہی۔ تمہاری بات کچھ مبہم ہے۔“
 ”عالی جاہ۔ ہاتھ کٹیں کو آرسی کیا۔ آپ گلرخ کو بلوایئے تو۔ پھر دیکھیے وہ میری گواہی دیتی
 ہے یا نہیں۔“ گلخام نے زور دے کر کہا۔

کر تا تھا۔

اس ترقی یافتہ دور میں بھی بڑی بڑی حکومتوں کے اہم ترین راز ایسے ہی لوگوں کے ذریعے افشا ہوتے اور تجاری معاہدہ پر دوسروں تک پہنچ جاتے ہیں۔

نواب والا جاہ نے جب گلرخ کو طلب کیا تھا، اسی وقت تمام محل میں کھلبلی مچ گئی تھی اور اکثر کپڑے اور غلام اپنے اپنے مورچوں میں بیٹھ کے دربار میں ہونے والی گفتگو سننے میں لگ گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے گلخام، گلرخ اور نواب والا جاہ کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو سنی تھی۔

اس کے بعد جب گلرخ دربار سے واپس گئی تو اسے بھی فکر ہوئی کہ آخر گلخام، نواب ہادر کے پاس کس غرض سے آیا ہے؟ پس وہاں سے باہر نکلتے ہی وہ بھی ایک ایسی جگہ چھپ کے کھڑی ہو گئی جہاں سے وہ دربار میں ہونے والی گفتگو سن سکتی تھی۔

نواب والا جاہ نے گلخام سے تنہائی میں گفتگو کی تھی۔ دربار کے پہلو والے صحن کمرے میں دونوں میں گفتگو ہوتی تھی اس کے باہر صرف غلام پہرے پر تھا۔

گلخام چونکہ خود بھی ایک حجابی غلام تھا اس لیے اس نے کرناٹک کے دربار میں داخل ہوتے ہوئے ایک سرسری نگاہ میں ہر چیز دیکھ لی تھی۔

جب والا جاہ نے گلخام کو راز ظاہر کرنے کو کہا تو اس نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے عرض کیا:

”اعلیٰ حضرت۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ دروازے پر پہرے دار موجود ہے۔ مجھے راز ظاہر کرنے میں کوئی عذر نہیں بشرطیکہ آپ مطمئن ہوں۔“

نواب نے اس کی احتیاط کو سراہا:

”تم نے درست کہا گلخام۔“

پھر نواب نے تالی بجا کر پہرے دار کو اندر بلوایا:

”تم دربار کے بڑے دروازے پر جا کے پہرہ دو۔ اور خبردار کسی کو اس طرف ہرگز نہ آنے دینا۔“

پھر دربار نواب کا حکم سن کر باہر چلا گیا۔ اس طرح پہرے دار کے گفتگو سن لینے کا خطرہ بھی ختم ہو گیا مگر نواب والا جاہ محمد علی خاں اس بات سے قطعی بے خبر تھا کہ اس کی کینز گلرخ کمرے کی اس

کھڑکی سے چھٹی کھڑی ہے جہاں سے وہ تمام گفتگو آسانی سے سن سکتی ہے۔ صرف وہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ ایک اور کینز اور ایک غلام بھی دربار کی گفتگو سننے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔

ہر طرف سے خطنی ہونے کے بعد گلخام نے اپنی ممکنہ عداوت کا ثبوت دیتے ہوئے نظام دکن کا راز افشا کیا:

”اعلیٰ حضرت۔ میرے آقا نظام دکن نے حیدر علی خاں والی سرنگاپٹم کو میرے ذریعے پیغام بھیجا ہے کہ تاجر پیشہ انگریز کرناٹک کے سرکش صوبیدار محمد علی خاں کی ملکیت سے جو فنی ہند میں اپنی حکمرانی کے لیے زمین ہموار کر رہا ہے اس لیے نظام دکن یہ چاہتے ہیں کہ وہ حیدر علی خاں کے تعاون سے کرناٹک کے صوبے دار اور اس کے علاقہ کو اپنے قبضہ میں لے لیں۔“

گلخام نے مانتی لے کر اپنی بات جاری رکھی:

”یہ پیغام لے کر میں سرنگاپٹم جا رہا ہوں اور جو جواب حیدر علی خاں مجھے دے گا وہ میں نظام کو پہنچاؤں گا۔“

میں نے اس مسئلے پر جب ٹھنڈے دل سے غور کیا تو اسی نتیجہ پر پہنچا کہ اگر نظام دکن اور حیدر علی خاں کا مشترکہ لشکر کرناٹک پر حملہ آور ہو اور اہمیت خون سے گاؤں ہزاروں بے گناہ مارے جائیں گے اور اور۔“

گلخام کہتے کہتے گھر گیا۔ اس کی آواز گلے میں اٹک گئی۔ اس موقع پر نواب والا جاہ نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا:

”کہو کہو۔ اور کیا کہنا چاہتے ہو؟“

اور یہ کہ اعلیٰ حضرت جانتے ہیں کہ میں میری بہن گلرخ بھی موجود ہے۔ آخر گلخام نے دل کی بات اگل دی۔

”تمہیں اپنی بہن سے بہت محبت ہے گلخام؟“ نواب والا جاہ نے بڑی تنگی نظر دلا سے گلخام کو دیکھی۔

گلخام کا سر جھکا ہوا تھا اس لیے وہ نواب کی نظروں اور تیجہ بوجھ محسوس نہ کر سکا۔

”جی ہاں اعلیٰ حضرت۔ گلرخ صرف میری بہن ہی نہیں بلکہ منگیتر بھی ہے مگر ذرا بد دلانہی واقع ہوئی ہے۔“

والا جاہ چونک پڑا:

بہم ملازم تھا۔

نواب والا جاہ نے گلغام کو گمان خانے میں بھیج کے فوراً اپنے نائب کو بلوایا اور اسی وقت اپنے حلیف انگریزوں کو ایک خط لکھوایا :

”ہمارے فوجی جاسوسوں نے نظام الملک نظام دکن کے ایک نامور کو گرفتار کیا ہے جس کے قبضہ سے ایک اہم خط برآمد ہوا۔ اس خط میں نظام دکن نے نواب حیدر علی خاں کو لکھا ہے کہ غیر ملکی انگریز تاجر وائی کرناٹک یعنی میر سے تعاون سے جنوبی ہند پر قبضہ کرنے کے لیے راہ ہموار کر رہا ہے اس لیے نواب حیدر علی خاں اور نظام دکن کو مشترکہ لشکر کے ساتھ انگریزوں اور کرناٹک کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہیے۔ خط سے جاننے والا قاصد ہمارے قبضہ میں ہے۔ آپ سے التماس ہے کہ فوری طور پر آپ نظام دکن کو حیدر علی خاں کے ساتھ ٹھٹھ جوڑ کرنے سے کسی بھی طرح روکنے کی کوشش نہ کیجیے اور نظام کو کچھ لاپ دے کہ اس بات پر آمادہ کیجیے کہ وہ حیدر علی خاں کا تعاون حاصل کرنے کے بجائے آپ کا اور ہمارا تعاون حاصل کرے تاکہ ہم سب مل کر حیدر علی کی زور پکڑتی طاقت کو ختم کر دیں“

والا جاہ نے یہ خط انگریزی میں ترجمہ کرا کے انگریزوں کے صدر مقام مدراس روانہ کیا۔ اس بروقت اطلاع کے ملنے سے والا جاہ بہت خوش تھا کیونکہ نظام اور حیدر علی کے گٹھ جوڑ میں انگریزوں سے زیادہ اس کا نقصان مضر تھا۔ کرناٹک پر حملہ کی صورت میں انگریز کرناٹک کی مدد کو ضرور آتے ، کیونکہ والا جاہ دراصل انگریزوں کا ماتحت ہو گیا تھا لیکن انگریزوں کی طاقت اس قدر نہ گئی کہ وہ نظام اور حیدر علی کے دھبے چلے کا مقابلہ کر سکتے۔

والا جاہ کے شاہی محل سے شام کے وقت ایک قاصد مدراس روانہ ہوا اور اسی محل سے نصف شب کے بعد ایک اور قاصد روانہ ہوا مگر اس کا رخ کرناٹک سے مدراس کے بجائے مرزا پٹم کی طرف تھا۔ یہ قاصد شاہی محل کا ایک غلام تھا جسے گلگرخ نے اپنے تمام زیورات حوالے کر کے اہمیت پر آمادہ کیا تھا کہ وہ فوراً مرزا پٹم پہنچے اور وہاں سردار علی سے جو حیدر علی فوج میں ملازم ہے، ملے اور اسے یہی غلام دے کہ نظام دکن کا قاصد مرزا پٹم روانہ ہوا تھا مگر والا جاہ کے فوجیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا ہے اور

”اچھا تو یہ بات ہے۔ خیر ہم تمنا رخیال رکھیں گے۔ تم دو چار دن ہمارے گمان رہو۔ ہم کچھ غور و فکر کریں گے اور اس دوران گلگرخ سے بھی دریافت کریں گے۔“

گلغام کی تو باجیس کھل گئیں۔ اس نے سمجھ لیا کہ بس اب ہالار لیا۔ اس کا چھوٹا دماغ اس کے سوا اور سوچ بھی کیا سکتا تھا۔

نواب والا جاہ کے حکم پر گلغام کو تنہا ہی گمان خانے میں پہنچا دیا گیا اور وہ اپنے تصور میں گلگرخ کو لیے گمان خانے کے لوازم میں پھنس گیا۔

ادھر والا جاہ کو اپنی فکر بگڑ گئی۔ کرناٹک کا صوبہ اگرچہ ایک علیحدہ حکومت تھی جس کا وہ بلا شرکت غیر سے حکمران تھا لیکن دہلی دربار کے فرمان کے مطابق نظام دکن کو کرناٹک کی یہ سیادت دی گئی تھی کہ کرناٹک کا ہر نواب نظام دکن کی مرضی سے مقرر ہوتا تھا۔

نواب والا جاہ بالکل خود مختار صوبے دار تھا لیکن اسے دہلی دربار کی یہ شقی بھی گوارا نہ تھی کہ کرناٹک کے گورنر کا تقرر نظام دکن کی مرضی سے کیا جائے۔

دہلی دربار کے فرمان کی اس شقی کو دور کرنے کے لیے نواب محمد علی خان نے تلک دودو شروع کیا اور آخر وہ اس میں کامیاب ہو گیا۔

دہلی دربار سے تاحذر ہند کا ایک فرمان جاری ہوا جس میں نواب محمد علی خان کو کرناٹک کا نہ صرف خود مختار حکمران تصور کیا گیا بلکہ اسے ”والا جاہ“ کا خطاب بھی دیا گیا۔

اس فرمان سے نظام دکن پر جیسے بھی گہری۔ نواب والا جاہ نے اس فرمان کے جاری ہوتے ہی نظام دکن سے آنکھیں پھیریں اور اپنی طاقت بڑھانے کے لیے اس نے انگریزوں سے ایسا گٹھ جوڑ کیا کہ انگریز اور والا جاہ ہم پیالہ دہم فالہ ہو گئے۔

نواب والا جاہ کی اس سرکشی اور غرور کے پیش نظر ہی نظام دکن نے نواب حیدر علی خاں کے تعاون سے کرناٹک پر قبضہ کرنے کا سوچا تھا اور اس سلسلے میں ایک خط اپنے خاص غلام گلغام کے ہاتھ مرزا پٹم پہنچوایا تھا لیکن غلام گلغام نے اس راز کو اپنی ایک طرف نہ بھرتا رہا اور اپنی غیبیہ گلگرخ کو حاصل کرنے کے لیے کرناٹک پہنچ گیا۔

حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ گلغام اور گلگرخ سگے بہن بھائی تھے مگر گلغام کے دماغ میں یہ بیٹھ گیا تھا یا کسی نے بٹھا دیا تھا کہ وہ گلگرخ کا سوتیلہ بھائی ہے اور یہ کہ وہ گلگرخ سے شادی کر سکتا ہے جبکہ گلگرخ کو اپنے سوتیلے بھائی سردار علی سے محبت تھی جو ان دنوں مرزا پٹم میں نواب حیدر علی خاں کی فوج

اس نے تمام راز اگلی دیے ہیں۔ اور اس نے والا جاہ کو بتایا ہے کہ نظام دکن، نواب حیدر علی خاں کا تعاون حاصل کرنا چاہتا ہے۔ بس اگر نظام دکن کاٹنا صد کفام سرنگا پٹم پہنچے تو اس کی کسی بات کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔ نواب حیدر علی خاں کو اپنے طوط پر جنگ کی تیاری کرنی چاہیے کیونکہ والا جاہ نے انگریزی فوج کو بلوانے کے لیے قاصد روانہ کر دیا ہے اور سرنگا پٹم پر چند دنوں بعد حملہ ہو سکتا ہے۔ پھر ایسا ہوا کہ کرناٹک کے شاہی کل سے چلنے والے دو نوں نامبر اور پیامبر اپنے اپنے مقام پر پہنچے۔ والا جاہ کا نامہ برادر اس پہنچا۔

اور —

گلبرخ کے بچے ہوئے پیامبر نے سرنگا پٹم میں قدم رکھا۔



مردار علی حیدر علی فوج کا ایک عام سپاہی تھا۔ مگر — یہ عام سپاہی اپنی ہنس مکھ طبیعت، چٹکلوں اور لطیفوں کی وجہ سے خاص آدمی بن گیا تھا۔ حیدر علی فوج کے تمام چھوٹے بڑے عہدیدار مردار علی کی پُر لطف باتوں سے غفلت ہوتے تھے اور وہی وجہ تھی کہ وہ فوجیوں کی محبوب اور مقبول شخصیت بن گیا تھا۔ چنانچہ —

ارکاٹ سے آنے والے اس غلام کو جو گلبرخ کا پیغام لے کر سرنگا پٹم پہنچا تھا، مردار علی کو تلاش کرنے میں کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ پیامبر نے فوجی بستی میں پہنچ کے جب مردار علی کے بارے میں دریافت کیا تو کئی فوجی اسے ساتھ لے کر مردار علی کے پاس پہنچے۔

”لو سنبھالو اپنے مہمان کو!“ ایک نے ہنس کر کہا۔

”مردار۔ ہم نے مہمان کو تمہارے پاس پہنچا تو دیا ہے مگر اپنے مہمان کی وجہ سے ہیں فراہوش نہ کر دینا“ ایک دوسرے سپاہی نے اسے چھیڑا۔

”میرے بھائیو۔ تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے میرے مہمان کو ٹھیک پہنچا دیا۔“ مردار نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

”مگر اب خدا کے لیے میری جان چھوڑو تاکہ میں اپنے مہمان کی خاطر مدارات کر سکوں۔ اس سے

’ہاں ہاں ضرور سناؤ۔ میں بالکل ہوش میں ہوں۔ بس ذرا یونی —“ اور مردار علی کہتے کہتے رک گیا جیسے شرمایا گیا ہو۔

قاصد نے ادھر ادھر دیکھ کر زوارانہ انداز میں کہنا شروع کیا:
’ذرا کان کھول کے سنو مردار علی۔ میں اس وقت تم سے جو کچھ کہ رہا ہوں یہی کچھ تم نواب حیدر علی خاں کے سامنے دہراؤ گے۔“

’میں — میں نواب بہادر کے پاس کیسے جاؤں گا؟“ مردار علی نے بات لٹا دی:
’مجھ جیسے معمولی سپاہی سے نواب بہادر کیوں ملیں گے؟“
’تم خواہ مخواہ پریشان ہو گئے مردار علی تو قاصد نے اسے تسلی دی:

’یہ بات اتنی اہم ہے کہ نواب بہادر تمہیں انعام دیں گے۔ پہلے تم ہی تو نو!“
’اچھا۔ تم کہتے ہو تو سن لیتا ہوں۔“

مردار کو پسینہ آ گیا تھا۔
قاصد نے آہستہ آہستہ ہاتھ ٹھٹھکے گھر خ کا پیغام لے لیا۔ پیغام سن کے مردار علی اور زیادہ گھبرا گیا۔

قاصد بھائی: ’اس نے تھوک نکلے ہوئے کہا:
’تم جو پیغام لائے ہو وہ ضرور سچ ہو گا مگر میں نواب بہادر کے سامنے اسے کس طرح بیان کر سکوں گا۔ میں تو ان کے سامنے بول ہی نہ سکوں گا۔“

’مردار علی۔ تم بڑے بزدل آدمی ہو۔ سپاہی ہو کر ایسے ڈر پک۔ معلوم نہیں تم میدان جنگ میں کیسے لڑتے ہو گے؟“ قاصد بڑبڑانے لگا۔ اسے مردار علی پر غصہ آ رہا تھا۔

’دیکھو بھائی۔ میدان جنگ ادب لگے ہے اور نواب بہادر کا دربار اور جگہ۔“ مردار علی نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی:

’پھر بھی اگر تم مجھے ڈر پک کہتے ہو تو میں تسلیم کیے لیتا ہوں لیکن میں نواب بہادر کے سامنے یہ سب کچھ نہ کہہ سکوں گا۔“

’پھر اور کون کہے گا؟“ قاصد بگڑ گیا:

’اس بے چاری گھر خ نے تم تک یہ بات پہنچانے کے لیے مجھے اپنے مارے زیور دے دیے

باتیں کر سکوں۔

اسی مختصر نوک جھونک کے بعد جب مردار علی کے یار دوست رخصت ہو گئے تو اس نے اپنے مکان سے دریافت کیا۔

’میرے مکان بھائی۔ ان کم بختوں کی بک بک میں میں آپ سے ایک بات بھی نہیں کہہ سکا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اسی سے پہلے آپ کو کہا دیکھا تھا!“

ارکاٹ کے قاصد نے جواب دیا:

’مردار بھائی۔ آپ اپنی یادداشت پر زور نہ دیکھیے اس لیے کہ آپ مجھ سے کبھی نہیں ملے اور نہ میں نے آپ کو اس سے پہلے دیکھا ہے۔“

’آپ بڑے سچے اور کھرے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔“ مردار نے بڑے غلوں سے کہا:
’کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں اور میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

قاصد نے جواب میں کہا:

’میرے بھائی مردار علی۔ میں ارکاٹ سے آیا ہوں جہاں کے حکمران نواب محمد علی والاہ ہیں۔“
’اچھا تو آپ ارکاٹ سے تشریف لائے ہیں!“ ارکاٹ کا نام سن کر مردار علی کا دل بیچوں اچھلنے لگا تھا۔

’جی ہاں۔ میں ارکاٹ سے آیا ہوں اور آپ کے لیے گھر خ کا ایک نہایت اہم پیغام لایا ہوں۔“
قاصد نے بے وھڑکی ہو کے گفتگو شروع کی۔

’گھر خ؟“

مردار علی نے حیران نظروں سے پیامبر کو دیکھا:

’کیا تم گھر خ کو جانتے ہو؟“

’شاید تم ہوش میں نہیں ہو مردار علی۔ پیامبر نے جواب دیا:

’میں کہہ رہا ہوں کہ میں گھر خ کا پیغام لایا ہوں اور تم مجھ سے پوچھ رہے ہو کیا میں گھر خ کو جانتا ہوں۔ تم ہوش میں آؤ تو میں تمہیں وہ اہم پیغام سناؤں جسے سنانے کے لیے میں خطوں کی پرواہ نہ کرتا ہوں۔ یہاں تک پہنچا ہوں اور جس کے لیے گھر خ نے مجھے منہ مانگا معاوضہ ادا کیا ہے!“

چلنے والا ہے۔ وہ ہیں کیا پیغام بھیج سکتا ہے۔ کیوں ہیبت خاں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟
 ہیبت خاں خود بہت حیران تھا۔ اس نے کہا:

”نواب بہادر صاحب نے درست فرمایا۔ نواب ارکاٹ تو ہمارا سخت مخالف ہے۔ پھر بھی قاصد کی بات سننے میں کیا حرج ہے۔ میری درخواست ہے کہ اسے حاضر ہونے کی اجازت دی جائے۔“

”ٹھیک ہے۔“

نواب بہادر نے محفوظ کا طرف دیکھا:
 ”ان دونوں کو پیش کیا جائے۔“

محافظ کے جانے کے بعد نواب بہادر پھر ہیبت خاں سے گفتگو میں مصروف ہو گئے۔
 اس دوران محافظ نے باہر جا کر سردار علی کو بتا دیا کہ وہ ارکاٹ کے قاصد کو جا کر اپنے ساتھ لے آئے۔ نواب بہادر نے ان دونوں کو باریابی کی اجازت دے دی ہے۔
 سردار علی بھاگتا ہوا قاصد کے پاس پہنچا اور ذرا دیر بعد اپنا کاپٹا قاصد کو لے کر واپس آ گیا۔

”ہم حاضر ہیں۔ ہمیں پیش کر دو نواب بہادر کے حضور۔“ سردار علی نے پھولی ہوئی سامانوں کے درمیان کہا۔

محافظ نے دونوں کو نواب بہادر کے سامنے پیش کیا۔ سردار علی اور ارکاٹ کے قاصد نے ان کو تعظیم پیش کی اور سر جھکا کے کھڑے ہو گئے۔

”تم میں سردار علی کون ہے؟“ نواب بہادر نے دریافت کیا۔

”میں ہوں نواب بہادر۔“ سردار علی نے سراٹھایا۔

”ارکاٹ سے تمہارے پاس کوئی پیغام آیا ہے؟“

”جی نواب بہادر۔“

سردار نے کھٹی کھٹی آواز میں جواب دیا:

”پیغام میرے نام آیا ہے مگر وہ آپ کے لیے مرنگلا پٹم کے حکمران کے لیے ہے۔“

”بیان کرو۔ کس کا پیغام ہے اور کیا پیغام ہے؟“

سردار نے قاصد کو کہنی ماری:

”ہیں اور ایک تم ہو کہ جسے نہ گلبرخ کا خیال ہے اور نہ اس بات کی اہمیت کا کوئی احساس ہے۔“

قاصد بھاٹی: ”سردار بجا جت سے بولا:

”میں گلبرخ کا اور تمہارا دونوں کا بہت بست شکر گزار ہیں اور تم سے امید کرتا ہوں کہ جس حفاظت سے تم نے یہ پیغام بھرنک پہنچایا ہے بالکل اسی طرح تم اسے نواب بہادر تک پہنچا دو گے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

قاصد کا بارہ چڑھ گیا:

”میں نے پیغام پہنچانے کا کام انجام دے دیا اب تم جانو اور تمہارا کام۔ میں واپس ارکاٹ جا رہا ہوں۔“

قاصد واقعی جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

سردار علی نے اس کے پیر پکڑ لیے:

”میرے بھائی۔ میرے دوست۔ میں تمہارے ساتھ نواب بہادر کے پاس چلوں گا لیکن ان سے

بات تم کرو گے۔ خدا کے لیے بھر پور یہ احسان کرو۔“

قاصد کو اس پر رحم آ گیا۔ پھر وہ مسکراتے لگا:

”اچھا۔ مجھے لے چلو نواب بہادر کے پاس۔ میں خود بات کروں گا ان سے۔“

سردار علی خوش ہو گیا۔ اور قاصد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا:

”تم یہیں بٹھرو۔ میں نواب بہادر سے اجازت لے کر ابھی آتا ہوں۔“

نواب بہادر حیدر علی جاں اپنے ایک سردار ہیبت خاں سے گفتگو کر رہے تھے کہ ان کے محافظ

نے داخل ہو کر عرض کیا:

”نواب بہادر کا اقبال بلند ہو۔ سردار علی نام کے ایک سپاہی نے درخواست پیش کی ہے کہ اس

کے پاس ارکاٹ سے ایک قاصد آیا ہے۔ اس کے پاس نواب بہادر کے لیے ایک ضروری پیغام ہے۔

اجازت ہو تو ان دونوں کو حاضر کیا جائے؟“

نواب بہادر نے حیرانگی سے پہلے محافظ اور پھر ہیبت خاں کو دیکھا:

”ارکاٹ سے قاصد آیا ہے۔ یہ بات کچھ مجھ میں نہیں آتی۔ والا جاہ محمد علی نوانگر بزدل کے جوتے

سردار علی، نواب بہادر کے اس چبھتے ہوئے سوال سے پریشان ہو گیا مگر فوراً ہی سنبھل کر اس نے کہا:

عالی جاہ۔ ارکاٹ کے قاصد نے جو پیغام مجھے دیا تھا اس میں کچھ اور باتیں بھی تھیں مثلاً یہ کہ اگر خدا خواستہ نواب ارکاٹ اور انگریزوں نے نظام دکن کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تو حکومت مرگنا پٹم بڑی مشکل میں گرفتار ہو جائے گی اور اگر جنگ ہوئی تو دونوں طرف سے مسلمان لڑیں گے اور بھائی بھائی کا گلا کاٹے گا۔

اس کے علاوہ عالی جاہ گلبرخ میری سوتیلی بہن کے ساتھ ساتھ منگیتر بھی ہے۔ اسے یہ امید ہے کہ نواب بہادر ارکاٹ پر قبضے کے بعد ہم دونوں کی شادی کر دیں گے۔

نواب بہادر کا ذہن اگرچہ اس خبر سے پریشان ہو گیا تھا لیکن وہ سردار علی کے آخری جملے پر مسکراتے بغیر نہ سکے۔

”ٹھیک ہے سردار علی۔ تم جاسکتے ہو لیکن ارکاٹ کے قاصد کو چند روز تک تم اپنا ہمان رکھو گے اور پوری طرح اس کی حفاظت کرو گے۔ تمہارے سگے اور سوتیلے رشتوں کے بارے میں چند دنوں کے بعد۔“

نواب حیدر علی کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ پہرے دار نے اندر آ کر اطلاع دی:

”نواب بہادر کا اقبال بلند ہو۔ نظام دکن کا قاصد حاضر ہے اور اذن باریابی چاہتا ہے۔“

حیدر علی خاں نے سردار علی کو دوسرے رستے سے باہر بھیج دیا۔ پھر نظام دکن کے قاصد کو اندر بلوایا۔

نظام دکن کا قاصد، گلبرخ کا سگہا اور سردار علی کا سوتیلہ بھائی گلغام، نواب بہادر کے سامنے پیش کیا گیا۔ گلغام آداب بجالایا۔

نواب بہادر نے اسے غور سے دیکھا۔ پھر پوچھا:

”تمہارا نام گلغام ہے؟“

گلغام کو ذرا تعجب ہوا مگر وہ سنبھل کر بولا:

”اعلیٰ حضرت نے درست فرمایا۔ میرا نام گلغام ہے۔“

”قاصد بھائی جو پیغام لائے ہو بیان کر دو۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

ارکاٹ کے قاصد نے سر اٹھا کر گستاخ شروع کیا:

”اے نواب بہادر۔ اے مسلمانوں کے سچے بہادر حکمران! ارکاٹ سے پیغام لے کر میں آیا ہوں۔ یہ پیغام ارکاٹ کے شاہی محل کی ایک کینز گلبرخ کی طرف سے سردار علی، جو مرنگا پٹم کی فوج کا ایک سپاہی ہے، کے نام ہے لیکن پیغام میں جو بات لکھی گئی ہے اس کا تعلق سلطنت میسور اور مرنگا پٹم سے ہے جسے میں آپ کے دربار میں پیش کر رہا ہوں۔

عالی مقام نواب بہادر۔ حیدر آباد دکن کے حکمران نظام دکن نے ایک خط اپنے قاصد گلغام کے ہاتھ آپ کے پاس روانہ کیا تھا جس میں انہوں نے یہ خواہش کی تھی کہ اگر آپ پسند فرمائیں تو دکن کے تعاون سے انگریزوں اور ان کے حلیف نواب ارکاٹ کا خاتمہ کرنے پر آمادہ ہیں لیکن گلغام اس خط کو لے کر مرنگا پٹم آنے کے بجائے نواب ارکاٹ کے پاس جا پہنچا اور اس نے نواب پر یہ راز افشا کر دیا۔ راز افشا کرنے اور نواب سے صلہ حاصل کرنے کے بعد وہ اب آپ کے پاس آ رہا ہے آپ کو یہ اطلاع دینا اس لیے ضروری تھا کہ نواب ارکاٹ نے اس راز کو بابتے ہی فوراً اپنا ایک قاصد انگریزوں کے پاس روانہ کر دیا ہے کہ وہ ایک تو نظام دکن کو مرنگا پٹم کے ساتھ تعاون کرنے کے بجائے انگریزوں اور نواب ارکاٹ سے تعاون پر مجبور کریں۔ پھر دونوں لشکر کر مرنگا پٹم پر حملہ کر دیں۔“

نواب بہادر نے یہ اہم پیغام بڑی توجہ سے سنا۔ پھر سردار علی سے سوال کیا:

”سردار علی۔ تم تمہاری نیت پر کسی قسم کا شبہ نہیں کرتے لیکن یہ ضرور معلوم کرنا چاہیں گے کہ نواب ارکاٹ کے محل سے پیغام بھیجنے والی کینز سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“

عالی جاہ۔ گلبرخ میری بہن اور قاصد گلغام میرا سوتیلہ بھائی ہے۔ سردار علی جواب دے کر خاموش ہو گیا۔

دراصل نواب حیدر علی خاں کا اپنے لشکر پر بڑا عب تھا۔ وہ خوش ہوئے تو جہل نادر کو نہال کر دیتے اور غاروں کے ساتھ وہ قطعی طور پر کوئی رعایت نہ کرتے تھے۔

”سردار علی۔“ نواب بہادر نے زم بچے میں کہا:

”مانا کہ پیغام بھیجنے والی کینز تمہاری بہن ہے لیکن اس نے یہ پیغام صبح کر کیا اپنے آقا نواب والا جاہ سے غداری نہیں کی؟“

"کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ ہم تمہارا نام جانتے ہیں؟" نواب بہادر نے اسے گھور کر دیکھا۔
 "اعلیٰ حضرت۔ اس میں تعجب کی کوئی بات ہے۔ میرا سوتیلّا بھائی سرنگاپٹم کی فوج میں ہے، اس
 نے آپ کو بتایا ہوگا۔" گلغام نے اپنے آپ پر قابو پا کر کہا۔
 نواب بہادر نے عکس کیا کہ قاصد کافی چالاک ہے۔
 "خیر۔ تم اپنے آنے کا مقصد بیان کرو۔"

گلغام نے اندر کی جیب میں ہاتھ ڈال کے ایک بند لٹافہ نکالا اور نواب بہادر کے سامنے پیش
 کیا۔ حیدر علی خاں نے لٹافہ لے کر قریب کھڑے اپنے میرمنشی کے حوالے کیا۔
 خیال رہے کہ گلغام کے پاس یہ خط اس وقت بھی تھا جب اس نے والا جاہ محمد علی والی ارکا
 سے اس سلسلے میں گفتگو کی تھی مگر اس نے والا جاہ کو زبانی ہی سب کچھ بتایا تھا اور خط دکھانے کا
 خواہ مول نہیں لیا تھا۔

گلغام نے خط دیتے ہوئے کہا:

"اعلیٰ حضرت: نظام دکن کا یہ والا نامہ میں اپنی جان پر کھیل کر اور سینے سے لگا کے لایا ہوں۔
 مجھے یہ تو علم نہیں کہ اس میں کیا تحریر کیا گیا ہے لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ اس میں یقیناً کوئی اہم بات لکھی
 ہوگی اس لیے کہ اعلیٰ حضرت اپنے اہم خطوط کے لیے مجھے ہی نامہ بر بناتے ہیں۔"
 حیدر علی خاں، گلغام کی اس لٹافہ پر دل میں ضرور ہنسنے لگے مگر انھوں نے اسے اس
 پُر فریب گفتگو کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ میرمنشی کو حکم دیا:
 "نظام دکن کا نامہ پڑھا جائے۔"

میرمنشی نے القاب و آداب کے بعد اصل مضمون پڑھا۔ لکھا تھا:

"یہ تاہر پیشہ انگریزوں کو ناکھ کے سرکش صوبے دار کے ذریعے
 اپنی حکمرانی کی زمین ہوا کرنے میں لگے ہیں اور علاقہ کرناٹک میں مکمل
 طور پر اپنا تسلط جما چکے ہیں۔"

ہمارا ارادہ ہے کہ آپ کے تعاون سے اس علاقہ (کرناٹک) کو دوبارہ
 اپنے قبضے میں لے آئیں۔"

نظام دکن کے اس خط میں وہی بات تحریر تھی جو سردار علی کے پاس آنے والے قاصد نے ابھی
 ذرا دیر پہلے حیدر علی خاں کو بتائی تھی۔ اس سے سب سے پہلے تو حیدر علی خاں کو اس بات کی خوشی ہوئی

کہ ارکاٹ (کرناٹک) کے قاصد نے کسی قسم کی غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔

دوسری بات انہوں نے یہ محسوس کی کہ خط لانے والا قاصد گلغام بڑا شاطر اور چالاک ہے اور
 باتیں بنانا بھی خوب جانتا ہے۔

"تو — یہ خط تم سینے سے لگا کر لائے ہو اور تم نے اس کی پوری طرح حفاظت کی ہے؟"
 نواب بہادر نے گلغام کو تنگی نظروں سے دیکھا۔

"جی اعلیٰ حضرت۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ایک محترم قاصد کو سلام و پیام اور خطوط کی کس طرح
 حفاظت کرنی چاہیے؟" گلغام، حیدر علی خاں کی تنگی نظر کو شاید محسوس نہ کر سکا اور اپنی شیخی
 بگھارنے لگا۔

"گو یا، تم یہ نامہ نظام دکن کے ہاتھ سے لے کر سیدھے میرے پاس آ رہے ہو؟" نواب بہادر
 کے لہجے میں سختی کچھ اور بڑھ گئی تھی مگر گلغام اسے محسوس نہ کر سکا۔

"جی اعلیٰ حضرت۔ میں بالکل سیدھا آپ کی خدمت میں آیا ہوں۔ میں نے راستے میں اپنے
 آرام کی کوئی فکر نہ کی تھی۔"

گلغام نے پہلے سے زیادہ وثوق سے کہا اور اس طرح نواب حیدر علی خاں کی طرف دیکھا جیسے وہ
 اپنی محنت اور کارنامے کی داد چاہتا ہو۔

مگر —

نواب حیدر علی خاں سے نظریں ملتے ہی وہ جھجکا اور اس کی نظریں جھک گئیں۔
 "اُدھو اُدھو! قاصد تو نے من اپنے آقا ہی کو دھوکہ نہیں دیا بلکہ میں بھی فریب دینے کی
 کوشش کر رہا ہے۔"

نواب بہادر شیر کی طرح گر بجے:

"کیا یہ جھوٹ ہے کہ تو اس خط کے ساتھ پہلے والا جاہ محمد علی کے پاس کرناٹک گیا تھا اور اس
 پر یہ راز ظاہر کرنے کے بعد ہمارے پاس آیا ہے؟"

گلغام ہکا بکا رہ گیا۔

موت اسی کی نظروں میں ناپچنے لگی۔ اس کی سمجھ میں اور تو کچھ نہ آیا، سوائے اس کے کہ وہ فوراً
 زانوؤں پر جھک گیا اور گڑ گڑایا:

"نواب بہادر۔ رحم کیجیے۔ میں خطا وار ہوں۔ آپ کا جرم ہوں۔ مجھے معاف کر دیجیے نواب بہادر۔"

میں دخل نہیں دیتی لیکن اس ملک سے ہمارے تجارتی مفادات وابستہ ہیں اس لیے ہمیں اپنے دوستوں کی ہر وقت ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

چونکہ شاہ دکن ہمیشہ سے ہمارے دوستوں کی نصرت میں شامل رہے ہیں اس لیے ہم انہیں اس اہم موقع پر تنہا نہیں چھوڑیں گے۔
نظام دکن کو اس کی طرف سے اشارہ ملا تو وہ بھی بولا:

”اس کا مطلب ہے کہ حیدر علی سے جنگ کی صورت میں انگریز فوج ہمارا ساتھ دے گی؟“
نظام کا انداز سوالیہ تھا۔

انگریز قاصد نے فوراً جواب دیا:
”بالکل۔ آپ کا ساتھ ضرور دیا جائے گا۔ انگریز شکم کو آپ ہر وقت اپنی مدد کے لیے آمادہ پائیں گے۔“

نظام دکن بہت چالاک تھا اس نے دریافت کیا:
”ہماری مدد کی صورت میں انگریز ہم سے کس قسم کے صلہ کی توقع رکھتے ہیں۔ آپ لوگ یعنی کپینی والے چونکہ تجاوت پیشہ ہیں اس لیے نفع نقصان کی بات پہلے طے کر لی جائے تو بہتر معلوم ہوتا ہے۔“

جنرل اسمتھ کو پہلے ہی قدم پر نفع حاصل ہو گیا۔
وہ تو اپنی جگہ گھبرا یا ہوا تھا اور ہر صورت میں نظام دکن کا تعاون چاہتا تھا تا کہ حیدر علی خاں کی بڑھتی ہوئی طاقت پر قابو پایا جاسکے مگر اب اس کے قاصد نے سنارقی سطح پر پہلے ہی فتح حاصل کر لی تھی اور نظام دکن کچھ حاصل کرنے کے بجائے انگریز کا تعاون حاصل کرنے کے لیے اپنی طرف سے کچھ دینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

قاصد نے بڑی شان سے کہا:
”شاہ ہمارے۔ میں دراصل آپ کو خطرے سے آگاہ کرنے آیا تھا۔ جہاں تک کپینی کے تعاون اور صلہ کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں کوئی بات میرے ذہن میں نہیں ہے۔ اگر شاہ والا ہتیار اس سلسلے میں مبری کچھ رہنمائی کریں تو زمین نوازش ہوگی۔“

نظام دکن کو دراصل ایک طرف تو حیدر علی سے خطرہ تھا اور دوسری طرف وہ کپینی کی طاقت سے بھی خائف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ نواب والا جاہ محمد علی انگریزوں کی گود میں بیٹھا ہے۔ یہ بات سب

انگریز قاصد دیر تک نظام کا منہ تکتا رہا کہ شاید وہ کچھ اور کہے گا مگر نظام نے تو جیسے چپ سا دھلی تھی آخر قاصد کو خود ہی بولنا پڑا۔

”اے شاہ دکن۔ میں آپ کا شکریہ جنرل اسمتھ تک پہنچا دوں گا لیکن صرف شکریہ ادا کرنے سے تو وہ خطرہ نہیں ٹلے گا جس کی اطلاع جنرل صاحب نے آپ کو میرے ذریعے دی ہے۔“
”قاصد نے ٹھیک کہا۔“

نظام دکن اور زیادہ معصوم بن گیا:
”لیکن جنرل اسمتھ کی اطلاع کے تحت میں موائے اپنا دفاع مضبوط کرنے کے اور کیا کر سکتا ہوں۔“

انگریز قاصد تو موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے فوراً کہا:
”شاہ محترم! صرف مضبوط دفاع ہی دشمن کے حملے کو نہیں روک سکتا۔ آپ مجھ سے کہیں زیادہ تجربہ کار ہیں۔ آپ کو ضرور یہ علم ہو گا کہ بعض اوقات دشمن کا حملہ روکنے کے لیے خود میں پر حملہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔“

”ٹھیک کہا تم نے۔“
نظام نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا:
”لیکن شاید تمہیں اس بات کا علم نہیں کہ حیدر علی کی طاقت اس قدر بڑھ چکی ہے کہ ہم خود اس پر حملہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ حیدر علی کو فرانسیسیوں کا تعاون بھی حاصل ہے۔“

”اے فرانسیسیوں کا تعاون حاصل ہے تو آپ ہماری کپینی کا تعاون حاصل کر سکتے ہیں۔“ انگریز قاصد نے فوراً کہا۔

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو قاصد۔ کپینی سے ہمارا کوئی فوجی معاہدہ نہیں۔ ہم اسے اپنی مدد کے لیے کیسے بلا سکتے ہیں۔“

نظام نے فوراً گرفت کی تھی۔ اسے شبہ ہو گیا تھا کہ قاصد جنرل اسمتھ کا کوئی منصوبہ لے کر آیا ہے اور نظام کو بتانے سے فی الحال گریز کر رہا ہے۔

آخر انگریز قاصد کو اپنا منصوبہ اگلا پڑا۔
”شاہ محترم!“ انگریز قاصد کو خود ہی کہنا پڑا: ”آپ مانتے ہیں کہ کپینی ہند کے ملکی معاملات

اس سلسلہ میں اگر اسے نظام دکن کی خوش قسمتی کہا جائے تو ٹھیک ہوگا کہ اسے ایک مرہٹہ سردار کا بغیر کسی معاوضے کے تعاون بھی حاصل ہو گیا۔

اس مرہٹہ سردار کے ساتھ دس ہزار کا لشکر تھا اور یہ پونا کے مرہٹہ پیشوا سے الگ رہ کر جنوبی ہند میں ادھر ادھر لوٹ مار کرتا پھرتا تھا۔

مرہٹہ سردار کو جب معلوم ہوا کہ نظام دکن اور انگریز کمپنی کی متحدہ فوجیں شیر دکن حیدر علی خاں کے خلاف صف آرا ہو رہی ہیں تو اس نے لوٹ مار کرنے اور مال غنیمت کے لالچ میں خود ہی نظام دکن کو اپنے تعاون کی پیش کش کر دی۔

نظام دکن نے یہ پیش کش انتہائی مسرت کے ساتھ قبول کر لی۔

حالات یہاں تک پہنچنے کے بعد نظام دکن اور کمپنی کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے نظام دکن نے شمالی سرکار کا علاقہ انگریزوں کے سپرد کر دیا۔ پھر انگریزوں کے منصوبہ کے مطابق تینوں طاقتوں یعنی نظام دکن، مرہٹہ لشکر اور کمپنی کی فوجوں نے متحدہ طور پر حیدر علی کے علاقہ بالا کھٹ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔

ان باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ اس جنگ کا آغاز انگریز کمپنی، نظام دکن اور ایک مرہٹہ سردار نے کیا لیکن انگریزوں کی شہ پر ہندوستان کی تاریخوں میں لکھا گیا کہ یہ جنگ جسے انگریزوں کی پہلی جنگ کاناکا دیا گیا ہے اور ۱۷۶۷ء سے ۱۷۶۹ء تک لڑی گئی، اس کا ذمہ دار سرنگا پٹم کا حکمران حیدر علی خاں تھا۔

اس بات میں رقی بھر بھی شبہ نہیں کہ یہ انگریزوں، نظام دکن اور مرہٹہ سردار کا گٹھ جوڑ تھا، جو اپنی اپنی جگہ پر حیدر علی کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خوفزدہ تھے۔

جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں کہ نظام دکن نے قاصد کے ذریعہ حیدر علی خاں کو ایک خط بھیجا تھا جس میں اس نے والا جاہ محمد علی کو ختم کرنے کے لیے حیدر علی خاں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کا تھی۔ وہ قاصد یعنی گفٹام اس جنگ کے وقت سرنگا پٹم میں قید تھا مگر تاریخ میں یہ لکھا گیا کہ یہ جنگ اس وجہ سے شروع ہوئی کہ حیدر علی خاں نے نظام دکن حیدر آباد کے کچھ علاقوں پر حملہ کر دیا تھا۔

اس کی تردید خود انگریز مؤرخین نے بھی کی ہے۔

مورخ ڈیلا تو سی دتار تاریخ ہند میں لکھتا ہے:

نظام دکن کے یہ خطرے کی گھنٹی تھی اس لیے وہ کمپنی کے تعاون کو ہر قیمت پر خریدنے کے لیے تیار ہو گیا۔

اس نے قطعی فیصلہ کرنے کے بعد کہا:

”جنرل اسمتھ سے ہمارا اسلام کہا جائے اور اس کے بعد کہا جائے کہ ہم کمپنی کے تعاون کی پیش کش کو قدر کی نظر سے دیکھتے ہیں اور علی مدد کی صورت میں ہم ان کے لشکر کے اخراجات کے لیے معقول علاقہ پیش کریں گے۔“

یہ سن کے انگریز قاصد کے تو جیسے پرانے گئے۔ وہ بڑی تیزی سے مدراس پہنچا اور اس نے جنرل اسمتھ کو خوشخبری سنائی:

”محترم جنرل! آپ کی قسمت بہت یادری کر رہی ہے۔ میں نے نظام دکن کو خطرے سے آگاہ کیا تو وہ پکے ہوئے آم کی طرح میری گود میں آگرا۔ اس نے مجھ سے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ کمپنی کی طرف سے علی مدد کی صورت میں وہ کمپنی کو فوج کے اخراجات کے لیے ایک معقول علاقہ بھی دے گا۔“

پھر اس نے بڑی تفصیل سے اپنی اور نظام دکن کی گفتگو بیان کی۔

جنرل اسمتھ سمجھ لیے واقعی یہ ایک بڑی خوشخبری تھی۔ اسے اگرچہ والا جاہ محمد علی کا پورا پورا تعاون حاصل تھا یہاں تک کہ اس نے کرناٹک کا پورا علاقہ اور فوج انگریزوں کے ماتحت کر دی تھی لیکن والا جاہ کا ملک ایک چھوٹا علاقہ تھا جبکہ نظام دکن جنوبی ہند کی ایک اہم شخصیت اور بڑی طاقت تھی۔

چنانچہ کمپنی اور نظام دکن میں گفتگو شینید شروع ہوئی۔

نظام دکن اپنے اس قاصد کے لیے ضرور پریشان تھا جسے اس نے سرنگا پٹم بھیجا تھا۔ حالانکہ اب حالات بدل چکے تھے اور نظام دکن حیدر علی سے زیادہ طاقتور فوج کی حمایت حاصل ہو رہی تھی، اس لیے اس نے یہ کہہ کر دل کو تسک دے کر:

”جنگ اور محنت میں ہر جہرہ استعمال کیا جاتا ہے۔“

آخر طے یہ ہوا کہ نواب حیدر علی خاں کے خلاف انگریزوں اور نظام دکن کا متحدہ لشکر کاروائی کرے گا۔ اس میں نواب والا جاہ کا لشکر بھی شامل ہوگا مگر یہ تھوڑے پہلے ہی سے انگریزوں کی زیر کمان ہے اس لیے اس کا ذکر نہیں کیا جاتا۔

”فتوحات حیدری سے خوفزدہ ہو کر نظام الملک اور مرہٹوں نے انگریزوں سے گٹھ جوڑ لیا۔ ان کا سہرا لشکر کرنی (اسے جزل بھی لکھا گیا ہے) اسمتھ کی سرکردگی میں میسور پر چڑھ دوڑا۔
مورخ سنیکلر ’تاریخ ہند‘ میں لکھتا ہے:

”۱۷۹۴ء میں انگریزوں کو معلوم ہوا کہ حیدر علی خاں فرانسیمیں سازش کر رہے ہیں تاکہ ان کی مدد سے انگریزوں کو ہند سے نکال باہر کریں۔ پس انگریزوں نے نظام دکن اور مرہٹوں سے مدد مانگی اور پھر تینوں فوجیں یعنی نظام، انگریزی فوج (جس میں والا جاہ کی فوج بھی شامل تھی) اور مرہٹہ فوجیں میسور پر حملہ آور ہوئیں۔
اسی طرح تھامسن ’تاریخ ہند‘ میں رقم طراز ہے:

”نظام دکن ہمیشہ حیدر علی خاں کا حامی رہا اس لیے اس نے انگریزوں اور مرہٹوں کی مدد سے میسور پر حملہ کر دیا۔
دکس آن انڈیا“ میں تحریر ہے:

”حیدر علی کے خوف سے نظام الملک انگریزوں سے مل گیا اور مرہٹوں کے تعاون سے میسور پر حملہ کر دیا۔“

اب حیدر آباد دکن کی مطبوعہ تاریخ سے ایک حوالہ ملاحظہ ہو:

”چونکہ اس زمانہ میں کمپنی کو حیدر علی خاں کی روز افزوں ترقی سے خوف پیدا ہو گیا تھا کیونکہ حیدری فوجیں آٹھ دن کرناٹک اور انگریزی کمپنی کے علاقہ پر چلے کوئی رہتی تھیں اس لیے یہ ضروری تھا کہ اس کا سدباب کیا جائے۔ چنانچہ انگریز کمپنی نے بنگالہ عالی (نظام دکن) کو حیدر علی خاں کے خلاف کھڑا کر دیا۔“

بقول محمود گلگوری:

”سچ تو یہ ہے کہ نظام علی خاں کو ایک اور اسلامی طاقت (حیدر علی) کا ابھرنے کا سخت گراں گزر رہا تھا مگر اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ خود اس پر حملہ کرنا۔ دوسری طرف انگریزوں کو یہ خوف پیدا ہو چلا تھا کہ کہیں

حیدر علی خاں کی بڑھتی ہوئی طاقت انہیں ہندوستان سے نہ نکال دے۔ چنانچہ سازشیں دونوں طرف سے شروع ہوئیں اور ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے نظام نے علاقہ شمالی سرکار، انگریزوں کے حوالے کر دیا اور لشکر لے کر میسور پر حملہ آور ہوا۔“

ان حوالوں سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ دورِ ننگشہ میں جس قدر تاریخی کتب لکھی گئیں یا تاریخی ترتیب دی گئیں ان میں انگریز اور ہندو مفادات کو ہمیشہ نظر رکھا گیا اور مسلمانوں کے سزاوارت بادشاہوں اور سلاطین پر طرح طرح کے الزامات تراش کر انہیں بدنام کیا گیا۔
لیکن بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان کے قیام کو ۴۵ سال گزرنے کے باوجود سرکاری یا نجی طور پر کوئی ایسی جامع کوشش نہیں کی گئی جو مسلمانانِ برصغیر کے صحیح کارناموں کو اجاگر کرے اور ان واقعات اور حالات کو ہماری تاریخوں سے نکال دیتی جو ہمارے مشاہیر کی ذات پر ایک بدنام دھبہ ہیں۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔

حیدر علی خاں کے کان اس سازش سے باخبر ہو چکے تھے۔ چنانچہ وہ بھی اپنے لشکر کو ترتیب دے کر مدافعت کے لیے نکلا۔

نواب باہادر نے اپنے لشکر کے پانچ حصے کیے۔ ایک حصے پر بیہو سلطان، دوسرے پر محمد علی کیدان، تیسرے پر بخشی ہیبت جنگ اور چوتھے پر میر علی رضا خاں کو سردار مقرر کیا۔ باقی لشکر انہوں نے اپنے ساتھ رکھا۔

اس دد کی جنگی حکمت علی اور چالوں میں سب سے اہم چال یہ تھی کہ دشمن کی رمد کو رد کا جائے کیونکہ اگر رمد ہند ہو جائے تو لشکر لڑنے سے معذور ہو جاتا ہے۔

رمد کو رد کرنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ ان ملافوں کو تباہ کر دیا جائے جہاں سے دشمن کی رمد مل سکتی تھی۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

یہ فعل اگرچہ غیر انسانی معلوم ہوتا ہے لیکن اس زمانے میں ہر لشکر اس حکمت علی پر عمل کرتا تھا۔ اسی لیے حیدر علی پر اس کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔

حیدر علی نے رسد کو روکنے کے علاوہ دشمن کے بڑھتے ہوئے لشکر پر شب خون مارنے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔

حیدر علی لشکر شب خون مارنے میں بڑا ماہر تھا اور اس کے مخصوص دستے چند گھنٹوں کی کوشش سے بڑے سے بڑے لشکر کو نہ دبالا کر کے رکھ دیتے تھے۔ پس اس دُہری مار سے دشمن سخت پریشان ہوا اور اس کی پیش قدمی کی رفتار کم ہو گئی۔

اس موقع پر انگریزوں نے ایک زبردست جنگی چال چلی۔

انہوں نے اپنے بھیڑیوں کے کپتی آفس کو حکم دیا کہ وہ بھیڑیوں سے ایک فوج منگور کے ماحل پر اتار دے جو آگے بڑھ کر بد نور پر قبضہ کر لے۔

قارئین کو یاد ہو گا کہ یہ علاقے حیدر علی خاں نے فتح کیے تھے اور ان پر حیدر علی پرچم لہرا رہا تھا۔ یہ علاقے سلطنت میسور کے لیے انتہائی اہمیت رکھتے تھے۔ انگریزوں کے منصوبے کے مطابق بھیڑیوں سے ایک فوج منگور کے ماحل پر اتار گئی۔ وہاں مدافعت نہ ہونے کے برابر تھی۔

جب حیدر علی خاں کو اس اچانک اور غیر متوقع حملے کی اطلاع ملی تو انہوں نے فوراً سلطان ٹیپو کو بد نور کی طرف روانہ کیا مگر اس خیال سے کہ شہزادہ نا تجربہ کار ہے کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے، انہوں نے مشرقی محاذ کو میر علی رضا خاں اور محمد علی کیدان کے سپرد کیا اور خود بھی لشکر کے ساتھ بد نور روانہ ہو گئے۔

انگریزوں کی اس حکمت عملی نے حیدر علی خاں کے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ مشرقی محاذ سے سلطان ٹیپو اور حیدر علی خاں کے بد نور چلے جانے سے اتحادی فوجوں کو پیش قدمی کا موقع مل گیا اور انہوں نے بڑھ کر دہلی، ترائور، لنگن گڑھ، چکد پور، دھرم پوری، کولار اور ہوسکوٹ وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ میر علی رضا خاں اور محمد علی کیدان سے کچھ بناٹ نہ بنا اور انہیں پسپا ہونا پڑا۔

اب جو اتحادیوں کو فتوحات نصیب ہوئیں تو نواب والا جاہ (جس کی فوجیں اتحادی لشکر میں انگریزوں کے ماتحت شامل تھیں) فوراً اس کاٹ سے چل کر کولار پہنچ گیا اور اس نے کولار کو اپنا صدر مقام بنایا۔ جیسا کہ قارئین جانتے ہیں کہ کولار نواب حیدر علی خاں کی جائے پیدائش تھا۔ والا جاہ نے کولار کو اس لیے اپنا صدر مقام بنایا کہ حیدر علی خاں اپنے جائے پیدائش پر قبضہ ہوجانے سے اس کے مطیع ہو جائیں گے۔

حالانکہ ع

ایں خیال است و محال است وجہوں

(یہ صرف خیال تھا بلکہ محال تھا اور پاگل پن تھا)

مگر — والا جاہ محمد علی اس وقت فتح پر اس قدر مسرور اور مغرور ہوا کہ اس نے فرار ماری لالہ حاکم گئی کو بلوایا اور اسے تمام مفتوحہ علاقوں کا حاکم مقرر کر دیا۔ گویا یہ تمام علاقے اس کی اپنی فوجوں نے فتح کیے تھے اور والا جاہ وہاں کا بادشاہ بن گیا تھا۔

مغربی محاذ پر بھیڑیوں سے آنے والی انگریز فوج نے منگور کے قلعہ پر قبضہ کر لیا تھا یہ سلطان بڑی تیز فوری سے اس محاذ پر پہنچا اور اس نے جلتے ہی قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ کو چند ہی دن گزرے تھے کہ نواب حیدر علی خاں بھی بیٹے کی مدد کو منگور پہنچ گئے۔

انگریزوں کو منگور کے قلعہ پر قبضہ سے ڈہرا فائدہ پہنچا۔ ایک تو یہ کہ حیدر علی فوجیں دو حصوں میں تقسیم ہو کر آدھی فوجیں مغرب کو چلی گئیں اور آدھی فوجیں مشرقی محاذ پر رہ گئیں۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے مشرق میں کولار اور ہوسکوٹ تک کا علاقہ فتح کر لیا اور اب مزید فتوحات کے منصوبے بنائے جانے لگے۔

دوسری طرف حیدر علی لشکر کی آدھی فوجیں مغرب میں منگور کے قلعہ پر لگ گئیں۔ ٹیپو سلطان اور خود حیدر علی خاں کو مشرقی محاذ چھوڑ کر آٹھ ماہر حیدر علی خاں کے ساتھ بھی اتنی فوج نہ تھی کہ وہ قلعہ پر فوری حملہ کر کے انگریزوں کو مار بھگاتے۔

اس موقع پر نواب حیدر علی خاں کی ذہانت نے انہیں ایک راستہ دکھایا۔ جس طرح انگریزوں کی حکمت عملی نے حیدر علی فوجوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا اسی طرح نواب بہادر نے بھی ایک ایسی چال چلی کہ انگریزوں کو مار بھگاتے۔

ذہین اور زیرک نواب حیدر علی خاں نے قرب و جوار کے تمام بڑھتیوں (ترکھانوں) کو بلوایا اور انہیں حکم دیا کہ وہ کھڑکی کی بندوبست تیار کریں جن کی شکلیں بالکل اصلی بندوبست کی مانند ہوں۔ چنانچہ کھڑکی کے کاریگر وہاں نے بندوبست بنانا شروع کر دیں۔

دوسری طرف حیدر علی خاں نے رنگ برنگ کے جھنڈے اور نشان تیار کر لئے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے آٹھ ہزار آدمیوں کو فوری طور پر ملازم رکھا۔ یہ سب ملازم بظاہر حیدر علی خاں کے فوجی تھے، حالانکہ وہ بندوبست تیار نہیں جانتے تھے۔ ایک طرف دھڑا دھڑا بندوبست تیار ہو رہی تھیں۔

ایک پہریدار جو سب سے اونچے برج سے اتر کر آیا تھا، اس نے بتایا:
”مردار۔ دشمن کے کئی لاکھ فوجی ایک ساتھ قلعے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔
”کئی لاکھ؟“

اور مردار کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

پھر اسے ہوش آیا تو تیزی سے میڑھیاں چڑھتا اور پر کی طرف بھاگا۔ اسے اطلاع دینے والے
اس کے پیچھے پیچھے تھے۔

انگریز فوج کے سردار نے فحش سے جھانک کر دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ حیدری
لشکر تھا کہ لہریں مارتا سمندر۔

قوس قزح کے رنگوں میں لپٹا ہوا حیدری لشکر تلواریں چمکانا اور بندو قیں ہوا میں لہراتا
آہستہ آہستہ قلعہ منگور کی طرف آ رہا تھا۔ اس لشکر کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے ان گنت
گھڑ سوار بھی تھے۔

انگریز سردار نے ہٹ کر کہا:
”ہم منگور پر قبضہ قائم نہیں رکھ سکتے۔“
چند لمحوں تک اس نے حکم دیا:
”بستی واپس جانے کی تیاری کی جائے۔“

اس کے ساتھ ہی پورے قلعے میں ڈالسی۔ ڈالسی کی آوازیں گونجنے لگیں۔ فوجیوں نے سنا
سمیٹنا شروع کر دیا اور ایک جگہ ٹپسی بچ گئی۔

اسی وقت افواہ گرم ہوئی کہ دشمن کی سوار فوج نے قلعہ پر حملہ کر دیا ہے اور وہ قلعہ کے صدر
دروازے تک پہنچ چکی ہے۔
اور یہ حقیقت بھی سچی۔

حیدری فوج میں اصلی اور نقلی لشکریوں کی کثیر تعداد دیکھ کر قلعہ پر متعین فوجیوں میں سراپا
پیدا ہو گئی تھی اور وہ سب ایک ایک کر کے فحش اور بر جیوں سے نیچے اتر گئے تھے۔ اس بات
سے شہزادہ پیو نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ قابض فوج بھاگنے کی تیاری کر رہی ہے۔
پس۔

پیو سلطان اپنے چند سوار دستوں کے ساتھ قلعہ کے صدر دروازے کی طرف بڑھا۔ سواروں کو

دوسری طرف نشان اور علم بن رہے تھے۔

تیسری جانب ان نے بھرتی ہونے والوں کو علم اور بندو ق پڑھنا سکھایا جا رہا تھا۔

یہ تمام کام مینوں میں نہیں، دونوں میں ہو گئے۔ کیونکہ حیدر علی خاں جانتے تھے کہ وہ جب تک
معزنی محاذ پر لکھے رہیں گے اس وقت تک مشرقی محاذ پر متحدہ دشمن فتوحات حاصل کرتا رہے گا۔
حیدر علی خاں کی ان تیاریوں کے بعد ایک دن ایسا ہوا کہ قلعہ منگور کی طرف آٹھ ہزار کا بندو ق
بردار لشکر، پھر بر سے اڑا تا اور نشان لہراتا آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

آٹھ ہزار کے علاوہ حیدر علی خاں اور پیو سلطان کا لشکر ایک تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ منگور کے
قلعہ پر لاکھوں کا لشکر ایک دم چڑھ دوڑا ہے۔

قلعہ منگور پر بستی سے آگے ہوئے انگریز لشکر پر سے چوکی پر جو کس کھڑے تھے۔ انہوں نے
جب اڑتے ہوئے پھر بدوں کا سیلاب اور حیدری فوج کا رنگ برنگ ٹڈی دل قلعے کی طرف بڑھتے
دیکھا تو ان کے ہاتھ پیر ہول گئے اور گوں میں خون جمنے لگا۔ فحش اور بر جیوں کے کچھ پر سدا
گرتے پڑتے نیچے کی طرف بھاگے۔

فوج کا سردار نیچے ایک کمرے میں بیٹھا اطمینان سے صبح کا ناشتہ کر رہا تھا کہ فحش کے
سپاہی آگے پیچھے اس کے کمرے میں گھس آئے۔

وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا:

”تم۔ تم۔ بغیر اجازت کمرے میں۔ اس کے منہ میں نوالہ پھنسا ہوا تھا اور اس کی
آواز ٹھیک سے نہ نکل رہی تھی۔

”مردار۔ مردار۔ غضب ہو گیا۔ ”ڈی دل۔ ڈی دل۔“ ایک پر سے دار نے
ہانپتے ہوئے بڑی مشکل سے کہا۔

”ڈی دل۔ کیسا ڈی دل۔ کہہ رہے ڈی دل؟“ سردار نے سنبھل کر پوچھا۔

پر سے دار بھی اپنے اوپر قابو پا چکے تھے۔ ان میں سے ایک نے بتایا:

”مردار بہادر۔ دشمن نے لاکھوں سپاہیوں کے ساتھ حملہ کر دیا ہے۔“

”لاکھوں سپاہی؟“ سردار نے گھبرا کر اسے دیکھا: ”کہاں ہیں لاکھوں سپاہی؟“

آتا دیکھ کر قلعہ والوں کے رہے سپہ اوسان میں حفا ہو گئے اور وہ بے انتہا بدحواسی کے عالم میں قلعہ خالی کر کے ساحل کی طرف بھاگے اور جہازوں میں سوار ہو کر لنگر اٹھا دیے۔

منگلور کا وہ مضبوط قلعہ جو پیٹو سلطان اور حیدر علی خاں کی متحدہ فوجوں سے اس قدر جلد فتح ہونا مشکل تھا وہ قلعہ حیدر علی خاں نے بڑی آسانی سے فتح کر لیا۔ یہ اس کی ذمات کا کرشمہ تھا اور اب حیدر علی پرچم قلعہ منگلور پر لہرا رہا تھا۔

حیدر علی فوج کا ایک لشکر بھی ضائع نہ ہوا۔ صرف چند گولے قلعہ کی تفصیل پر پھینکے گئے جس کا مقصد قلعہ والوں کو ہراساں کرنا تھا۔

حیدر علی کی حکمت عملی کی یہ ایک کامیاب فتح تھی۔ اس سے ایک طرف تو منگلور کا قلعہ بغیر خون بہائے فتح ہو گیا اور دوسری طرف پیٹو سلطان کے سواروں کو وہ بے شمار سامان جو گولہ بارود اور بندوقوں پر مشتمل تھا ہاتھ لگا۔

قلعہ منگلور دشمنوں سے واپس لینے کے بعد حیدر علی اور پیٹو سلطان مغرب سے مشرق کی طرف واپس ہوئے۔ اس وقت انگریزی فوج کا پڑاؤ نرسی پور میں تھا۔

نرسی پور کے ایک بازار میں مراری لال نے ڈیرے سے جہاز کھے تھے۔ نواب حیدر علی خاں نے کیمپ پر اچانک شب خون مارا اور بہت سا مال و اسباب حاصل کر کے سات گڑھ کی طرف روانہ ہوئے۔

اس دوران مدراس سے انگریزوں کا ایک لشکر جنوب کی طرف بڑھا اور اس نے ڈنڈیگل اور دھارا پور پر قبضہ کر لیا۔

اس قبضہ کی خبر جب نواب بہادر گولی تو انہوں نے شہزادہ پیٹو کو جنرل اسمتھ کے مقابلے پر پھوڑا اور خود فوجیں لے کر دھارا پور کی طرف بڑھے۔

نواب بہادر کی فوجیں ابھی دھرمپوری کے راستہ ہی میں تھیں کہ انیس چار ہزار بیلوں کا ایک قافلہ ملا۔ ممکن ہے یہ قافلہ بیل گاڑیوں کا ہو۔ ان بیلوں پر انگریزی فوجوں کے لیے رسد کا سامان بار تھا۔ حیدر علی نے اس رسد پر قبضہ کر لیا۔

حیدر علی اس سامان رسد کے ساتھ دھرمپوری پہنچے۔ یہاں تھوڑی سی لڑائی ہوئی اور حیدر

فوجوں نے دھرمپوری پر قبضہ کر لیا۔

دھرمپوری کے بعد حیدر علی فوجوں نے ہوسکوٹہ کا رخ کیا۔ یہ ایک مضبوط قلعہ تھا اور دشمن کی بیشتر فوجیں وہاں مقیم تھیں۔

دوسری طرف محمد علی کیدان نے ہنور پہنچنے کے اس پر قبضہ کر لیا۔ شہزادہ پیٹو بھی اپنی فوج کے ساتھ محمد علی کیدان کے پاس پہنچ گیا۔

اسی جگہ پیٹو سلطان کو خبرنے اطلاع دی:

"جنرل اسمتھ اپنے لشکر کے ساتھ کولار سے نکل چکا ہے۔"

"بہم بات نہ کرو۔ یہ بتاؤ کہ جنرل اسمتھ کس طرف جا رہا ہے؟" پیٹو سلطان نے اپنے منبر سے دفاحت چاہی۔

منبرنے کچھ سوچتے ہوئے کہا:

"شہزادہ بہادر۔ ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اسمتھ کس طرف جائے گا۔"

"پھر وہی بے تکی بات؟" شہزادہ پیٹو چڑ گیا:

"اسمتھ جب کولار سے نکل چکا ہے تو کسی طرف تو جا رہا ہو گا۔ آخر اس کا رخ کس سمت

ہے؟"

"شہزادہ بہادر۔ میں بتاؤں گا ہوں۔" منبرنے کہا:

"اسمتھ کولار سے نکلا۔ چار میل جنوب کی طرف چلا۔ پھر ایک دم اس نے لشکر کو مشرق کی

طرف چلنے کا حکم دیا۔"

جب لشکر چار یا پانچ میل چل چکا تو اس نے پھر اپنا راستہ بدل دیا اور لشکر کو شمال کی طرف

چلنے کا حکم دیا۔ مگر شاید اسے کچھ شبہ ہو اور اس نے اپنے لشکر کو واپس کولار جانے کا

حکم دے دیا۔"

پیٹو نے حیران نظروں سے منبر کو دیکھا۔ پوچھا:

"اب اس کا لشکر کہاں ہے؟"

منبرنے سر جھکا کر جواب دیا:

"جی۔ وہ کولار کے سامنے خمیر زن ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" پیٹو نے مسکرا کر کہا: "اسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔"

پھر نکلے گا اور جدھر اسے جانا ہے اس طرف بے خوف و خطر چلا جائے گا۔
عجز نہ تو زیادہ پڑھا لکھا تھا اور نہ اسے زیادہ تجربہ تھا۔ اس نے شہزادے کی باتیں سنیں
تو حیران رہ گیا۔

"شہزادے بہادر۔ آپ نے اتنی سی عمر میں اتنا سارا تجربہ کیسے حاصل کر لیا۔ یہ باتیں تو شاید
بڑے بڑے سرداروں کو بھی نہ آتی ہوں گی۔"

"ایسا نہ کہو۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے تمام سردار بڑے تجربہ کار اور دانا رہے ہیں اور اس کی
وجہ یہ ہے کہ ان کے سردار اعلیٰ ہمارے بابا خان نواب بہادر ہیں۔ میں نے ان کے ساتھ رہ کر
بھی یہ تجربہ حاصل کیا ہے۔"

"غیب شاید یہ علم نہیں کہ مجھے بابا خان نے گیارہ بارہ سال کی عمر میں میدان جنگ میں طلب کر
لیا تھا۔ جب سے میں میدان جنگ میں دشمن سے بندہ آ رہا ہوں۔"

"بے شک بے شک۔ خدا شہزادے کی عزت و زکوٰۃ سے۔"

"عجز نے شہزادے کو دل سے دعا دی:

"شاید اسی لیے یہ مثل مشہور ہے کہ:

"ہونا برودا کے چکنے چکنے بات"

(یعنی ہونا باپ کی اولاد بھی ہونا ہوتی ہے)

اس گفتگو کے دوسرے ہی دن شیو سلطان کی بات سچ ثابت ہو گئی۔

پہلے عجز کا ایک ساتھی جسے وہ اپنی جگہ کو لار میں پھونڈا تھا، ایک تیز رفتار گھوڑے پر
بیٹھ کر پاس ہتھور پہنچا۔

"شہزادے بہادر۔ جنرل اسمتھ ایک بڑے لشکر کے ساتھ ہوسکوٹہ جا رہا ہے۔" اس نے اطلاع
دیتے ہوئے کہا۔

یہ خبر پاتے ہی شیو سلطان نے فوراً لشکر کو کوچ کا حکم دیا اور اپنے ساتھی سردار محمد علی کیدار
سے کہا:

"ہماری اطلاع کے مطابق بابا خان بھی ہوسکوٹہ کی سمت جا رہے ہیں۔ انہیں فوراً اطلاع
دی جائے کہ جنرل اسمتھ کو لار سے ہوسکوٹہ کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔"

انہیں یہ خبر بھی دی جائے کہ ہم جنرل اسمتھ کو راستہ میں روکنے کی کوشش کریں گے۔ بابا خان

اب عجز کے بولکھلانے کی باری تھی۔ اس کا خیال تھا کہ جنرل اسمتھ ایک بے وقوف آدمی
ہے جو اپنے لشکر کو محض اپنی طاقت کے اظہار کے لیے ادھر ادھر گھماتا پھیر رہا ہے لیکن شیو نے
اس کے خیال کی تردید کر دی تھی۔

عجز کے دل میں عجیب طرح کی الجھن پیدا ہو گئی۔ اس سے رہانہ گیا اور آخر وہ پوچھ بیٹھا:
"شہزادے بہادر۔ میرے خیال میں جنرل اسمتھ ایک احمق آدمی ہے جو اپنی فوج کو ادھر
ادھر بھٹکا تا پھیر رہا ہے مگر آپ فرما رہے ہیں کہ اسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ میری یہ جرأت تو
نہیں کہ میں آپ سے سوال کروں لیکن میں دل میں الجھ رہا ہوں۔"

شیو نے پُر سکون لہجے میں کہا:

"تم نے مجھ سے سوال نہیں کیا لیکن میں تمہیں جواب ضرور دوں گا۔ تم ایک لشکر کی ہو مگر اس سے
زیادہ اہم بات یہ ہے کہ تم دشمن کے لشکر میں گھس جاتے ہو اور تمہیں کوئی شناخت نہیں کر
پاتا۔ پھر کبھی ایسا موقع بھی آتا ہے کہ تم دشمن کے دل میں اتر جاتے ہو اور جو کچھ اس کے دل میں ہوتا
ہے اسے معلوم کر کے اپنے آقا تک پہنچاتے ہو۔ کیوں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

"شہزادے بہادر نے بالکل درست کہا۔" عجز نے جواب دیا:

"بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"تم اپنے اس کام کو ہوشیاری یا چالاکی کہتے ہو مگر فوجی اصطلاح میں اسے حکمت علمی یا
جنگی چال" کہا جاتا ہے۔"

جنرل اسمتھ کو لار سے فوج لے کر چلا اور ادھر ادھر گھوم پھر کر واپس کو لار گیا۔ اس کی
دو ہی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ اول یہ کہ کو لار سے نکلنے کے بعد جنرل اسمتھ کا دماغ الجھ کر رہ گیا اور
وہ کوئی مستقل فیصلہ نہ کر سکا کہ کس طرف جائے اس لیے وہ شمال جنوب اور مشرق مغرب میں بھٹکتا
رہا۔ پھر یہ نشان ہو کر واپس چلا گیا۔

لیکن ایک دوسری وجہ جس کا امکان زیادہ ہے وہ یہ ہو سکتی ہے کہ کو لار سے نکلنے کے
بعد جنرل اسمتھ کو یہ شبہ ہوا کہ اسے اطلاع دی گئی کہ اس کے دشمن کے جاسوس اس کی پیش قدمی
پر نظریں لگائے ہوئے ہیں اور یہ بات اس کے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہے اس لیے اس نے اپنے
دشمن کے جاسوسوں کو دھوکا دینے کے لیے لشکر کو ادھر ادھر گھمایا پھر کو لار واپس چلا گیا۔
اگر اس نے واقعی یہ حکمت علمی برتی ہے تو یہ یقین رکھنا چاہیے کہ وہ ایک دودن میں کو لار سے

بے فکر ہو کے قلعہ ہو سکوت پہنچ کے اسے فوج کریں۔

محمد علی کیدان نے بیٹو سلطان کے دونوں احکامات پر فوری عمل کرایا۔ اس نے ایک ہوا نواب بادر کی طرف بھیجا اور دوسری طرف ہتور میں مقیم فوج کو اس قدر جلد تیار کیا کہ وہ دن ڈھلنے سے پہلے جزل اسمتھ کو دکنے کے لیے چل پڑے۔

جزل اسمتھ نے واقعی فوجی چال چلی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر دشمن کے جاسوس اس کے لشکر کے گرد موجود ہیں تو وہ مطمئن ہو جائیں کہ انگریز فوجیں کو لار میں خاموش ہو کے بیٹھ گئی ہیں۔ اس کی یہ جنگی چال ضرور کامیاب ہو جاتی اگر حیدری فوج کے جاسوس کو لار میں موجود نہ ہوتے۔ چنانچہ حیدر علی اور بیٹو سلطان کی بیدار مغزی کی وجہ سے جزل اسمتھ کی یہ جنگی چال ناکام ہو گئی۔ جزل اسمتھ کی فوج کے گرد نہ صرف بیٹو سلطان کے مخبر منڈلا رہے تھے بلکہ نواب بادر کے مخبر بھی کو لار میں موجود تھے اور وہ نواب بادر کو اس جو ہو سکوت کے بارے میں خبریں پہنچا رہے تھے۔

نواب بادر کو ہو سکوت کے راستے ہی میں معلوم ہو گیا کہ جزل اسمتھ ایک بڑی فوج کے ساتھ ہو سکوت کو پکانے کے لیے بڑھا چلا آ رہا ہے۔ اس اطلاع سے ان کی پیش قدمی پر اثر پڑا اور کچھ دیر کے لیے فوجوں کو روک کر انہیں یہ سوچنا پڑا کہ آیا انہیں پہلے جزل اسمتھ کی فوج سے مقابلہ کرنا چاہیے یا ہو سکوت کی طرف پیش قدمی جاری رکھنا چاہیے۔

نواب بادر حیدر علی خاں اسی تذبذب میں تھے کہ ان کے پاس محمد علی کیدان کا قاصد پہنچا۔ اس نے عرض کیا،

”مردار محمد علی کیدان نے ہتور سے نواب بادر کی خدمت میں پیغام بھیجا ہے کہ نواب بادر بے خطر ہو کر ہو سکوت کی طرف پیش قدمی جاری رکھیں کیونکہ وہ اپنی فوجوں کے ساتھ کو لار سے آنے والے جزل اسمتھ کے لشکر کو راستے ہی میں الجھائیں گے اور اسے ہو سکوت پہنچنے نہیں دیں گے۔“

نواب بادر کو اس اطلاع سے بڑی مسرت ہوئی مگر بیٹے کی طرف سے ابھی وہ مطمئن نہیں تھے

انہوں نے خبر سے دریافت کیا،

”محمد علی کیدان کو شہزادے بیٹو کے بارے میں کیا سلیات ہیں؟“

”نواب بادر۔ آپ شہزادے کی طرف سے بالکل مطمئن رہیے۔ شہزادہ بادر اپنی فوج کے ساتھ محمد علی کیدان کے ہمراہ ہتور میں موجود تھے۔ میں انہی کے حکم سے آپ کی طرف آیا ہوں۔“

”مگر تم تو کہہ رہے ہو کہ شہزادہ بادر وہاں موجود تھے۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ شہزادہ بیٹو اس وقت کہاں ہیں؟“

نواب بادر ایک نئی فکر سے دوچار ہو گئے۔

لیکن خبر لانے والے نے انہیں مطمئن کر دیا:

”نواب بادر۔ میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ شہزادہ بادر اور سردار محمد علی کیدان اس وقت لشکر کے ساتھ جانے کے لیے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو چکے تھے جس وقت میں ہتور سے چلا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ اس وقت جزل اسمتھ کے مقابلہ پر پہنچ چکے ہوں۔“

”شکر ہے خداوند تعالیٰ کا۔“ حیدر علی کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

اب حیدری لشکر ایک بار پھر ہو سکوت کی طرف رواں دواں تھا۔

مخبر دو طرفوں سے ہو رہی تھی۔ انگریز، مرہٹہ اور نظام دکن کی متحدہ فوجیں ایک طرف تھیں اور حیدر علی کا لشکر دوسری طرف۔ ان کے جاسوس ان کے لشکر کی تحریک کر رہے تھے اور ان کے مجزان کے لشکر میں موجود تھے۔ دونوں طرف کے مجزا اپنے اپنے آقاؤں کو خبریں بھجوا رہے تھے۔

جزل اسمتھ لشکر لے کر کو لار سے بڑے اطمینان سے نکلا۔ اس کا رخ ہو سکوت کی جانب تھا لیکن رفتار انتہائی سست تھی اور اسی سست رفتاری کی وجہ سے بیٹو سلطان اور محمد علی کیدان کی فوجیں جزل اسمتھ تک اس وقت پہنچ گئیں جب جزل اسمتھ ہو سکوت سے ابھی کچھ فاصلے پر تھا۔

بیٹو اپنی فوجوں کے ساتھ جزل اسمتھ کے لشکر کے سامنے نمودار ہوا تو وہ حیران رہ گیا۔ پہلے تو اسے یہ خیال ہوا کہ یہ لشکر حیدر علی خاں کا ہے جو ہو سکوت کی طرف بڑھ رہا تھا اور شاید جزل کے لشکر کی آمد کی اطلاع پا کر لوٹ پڑا ہے۔ جزل نے فوراً لشکر کو روکنے کا حکم دیا تاکہ تازہ حالات

معلوم کیے جاسکیں۔

جنرل اسمتھ کو جلد ہی علم ہو گیا کہ سامنے آنے والا لشکر حیدر علی خاں کا اصل لشکر نہیں بلکہ اس کے لشکر کا وہ حصہ ہے جو شہزادہ ٹیپو اور محمد علی کیدان کی سرکردگی میں مختلف علاقوں میں فتوحات حاصل کر رہا ہے۔

اسے یہ بھی بتایا گیا کہ یہ لشکر بتور کی طرف سے آیا ہے جس پر حیدر علی فوجوں نے چند دن پہلے ہی قبضہ کیا ہے۔

جنرل اسمتھ کے ہوسکوٹ پہنچنے کے لیے اب ضروری ہو گیا تھا کہ وہ پہلے اس ناگہانی آفت سے نجات حاصل کرے اور اس سے نجات کی صورت صرف یہ تھی کہ ٹیپو کی فوجوں پر حملہ کر کے راستہ صاف کیا جائے۔

یہ بات بعد میں معلوم ہوئی کہ جنرل اسمتھ نے اپنی رفتار سست کیوں رکھی تھی!

جنرل اسمتھ کا منصوبہ یہ تھا کہ حیدر علی خاں کے لشکر کو ہوسکوٹ (۱) سے بعض زوارخ میں لے کر بھی لکھا گیا ہے) پہنچنے دیا جائے۔ پھر جب حیدر علی کا لشکر قلعہ ہوسکوٹ کا محاصرہ کر کے اس پر حملہ شروع کرے تو جنرل اسمتھ اس کی پشت پر نمودار ہو۔ اس طرح سامنے سے قلعہ والے حیدر علی پر حملہ کریں اور پیچھے سے جنرل اسمتھ حملہ آور ہو اور حیدر علی کے لشکر کو دو سمتوں سے اس طرح پھیل کر رکھ دے جیسے چکی کے دو پاؤں میں اناج۔

لیکن۔

جنرل اسمتھ کا یہ منصوبہ شہزادہ ٹیپو کے لشکر نے ناکام بنا دیا۔ ٹیپو سلطان اور محمد علی کیدان نے جنرل کا نہ صرف راستہ روک لیا بلکہ اس پر اس قدر شدید حملہ کیا کہ جنرل اسمتھ بدحواس ہو گیا مگر اس نے جلد ہی سنبھل کر مورچے قائم کر لیے۔ اس طرح ٹیپو اور جنرل اسمتھ کے درمیان ایک طویل جنگ کا آغاز ہو گیا۔

جنرل اسمتھ نہیں چاہتا تھا کہ جنگ طویل کھینچے کیونکہ اس کا مقصد تو جلد سے جلد ہوسکوٹ پہنچنے کے لیے حیدر علی کے ہاتھوں سے بچانا تھا مگر ٹیپو نے اسے اس طرح الجھایا تھا کہ جنگ طویل پکڑتی جا رہی تھی۔ ٹیپو سلطان کا مقصد یہ تھا کہ اس جنگ کو اس وقت تک طویل دیا جائے جب تک نواب حیدر علی خاں قلعہ ہوسکوٹ پر قابض نہیں ہو جاتے۔

ادھر ہوسکوٹ پر حیدر علی نے محاصرہ سخت کر دیا تھا اور دبا دبا رہ رہا رہا ہے تھے۔ وہ خود

چاہتے تھے کہ قلعہ پر جلد سے جلد قبضہ ہو جائے تاکہ وہ یہاں سے فارغ ہو کے شہزادہ ٹیپو کی مدد کو پہنچیں۔

قلعہ ہوسکوٹ پر رات دن گولہ باری جاری تھی اور نفیصل پر چڑھنے کی بھی کئی بار کوشش کی گئی تھی۔

آخر ایک شدید جنگ کے بعد حیدر علی فوج کے جانباز سپاہیاں لگا کر قلعہ کی نفیصل پر پہنچ گئے اور پہلے دروں کو قتل کر کے ہونے والے قلعہ کے دروازے پر پہنچ کر اسے کھول دیا۔ حیدر علی لشکر دھڑا دھڑا قلعہ میں داخل ہو گیا اور قلعہ فتح ہو گیا۔

نواب بہادر حیدر علی خاں نے اسی وقت ایک قلعہ کے ذریعے اس کی اطلاع شہزادہ ٹیپو کو بھجوائی اور یہ بھی کھلوا دیا کہ وہ دو تین دن میں قلعہ کا انتظام کر کے اس کے پاس پہنچ رہے ہیں۔

ٹیپو سلطان دشمن کو بری طرح الجھائے ہوئے تھا۔ جنرل اسمتھ کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہو رہی تھی۔ اور وہ ہر وقت دانت کٹکاتا رہتا تھا۔

انہی دنوں ہوسکوٹ کی فتح کی خبر ملے کہ ایک حواری ٹیپو سلطان کے پاس پہنچا۔ ٹیپو اسی وقت سجدہ لشکر بجا لایا۔ پھر وہ اس رات محمد علی کیدان اور دوسرے سرداروں کے ساتھ نئی حکومت علی ترتیب دیتا رہا۔

جب صبح ہوئی تو ٹیپو سلطان نے جنرل اسمتھ کے سامنے اپنے لشکر کو اس طرح ترتیب دیا جیسے وہ آج فیصلہ کن جنگ کرنا چاہتا تھا۔ جنرل اسمتھ خود بھی اس جنگ کا جلد سے جلد فیصلہ چاہتا تھا۔ وہ بھی اپنے پورے لشکر کو مقابلہ پر لے آیا۔

پہلے ٹیپو کی طرف سے ہوئی اور اس نے اسمتھ کے لشکر پر ایک سخت حملہ کیا۔ جنرل اسمتھ کے لشکر کا تعداد ٹیپو سلطان کے لشکر سے کہیں زیادہ تھی۔ اس نے یہ ملکہ روک لیا اور کچھ دیر بعد جوابی حملہ کر دیا۔

جنرل اسمتھ کا حملہ اس شدت کا تھا کہ ٹیپو کا لشکر اپنے حملہ میں جس قدر آگے بڑھ گیا تھا اسے وہیں واپس آنا پڑا۔ پھر دشمن کے دباؤ کی وجہ سے اس کے لشکر کے قدم دبا دیے گئے اور اسے پسپا ہونا پڑا۔

پٹوسلطان کے لشکر کی سپاہی اگرچہ منظم اور بہت سست تھی مگر سپاہی تو شکست کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ وہ جس قدر پیچھے ہٹ رہا تھا، جنرل اسمتھ اس پر اتنا ہی زیادہ دباؤ بڑھاتا جا رہا تھا۔ دوپہر ہونے تک پٹوسلطان کا لشکر اس قدر پسپا ہو گیا کہ اس کے مورچوں اور جیپوں پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔

مگر۔

عجیب بات یہ تھی کہ پٹو کا لشکر برابر پسپا ہو رہا تھا مگر نہ تو ہتھیار ڈالتا تھا اور نہ میدان چھوڑ کر بھاگ رہا تھا۔ انگریز لشکر اسے برابر دبا رہا تھا۔ خیال رہے کہ یہ مرنے والے انگریزوں کا لشکر نہ تھا بلکہ اس میں نظم و انکس کے ذمے، امر ہٹ فوجی اور والا جاہ کے بیشتر لشکر بھی شامل تھے۔

پھر پٹوسلطان کا پسپا ہوتا ہوا لشکر چند اونچے اونچے ٹیلوں کے درمیان آ گیا جن کے ساتھ اونچی اونچی بھاڑیاں تھیں۔ اس وقت جنرل اسمتھ نے اپنے وہ دستے جنہیں اس نے اب تک محفوظ رکھا تھا، انہیں بھی جنگ میں بھونک دیا اور ایک شدید اور فیصلہ کن حملے کا حکم دے دیا۔ جنرل اسمتھ کی فوج چیلوں کی طرح پٹوسلطان کے فوجیوں پر ٹوٹ پڑی۔

اور۔

اسی وقت پٹوسلطان کی سپاہ ہوتی ہوئی فوج اک دم جم کے کھڑی ہو گئی۔ جنرل اسمتھ نے پٹوسلطان کے فوجیوں کی اس حرکت کو ضرور حیرت سے دیکھا ہو گا مگر اس کی یہ حیرت ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ ان بے جان ٹیلوں اور اونچی اونچی بھاڑیوں نے انسان اگلا شروع کر دیے۔

یہ پٹوسلطان کے وہ فوجی تھے جنہیں رات کو اس کین گاہ میں چھپا دیا گیا تھا۔ یہ منصوبہ خود پٹوسلطان نے بنایا تھا۔ اس نے اپنا ایک تھائی لشکر اس کین گاہ میں پوشیدہ کر دیا تھا اور باقی دو تھائی لشکر کے ساتھ جنرل اسمتھ پر حملہ کیا تھا۔ پھر جب جنرل اسمتھ نے جوابی حملہ کیا تو منصوبے کے مطابق پٹوسلطان کا لشکر پورے نظم و ضبط کے ساتھ چھپتا ہوا شروع ہو گیا۔

جنرل اسمتھ کو اپنی فوج نظر آ رہی تھی اس لیے وہ برابر بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ دوسری جانب پٹو کا لشکر آہستہ آہستہ دشمن کو کین گاہ تک لانے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر وہاں چھپے ہوئے تازہ دم فوجی نعرے لگاتے ٹیلوں اور بھاڑیوں سے گروہ درگروہ نکلنا شروع ہو گئے۔

جنرل اسمتھ کو فوراً احساس ہوا کہ دشمن نے اسے سخت دھوکا دیا ہے۔ اس نے اپنے لشکر کو روکنے کی ہمت کوکشن کی مگر کین گاہ کا تازہ دم فوج نے اتنا سخت حملہ کیا کہ جنرل کی فوج کے قدم نہ جم سکے اور وہ میدان چھوڑ بھاگی۔ جنرل اسمتھ جدھر سے آیا تھا اُدھر ہی کودا پس ہو گیا یعنی وہ میدان جنگ سے بھاگا تو اس نے کولار جا کر دم لیا۔

ایک روایت کے مطابق پٹوسلطان نے جنرل اسمتھ کی فوج کے لیے بنگلو رکے نواح میں کین گاہ تیار کر رکھی تھی جہاں چھپے ہوئے فوجیوں نے جنرل اسمتھ اور اس کی فوج کو شکست سے دوچار کیا تھا۔

نواب حیدر علی خاں قلعہ ہوسکوٹ (ہسکوٹ) کے انتظام سے نارغ ہو کے زمی پور پہنچے اور وہاں قیام کیا۔ یہ وہی مقام تھا جہاں چند دن پہلے تک انگریزی فوجیں رہا کرتی تھیں۔ یہاں قیام کے دوران ہی حیدر علی کو اطلاع ملی کہ انگریزی فوج کے لیے مدراس سے سامان رسد آ رہا ہے۔ انہوں نے فوراً چند دستے بھیج کر اس سامان پر قبضہ کر لیا۔ یہ واقعہ ہر بن علی کے قریب پیش آیا تھا۔ اس کے بعد تو نواب بہادر نے انگریزی، امر ہٹ اور دکنی فوجوں پر شب خون مارنے کا ایک طویل سلسلہ شروع کر دیا اور اس قدر شب خون مارے کہ مرہٹے اور نظام دکن کی فوجیں چیخ اٹھیں۔ مرہٹے تو آٹھ دن کے ان حملوں سے بے انتہا تنگ آئے ہوئے تھے اور ہر صورت میں ان سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتے تھے۔

نواب حیدر علی خاں کو معلوم تھا کہ مرہٹوں کا مقصد محض دولت حاصل کرنا ہے اس لیے نواب بہادر نے ان کے آگے ہڈی ڈال دی اور ایک رقم کی پیش کش کی۔ مرہٹے تو ایسے موقع کی تلاش ہی میں تھے۔ وہ فوراً راضی ہو گئے۔ نواب بہادر نے ان کو ۳۲ لاکھ روپے اور ایک چھوٹا سا علاقہ دے کر متحدہ لشکر سے الگ کر دیا اور مرہٹے متحدہ لشکر چھوڑ کر ایک خیال کے مطابق یونا کی طرف چلے گئے۔

اب تو نظام دکن کے حواس جلتے رہے اور ہاتھ پیر مرد پڑ گئے۔ اس نے فوراً اپنے سردار

سے واپسی کے مشورے شروع کر دیے۔ حالانکہ اس کے پاس اس وقت بھی ایک بت بڑی فوج موجود تھی۔

موسیوڈٹ نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے:

نواب نظام علی خاں کے پاس گنتی گانے کے لیے ایک لاکھ سو ارب اور بیادوں کی جمعیت تھی لیکن ان میں شاید دو ہزار بھی اچھے بندوچی اور جاباز نہیں تھے۔ نواب کے سرداروں میں ایک رام چندر مرہٹہ، تین نواب شاہنور، کڑپتہ اور کازور بھی شامل تھے۔ نظام کی شکرگاہ میں رقا ساڈوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ نواب دکن کے دیوان رکن الدولہ نے انگریزوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود نواب حیدر علی خاں سے صلح کے لیے سلسلہ جہنمی کیا۔

نظام دکن کے دیوان رکن الدولہ کا قاصد حیدر علی خاں کے پاس پہنچا تو نواب بہادر نے اس کی پذیرائی کی اور اسے عزت سے ٹھہرایا گیا۔ حیدر علی خاں خود بھی نظام سے اچھا نہیں چاہتے تھے انہوں نے مرہٹوں کو تو متحدہ لشکر سے پہلے ہی الگ کر دیا تھا اب ان کی خواہش تھی کہ نظام دکن بھی انگریزوں کا ساتھ چھوڑ دے تو وہ انگریزوں کی چال بازیوں کا پورا پورا بدلہ لیں۔ حیدر علی خاں کو انگریزوں سے زیادہ نواب ارکاٹ والا جاہ محمد علی سے کد اور نفرت تھی تمام فتنوں اور جھگڑوں کی جڑ وہی شخص تھا۔

اگر والا جاہ، نظام دکن کے قاصد گلغام کو روک کر انگریزوں کو خبر نہ کرتا تو نظام اور حیدر علی خاں کی صلح پہلے ہی ہو چکی ہوتی لیکن والا جاہ نے نہ صرف انگریزوں کو نظام اور حیدر علی کے متوقع معاہدہ کی اطلاع دی بلکہ ان پر بیہ زور بھی دیا کہ وہ نظام کو بالاکھاٹ پر حملہ کا لالچ دے کہ اپنے ساتھ ملا لیں۔

اس طرح اب تک جو خیریزی ہوئی تھی اس کا دمر دار نواب ارکاٹ والا جاہ محمد علی تھا اور حیدر علی خاں اسے مزادینے کے لیے بے چین تھے۔

ان کی بے چینی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ والا جاہ نے ان کی جائے پیدائش کو لارکو اپنا مرکز بنایا تھا۔

نظام دکن کی طرف سے قاصد نے پر نواب بہادر اس لیے بھی خوش تھے کہ نظام سے صلح کے بعد

وہ اپنے ذلیل دشمن کو کیفر کردار تک پہنچا سکیں گے۔

انہوں نے نظام کے قاصد سے ابھی گفتگو نہیں کی تھی صرف اسے مہمان کے طور پر ٹھہرایا تھا لیکن قاصد کا یہ کہنا کہ وہ نظام دکن کی طرف سے صلح کی گفتگو کے لیے آیا ہے، حیدر علی خاں کے لیے باعث اطمینان تھا۔

چنانچہ قاصد سے گفتگو سے پہلے حیدر علی نے اپنے تمام بڑے بڑے سرداروں کو بلوایا۔ ان سرداروں میں شہزادہ بیٹو کے علاوہ میر رضا علی خاں، سید صاحب، اسماعیل صاحب، ایسیت خان، اور محمد علی کیدان شامل تھے۔

حیدر علی نے نواب محفوظ خاں کو بھی بلوایا تھا مگر وہ کسی وجہ سے اب تک نہ پہنچ سکا تھا۔ اس وقت اسی کا انتظار بہرہ تھا۔

میر رضا علی: ذرا دیکھو تو محفوظ خاں کہاں ہیں۔ وہ اب تک کیوں نہیں پہنچے؟ حیدر علی نے درجے چینی سے میر کو مخاطب کیا۔

میر رضا علی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولے:

میں ابھی لے کے آتا ہوں انہیں۔

یہ کہتے ہوئے وہ باہر چلے گئے۔

حیدر علی دوسرے سرداروں سے گفتگو کرتے رہے مگر یہ گفتگو نظام دکن کے بارے میں نہ تھی۔ حیدر علی اس اہم مسئلہ پر اس وقت تک گفتگو نہ کرنا چاہتے تھے جب تک محفوظ خاں نہ آجائے۔

اس کی موجودگی اس لیے ضروری تھی کہ محفوظ خاں، نواب ارکاٹ والا جاہ محمد علی کا بڑا بھائی تھا۔ ارکاٹ کی نوابی کا اصل حقدار وہ تھا لیکن والا جاہ محمد علی نے سازش کر کے اسے اس کے حق سے محروم کر دیا تھا۔

محفوظ خاں چند ماہ پہلے ہی والا جاہ کی قید سے بھاگ کر حیدر علی کے پاس پہنچا تھا۔ میر رضا علی اسے ڈھونڈنے باہر گئے تو لوگوں نے انہیں بتایا:

”محفوظ خاں لشکر یوں کے ضیموں میں کسی کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔“

ایک دوسرے آدمی نے کہا:

”ان کے ساتھ ایک عورت بھی ہے۔“

تیسرے نے ٹکڑا لگایا:

عورت بہت خوبصورت ہے۔“

میر رضا علی یہ باتیں سن کے بہت حیران ہوئے۔ نواب محفوظ کی عمر پچاس سے ادھرتھی۔ ان کی ایک بچی ننھی سی کتاب ہو چکی تھی۔ پھر اس عمر میں انہیں کیا سوچھی کہ کسی خوبصورت عورت کے ساتھ شکر یوں کے خیمے جانتے پھر رہے ہیں۔ بات ایکنارک تھی کہ وہ اس سلسلے میں دوسرے آدمیوں سے کچھ پوچھ بھی نہ سکتے تھے۔

میر رضا علی نے یہ باتیں اپنے ذہن سے جھٹک دیں۔ انہیں کسی کی ذاتی زندگی میں دخل دینے کا کیا حق تھا؟ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ محفوظ خاں اگر غدار ستے پر پھل پڑے ہیں تو وہ خود بھگتیں گے۔ پھر انہیں ایک دم حیدر علی خاں کا خیال آ گیا۔ ان کا خیال آتے ہی جیسے ان کے پیروں میں پیسے لگ گئے۔

میر رضا علی کو یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ محفوظ خاں شکریوں کے خیموں میں کسی کو تلاش کر رہے ہیں۔ اس لیے انہوں نے کسی سے مزید بات کہے بغیر خود بھی شکریوں کے خیموں میں جھانکنا شروع کر دیا۔

ایک خیمہ۔

دو خیمے۔

دس پندرہ خیمے۔

اس بھال دہڑ میں وہ کئی شکریوں سے ٹکرا بھی گئے۔ لشکری انہیں پہچانتے تھے کہ وہ ایک بڑے سردار ہیں اس لیے وہ ان سے تو کچھ نہ کہتے مگر ان کی بدحواسی پر مسکراتے ضرور تھے۔ آخر میر رضا علی نے محفوظ خاں کو ایک خیمے میں جا پکڑا۔ لیکن جب ان کی نظر محفوظ خاں کے ارد گرد پڑی تو انہوں نے گہرا کر خیمے سے اپنی گردن باہر کی طرف کھینچی۔

انہوں نے دیکھا تھا کہ خیمے میں محفوظ خاں درری کے فرش پر بیٹھ ہیں اور ان کے ساتھ ہی ایک خوبصورت نور عورت بھی راجان ہے۔ دوسری طرف ایک لشکری اہل قہر ماندھے کھڑا تھا۔ میر رضا علی کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ انہوں نے چاہا کہ واپس ہو جائیں اور نواب بہادر سے جا کر وہ کچھ بیان کر دیں جو ان کی نظروں نے دیکھا تھا کہ اسی وقت محفوظ خاں ہنستے ہوئے خیمے سے باہر آ گئے۔

”ارے بھائی رضا علی۔ تم خیمے میں جھانک کر واپس کیوں آ گئے۔ خیریت تو ہے؟“

میر صاحب نے جواب دیا،

”خیریت کہاں ہے خان صاحب۔ نواب بہادر بے چینی سے آپ کا انتظار فرما رہے ہیں۔ میں

آپ کو تلاش کرنے آیا ہوں۔“

محفوظ خاں نے دریافت کیا:

”مجھے تلاش کرنے آئے تھے تو مجھے بتایا کیوں نہیں۔ جھانک کے واپس جا رہے ہو۔“

میر رضا علی کہتے ہوئے ذرا جھجکا:

”وہ۔۔۔ بات یہ تھی کہ آپ کسی خاتون سے مخاطب تھے۔ میں نے مناسب نہ سمجھا کہ اس اہل میں آپ کو۔“

محفوظ خاں نے زور کا تقہم لگایا:

”ارے وہ عورت۔۔۔۔۔ خیر وہ تو بعد میں بتاؤں گا۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ نواب بہادر نے مجھے کیوں یاد فرمایا ہے۔ خیریت تو ہے؟“

”وہ۔۔۔ نظام دکن کا قاضی بیگم کے کہ آیا ہوا ہے۔“

میر رضا علی نے تمہید باندھنا شروع کی تو محفوظ خاں نے ٹوک دیا:

”یہ تو مجھے معلوم ہے کہ قاضی بیگم کے کہ آیا ہوا ہے لیکن میرا اس قاصد سے کیا تعلق۔ نواب بہادر نے مجھے کیوں بلوایا ہے؟“

محفوظ خاں کو اپنی فکر ٹوٹ گئی۔ وہ نواب بہادر کے پاس یا نیا آیا تھا۔ حیدر علی نے اگرچہ اسے ایک عہد کی طرح ٹھہرا تھا لیکن غیر جگہ۔ غیر دربار۔۔۔۔۔ سرکار دربار میں لوگ خواہ مخواہ مخالف ہو سکتے ہیں۔

محفوظ خاں اس لیے پریشان ہو گیا تھا کہ کہیں کسی نے اس کی بدگوئی تو نہیں کی۔ میر رضا علی نے سے تسلی دی:

”نکو کی ضرورت نہیں خان صاحب۔ نواب بہادر نے دکن کے قاصد کے سلسلے میں سرداروں سے گفتگو کر لیا ہے۔ اس لیے آپ کو بھی بلوایا تھا۔ آپ اپنی جگہ موجود نہ تھے اس لیے مجھے بھیجا گیا۔“

محفوظ خاں نے اطمینان کا سانس لیا:

”میر صاحب۔ میں پردہ سی، اتنے دنوں بعد قید خانہ سے نجات ملی ہے۔ اب قدم قدم پر جی رتا ہے۔ خیر چلیے۔“

”مگر۔۔۔“ میر رضا علی کہتے کہتے رک گئے۔

”مگر کیا؟“ محفوظ خاں پھر گھبرا گئے:

”کیا کوئی اور بھی حکم ہے؟“

”نہیں خالصاً۔ اور کوئی حکم نہیں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ آپ کے ساتھ جو خاتون ہیں ان کا کوئی ٹھکانہ کر دیں۔ پھر چلیں۔“

محفوظ خاں بڑی شگفتگی سے بولے:

”اے واہ — کس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ اس کی فکر نہ کرو۔ میں نے اس کے لیے کچھ انتظام کر دیا ہے۔ باقی واپس آگے کروں گا۔“

پھر وہ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے نواب بہادر کی طرف چلے۔ نواب بہادر واقعی ان کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔

یہ دونوں داخل ہوئے تو نواب بہادر نے کہا:

”واہ میرے صاعلی۔ ہم نے تمہیں محفوظ خاں کو بلانے بھیجا تھا اور تم خود بھی ان کے ساتھ ہی گم ہو گئے۔“

”بہت بہت معذرت خواہ ہوں نواب بہادر۔“ میرے صاعلی نے محفوظ خاں کی طرف دیکھتے ہوئے جواب میں کہا:

”در اصل محفوظ خاں کچھ اس طرح الجھے ہوئے تھے کہ ان کی وجہ سے آنے میں دیر ہو گئی۔“

نواب بہادر نے محفوظ خاں کی جانب دیکھا:

”کیوں محفوظ خاں۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔“

نواب بہادر کا لہجہ بڑا شگفتہ تھا:

”ہم تمہارے لیے کچھ اور سوچ رہے ہیں اور تم ہو کہ خود کو ادھر ادھر الجھاتے پھر رہے ہو۔“

”تو بہ تو بہ اعلیٰ حضرت! محفوظ خاں جمل سے ہو گئے۔“

”در اصل مجھ پر کسی کا ایک احسان تھا۔ میں اس سے سبکدوش ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی تفصیل سے آپ کو پھر کسی وقت آگاہ کروں گا۔ مختصر یہ ہے کہ —“

”تمہارا مختصر قصہ ہم بعد میں سنیں گے۔ پہلے اس اہم کام سے غافل نہ ہو لیں۔“ نواب بہادر نے انہیں مزید بات کرنے سے روک دیا۔

پھر —

نواب بہادر نے خود ہی اصل بات شروع کی:

”جنوبی ہند کے جو حالات ہیں اور ان بدلیسی کمپنی والوں نے جو کھیل شروع کر رکھا ہے، اس سے سب واقف ہیں۔ ہم نے مرہٹہ سردار کو کچھ لے دے، کے ٹال دیا ہے اور وہ متحدہ لشکر جو ہمیں تباہ کرنے اور بالاکھاٹ پر قبضہ کرنے کے لیے آیا تھا اس میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ نظام دکن کے تمام کس بل نکل گئے ہیں اور وہ فرار کا راستہ دیکھ رہے ہیں۔ اس کے قاصد کا آنا اس بات کی صاف دلیل ہے کہ وہ ہر شرط پر ہرجا کرنے کا خواہشمند ہے۔“

ہم خود بھی نظام دکن کو ختم کرنا نہیں چاہتے، اس لیے کہ وہ ہماری اپنی طاقت ہے۔ ہمارے ملک کی طاقت ہے۔ اب طے یہ کرنا ہے کہ نظام کے ساتھ کن شرائط پر معاہدہ کیا جائے۔“

محفوظ خاں نے کھڑے ہو کر کہا:

”کیا اعلیٰ حضرت نے قاصد سے گفتگو کی ہے۔ آؤ وہ کیا شرائط لے کر آیا ہے؟“

”محفوظ خاں! حیدر علی نے نوی سے کہا:

”نظام دکن کیا کہتا ہے اس کی ہمیں کوئی پروا نہیں۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ہم کن شرطوں پر اسے مجبور کر سکتے ہیں۔“

تمہاری اطلاع کے لیے میں یہ بتا دوں کہ ہم نے نظام کے قاصد کو اعلیٰ حضرت پیش کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔“

اس وقت محمد علی کیدان نے جرات کر دہ بولا:

”آقا نے عرض کیا۔ اس تمام فتنے کی جڑ والی اراکٹ والا جاہ محمد علی ہے۔ ہمیں سب سے پہلے اسے معزول کرنا ہے۔“

”ہمیں تمہاری رائے پسند آئی محمد علی کیدان۔“

نواب حیدر علی نے اسے عین آمیز نظروں سے دیکھا:

”مگر والا جاہ براہ راست نظام دکن کا ماتحت نہیں ہے۔ اس کی بیست پر تو انگریز کمپنی ہے ہاں ہم اس معاہدے میں اس طرح کی کوئی شرط ضرور رکھ سکتے ہیں۔“

نظام دکن اگرچہ کوئی بڑی طاقت نہ تھی لیکن جنوبی ہند میں اس کی اہمیت ضرور تھی۔ انگریز اس کے زور پر بہت چھوٹے تھے اس لیے حیدر علی، نظام دکن سے صلح کے خواہش مند تھے۔ چونکہ متحدہ بہت اہم تھا اس لیے گفتگو طویل پھیلتی رہی مگر کسی متفقہ فیصلے کی صورت سامنے نہ آ سکی۔ پھر یہ طے پایا کہ شام کو اس سلسلے میں پھر گفتگو ہو اور کل صبح نظام دکن کے قاصد کو اذن باریابی

دیا جائے۔

شام کی محفل میں بھی "شرائط صلح" زیر بحث رہیں۔ خوب مباحثہ ہوا مگر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ آخر یہ طے پایا کہ دوسرے دن نظام کے قاصد کو گفتگو کا موقع دیا جائے شاید اس کی روشنی میں کوئی معاہدہ طے پا جائے۔

سکیں۔ اعلیٰ حضرت نظام دکن، میسور کے نمائندے کو خوش آمدید کہیں گے۔
ٹھیک ہے۔ ہم نظام کی خواہش کا احترام کرتے ہیں۔" نواب حیدر علی خاں نے مزید وضاحت کے لیے کہا:
"لیکن ہمیں یہ بتایا جائے کہ کیا والی دکن کے ذہن میں صلح نامہ کا کوئی ہلکا سا خاکہ موجود ہے اگر ہے تو کیا ہے؟"

قاصد نے ذرا ٹھہر کر جواب دیا:
"محترم نواب بہادر۔ میں اس کا صحیح طور پر جواب نہیں دے سکتا لیکن تجھے یہ حکم ضرور ہے کہ میں آپ کی خدمت میں یہ عرض کر دوں کہ میسور سے گفتگو کے لیے جو بھی تشریف لائے وہ نہ صرف با اختیار ہو بلکہ کھلے دل سے گفتگو کرے تاکہ جو بات طے پائے طریق اس کے پوری طرح پابند ہو جائیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم تمہارا مقصد سمجھ گئے۔"

نواب بہادر نے ہاتھ اٹھا کر کہا:

"تم اگر ٹھہرنا چاہو تو ہمارے جہان کی حیثیت سے ٹھہر سکتے ہو اور اگر واپس جانا چاہتے ہو تو تمہیں اجازت ہے۔ ہم بہت جلد اپنا وفد والی دکن کے پاس بھیجیں گے۔" نواب بہادر نے بھی پوری وضاحت سے جواب دیا تھا۔

"نواب بہادر کا میں بہت شکر گزار ہوں۔ قاصد نے کہا:

"میں واپس جانے کی اجازت چاہتا ہوں اور نواب بہادر سے امید ہے کہ وہ اس گفتگو کے اختتام سے پہلے کسی فوجی کارروائی کا حکم نہ دیں گے۔"

نواب بہادر نے اسے مطمئن کیا:

"تم بالکل اطمینان رکھو۔ گفتگو کے کامیاب یا ناکام ہونے تک ہماری طرف سے کوئی فوجی کارروائی نہ ہوگی۔"

قاصد نے رخصتی سلام کیا۔ نواب بہادر نے اشارے سے جواب دیا اور اشارے ہی سے اسے روک دیا۔

پھر انہوں نے بائیں ہاتھ کی انگلی سے ایک چاندی کی انگوٹھی اتاری جس میں الماس جڑا ہوا تھا۔ نواب بہادر نے فرمایا:

دوسری صبح نواب حیدر علی خاں نے نظام دکن کے قاصد کو طلب کیا۔ اس وقت دربار یعنی نواب بہادر کے خیمے میں صرف محفوظ خاں اور میر رضا علی موجود تھے۔

نواب بہادر نے قاصد سے خود کلام کیا۔ ان کا بھڑا دوستانہ اور مشفقانہ تھا۔ نواب بہادر نے دریافت کیا:

"میں نظام دکن کے قاصد کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ والی دکن، خیر و عافیت ہوں گے۔"

قاصد کو نواب بہادر کے بھرپور احوالہ ہوا۔ اس نے ادب سے عرض کیا:

"والی دکن نظام علی خاں بہادر خدا نے تعالیٰ کے فضل و کرم اور نواب بہادر کی دعاؤں سے بخیریت ہیں۔ انہوں نے آپ کے لیے نیک خواہشات اور دوستی کا پیغام بھیجا ہے۔"

"اس خطبے کے لیے والی دکن کو ہمارا شکریہ پہنچایا جائے۔" نواب بہادر نے بھی رسمی سا جواب دیتے ہوئے کہا۔

دونوں طرف تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ قاصد شاید آغاز کے لیے الفاظ ترتیب دے رہا تھا۔ نواب بہادر نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ انہوں نے کہا:

"والی دکن سے ہم بھی دوستی کے خواہشمند ہیں مگر اس کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ والی دکن کے ذہن میں اس کا کیا تصور ہے؟"

قاصد کو واقعی موقع مل گیا۔ اس نے فوراً کہا:

"اعلیٰ حضرت والی دکن نے اس ناچیز کو اس لیے نواب بہادر کی خدمت میں بھیجا ہے اور اس امر کی خواہش کی ہے کہ سلطنت میسور کی طرف سے خود نواب بہادر یا ان کا کوئی اہم نمائندہ اعلیٰ حضرت نظام دکن سے گفتگو کے لیے تشریف لائے تاکہ دوستی اور خطبے کے معاہدے کی شرائط طے کی جا

حلیف انگریزوں کو نظام دکن اور حیدر علی کے متوقف گھڑ سے باخبر کر دیا ہے۔
اس طرح نظام دکن اور حیدر علی میں دوستی ہونے کے بجائے انگریزوں نے بالا گھاٹ پر
حملے کا لالچ دے کر نظام دکن کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور اس کے نتیجے میں انگریزوں کی یہ پسلی
رٹائی شروع ہوئی تھی۔

یہ ٹھیک تھا کہ گلبرخ نے جو کچھ کیا تھا اس میں اس کا مفاد پوشیدہ تھا۔ وہ اس طرح کہ
اگر نواب بہادر حیدر علی اس کے منگیتر سے خوش ہو گئے تو یہ ممکن تھا کہ جس وقت نواب بہادر
ارکاٹ فتح کرتے یا گلبرخ سرنگاپٹم پہنچتی تو نواب بہادر گلبرخ اور سردار علی کی شادی کر دیتے، جیسا کہ
اس وقت صورتحال پیدا ہو گئی تھی۔

گلبرخ نے صرف یہی ایک کام نہ کیا تھا بلکہ اس نے محفوظ خاں جو نواب والا جاہ محمد علی کے بڑے
بھائی تھے اور جن کا ستم کر دالا جاہ نے ارکاٹ کی نوابی حاصل کی تھی، پر ایک بڑا احسان کیا تھا۔
محفوظ خاں کافی عرصہ سے والا جاہ کی قید میں تھے۔ گلبرخ کی ایک گہری سبیلی ماہر وہ بھی محل میں کینز تھی
اس کی شادی ارکاٹ کے قید خانے کے ایک عافظ سے طے پا گئی تھی مگر ماہر کی ماکن، جو والا جاہ
محمد علی کی تیسری بیوی تھی اسے چھوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہ تھی۔

ماہر واکمز اپنی پتا گلبرخ کو سنا فی اور دونوں مل کر دیا کرتی تھیں۔ آخر گلبرخ نے ایک
تدبیر سوچی۔

ایک دن وہ ماہر کی ماکن کے پاس گئی اور اس سے کہا:
”ملکہ محترمہ! آپ کی کینز ماہر کی شادی ہونے والی ہے۔ کیا آپ کو اس کا علم ہے؟“
”ہاں، مجھے معلوم ہو گیا ہے۔“ ملکہ نے جواب دیا:
”مگر اس کی شادی اس وقت تک کیسے ہو سکتی ہے جب تک میں اسے اس بات کی
اجازت نہ دوں۔“

”آپ نے درست فرمایا ملکہ محترمہ!“ گلبرخ نے تائید کرتے ہوئے کہا:
”لیکن اگر ماہر واکمز کے اپنے میاں کے ساتھ یہاں سے بھاگ جاتے تو پھر
آپ کیا کریں گی؟“
ملکہ گھبرا گئی۔ اس نے کہا:
”یہ تو ہو سکتا ہے۔ پھر مجھے کیا کرنا چاہیے گلبرخ۔ تم مجھے کوئی ترکیب بتاؤ کہ ماہر میرے

میرا انگوٹھی ہم تمہیں دیتے ہیں۔ اسے تم ایک یادگار کے طور پر قبول کر سکتے ہو۔ چونکہ ہم
اسے تمہیں غلوں دل سے عنایت کر رہے ہیں اس لیے اسے کسی طرح بھی رشوت نہیں
کہا جاسکتا۔“

قاصد نے جھک کر نواب بہادر کو درباری تعظیم پیش کی اور انگوٹھی ان کے ہاتھ سے لیکر
پہلے پیشانی سے لگا دی۔ پھر اپنی انگلی میں پسلی۔

خان بہادر کی مجلس برخواست ہونے کے بعد محفوظ خاں سیدھے اس خیمے میں پہنچے
جہاں سے میرزا علی انیس نواب بہادر کے پاس لے گئے تھے۔
خیمے میں نواب بہادر کا ایک لشکر ہی تھا اور اس کے سامنے ایک خوبصورت عورت بیٹھی تھی۔
محفوظ خاں کو کہتے دیکھ کر وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔

محفوظ خاں نے عورت سے کہا:
”گلبرخ! تمہارا احسان میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ اگر تم کو ششستر نہ کرتیں تو نہ کہ تمہاری
قید سے مجھے عمر بھر رٹائی نہ ملتی۔“

”خان صاحب! گلبرخ نے بڑے سلیقے سے جواب دیا:
”آپ بار بار اس واقعے کا ذکر کر کے کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ اگر میں نے آپ کی کوئی
خدمت کی تھی تو آپ نے مجھے اس کا صلہ بھی تو دے دیا۔ اگر آپ مدد نہ کرتے تو میں سردار علی کو
کس طرح ڈھونڈتی۔“

یہ سب آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج میں سردار علی تک پہنچی ہوں۔ یہ کہہ کر گلبرخ نے
بڑے پیار سے اس لشکر کی طرف دیکھا جو اس کے سامنے کھڑا تھا۔

قارئین گلبرخ اور سردار علی کے ناموں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ پچھلے صفحات میں یہ بیان کیا
جا چکا ہے کہ ارکاٹ کے نواب والا جاہ محمد علی کے محل کی ایک کینز گلبرخ نے محل کے ایک غلام کے
ہاتھوں اپنے سوتیلے بھائی سردار علی، جس کی وہ منگیتر تھی، کے پاس ایک اہم پیغام بھیجا تھا۔
گلبرخ کے بھیجے ہوئے پیغام ہی سے نواب بہادر حیدر علی کو یہ معلوم ہوا تھا کہ نظام دکن کا قاصد
نواب بہادر کے پاس آنے کے بجائے والا جاہ کے پاس پہنچ گیا ہے اور والا جاہ نے فوراً اپنے

پاس سے کہیں اور نہ جلتے۔

گلرخ نے بڑا سامنہ بنا کر کہا:

"اے ملکہ محترمہ۔ آپ ماہر و پربھارت و کیوں نہیں پھرتیں۔ اس کی جگہ کسی اور کینیز کو اپنی خدمت میں لے لیجیے۔"

"یہ تو میں کر سکتی ہوں۔ داروغاؤں میری بات بھی مانتی ہے مگر اس سے اچھی کینیز مجھے یا گی کہاں!"

"تو کیا میں اس سے بڑی ہوں؟" گلرخ نے فوراً خود کو پیش کر دیا۔
ملکہ کی تو باپھیں کھل گئیں۔

"ارے تم۔ تم تو پورے محل میں نمبر ایک ہو۔ تم راضی ہو تو میں آج ہی داروغاؤں سے بات کروں؟"

گلرخ نے سر تہنیم کر دیا۔

ملکہ نے اسی وقت داروغاؤں کو بلوایا اور ماہر و کی جگہ گلرخ کو اپنی خدمت کے لیے لگانے کا کہا۔ داروغاؤں نے گلرخ سے دریافت کیا۔ اس نے ہاں کر دی۔ پس گلرخ ماہر و کی جگہ ملکہ کی خدمت میں آ گئی۔

گلرخ کی اس "ہاں" کا ایک سبب تو ماہر و کو شادی کی اجازت دلوانا تھا اور دوسرا سبب یہ تھا کہ کینیزوں اور غلاموں کا ایک گروہ والا جاہ محمد علی کے بڑے بھائی محفوظ خاں کو آزاد کرانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

ملوکیت یعنی بادشاہی زمانے میں شاہی محلات طرح طرح کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا مرکز ہوا کرتے تھے اور کینیزیں اور غلام وہ کام کر جاتے تھے جو شاہی لشکر بھی نہ کر سکتا تھا۔ پس۔

اس سازشی گروہ نے جو "محفوظ خاں" کو ایک بھاری معاوضے کے صلے میں آزاد کرانے کی فکر میں تھا، گلرخ کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی۔ گروہ کو علم تھا کہ گلرخ اور ماہر و میں گہری چھنتی ہے اور ماہر و کا منگیتر قید خانے کی اس کو ٹھٹھری کاپرسے دار ہے جس میں محفوظ خاں قید ہیں۔

عمل کے نوڈی غلام ایک دوسرے کے مخالف تو ہوتے تھے مگر جب ان کا مفاد مشترک ہوتا

تو وہ متحد ہو جاتے تھے۔

گلرخ نے اس سلسلے میں ماہر و سے بات کی اور اسے اس بات پر آمادہ کر دیا کہ اگر وہ اپنے منگیتر کو آزاد کرنے کے محفوظ خاں کے ساتھ ساتھ ماہر و اور اس کے منگیتر کو بھی ارکاٹ سے مرنگا پٹم بھیجا جاسکتا ہے۔

ماہر و محل کی روز روز کی دانٹا کل کل سے پریشان تھی۔ گلرخ اس کی سبیلی تھی اور اس پر اس نے احسان بھی کیا تھا۔ اس نے اپنے منگیتر سے مشورہ کیا۔ وہ بھی اپنی موجودہ ملازمت سے بے حد پریشان تھا۔ پھر محفوظ خاں کے آزاد کرانے میں یہ مفاد بھی مضمر تھا کہ ممکن ہے محفوظ خاں ارکاٹ کا نواب ہو جائے تو اس کے پڑ بارہ ہو جائیں۔

اس "محفوظ خاں" کو قید سے نکالنے، پھر انہیں ماہر و اور اس کے منگیتر سمیت مرنگا پٹم پہنچانے کا منصوبہ تیار ہوا۔ جس معاملہ میں محل کے چار غلام اور چار کینیزیں ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے ہوں وہ بخیر و خوبی کیوں نہ انجام پائے۔ یہ غلام اور کینیزیں تو اس قدر طاقتور ہوتے تھے کہ شاہ وقت کو بھی قتل کر دیا کرتے تھے۔

اس طرح ایک شب قیدی محفوظ خاں مع اپنے محافظ اور اس کی منگیتر کے ارکاٹ سے اس طرح غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔
نواب والا جاہ محمد علی کو بھائی کے قید سے اس طرح خزاں ہونے کی خبر ملی تو اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔

والا جاہ نے تمام غلاموں کو مورد الزام ٹھہرایا۔ غلاموں نے صاف انکار کر دیا کہ یہ کام صرف محفوظ خاں کے محافظ کا ہے اور یہ کہ انہیں اس بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔
محافظ کو پوری ریاست میں تلاش کیا گیا مگر وہ کہاں ملتا۔ اس طرح ابھی مع ہمد غائب کی مثل صادق آئی۔

محفوظ خاں اور اس کا محافظ مع ماہر و کے بڑی حفاظت سے مرنگا پٹم پہنچ گئے۔ محفوظ خاں نے جب خود کو نواب بدر حیدر علی خاں کے سامنے پیش کیا تو نواب ہا در نے ان کی بڑی عزت افزائی کی اور وعدہ کیا کہ وہ ارکاٹ کی نوابی اُسے دلانے کی کوشش کریں گے۔
گلرخ نے ماہر و سے وعدہ کیا تھا کہ وہ خود بھی بہت جلد مرنگا پٹم پہنچنے کی کوشش کرے گی کیونکہ اس کا منگیتر مردار علی بھی تو مرنگا پٹم ہی میں ہے۔

محفوظ خاں کو نواب بہادر نے اپنے لشکر میں ایک بڑے سردار کا عہدہ دیا۔ محفوظ خاں کی ہی سفارش پر ماہر وکے منیجر کو بھی فوراً میں ملازم رکھ لیا گیا اور ان دونوں کی شادی کر دی گئی۔ گل رخ اپنے وعدے کے مطابق ایک رات چپکے سے اراکات سے نکلی اور سرنگا پٹم پہنچ گئی۔ ماہر وکے گل رخ کے بارے میں اپنے منیجر اور محفوظ خاں کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ چنانچہ جب گل رخ نے سرنگا پٹم کے محفوظ خاں کو پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ خانہ صاحب نواب بہادر کے ساتھ میدان جنگ میں ہیں اور سردار علی بھی ان کے ساتھ ہی ہے۔

گل رخ کو کس طرح چین ملتا ہے فوراً محاذ جنگ کی طرف روانہ ہو گئی اور محفوظ خاں کو تلاش کرتی ہوئی ان تک پہنچ گئی۔

محفوظ خاں بھی اس کے احسان مند تھے۔ وہ اسے خود اپنے ساتھ لے کر سردار علی کے پاس اس کے خیمے میں پہنچے۔

نواب بہادر کی مجلس بر خاست ہونے کے بعد محفوظ خاں دوبارہ سردار علی کے خیمے میں پہنچے جہاں گل رخ اور سردار علی بے چینی سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ محفوظ خاں نے انہیں خوشخبری سنائی۔

”تمہارا ام نامبارک ہوا گل رخ۔ نظام دکن سے صلح کی بات چیت کامیاب ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ اس سے قطع نظر میں ایک دو دن میں نواب بہادر سے تم دونوں کی شادی کی اجازت حاصل کروں گا۔ اس وقت تک تمہیں میرے اہل خانہ کے ہمراہ رہنا ہو گا۔ گل رخ مسکراتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔“



امیر البحر راجہ علی کی معزولی کا سب کو افسوس ہوا۔

مشہور مقولہ ہے کہ ”خود کردہ راجہ بے نیست“

اسے اردو میں یوں کہہ سکتے ہیں ”اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنا“

راجہ علی کی معزولی خود اس کے اعمال کا نتیجہ تھی۔ نواب بہادر حیدر علی خاں نے راجہ علی کا بحیثیت امیر البحر اس لیے انتخاب کیا تھا کہ راجہ علی ایک بااثر (سلمان) پالیگار خاندان کا ایک پُر جوش جوان تھا۔ وہ کٹانور کا راجہ تھا اور سمندر سے محبت اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ہر بااثر جوان ایک اچھا ملاج ہوتا تھا۔

اس خیال کے پیش نظر جب راجہ علی کٹانور کے نارڈوں کی شورش کو دبانے کے لیے نواب بہادر سے فوجی امداد مانگے حیدر نگر گیا تو نواب بہادر نے اس کی دکتی پیشانی اور مضبوط اعضا سے اندازہ لگایا کہ وہ ایک بہتر بحری فوجی افسر ہو سکتا ہے۔

نواب بہادر کے ذہن میں حیدر دی بحریہ کے قیام کا منصوبہ گزشتہ کئی سال سے پرورش پار رہا تھا مگر اس بحریہ کی سرداری کے لیے وہ ایک معقول آدمی کی تلاش میں تھے۔ چنانچہ انہوں نے پہلی ہی نظر میں راجہ علی کو اپنے تجویز بحری بیڑے کا امیر البحر منتخب کر لیا۔

راجہ علی کا انتخاب کچھ غلط بھی نہ تھا۔ اس لیے کہ اس پُر جوش جوان نے ایک ماہ کے مختصر عرصہ میں ایک بڑا بحری بیڑا تیار کر لیا۔ اس بیڑے میں جنی کشتیوں کی تعداد بعض جگہ صرف ایک سو



لکھی گئی ہے جو زیادہ درست معلوم نہیں ہوتی۔ بہر حال۔ راجہ علی نے ایک ماہ میں نہر من بجری تیار کیا بلکہ اس بیڑے کے لیے بحری فوج بھرتی کر کے انہیں تربیت بھی دلائی۔ پھر اس غم تربیت یافتہ فوج کے ساتھ اس کے بحیرہ عرب کے ان ہندو جزیروں پر قبضہ کیا جو صدیوں سے ہندو راجاؤں کی ملکیت چلے آ رہے تھے۔

یہاں تک تو نواب بہادر حیدر علی خاں کلراجہ علی کے بارے میں اندازہ صحیح ثابت ہوا مگر وہ یہ اندازہ نہ کر سکے کہ یہ شجاع اور بہادر جوان قوت فیصلہ سے عاری ہے اور تاریخ اسلام سے بالکل ناواقف اور کوراہے۔

کسی بھی فوجی افسر کے لیے اس کی ذاتی شجاعت، دلیری اور فوجی سوچ بوجھ کے ساتھ ساتھ اس کی طبیعت میں حلم، بردباری، تحمل، قوت ارادی اور قوت فیصلہ ہونا بھی لازمی صفات ہیں۔ اس سلسلے میں تاریخ اسلام کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔ اس واقعہ کا تعلق جس شخص سے ہے اس کا نام ابراہیم یا ابراہیم ادم تھا۔ میرے حافظے میں اس کا نام محفوظ نہیں۔ دراصل یہ واقعہ میں نے بچپن میں ایک انگریزی نظم کی صورت میں پڑھا تھا۔

نظم کچھ اس طرح تھی کہ:

ایک جوان مسلمان کے باپ کو کسی نے قتل کر دیا۔ اس جوان نے قسم کھائی کہ جب تک وہ اپنے باپ کے قاتل سے انتقام نہیں لے گا اس وقت تک نہ چارپائی سے بیٹھ لگائے گا اور نہ پیٹ بھر کھانا کھائے گا۔

ابراہیم کو بڑی دھڑ دھوپ کے بعد کسی شخص سے اپنے باپ کے قاتل کا نام معلوم ہو گیا۔ نام بتانے والے نے قاتل کے شہر اور محلہ کا نام بھی بتایا مگر جب ابراہیم اس محلہ میں پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ اس نام کا ایک شخص یہاں رہتا ضرور تھا مگر چھوڑا ماہ پہلے وہ یہ محلہ چھوڑ کر کسی نامعلوم جگہ منتقل ہو گیا ہے۔

دوسری طرف ابراہیم کے باپ کے قاتل کو بھی کسی طرح معلوم ہو گیا کہ اس کے ہاتھ سے قتل ہونے والے شخص کا بیٹا اسے تلاش کر رہا ہے اور اس نے قاتل سے انتقام لینے کی قسم کھائی ہے۔ اس خوف سے وہ مہناہ اپنی رہائش بدل دیتا تھا۔ پہلے تو اس نے اپنے شہر میں اپنے دوستوں کے گھروں میں باری باری پناہ لی لیکن کوئی کسی کو کب تک پناہ دے سکتا ہے! جبکہ اسے یہ بھی معلوم ہو کہ جس کو وہ پناہ

دے رہا ہے وہ ایک شخص کا قاتل ہے اور مقتول کا بیٹا اسے جگہ جگہ ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔

اس طرح قاتل کو کچھ عرصہ بعد اس کے دوستوں نے بھی جواب دے دیا اور اسے صاف الفاظ میں بتا دیا کہ وہ ایک قاتل کو پناہ دے کر اپنے لیے مصیبت مول نہیں لے سکتے۔

اس طرح قاتل کو اپنا شہر ہمیشہ کے لیے چھوڑنا پڑا۔ وہ اپنے شہر سے دوسرے شہر گیا مگر کچھ عرصہ بعد اسے شبہ ہوا کہ کوئی شخص اس کا تعاقب کر رہا ہے اور اگر وہ اس شہر میں رہا تو ضرور پکڑا جائے گا۔ اس خوف سے اس نے وہ شہر بھی چھوڑ دیا اور تیسرے شہر پہنچا۔

دراصل اس پر موت کا خوف طاری ہو گیا تھا جو اس کے دل میں خواہ مخواہ کے دوسرے پیدا کرتا تھا اور اسے چین سے نہ بیٹھنے دیتا تھا۔ جس طرح ابراہیم نے اپنے باپ کی صورت نہ دیکھی تھی اور اسے عرف اس کا نام معلوم تھا اسی طرح قاتل کو بھی نہ تو مقتول کے بیٹے کا نام معلوم تھا اور نہ اس نے اسے دیکھا تھا۔ مگر دونوں اپنی تلک و دو میں گئے تھے۔ ابراہیم، قاتل کو اس کے نام کی مدد سے شہر شہر ڈھونڈتا پھر رہا تھا اور قاتل اپنے نام معلوم تلاش کرنے والے کے خوف سے شہر دوسرے شہر دوسرے بھاگتا اور چھپتا پھر رہا تھا۔ اس طرح کئی سال گزر گئے۔

نہ ابراہیم کو قاتل مل سکا اور نہ قاتل کو کسی جگہ قرار پایا۔ اس طویل عرصے میں ممکن ہے کہ کبھی دونوں کا آسنا سامنا بھی ہوا ہو مگر دونوں ہی ایک دوسرے کو نہ پہچان سکے۔

وقت آہستہ آہستہ گھسکتا رہا اور ایک سال اور گزر گیا اور ابراہیم کی کوشش کامیابی کا منہ نہ دیکھ سکی۔

ابراہیم نے اپنا یہ دستور بنالیا تھا کہ وہ صبح کو ایک منہ غم اور جوش کے ساتھ اپنے باپ کے قاتل کی تلاش میں نکلتا اور شام کو تھکا ہارا

”فکر نہ کرو محترم۔ کچھ دن کیا، تم جب تک چاہو میرے گھر میں رہ سکتے ہو۔ تم اب میری پناہ میں ہو۔ کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھانے کے بھی نہیں دیکھ سکتا۔“
انہی شکریہ گزاری کے طور پر نوادر کی آنکھوں نے دو آنسو ٹپکا دیے اور اس نے سسکیاں لینا شروع کر دیں۔

”محترم۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔ تمہیں یہاں کوئی خطرہ نہیں۔“

ابراہیم نے اسے تسلی دی:

”جب تک چاہو تم یہاں رہ سکتے ہو۔“

نوادر مطمئن ہو گیا۔ ابراہیم نے اس کے لیے ایک کمرہ مخصوص کر دیا۔ اس نے گھردلوں کو سمجھا دیا کہ اس کے ایک دوست کچھ دن کے لیے اس کے مکان میں ہیں۔ وہ باہر کے لوگوں سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے اس لیے ان کے بارے میں کسی سے کوئی تذکرہ نہ کیا جائے۔

نوادر کو ابراہیم کے گھر میں رہتے ہوئے ایک ماہ گزر گیا۔ اب اس کی وحشت بھی دور ہو گئی اور اس کی دہشت بھی جانی رہی تھی۔ ابراہیم سے اس کی ملاقات صوفیہ شاہ کے وقت ہوتی جب وہ اپنے کام سے واپس آتا۔ اس وقت بھی وہ صوفیہ شاہ کے لیے نوادر کے پاس ٹھہرتا۔ اس کی خیریت دریافت کرتا۔ پھر اپنے کمرے میں چلا جاتا۔

نوادر نے محسوس کیا کہ صبح کو جب ابراہیم اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر جاتا ہے تو اس کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر نظر آتا جیسے وہ پریشان ہو۔ پرامید ہو مگر جب وہ شام کو اور اکثر رات گئے گھر واپس آتا تو وہ ایک بار ہوا جواری نظر آتا۔ اس کا چہرہ بھیکا پھیکا ہوتا اور یوں دکھائی دیتا جیسے اسے کوئی شدید صدمہ پہنچا ہو۔

یہاں تک کہ نوادر کو ابراہیم کو اس طرح جاتے آتے دیکھ کر کوفت سی ہونے لگی۔ ساتھ ہی وہ اس سے شرمندہ شرمندہ مارہنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں سوچتا کہ وہ بھی کس قدر بد قسمت ہے کہ اپنے محسن کا دکھ درد بھی نہیں بٹا سکتا۔ پتہ نہیں اس کا محسن کیا کام کرتا ہے۔ وہ صبح کو کہاں جاتا ہے۔ جاتے وقت وہ پریشان دکھائی دیتا ہے مگر واپسی پر ہڈی ہڈی تھکے ہوئے ہے۔ کاش وہ اس کی کوئی مدد کر سکتا۔

آخر نوادر دسے اپنے محسن کا غمزدہ چہرہ دیکھتا گیا اور ایک دن وہ ابراہیم کی واپسی پر اس کی راہ روک کر کھڑا ہو گیا:

گھر واپس آ کر دو نالے کھاتا اور ایک الگ کمرے میں منہ پیٹ کر پڑتا۔

ایک شام وہ کچھ زیادہ تھکا ہوا تھا۔ دو نالے کے اس نے فرش سے کمر لگائی تو اسے فوراً نیند آ گئی۔ نہ معلوم وہ کتنی دیر سو رہا تھا کہ کسی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

ابراہیم اٹھ کر دروازے کے پاس گیا۔

”کون ہے؟“ اس نے اندر سے پوچھا۔

”دروازہ کھولیں۔ میری جان خطرے میں ہے۔ دشمن میرا پیچھا کر رہا ہے۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کیجیے۔ میں آپ کا احسان عمر بھر نہ بھولوں گا۔“ باہر سے کوئی گھبراتے ہوئے لہجے میں گڑ گڑا کر دروازہ کھولنے کی درخواست کر رہا تھا۔

ابراہیم کے جذبہ رحم نے جوش مالا۔ وہ یہ برداشت نہ کر سکا کہ کوئی بے سہارا انسان اپنے دشمن کے ہاتھوں مارا جائے۔ اس کے دل نے کہا کہ اے ابراہیم! مجبور پر رحم کر کہ اللہ تم کو کرنے والے پر خود بھی رحم فرمائے۔

ابراہیم نے فوراً دروازہ کھول کر اسے اندر کھینچ لیا۔ پھر دروازہ مضبوطی سے بند کر دیا۔
”میں آپ کا یہ احسان تمام عمر نہ بھولوں گا۔“ ادھیڑ عمر کے خوفزدہ آدمی نے اکھڑی اکھڑی سانفوں کے درمیان کہا:

”آپ مجھے پناہ نہ دیتے تو وہ ضرور مجھے مار ڈالتا۔“

ابراہیم نے اسے تسلی دی:

”فکر نہ کرو محترم۔ اب تمہیں کوئی نہیں مار سکتا۔ میں تمہاری حفاظت کروں گا۔ تم میری

پناہ میں ہو۔“

نوادر نے متحیرانہ نگاہوں سے ابراہیم کو دیکھا:
”قیل بلی احرام جان۔ کیا تم مجھے کچھ دنوں کے لیے اپنے گھر میں پناہ دے سکو گے۔ مجھے باہر ہر طرف خطرہ ہی خطرہ دکھائی دیتا ہے۔“
ابراہیم نے اعلیٰ حسن اخلاق کا مظاہرہ کیا:

”میرے دوست۔ میرے محسن!“ نودار نے جی کڑا کر کے کہا:
”مجھ سے اب تمہاری یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔ کیا غم ہے تمہیں۔ آخر کس بات نے تمہیں
بدمحال کر دکھا ہے؟“

”میں ٹھیک ہوں میرے دوست۔“ ابراہیم نے افسردہ آواز میں جواب دیا:
”تم میرے جہانِ بوار میں اپنے غم کو جہانوں میں نہیں بانٹا کرتا!“

”میرے محسن۔ میں تمہارے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔“ نودار نے کہا:

”میں جانتا ہوں کہ میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتا مگر میں نے سنا ہے کہ اپنا غم اگر دیواروں
سے بھی بیان کیا جائے تو اس کی شدت کم ہو جاتی ہے۔ تم مجھ سے کم از کم اپنا غم تو بیان کرو۔
محکم ہے اس طرح تمہارا دل کچھ ہلکا ہو جائے۔“

ابراہیم نے اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھتے ہوئے کہا:

”اس وقت میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ کل واپسی پر تم سے بات کروں گا۔“

ابراہیم اپنے کمرے میں چلا گیا اور نودار اس کے غم پر آنسو بہاتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔
ابراہیم کے گھر بڑا بڑا تھا۔ اسے اپنے دشمن کا کوئی دھڑکا نہ رہ گیا تھا مگر ادھر کچھ دنوں سے وہ
ابراہیم کے غم سے غزدہ ضرور رہنے لگا تھا۔ وہ رات اور دوسرا دن اس نے بڑی بے چینی سے
گناہا۔ پھر شام ہوتے ہی وہ ابراہیم کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

اس دن اتفاق سے ابراہیم بھی جلد ہی آگیا اور نودار کو زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ ابراہیم
نے نودار کو کھانے کی طرح راستہ میں کھڑے دیکھا تو وہ پھسکی سی ہنسی ہنسا:

”میرے دوست! نکل نہ کرو۔ آج میں تمہیں اپنے غم میں ضرور شریک کروں گا۔ تم اپنے کمرے
میں جاؤ میں کچھ دیر بعد خود تمہارے پاس آؤں گا۔“

نودار نے اس سے کوئی سوال نہ کیا اور خاموشی سے اپنے کمرے میں آگیا۔ کچھ ہی دیر
بعد اپنے وعدہ کے مطابق ابراہیم آگیا۔ پھر دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

”اب پوچھو۔ تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“ ابراہیم نے سلسلہ کلام شروع کیا۔

”میرے محسن!“ اجنبی نے مجاہد سے کہا:

”میں اتنے دنوں سے تمہیں صبح ہی صبح کہیں جاتے اور تمام دن بعد واپس آتے دیکھتا ہوں۔
میں نہیں جانتا کہ تم کیا کاروبار کرتے ہو یا کہاں ملازم ہو۔ یہ پوچھنے کا مجھے کوئی حق بھی نہیں لیکن

مجھے اس بات کا شدید احساس ہوتا ہے کہ جس وقت تم گھر سے روانہ ہوتے ہو اس وقت
تمہارا چہرہ پر غم اور پُر امید دکھائی دیتا ہے لیکن جب تم رات کو واپس آتے ہو تو انتہائی دل شکستہ
اور پریشان ہوتے ہو۔“

تمہارے بارے میں میرے یہ خدشات ہیں۔ اگر تم چاہو تو میرے دل میں اٹھتے ہوئے ان
دوسو سوں کو دہر کر سکتے ہو۔ ہاں اگر تمہیں اس کے اظہار سے تکلیف کا امکان ہو تو میں اپنا سوال
واپس لیتا ہوں۔“

”میرے اجنبی دوست۔“ ابراہیم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

”تم نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا کہ میں صبح کو جاتے وقت پُر غم ہوتا ہوں اور واپسی پر
دل شکستہ دکھائی دیتا ہوں۔“

ہر روز جب میں گھر سے نکلتا ہوں تو مجھے اپنی کامیابی کی پوری پوری امید ہوتی ہے اسی لیے
میں پُر غم ہوتا ہوں مگر جب تمام دن کی کوشش کے باوجود میں اپنے مقصد تک نہیں پہنچ پاتا تو
میرا دل ٹوٹ جاتا ہے اور میں اسی حالت میں گھر آ کر پڑ رہتا ہوں۔ دوسری صبح میں پھر اسی غم و
حوصلہ کے ساتھ گھر سے نکلتا ہوں مگر کامیابی نہیں ہوتی۔

گزشتہ دو سال سے میری یہ کیفیت ہے۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک میں اپنے
مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا نہ تو میں چار پائی پرسوں گا اور نہ پیٹ۔ ضرر دہی کھاؤں گا۔
اجنبی نہایت توجہ سے ابراہیم کی بات سن رہا تھا۔ جب وہ سانس لینے کے لیے رکا تو اجنبی
نے بے چینی سے پوچھا:

”میرے محسن۔ یہ تمام باتیں تو میں اپنی آنکھوں سے ہر روز دیکھتا ہوں۔ کیا تم مجھے اپنے اس
غم یا مقصد سے آگاہ نہ کر دے گے جس نے تمہاری نیند حرام کر دی ہے اور بھوک اڑا دی ہے۔“
”سنو میرے اجنبی ہمدرد۔“ ابراہیم نے سنبھل کر کہنا شروع کیا:

”میرا غم یہ ہے کہ میرا پاپ ایک شخص کے ہاتھوں مارا گیا ہے اور میں نے قسم کھائی ہے کہ
جب تک میں باپ کے خون کا بدلہ نہ لے لوں گا اس وقت تک آرام نہ کروں گا۔ پیٹ بھر غذا نہ
کھاؤں گا۔“

میں روز صبح اس قاتل کی تلاش میں اس امید پر نکلتا ہوں کہ شاید آج میں اسے پاسکوں مگر
دن بھر کی ناکام تلاش کے بعد گھر واپس آتا ہوں اور منہ پیٹ کر پڑ رہتا ہوں۔“

”تلوار حاضر ہے مہمان۔ اب بتاؤ تم اس سے کیا کام لینا چاہتے ہو؟“
 ”یہ تلوار تم اٹھاؤ میرے محسن!“ اجنبی نے ابراہیم سے درخواست کی اور خود فرش پر دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔

ابراہیم نے مہمان کی درخواست پر تلوار اپنے ہاتھ میں پکڑ لی۔
 اجنبی مہمان نے حسرت ناک نظروں سے اپنے محسن کو دیکھا اور جیسے خوابوں میں کتنا شروع کیا۔
 ”قدرت کے بھی کیا کھیل ہیں۔ اس کے رازوں سے کوئی واقف نہیں۔ کہتے ہیں کہ بھاگا بھاگتا جائے اور بھاگ ساتھ جاتے۔ میں جس کے خوف سے محلوں اور شہروں بھاگتا پھرتا تھا، قسمت مجھے اسی کے دروازے پر لے آئی۔

ابراہیم۔ تم میرے محسن ہو۔ تم نے مجھے پناہ دی ہے۔ میں تمہارا احسان صرف اپنی جان دے کر اٹار سکتا ہوں۔

اسے غمزدہ ابراہیم۔ تلوار کھینچا اور مجھے قتل کر کے اپنا کلبو ٹھنڈا کر لو اس لیے کہ جس اسحاق کی تلاش میں تم اتنے عرصے سے سرگرداں ہو وہ اسحاق یعنی تمہارے پیارے باپ کا قاتل میں ہی ہوں۔ میرا ہی نام اسحاق ہے جس کی تمہیں تلاش تھی اور جو تمہارے خوف سے چھپتا ہوا تمہارے ہی گھر میں آ کر پناہ گزین ہو گیا۔

ابراہیم نے یہ سن کر کہ اس کا مہمان ہی اس کے باپ کا قاتل ہے، ایک اضطرابی کیفیت کے تحت تلوار تو بھینچ لی مگر تلوار صرف کھینچنے کے رہ گئی تھی اور ابراہیم گم سم کھڑا تھا۔
 اجنبی مہمان اسحاق جو اس کے باپ کا قاتل تھا، اس نے ابراہیم کے سامنے اپنا منہ بھکا دیا تھا اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔

جب اسحاق پر دیر تک تلوار کا وارہ ہوا تو اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے منہ ابراہیم شمشیر بکٹ کھڑا تھا مگر اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں سامنے کی طرف جھکی ہوئی تھیں اور وہ پتھر کے بت کی مانند بے حس و حرکت تھا۔

”میرے محسن!“ اسحاق نے ذرا اونچی آواز میں کہا:

”جلدی کرو میرا سرتق سے جلا کر دو، قبل اس کے کہ مجھ میں زندہ رہنے کی آرزو پیدا ہو جائے اور میں جان بچانے کے لیے یہاں سے بھاگنے کی سوچنے لگوں۔“
 اس وقت ابراہیم نے ایک جھٹکے کے ساتھ کھلی ہوئی تلوار دیوار پر دے ماری اور دھتکنا

ابراہیم یہ کہہ کر خاموش ہوا اور اس نے اجنبی مہمان کی طرف دیکھا۔ اس کا مہمان کسی گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا۔
 ابراہیم نے کہا:

”میرے ہمدرد۔ تم میرے غم کو اپنے دل سے کہیں لگا رہے ہو۔ یہ غم تو میری زندگی کے ساتھ چلتا رہے گا۔ اور شاید قبر میں بھی میرے ساتھ جائے گا۔“
 اجنبی چونکا اور کھسیانی ہنسی ہنسنے ہوئے بولا:

”میرے محسن۔ تمہیں اس قدر دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے۔ کامیابی کسی وقت بھی تمہارے قدم چوم سکتی ہے۔ ہاں ذرا یہ تو بناؤ کہ کیا تم اپنے باپ کے قاتل کا نام جانتے ہو؟“
 ”ہاں اجنبی۔ میں نے اس کا نام معلوم کر لیا ہے مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟“ ابراہیم نے اس سے سوال کیا۔

”بس یونی پوچھ لیا کہ شاید میں اسے جانتا ہوں۔“ اجنبی نے کھوٹے کھوٹے انداز میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

”میرا باپ کے قاتل کا نام مجھے اسحق بتایا گیا ہے۔“ ابراہیم نے بڑے دکھ سے کہا۔

”اسحق!“ اجنبی نے دہرایا:

”تم نے اسحق کو کہیں دیکھا ہے؟“

”نہیں اجنبی۔ نہ میں نے اسے دیکھا ہے اور نہ اسے پہچان سکتا ہوں۔“ ابراہیم کے لہجے سے غم جھلک رہا تھا۔

”میرے محسن! کیا تم اپنی تلوار یہاں لا سکتے ہو؟“ اجنبی نے ایک سوال کر دیا۔

ابراہیم نے حیران نظروں سے مہمان کو دیکھا:

”میں سمجھ نہیں سکتا کہ یہ کہہ رہے ہو۔ تلوار کی تمہیں کیا ضرورت ہے؟“

”تلوار کی ضرورت مجھے نہیں ہے میرے محسن۔“ اجنبی نے کھوٹے کھوٹے لہجے میں کہا:

”تمہیں تلوار کی ضرورت پڑے گی۔“ تلوار لے آؤ میرے محسن!

ابراہیم کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی مہمان کی خاطر اپنے کمرے میں گیا اور وہ تلوار لے آیا جسے لیکر وہ ہر صبح اپنے باپ کے قاتل کی تلاش میں نکلتا تھا۔
 ابراہیم نے تلوار مہمان کے سامنے رکھ دی:

کیونکہ اسلام سلامتی کا مذہب ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کا سب سے بڑا علمبردار بھی ہے۔ اسلام ہمیں درس دیتا ہے کہ کسی سے کیے ہوئے عہد کو جان دے کو بھی برقرار رکھو۔ کسی کو پناہ دینا ایک قسم کا وعدہ ہوتا ہے۔

اس قصہ کے بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ جزائروں پر حملہ ہونے کے بعد دہاں کے ہندو راجہ نے ہتھیار ڈال دیے تھے اور وہ امیر البحر راجہ علی کی پناہ میں آ گیا تھا مگر راجہ علی نے اپنے ہاتھ میں فوجیوں اور ملاحوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے راجہ کی آنکھیں نکلوا دیں اور اسے اندھا کر دیا تھا۔

اس کے اسی اقدام کو نہ تو نواب حیدر علی نے پسند کیا اور نہ شرعی حیثیت سے قاضی القضاۃ نے راجہ علی کو کوئی رعایت دی۔ انہوں نے بھی اسے جرم گردانا اور اس کے معزول کیے جانے پر شرعی مہر لگا دی۔

اسی دن دربار ختم ہونے کے بعد راجہ علی نے نواب بہادر کے پاس حاجب کے ذریعے سے درخواست کی کہ اسے رخصتی سلام کرنے کی اجازت دی جائے مگر نواب بہادر نے اس کی اس درخواست کو شرف قبولیت نہ بخشا اور حاجب کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ: ”راجہ علی کو معقول لباس مینا کیا جائے اور اسے کمال حفاظت سے اس کی ریاست کن الود پہنچا دیا جائے“۔

راجہ علی جس عالم میں دارالسلطنت حیدر نگر روانہ ہوا تھا اس سے لوگوں نے اندازہ لگایا تھا کہ امیر البحر راجہ علی کسی وجہ سے نواب بہادر کے زیرِ عتاب آ گیا ہے اور پتہ نہیں اب اس کا کیا حشر ہو!

یہ خبر فوراً ہی رانی کنا نور سلمہ کو پہنچائی گئی۔ اس منحوس بزرگ کو سننے ہی سلمہ فوراً اپنے خسر سے ملنے روانہ ہو گئی۔

ادھر جب راجہ علی کے باپ کو یہ خبر ملی تو وہ بھی بدحواس ہو گئے مگر انہوں نے فوراً خود کو سنبھالا اور کنا نور روانہ ہوئے تاکہ دہاں پہنچ کر اپنی عزیزہ بیورانی سلمہ کی اشک ثنوی کریں۔

یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ دونوں کی ملاقات راستے میں ہو گئی۔ رانی سلمہ کی بند گاڑی سواروں کے پرے میں آ رہی تھی اور راجہ علی کے والد دو سواروں کے ساتھ کنا نور جارہے تھے۔ اگر دونوں کی ملاقات نہ ہوتی تو اور زیادہ پریشانی ہوتی۔

اس اتفاقیہ ملاقات کے وقت دونوں ہی افسردہ اور غمگین تھے۔ راجہ علی کے والد نے رانی سلمہ

اکوڑا میں کہا:

اے اسحاق۔ اے میرے باپ کے قاتل۔ تم رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ کہیں دور بھاگ جاؤ۔

پھر ابراہیم نے اپنی جیب سے ایک قلعی نکالی جس میں کچھ رقم تھی اور قلعی کو اسحاق کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا:

جلدی کرو اسلحہ۔ میں اپنے باپ کے قاتل کو تو قتل کر سکتا ہوں لیکن اپنی پناہ میں آئے ہوئے انسان کو اپنے گمان کو کیسے قتل کر سکتا ہوں۔

میں تمہارا خون بہا کر اسلامی روایات کا خون نہیں کر سکتا۔ پناہ اور مہمان کی روایات کا خاتمہ نہیں کر سکتا۔ خدا کے لیے تم جلدی سے یہاں سے نکل جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ شیطان تجھ پر غالب آ جائے اور میں تمہارا خون کر کے عربوں کی روایت اور اسلامی مہمان نوازی کا گلاب دبا دوں۔ تجھ سے یہ ہرگز نہ ہو گا۔

اسحاق اس کے اصرار پر کھڑا ہو گیا۔ وہ مضطرب قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا۔ پھر اس نے دروازہ کھول کر ایک نظر ابراہیم کے پھیکے چہرے پر ڈالی اور دوسرے لمحے اس نے دروازے کو اپنے پیچھے بند کر کے خود کو تاریکی کے سمندر میں ڈبو دیا۔

یہ قصہ تھا ایک عرب جوان کا۔ جس نے باپ کا انتقام لینے کے لیے کھانا اور سونا حرام کر لیا تھا مگر جب قسمت سے اسے باپ کا قاتل اپنے ہی گھر میں مل گیا تو وہ اس پر ہاتھ اٹھانے اور قتل کرنے سے باز رہا کیونکہ کسی کو پناہ دینے کے بعد اسے قتل کرنا عرب اور اسلامی روایات کے خلاف تھا اور اس قدر خلاف تھا کہ ابراہیم نے نہ صرف اپنے باپ کے قاتل سے انتقام کو ترک کر دیا بلکہ اپنے پاس سے کچھ رقم دے کر اسے گھر سے فوراً بھگا دیا۔ مبادا اس کے انتقامی جذبات بھر دی اٹھیں اور وہ اس شخص کو قتل کر ڈالے جسے وہ پناہ دے چکا تھا۔

عربوں کی یہ روایت ان کے دورِ جاہلیت سے ہی جاری تھی عرب زمانہ قدیم میں باوجود ہر طرح کے عیوب اور غلط کاریوں میں گرفتار ہونے کے ایک تو اپنے مہمان کا حد درجہ احترام کرتے تھے بلکہ پناہ دینے والے شخص کو کسی حالت میں بھی نہ خود قتل کرتے تھے اور نہ کسی اور کو اس کی اجازت دیتے تھے۔

اسلام لانے کے بعد ان کی یہ خوبیاں اسی طرح قائم رہیں بلکہ ان میں کچھ اور شدت پیدا ہو گئی

مجوزہ بجری بیڑے کا امیر البحر بھی مقرر کر دیا تھا۔ اس طرح ریاست کنا نور بالواسطہ نواب بہادر کے زیر تسلط آ گئی تھی۔ اس سے باغی نائٹگان دبار کو نوں میں چھپ گئے تھے۔

اس دوران راجہ علی نے حیدری بجری بیڑا تیار کیا اور اس کی مدد سے بحیرہ عرب کے ساحل مالابار کے قریب کے تمام ہندو جزائر پر قبضہ کر لیا۔

نائٹگان راجہ علی کی اس فتح سے اور زیادہ خائف ہو گئے لیکن تیسرے ہی مہینے راجہ علی کو امیر البحر کے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ اب نائٹگوں نے اس خیال سے کہ راجہ علی تنہا رہ گیا ہے اور نواب بہادر حیدری خاں اس کی مرہستی سے دمت کش ہو گئے ہیں، انہوں نے پھر شورش برپا کر دی۔ راجہ علی کی پوزیشن واقعی بہت کمزور تھی۔

راجہ علی کے ہندو سپہ سالار نے مشورہ دیا:

’راجہ بہادر۔ نائٹگوں کی شورش نے بغاوت کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ اس وقت اگر ہمیں باہر سے کمک نہیں ملتی تو ریاست کنا نور میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔‘

’کچھ بھی‘ سے اس کی مراد یہ تھی کہ کنا نور ایک مرتبہ پھر ہندو ریاست بن جائے گی اور راجہ علی اور رانی سلمہ کو اس ریاست کو جبر باد کھنا ہوگا۔

سپہ سالار کا مشورہ درست تھا مگر راجہ علی اس سے ان دونوں اس لیے خفا تھا کہ اسی کے مشورہ پر راجہ علی نے ہندو راجہ کی آنکھیں نکلوا دی تھیں۔ ہندو سپہ سالار کا یہ مشورہ راجہ علی اور ریاست کے مفاد میں تھا۔ راجہ علی کے خلاف پاپلاؤں (مسلمانوں) نے بغاوت کا علم بلند کر دیا تھا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ ہندو راجہ کو ان کے حوالے کیا جائے تاکہ وہ سرعام اسے قتل کر کے ان ہزاروں مسلمانوں کے خون کا بدلہ لے سکیں جنہیں راجہ کی فوج آئے دن تباہ کر رہی تھی۔

راجہ علی اگرچہ اسلامی روایات سے پوری طرح واقف نہ تھا مگر اسے یہ ضرور معلوم تھا کہ تہقید ڈالنے والے مفتوح راجہ کو قتل کرنا اسلامی اور فوجی نقطہ نظر دونوں طرح سے ناجائز تھا اس لیے اس نے پاپلاؤں کو صاف جواب دے دیا تھا کہ وہ راجہ کو ان کے حوالے نہیں کر سکتا۔

اس سے حالات بہت زیادہ بگڑ گئے۔

تب راجہ علی کے والد اور ہندو سپہ سالار دونوں نے راجہ علی کو مشورہ دیا کہ پاپلاؤں کی شورش کو ختم کرنے کے لیے اگر ہندو راجہ کو باغیوں کے حوالے نہیں کیا جاسکتا تو کم از کم اسے اندھا کر دیا جائے تاکہ پاپلاؤں کے بیڑے کے ہوئے جذبات ٹھنڈے ہو جائیں۔

کو مشورہ دیا کہ اس وقت کنا نور میں اس کی موجودگی بہت مزوری ہے۔ صرف وہی کنا نور واپس نہ جائے بلکہ راجہ علی کے والد نے جو دبھی راجہ علی کی واپسی تک کنا نور میں قیام کرنے کی پیش کش کی۔ چنانچہ رانی سلمہ اپنے خسر کو ساتھ لے کر کنا نور واپس آ گئی۔

راجہ علی کی امیر البحر کے عہدے سے معزولی کی خبر اس کے کنا نور پہنچنے سے پہلے ہی پہنچ چکی تھی راجہ کنا نور میں داخل ہوا تو بڑا پرشورہ اور دل برداشتہ تھا۔

رانی کو راجہ علی کے آنے کے دن اور تاریخ کا علم ہو گیا تھا اس لیے وہ راجہ کے استقبال کو اپنے خضر اور ریاست کے نئے سپہ سالار کے ساتھ مرحلہ پر پہنچی۔ ریاست کے پہلے سپہ سالار کو راجہ علی نے امیر البحر ہونے پر اپنا نائب بنا کر کنا نور سے بلوایا تھا اور اس کی جگہ اس کے چھوٹے بھائی کو سپہ سالار مقرر کیا گیا تھا۔

رانی سلمہ نے اشتباہ نہ نکھوں سے اپنے محبوب شوہر کا استقبال کیا۔ رانی ہی کیا، راجہ کے والد اور دوسرے تمام استقبال کرنے والوں کے چہرے بھی دھواں دھواں تھے۔ رانی سلمہ کا دل چاہا کہ وہ آگے بڑھ کے اپنے محبوب کے گلے سے لگ جائے مگر دوسروں کی موجودگی میں اسے اپنے جذبات پر قابو رکھنا پڑا۔

یہ ایک معزول امیر البحر کا دکھا پھیکا استقبال تھا جس میں ہر شخص غمغموں نظر آ رہا تھا۔

راجہ علی کی ریاست کنا نور اپنی جگہ قائم تھی۔ نواب بہادر نے اسے ریاست کی لکڑی سے محروم نہیں کیا تھا لیکن کنا نور کے نائٹ (ہندو برہمن) جو راجہ علی کے امیر البحر بنائے جانے سے دب کے بیٹھ گئے تھے وہ راجہ کی معزولی کی خبر جانتے ہی ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور جگہ جگہ شورائیں برپا ہونے لگیں۔

نائٹ اس لیے خیر ہو گئے تھے کہ راجہ علی کو اب نواب بہادر سے کوئی فوجی مدد نہیں مل سکتی تھی کیونکہ اسے معزول کر دیا گیا تھا۔

ساحل مالابار کے سیاسی حالات دو ڈھائی ماہ کے اندر اندر دو مرتبہ تبدیل ہوئے تھے۔ کنا نور میں راجہ علی کے خلاف نائٹوں نے صرف تین ماہ میسر شورائیں برپا کی تھیں لیکن یہ شورش کچھ زیادہ تیزی نہ بکھڑ سکی تھی اس لیے کہ راجہ علی کو نواب بہادر نے راجہ کنا نور تسلیم کر کے ساتھ اپنے

اس طرح راجہ علی نے باپ اور اپنے سالار کے مشورے سے راجہ کی آنکھیں نکلوا کر اسے اندھا کر دیا۔

اس سے باپاؤں کی مشورتن اور بغاوت تو ختم ہو گئی مگر جب یہ ضرر نواب بادر جید علی خان کو ہوئی تو انہوں نے راجہ علی کو بلوا کر واقعہ کی تحقیقات کی اور اسے امیر البحر کے عہدے سے معزول کر دیا۔

اس وجہ سے راجہ علی نے سپہ سالار کے مشورے کو کچھ زیادہ اہمیت نہ دی۔

کنانور کے حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ نائروں نے بے خوف ہو کر بعض جگہوں پر مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرب و جوار کی تمام مسلمان آبادیاں نقل مکانی کر کے شہر کے اندر آنا شروع ہو گئیں اور ایک عجیب طرح کی افزائش پیدا ہو گئی۔

سپہ سالار نے راجہ علی کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر خاموشی اختیار کر لی۔

راجہ علی کے والد اگرچہ کنانور میں موجود تھے لیکن وہ بھی راجہ علی کو کوئی مشورہ دیتے ڈرتے تھے کہ ان کے پیچھے مشورہ سے راجہ علی کو نقصان پہنچا تھا۔

اب صرف رانی سلمہ ایک ایسی ہستی رہ گئی تھی جو راجہ علی سے کھل کر گفتگو کر سکتی تھی لیکن وہ ایک بالکل غیر سیاسی شخصیت تھی اور ملکی معاملات سے ہمیشہ پہلو بچاتی تھی۔ بیہات راجہ علی کے والد اور سپہ سالار کنانور کو معلوم تھی مگر اب حالات ایسا رخ اختیار کر گئے تھے کہ ان کے سنبھالنے کے لیے سب کو مل جل کر کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا۔

ایک دن سپہ سالار نے راجہ علی کے والد سے ملاقات کی۔

”بزرگ محترم۔ آپ ریاست کے حالات دیکھ رہے ہیں؟“ اس نے بڑے دکھ سے کہا۔
”جی ہاں سہیلی۔ میں سب دیکھ رہا ہوں مگر کیا کر سکتا ہوں۔ کاش میں اپنے بیٹے اور ریاست کنانور کے لیے کچھ کر سکتا۔“

راجہ علی کے والد جذباتی ہو گئے:

”کاش میرا خون اور بوڑھی ہڈیاں ریاست کے کام آ سکتیں۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں محترم۔ آپ یا میں کچھ نہیں کر سکتے۔“
سہیلی اپنی لادل بھی دکھا ہوا تھا:

”کرنے کا کام راجہ بادر کا ہے مگر ان سے کہے کون؟ ادھر حالات ہیں کہ دن بدن بگڑتے جا رہے ہیں۔“

راجہ علی سے کہنے کو تو میں کہہ دوں مگر مجھے ڈر ہے کہ وہ میری بات پر کوئی توجہ نہ دیں گے۔“
راجہ کے والد نے کہا:

”وہ مجھ سے ناراض معلوم ہوتے ہیں اس لیے کہ راجہ کی آنکھیں نکلوانے کا مشورہ انہیں میں نے ہی دیا تھا۔“

”نہیں محترم! سہیلی نے تو دید کی:

”مشورہ دراصل میں نے دیا تھا۔ ہاں تاہم آپ نے کی تھی۔“

”خیر بات ایک ہی ہے۔“ والد بولے:

”مگر اب کیا کیا جائے۔ نائروں سے ٹکٹے کے لیے ہمیں بیرونی امداد ملنا ضروری ہے۔“

”ایک بات میرے ذہن میں آتی ہے اگر آپ اتفاق کریں۔“ سپہ سالار نے کہا۔

”ضرور بتائیے۔“ راجہ کے والد نے کہا:

”میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

”ہمیں چاہیے کہ ہم رانی سلمہ سے درخواست کریں کہ وہ راجہ بادر پر زور دے کر انہیں

نواب بادر کے پاس فوجی مدد کے لیے بھیجنے کی کوشش کریں۔“ سپہ سالار نے ایک اہم مشورہ دیا۔

”بات تو بہت معقول ہے۔“ والد نے تاہم کہا:

”کیا خیال ہے میں آپ کو رانی سلمہ کے پاس لے چلوں؟“

”ہم دونوں ہی رانی صاحبہ کے پاس چلیں گے اور ان سے درخواست کریں گے کہ وہ ریاست

کنانور کی خاطر راجہ بادر کو حیدرنگر جانے پر مجبور کریں۔“ سپہ سالار نے کہا اور راجہ کے والد نے

اس کی رائے سے پورا اتفاق کیا۔

راجہ کے والد اور سپہ سالار دونوں نے ایک کینز کے ذریعے رانی سلمہ کو پیغام بھیجا کہ وہ

رانی سے تنہائی میں ایک اہم معاملہ پر مشورے کے لیے حاضر ہونا چاہتے ہیں۔

جس وقت کینز نے رانی سلمہ کو پیغام پہنچایا اس وقت رانی کے پاس راجہ علی بھی بیٹھا تھا۔

رانی نے راجہ سے دریافت کیا:

"اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو میری راست کے دونوں ہمدردوں سے ملقات کروں؟"

"مجھے کیوں ناگوار ہوگا سلمہ"۔ راجہ علی جو حالات سے بے حد دل شکستہ تھا اس نے کھوکھلی آواز میں جواب دیا:

"مجھے اعتماد ہے کہ وہ دونوں ہمارے وفادار اور ہمدرد ہیں۔ وہ ضرور کوئی اچھا مشورہ دینا چاہتے ہوں گے۔ میں دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہوں تم انہیں یہیں بلاؤ۔"

"جی نہیں۔ آپ یہیں تشریف رکھیے۔ میں ان سے دوسرے کمرے میں ملوں گی۔"

رانی نے اٹھ کے کینز کو کچھ تاکید کی۔ کینز باہر کی طرف چلی گئی اور رانی دوسرے کمرے میں آنے والوں کا انتظار کرنے لگی۔

رانی اور وہ دونوں وفاداروں میں حرف چنڈ منٹ گفتگو ہوئی۔ دونوں نے درخواست کی کہ راجہ علی کو مجبور کیا جائے کہ وہ حیدرنگر جا کر نواب بہادر سے فوجی کمک مانگیں۔

رانی نے جواب میں کہا:

"آپ بزرگوں کی رائے انتہائی معتدل ہے۔ میں خود بھی اپنی خطو ط پر غور کر رہی تھی۔ آپ نے مجھے بہت حوصلہ دیا ہے۔ میں یقیناً دلائی ہوں کہ میں راجہ کو رضامند کرنے کی پوری پوری کوشش کروں گی۔"

آپ لوگ یہ بھی یقین رکھیے کہ کل ریاست کا زور سے کوئی نہ کوئی اہم ہستی حیدرنگر کی طرف ضرور روانہ ہوگی۔"

سپہ سالار اور راجہ علی کے والد کو رانی کی باتوں سے بڑا اطمینان ہوا اور وہ خوشی خوشی دیس ہوئے۔ ان کے علی سے واپس جانے کے بعد راجہ علی کے دل میں بھی غلش پیدا ہوئی کہ وہ یہ معلوم کرے کہ رانی اور ملایا تینوں میں کیا باتیں ہوئیں مگر اس کی رانی سے پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

رانی نے بھی اس سے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کی۔ اس کی خاموشی بڑی تعجب خیز تھی بسکین راجہ علی نے اسے نہیں چھڑا۔

اس شب جب رانی سلمہ اور راجہ علی دونوں مہریوں پر لیٹے بے چینی سے کروٹیں بدل رہے تھے کہ رانی ایک جھٹکے سے اٹھ کے بیٹھ گئی۔

"راجہ — کیا سو گئے؟" رانی سلمہ نے آواز دی۔

"ان حالات میں بند کیسے آسکتی ہے رانی سلمہ"۔ راجہ علی آواز میں بولا۔

"حالات آپ کو سونے نہیں دیتے لیکن ان حالات کو بدلنے کی آپ کوئی کوشش نہیں کرتے؟ رانی کے لہجے میں تلخی اور طنز تھا۔

"رانی — یہ کیا کہہ رہی ہوں؟"

راجہ علی رانی کے تلخ لہجے پر تڑپ اٹھا:

"تم بھی ان حالات کا ذمہ دار مجھے سمجھتی ہو؟"

"نہیں پیارے علی۔ یہ بات نہیں ہے۔"

رانی سلمہ اٹھ کے راجہ علی کی مہری پر آگئی:

"میں جانتی ہوں کہ حالات تم نے نہیں بگاڑے مگر ان کے سنبھالنے کی ذمہ داری نہ میری ضرور عاید ہوتی ہے۔ تم اگر نواب بہادر سے اس وقت بھی درخواست کرو تو وہ تمہاری مدد سے انکار نہیں کریں گے۔"

رانی نے اپنے دل کا بوجھ بکا کر دیا۔

"رانی — تم سمجھتی کیوں نہیں۔ نواب بہادر نے مجھے کس قدر ذلیل کے دربار سے نکالا ہے۔" راجہ علی کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے:

"اب میں ان کے پاس کس منہ سے جاؤں؟"

"سنو راجہ علی؟" رانی سلمہ مہری سے اٹھ کر فرش پر کھڑی ہو گئی:

"پاپلاؤس کا فتنل مائتم یہاں بیٹھے دیکھتے رہو مگر کنا نور کی رانی اپنے عوام کا یہ قتل عام برداشت نہیں کر سکتی۔"

میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کل میں حیدرنگر گھر روانہ ہو جاؤں گی اور نواب بہادر کے دربار میں برہنہ سر ہو کر بے گناہ مائمنوں کے خون کی فریاد کروں گی۔"

راجہ علی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ بھی فرسش پر اتر آیا۔ رانی سلمہ کا چہرہ جوش اور غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

"نہیں رانی۔ میری تمہیں دوا نہیں ہونے دوں گا۔"

راجہ علی نے فیصلہ کر لیا:

"تم محل میں رہو گی اور میں نواب بہادر کے پاس مدد کے لیے ہاتھ پھیلاؤں گا۔"

پھر قدرت کی مسکراہٹ نے ایک تیز رفتار فاعد سوار کا روپ اختیار کیا۔ یہ سوار گھوڑا بھگانا، خاک اڑانا اور گرد و غبار میں پٹنا ہوا کناور کے راج محل پر پہنچا اور گھوڑے سے کود کر جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

ایک دربان نے اسے بڑھ کر روکا تو اس نے ہنپتے ہوئے کہا: "راجہ بھادرو کو جا کے خوشخبری سنا دو کہ حیدر علی لشکر ہمارا مدد کو آ گیا ہے۔" دربان تو یہ سن کر خوشی سے چیخا ہوا اندر کی طرف بھاگا اور خبر لانے والا سوار وہیں میسر پھیلوں پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔

تاریخ سلطنت خداداد میسور کے مصنف اس موقع پر یوں رقم طراز ہیں: "پلاڈوں نے صرف دو باتیں میسور کے آرام و اطمینان سے زندگی بسر کی تھی کہ راجہ علی کی معزولی کی خبر مالا باری میں آگ کی طرح پھیل گئی۔" ناٹروں نے سمجھا کہ نواب حیدر علی پلاڈوں سے دست کش ہو گئے ہیں۔ لہذا قتل عام کا بازار گرم ہو گیا۔ پلاڈوں کی ایک زبردست سفارت منگور پہنچی جہاں حیدر علی مقیم تھے۔ تاریخ آگے بٹاتی ہے کہ:

"سفارت کا بیان سن کے حیدر علی بیس ہزار سوار فوج لے کر مالا باری کی طرف بڑھے۔ کناور کے قریب راجہ علی نے ان کا استقبال کیا اور نواب حیدر علی کی رکاب کو بوسہ دیا۔ نواب نے اس کی عزت افزائی کرتے ہوئے اپنے ساتھ لے لیا۔"

اس طرح "سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں"۔ راجہ علی غلطی محفل ہوئی اور نواب بھادرو نے اسے اپنی عافیت میں لے لیا۔

کناور اور اس پاس کے تمام ناٹرنڈی کنارے نواب حیدر علی کے لشکر کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ نواب نے بھی قریب ہی پڑاؤ ڈالا۔

دوسرے دن دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے اور ایک شدید جنگ ہوئی۔ ناٹروں کا لشکر تعداد میں زیادہ تھا لیکن حیدر علی کے لشکر کے آرمودہ اور منجھے ہوئے سواروں نے ناٹروں کا ناطقہ بند کر دیا اور تمام ہوتے ہوئے ناٹر پیا ہوا کر تھکے ہٹ گئے۔

"مجھے تمہارے فیصلے سے خوشی ہوئی علی۔ رانی نے زہر خند کیا: "لیکن میں اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتی۔ تم اگر جاؤ گے تو میرے ساتھ ورنہ میں تنہا حیدرنگر جاؤں گی۔ تم مجھے روکنے کی کوشش نہ کرنا۔" "ٹھیک ہے۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔" راجہ علی نے کہا: "مگر میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔"

رات کے اسی پہر راجہ علی نے سپہ سالار اور اپنے والد کو بلوایا۔ اس نے انہیں بتایا کہ کل وہ اور رانی سلمہ حیدرنگر جا رہے ہیں۔

اس فیصلے سے وہ دونوں خوش ہوئے۔ پھر دیر تک اس سلسلے میں گفتگو ہوتی رہی۔ طے یہ پایا کہ راجہ علی اور رانی سلمہ کے حیدرنگر جانے کی خبر پوشیدہ رکھی جائے اور وہ دونوں بھیس بدل کر جائیں تاکہ ناٹران کا راستہ نہ روک سکیں۔

ان کے جانے کے بعد رانی اور راجہ دیر تک اس سلسلے میں گفتگو کرتے رہے۔ پھر ایک ہی مسہری پر دونوں سو گئے۔ انہیں کئی دنوں کے بعد سکھ کی نیند آئی تھی مگر وہ دیر تک نہ سو سکے۔ رانی کی کینر خاص نے انہیں جلدی ہی جگا دیا تاکہ وہ جانے کی تیاری کر سکیں۔

کہتے ہیں کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے۔

ناٹروں نے کناور کے مسلمانوں کو بے دست و پا سمجھ کے ان کا قتل عام شروع کر دیا لیکن قدرت کو تو پلاڈوں سے ابھی بہت کام لینے تھے۔ پھر بھلا ان کا قتل عام قدرت کیسے برداشت کرتی۔

ادھر راجہ علی اور رانی سلمہ حیدرنگر جلنے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ انہوں نے ہندو جٹا دھاری سادھوؤں کے لیے جُجے پہن لیے تھے۔ جسم کے تمام کھلے حصوں پر لاکھل لاکھتی اور لہتوں میں دو چمٹے لے لیے تھے۔ غرضیکہ انہوں نے سادھوؤں کا ایسا روپ دھارا تھا کہ سپہ سالار اور راجہ علی کے والد کو بھی شبہ ہو گیا کہ وہ واقعی سادھو ہیں۔ دوسری طرف قدرت مسکرا رہی تھی۔

اسی جنگ میں راجہ علی نے اپنی مادی کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ نائروں کے سپاہیوں پر نواب حیدر علی، کالی کٹ پر قبضہ کے لیے آگے بڑھے۔

اس جنگ ایک بات کی وضاحت بہت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ جس وقت راقم الحروف سلطان ٹیپو شہید پر ناول لکھنے کے لیے عتقت کتابوں کا مطالعہ کر رہا تھا تو اس دوران جناب کوثر کی کتاب "سیکریٹ کرسپانڈنس آف ٹیپو سلطان" SECRET CORRESPONDENCE OF TIPU SULTAN میری نظر سے گزری تھی جس میں ایک جگہ درج تھا:

"جس وقت حیدر علی خاں نے ۱۷۹۰ء میں مالابار پر حملہ کیا تو ٹیپو سلطان ان کے ماتھے تھے۔"

راقم نے اس تحریر پر نشان لگا کر دکھایا تھا کہ جب میرا ناول مالابار پر حملہ تک پہنچے گا تو میں اس تحریر پر ایک نوٹ ضرور لکھوں گا۔ چنانچہ اب میں اس کی وضاحت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

سلطنت خداداد میسور کے بانی یعنی نواب حیدر علی کے حالات، واقعات اور کارنامے اب اپنے اختتام کو پہنچ رہے ہیں اور اس جدوجہد کا آئندہ باب میں ٹیپو سلطان شامل ہو جائیگا گے اس لیے یہی وقت اس وضاحت کے لیے زیادہ موزوں ہے۔

مندرجہ بالا کتاب میں سلطان ٹیپو کو ۱۷۹۰ء میں مالابار کے اس میدان جنگ میں دکھایا گیا ہے جس میں ایک طرف جنوبی ہند کے تمام نائروں (ہندو برہمن) ایک جاہلوں کے، طاقت پکڑتی ہوئی سلطنت خداداد میسور کو مٹانے کے لیے آئے تھے اور دوسری طرف بانی سلطنت نواب حیدر علی خاں، ان مایلاؤں کی مدد کو آئے تھے جن پر ہندو نائروں نے عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا اور روانہ کسی محلے یا آبادی میں ان کا قتل عام کیا جاتا تھا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مالابار کی یہ جنگ ایک بھرپور جنگ تھی اور اسے کسی سرحدی جھڑپ یا شورش کا نام نہیں دیا جاسکتا۔

سلطان ٹیپو شہید کی زندگی اور کارناموں کا جائزہ تو ہم اگلے صفحات میں لیں گے۔ یہاں صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ عام آثار و تحفوں نے سلطان شہید کو ۱۷۹۰ء میں میدان جنگ میں دکھایا اور تمام مؤرخین کا یہ خیال ہے کہ جنوبی ہند میں انگریزوں (یا میسوری) پہلی جنگ "جو" ۱۷۹۱ء میں شروع ہوئی، اس میں سلطان ٹیپو پہلی مرتبہ شریک ہوئے۔

مگر

انگریزی کتاب کے مطابق سلطان ٹیپو شہید پورے سات سال پہلے ہی ایک ایسی جنگ میں شریک تھے جو واقعی ایک عظیم اور خوفناک جنگ تھی۔

یہاں پر اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ سلطان شہید کی پیدائش (تفصیل اپنی جگہ بیان ہوگی) ۱۷۵۰ء/۱۵۱۷ء میں ہوئی تھی۔ اس طرح جنگ مالابار جس میں سلطان شہید نے پہلی مرتبہ شرکت کی، اس وقت ان کی عمر صرف نو یا دس سال تھی جبکہ اب تک یہی خیال کیا جاتا تھا کہ سلطان شہید کی میدان جنگ میں پہلی آمد ۱۷۹۶ء میں یعنی پہلی جنگ میسور کے موقع پر ہوئی جب ان کی عمر سترہ سال ہو چکی تھی۔

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب سلطان ٹیپو شہید پہلی جنگ میسور میں بھرپور طریقے سے شریک ہوئے تو وہ کوئی نووارد شمشیرزن نہیں تھے بلکہ انہیں پورے سال کا میدان جنگ کا عملی تجربہ حاصل تھا اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اپنی صلاحیتوں کا ایسا مظاہرہ کیا کہ دیکھنے اور سننے والے دنگ رو گئے۔

بعض خطوط کے مطالعہ سے مجھے اندازہ ہوا کہ میرے بعض قارئین کو یہ شکایت ہے کہ میں ایک قصبے میں دوسرا قصبہ اور ایک ناول میں دوسری کہانی شروع کر دیتا ہوں۔ اس کے لیے عرض ہے کہ تاریخ نویس یا ناول نگار کا مقصد آپ کو تاریخ پڑھانا نہیں بلکہ تاریخ سنانا ہوتا ہے۔ اگر ناول برصغیر پر لکھا جا رہا ہے اور ناول نگار کا قلم آپ کو برصغیر سے ایران، مشرق وسطیٰ یا مغرب اقصیٰ کی سیر کو اسے لگتا ہے تو اس کا مقصد موضوع سے ہٹنا نہیں بلکہ اپنے موضوع کو زیادہ وضاحت سے بیان کرنا ہوتا ہے۔ بہر حال میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ اپنے قاری کی دلچسپی کے لیے لکھتا ہوں۔ آدم برسر مطلب!

نائروں کے سپاہیوں کو کتنے بٹ گئے تو نواب بہادر نے کالی کٹ کا رخ کیا۔ واضح رہے کہ نائروں کی اس ننگ میں "جو جنگ" مالابار کہلاتی ہے، سلطان ٹیپو شریک تھے۔ نواب بہادر نے سلطان ٹیپو کے لیے علم کلام اور عربی فارسی کے دوسرے مضامین کے الگ الگ استاد مقرر کیے تھے لیکن نواب بہادر دسپاہی اور خاندانی سپاہی زادے تھے اس لیے انہوں نے ٹیپو کے مجلس علم کے علاوہ علم پہ گری پر بھی گہری نظر رکھی۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ سلطان ٹیپو کو صرف نو سال کی عمر میں اپنے ساتھ اس عظیم جنگ پر لے گئے تھے۔ شہسواری اور شمشیر زنی میں شہزادہ ٹیپو اس کم سنی ہی میں کافی مہارت حاصل کر چکا تھا۔

نواب بہادر کا اسے میدان جنگ میں لے جانے کا مقصد یہ تھا کہ راستے اور میدان جنگ کے خطرناک لمحات کا شہزادہ اپنی آنکھوں سے نظارہ کر سکے۔

حیدری لشکر کالی کٹ کے قلعہ کے قریب ٹھہرا۔ نواب بہادر لشکر کو ٹھکس دور کرنے کا موقع دینا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے پیچھے ہٹنے کا حکم دے دیا۔
ابھی بار برداری کے جانور دیں پچھڑوں اور گاڑیوں پر سے سامان اترنا شروع ہوا تھا کہ قلعہ کالی کٹ کا صدر دروازہ کھلا اور اس سے ایک درجن سے زیادہ سوار برآمد ہوئے جن کے نیزوں پر سفید پرچم لہرا رہے تھے۔

سفید پرچم امن، سلامتی اور دوستی کا نشانی ہوتے ہیں۔ نواب بہادر نے قدر سے تعجب سے آنے والوں کو دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی سپہ سالار اور نائب فضل اللہ خاں ہیبت جنگ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ امن کے پیامبروں کو آنے دیا جائے۔

امن کی یہ سفادت نواب بہادر سے بچا سہم کے فاصلے پر رک گئی۔ سفارت میں پندرہ سوار تھے۔ درمیان کا سوار جو پگڑی باندھے تھا، اس کے سامنے کی طرف ایک بڑا سیرا دکھائی دے رہا تھا۔ قرائن سے وہ کوئی بڑا سردار معلوم ہوتا تھا۔

نواب بہادر حیدری خاں گھوڑے پر سوار اپنے سرداروں کے ساتھ آنے والے وفد کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ نواب بہادر کے دائیں جانب دو قدم پیچھے ہٹ کر ان کا نائب ہیبت جنگ تھا اور بائیں طرف راجہ علی تھا۔

نواب بہادر نے گردن کھاکر راجہ علی کو اشارہ کیا۔ راجہ علی گھوڑا بڑھا کر وفد کے قریب پہنچا اور مقامی زبان میں ان سے گفتگو کرتا رہا۔ دہاں سے واپس آکر راجہ علی نے نواب بہادر کو تفصیل سے آگاہ کیا۔

"نواب بہادر۔ کالی کٹ کا راجہ زامن اپنے سرداروں کے ساتھ آپ کا استقبال کرنے کو حاضر ہوا ہے۔ وہ سلامتی کی اجازت چاہتا ہے اور آپ کے دامن عافیت سے وابستہ ہونا چاہتا ہے۔"
نواب بہادر کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا:
"اجازت ہے۔ راجہ کو پیش کیا جائے۔"

راجہ علی واپس گیا اور راجہ زامن کو جس کی پگڑی میں سیرا لگا تھا، اپنے ساتھ لے آیا۔ راجہ علی اور راجہ زامن، نواب بہادر کے قریب پہنچنے کے گھوڑے سے اترے۔ انہیں گھوڑوں سے اترتے دیکھ کر نواب اور ان کے سرداروں نے بھی گھوڑے سے چھوڑ دیے۔

راجہ زامن نے کمر سے تلوار اتار کر دونوں ہاتھوں پر رکھی اور نواب بہادر کو پیش کر دی۔ نواب بہادر نے راجہ علی کو تلوار لینے کا اشارہ کیا۔ راجہ علی نے راجہ زامن سے لے کر تلوار نواب بہادر کو پیش کر دی۔

اب نواب بہادر راجہ زامن کی تلوار لے کے اس نے قریب پہنچے اور تلوار دوبارہ راجہ کی کمر میں لگا دی۔

راجہ نے فوراً سر کو خم دے کر تعظیم پیش کی۔ نواب بہادر نے اس کی تعظیم قبول کی اور اس طرح اطاعت کی دم پوری ہو گئی۔
راجہ نے ادب سے کہا:

"کالی کٹ کا راجہ زامن، نواب بہادر والی میسور سے قلعہ کالی کٹ میں فزوکشی ہونے کی درخواست کرتا ہے۔"

نواب بہادر نے راجہ علی سے کہا:
"راجہ زامن کی دورانہ لیشی ہمیں پسند آئی۔ ہم نے راجہ کی اطاعت بھی قبول کی۔ راجہ کی گدی بحال رہے گی۔ اس کے اختیارات میں کوئی کمی نہیں آئے گی نہ ان میں کوئی دخل دیا جائے گا۔ بس لوگ سوار ہو جائیں ہم قلعہ میں قیام کریں گے۔"

سب لوگ سوار ہوئے۔ آگے آگے راجہ زامن اپنے سواروں کے ساتھ امن کے سفید پھریرے اڑاتا چل رہا تھا۔

اس سے بیس قدم پیچھے نواب بہادر سینہ تانے گھوڑے پر پورے جاہ و جلال سے سوار رہے تھے۔ دائیں بائیں نواب کے حواری اور عاملین سلطنت، پھران کے پیچھے لشکر حیدری معہ خمیوں ڈیروں کے چل رہا تھا۔

قلعہ والے سمجھ گئے کہ سفارت کامیاب ہوئی اور کالی کٹ کے راجہ زامن کی اطاعت قبول ہو گئی ہے۔

قلعہ والوں نے صدر دروازے کے دونوں پٹ پوری طرح کھلی دیے اور انہیں فرشی راہ

”ہم تمہیں اپنا راجہ نہیں مانتے۔ تم نے ہماری عزتوں کا سودا کیلئے نکل جاؤ۔ تم سے تم عمل میں آنے کے قابل نہیں۔“

تو تو میں میں زیادہ بڑھ گئی۔ راجہ کے بھی کچھ بہرہ و پیدا ہو گئے۔ اس طرح دو گروہ بن گئے اور ہاتھ پائی شروع ہو گئی۔

راجہ زامن کا گروہ کمزور تھا۔ اس کی اور راجہ کی خوب پٹائی ہوئی۔ پھر ایک میان کے مطابق، مخالف گروہ نے راجہ کو پکڑ کے ایک کمرے میں بند کر دیا اور بند کمرے کو آگ لگا دی اور راجہ اس میں جل کر مر گیا۔

دوسرا بیان یہ ہے کہ اپنے ہی آدمیوں کی لعن طعن سے راجہ اس قدر شرمندہ اور خجل ہوا کہ اس نے اپنا کمرہ بند کر کے خود کمرے میں آگ لگا دی اور جل مرا۔

اس آگ سے صرف راجہ کا کمرہ ہی نہیں جلا بلکہ پورا راج محل جل کر راکھ ہو گیا۔ نواب بہادر نے راج محل کو جلنے دیکھ کر اپنے لشکریوں کو اسلحہ بھانے کا حکم دیا مگر معلوم نہیں کہ آگ کس طرح لگی یا لگائی گئی تھی کہ اس نے چشم زدن میں پورے محل کو اپنی بیٹھ میں لے لیا اور سب کچھ جل کر رہ گیا۔ اس سے قطع نظر، کالا کٹ پر نواب بہادر کا قبضہ بغیر جنگ و جدل کے ہو گیا۔

نواب بہادر کا لشکر کالا کٹ میں تھا کہ نارٹوں نے ایک بار پھر جمع ہو کر ان پر حملہ کیا۔ وہ براصل اپنی پہلی شکست کا بدلہ لینا چاہتے تھے مگر ان کا یہ آرزو ایک بار پھر دوسری کی دھڑی رہ گئی۔ انہوں نے حملہ تو بڑے جوش سے کیا تھا مگر زیادہ دیر مقابلہ نہ کر سکے اور میلان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

نواب بہادر نارٹوں کا تعاقب کرتے ہوئے کوچین پہنچے۔ راجہ کوچین بلحاظ نواب بہادر کی اطاعت میں آ گیا۔ کوچین کے ساتھ ہی پونانی پر بھی قبضہ ہو گیا۔

خطہ مالابار میں برسات کے موسم میں شدید بارش ہوتی ہے اور مٹی نالے اُبل پڑتے ہیں۔ نواب بہادر حیدر علی خاں کو مالابار کے موسم برسات کی تباہ کاریوں کا علم تھا اس لیے انہوں نے برسات میں مالابار سے دور ہی رہنا مناسب سمجھا اور کچھ فوج پونانی اور کالا کٹ میں پھوڑ کے بقیہ

کو دیں۔ ذرا دیر میں کالا کٹ کا قلعہ لشکر حیدری سے بھر گیا۔

قلعہ کے بڑے میدان میں سواروں کے خیمے نصب ہوئے۔ زمینیں اتار کر گھوڑوں کو آزاد کیا گیا۔ سواروں نے گریں کھول دیں۔ سرداروں کو میرک میں کمرے دیے گئے۔ نواب بہادر قلعہ دار کے محل میں اترے۔

راجہ زامن نے عرض کیا: ”نواب بہادر۔ وفادار کو اجازت مرحمت فرمائیے کہ شاہی مہمانوں اور لشکریوں کے طعام و قیام کا معقول انتظام کیا جائے۔“

نواب بہادر نے راجہ کو اجازت دے دی۔ وہ ملام کر کے اپنے محل میں چلا گیا۔

راجہ زامن نے کالا کٹ کو خوزیری سے بچا لیا۔ اس نے کچھ باتھا کہ حیدری لشکر کے اس سیلاب کے آگے بند باندھنا ناممکن ہے، پھر کیوں نہ باعزت چھوڑ کر لیا جائے۔ اس طرح اس نے عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی مختصر فوج اور عوام کو جنگ و جدل کی خوزیری سے بچا لیا تھا مگر جب راجہ زامن اپنے راج محل پہنچا تو وہاں الٹا بیچ پڑ گیا۔

راجہ نے کالا کٹ والوں کے ساتھ بھلائی کی تھی مگر وہ بے چارہ الٹا برائی میں پکڑ گیا۔ راجہ کے عزیز و اقارب اور بہت سے عائدین سلطنت اس کے سخت خلاف ہو گئے۔ کالا کٹ کے ہمارے منتر نے راجہ زامن کو آڑے ہاتھوں لیا:

”راجہ زامن نے پلچھ مملکانوں کو قلعہ حوالے نہیں کیا بلکہ ہم سب کی عزت کا خاتمہ کر دیا۔“

دوسرے وزیر نے لگی میں اور لگائی:

”ہم نسل کے راجپوت ہیں۔ ہمارا رشتہ شمال کے سورج بنیوں اور چندر بنیوں سے بنتا ہے۔“

راجہ زامن کو بعضوں تشنعوں کے اس قدر تیر لگے کہ اس کا سینہ چھلنی ہو گیا۔ وہ چیخ اٹھا:

”تم احسان فرماؤ مشن ہو۔ میں نے تمہارے مشورے سے صلح کا راستہ اختیار کیا ورنہ اس وقت قلعہ اور علی آگ ادھون کی ہول کھیں رہا ہوتا۔ اب تم مجھے انام دے رہے ہو۔ آخر تم چاہتے کیا ہو؟“

مہانتری نے صاف لفظوں میں کہہ دیا:

لشکر کے ساتھ کوٹنور چلے گئے۔

یہ مقام مالابار سے قریب تر تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ موسمِ برسات کو ٹنور میں گزاریں گے تاکہ لشکر کو آرام مل سکے اور مالابار کی برسات سے بھی دور رہے۔

ناڑوں کو نواب بہادر کے کوٹنور جانے کی خبر ملی تو انہوں نے پھر پاللاؤں پر ظلم و ستم شروع کر دیے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر اظلاف و جو انب کے ہمارے جمع ہوئے اور انہوں نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ کالی کٹ اور پونانی کا محاصرہ کر لیا۔

ناڑوں نے یہ جرأت موسمِ برسات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ بارشوں کی وجہ سے حیدر علی، مالابار کا رخ نہ کریں گے اور اس دوران وہ پاللاؤں کا کھلے بندوں قتل عام کر سکیں گے اور کالی کٹ اور پونانی کو بھی آزاد کرالیں گے۔

کالی کٹ اور پونانی کے محصورین نے فوراً مخفیہ قاصدوں کے ذریعے ایک طرف تو کوٹنور میں مقیم نواب بہادر کو حالات سے آگاہ کیا اور دوسری طرف ہی خبر میر رضا علی کو پہنچی گئی، جو اس وقت مدگڑی میں قیام پذیر تھے۔

میر رضا علی خاں خبر جانتے ہی فوج لے کر کالی کٹ کی مدافعت کے لیے پہنچ گئے۔ سادھر جب نواب بہادر کو کالی کٹ اور پونانی کے حالات کا علم ہوا تو وہ اپنے پندرہ ہزار سواروں اور پیادہ فوج کے ساتھ مالابار کے طوفانی موسم میں ندی نالے عبور کرتے ہوئے پونانی کے قریب پہنچے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ اس جنگ میں نواب بہادر نے اپنے آٹھ نو سالہ فرزند شہزادہ شیو کو ساتھ رکھا تھا تاکہ وہ سفر کی تکالیف اور دشواریوں کا عادی ہو جائے۔ نواب بہادر نے حکم دیا تھا کہ گھوڑوں پر زین نہ کسی جائے اورنگی پیٹھ پر سفر کیا جائے۔ شہزادہ شیو بھی ایک گھوڑے کی منگی پیٹھ سے چٹا ہوا سفر کر رہا تھا۔

پیادوں کو موسمِ جلے اور چھتریاں دی گئی تھیں۔ خود نواب بہادر حیدر علی خاں اس سفر میں ایک عام سپاہی کی طرح لشکر کے ساتھ چل رہے تھے اور یہ لشکر ٹھکانے سے بھگیا اور نالوں کو پھاندتا ہوا پونانی پہنچا۔

ناڑوں کے بارے میں پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ یہ ہندوؤں کا سب سے کڑا و متعصب فرقہ تھا۔ مسلمان اور مسلم ریاست کے یہ سخت مخالف تھے۔ ان کا مرتبہ اگرچہ برہمنوں سے کم تھا مگر اپنی سپاہیانہ پیشہ وری کی وجہ سے یہ خود کو سب سے افضل سمجھتے تھے۔ وہ مسلمانوں سے کٹی بار

شکست کھا چکے تھے مگر اپنی طبیعت کی وجہ سے باز نہ آتے تھے۔

اب انہوں نے پونانی کے باہر ایک گہری خندق میں مورچے لگا رکھے تھے اور توپ خانہ ایک اونچی جگہ نصب کیا تھا۔

ناڑوں کی یہ تیاریاں محض احتیاط کے طور پر تھیں اس لیے کہ انہیں یقین تھا کہ نواب بہادر کم از کم برسات میں پونانی کا رخ نہیں کریں گے اور اس موسم میں وہ بڑے اطمینان کے ساتھ کالی کٹ اور پونانی کے مسلمانوں کا قتل عام کر سکیں گے۔

بعض دور اندیش ناٹ سرداروں نے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ نواب بہادر کی طرف سے غافل ہونا سخت غلطی ہے اس لیے مسلمانوں کے قتل عام کے ساتھ ساتھ نواب بہادر کے خورے کے تدارک کے لیے پورے دفاعی انتظامات کیے جائیں۔

پس —

خندق میں مورچے لگانا اور خندق کے اوپر مکڑیوں کی جی بنی ہوئی ایک ہلالی دیوار کھڑی کرنا ان کی دفاعی حکمت عملی تھی۔

چنانچہ جب نواب بہادر پونانی پہنچے اور انہوں نے ناڑوں کے مضبوط دفاعی انتظامات دیکھے تو انہوں نے اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔

نواب بہادر کے لشکر میں پرتگیزی اور فرانسیسی کثرت سے بھرتی کیے گئے تھے اور وہ واقعی نواب بہادر کی ان میں بڑی دلیری سے لڑتے تھے۔

نواب نے پرتگیزی فوج پر ایک پرتگیزی سالار مقرر کیا اور اسے دایاں بازو یعنی میمنہ سپرد کیا۔ بائیں جانب کے حصہ فوج پر انہوں نے ایک انگریز کو افسرِ اعلیٰ لگایا۔ یہ انگریز نواب بہادر کا ملازم تھا اور بڑی وفاداری سے خدمات انجام دے رہا تھا۔

فوج کے تیسرے حصہ کو جس میں فرانسیسی زیادہ تھے، نواب نے ریڑھ (محفوظ) فوج کے طور پر رکھا۔ اس کا سالار ایک فرانسیسی افسر تھا۔

جنگ کا آغاز نواب بہادر نے میمنہ کی فوج کے حملے سے کیا۔ حملہ کا حکم پاکر پرتگیزیوں کی یہ فوج بڑی تیزی سے گویاں چلائی ہوئی خندق کی طرف بڑھی۔ دشمن گولی کا جواب گولی سے دے رہا تھا اور اس کا بلند مقام پر نصب توپ خانہ الگ الگ برساتا تھا۔

پرتگیزی بڑی بہادری سے بڑھتے ہوئے مکڑی کی دیوار تک پہنچ گئے مگر انہیں یہ نہ معلوم ہوا

کہ دشمن کا کس قدر نقصان ہوا ہے جبکہ خود پر نگیز یوں کا کافی جانی نقصان ہوا تھا۔
نواب بہادر نے اپنے میمنہ کو تقویت دینے کے لیے میسرہ یعنی پائیں بازو کی فوج کو حملہ کا حکم دے دیا۔

میسرہ کا حاکم انگریز تھا۔ اس نے بڑا زبردست جملہ کیا اور فوج گولیاں کھاتی خندق تک پہنچ گئی۔ مگر لکڑی کی دیوار جس کے سوراخوں سے گولیاں برس رہی تھیں، ان کے لیے بھی سدِ سکندری بن گئی۔

میمنہ اور میسرہ پر گولیاں برس رہی تھیں مگر نہ گولی چلانے والا دکھائی دیتا تھا اور نہ انہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کی گولیوں سے دشمن کا کتنا نقصان ہوا۔

اس وقت نواب بہادر کے دونوں بازو بہت نقصان اٹھا چکے تھے اور نواب بہادر جوش اور غصہ سے دونوں طرف گھوڑا دوڑا رہے تھے۔

اسی وقت ریزرو فوج کے فرانسیسی کمانڈر نے عرض کیا:

"نواب بہادر۔ اجازت دی جائے کہ میں حملہ کروں!"

"تم۔"

نواب بہادر نے ایک لمحہ کے لیے سوچا:

"مگر تم دیکھ رہے ہو کہ ہمارا دایاں اور بایاں بازو کس مشکل میں ہے۔"

"اسی لیے تو اجازت چاہتا ہوں نواب بہادر! سالار کے بچے میں بڑی عاجزی اور ہمت تھی۔"

آخر نواب بہادر نے اپنی محفوظ فوج کی بازی لگا دی اور اسے حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔

میمنہ اور میسرہ دونوں بازوؤں نے بڑی جواہری سے حملہ کیا تھا اور شدید نقصان اٹھانے کے باوجود وہ اب تک مقابلہ پر ڈٹے ہوئے تھے۔ مگر محفوظ فوج کے فرانسیسی سالار کا حملہ اسی قدر شدید تھا کہ لکڑی کی دیوار سے نکلنے والی گولیاں اور پر سے آگ برسنے والا توپ خانہ ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا اور بندوق کی گولی کی طرح پکے تھکے دوڑتے ہوئے وہ خندق پر پہنچے اور پانی سے بھری خندق کو لمحوں میں پار کر کے لکڑی کی دیوار سے، جس سے ہزاروں گولیاں نکل رہی تھیں، ٹکرائے اور لکڑی کے تختے توڑ ڈالے۔ دیوار گرا دی اور نائروں کا نقل شروع کر دیا۔

فرانسیسیوں پر متمتع یہ فوج اس قدر بے جگری سے لڑی کہ ہزاروں نامٹا رہے گئے۔ جو یہ پر قبضہ ہو گیا اور شہر میں آگ لگا دی گئی۔

اس وقت قلعہ کے محصور لشکر بھی نکل آئے اور انہوں نے بھاگتے ہوئے نائروں کا خوب خوب صفایا کیا۔ نائروں کو زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا اور ان کے ہزاروں کی تعداد میں آدمی مارے گئے۔

نواب بہادر حیدر علی خاں خود ایک بہادر انسان اور دلیر جنرل تھے اس لیے وہ بہادری اور بہادروں کی قد بھی کرتے تھے۔ فرانسیسی آخر کی بہادری سے وہ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے فوراً اسے دس ہزار افواج کا سپہ سالار بنایا اور ساتھ ہی توپ خانے کا افسر بھی مقرر کر دیا۔
نواب بہادر کی اس فتح سے ان کی بیعت چاروں طرف طاری ہو گئی۔ نائروں نے اپنے دیہات خالی کر کے بھاگنے لگے۔

نواب بہادر کا عام نائروں سے کوئی اختلاف نہ تھا۔ انہوں نے برہمنوں کو حکم دیا کہ نائروں میں امن کا اعلان کیا جائے اور انہیں واپس لا کر ان کے گھروں اور دیہاتوں میں آباد کیا جائے۔ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں دی جائے گی اور ان کی جانوں کی حفاظت کی جائے گی۔

لیکن نائروں اس قدر خوفزدہ ہو گئے تھے کہ انہوں نے واپس آنے سے انکار کر دیا۔ برہمن اپنی کوشش میں ناکام ہو گئے۔ انہوں نے واپس آ کر نواب بہادر کو مطلع کر دیا۔

نواب بہادر نے اسی وقت دو مرا اعلان کر آیا جس کے مندرجات اس طرح تھے:

۱۔ پنج اقوام، نائروں کے جہوں میں غلاموں کی طرح دوڑتی تھیں، اب یہ دم موقوف کی جاتی ہے۔

۲۔ اب ہم صرف نائروں کو ہتھیار باندھا کرتے تھے، اب پنج ذاتیں بھی ہتھیار باندھا کر رہیں گی۔

۳۔ جو نائروں مسلمان ہو گا اس کے پچھلے تمام حقوق بحال اور برقرار رہیں گے۔

۴۔ جو بھی غیر مسلم، مسلمان ہو گا، اسے وہی حقوق حاصل ہوں گے جو جو مسلم نائروں کو حاصل ہوتے ہیں۔

۵۔ اب تک نائروں کا درجہ صرف برہمنوں سے کمتر تھا مگر اب وہ اس سے بھی کمتر درجہ کے منظور ہوں گے۔

نواب بہادر کے اس اعلان کا یہ اثر ہوا کہ ہزاروں غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہو گئے!

نواب بہادر کو مالابار میں معروف دیکھ کر بد نور (حیدرنگر) کے ہندوؤں نے مرہٹوں سے درخواست کی کہ وہ ہندو ریاست بد نور کو نواب حیدر علی خاں کے قبضہ سے نجات دلائیں۔ مرہٹے ایسے ہی کسی موقع کے انتظار میں تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کی درخواست قبول کر لی اور لشکر لے کر بد نور کی طرف چلے۔

حیدرنگر کے جاسوسوں نے فوراً نواب بہادر کو اطلاع دی کہ مرہٹہ لشکر بد نور کی طرف بڑھ رہا ہے۔

نواب بہادر حیدر علی کو حیدرنگر سب شہروں سے زیادہ عزیز تھا۔ وہ اس خبر سے کچھ پریشان ہوئے۔ انہوں نے مالابار کا انتظام میر رضا علی خاں کے سپرد کیا جو بد گری سے لشکر لے کر آئے ہوئے تھے۔

پھر نواب بہادر باگیں اٹھ کر حیدرنگر کو بچانے کے لیے روانہ ہوئے۔ اس وقت تک مرہٹے بد نور پر قابض ہو چکے تھے مگر بارش کی وجہ سے وہ قبضہ برقرار نہ رکھ سکے اور مرہٹوں کا لشکر واپس ہو گیا۔ اس طرح نواب بہادر کو حیدرنگر کے لیے کوئی جنگ نہ کرنا پڑی۔ مرہٹوں کی طرف سے محنت ہونے کے بعد نواب بہادر نے چیتلارگ پر فوج کشی کی اور حیدرنگر کا چیتلارگ کے مضامات پر قبضہ ہو گیا۔ اب انہوں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ عاصروں کی کھینچ لیا۔ پانچ ماہ بعد نواب بہادر نے محاصرہ اٹھایا۔

اب وہ شاہنور کی طرف متوجہ ہوئے اس لیے کہ مرہٹوں کے بد نور پر حملہ کے وقت دلی شاہنور نواب عبدالعظیم نے مرہٹوں کو اپنی افغانی فوج کا کمک بھیجی تھی۔

نواب بہادر کے دل میں اس کا ملال تھا۔ انہوں نے ایک لشکر اپنے نائب ہیبت خاں کے سرکردگی میں شاہنور روانہ کیا اور خود بھی فوج لے کر چلے۔

شاہنور کے قریب پہنچ کر نواب بہادر نے اپنی فوج کین گاہ میں چھادی اور پنڈاروں کو حکم دیا کہ وہ شاہنور پر حملہ کریں اور نواب عبدالعظیم کی فوج کو شکست کا فریب دے کہ اس جگہ لے آئیں جہاں نواب بہادر کی فوج کین گاہ میں تیار کھڑی ہے۔

منصوبہ کے تحت پنڈارہ فوج نے عبدالعظیم خاں کے افغانی لشکر پر زبردست حملہ کیا۔ افغانی فوج مقابلہ کے لیے قلعہ سے باہر آئی۔ فطوری دیر کی جنگ کے بعد پنڈاروں نے سپاہ ہونا

شروع کر دیا جسے دیکھ کر افغانی یہ سمجھے کہ انہوں نے پنڈاروں کو شکست دیدی ہے۔ پس انہوں نے زور کا حملہ کیا تا کہ پنڈاروں کے میدان چھوڑ جاگیں۔ مگر پنڈارے بھلگنے کے بجائے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے رہے اور افغانی انہیں دباتے ہوئے آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ پنڈارے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں پر حیدری لشکر کین گاہ میں موجود تھا۔

اس وقت حیدری لشکر نے اچانک کین گاہ سے نکل کر شاہنور کے افغانی لشکر پر حملہ کر دیا۔ اس اچانک حملے سے افغانی گھبرا گئے اور نواب بہادر کے لشکر نے انہیں کاٹ کے رکھ دیا۔ نواب عبدالعظیم خاں کو اس شکست کی اطلاع پہنچی تو اس نے بھاگ کر قلعہ میں پناہ حاصل کی اور قلعہ بند ہو گیا۔

نواب بہادر حیدر علی خاں کو اس پر سخت غصہ تھا انہوں نے فوراً قلعہ کے گرد محاصرہ ڈال دیا۔ جب کئی دن محاصرہ کو گزر گئے تو نواب عبدالعظیم نے یہ سمجھ لیا کہ اب نواب بہادر کچھ کیے بغیر یہاں سے ٹھنڈے دالے نہیں۔ چنانچہ اس نے صلح کا بیغام بھیجا اور ایک کرڈر تعداد مضامات کے چند قلعہ نواب بہادر کو پیش کیے۔

نواب بہادر نے اسے غنیمت سمجھا اور محاصرہ اٹھایا۔

اس کے بعد نواب بہادر نے آس پاس کے علاقوں کے راجاؤں اور پالیگاردوں کی طرف لشکر روانہ کیے۔

ایک لشکر جو مرزا علی حسین علی بیگ کی سالاری میں گیا تھا اس نے بسواری درگ کو فتح کیا اور دہان کے راجہ نے نواب بہادر کی خدمت میں مردارید یا قوت اور جڑاؤ زیورات کے بیس ہندوق بطور تادان روانہ کیے۔

نواب بہادر حیدر علی خاں نے ۱۷۹۰ء میں مالابار کی طرف سے کوچ کیا تھا اور مسلسل ۱۷ سال سے فتوحات کا سلسلہ جاری تھا۔

نور شہزادہ سلطان بیٹوان کے ساتھ تھا اور راہ کی صوبتوں، حملہ کی سختیوں اور جنگی مورچوں پر شمشیر زنی اور گولہ باری کے مناظر نہ صرف اس کی نظروں سے گزر رہے تھے بلکہ وہ خود بھی ان تمام محلات میں علی طور پر شریک تھا۔ شہزادہ کا یہی علی تجربہ تھا جس نے اسے کم عمری ہی میں ایک تجربہ کار

جزل کی تمام فوجیں سے آراستہ کر دیا تھا۔

نواب بہادر کو چار سال تک برابر فتوحات حاصل ہوتی رہیں لیکن اب ان کے سامنے مرہٹوں کی طاقت ایک مضبوط دیوار بن کے اٹھ گئی۔

جنگ پانی پت میں مرہٹوں کی طاقت کا تقریباً خاتمہ ہو گیا تھا مگر جب مادھوراؤ ان کا نیا پیشوا بنا تو اس نے مرہٹوں کی طاقت کو از سر نو ترتیب دیا۔ اسے نواب بہادر کی مالابار کی فتوحات کی خبریں براہ پہنچ رہی تھیں۔ بد نور، مالابار اور شاہنور وغیرہ پر نواب بہادر کا قبضہ اسے سخت ناگوار محسوس ہوتا تھا۔ اور وہ اسی نئی ابھرتی ہوئی طاقت کے وجود کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتا تھا۔

آخر مادھوراؤ ایک منظم لشکر کے ساتھ نواب حیدر علی خاں کے زور کو توڑنے کے لیے میسور کی طرف بڑھا۔

اس وقت اس کی کمان میں ایک لاکھ سوار، ساٹھ ہزار پیادے اور پچاس ہزار تیراندازوں کے علاوہ ایک بڑا توپ خانہ بھی تھا۔ یہ ایک لشکر نہ تھا بلکہ ایک ایسا طوفان تھا جس نے راستے میں آنے والی طاقتوں کو پیس کے رکھ دیا۔

نواب بہادر کو اس خطرناک لشکر کے آنے کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت فکر مند ہوئے مگر ہاتھ پر ہاتھ رکھنے کے بجائے جو کچھ فوج اکٹھا ہو سکی اسے لے کر سرنگاپٹم سے بنگلور آئے۔

اس دوران مادھوراؤ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ شاہنور پہنچا۔ نواب حیدر علی خاں جس نے کچھ دن پہلے ہی نواب بہادر کی اطاعت قبول کی تھی غداری کرتے ہوئے مرہٹوں سے مل گیا۔ چٹلا رنگ کے راجہ نے بھی مرہٹوں کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیا۔

مادھوراؤ یہاں سے آگے بڑھ کر سر اپہنچا یہاں کا صوبیدار میر رضا علی خاں تھا۔ اس نے قلعہ بند ہو کر چند دن مقابلہ کیا۔ پھر ملک اور قلعہ دشمن سے بچانے کے لیے اس نے قلعہ مادھوراؤ کے حوالے کر دیا۔

ادھر نواب حیدر علی خاں نے بنگلور میں بیٹھ کر پٹداروں کی ایک فوج مقرر کر کے مارگری روانہ کی کہ وہ مرہٹہ لشکر پر چپ کر بخونجھن اترے رہیں۔

مادھوراؤ نے بھی قلعہ مارگری کا رخ کیا اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا لیکن قلعہ دار سردار خاں نے اس کا مقابلہ کیا۔ چار دن تک مرہٹہ فوج قلعہ پر حملے کرتی رہی مگر سردار خاں نے اس کی ایک نہ پلٹنے دی

ہر حملہ پسپا کر دیا۔

اس وقت راجہ چٹلا رنگ جو قلعہ مارگری کے خفیہ راستوں سے واقف تھا اس نے اپنے آدمیوں کو پوشیدہ راستوں سے قلعہ پر چڑھا دیا۔

اس طرح قلعہ مارگری پر دشمن کا قبضہ ہو گیا مگر قلعہ دار سردار خاں نے ہتھیار نہیں ڈالے اور اپنے رفیقوں کے ساتھ صرف تلواروں سے مرہٹہ لشکر کا مقابلہ کیا۔

سردار خاں اور اس کے رفقاء نے بہادری اور شجاعت کا ایک نیا باب رقم کیا۔ سردار خاں کے تمام قیدیوں نے لڑتے لڑتے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ خود سردار خاں تھان کا مقابلہ کرتا رہا اور جب شدید زخمی ہو کر گرا تو اس وقت اسے گرفتار کیا گیا۔

مارگری کے صحرائیں چھپی ہوئی پٹداروں کی فوج نے مرہٹہ لشکر پر کئی شب خون مارے اور بلاشبہ انہوں نے ہزار سے زیادہ مرہٹے فوجیوں کو قتل کر دیا تھا مگر لاکھوں کے لشکر میں ہزار آدمیوں کی کمی سے کیا فرق پڑتا۔

مارگری کے بعد مادھوراؤ نے بالاپور، کمر پہ، کولار، لمباگی، گرم کنڈہ پر قبضہ کیا اور اب اس کے سامنے سرنگاپٹم تھا۔

نواب بہادر حیدر علی خاں کی سلطنت خداداد کو ابھی پوری طرح استحکام حاصل نہ ہوا تھا کہ انہیں ایسے زبردست غنیمت کا سامنا کرنا پڑا جو تقریباً دو لاکھ کی نفری، جس میں سوار، پیادے، تیرانداز اور پٹدارے شامل تھے، لے کر ان کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔

پٹداروں کا یہ حال تھا کہ وہ نصف کے قریب مرہٹہ پیشوا مادھوراؤ کے ساتھ اور اتنے ہی نواب بہادر حیدر علی خاں کے ساتھ تھے اور دونوں طرف سے کمال وفاداری سے لڑ رہے تھے۔ نواب بہادر کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ اگر سرنگاپٹم پر مرہٹوں کا قبضہ ہو گیا تو ان کی سلطنت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مگر وہ کمزور دل انسان نہیں تھے۔ وہ ہر قسم کے حالات میں مستقل مزاج اور بے خوف رہنے کے عادی تھے۔

ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ ان کے زیر اثر تمام پالیگار اور راجے ان سے منہ موڑ کر مادھوراؤ کے تلوارے چاٹ رہے تھے مگر بغیر ہر سال ہونے والے اپنی فوج لے کر مارگری کے صحرائیں پہنچ گئے۔

ادھوراؤ کو اپنی فتوحات پر معزور ہونا ہی چاہیے تھا۔ ہندو بغلیں بجا رہے تھے اور مادھوراؤ کی فتوحات پر اتراتے پھرتے تھے۔

مادھوراؤ نے چننا منی کو اپنا مستقر بنا کر پچاس ہزار کا ایک لشکر جس کے ساتھ بھاری توپخانہ بھی تھا، سرنگاپٹم کی طرف روانہ کیا اور ایک دوسری فوج بارہ محل پر قبضہ کے لیے بھیجی۔

نواب بہادر کے لیے مادھوراؤ کو روکنے کا یہ آخری موقع تھا اور انہوں نے اپنی ذمات اور جرات سے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

نواب بہادر نے اپنی طاقت مارٹھی کے جنگ میں اکٹھا کر دی تھی اور وہ بے چینی سے اس پچاس ہزار مرہٹہ فوج کا انتظار کر رہے تھے جو ہر اول دستے کے طور پر سرنگاپٹم جا رہی تھی۔

ایک روز آدھی رات گزرتے ہی نواب بہادر اپنے برقی رفتار دستوں کے ساتھ مارٹھی سے نکلا اور مرہٹہ فوج پر ایک زبردست شب خون مارا۔

نواب بہادر کا یہ شب خون اس قدر زبردست تھا کہ مرہٹوں کا نصف کے قریب پنج اس میں کٹ کے لہ گئی اور باقی فوج تمام سامان جنگ چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔

نواب بہادر کو اس کامیابی کے علاوہ ایک اور کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ یہ کامیابی ان پنڈاروں کی تھی جنہیں نواب بہادر نے مرہٹوں کی اس فوج کو روکنے کے لیے بھیجا تھا جو بارہ محل پر قبضہ کے لیے جا رہی تھی۔ اس فوج پر بھی حیدر علی پنڈاروں نے شب خون مار کر اسے واپس پر مجبور کر دیا تھا۔ ان دو فتوحات نے نواب بہادر کے اکھڑے ہوئے پیروں کو پھر سے جمادیا۔

مرہٹہ پیشوا کو جب اپنی فوج کی دونوں جگہ شکست کی خبر ملی تو وہ گھبرا گیا۔ اس لیے کہ اس کی تقریباً نصف بہترین فوج یا تو کٹ گئی تھی یا بے مہار ہو کر صحرائیں بھٹک رہی تھی۔ مادھوراؤ نے فوراً چننا منی سے اپنا صدر مقام تبدیل کیا اور ارباجی درگ پہنچ گیا۔

اس زبردست شکست نے اس کے حواس ناب کر دیے تھے۔ اس شرمناک مار کے بعد نہ تو وہ واپس جاسکتا تھا اور نہ آگے بڑھ سکتا تھا۔ اس کی فوج میں اس قدر کمی ہو گئی تھی کہ وہ آگے بڑھنے کا خطرہ مول لینے پر تیار نہ تھا۔

ہم سب جانتے ہیں کہ میدان جنگ میں دو مقابل طاقتیں صرف اس وقت صلح پر آمادہ ہوتی ہیں جب ان کی اپنی اپنی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔

مرہٹہ پیشوا مادھوراؤ نے تقریباً دو لاکھ کے لشکر سے نواب بہادر حیدر علی خاں کی بڑھی ہوئی

طاقت کے خاتمے کے لیے میسور پر حملہ کیا۔ اس نے مسلسل فتوحات حاصل کیں۔ پورا ملک پامال کر کے رکھ دیا۔ سلطنت میسور پانی پر بہتے پتے کی مانند رزنے لگی۔

پھر ہوا کا رخ بدلا۔

نواب بہادر مارٹھی کے جنگل سے اپنے تیز رفتار دستوں کے ساتھ نکلے اور ایسا شب خون مارا کہ مادھوراؤ کے پچاس ہزار کے لشکر میں سے آدھے سے زیادہ فوجی مارے گئے۔ باقی سامان چھوڑ کے میدان سے نکل بھاگے۔

دوسرا محرکہ نواب بہادر کے پنڈاروں نے سر کیا۔ انہوں نے بارہ محل کی طرف جانے والی فوج پر حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا۔ مرہٹہ پیشوا کا غرور خاک میں مل گیا اور اس کا سرذمات کے مارے جنگ لگا۔

اس طرح نواب بہادر کو بیہیم شکستوں کے بعد دو ایسی فتحیں حاصل ہوئی تھیں جن سے ان کے حوصلے بلند ہوئے تھے مگر یہ خدشہ موجود تھا کہ ابھی مادھوراؤ کے پاس نصف لشکر موجود ہے۔ اگر وہ شکست کا بدلہ لینے آگے بڑھا تو اسے روکنا مشکل ہو جائے گا۔

چنانچہ

دونوں طرف صلح کا خیال پرورش پانے لگا۔ ان پہل نواب بہادر کی طرف سے ہوئی۔ نواب بہادر حیدر علی خاں نے مادھوراؤ کے پاس قاصد بھیجا۔ یہ قاصد خالی ہاتھ نہیں تھا۔ نواب نے سات لاکھ کی رقم اس کے ساتھ کی تھی۔

قاصد نے سات لاکھ کی یہ رقم مرہٹہ پیشوا مادھوراؤ کے سامنے رکھ کے کہا:

”نواب بہادر حیدر علی خاں نے مرہٹہ پیشوا کو پیغام دیا ہے کہ، ہمیں جنگ سے عار نہیں۔ انکار نہیں، لیکن مرہٹوں کے عظیم لشکر نے ملک کو پامال کر ڈالا ہے۔ ہم چاہتے ہیں یہ سات لاکھ کی رقم آپ قبول فرمائیں۔ اس کے علاوہ ہم دوسری قسط کے طور پر پانچ لاکھ اور پنجواہی لگے۔ آپ واپس پونا تشریف لے جائیں تاکہ پامال ملک کی از سر نو تعمیر کی جائے۔“

مادھوراؤ دل ہی دل میں اس پیشکش پر بہت خوش ہوا۔ اس نے سات لاکھ قبول کر لیے اور بقیہ لشکر کے ساتھ پونا واپس چلا گیا۔ اسے کہتے ہیں:

کے نظام کو درست کرنے کا موقع میسر آیا مگر وہ پوری طرح منجیل بھی نہ پائے تھے کہ ایک اور دشمن ان کے سامنے آکھڑا ہوا۔

نواب بہادر کا یہ دشمن نظام الملک نظام علی خاں والی دکن تھا۔

وہ اکیلے نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ سات سمندر پار سے آنے والی مملکت اور بے ایمان انگریز قوم بھی تھی، جس نے ایک صدی پہلے تجارت کی لڑ میں پہلے رنگال میں قدم جمائے۔ پھر جنوبی ہند کا رخ کیا۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی جو ایک خالص تجارتی ادارہ تھا اس نے برصغیر میں مدیثہ و انیاں شروع کرتے ہوئے بھائی کو بھائی سے لڑا کہ اس سرزمین کے مختلف علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کیا۔

نواب بہادر حیدر علی خاں کی اگلی جنگ نظام الدکن حیدر آباد اور انگریزوں کے مشترکہ لشکر سے ہوئی جس میں نظام اور انگریزوں کے علاوہ ایک مہمہ سردار کے دس ہزار سوار بھی تھے۔ یہ مہمہ سردار اپنے دس ہزار سواروں کے ساتھ پورے دکن میں لوٹ مار کرتا پھرتا تھا۔ جب نواب بہادر اور نظام حیدر آباد (جس کے ساتھ انگریز بھی تھے) ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوئے تو مفاد پرست مہمہ سردار نے نواب بہادر کے خلاف جنگ کرنا اپنے مفاد میں سمجھا اور نظام حیدر آباد کے لشکر کا حلیف بن گیا۔ انگریزوں کی تاریخوں میں اسے "انگریزوں کی پہلی جنگ" اور برصغیر کی تاریخوں میں اسے "میسور کی پہلی جنگ" کا نام دیا گیا ہے۔ اس تاریخی اور اہم جنگ کے اسباب پر نظر ڈالنے سے پہلے ہم اس واقعہ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو میسور میں پیش آیا۔ یہ واقعہ تھا راجہ میسور کی وفات۔

آغا میں لکھا جا چکا ہے کہ ریاست میسور کی ابتدا ۱۲۹۹ء میں ہوئی تھی جب دوار کا (کاٹھیاوار گجرات) کے دو بھائی وجیاراما اور کرشنا راما جنوب میں آئے اور انہوں نے ہڈنا ڈیل جو میسور کے قریب ہے، ریاست کی بنیاد رکھی۔ اس سلسلے میں جو روایت مشہور ہے اسے تفصیل کے ساتھ کچھ صفحات میں لکھا جا چکا ہے۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ ریاست میسور میں مسلمانوں کی آمد کس وقت شروع ہوئی۔

جنوب میں جب تک وجیانگر کی ہندو ریاست قائم رہی اس وقت تک ہڈنا ڈیل میسور کی ریاست اس کی باجگزار رہی۔ پھر جب وجیانگر کا زوال ہوا، اس وقت ہڈنا ڈیل کے راجہ قمر جی اودیاری نے علم آزادی بلند کیا اور ۱۵۶۶ء میں مرنگا پٹم کو دارالسلطنت بنایا۔

واقعہ ہے کہ اس وقت تک اس خاندان کے مندرجہ ذیل پانچ راجہ گدی نشین ہو چکے تھے:

۱۔ ہڈورایا وجیا ۱۲۹۹ء سے ۱۴۲۳ء تک

بلائے آمد و لے بیخ گزشت
"محبیت آئی مگر خیریت سے گزر گئی"

نواب بہادر کے لیے بھی مرہٹوں کی دلہن بہت غنیمت تھی۔ وہ اپنی طاقت کو ترتیب دینے اور ملک کی تعمیر میں لگ گئے۔

گزشتہ پانچ سال کا وہ مہمہ جس میں شہزادہ پیپو نے اپنے والد نواب بہادر حیدر علی خاں کے ساتھ کر پوری جنگی تربیت علی طور پر حاصل کی، اس میں وہ زمانہ بھی تھا جس میں نواب بہادر نے تواتر کے ساتھ فتوحات حاصل کیں۔ پھر مہمہ پیشوا مادھورائ کی سلطنت میسور پر چڑھائی کا زمانہ بھی شامل تھا جب اس کے تمام اپنے بیگانے ہو گئے۔ والی شاہنود نواب عبدالکیم خاں جس نے کچھ ہی دن پہلے اطاعت قبول کی تھی، وہ اس بار سے وقت میں نواب بہادر کا وفادار ساتھی ہونے کے بجائے آستین کا سانپ ثابت ہوا اور مادھورائ کے ساتھ مل کر نواب بہادر کے علاقوں پر حملہ آور ہوا۔

چتلارگ کے راجہ نے بھی ایسا ہی قدم اٹھایا اور ایک دور کی طاقت کا حلیف بن کے قریب کے دوست کی پشت میں بھرا بھونکنے پر نکل گیا۔

سرا، نواب بہادر کے ہاتھ سے نکلا۔ مدگری پر مرہٹوں کا قبضہ ہوا۔ ماگرٹی کے قلعہ پر قلعدار سردار خاں نے سخت مدافعت کی مگر آخری وقت تک جنگ کرنے کے بعد زخمی ہوا اور قلعہ مادھورائ کے ہاتھ لگ گیا۔

پھر بالاپور، ماگرٹی، اکولا۔ اور بلگاگی اور گرم کنڈہ یکے بعد دیگرے نواب بہادر کے ہاتھ سے نکل کر مرہٹوں کے قبضہ میں جلتے رہے۔

ان تمام واقعات کو شہزادہ پیپو نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس نے دوستوں کو دشمن بننے اور وفاداریاں تبدیل ہوتے دیکھا۔ فتح کے دلفریب مناظر بھی اس کی نظر سے گزرے اور شکست کا چرہ بول نظارہ بھی پیش نظر آیا۔ اس طرح میدان جنگ کی علی تربیت نے شہزادہ پیپو کی شخصیت کو ایک بالکال جزل کے روپ میں ڈھال دیا۔

مہمہ پیشوا مادھورائ کے واپس جانے کے بعد اگرچہ بظاہر نواب بہادر کو اپنی سلطنت خداداد میسور

۲۔ چامراج اوڈیراؤل ۱۲۲۳ء سے ۱۲۵۸ء تک

۳۔ قمرچ اوڈیراؤل ۱۲۵۸ء سے ۱۲۷۸ء

۴۔ چام راجہ دوم ۱۲۷۸ء سے ۱۵۱۳ء

۵۔ چام راجہ سوم ۱۵۱۳ء سے ۱۵۵۲ء

اس طرح اس خاندان کے چھٹے راجہ قمرچ اوڈیراؤل نے ۱۵۶۶ء میں بغاوت کر کے اپنا دارالسلطنت سرنگاپٹم منتقل کر لیا۔ اس کے بعد ہی میسور میں مسلمانوں کی آمد شروع ہوئی۔ پھر ۱۶۸۷ء میں شہنشاہ اورنگ زیب نے جنوبی علاقوں پر قبضہ کیا اور یہ ریاست سلطنتِ مغلیہ کی باجگزار بن گئی۔

۱۶۹۶ء میں مرہٹوں نے سرنگاپٹم پر حملہ کیا مگر انہیں کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ اسی وقت نعل شہنشاہ ہند اورنگ زیب عالمگیر جنوبی ہند میں تھے۔ راجہ چکریواریا اوڈیراؤل نے دربارِ عالمگیری میں تحائف پیش کیے اور اطاعت کا اظہار کیا۔

شہنشاہ نے خوش ہو کر راجہ کو چکریواریا کا خطاب عطا کیا۔ نوبت اور نفاذ کی اجازت دی اور باقی دانت کا ایک تخت بھی تحفہ میں دیا۔

پھر جب دہلی پر زوال آیا تو حاکم سر، نواب بن بیٹھا اور میسور کے راجہ نے خود مختاری اختیار کر لی۔

میسور کی پہلی جنگ میں انگریزی فوج جس میں زیادہ تر دالاجاہ محمد علی کی فوجیں تھیں، اس کا سالار کرنی اسمتھ تھا۔ حیدر آبادی فوجیں خود نظام الملک کی کمان میں تھیں اور مرہٹہ سردار الگ تھا۔ یہ متحدہ افواج میسور کی طرف روانہ ہوئیں۔

بعض انگریزی مؤرخوں نے لکھا ہے کہ میسور پر حملہ اس وجہ سے ہوا کہ نواب بہادر حیدر علی خان نے حیدر آباد کے علاقوں پر چھاپہ مارنا تھا جس کے جواب میں یہ جنگ شروع ہوئی۔

دراصل نظام حیدر آباد کو جنوب میں ایک اور اسلامی سلطنت کا قیام ناگوار گزر رہا تھا مگر وہ ایک حیدر علی سے مقابلہ کی تاب نہ نہ رکھتا تھا پس اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ وہاں دوسری طاقت انگریزوں کی تھی۔

انگریزوں کو نواب بہادر کی طرف سے یہ خطرہ تھا کہ کہیں وہ انہیں برصغیر ہی سے بے دخل نہ کر دیں۔ اس طرح یہ دونوں مل گئے اور یہ سب فوجیں بالاکھاٹ کی طرف بڑھیں۔

نواب بہادر حیدر علی خاں چونکہ ہر دم آنکھیں کھلی رکھتے تھے اس لیے انہیں اس گٹھ جوڑ کا فوراً علم ہو گیا اور انہوں نے بھی تیاریاں شروع کر دیں۔

نواب بہادر نے حیدری فوج کو مختلف دستوں میں تقسیم کیا اور ہر دستہ کا الگ الگ سالار مقرر کیا جس کی ترتیب اس طرح تھی:

ایک دستہ پر شہزادہ بیٹو سلطان کو سالار مقرر کیا گیا۔ شہزادے کی عمر اسی وقت مولد ہوئی تھی اور وہ پہلی مرتبہ ایک دستہ فوج کا جرنل مقرر ہوا تھا۔

دوسرا دستہ محمد علی میدان کی زیرِ نعت تھا۔

تیسرے کے سالار بخشئی بیعت خاں تھے۔

چوتھے دستہ پر میر رضا علی خاں کو مقرر کیا گیا۔

باقی فوج نواب بہادر نے اپنے ہاتھ رکھی۔

نواب بہادر کے دستے ملافت کیے گئے بڑھے۔ انہوں نے دشمن کو رسد سے محروم کرنے کیلئے دیاتوں کو لوٹ کر ویران کر دیا اور متحدہ لشکر پر شبِ خون مارنے شروع کر دیے۔

انگریزوں نے نواب بہادر کا زور توڑنے کیلئے بھی سب سے ایک فوج منگو کر ماحل منگلور پر اتار دی اور اسے حکم دیا کہ بد نور (حیدرنگر) پر قبضہ کرے۔

نواب بہادر کو اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے شہزادہ بیٹو کو بد نور کی طرف روانہ کیا۔ پھر مشرقی محاذ پر رضا علی خاں کے سپرد کر کے خود بھی بد نور روانہ ہوئے۔

نواب بہادر کے جانے سے محاذ کمزور ہو گیا اور اتحادی فوجوں نے دامنباڑی، کنگن گڑھ، ہوسکوٹہ اور کولار وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔

کولار پر قبضہ کی خبر نے دالاجاہ محمد علی کو بہت مسرور کیا کیونکہ یہ شہر نواب بہادر کا مولد تھا۔ دالاجاہ نے فوراً کولار کو اپنا صدر مقام بنایا اور مراری راؤ کو جو گتھی کا حاکم تھا اپنے پاس بلا کر مفتوحہ علاقے اس کے سپرد کر دیے۔

دالاجاہ کا خیال تھا کہ نواب حیدر علی خاں اپنے مولد کے ہاتھ سے نکل جانے سے اس کے مطیع ہو جائیں گے۔

دوسری طرف شہزادہ بیٹو نے منگلور پہنچتے ہی قلعہ کا محاصرہ کر لیا جس پر انگریز قبا بھی ہو چکے تھے۔ شہزادے کے پاس فوج کم تھی۔ وہ زیادہ مؤثر کاروائی نہ کر سکا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ انگریزی فوج

قلعہ میں قید ہو کے رہ گئی۔ اور بد نور پر قبضہ کا خواب، خواب ہو کر رہ گیا۔

اس عرصہ میں نواب بہادر بھی اپنے چند دستوں کے ساتھ منگلور پہنچے۔ شہزادے نے قلعہ کے محاصرے کا حائل بتایا۔ نواب بہادر بیٹے کی کاروائی سے بہت خوش ہوئے۔

نواب بہادر کے پاس بھی زیادہ فوج نہ تھی۔ منگلور کا قلعہ بہت مضبوط تھا۔ اسے سر کرنے کے لیے کافی لشکر کی ضرورت تھی۔ اس وقت نواب بہادر کو ایک عجیب و غریب سوچ تھی۔ انہوں نے قرب و حوار کے تمام مکڑی کا کام کرنے والے ترکھانوں کو بلوایا اور انہیں حکم دیا کہ وہ مکڑی کی نمائشی بندوقیں تیار کر دیں۔ حکم پاتے ہی کارگر دوں نے بندوقیں بنانا شروع کر دیں۔

دوسرا کام نواب بہادر نے یہ کیا کہ فوراً آٹھ ہزار آدمیوں کو سپاہی کے طور پر بھرتی کر لیا۔ وہ سپاہی نہ تھے نہ بندوق چلانا جانتے تھے۔ وہ تمام کے تمام کاشت کار تھے۔ ان آٹھ ہزار سپاہیوں کے لیے رنگ برنگ اور جھللاتے لباس تیار کیے گئے۔

جب مکڑی کی نمائشی بندوقیں تیار ہو گئیں تو نواب بہادر نے ان نمائشی سپاہیوں کو ذرق برق لباس پہنا دیے اور ہر ایک کے ہاتھ میں ایک بندوق پکڑا دی۔ بندوقوں پر ایسی پالش کی گئی کہ دُور سے وہ بالکل اصل لگتی تھیں۔

اس طرح نواب بہادر نے آٹھ ہزار کا نمائشی لشکر جس کے ہاتھوں میں نمائشی بندوقیں اور بدن پر رنگ برنگ اور جھللاتے ہوئے لباس تھے، اسے آہستہ آہستہ قلعہ منگلور کی طرف بڑھایا۔ قلعہ پر قابض فوج نے جب آٹھ ہزار بندوق بردار سپاہیوں کو قلعے کی طرف آتے دیکھا تو ان کے ہوش اُڑ گئے۔ انہیں بھاگنے کی فکر ہوئی۔

اس وقت شہزادہ شیونے توپ خانہ کو حکم دیا کہ قلعہ پر گولے برسانا شروع کر دے۔ خود شہزادے نے اپنے دستے کے ساتھ قلعہ پر حملہ کر دیا۔ انگریز مرابیمہ ہو کر قلعہ سے ماحول کی طرف بھاگے وہ اپنے ساتھ کوئی سامان بھی نہ لے پاسکے۔

اس طرح مغربی علاقہ پر انگریزوں کی حکمت علی ناکام ہو گئی اور نواب حیدر علی خاں پھر مشرقی قحاذ پر واپس آ گئے۔

اس کے بعد سے نواب بہادر حیدر علی خاں نے جو جنگیں انگریزوں، نظام دکن اور مرہٹہ سرداروں سے لڑیں ان سب میں شہزادہ شیو برابر شریک رہا اور اپنے جری اور حوصلہ مند والد کی پشت سے پشت ملا کر دایہ شجاعت دیتا رہا۔

چونکہ اب شہزادہ شیو سلطان کا تذکرہ بھر پور انداز میں شروع ہو رہا ہے جس میں ہمیں سندھ جنگوں کی تفصیل پیش ہوگی مگر نواب بہادر حیدر علی کا تذکرہ اختتام کو پہنچانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان کے بقیہ کارناموں پر (جن کی تفصیل سلطان شیو کے ذیل میں آئے گی) ایک طائرانہ نظر ڈالتے چلیں۔

نواب بہادر حیدر علی خاں اور شیو سلطان نے انگریزوں، نظام حیدر آباد اور مرہٹوں کو اس قدر بڑبڑایا کہ وہ صلح کرنے پر مجبور ہو گئے۔

سب سے پہلے مرہٹہ سردار نے حیدر علی سے دوستی کا معاہدہ کیا اور اپنی فوج لے کر دہری وطن نکل گئی۔

نظام کو اس خبر نے ہلا کے رکھ دیا۔ اس نے فوراً اپنے دیوان رکن الدولہ کے ذریعے صلح کا بیعانہ بھیجا اور مندرجہ ذیل شرائط پر صلح ہوئی:

۱۔ نواب محفوظ خاں (نواب محمد علی والا جاہ کا بڑا بھائی) کی بیٹی شہزادہ شیو سلطان کے عقد میں آئے گی۔

۲۔ نواب محفوظ خاں بحیثیت میرا نوار الدین کے بڑے بیٹے ہونے کے، صوبہ دار اکاٹ مقرر ہوں اور وہ اپنا حق، شیو سلطان کو تنزیلین کر دیں۔

۳۔ نواب حیدر علی خاں اور نظام حیدر آباد ہمیشہ ایک دوسرے کے حلیف رہیں گے۔

۴۔ نواب حیدر علی اور نظام حیدر آباد متفقہ طور پر محمد علی والا جاہ کو معزول کرنے کی کوشش کریں گے۔

نواب حیدر علی اگر چاہتے تو دراصل اس پر حملہ کر کے جزیری ہند سے انگریزوں کے قدم ہمیشہ کے لیے اکھاڑ سکتے تھے مگر انہوں نے مغلوب دشمن کے ساتھ ایسی نرم شرائط رکھیں جن پر لوگوں کو افسوس ہوا انگریزوں نے یہ شرطیں تسلیم کرنے میں پل بھر دیر نہ لگائی۔

شرائط حسب ذیل تھیں:

۱۔ آئندہ فریقین ایک دوسرے کے مددگار رہیں گے۔

۲۔ فریقین ایک دوسرے کے متوفعات اور قیدی واپس کر دیں گے۔

۳۔ علاقہ کرور جو محمد علی والا جاہ کی ملکیت تھا آئندہ سے نواب حیدر علی خاں

کی ملکیت تصور ہو گا۔

جیدر علی خاں نے اپنی فتح کی یاد گا۔ مدراس میں اس طرح چھوڑی کہ ان کے حکم سے انگریزوں نے ایک پتھر پر کندہ کیا ہوا کتبہ قلعہ سینٹ جارج کے دروازہ پر لگایا گیا جس میں دکھایا گیا تھا کہ گورنر مدراس اور ممبران کونسل جیدر علی خاں کے سامنے دوزانو بیٹھے ہیں اور جیدر علی خاں ایک ممبر کی ناک کو جو ہاتھی کی سونڈ کی طرح لمبی تھی، پکڑ کر کھینچ رہے ہیں، جس میں سے اشرفیاں گر رہی ہیں اور کرنل اسمتھ ایک طرح صلیب نما ہاتھ میں لیے اپنی تلوار توڑ کر رکھ رہا ہے۔

صلیب نما مدراس کے بعد جب نواب بہادر مرنگا پٹم واپس آئے تو ان کے جلوس کے چہنم دیدر حالات ایک فرانسیسی مورخ نے اس طرح بیان کیے ہیں:

”جس وقت نواب بہادر جیدر علی خاں کا جلوس مرنگا پٹم پہنچا تو جلوس میں پچاس ہزار سوار، اسی ہزار پیادے اور چار ہزار بندوچی شامل تھے۔ توپ خانہ، بم برداروں اور تیراندازوں کی تعداد اس کے علاوہ تھی جس کی ترتیب اس طرح تھی:

۱۔ سب سے آگے یورپ کے سواروں کا رسالہ تھا۔ ان کی اونچی ٹوپیاں زرق برق درمیاں، اچھلدار اسلحہ اور تونمند گھوڑے جاہ و جلال کی نشانی تھے۔

۲۔ ان کے پیچھے ۳۰۰ اونٹ تھے جن پر نامہ بری کا سامان بار تھا۔ کوہاں والے ان اونٹوں پر بھالے لیے نامہ بر بیٹھے تھے۔

۳۔ ان کے پیچھے دونائیت سر بلند نشان بردار ہاتھی تھے۔ یہ نشان نیلے رنگ کے ریشمی اور زکار پھر مردوں سے آراستہ تھے۔ ایک نشان پر سورج اور دوسرے پر چند ستاروں کو زریں کام سے بنایا گیا تھا۔

۴۔ اس کے بعد ایک بلند ہاتھی تھا جس پر نقاروں کی جوڑی تھی اور نقارچی نقارے بجا رہے تھے۔

۵۔ پھر فرنا بھانے والے سواروں کا ایک غول تھا۔

۶۔ ان کے پیچھے چار ہاتھیوں پر ۲۴۔۲۵ باب نقار بیٹھے موسیقی کے

راگ الاپ رہے تھے۔

ان کے پیچھے آنے والوں کی ترتیب اس طرح تھی:

۷۔ پانچ ہاتھی جن پر طلائی عاریاں رکھی تھیں۔

۸۔ چار ہاتھی زریں پشت پہلو ہو دے۔ پھر چھ جوان چار آئینہ لگائے اور بند و تین سنبھالے بیٹھے تھے۔

۹۔ دو رسالے جیشیوں کے۔

۱۰۔ کالوں کا ایک گروہ۔ سر پر شتر مرغ کے پر اور ہاتھوں میں بھالے۔

۱۱۔ جھنڈی برداروں کا گروہ۔

۱۲۔ جیدر شہزادے، سپہدار اور دوسرے افسر۔

۱۳۔ شکاری سواروں کی ایک جماعت۔

۱۴۔ خاصہ کے بارہ گھوڑے۔

۱۵۔ پیادوں کی فوج جس کے ہاتھوں میں سنہری ملیح کا سیاہ عصا تھا۔

۱۶۔ ترکی گھوڑوں پر بارہ سوار۔

۱۷۔ منصب دار خانگی۔

۱۸۔ میر صدقات کا ہاتھی۔

۱۹۔ پھر نواب بہادر کا ہاتھی، مفید رنگ کا یہ ہاتھی جھوم جھوم کر آ رہا تھا۔

۲۰۔ دو سو ہاتھیوں کی قطار۔

۲۱۔ پانچ ہاتھی جن میں ایک پر طلائی مسجد رکھی تھی۔

۲۲۔ دو رسالے جیشیوں کے۔

۲۳۔ جیشیوں کی پلیٹن۔

۲۴۔ جانثار سپاہیوں کا غول۔

لگ گئی رہہ چٹخ کر بولا :

”وزیر اعظم کی عقل و فراست پر کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا لیکن ان کا یہ ہنہار درست نہیں معلوم ہوتا کہ اس وقت حیدر علی کا کوئی مقابل نہیں۔

کیا یہ غلط ہے کہ مرہٹہ لشکر نے سرنگا پٹم پہنچنے کے حیدر علی کو شکست فاش دی تھی اور اس نے سات لاکھ کی رقم وے کر اپنی جان بچائی تھی؟“

”ذرا ٹھہرو ترکم راؤ۔“

پونما کے پیشوائے ترکم راؤ کی بات کاٹ دی :

”میں یاد پڑتا ہے کہ حیدر علی خاں نے ہمیں سات لاکھ کا ادائیگی کی تھی اور پانچ لاکھ مزید ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔“

”پیشوائے اعظم نے بالکل درست فرمایا۔“

ترکم راؤ کے بولنے سے پہلے ہی نانافرنزولیس نے بات درمیان سے اچک لی۔ دراصل اُسے ترکم راؤ کا اپنی اور پیشوائے لشکر میں دخل دینا سخت ناگوار گذر رہا تھا۔ نانافرنزولیس نے ذرا تو وقت اور سامان لینے کے بعد اپنی بات پوری کی :

”پونما کے دربار کی پچاس لاکھ کی رقم حیدر علی کی طرف پچھلے پانچ سال سے واجب الادا چلی آ رہی ہے مگر نواب نے اس مسئلہ میں کوئی پیشرفت نہیں کی اور نہ ادائیگی کے لیے مزید وقت کی درخواست کی ہے۔ ان حالات میں کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ نواب سے رقم کی ادائیگی کا سختی سے مطالبہ کیا جائے؟“

”سختی سے مطالبہ۔“

ماہوراؤ نے یہ الفاظ زیر لب دہرائے :

”تم نے ٹھیک کہا نانافرنزولیس۔ حیدر علی سے واقعی سختی سے مطالبہ کیا جائے گا مگر یہ مطالبہ زبانی یا تحریری نہیں ہوگا بلکہ ہم یہ مطالبہ نوک شمشیر اور توپ خانہ کی زبان سے کریں گے۔ کیوں ترکم راؤ تمہارا کیا خیال ہے؟“

پیشوائے ترکم راؤ کو براہ راست مخاطب کیا تو اس کا سینہ مسرت سے پھول گیا۔ اس نے شمشیر پر ہاتھ رکھ کر کہا :

”غلام صرف پیشوائے حکم کا منتظر ہے۔ بہادر تو میدان جنگ کا لغتہ سننے کے لیے ہر وقت

نواب حیدر علی خاں کی فتوحات اور انگریزوں اور نواب کے درمیان صلح نامہ مدراس کی ختبہ جب مرہٹوں کے پیشوا مادھو راؤ کو پہنچی تو وہ غصہ سے بلبلا اٹھا۔ اس کی سمجھ میں یہ نہ آ رہا تھا کہ وہ حیدر علی خاں جسے اس نے صرف پانچ سال پیشتر سرنگا پٹم کے منافات میں ایک زبردست شکست سے دوچار کیا تھا، اس نے اس مختصر عرصہ میں اتنی بڑی طاقت کیسے جمع کر لی کہ انگریزوں کو نواب کی شرارتوں پر صلح کرنا پڑی۔

چنانچہ اس نے اپنے عالی دماغ وزیر نانافرنزولیس سے استفسار کیا :

”نانافرنزولیس۔ کیا یہ سچ ہے کہ حیدر علی خاں جب مدراس سے صلح کر کے سرنگا پٹم واپس آیا تو اس کے لشکر کے جلوس میں پچاس ہزار جہاز موار، اسی ہزار پیادے اور چار ہزار بندو قچی شامل تھے؟“

وزیر نانافرنزولیس نے بڑی معانت سے جواب دیا :

”پیشوائے محترم۔ میری اطلاع کے مطابق نواب حیدر علی خاں کے لشکر کی اس تعداد میں تو پناہ اور بان و بم برداروں کی تعداد شامل نہیں۔

ہمارے جاسوسوں کا اندازہ ہے کہ اس وقت نواب کے پاس بہترین اسلحہ کے ساتھ ڈیڑھ لاکھ کا لشکر کیں گانٹے سے درست کھڑا ہے اور اس وقت نواب کا کوئی بد مقابل نہیں۔“

نانافرنزولیس کا آخری جملہ سن کر مرہٹوں کے سپہ سالار ترکم راؤ کے تن بدن میں آگ

پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کی اس شکست کی خبر ایسا جی کو ملی تو اس کے ارادوں پر اس
 چڑگی اور وہ مرہٹہ لشکر لے کر ذرا پونا واپس ہو گیا۔
 اس کے بعد ہی پونا کے حالات بدل گئے۔

مرہٹوں کے پیشوا بالاجی باجی راؤ کا انتقال ہوا اور اس کی جگہ پونا کی گداری پر مادھوراؤ بیٹھا۔
 اس نے مرہٹہ لشکر کو از سر نو ترتیب دیا۔ اس وقت نواب حیدر علی خان کا جنوبی ہند میں طوطی بول
 رہا تھا۔

مادھوراؤ کو حیدر علی کا اقتدار پسند نہ آیا اور اس نے ایک لاکھ سوار، ساٹھ ہزار پیادے
 اور پچاس ہزار تیر اندازوں کے ساتھ مرنگا پٹم پر چڑھائی کر دی۔
 حیدر علی کو مادھوراؤ کے آنے کی خبر ملی تو وہ مقابلہ کے لیے نکلے اور مارگری کے جنگل میں
 لگات لگا کر مرہٹہ بہراول پر حملہ کر کے اسے پوری طرح ہر باد کر دیا۔
 مادھوراؤ نے ایک فوج بارہ محل پر قبضہ کے لیے بھی روانہ کی تھی۔ اس فوج کو حیدر علی کے
 پنداروں نے گامز موی کی طرح کاٹ کے رکھ دیا۔
 مادھوراؤ ان دو شکستوں سے گھر آگیا۔

ادھر حیدر علی بھی مرہٹوں کو کسی نہ کسی طرح واپس کرنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے سات لاکھ
 روپے مادھوراؤ کو بھجوائے اور یہ وعدہ کیا کہ وہ پچاس لاکھ روپے بطور تادان مزید ادا کریں
 گے بشرطیکہ مرہٹہ لشکر پونا واپس ہو جائے۔

مادھوراؤ نے اس پیش کش کو فوراً قبول کر لیا۔ وہ سات لاکھ کی رقم لے کر پونا لوٹ گیا۔
 یوں پچاس لاکھ کی رقم اب تک نواب بہادر کے ذمے واجب الادا چلی آرہی تھی۔

اس وقت پٹنادر بار میں انہی پچاس لاکھ کا ذکر ہوا تھا اور پیشوا مادھوراؤ نے اپنے موجود
 سپہ سالار کو لشکر کی تیاری کا حکم دیا تھا۔

مادھوراؤ کے وزیر نانافرنویس کی رائے یہ تھی کہ نواب حیدر علی کے خلاف واجب الادا رقم کا
 سختی سے مطالبہ کیا جائے۔ اس لیے کہ یہ عین ممکن ہے کہ حیدر علی بغیر جنگ کے رقم ادا کرنے پر
 آمادہ ہو جائے مگر مادھوراؤ اور ترک راؤ میں جو گفتگو ہوئی تھی اس کا صاف مطلب تھا کہ اب
 جنگ ناگزیر ہے اور مرنگا پٹم پر حملہ مزید کیا جائے گا۔

پس مرہٹہ وزیر نانافرنویس نے جنگ کے خلاف ہونے کے باوجود خاموشی اختیار کر لی۔

بے چین رہتے ہیں۔

پیشوا نے اسی وقت فیصلہ کر دیا:

”ہم تمہاری بات سے خوش ہوئے ترک راؤ تمہیں لشکر کی تیاری کا حکم دیا جاتا ہے۔ ہم
 حیدر علی کے پاس خود جا بیٹھیں گے اور اس سے پچاس لاکھ کی رقم مع سود کے وصول کریں گے۔
 اس کے بعد ہمارا لشکر سراسر اپنی غلداری قائم کرے گا تاکہ جنوبی ہند میں مرہٹہ طاقت کو شمشادہیت
 کے روپ میں ڈھالا جاسکے۔“

”ایسا ہی ہو گا پیشوا نے اعظم۔“

ترک راؤ نے فوراً اس کی ہل میں ہل ملائی:

”جنوبی ہند میں مرہٹہ سورج ایک بار چھر چکے گا۔“

نواب حیدر علی خان کے ذمے پچاس لاکھ کی واجب الادا رقم کا قصہ اس طرح تھا کہ ۱۷۹۱ء میں
 بھی اسی طرح مرہٹوں نے ایسا جی کی سرداری میں سرنگا پٹم پر غلدار کی تھی اور نواب نے اپنی مختصر
 فوج کے ساتھ مرہٹہ لشکر کو اس قدر پریشان کیا تھا کہ وہ صلح کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ حیدر علی
 بھی ان سے جان چھڑانا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے ”بارہ محل“ کا علاقہ مرہٹوں کو دینے کا اعلان
 کیا اور صلح ہو گئی۔

ایسا جی خوش خوش اپنے لشکر کے ساتھ بارہ محل پر قبضہ کے لیے روانہ ہوا مگر جب وہ بارہ محل
 پہنچا تو حیدر علی قلعہ داروں نے اسے قبضہ دینے سے انکار کر دیا۔

ایسا جی کے لیے یہ صورت حال بڑی پریشان کن تھی۔ اسے حیدر علی اور بارہ محل کے قلعہ داروں پر
 بست غصہ آیا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بارہ محل کے تمام قلعوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا اور
 انہیں مندم کر کے زمین کے برابر کر دے گا۔

ایسا جی کے ارادے بڑے خطرناک تھے مگر اسی وقت مرہٹوں کی طاقت کو ایک ایسا دھچکا لگا کہ
 شمالی ہند میں ان کی قوت کا شیرازہ بکھر کے رہ گیا۔

مرہٹوں نے مسلمان فاتح احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں پانی پت کی تیسری جنگ میں ایسی شرمناک
 شکست کھائی کہ انہیں شمالی ہند چھوڑ کے پونا میں پناہ حاصل کرنا پڑی۔

کیونکہ شخصی حکومتوں میں شاہ وقت سے اختلاف کرنا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف سمجھا جاتا تھا اگر بادشاہ ذات کو دن کہے تو دربار کے تمام چھوٹے بڑے درباریوں کا فرضی ہونا تھا کہ وہ بادشاہ کی غلطی کی نشاندہی کرنے کے بجائے اس کی ہاں میں ہاں ملائیں ورنہ اپنے سر سے جائیں۔

اُس دن ترک راؤ جب شام کو دربار سے اپنی جوبلی پر پہنچا تو خوشی کے مارے پھولے نہ سما رہا تھا۔ ترک راؤ نے سپہ سالار کی حیثیت سے کئی رٹائیاں لڑی تھیں اور ان میں فتح حاصل کی تھی لیکن وہ صرف "رٹائیاں" تھیں۔ انہیں جنگ "کانام" نہیں دیا جاسکتا تھا۔ ترک راؤ کا خیال تھا کہ جنگ تو اب ہوگی اور اسے اپنی بہادری کے پورے جوہر دکھانے کا موقع ملے گا۔

اس کا خیال کسی حد تک صحیح بھی تھا۔ اس لیے کہ جنوبی ہند میں اگر مرہٹوں کے بعد کوئی اور طاقت تھی تو وہ فاب حیدر علی خاں کی ریاست میسور تھی۔ جسے نواب بہادر نے سلطنت خداداد کانام دیا تھا۔ یوں تو نظام دکن اور مدراس کے بدلیسی حاکموں یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریزوں کی بھی ایک طاقت تھی۔ مگر وہ دونوں ہی نواب حیدر علی سے یا تو شکست کھا چکے تھے یا انہوں نے نواب سے دوستی کے معاہدے کر لیے تھے۔ سب سے آخری معاہدہ "معاہدہ مدراس" تھا جس کے مندرجات سے ظاہر تھا کہ انگریزوں نے نواب بہادر سے کس قدر دُوب کے اور خائف ہو کر یہ معاہدہ کیا تھا۔

ترک راؤ اسی نواب بہادر حیدر علی خاں کے مقابلہ پر بارہا تھا۔ پیشوا نے اسے اس اہم جنگ کی ذمہ داری سونپ دی تھی اور حکم دیا تھا کہ وہ جس قدر اور جتنی چاہے فوج تیار کر لے مگر یہ خیال رکھے کہ اس بار حیدر علی کے مرکز یعنی مرنگا پٹم کانام میسور کی سرزمین اور تاریخ سے متاثر ہے۔ ترک راؤ کو جو ان تو نہیں کہا جاسکتا تھا اس لیے کہ اس کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی مگر بظاہر وہ ایک تیر خند اور مضبوط کاٹھی کا انسان تھا اور اس میں ہلاکی پھرتی اور قوت تھی۔

مرہٹے عام طور پر دراز قامت نہ ہوتے تھے لیکن ترک راؤ کا قد عام مرہٹوں سے کچھ نکلتا ہوا تھا اور شکل و شباب سے بھی وہ ایک بارعب سپہ سالار معلوم ہوتا تھا۔

بہادری کے ساتھ ساتھ ترک راؤ میں صحت پرستی کا جذبہ بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔ یوں تو اس کے تصرف میں بہت سچی جین عورتیں تھیں جنہیں اس نے ایک بڑی جوبلی میں رکھا تھا اور وہیں ان کے قیام و طعام کا معقول انتظام کیا ہوا تھا لیکن اس جوبلی کی طرف اس کا جانا بہت کم ہوتا تھا کیونکہ پناہی میں اس کی

دو جوبلیاں اور تھیں جو اُسے اتنا وقت نہ دیتی تھیں کہ وہ بڑی جوبلی کی طرف جاسکے۔

ان دو جوبلیوں میں سے ایک میں اس کی خاندانی بیانتا بیوی رہتی تھی جس سے ترک راؤ کی دو اولادیں تھیں۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ دونوں ہی جوانی کی حدود میں قدم رکھ رہی تھیں۔ مگر دوسری جوبلی میں رہنے والی ایک ایسی نازک اندام حسینہ تھی جس نے سنگدل اور سخت دل ترک راؤ کو پوری طرح اپنے قابو میں کر رکھا تھا۔

اس دو شیرزہ کا ناما رچنا تھا۔

ڈیڑھ سال پہلے اس کے ایک سپاہی نے رچنا کو ترک راؤ کے حضور پیش کیا تھا۔ ترک راؤ اگرچہ ادھیر طبع کا ایک سمجھدار آدمی تھا مگر رچنا کے حسن میں اس ہلاکی جاذبیت تھی کہ اسے دیکھتے ہی وہ اپنے حواس کھو بیٹھا۔ اس نے رچنا کے لیے فوراً ایک جوبلی کا انتظام کیا اور وہاں اسے رانیوں کی طرح رکھا۔

رچنا کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس کی بیٹی ہے یا کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے اسے پیش کرنے والے نے ترک راؤ کو صرف یہ بتایا تھا کہ رچنا کسی مضبوط سہارے کی تلاش میں ادھر ادھر جھنگ رہی تھی کہ میرے ہاتھ لگ گئی اور میں اسے مرہٹہ لشکر کے سپہ سالار یعنی آپ کے پاس لے آیا کہ آپ سے زیادہ مضبوط سہارا کوئی دوسرا کیا ہوگا!

رچنا کی خوبصورتی کی خبر نہ نہ مادھوراؤ کو بھی پہنچی تھی۔ اسے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ مرہٹہ سپہ سالار نے ایک خوبصورت بلیں کو ایک بہت خوبصورت محل میں قید کر رکھا ہے مگر مادھوراؤ اس اطلاع پر صرخت مسمکرا کر رہ گیا تھا کیونکہ مادھوراؤ اور ترک راؤ میں بڑا پرانا یا نارہ تھا اور جوانی کے زمانہ میں دونوں ہم مشرب، ہم پیالہ و ہم نالہ تھے۔

پیشوا ہونے کے بعد مادھوراؤ کی خوش فطرتیوں پر ذمے داریوں کا سایہ پڑ گیا مگر ترک راؤ سپہ سالار ہونے پر کچھ اور کھل کھیلنے لگا تھا۔

رچنا کی عمر اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ وہ واقعی ایک کھلتا ہوا گل تھا۔ اس کا اور ترک راؤ کا کوئی جوڑ نہ تھا مگر رچنا، جس کی حیثیت ایک طاشنہ سے زیادہ نہ تھی، ترک راؤ کو نہ صرف دل و جان سے چاہتی تھی بلکہ اسے اپنا بھگوان اور اُن دا تا بھتی تھی۔

ممکن ہے کہ اس میں ترک راؤ کے لیے یہ غلو اس وجہ سے پیدا ہو گیا ہو کہ اس نے

رچنا نے اس کی افسردگی دور کرنے کے لیے کہا:
 "آپ آئے تھے تو مسرت جیسے آپ پر قربان ہو رہی تھی مگر اب آپ افسردہ ہو گئے۔
 آخر کیوں؟"

ترک راڈ جیسے گری نیند سے بیدار ہوا اس نے سر کو ہٹا سا جھٹکا دیا:
 "بے شک۔ جب میں جوبلی میں داخل ہوا تھا تو بہت خوش تھا۔ اسی لیے کہ مجھے ایک عظیم لشکر
 کا سپہ سالار بنایا گیا ہے اور میں وہ عظیم جنگ لڑنے جا رہا ہوں جس کی مثال جنوبی ہند کی تاریخ میں
 مشکل ہی سے ملے گی۔"

رچنا نے اپنی بھاری پلکیں پٹ پٹائیں:
 "میں سمجھ نہیں پاتی جھگڑا۔ کیسا شکر۔ کیسی جگہ؟"
 رچنا جیسی سیدھی مادی لڑکی کے لیے ترک راڈ کی باتیں کسی سہ سے کم نہ تھیں اس نے
 اپنے ہوش میں مرنے والے مصائب دیکھے تھے پھر بھلا جنگ اور لشکر کی باتیں اس کی سمجھ میں کس طرح آتیں؟
 ترک راڈ نے آفاہ سے اپنے پیر پھینچ لیے اور قریب رکھی ہوئی ایک چوکی پر بیٹھ گیا۔
 چوکی کے پایوں پر چاندی کے پتر منڈھے ہوئے تھے۔ اس نے رچنا کو بھی اپنے سامنے دبیسی ہی
 ایک چوکی پر بٹھا دیا۔
 پھر اس نے رچنا کو سمجھایا:

"دیکھو رچنا جنگ اسے کہتے ہیں کہ ایک راجہ دوسرے راجہ پر حملہ کرے اور دونوں کی
 سپنائیں (زوجین) ایک دوسرے سے لڑیں اور ان میں سے ایک میدان چھوڑ کر بھاگ ملے۔"
 رچنا کی سمجھ میں پھر بھی نہ آیا۔ اس نے معصومیت سے پوچھا:
 "مگر جھگڑا۔ ایک راجہ کو دوسرے راجہ سے لڑنے کی کیا ضرورت۔ وہ اپنی راجدھانی میں خوش
 رہے اور دوسرا اپنی راجدھانی میں چین کی بنی بکٹے؟"
 ترک راڈ چڑھا گیا۔ ذرا سختی سے بولا:

"ایسا نہیں ہوتا رچنا۔ ہمارا پیشوا مادھوراؤ۔ دکھنی بھارت کا سب سے بڑا راجہ ہے مگر ایک
 مسلمان ملے پھر حیدر علی ہمارے پیشوا کا حکم نہیں مانتا۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اسے دینا
 نیست و نابود کر دوں۔"

رچنا، ترک راڈ کے سخت لہجہ سے سم گئی۔ اس نے فوراً بات بدل دی:

یہاں آنے سے پہلے مصائب کے کچی دریا پا رہے تھے اور ترک راڈ کا علاج کر دیا یہ عمل (جوبلی) اس کے
 لیے جنت سے کم نہ تھا۔

ترک راڈ جب رچنا کی جوبلی میں داخل ہوتا تو وہ مسکراتے چہرے سے اپنے بھگوان کا اس متبادل
 کرتی اور اس کے پیروں میں بیٹھ کے اس کے خاک و دھول میں اٹے ہوئے جوڑوں کو تارتی اور انہیں
 بے تکلف اپنی قیمتی سٹارٹی کے پلو سے صاف کرتی۔ پھر دوڑ کے پانی کا ایک آفاہ اور ڈول اٹھا
 لاتی اور ترک راڈ کے میلے پیروں کو آفاہ میں رکھ کے دھوتی۔

اس دوران ترک راڈ رچنا کے لائبنے بالوں سے کھینٹا، ان میں انگلیاں پھیرتا اور شاید اپنی
 جوانی کے میٹے دونوں کو یاد کرتا رہتا۔

اس شام رچنا نے اپنے بھگوان کو مسکراتے چہرے کے ساتھ جوبلی میں داخل ہوتے دیکھا تو دوڑ کے
 اس سے پیٹ گئی۔

قریب کھڑی دو داسیاں رچنا کے اس دامانہ انداز پر شرمائیں اور سر جھکا کے دوسری طرف
 چلی گئیں۔ پھر رچنا نے حسب معمول ترک راڈ کے پاؤں میں بیٹھ کر اس کے جوتے اتارے اور سٹی
 میں لٹھڑے ہوئے پیر دھلائے۔

ترک راڈ نے ایک عالم بے خودی میں رچنا کو اپنی طرف کھینچ لیا:
 رچنا تم مجھے چھوڑ کر چلی تو نہ جاؤ گی؟ ترک راڈ نے نہ جانے کسی ہذبے اور خدشے کے
 تحت کہا۔

رچنا نے کسمکھتے ہوئے کہا:
 "آپ میرے بھگوان ہیں۔ بھگوان بھلے ہی اپنی بھاری سہ سے نہ پھیر لیں مگر بھگوان اپنے
 بھگوان کو چھوڑ کر کہاں جاسکتی ہے؟"

ترک راڈ نے ایک ٹھنڈی ماسن لہجہ سے کہا کہ یہ گئی جوانی کا ماتم ہو:
 "مجھے ایسا لگتا ہے رچنا جیسے کوئی تیس چھ سے چھ لے گیا ہے۔"
 ایسی باتیں نہ کر دھگوان۔ موت کے سوا کوئی اور مجھے آپ سے جدا نہیں کر سکتا۔ رچنا نے تڑپ
 کے کہا۔

پتہ نہیں ترک راڈ نے اس کا جواب سنا کہ نہیں کیونکہ اس کی نظریں کھلے آسمان میں جیسے
 کچھ تلاش کر رہی تھیں۔

"تو بھگون۔ اس لڑائی میں آپ مجھے اپنے ساتھ لے چلیں گے نا؟"
ترک راڈ کا سارا غصہ ٹھنڈا ہو گیا:

"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ تم میرے ساتھ ضرور چلو گی۔ یہ بات تو میں خود تم سے کہنے والا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ تم بھی میری طرح بہادر اور جی دار ہو۔ میرا خیال تھا کہ لڑائی اور جنگ کا نام سن کر تم ڈر جاؤ گی۔"
رچنا مسکرا دی۔

اور ترک راڈ کی جوانی کا دھلتا سورج ایک ٹکڑے کے لیے دک گیا۔
رچنا بڑی لگاوٹ سے بولی:

"بھگون۔ ڈر تو مجھے اس وقت لگتا جب آپ مجھے اتنی بڑی جوی میں اکیلا چھوڑ کے چلے جاتے۔ وہاں تو آپ میرے ساتھ ہوں گے۔ پھر مجھے کس بات کا ڈر ہو گا۔"
رچنا کی محبت اور اس کی گلاز جوانی نے ترک راڈ کو اپنی دوسری بیویوں کی طرف سے نفرت یا غافل کر دیا تھا۔ وہ صرف مشہور تلواردوں کے موقع پر اپنے بال بچوں اور دوسری داشتادوں کے پاس جاتا تھا۔ اس وقت صرف رچنا کا بول بالا تھا اور اس کے سامنے کسی اور کا چراغ نہ جلتا تھا۔
درباری حاضری اور فوجی ضرورتوں کے بعد اس کا جو وقت بچتا تھا اس کی ماں صرف اور صرف رچنا تھی۔

مگر۔

اس وقت ترک راڈ کی امیدوں پر پانی پھر گیا جب مرہٹوں کے پیشوا نے بھرے دربار میں اعلان کیا کہ:

"ہمارے ذاتی جاسوسوں نے اطلاع دی ہے کہ حیدر علی نے مرنگا پٹم میں ایک بہت بڑا لشکر جمع کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے انگریزوں سے مدد اس میں جو معاہدہ کیا ہے اس میں یہ شرط لکھی گئی ہے کہ حیدر علی اگر کسی سے جنگ آزما ہو گا تو انگریز اپنی فوجوں سے اس کی مدد کریں گے۔"

ماہو راڈ نے اتنا کہہ کر اپنے وزیراعظم نانافز نویس کی طرف دیکھا:
"نانافز نویس۔ کیا تمہیں بھی اسی قسم کی اطلاعات موصول ہوئی ہیں؟"
"جی ہاں پیشوائے معظم" وزیراعظم نے فوراً جواب دیا:

"آج میں ایسی ہی اطلاعات کے ساتھ دربار میں حاضر ہوا تھا۔ مجھے تو یہاں تک معلوم ہوا ہے کہ حیدر علی نے مدراس سے انگریزی فوج کے کچھ دستے سرنگا پٹم بلوائے ہیں اور خیال ہے کہ وہ کسی بڑی جنگ کا تیاریں میں مصروف ہے۔"
وزیراعظم نے یہ بات اسے ذوق سے کہی تھی کہ پیشوا اور سارے درباری حیران رہ گئے، سوائے سپہ سالار ترک راڈ کے اسے وزیراعظم پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ آخر اس سے ضبط نہ ہوا اور وہ بول ہی پڑا:

"پیشوائے اعظم۔ میں جاسوسوں کی بات رد تو نہیں کرتا لیکن نہ ضرور کہیں گا کہ ان خبروں میں بہت زیادہ جبالغہ ہے۔ حیدر علی کی طاقت اتنی زیادہ نہیں بڑھی ہے کہ اس پر قابو نہ پایا جا سکے۔ میں اسے سرنگا پٹم سے نکلنے نہ دوں گا اور وہیں اس کی قبر بنے گی۔"
پیشوا نے مسکراتے ہوئے کہا:

تم اپنے سینا بھتی ترک راڈ کے جوش و جذبہ کی قدر کرتے ہیں اور ہمیں ان سے ایسی ہی امید ہے مگر دشمن کو کسی وقت بھی کمزور نہ سمجھنا چاہیے۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ میسور کے خلاف ہم بذات خود اپنے لشکر کی کان سنبھالیں گے۔ وزیراعظم نانافز نویس اور سینا بھتی ترک راڈ ہمارے نائب کی حیثیت سے اس جنگ میں ہمارے مددگار ہوں گے۔
وزیراعظم نے جانے کیوں پیشوا کے اس فیصلے سے خوش ہوا۔ اس کے چہرے پر مسرت کی چمک سی پیدا ہوئی۔

اس کے برعکس ترک راڈ کو جیسے ماںپ سوکھ گیا۔ اس کا چہرہ دھڑاں دھڑاں ہو گیا تھا۔ جو کچھ کہہ رہا تھا وہ کچھ ہی تھا وہ پیشوا کے اگلے اعلان نے پوری کر دی:
ماہو راڈ پیشوا نے کہا:

مزید یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ چونکہ یہ جنگ مرہٹہ قوم کی زندگی اور موت کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے اس جنگ کے دوران جنگ میں حصہ لینے والوں کو اپنے ساتھ بال بچوں یا کسی اور عورت کو لے جانے یا ساتھ رکھنے کی قطعی اجازت نہ ہوگی۔

ترک راڈ کے دل میں چلتے ہوئے جذبات بالکل ہی ٹھنڈے پڑ گئے۔ اس نے سوچا تھا کہ اس مہم میں رچنا اس کے ساتھ ہوگی۔ پونا میں بھی رچنا ہی اس کے ساتھ ہوتی تھی اور وہ کسی اور عورت کے گھبراتے نہ گزارتا تھا مگر اس مہم میں رچنا کا اس کے ساتھ ہونا اس کے لیے نعمت سے کم نہ ہو گا کیونکہ

کہ وہ مرہٹہ لشکر کا سپہ سالار ہوگا۔ وہاں صرف اس کا حکم چلے گا۔ وہ جیسے چاہے گا جنگ کرے گا اور جس طرح چاہے گا اپنی جان تمنا چنا کے ساتھ گلچھڑے اڑائے گا۔

آج کے اعلان نے اس کے تمام منصوبے خاک میں ملا دیے تھے اور جب وہ شام کو دربار سے جوی پہنچا تو اس کا تھوڑا پھولا ہوا تھا۔

رچنا اسے دیکھ کر ڈر گئی:

”خیر تو ہے بھگون۔ آج آپ بہت خاموش ہیں؟“ یہ کہتے ہوئے رچنا نے اس کے جوتے کھونے کے بجائے اس کے گلے میں اپنی ہاںیں حاصل کر دیں۔

ترک راؤ کے بچے ہوئے دل میں جوانی کی ایک چنگاری چھٹی۔ اس نے بھی رچنا کو اپنی ہاہوں میں سمیٹ لیا۔

اس نے خمدی سانس لے کر کہا:

”یہ جو اپنا مانتی ہے نا۔ ارے وہی نانا فرنیس۔ بڑا جیٹ ہے یہ سانس نے پیشوا کو ڈرا دیا ہے کہ جیدر علی کے پاس بہت بڑا لشکر ہے۔

پیشوا بھی عجیب ہی آدمی ہے۔ اس نے بھی نانا فرنیس کی بات کا یقین کر لیا۔ میں نے کہا بھی کہ یہ خبر غلط ہے اور دشمنوں کی اڑائی ہوئی افواہ ہے مگر پیشوا نے میری ایک نہ سنی اور اعلان کر دیا کہ فوجوں کی وہ خود مرداری کرے گا۔

رچنا گھبرا گئی سانس نے پوچھا:

”تو کیا پیشوا نے آپ کو مرداری سے ہٹا دیا ہے؟“

یہ کہتے ہوئے اس کے ہونٹ پکپکا رہے تھے۔ دراصل رچنا کو ترک راؤ سے کوئی دلچسپی تھی بلکہ وہ تو اس مضبوط سہارے کی قدر کرتی تھی جو ترک راؤ کو مرہٹہ سپہ سالار ہونے کی حیثیت سے حاصل تھا۔

”اری پگلی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سپہ سالار تو میں ہی رہوں گا مگر اب حکم پیشوا کا چلے گا وہ جس طرح چاہیں گے فوجوں کو لڑائیں گے۔ ترک راؤ نے اسے سمجھایا۔

”یہ تو میرے لیے بہت اچھا ہوا۔“ رچنا نے اس طرح کہا جیسے یہ اس کے لیے کوئی اہم بات ہی نہ تھی۔

ترک راؤ اس کا منہ دیکھنے لگا۔

”کیوں۔ اچھا کیوں ہوا۔ تجھے اس سے کیا ملے گا؟“ ترک راؤ کے لہجے میں تلخی آگئی۔ وہ اس بھولی لڑکی کو کیسے سمجھاتا کہ پیشوا کی موجودگی میں اس کی حیثیت ایک معمولی سپاہی سے زیادہ نہ ہوگی۔

رچنا نے ترک راؤ کی تلخی کا جواب ایک بھرپور ادا سے دیا۔ وہ بولی:

”رچنا کو اس سے یہ ملے گا کہ اس کا بھگون جنگ کے دنوں میں بھی اپنی پادشہ کے پاس رہے گا۔ آپ کو لڑائی کے جھجھکوں سے چھٹکارا مل جائے گا اور آپ دن بھر کی لڑائی کے بعد بے فکر ہو کر میرے پاس آیا کریں گے۔“

”یہ تو یہی خیال غلط ہے رچنا۔“

ترک راؤ نے افسردگی سے جواب دیا:

”اگر ایسا ہوتا تو مجھے کوئی غم نہ ہوتا مگر پیشوا نے میدان جنگ میں عورتوں کو ساتھ لے جانے سے منع کر دیا ہے۔“

”کیا کہا آپ نے؟“ رچنا کا دل مسرت سے جھم اٹھا تھا مگر اسے مصنوعی حیرت اپنی آنکھوں میں سمجھانا پڑی تھی:

”میں کا مطلب ہے کہ میں آپ کے ساتھ نہیں جاسکوں گی۔“

اب تم سمجھی ہو اصل بات۔ ترک راؤ بولا:

”پیشوا نے تمام لشکریوں کو اپنے ساتھ عورتوں کو لے جانے سے منع کر دیا ہے۔“

مگر اب کیا ہوگا۔ میں آپ کے بنا ایکلے کیسے رہوں گی۔ رچنا نے اپنی آواز میں افسردگی شامل کر دی تھی۔

دراصل وہ جنگ پر جانے سے گھبراتی تھی مگر ترک راؤ کے حکم سے انکار بھی نہ کر سکتی تھی۔

اب اس نے جین کا سانس لیا تھا۔ اس نے غماہری ہی کیا تھا کہ اسے ترک راؤ کے ساتھ نہ جانے کا جید افسوس ہے اور اس کے بغیر اس کا وقت اچھا نہ گزرے گا۔

ایک مثل منہو رہے کہ: ”گنوار گوں کا یار۔“

یعنی دیوانی اُن بڑھ جسے ہم غلطی سے بے وقوف سمجھتے ہیں وہ دراصل بے وقوف نہیں ہوتا بلکہ اپنے مفاد کا پورا خیال رکھتا ہے۔ رچنا کی بھی یہی حالت تھی۔ وہ بغاہر بہت بھولی بھالی تھی

دخل دینا چاہیے اور نہ پیشوا کو اسے اتنا منہ لگانا چاہیے۔

ترک راؤ لشکر گاہ کے میدان میں پہنچا تو یہ دیکھ کے حیران رہ گیا کہ پیشوا اور وزیر اعظم اپنے میں شرا اور میدان میں کھڑے فوجی مشقیں دیکھ رہے ہیں۔

پیشوا تو ایک ہی جگہ کھڑا تھا مگر وزیر اعظم جگہ جگہ ایک سے دوسری صف میں جا رہا تھا ترک راؤ کے قہ بدن میں آگ لگ گئی مگر پیشوا کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکا۔

مرہٹہ لشکر گاہ میں دو ہفتے تک فوجیں اکٹھا ہوتی رہیں۔ تمام مرہٹہ علاقوں کو حکم پہنچا گیا تھا کہ پیشوا بذات خود ایک اہم عہد پر روانہ ہو رہا ہے اس لیے تمام مرہٹہ سردار اور وہ مردار جو مرہٹوں کے حلیف ہیں، اپنے اپنے لشکر کے ساتھ جلد از جلد پونا پہنچ جائیں۔ چنانچہ صبح سے رات لگے لگے فوجوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا۔

اس دوران پیشوا، وزیر اعظم اور سپہ سالار کا عیش و آرام خاک میں مل گیا۔ خصوصاً ترک راؤ جو پیشوا سے بھی زیادہ عیش پسند تھا، اس کے لیے یہ ایام بہت سخت اور تکلیف دہ ثابت ہو رہے تھے۔ پھر ۱۶ مئی میں پیشوا اپنا لشکر لے کر میسور کی طرف روانہ ہوا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ نواب حیدر علی خاں کو پیشوا کی پونا سے روانگی کی خبر ہی نہ ہوئی تھی۔ وہ بڑا بیدار مغز حکمران تھا وہ جنگ اور اس کی دونوں حالتوں میں اپنے محکمہ جاسوسی پر خاص توجہ دیتا تھا۔ میسور کے رادگرو کے تمام رجواڑے، سلطنتیں اور حکومتوں کی تمام غیر معمولی فوجی نقل و حرکت کی خبریں انہیں اپنے جاسوسوں کے ذریعے ملا کرتی تھیں۔

جنی وقت مرہٹہ لشکر گاہ میں پہلی مرتبہ پیشوا نے مرہٹہ لشکر کا معائنہ کیا تھا اسی وقت حیدر علی کو بڑے گرو کے جاسوسوں نے زبانی اور تحریری طور پر اطلاع دی تھی۔

”نواب بہادر۔ مرہٹہ لشکر میں بڑے زور کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ پیشوا اور وزیر اعظم اور مرہٹہ سپہ سالار ترک راؤ سب کے سب فوجی تیاریوں میں حصہ لے رہے ہیں“ یہ اطلاع ایک جاسوس نے نواب کے دربار میں بذلت خود پہنچائی تھی۔

نواب نے سوال کیا تھا:

”کیا مرہٹہ پیشوا شمال میں کوئی مہم بھیج رہا ہے یا اس کا خیال تھا کہ دکن یا میسور کی طرف اگے کا ہے۔“

”نواب بہادر۔ ابھی مرہٹہ پیشوا کے ارادے معلوم نہیں ہو سکے۔ جاسوس نے ادب سے

مگر اپنے اچھے برے کو خوب سمجھتی تھی۔

رچنا، ترک راؤ کی سانسوں سے بھی قریب تھی لیکن اسے کسی پہلو چین نہ رہا تھا۔ میسور کے محاذ پر خود جانے کے پیشوا کے اعلان نے اس کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا کے رکھ دیا تھا۔ اس زمانے میں صرف طاقت کا بول بالا تھا۔ یہاں تک کہ پونا کے پیشوا ہونے کے لیے بھی طاقت ہی ضروری تھی۔

ادھر ترک راؤ کے دل کے کسی کو نہ کھڑے سے میں پیشوا بننے کی خواہش دہی ہوئی تھی اور اس خواہش کی تکمیل کا یہ بہترین موقع تھا۔

حیدر علی خاں پر قابو پانا ناممکن تصور کیا جاتا تھا۔

فرانسیسی، انگریز، مرہٹے اور نظام دکن سب ہی باری باری قسمت آزمائی کر چکے تھے اور انہیں منہ کی کھانا پڑی تھی۔

چنانچہ ترک راؤ نے سوچا تھا کہ وہ اپنی سپہ سالاری میں میسور پر ایسا حملہ کرے گا کہ جس کا خیال حیدر علی کے گمان میں بھی نہ ہو گا۔ اس کا یہ خیال کسی حد تک درست بھی تھا کہ اس وقت مرہٹہ طاقت ایک بار پھر اپنے عروج پر آ چکی تھی۔

ترک راؤ نے انہی خیالوں میں کروٹیں بدل بدل کر سویرا کر دیا۔ رچنا کی تمام ادائیں، ناناؤ انداز اور غرے و عشوے اس رات ترک راؤ پر بے اثر ہو کے رہ گئے۔ صبح کو جب ترک راؤ دربار جانے لگا تو رچنا کا منہ چھو لایا ہوا تھا مگر ترک راؤ اس پر توجہ دے بغیر دوبار چلا گیا۔

ترک راؤ راج علی پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ ماہو راؤ پیشوا اپنے وزیر نا فر نويس کے ساتھ صبح سے شکر گاہ گیا ہوا ہے۔

”نانا فر نويس۔ ترک راؤ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور اس نے نفرت سے زمین پر فٹوک دیا۔ اسے نانا فر نويس سے دلی نفرت تھی اور جب پیشوا نے نانا فر نويس کے لشکر کے ساتھ جانے کا اعلان کیا تو ترک راؤ کو اس سے اور زیادہ نفرت ہو گئی۔

اس کا خیال تھا کہ وزیر کا کام صرف ملکی انتظام تک محدود تھا۔ اسے فوجی معاملات میں نہ تو خود

جواب دیا تھا:

”میں ان کی ابتدائی تیاریاں دیکھ کر ہی سرنگا پٹم روانہ ہو گیا تھا۔ میرے دوسرے ساتھی مزید خبروں کے کہ آپ کے حضور حاضر ہوتے رہیں گے۔“

نواب حیدر علی کے لیے اتنی ہی جبر کافی تھی۔ انہوں نے جاسوس کو واپس پونا بھیج دیا اور اپنی تیاریوں میں لگ گئے۔

ادھر پونا سے حیدر علی خاں کے پاس مرہٹہ فوج کے بارے میں روزانہ کوئی نہ کوئی اطلاع پہنچتی تھی۔ انہیں چند ہی روز بعد یہ معلوم ہو گیا کہ مرہٹوں کی یہ تمام تیاریاں دراصل میسور کے خلاف ہیں اور ان کا پیشوا برہنہ نسیس مرہٹہ لشکر کے ساتھ میسور کو (حاکم بدھن) صفحہ ہستی سے مٹانے کے ارادے سے آ رہا ہے۔

نواب بہادر نے بھی اپنی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ اس وقت انہیں اپنے قریبی حلیہ یعنی انگریزوں سے مدد لینے کا خیال آیا۔ نواب نے ایک سفیر کے ذریعے فوراً مدراس کے گورنر کو اطلاع دی کہ ان پر مرہٹہ لشکر حملہ آور ہونے کو ہے اسی لیے انہیں فوجی مدد بھیجی جائے۔

معاہدہ مدراس کی ایک شقی یہ بھی تھی کہ میسور پر حملہ کی صورت میں انگریز اپنی سات فوجیں کمپنیوں سے نواب بہادر کی مدد کریں گے۔ مگر جب نواب کا سفیر مدراس پہنچا اور اس نے انگریز گورنر سے فوجی کمک کی درخواست کی تو گورنر نے منہ بنا کے جواب دیا:

”ہم اپنے دوست اور حلیف نواب حیدر علی خاں کی مدد کے لیے ہر وقت تیار ہیں لیکن کمپنی کے حالات بنگال میں بہت زیادہ خراب ہیں اور ہم نے اپنی فوج کا بیشتر حصہ وہاں بھیج دیا ہے۔ ہم اسی وقت بہت مجبور ہیں۔ ہمارے حالات جیسے ہی درست ہوں گے ہم نواب بہادر کی ضرورت دیکھیں گے۔“

یہ ایک کھلا ہوا جھوٹا اور ہانا تھا۔

۱۷۵۷ء میں انگریز نواب سراج الدولہ کو فریب کاری سے شکست دے کر بنگال پر قابض ہو چکے تھے اور انہیں بنگال کی طرف سے کوئی پریشانی نہ تھی۔ مدراس کے گورنر کو بھی اسی بات کی خبر مل چکی تھی کہ مرہٹہ پیشوا میسور پر ایک زبردست حملہ کرنے والا ہے۔ وہ اسی خبر سے بہت خوش تھا پھر معاہدہ مدراس تو انگریزوں نے نواب کو ٹالنے کے لیے کیا تھا۔ اسی پر علی کرنے کا نہ ان کا کوئی ارادہ تھا اور نہ انہوں نے آئندہ کبھی اس پر علی کیا۔

نواب بہادر نے انگریز گورنر کے اس جواب پر کسی خاص رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ وہ انگریزوں کی بددیانتی اور دغا بازی کو خوب سمجھتے تھے۔ انہوں نے بھی انگریزوں کا منہ بھرنے کے لیے ان سے مدد مانگی تھی اسی لیے انہیں اس جواب سے مایوسی نہیں ہوئی۔

مرہٹہ لشکر پونا سے روانہ ہوا تو واقعی ایک سیلاب کے مانند تھا۔ اس لشکر میں ایک لاکھ سوار، پچاس ہزار بندوچی، ساٹھ ہزار پیادے اور پندرہ لاکھ لشکر اس کے علاوہ تھا۔ پندرہ سو جنوری ہند کے وہ کرانے کے فوجی تھے جو ہر لشکر کے ساتھ لوٹ مار کے لیے شامل ہو جایا کرتے تھے۔

مرہٹوں کے اس لشکر کے ساتھ ایک بڑا توپ خانہ بھی تھا جس میں ایک سو کے قریب بڑی چھوٹی توپیں تھیں۔

اس موقع پر ملک وملت کے ننداروں اور مفاد پرستوں نے بھی اپنا رنگ دکھایا۔ شائزہ کے نواب عبدالعظیم خاں نے فوراً مرہٹوں سے اپنی ونداداری کا اعلان کیا اور اپنی فوجیں لے کر مرہٹہ لشکر میں شامل ہو گیا۔

یہی علی جتندرگ کے راجہ نے بھی کیا۔

حالانکہ نواب حیدر علی خاں نے ان دونوں کے ساتھ دوستانہ رویہ اختیار کیا تھا مگر مصائب کے ان ایام میں انہوں نے نواب کی مدد کرنے کے بجائے اسی کے خلاف صف آرائی میں حصہ لیا۔

مرہٹہ لشکر کے ساتھ جو ٹکڑا پونا کا پیشوا، اس کا وزیر اعظم ناما فرخزاد اور سپہ سالار ترک راؤ بھی تھے اسی لیے مرہٹے بہت خوش تھے۔ ان کا جوش قابل دید تھا اور ان کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ نواب کے مخالفین دلوں میں خوش ہو رہے تھے کہ اس مرتبہ سلطنت میسور کا خاتمہ ہو کے رہے گا۔

مرہٹہ لشکر آندھی اور طوفان کی طرح دریائے تنگ بھدرا تک پہنچا۔ پیشوا اور راؤ کا خیال تھا کہ شاید حیدر علی خاں اسے دریا عبور کرنے سے روکنے کے لیے دریا کے دوسرے کنارے پر موجود ہوں گے لیکن حیدر علی خاں نے اس قسم کی کوئی کوشش نہ کی۔

مرہٹہ لشکر نے بغیر کسی مداخلت کے دریائے تنگ بھدرا کو عبور کیا اور مرز بین میسور پر پہنچ کے اپنے تین فوجی کیمپ قائم کیے۔ یہ کیمپ چردلی، نوزلی اور چرائی کے مقامات پر قائم

کیے گئے تھے۔ اس طرح مرہٹہ لشکر کا پھیلاؤ کئی کوس تک ہو گیا تھا۔

نواب حیدر علی خاں نے بھی اپنی کوشش سے ایک بڑا لشکر اکٹھا کر لیا تھا مگر مٹوں کے قریب باڑھاٹی لاکھ لشکر کے مقابلے میں ان کے لشکر کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی سوائے اس کے کہ ان کا لشکر نہایت تجربہ کار اور وفادار تھا۔

پانچ دن تک دونوں لشکر ایک دوسرے کے سامنے پڑاؤ ڈالے پڑے رہے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کی طاقت کا صحیح اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔

پھر چھ دن جنگ کا آغاز ہوا۔

مادھوراؤ نے اپنے توپ خانے سے کام لیا اور حیدر علی خاں کے لشکر پر اس قدر گولے برسائے کہ قیامت کا سماں پیدا ہو گیا۔

گولوں کے پھٹنے سے زمین پر زلزلہ ماسا گیا۔ حیدر علی خاں کے پاس بھی توپ خانہ تھا مگر وہ اسے ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔

دونوں گھنٹوں کی جنگ میں نواب کے لشکر کو زبردست نقصان اٹھانا پڑا اور ان کی فوج بری طرح شکست کھا گئی مگر حیدر علی نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ فرائی میدان جنگ سے ہٹ کر ایک کین گاہ میں داخل ہو گئے تاکہ رات ہونے پر مادھوراؤ کے توپ خانے پر شب خون مار کر اسے بیکار کر دیں۔

حیدر علی کی یہ کین گاہ ایک جنگلی میں تھی مگر وہ ابھی فوج کو شب خون کے لیے تیار بھی نہ کر پائے تھے کہ سویرا ہو گیا۔

صبح ہوتے ہی مرہٹوں نے دوسری طرف سے حملہ کر دیا۔ اس مشکل وقت میں سوائے فرار کے اور کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا تھا۔ آخر انہوں نے توپ خانہ کو جو ای گولہ باری کا حکم دیا تاکہ اس کی آڑ میں کسی بھی طرف کو نکل جائیں مگر مرہٹوں نے ان کی فوج کو کاٹ کے رکھ دیا اور یہ بھی ایک بد نصیبی ہوئی کہ توپ خانہ کی توپیں بھی نہ چل سکیں۔

نواب حیدر علی ایک درخت کے نیچے کھڑے اپنی شکست کو دیکھ رہے تھے مگر وہ اب بھی ناامید نہ تھے اور خدا سے اپنی نصرت کی دعا مانگ رہے تھے۔

ٹھیک اسی وقت طنپور چپوں کا ایک گروہ اوھڑا نکلا۔ نواب کے لیے یہ تائید غیبی تھی۔ انہوں نے فوراً طنپور چپوں کو زور زور سے طنپور سے بھانے کا حکم دیا۔

جب ایک ساتھ ایک درجن سے زیادہ طنپوروں کا پوری آواز کے ساتھ شور بلند ہوا تو مرہٹوں میں تسک بچ گیا۔

مادھوراؤ نے گھبرا کر اپنے وزیر سے دریافت کیا:

”کیوں فرخو نہیں۔ یہ فوجی باجوں کی آواز کس سمت سے آرہی ہے؟“

فرخو نے ابھی کوئی جواب نہ دیا تھا کہ ترک راؤ چمک کے بولا:

”ہیشوا بہار۔ معلوم ہوتا ہے کہ حیدر علی کو کہیں سے تھوڑی بہت فوجی مدد ملی ہے اسی لیے وہ زور زور سے بھاگے۔ بجا کہ ہم پر رعب ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے مگر آپ اطمینان رکھیے میں ابھی اسے تباہ کر کے رکھ دوں گا۔“

مادھوراؤ کا ماتھا ایک دم گھوم گیا۔ وہ چیخ کے بولا:

”ترک راؤ! تم پیچھے ہٹ جاؤ۔ لشکر کی کمان میرے ہاتھ میں ہے۔ فیصلہ کرنے کا اختیار مجھے ہے۔ تم دخل دینے والے کون ہوتے ہو؟“

ترک راؤ دل ہی دل میں تیج و تاب کھا کر رہ گیا۔

چند لمحوں بعد ہیشوا نے فرخو سے اپنا سوال دہرایا:

”فرخو نہیں۔ تم نے بتایا نہیں ان فوجی باجوں کے بچنے کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟“

فرخو نے بڑا ذہین اور شاطر تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ ہیشوا طنپوروں کی آواز سن کے گھبرا گیا ہے اور لڑائی روکنے کے لیے کوئی بامعنا تلاش کر رہا ہے۔ اس لیے اس نے وقت کی مناسبت سے جواب دیتے ہوئے کہا:

”ہیشوا! اعظم۔ طنپوروں کے شور و غل سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حیدر علی کو فوجی کمک پہنچ گئی ہے اور وہ طنپور سے بجوا کر اپنی بھائی فوج کو اکٹھا کر رہا ہے تاکہ جوابی حملہ کر سکے۔“

”تم نے ٹھیک کہا فرخو نہیں۔“

ہیشوا نے فوراً اس کی تائید کی:

”میں صحیح صورت حال معلوم ہونے سے پہلے لشکر کو کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔“

اس کے ساتھ ہی ہیشوا نے جنگ کو قوی کر کے لشکر کو پیچھے ہٹانے کا حکم دے دیا۔

اور نواب پر سے ایک زبردست خطرہ اس تائید غیبی کی وجہ سے ٹل گیا۔

مادھوراؤ کے پیچھے ہٹنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس نے اگرچہ حیدر علی کو وقتی شکست دے

دی تھا مگر حیدر علی کے لشکر نے شکست کھاتے کھاتے بھی مرہٹوں کا اس قدر جانی نقصان کیا تھا کہ وہ گھبرا گیا تھا اور اس نے اس وقت تیغیے پہنا ہی مناسب سمجھا تھا۔

پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اسی شام نواب بہادر کا نائب بیت جنگ ایک تازہ دم لشکر لے کر مدد کو پہنچ گیا مگر نواب بہادر نے جوابی حملے کا سطرہ مول لینے کے بجائے اپنے لشکر کو بھی پیچھے ہٹنے کا حکم دے دیا۔

مشہور ہے کہ سلطان ٹپو نے اس جنگ میں جو افرادی اور شجاعت کے کچھ ایسے جوہر دکھائے کہ حیدر علی خاں نے اسے بار بار اپنے سینے سے لگایا تاہم شجاعت اور بہادری کے ان کارناموں کے ساتھ ساتھ شہزادے کو ایک ناگوار فرض بھی انجام دینا پڑا۔

حیدر علی خاں نے لشکر کو منگلور کی سمت ہٹنے کا حکم دیا اور اس کے ساتھ ہی شہزادے کو یہ حکم ہوا کہ وہ منگلور تک کے پورے علاقے کو اس قدر دیران کر دے کہ مرہٹوں کو وہاں سے رسد قطعی حاصل نہ ہو سکے۔

شہزادے نے اس حکم کی تعمیل کی اور اپنے ہی علاقے کو اپنے ہاتھوں سے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔

اس دور کی جنگوں میں یہ دستور تھا کہ دشمن کی رسد کو تباہ کر دیا جائے تاکہ وہ آگے قدم نہ بڑھا سکے۔ چنانچہ اب مرہٹے اس راستے سے گزرے تو انہیں آبادیاں ویران اور کنوؤں میں زہر گھلا ہوا ملا۔

بنگلور پہنچنے کے نواب بہادر نے اپنے وکیل کے ذریعے مادھورائ کو صلح کا بیانیہ بھیجا مگر اس نے ایک کردڑی رقم طلب کرنے کے علاوہ بعض بہت سخت شرطیں پیش کیں۔ نواب بہادر نے اس قسم کی ذلیل صلح پر جنگ کو ترجیح دیا اور پھر جنگ کے لیے تیار ہوئے۔

اب مرہٹہ لشکر دریائے تنگ بھدر کے دامن سے نکل کر سرنگا پٹم کی طرف بڑھا۔ مرہٹوں نے کئی شہنشاہی اور مشرقی اضلاع بغیر کسی مدافعت کے فتح کر لیے۔ اس وقت نواب بنگلور میں تھے اور مرہٹوں کے اور آگے بڑھانے کے انظار میں تھے۔

مادھورائ اس سبیل رداں کے ساتھ بنگلور سے تیس میل کے فاصلے پر آ کر ٹھہر گیا۔

یہاں بنگل کے مقام پر نواب بہادر کا ایک مضبوط قلعہ تھا اور وہ بغیر یہ قلعہ فتح کیے آگے نہ بڑھتے چاہتا تھا۔

مادھورائ نے قلعہ بنگل کا محاصرہ کر لیا مگر اس کا لشکر خود تین طرف سے محاصرے میں آ گیا۔ مرہٹوں کے لیے ایک محاصرہ یہ تھا کہ اطراف کا تمام علاقہ نواب کے حکم سے ویران کر دیا گیا تھا اس لیے اس کے لشکر میں رسد کی سخت کمی واقع ہو گئی تھی۔

دوسرا محاصرہ یہ تھا کہ نواب بہادر اپنے لشکر کے شب خون مارنے والے دستوں کے ساتھ بنگلور سے بنگل کے قریب ایک پاڑی کے پیچھے آگے چھپ گئے تھے اور ہرات مرہٹہ لشکر پر شب خون مار کے سینکڑوں مرہٹوں کو خاک و خون میں مبتلا دیتے تھے۔

تیسرا اور سب سے اہم مورچہ قلعہ بنگل کا تھا۔ قلعہ سے اتنی شدید مدافعت ہو رہی تھی کہ مرہٹوں کے دو لاکھ کے لشکر سے کچھ مٹائے نہ بن رہا تھا۔ اور مادھورائ قلعہ پر قبضہ کرنے سے قاصر رہا تھا۔

اس دوران نواب بہادر پر قدرت نے ایک اور ہیرا فانی کی اور وہ یہ کہ جنوبی ہند میں بارش کا موسم شروع ہو گیا۔

مادھورائ پیشوا بارش کے دنوں میں بیمار ہو جایا کرتا تھا۔ پس بارش شروع ہوتے ہی وہ بیماری کے حملے میں جکڑ گیا اور سخت پریشان ہو گیا۔

مادھورائ کی بیماری کی خبر ناٹا فر نوئس کو تھا اور نہ ترک راڈ کو۔ سپہ سالار ترک راڈ کو وہ بتانا بھی نہ چاہتا تھا اس لیے اس نے فر نوئس سے مشورہ کیا:

”فر نوئس۔ تم میرے اعتماد کے آدمی ہو اس لیے میں تمہیں ایک راز سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے فر نوئس کو اپنے خیال میں بلا کر راز دارانہ لہجے میں کہا۔

ناٹا فر نوئس نے بڑی مسرت سے جواب دیا:

”میرا میری خوش نصیبی ہے کہ پیشوا مجھ پر اعتماد کرتے ہیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا راز میرے ساتھ قبر میں جائے گا۔“

”ہمیں تم سے ایسی ہی امید ہے فر نوئس۔“

مادھورائ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

”دراصل میں ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہوں کہ ہر رات کے موسم میں اس بیماری میں چل گیا“

اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہاں بارشیں شروع ہو گئی ہیں اور اس کے ساتھ ہی ہماری طبیعت روز بروز بگڑتی جا رہی ہے۔

وزیر نانا فر نو بیس نے مشورہ دیا:

”بیشوائے اعظم جان ہے تو جہاں ہے۔ آپ فوراً پونا تشریف لے جائیے۔ بیماری اور پھر پردیس میں اس سے تو ایسا تو رہی بچائے۔ مرض کا بڑھانا کسی طرح مناسب نہیں۔ میں ابھی آپ کی واپسی کا انتظام کرتا ہوں۔“

مادھو راؤ نے مضطرب آواز میں کہا:

”میں واپس تو جیلا جاؤں مگر یہاں کا کیا بنے گا۔ مجھے ترک راؤ پر کوئی اعتبار نہیں۔ کہیں وہ مرہٹوں کے اتنے بڑے لشکر کو کھڑا کر نہ رکھ دے۔“

”بیشوائے محترم۔ میں کہہ چکا ہوں کہ جان تر جہاں۔“

نانا فر نو بیس نے اپنی بات دہرائی:

”آپ مرہٹہ لشکر کو اپنی جان پر سبوں کی ترجیح دے رہے ہیں۔ آپ اس وقت صرف اپنی جان کی فکر کیجیے۔“

”مگر تم کیا کرو گے فر نو بیس؟ مادھو راؤ نے دریافت کیا:

”تمہاری اور ترک راؤ کی نہ کبھی جی ہوتی ہے اور نہ بنے گی۔“

”محترم بیشوا۔“ نانا فر نو بیس مسکرایا:

”میں لشکر کے ساتھ نہیں آپ کے ساتھ آیا تھا اور آپ کے ساتھ ہی پونا واپس جاؤں گا میں تو ترک راؤ کی صورت دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔“

آخر مادھو راؤ اپنے تمام اختیارات ترک راؤ کے سپرد کر کے پونا روانہ ہو گیا۔ اس کا وزیر نانا فر نو بیس بھی اس کے ساتھ ہی واپس چلا گیا۔

اب تو ترک راؤ کی بنائی۔ اتنا بڑا لشکر اس کے زیرِ کمان تھا اور وہ پوری طرح سیاہ و سفید کا ملک تھا۔

منش مشورہ رہے کہ پانچوں انگلیاں لگی ہیں اور مگر کڑا ہی ہیں۔ یہی حال اس وقت ترک راؤ کا تھا۔

مادھو راؤ بیشوا کے واپس جانے کے بعد ترک راؤ نے دو کام کیے۔ پہلا تو یہ کہ اس نے

فوجوں کی از سر نو ترتیب کے لیے تھوڑی سی پسپائی اختیار کی۔ اور اپنی ملک کے لیے رتن گری، میراج، ونکٹ گری، زنگی، کالستری اور گتھی کے راجاؤں کو طلب کیا۔ ان راجاؤں میں گتھی کا راجہ مراری اللہ سب سے زیادہ طاقتور اور قابلِ اعتماد تھا۔

دوسرا کام جو ترک راؤ نے کیا اس کا نقلی اس کے دل سے تھا۔ اس نے اپنے نائب راہن کو بلوایا۔ اور کہا:

”راہن۔ تمہیں اسی وقت بلانا ہے۔“

راہن کو لی نے بڑی حیرت سے ترک راؤ کو دیکھا مگر کوئی سوال کرنے کے بجائے انہماک

اطاعت کے طور پر کہا:

”سپہ سالار کے حکم کی فوراً تعمیل ہوگی۔ مجھے روانگی کی اجازت دیا جائے۔“

ترک راؤ مسکرایا اور بولا:

”راہن۔ تمہاری وفاداری اور اطاعت کا یہی انداز مجھے بہت پسند ہے۔ میں نے تمہیں حکم دیا کہ پونا جانا ہے اور تم نے بغیر یہ پوچھ ہوئے کہ وہاں جا کر کیا کرنا ہے فوراً اپنی رہنمائی کی ظاہر کر دی اور جانے کی اجازت مانگی۔“

راہن کو لی ایک گھٹے ہوئے بدن کا معقول شکل و صورت والا جوان تھا۔ ترک راؤ اس پر ہمیشہ سے اعتبار کرتا تھا اور اپنے اہم معاملات اسی کے سپرد کیا کرتا تھا۔ راہن نے اس کے اعتماد کو کبھی غیس نہیں پہنچائی تھی۔

راہن نے سر جھکا کر جواب دیا:

”سپہ سالار اعظم۔ آپ میرے آقا ہیں۔ آقا کا کام حکم دینا اور غلام کا کام حکم کی تعمیل کرنا ہے۔

اس کا یہ کام ہرگز نہیں کہ کام کی نوعیت، وجہ اور جواز کے بارے میں کوئی بحث کرے۔

میں نے آپ سے روانگی کی اجازت مانگی ہے۔ آپ اجازت دیتے وقت کچھ ہدایات ضرور دیں گے بس ان ہدایات پر عمل کرنا میرا فرض ہو گا۔“

”شک ہے راہن۔ ہمیں تم جیسے عقلمند اور قابلِ اعتماد لوگوں کی ہی ضرورت ہے یہ کہہ کر ترک راؤ کچھ سوچنے لگا۔

راہن کو لی سر جھکا کر کھڑا تھا۔ اس نے بولنے کی قطعی کوشش نہ کی۔ آخر چند لمحوں بعد ترک

راؤ نے اسے مخاطب کیا:

اس لیے وہ رچنا کو لے کر سیدھا سپہ سالار ترک راڈ کے نیچے پرہینا۔ اس طرح رچنا خاک سے اٹھ کے محل میں پہنچ گئی تھی۔

راوہن کو لی کہ اگرچہ ترک راڈ نے ایک معمولی سپاہی سے مردار بنادیا تھا لیکن وہ چھوٹی طبیعت کا آدمی تھا اس لیے مردار ہونے کے بعد اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جب تقدیر اسے مردار بنا سکتی ہے تو وہ سپہ سالار بھی بن سکتا ہے۔

اس فاسد خیال نے اسی کے دل میں کچھ ایسا گھر کیا کہ ایک شب اس نے ترک راڈ کو قتل کر کے خود سپہ سالار بننے کا قصد بھی کر لیا مگر عین موقع پر وہ گھرا گیا اور اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔

اب۔

ترک راڈ نے اسے اپنا فاسد خیال بھیا تو ایک بار پھر اس کے دماغ میں وہی فاسد خیال پیدا ہوا مگر کم عقل اور نا تجربہ کار ہونے کی وجہ سے وہ صرف یہ سوچ سکا کہ اگر وہ راڈ کو یہ خبر پہنچا دے کہ مرہٹہ سپہ سالار ترک راڈ نے اسے اپنی عجوبہ رچنا کو لانے کے لیے بھیجا ہے تو شاید پیشوا خوش ہو کر اسے ترک راڈ کا جگہ سپہ سالار بنا دے۔

پونا پہنچتے پہنچتے راوہن کو لی کو اس بات کا پورا یقین ہو گیا کہ وہ جیسے ہی پیشوا کو یہ بتائے گا کہ سپہ سالار ترک راڈ نے اپنی عجوبہ رچنا کو محاذ جنگ پر بلایا ہے تو اس کا وقت پیشوا ترک راڈ کو سپہ سالاری سے معزول کر کے اسے سپہ سالار مقرر کر دے گا۔

پس۔ پونا پہنچ کر وہ رچنا کی حویلی پر جانے کے بجائے سیدھا پیشوا کے محل پر پہنچا اور اطلاع کرائی کہ سرنگاپٹم کے محاذ سے ترک راڈ کا خاص مردار راوہن کو لی آیا ہے اور پیشوا سے فوراً ملنا چاہتا ہے۔

راوہن کو لی کو ماہور راڈ اور ناٹا فرنیس دونوں ہی اچھی طرح جانتے تھے۔ اسی وقت فرنیس پیشوا کے پاس ہی موجود تھا۔

پیشوا نے یہ سوچتے ہوئے کہ شاید راوہن میدان جنگ سے کوئی خاص پیغام یا خبر لے کر آیا ہے اسے باریابی کی اجازت دیدی، حالانکہ خود بھی اسے محاذ سے واپس آئے ابھی مشکل سے

”راوہن تم نے ہماری رچنا کو دیکھا ہے؟“

راوہن کے جسم میں جیسے بجلیاں سی کوئڈ لگیں مگر اس نے خود کو سنبھالا:

”جی ہاں میرے آقا۔ چھوٹی سپہ سالارنی کو میں نے ہی آپ کی خدمت میں پہنچایا تھا۔“

”ادہ۔ یہ تو ہم بھول ہی گئے۔“

ترک راڈ مسکرایا:

”ہاں۔ میں اسی رچنا کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ تم اپنے ساتھ اپنے اعتماد کا ایک دستہ فوج کا لے کر پونا جاؤ اور رچنا کو اپنے ساتھ لے آؤ۔“

کوشش کرنا کہ اس کی جزم سے کم لوگوں کو ہو۔ پھر بھی اگر کوئی اعتراض کرے تو کہہ دینا کہ یہ ترک راڈ کا حکم ہے اور اگر کوئی مزاحمت کرے تو تم اپنے فوجی دستے سے کام لے سکتے ہو۔ تمہیں ہر حال رچنا کو اپنے ساتھ لے کے آنا ہے۔“

”ٹھیک ہے آقا۔“

راوہن کو لی نے مرہٹہ کا دیا:

”اور اگر ماکن سپہ سالارنی آئے میں عذر کریں تو کیا حکم ہے؟“

”تم نے ٹھیک کہا ترک راڈ بولا:

”رچنا آئے سے انکار کر سکتی ہے۔ زبانی پیغام پر کوئی بھی اعتبار نہیں کرتا۔“

ترک راڈ کچھ سوچتا ہوا اپنی پگڑی سے وہ بڑا میرا اتارنے لگا جسے وہ ہر وقت پگڑی میں لگائے رکھتا تھا:

”یہ لو راوہن۔ یہ ہماری نشانی ہے۔ اب رچنا انکار نہیں کرے گی۔ مگر تم اس ہیرے کی بھی اسی طرح حفاظت کرنا جس طرح رچنا کی حفاظت کر دگے۔“

اور۔

ترک راڈ کا خاص مردار راوہن کو لی سواروں کا ایک مضبوط دستہ لے کر پونا کی طرف روانہ ہو گیا۔ راوہن ہی رچنا کو ترک راڈ کے پاس لایا تھا۔ وہ پونا کی گلیوں میں بھٹک رہی تھی کہ راوہن اسے مل گیا۔ جھٹکے لگتے ہوئے کہ اس سے التجا کی کہ وہ اسے اپنی پناہ میں لے لے مگر اس وقت راوہن کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ وہ محض ایک سپاہی تھا۔

رچنا کی موہنی صورت نے اسے بے خود سا کر دیا تھا مگر وہ کوئی خطرہ مول لینے پر تیار نہ تھا۔

ایک ہی ہفتہ گزرا تھا اور اس کی طبیعت پوری طرح سنبھلی بھی نہ تھی۔

رادھن، پیشوا کے سامنے پیش ہوا تو وزیر نانافرنولیس نے اسے دلچسپی سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا:

”رادھن۔ ہم جانتے ہیں کہ تم ہمارے سپہ سالار کے خاص آدمی ہو اس لیے تمہارا ہمارا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تم کوئی بہت اہم خبر لے کر آئے ہو۔“

نادان رادھن کوئی نے سینہ پھلا کے بڑے فخر سے جواب دیا:

”وزیر اعظم کا اندازہ بالکل صحیح ہے۔ میں واقعی یہ اہم خبر لے کر آیا ہوں کہ ہمارا مرہٹہ سپہ سالار ترکم راؤ دشمنوں سے لڑنے کے بجائے عیش و عشرت کی محفل سجانے کی کوشش کر رہا ہے۔“

نانافرنولیس پہلے ہی ترکم راؤ کے خلاف تھا۔ وہ اس بات پر چونک پڑا۔ پیشوا جو مرہٹوں کی وجہ سے مضطرب رہا تھا، اس نے بھی اس اطلاع پر بڑا سامنے بنایا اور نانافرنولیس کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اس بات کی تفصیل معلوم کرے۔

نانافرنولیس نے جب کاروائی کرتے ہوئے رادھن سے پوچھا:

”رادھن۔ تم تو ترکم راؤ کے خاص آدمی ہو۔ اس نے تمہیں سپاہی سے سروار بنایا پھر تم اس کی شکایت کیوں کر رہے ہو؟“

رادھن نے اور زیادہ تن کر کہا:

”وزیر اعظم۔ آخر میں میں ایک نمک خوار مرہٹہ سردار ہوں۔ میں یہ کیسے دیکھ سکتا ہوں کہ ہمارا سپہ سالار میدان میں حیدر علی سے جنگ کرنے کے بجائے اپنے خیمے میں عیش کی محفل سجائے۔ مجھے یہ بات سخت ناگوار گزری اس لیے میں اپنے پیشوا اور وزیر اعظم کو بتانے کے لیے آیا ہوں۔“

رادھن کی باتوں نے وزیر اعظم کو الجھا دیا۔ اس نے دوبارہ پوچھا:

”اچھا یہ بناؤ تمہیں سپہ سالار کی کونسی بات ناگوار گزری۔ کیا اس نے حیدر علی سے صلح کر لی ہے اور اب وہ میسور کی لڑائیوں کے ساتھ رنگ رلیاں منار رہا ہے؟“

رادھن گھبرا گیا پھر ذرا سنبھل کے بولا:

”یہ بات نہیں ہے وزیر اعظم۔ آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہمارا سپہ سالار جنگ کے بجائے عیش کی محفلیں سبانا چاہتا ہے اور یہ اہم خبر دینے کے لیے میں یہاں آیا ہوں۔“

نانافرنولیس اور زیادہ الجھ گیا۔ پیشوا کو بھی رادھن کی باتیں کچھ بے ربط سی معلوم ہوئیں اور اس نے ناگوار سی منہ گھمایا۔

نانافرنولیس نے ذرا تلخ لہجے میں کہا:

”تو کیا بکو اس کر رہا ہے۔ آخر تو کہنا کیا چاہتا ہے۔ تو مرہٹہ فوج کا ایک سردار ہے اور تیری جگہ مرہٹہ کا پٹنم کا محاذ ہے۔ تو محاذ چھوڑ کے ہمارے پاس کیوں آیا ہے؟ تو سپہ سالار سے اجازت لے کے آیا ہے یا دواں سے بھاگ آیا ہے۔ اور اب ہمیں سپہ سالار کے خلاف بھڑکانا چاہ رہا ہے؟“

رادھن کوئی سے جو ایک دم اتنے بہت سے سوالات کیے گئے تو اس کی عقل ٹھکانے آگئی اور سپہ سالار بننے کا سارا اٹھ اتر گیا۔ اس نے گھجکھا کے کہا:

”میں محاذ سے بھاگ کے نہیں آیا بلکہ سپہ سالار نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔“

اب پیشوا بھی چونک پڑا۔ اس نے رخ بدلتے ہوئے خود سوال کیا:

”بہی تو تجھ سے پوچھا جا رہا ہے کہ ترکم راؤ نے تجھے پونا کیوں بھیجا ہے؟“

رادھن ڈر گیا تھا۔ اس نے سمجھتے ہوئے لہجے میں کہا:

”اُن داتا۔ ترکم راؤ سپہ سالار نے مجھے پونا سے رجنا کو لے آنے کا حکم دیا ہے اور میں صرف اسی کام کے لیے آیا ہوں۔“

”ماں دھو راؤ اور نانافرنولیس دونوں ترکم راؤ کے اور چٹا کے معاملات سے پوری طرح آگاہ تھے اس لیے دونوں کو رادھن کی بات پر ہنسی آگئی۔

پیشوا نے مسکراتے ہوئے کہا:

”اُسے عقل کے دشمن! جب تجھے رجنا کو لینے بھیجا گیا تھا تو پھر تو ہمارے پاس کیا لینے آیا؟“

رادھن نے پھر بے عقلی کی بات کی:

”اُن داتا۔ میرا خیال تھا کہ یہ خبر بہت اہم ہے۔ اور آپ سے سن کر بہت خوش ہوں گے اور آپ۔“

مگر رادھن بات پوری نہ کر سکا اور گھبرا کر خاموش ہو گیا۔

وزیر اعظم غصہ سے کھڑا ہو گیا:

را دھن پہلے ہی پریشان تھا۔ رچنہ کے سوال پر اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ جواب دینے کے بجائے وہ ٹکڑے ٹکڑے کر رہا تھا۔
 رچنہ کو جانے کیا سوچا کہ اس نے را دھن کا ہاتھ پکڑ کر اپنی مہری پر بٹھایا۔ اسی وقت رچنہ کی ایک ملازمہ اچانک اندر آ گئی۔
 رچنہ نے اس کے آنے کی کوئی پروا نہ کی اور اسے حکم دیا:
 ”باہر کا خیال رکھو اور ہاں کچھ کھانے پینے کا انتظام کرو۔“
 خادمہ مسکراتی ہوئی سر جھٹک کر واپس چلی گئی۔ پھر ذرا دیر بعد را دھن کے سامنے شراب اور پیالے رکھے تھے۔ کھانے کے لیے ٹکین چیزیں بھی تھیں۔
 ”میں تمہیں لینے آیا ہوں رچنہ۔“ را دھن نے جیسے خواب سے چونک کے کہا۔
 رچنہ نے لگاؤ سے کہا:

”را دھن۔ میں نے تمہارے ساتھ چلنے سے نہ پہلے انکار کیا تھا اور نہ اب انکار کر دوں گی مگر یہ تو بتاؤ کہ تم مجھے کہاں لے جاؤ گے۔ تمہیں ترک راڈ کا کوئی خوف نہیں؟“
 اس وقت تک رچنہ کے ہاتھ سے بھرے ہوئے شراب کے دو پیالے را دھن کے حلق سے اتر چکے تھے۔ خود رچنہ نے بھی ایک پیالہ چڑھایا تھا اور اس کی آنکھوں میں سرخ ڈور سے چمک اٹھتے تھے۔
 را دھن نے ترک میں جواب دیا:
 ”میں نے پہلے بھی تمہیں ترک راڈ کے حوالے کیا تھا اور اب بھی میں تمہیں ترک راڈ کے پاس ہی لے جاؤں گا۔ اس نے تمہیں بلایا ہے۔“

یہ کہتے ہوئے را دھن نے ترک راڈ کا دیا ہوا میرا چنکے سامنے کر دیا۔
 ”مجھے یقین آ گیا کہ ترک راڈ ہی نے تمہیں بھیجا ہے لیکن ایک ہفتہ تک میں نہیں جاؤں گی۔“
 رچنہ نے سرشاری کے عالم میں کہا۔
 ”کیوں نہیں جاؤ گی؟“

را دھن کے ہاتھ میں شراب سے بھرا تیسرا پیالہ تھا:
 ”بیشک کہتا ہے کہ ترک راڈ کے پاس دو لاکھ کا لشکر ہے۔ وہ پونا کا تخت بھی الٹ سکتا ہے۔ تم جانے سے انکار کر دو گی تو وہ تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔“
 ”کچھ بھی ہو جائے میں ایک ہفتہ سے پہلے نہیں جاؤں گی اور یہ پورا ہفتہ تم اس غل میں

”تو آدمی ہے کہ گدھا۔ تجھے یہ نہیں معلوم کہ تو پیشوا کے دربار میں کھڑا ہے۔ تو پوری بات کیوں نہیں کرتا یہ اور اور کی کیا رٹ لگا رکھی ہے؟“
 را دھن کی توجان ہی نکل گئی۔ اس نے روٹاٹے انداز میں کہا:
 ”ماہمتری جی۔ میں نے سوچا تھا کہ آپ خوش ہو کر مجھے انعام دیں گے۔“ آخر را دھن نے اصل بات اُگل دی۔

اس پر بیمار پیشوا کو ہنسی آ گئی۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا:
 ”تو واقعی بے وقوف ہے۔ تو مرہٹہ لشکر کے سپہ سالار کی طاقت سے واقف نہیں ہے۔ اس کے زیرِ کان دو لاکھ کا لشکر ہے۔ وہ تو پونا کی سلطنت کا تختہ الٹ سکتا ہے۔ ایک چنکیا، اگر ترک راڈ ایک ہزار چنکیاں بھی اپنے ساتھ رکھے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ آخر وہ مرد ہے اور مردوں کو عورتیں رکھنے کا حق ہوتا ہے۔“
 چل نکل جا ہاں سے۔ اور جردار۔ ترک راڈ سے اس بات کا ذکر نہ کرنا کہ تمہارے پاس آیا تھا۔“

را دھن کو لیپ چاپ دربار سے واپس آ گیا۔ وہ تو ڈر رہا تھا کہ کہیں پیشوا اسے قتل ہی نہ کر دے مگر لطف کی بات یہ کہ اسے اپنی غلطی کا ذرا بھی احساس نہ ہوا بلکہ وہ یہی سوچتا رہا کہ پیشوا اور وزیر کیسے بے وقوف لوگ ہیں کہ اپنے سپہ سالار کی حرکتوں پر ناراض ہونے کے بجائے صرف ہنس دیتے ہیں۔

دربار سے وہ سیدھا رچنہ کی غل نما حویلی پر پہنچا۔ رچنہ اسے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر حیران بھی ہوئی اور خوش بھی۔

حیران اس وجہ سے کہ را دھن کے آنے کی اسے کوئی امید ہی نہ تھی اور خوش اس لیے کہ رچنہ نے اپنے بڑے دونوں میں را دھن سے پناہ مانگی تھی مگر وہ بزدل اس کو مل کئی کو اپنے پیلوں میں جگہ دینے کے بجائے ادھیڑ ترک راڈ کے حوالے کر کے اٹک ہو گیا تھا۔
 رچنہ نے ہنستے ہوئے اس کا استقبال کیا:
 ”را دھن۔ تم اچانک کیسے آ گئے ریخت تو ہے؟“

میرے ساتھ رہو گے۔
پھر۔

رچنا اور رادھن کو لیو نہی آمنے سامنے بیٹھے دیر تک شراب پیتے رہے۔ رچنا پہ نہیں کب کی
بھوکی اور پیاسی تھی کہ وہ شراب پیتے پیتے مدھوش ہو کے رادھن کی آغوش میں گر گئی۔
عمل کی خادماؤں نے سولے ایک کے تمام ٹھیس لگ کر دیں۔

ادھر رچنا اور رادھن رنگ ریاں منارہے تھے۔ ادھر ان کی تھاکے بٹو دیگیوں کی تفصیلی
اطلاعات پونا کے پیشوا اور وزیر اعظم کو پہنائی جا رہی تھیں مگر تعجب کی بات یہ تھی کہ نہ تو وزیر اعظم
نے پیشوا کو ان دونوں کے خلاف قدم اٹھانے کا مشورہ دیا اور نہ خود پیشوا ہی نے باجبر ہونے کے
باوجود اپنے طور پر کوئی حکم دیا۔
اس سے دو باتوں کا اظہار ہوتا ہے:

ایک تو یہ کہ شاید پونا میں ہر امیر یا سردار عورتوں کو ناجائز طور پر اپنے ساتھ رکھتا تھا اور اسے
کوئی عیب نہیں سمجھتا تھا۔
دوسرے یہ کہ پیشوا اور وزیر اعظم کو غالباً یہ خطرہ تھا کہ اگر انہوں نے سپہ سالار ترک راؤ کی
داشتہ کو گرفتار کر کے سزا دی تو کمین ترک راؤ پونا کے خلاف فوج کشی نہ کر دے۔

پھر بھی مادھو راؤ پیشوا نے اپنے سپہ سالار کو ایک بہت مشفقانہ خط روانہ کر دیا جس میں
اس کے کارناموں کی تعریف کی گئی اور آخر میں وہ بے لفظوں میں اسے یہ خبر دی گئی کہ رادھن اور رچنا
ایک ہی سولی میں، ایک ہی کمرے میں جو بیٹھ گھسٹے ایک ساتھ رہتے ہیں اور یہ کہ شاید رادھن
ایک ہفتہ بعد رچنا کو لے کر مرنگا پٹم روانہ ہوگا۔ اگر ترک راؤ مناسب سمجھے تو اس سلسلہ میں رادھن اور
رچنا سے پوچھ گچھ کر سکتا ہے۔

پیشوا نے اس خط کے بھیجنے کے علاوہ اور کسی قسم کی مادی کاروائی کرنے کی ضرورت محسوس
نہ کی کیونکہ فارسی کے محاورہ میں ہمہ خانہ آفتاب است کے معنی (جس کے لیے اردو کا یہ
محاورہ زیادہ موزوں ہے کہ "اس جام میں سب شنگے ہیں") کیا پیشوا اور کیا وزیر اعظم سب کے سب
اسی طرح کی عیش پرستی میں مبتلا تھے۔ پھر وہ دوسروں کی برائیوں پر کیوں کان دھرتے!

ایک ہفتہ بعد رچنا کو محسوس ہوا کہ اب عشرت کی رات گزر چکی ہے اور فرقت کا دن آن پہنچا ہے
اس نے فوراً رادھن کو لیو نہی آگے بڑھ کر گشس سے بیدار کیا اور دونوں جلدی جلدی تیار ہو کر
سرنگا پٹم روانہ ہو گئے۔

رادھن کو لیو نہی عیش کے دن کہاں گزارے تھے۔ چنانچہ جب رچنا نے اسے بتایا کہ
پونا میں زیادہ دن ٹھہرنا مناسب نہیں تو اس نے سخت مخالفت کی اور مزید ایک ہفتہ پونا میں ہی
گزارنے کی ہنڈی لگ کر رچنا نے اسے سختی سے جھڑک دیا اور ان خطرات سے آگاہ کیا جن کے پیش
آنے کے امکانات تھے۔

رادھن کو لیو اور رچنا جس دن ترک راؤ کے پاس پہنچے اس سے دو دن پیشتر ترک راؤ کو
پیشوا کا وہ خط مل گیا تھا جس میں رادھن اور رچنا کا کچا چٹا لکھا تھا۔
ترک راؤ زخمی شیر کی طرح غصہ میں بھرا بیٹھا تھا کہ اسے رادھن کو لیو اور رچنا کے آنے کی
اطلاع دی گئی۔

ترک راؤ نے حکم دیا:
"رچنا کو ایک انگ خیمے میں رکھا جائے اور اس پر پہرہ لگا دیا جائے اور رادھن کو گرفتار
کر کے میرے سامنے پیش کیا جائے۔"
چنانچہ رچنا خیمے میں قید کر دی گئی اور رادھن کو گرفتار کر کے ترک راؤ کے سامنے پیش
کیا گیا۔

ترک راؤ نے رادھن کو دیکھتے ہی تلوار کھینچی۔ رادھن کے پورے جسم پر لرزہ طاری ہو
گیا۔ رادھن کو گرفتار کر کے لانے والے سپاہی کے خیمے سے باہر جانے کے بعد ترک راؤ
نے تلوار کی نوک رادھن کے سینے پر رکھ دی۔

"رادھن تو سچ بولے گا تو شاید تیری سزا کم ہو جائے!"

رادھن نے ماتھ جوڑ دیے:

"ٹانک۔ میں سچ بولوں گا۔"

ترک راؤ نے لڑک لڑک کر کہا: "تو پھر بتا۔ کیا تو ایک ہفتہ تک رچنا کے ساتھ ایک ہی

اپنے اس منصوبے پر عمل کرتے ہوئے ایک شب حیدر علی اپنے توپ خانے کے ساتھ جنگل سے مرنگاپٹیم کی طرف روانہ ہوئے مگر بد قسمتی سے ان کی ایک توپ چل گئی جس سے ترک رادھ کو ان کے فرار کا علم ہو گیا اور اس نے ایک زبردست فوج حیدر علی خاں کے تعاقب میں روانہ کر دی۔

حیدر علی پر پیچھے سے آنے والی مرہٹہ فوج نے زبردست حملہ کر دیا مگر وہ ٹھہرنے کے بجائے آگے ہی بڑھتے گئے۔

جب وہ موقی تالاب پر پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ آگے راستہ بند ہے اور مرہٹہ توپ خانہ آٹھ توپوں کے ساتھ تالاب پر گولہ باری کے لیے موجود ہے۔ اس موقع پر حیدر علی نے ایک انتہائی خطرناک مگر جرأت مندانہ قدم اٹھایا۔

حیدر علی خاں نے حکم دیا کہ موقی تالاب پر قبضہ کرنے والے مرہٹہ توپ خانے پر حملہ کر دیا جائے۔ انہوں نے من حکم ہی نہیں دیا بلکہ وہ خود ایک منتخب دستہ لے کر مرہٹہ توپ خانے پر حملہ آور ہو گئے۔

یہ حملہ اس قدر غیر متوقع اور اچانک تھا کہ مرہٹے بوکھلا گئے اور توپیں چھوڑ کر ہٹا گئے۔ ہوئے جن پر حیدر علی نے قبضہ کر لیا۔

فوجیں دودن سے بھوکی تھیں اس لیے وہاں تھوڑی دیر رک کر انہوں نے کچھ کھایا پیا پھر آگے کی طرف روانہ ہوئے۔

ترک رادھ کو اپنے توپ خانہ کی تباہی کا فوراً ہی علم ہو گیا۔ اس نے اسی لمحے اپنے بڑے توپخانے کو حیدر علی کا راستہ روکنے کے لیے آگے بڑھا دیا، جس نے حیدر علی اور ان کی فوج پر شدت سے گولہ باری شروع کر دی۔

مرہٹہ توپ خانے کی گولہ باری سے حیدر علی کی بارود لے جانے والی گاڑیوں میں آگ لگ گئی اور کئی سوادھی اس میں جل مرے۔ اور مرہٹے حیدر علی فوج کے قلب تک پہنچ گئے۔

اس جنگ میں حیدر علی کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ ان کے ایک سردار لالہ میاں نے اس جنگ میں شہادت پائی۔

لالہ میاں حیدر علی کے بھائی شہزاد خاں کے داماد تھے۔ اس کے علاوہ دو اور بڑے سردار میر علی رضا خاں اور میر علی زماں بھی مرہٹوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔

کرنے میں سوتا رہا ہے؟

’ماں مالک۔ مجھ سے یہ غلطی ہوئی ہے۔‘

رادھن کی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ ترک رادھ کی تلوار اس کے سینے میں اتر گئی اور وہ سینہ پکڑے ہوئے زمین پر گر پڑا۔

پھر ترک رادھ نے رچنا کو بلا کر دریافت کیا:

’رچنا۔ کیا یہ سچ ہے کہ تو اس ملک حرام کے ساتھ ایک ہفتہ تک سوتی رہی ہے؟‘

رچنا رادھن کی لالش دیکھتے ہی سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ اس نے سر جھکا کر جواب دیا:

’جو کچھ ہوا وہ رادھن کی زبردستی تھی۔ میں اس کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔‘

پھر رچنا نے کچھ اس طرح آنسو بہائے کہ ترک رادھ نے اسے پکڑ کر اپنے سینے سے لگایا۔



اب ترک رادھ نے پورے لشکر کے ساتھ مرنگاپٹیم کی طرف یلغار کی۔

نواب حیدر علی خاں کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اپنے مرداروں کے ساتھ جنگ کی نئی حکمت عملی تیار کی اور فیصلہ ہوا کہ کھلے میدان میں مقابلے کے بجائے دشمن کی پشت پر حملہ کیا جائے۔

نواب حیدر علی نے تھوڑی سی فوج مرنگاپٹیم کی حفاظت کو چھوڑی اور بقیہ لشکر لے کر مرنگاپٹیم سے نکلے۔ پھر جین پٹن کے راستے سے ماگرڑی کے جنگل میں پہنچ گئے۔

ترک رادھ کو جب معلوم ہوا کہ حیدر علی مرنگاپٹیم چھوڑ کے ماگرڑی کے جنگل میں پناہ لگے ہیں تو اس نے بھی ماگرڑی ہی کا رخ کر لیا۔ وہ حیدر علی خاں کو پانچ کے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ حیدر علی اس وقت میرن کی پہاڑی پر ٹھہرے ہوئے تھے۔

ترک رادھ نے جانتے ہی پہاڑی کا رخ کر لیا۔ محاصرہ اس قدر سخت تھا کہ چند دن کی لڑائی اور شب خون کے بعد حیدر علی کو باہر سے رسد ملنا مشکل ہو گئی۔

حیدر علی کے لیے یہ ایام بہت مشکل تھے اور ان کے پاس اب اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ رہ گیا تھا کہ وہ محاصرہ توڑ کے لڑتے بھڑتے مرنگاپٹیم پہنچ جائیں اور وہاں محمود ہو کر مدافعتی جنگ کریں۔

ان بڑے سرداروں کی گرفتاری کے بعد مرہٹوں کو حیدر علی کی تلاش تھی اور وہ انہیں پورے جنگل میں ڈھونڈتے پھر رہے تھے کہ ان کی نظر حیدر علی کے سپہ سالار یاسین خاں پر پڑی جو شدید زخمی حالت میں زمین پر گرا ہوا تھا۔

یاسین خاں کا جتہ اور شکل و صورت حیدر علی سے بے حد مشابہ تھے۔ مرہٹے ہی سمجھے کہ وہ حیدر علی ہے۔ جب مرہٹوں نے اس سے پوچھا:

”تم کون ہو؟“

توزیرک اور عتقند یاسین خاں کو فوراً شبہ ہوا کہ مرہٹے اسے حیدر علی خاں سمجھ رہے ہیں۔ چنانچہ —

یاسین خاں نے بھی خود کو حیدر علی ہی ظاہر کیا۔ مرہٹے لشکر کی فوراً خوب ہو گئے اور بڑے احترام کے ساتھ زخمی یاسین خاں کو اپنے سپہ سالار ترک راؤ کے پاس لے گئے۔ یاسین خاں نے وہاں بھی اپنے آپ کو حیدر علی ظاہر کیا۔

وقت حیدر علی کے خلاف ہو گیا تھا اور قسمت نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ان کی تمام فوج منتشر ہو گئی تھی۔ بڑے بڑے سردار مارے گئے تھے یا مرہٹوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے تھے۔ مرہٹہ قویہ خانہ کی کولہ باری سے اس قدر دھواں پھیل گیا تھا کہ کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ شہزادہ شیو بھی از سے جدا ہو گیا تھا۔

اس عالم دل گرفتگی میں حیدر علی خاں جو بالکل اکیلے رہ گئے تھے، انہوں نے سرنگاپٹم کا رخ کیا اور کسی نہ کسی طرح قلعے میں داخل ہو گئے۔

سرنگاپٹم میں حیدر علی نے عمل میں جانے کے بجائے درگاہ شاہ قادری میں قیام کیا۔ انہیں سب سے زیادہ پریشانی اپنے تحت جگر شہزادہ شیو کی تھی مگر خدا نے شہزادے کی مدد کی اور شام ہونے سے پہلے ہی شہزادہ مرہٹہ لباس میں شاہ قادری کی درگاہ میں پہنچ کے حیدر علی کی خدمت میں باریاب ہوا اور باپ نے بیٹے کو سینے سے لگا کر سکون حاصل کیا۔

اس جنگ میں حیدر علی کے اہم سردار محمد علی کیدان نے ایک عجیب و غریب کارنامہ انجام دیا۔ حیدر علی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ بھی اپنے لشکر سے ہٹ گیا تھا۔ جب اسے کہیں

حیدر علی اور شیو سلطان نظر نہ آئے تو اس نے جلدی جلدی لشکر کے جس قدر لشکر مل سکے، انہیں اکٹھا کیا اور ایک پہاڑی کے اوپر مورچہ قائم کر لیا۔

مرہٹہ سپہ سالار ترک راؤ نے اس پہاڑی کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور شدید گولہ باری کی مگر محمد علی کیدان اور اس کے ساتھیوں نے بارہ گھنٹے تک مرہٹہ لشکر کا مقابلہ کیا اور پہاڑی پر قابض رہے۔ پھر جب محمد علی کیدان کے آدھے سے زیادہ آدمی مارے گئے اور مرہٹوں نے چاروں طرف سے لیٹا کر کے اسے بے بس کر کے گرفتار کر لیا تو وہ اس پہاڑی پر قبضہ حاصل کر سکے۔

محمد علی کیدان کی اس بے پناہ شجاعت پر مرہٹہ سپہ سالار ترک راؤ بے حد متاثر ہوا اور اس نے محمد علی کو پونا دربار کی ملازمت کی پیشکش کی۔

محمد علی کیدان نے یہ پیشکش فوراً قبول کر لی اور ترک راؤ سے درخواست کی کہ اسے اپنے بال بچوں کو سرنگاپٹم سے لانے کی اجازت دی جائے۔

ترک راؤ کو یہ خوش فہمی تھی کہ اس نے حیدر علی خاں کو امیر کر دیا ہے۔ اب محمد علی بھاگ کر کہاں جائے گا۔ چنانچہ اس نے محمد علی کو سرنگاپٹم جانے کی اجازت دے دی۔

محمد علی کیدان اپنے ساتھیوں کو لے کر مرہٹہ لشکر گاہ سے نکلا تو شام کا وقت تھا اور جب وہ مرہٹہ ہراول دستوں کے مورچوں تک پہنچا تو اندھیرا پھیل گیا۔

اس کے ساتھ ترک راؤ نے ایک راہبر بھیجا تھا تاکہ اسے راستے میں کہیں روکا نہ جائے محمد علی کیدان نے اس راہبر کے ذریعے ہراول دستوں کے سردار سے درخواست کی کہ اسے ان مورچوں میں رات گزارنے کی اجازت دی جائے۔

اجازت ملنے پر محمد علی اور اس کے ساتھی بظاہر سو گئے۔ پھر جب ان کا راہبر ہی سو گیا تو محمد علی اور اس کے ساتھی اٹھے اور انہوں نے ہراول دستوں کے سوتے ہوئے لشکریوں کے ہتھیار اکٹھا کیے۔ پھر ان پر حملہ کر کے بیشتر کو جہنم واصل کر دیا اور ان ہتھیاروں کو لے کر حیدر علی کے پاس سرنگاپٹم پہنچ گئے۔

مرہٹہ سردار ترک راؤ نے اپنے خیال میں حیدر علی خاں کو گرفتار کر لیا تھا اس لیے اس کا خیال تھا کہ سرنگاپٹم پر کسی وقت بھی قبضہ کیا جاسکتا ہے۔ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے وہ سرنگاپٹم سے پندرہ میل دور پڑاؤ ڈالے عیش و نشاط کی محفلیں بجاتا رہا اور ادر حیدر علی نے سرنگاپٹم میں پوشیدہ رہ کر لاکھوں روپیہ خرچ کر کے بارہ ہزار کا لشکر تیار کر لیا۔

اب حیدر علی خاں نے ارادہ کر لیا کہ کھلے میدان میں نلکی کے مرہٹوں کا مقابلہ کرے لیکن محمد علی کیدان نے عرض کیا:

”نواب بہادر۔ یہ ٹھیک ہے کہ حیدر علی لشکر کی تعداد بارہ ہزار سے بڑھ گئی ہے اور ہم مرہٹوں کا کھلے میدان میں مقابلہ کر سکتے ہیں مگر ابھی نواب بہادر کے چند جاں نثار مجبور میں اور ان کی یہ خواہش ہے کہ نواب بہادر انہیں جاں نثاری کا موقع عطا فرمائیں۔“

حیدر علی اس کی بات نہ سمجھ سکے اور پوچھا:

”محمد علی کیدان۔ آخر تم کمنیا چاہتے ہو۔ تہدی و فاداری اور جاں نثاری کے تو ہم پہلے سے قائل ہیں۔ اب تم مزید کیا کرنا چاہتے ہو؟“

”آقاے عترت۔“ محمد علی نے بڑے عجز سے عرض کیا:

”آپ کھلے میدان میں مرہٹوں سے مزبور مقابلہ کریں لیکن اس سے پہلے اس غلام کو اجازت دیں کہ وہ مرہٹوں سے دو دو ہاتھ کرے۔“

”محمد علی۔ تم پہلے ہی ایک عجیب و غریب کارنامہ مناجام دے چکے ہو۔ ہم تمہاری اس عترت کی داد دیتے ہیں لیکن ہم تمہارے جیسے وفادار کو فائدہ نہیں کر سکتے۔ ہم تمہیں مرہٹوں کے اس بڑے لشکر پر تباہی جملہ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔“ حیدر علی نے محمد علی کیدان کی بھرپور تعریف کی مگر اسے کوئی اور قدم اٹھانے سے بھرا دیا۔

محمد علی کیدان دراصل ایک منصوبہ بنا چکا تھا۔ اس نے سراپا عجز بن کر درخواست کی:

”نواب بہادر۔ مجھے صرف ایک بار اور اجازت دے دیجیے۔ میں دو دن کے اندر اپنا منصوبہ مکمل کر کے سرنگاپٹم واپس آ جاؤں گا۔ اس کے بعد آپ کے ساتھ کھلے میدان میں مرہٹوں کا مقابلہ کروں گا۔“

حیدر علی خاں نے پھر بھی انکار کیا:

”بہرگز نہیں محمد علی۔ ہم تمہیں مرہٹہ لشکر پر حیدر علی کی اجازت نہیں دے سکتے۔ ہاں۔ اگر تم اپنا پورا منصوبہ ظاہر کر کے ہمیں قائل کر لو تو تمہیں اجازت دی جا سکتی ہے۔“

محمد علی کیدان نے قیصری بار در درخواست کی:

”آقاے عالی مقام۔ میں آپ کی حکم عدولی کی جرأت کا تصور بھی نہیں کر سکتا مگر ایک بار پھر یہی اہتمام کروں گا کہ مجھے مرہٹوں کے مورچے کوہ کری گٹھ جانے کی اجازت دی جائے۔ میں

انشاء اللہ اس مورچے کو تباہ کر کے دو تین دن میں لوٹ آؤں گا۔“

آخر حیدر علی خاں کو اجازت دینا پڑی:

”محمد علی کیدان۔ ہم اپنے وفاداروں کی ضد کی بھی قدر کرتے ہیں۔ جاؤ تمہیں اجازت ہے۔ جتنے دستے چاہو ساتھ لے جا سکتے ہو۔“

محمد علی کیدان خوش خوش صرف چند دستوں کے ساتھ مرہٹوں کے مضبوط مورچے کوہ کری گٹھ کی طرف روانہ ہوا۔

اس نے اپنے منصوبے کے مطابق اپنے اور اپنے مافیہوں کے پاس کوہ کری گٹھ پہنچنے سے پہلے ہی تبدیل کر لیے۔ اب وہ حیدر علی لشکر کے سواروں کے بجائے ترک راؤں کے مرہٹہ سوار دکھائی دیتے تھے۔ ان کے ساتھ مرہٹہ جھنڈے اور دیگر نشانات بھی تھے۔

کوہ کری گٹھ پہنچنے کے بعد محمد علی کیدان نے ایک ایسے آدمی کو پہاڑی پر بھیجا جو مرہٹی زبان بولی اچھی طرح بول اور جھگڑ سکتا تھا۔ اس نے مورچے کے پیریداروں کو بتایا کہ وہ سپہ سالار ترک راؤ کے پاس سے آگے اور مورچے کے سردار سے فوراً ملنا چاہتا ہے۔ پیریدار نے اسے اپنے سردار کے پاس پہنچا دیا۔

اس نے مورچے کے سردار کو ٹھٹھٹ مرہٹی زبان میں بتایا:

”مرہٹہ سپہ سالار ترک راؤ نے اس پہاڑی مورچے کی حفاظت کے لیے تازہ دم دستے بھیجے ہیں اور پرانے فوجیوں کو واپس بلایا ہے۔“

مرہٹہ سردار نے فوراً اس کی بات پر یقین کر لیا۔ یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ قاصد مرہٹہ لباس میں تھا اور مرہٹی زبان بول رہا تھا۔ اس نے پہاڑی سے نیچے جھانک کر دیکھا تو اسے نیچے مرہٹہ دستے کھڑے دکھائی دیے۔

محمد علی کیدان کے بھیجے ہوئے آدمی نے صرف ایک جملہ استعمال کیا اور اسے پہاڑی کا قبضہ دے دیا گیا۔

پرانے مرہٹہ لشکر مورچوں سے نلکی پہاڑی سے اتر گئے اور نئے تازہ دم لشکریوں نے کوہ کری گٹھ کا مورچہ سنبھال لیا مگر۔ پرانے مرہٹہ لشکریوں کو صحیح سلامت واپس جانا نصیب نہ ہوا

مختلف جنگوں کے دوران دونوں طرف پنداروں کا بھی غیر منظم لشکر رہتا تھا۔ حیدر علی خاں کے ساتھ جو پنداروں کا لشکر تھا اس کا سردار غازی خاں تھا۔ حیدر علی نے اندازہ لگایا تھا کہ کوہ کری گٹھ کی تباہی کا ترکم راؤ پر شدید رد عمل ہو گا۔ اسی لیے انہوں نے فوراً احتیاطی تدابیر اختیار کیں۔

حیدر علی کے ہندو لشکروں نے بتایا کہ اگلے ہفتے مرہٹوں کا ایک بہت بڑا اتھار اتر رہے جس میں مرہٹے کسی دربار میں اسٹان (غسل) کرنے ضرور جائیں گے۔ اس اطلاع کے ملتے ہی حیدر علی نے فوج کے تین حصے کیے۔

ایک حصے پر شہزادہ شیو کوہ سردار بنا کر دریا نے کاویری کی طرف بھیجا کہ وہ گھات رکائے بیٹھ جائے اور جب ترکم راؤ دریا میں نہانے کے لیے آئے تو موقع ملے دیکھ کر اس پر حملہ کر دے۔

دوسرے حصے فوج پر اسی نے محمد علی کیدان کو سردار بنا کر روانہ کیا کہ وہ دوسری طرف سے مرہٹوں پر حملہ آور ہو۔ محمد علی کے ساتھ حیدر علی خاں نے پنداروں کی فوج بھی کر دی جس کا سردار غازی خاں تھا۔

باقی فوج لے کر حیدر علی خاں خود ایک کین گاہ میں پوشیدہ ہو گئے۔ انہیں یقین تھا کہ ترکم راؤ دریائے کاویری پر ہی غسل کے لیے آئے گا اس لیے کہ مرہٹہ لشکر سے قریب ترین دریا یہی تھا۔ یہیں پر کاویری کا دوا بہ بھی تھا۔

چنانچہ — حیدر علی کے انداز سے اور جاسوسوں کی اطلاع کے مطابق ترکم راؤ اپنے محافظ دستوں اور ایک بڑی فوج کے ساتھ اسٹان کے لیے کاویری کے دوا بہ پر پہنچا۔ اس نے بڑی فوج کو کچھ دور پر مقرر کیا اور محافظ دستوں کے ساتھ دریا پر پہنچ کے اسٹان کرنے کا ارادہ کیا۔

ترکم راؤ کو ایک ٹم کے لیے بھی شبہ نہ ہو سکا کہ حیدر علی کے تین لشکروں نے دریائے کاویری کے دوا بہ کو گھیر رکھا ہے۔

ابھی وہ دھوئی بلندھ کے دریا میں اترا ہی تھا کہ محمد علی کیدان اپنے دستوں کے ساتھ ترکم راؤ کے محافظ دستوں پر گولیاں برساتا ہوا ٹوٹ پڑا۔

ترکم راؤ کے محافظ دستے اس اچانک حملے سے ایسے گھبرائے کہ جس کا بعد بھر مذاٹھا ادھر

محمد علی کیدان کے دستوں نے کوہ کری گٹھ پر نصب توپوں کا رخ بدلنے والوں کی طرف کر دیا اور پھر جو گولہ باری ہوئی تو قیامت برپا ہو گئی۔

مرہٹوں کو چھپنے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ ویسے طرف بھاگ کے جاتے، محمد علی کیدان کے چھپے ہوئے سپاہی تلوار بلند کر کے ان پر ٹوٹ پڑتے۔

دو گھنٹے کے مختصر وقت میں مرہٹوں کا پوری طرح صفایا کر دیا گیا۔ محمد علی کیدان کی یہ مہم پہلی مہم سے زیادہ کامیاب ہوئی۔

اب مشکل یہ تھی کہ بھاری توپوں کو سرنگا پٹم کی طرح لے جایا جائے۔ اس کے لیے محمد علی نے حکم دیا کہ بڑی توپوں کو ناکارہ کر دیا جائے اور چھوٹی توپوں کو ساتھ لے کر فوراً سرنگا پٹم واپس روانہ ہو جائے۔

ظاہر ہے کہ وہ چند دستوں کے ساتھ کوہ کری گٹھ کے مورچے پر قبضہ برقرار نہ رکھ سکتا تھا۔

اس لیے اسی نے مرہٹوں کو موت کے گھاٹ اتارا اور پھر چھوٹی توپیں ساتھ لے کر بھاگ بھاگ سرنگا پٹم پہنچ گیا۔

جب محمد علی کیدان نے اپنی مہم کی روداد حیدر علی خاں کو سنائی تو اس نے اسے فرطِ محبت سے اپنے سینے سے لگایا مگر اس سے یہ وعدہ بھی لے لیا کہ آئندہ وہ اس قسم کے اقدام سے پرہیز کرے گا اور اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کی کوشش کسی صورت بھی نہ کرے گا۔

کوہ کری گٹھ کی تباہی کی خبر جب ترکم راؤ کو پہنچی تو وہ آپسے سے باہر ہو گیا۔ اسی نے اپنے ساتھ کے پندارہ سردار کو حکم دیا کہ نواح سرنگا پٹم کی آبادیوں کو اس طرح تاراج اور برباد کر دیا جائے کہ سرنگا پٹم والوں کو دال سے دم کا ایک دانہ نہ مل سکے۔

ترکم راؤ نے یہ حکم تو دے دیا مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ ابھی اسے کوہ کری گٹھ سے زیادہ بڑی ایک اور شکست سے دوچار ہونے ہے۔

یہاں اس بات کی ایک بار پھر وضاحت کر دی جائے کہ اس زمانہ کے پندارے، گولے کے ایسے فوجی ہوتے تھے جن کی منہات بقدر قوت دے کر حاصل کر لی جاتی تھیں۔ ساتھ ہی پنداروں کو ٹ مار میں حاصل ہونے والا مال بھی بخش دیا جاتا تھا۔ چنانچہ مرہٹوں اور حیدر علی خاں کی ان

مگر غبار ہوئے۔

ترک راؤ نے سرنگا پٹم کی طرف بڑھنے کا ارادہ تو ملتوی کر دیا مگر لشکر کو حکم دیا کہ پانی گھاٹ اور بالا گھاٹ کو لوٹ مار کر کے تباہ کر دیا جائے تاکہ حیدر علی خاں کو رسد نہ مل سکے۔

حیدر علی خاں نے ان علاقوں کو پہلے کے لیے شہزادہ شیوا اور محمد علی کیدان کو ادھر روانہ کیا۔ شہزادے کو راستے میں معلوم ہوا کہ ترک راؤ کا خزانہ کنکر دی کی طرف سے رائے کوٹہ جا رہا ہے۔ چنانچہ اس نے حملہ کر کے خزانے پر قبضہ کر لیا۔

ایک طرف مرہٹہ دستوں نے پانی گھاٹ اور بالا گھاٹ کو لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ شہزادہ شیوا نے ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے ایک دستے کو مرہٹہ لباس پہنا یا اور اس دستے کو ساتھ لے کر لوٹ مار کرنے والے مرہٹہ فوجیوں میں شامل ہو گیا۔

مرہٹہ دستے اس وقت تک آبادیاں لوٹ چکے تھے اور لوٹے ہوئے مسلمان کو گاریوں اور گھوڑوں پر بار کر رہے تھے۔ پھر جب وہ ٹوٹا ہوا سامان جس میں ہزاروں گھوڑے، بیل، اداست اور ہاتھی بھی شامل تھے، لے کر روانہ ہوئے تو شہزادہ بھی ان سے ذرا پیچھے ہو کر چلنے لگا۔

مرہٹے جب اس مقام پر پہنچے جہاں شہزادہ اپنے فوجی دستے چھوڑ گیا تھا تو شہزادے نے حیدر علی نعرہ لگا کر سامان لے جانے والے مرہٹوں پر حملہ کر دیا۔

اس کا آواز سن کر کبھن گاہ میں پوشیدہ دستے بھی نکل آئے اور ان سب نے مل کر مرہٹوں کو مار بھجایا۔

اس طرح تمام ٹوٹا ہوا مال و اسباب شہزادہ شیوا کے ہاتھ آ گیا۔ اس میں چار ہزار گھوڑے، بیس ہاتھی اور بے شمار اونٹ اور بیل شامل تھے۔

مرہٹہ سپہ سالار ترک راؤ کی خواہش تھی کہ کسی طرح حیدر علی خاں کو کھلے میدان میں جنگ کے لیے آمادہ کیا جاسکے۔ مگر حیدر علی کو معلوم تھا کہ اتنے بڑے مرہٹہ لشکر سے کھلے میدان میں جنگ کرنا کسی قدر خطرناک ہو سکتا ہے۔ اسی لیے انہوں نے اپنے لشکر کو کئی حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا جن میں سے دو حصوں کا سردار شہزادہ شیوا تھا۔ شہزادے کے ساتھ محمد علی کیدان بھی تھا جس سے شہزادہ اہم موقعوں پر کام لیتا تھا۔

جھاگ پڑا

اس وقت ترک راؤ دریا میں کمر کر پانی میں کھڑا گھبرا کر ادھر ادھر بیکھ رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی۔

مرہٹوں کی وہ بڑی فوج جو کچھ دور کھڑی پہرہ دے رہی تھی، اس نے جب گولیوں کی گواہی سنی تو پہرہ دار دستوں کی مدد کے لیے تیزی سے آگے بڑھی۔

اس وقت پندارہ سردار غازی خان صرف ایک سو سواروں کے ساتھ اس بڑی فوج اور دریا کے درمیان آ گیا۔ مرہٹوں نے صرف سو سواروں کو دیکھ کر ان پر نندیدہ لگایا۔

پنداروں نے اتنے بڑے حملے کو بڑی پامردی سے رد کیا اور صرف پانچ منٹ تک جم کے لڑنے کے بعد انہوں نے پسپا ہونا شروع کر دیا۔ مرہٹوں نے ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ پندارے لڑنے اور بھگتے ہوئے اس خشک نالے تک پہنچ گئے جس میں شہزادہ شیوا گھاٹ لگائے بیٹھا تھا۔ شہزادے نے نالے سے نکل کر تعاقب کرنے والے مرہٹوں پر حملہ کر دیا۔

اسی وقت حیدر علی خاں بھی اپنی فوج کے ساتھ شہزادے کی مدد کو پہنچ گئے۔ اس چوڑی مار کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرہٹے اپنی کثیر تعداد کے باوجود میدان بھڑ بھگے۔

سب سے بری حالت سپہ سالار ترک راؤ کی تھی۔ وہ دریا میں اتر چکا تھا اور صرف دھوکے میں کھڑا تھا۔ ہر طرف گولیاں چلی رہی تھیں اور اس کے محافظ دستے حیدر علی کے حملہ آوروں کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

پھر جب احمد نے محسوس کیا کہ اس کے محافظ اسے نہ بچا سکیں گے تو وہ اسی طرح دھوکے پکڑے ہوئے دریا سے نکلنا اور دوڑ کے اپنے گھوڑے کے پاس پہنچا۔

ترک راؤ کو دوسری دھوکے بدلنے کا بھی موقع نہ مل سکا اور جب وہ گھبرا ہوا اپنے گھوڑے پر سوار ہوا تو دھوکے سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

ترک راؤ نے گھوڑے پر بیٹھتے ہی اسے تیز بھاگنا شروع کر دیا اور اسی طرح بے تحاشہ بھاگتا ہوا دریا میں گھاٹ پر پہنچ گیا۔

مرہٹے شیوا کو مٹانے آئے تھے مگر انہیں لینے کے دینے پڑ گئے اور اس شکست نے ان کے منصوبے خاک میں ملا دیے۔

ایک اندازے کے مطابق اس جنگ میں کئی ہزار مرہٹے مارے گئے اور سات ہزار کے قریب

یہ لڑائی تھا کہ دن ہوتی رہی اور اس قدر خوفناک تھی کہ میدان میں لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ رات ہونے پر مرہٹہ سردار نے ترکہ رائفے سے مزید فوج اور توپ خانہ منگوا لیا۔

محمد علی کیدان کو مرہٹہ توپ خانہ گرنے کی اطلاع ملی تو اسی نے فوراً مرہٹہ لاشوں کے پستے بنالیے اور ان کی آڑ میں بیٹھ کر مقابلہ کا فیصلہ کیا۔

صبح کو جب مرہٹوں نے اپنے ہی برائیوں کی لاشوں کے پستے دیکھے تو پریشان ہو گئے۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح دن بھر جنگ ہوتی رہی مگر شام ہوتے ہی محمد علی کیدان نے اپنے لشکر میں اعلان کر دیا کہ وہ استادہ جارہا ہے جہاں سے وہ اپنے زخمیوں کو اٹھانے کے لیے ڈوئیاں بھیجے گا۔ اس طرح محمد علی کیدان جس کی گرفتاری اور مرہٹے کے لیے ترکہ رائفے بھاری افغان بھی مقرر کر دیا تھا وہ میدان سے غائب تھا۔ وہ رات ہی رات میں اپنے لشکر کو لے کر نکل گیا۔

مرہٹہ سردار کو زخمیوں سے معلوم ہوا کہ محمد علی کیدان استادہ گیا ہے تو وہ لشکر لے کر ادھر روانہ ہوا مگر محمد علی استادہ جانے کے بجائے جنگل کے کنارے ایک قلعہ میں پناہ گزیں ہو گیا تھا۔ چنانچہ مرہٹے اسی کا پیچھا کرتے ہوئے استادہ سے قلعہ تک پہنچ گئے اور انہوں نے اس قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

محمد علی نے قلعہ کی تفصیل پر جگہ جگہ آگ روشن کرادی اور لکڑی کی کھوٹیوں کے سہارے کپڑے لٹکا دیے۔ مرہٹے ٹھکانے ہو گئے کہ محمد علی قلعہ میں موجود ہے اور مقابلے کی تیاری کر رہا ہے مگر صبح کو قلعہ ویران پڑا تھا۔

مرہٹوں نے قلعہ پر حملہ کیا تو کوئی مدافعت نہ ہوئی۔ وہ میڑھیاں لگا کر قلعہ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ محمد علی کیدان اپنی فوج کے ساتھ رات کو جنگل میں اتر گیا ہے۔

مرہٹوں کی فوج کا بڑا حصہ راتے پٹن ندی کے کنارے خیمہ زن تھا۔ جب ترکہ رائفے کو محمد علی کیدان کی گرفتاری میں ناکامی ہوئی تو اس نے اپنا لشکر آگے بڑھایا۔

شہزادہ بیٹوں اس وقت محارٹے لکڑی کی کین گاہ میں پوشیدہ تھا۔ مرہٹہ لشکر جب اس محارٹے کے قریب آکر ٹھہرا تو رات میں شہزادہ سے اس پر زبردست شب خون مارا اور اس کے ہاتھ بہت ماما مان آیا۔

حیدر علی لشکر نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ باؤدے کین گاہوں میں چھپ کر حملہ کرتے یا رات کو شب خون مارتے۔ اس طرح کے حملوں نے ترکہ رائفے کا ناک میں دم کر دیا تھا۔

وہ جنگ جس کی کامیابی کے لیے ترکہ رائفے صرف چھ ماہ کا عرصہ مندر کیا تھا، وہ چار ماہ سے بھی زیادہ طویل ہو گئی تھی۔ اس میں مرہٹے ہزاروں کی تعداد میں مارے جا چکے تھے۔ دوسری طرف حیدر علی کا بہت کم نقصان ہوا تھا۔ جو نقصان ہوتا ہی تھا اسے حیدر علی فوراً نئی بھرتی سے پورا کر لیتے تھے۔

ترکہ رائفے اور حیدر علی کا آخری معرکہ جسے فیصلہ کن بھی کہا جاسکتا ہے وہ لکڑی کے جنگل کے قریب ہوا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس چار پانچ سال کے عرصے میں مرہٹوں اور حیدر علی کے درمیان صرف اتنی ہی لڑائیاں ہوئیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ لڑائی تو تقریباً روز ہی ہوا کرتی تھی اور ہفتے عشرے میں کوئی نہ کوئی بڑا مقابلہ بھی ہوتا تھا لیکن حیدر علی اور شہزادہ بیٹوں نے یہ طریقہ اپنا لیا تھا کہ دن میں مرہٹہ لشکر پر چھپ کر حملہ کیا جائے اور رات کو شب خون مارا جائے۔

چنانچہ —

اسی دوران ہونے والی لڑائیوں اور حملوں کا اگر شمار کیا جائے تو ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے جن میں محمد علی کیدان نے بعض مواقع پر بڑی جرأت مندی اور ذہانت کا ثبوت دیا تھا۔ ایک بار جب مرہٹوں کا کیمپ میل کوٹ میں تھا تو حیدر علی نے محسوس کیا کہ ترکہ رائفے کافی زیادہ پریشان ہو چکا ہے اور ممکن ہے وہ واپس جانے کے بدلے ڈھونڈ رہا ہو اس لیے حیدر علی نے اس سلسلے میں خود قدم اٹھایا اور ترکہ رائفے کا پیغام بھیجا مگر اس معزور نے صلح کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے لشکر کو بد فور پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔

اس کے جواب میں حیدر علی نے محمد علی کیدان کو چھ ہزار کے لشکر اور بھاری توپ خانہ کے ساتھ بد فور کی طرف روانہ کیا۔

راستہ جنگل سے ہو کر گزرنا تھا اور اس راستے سے بھاری توپ خانہ نہیں جاسکتا تھا۔ مجبور ہو کر کیدان نے توپ خانہ واپس کر دیا اور لشکر لے کر بد فور کی طرف بڑھا۔

ترکہ رائفے کو محمد علی کیدان کے میدان میں آنے کی اطلاع ملی تو اس نے ایک بڑا لشکر اس کے مقابلے پر بھیجا۔ ان دونوں کا آمنا سامنا کھلے میدان میں ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد انہوں نے حکم دیا :
 "بیلوں کے سیگوں پر بندھے کپڑوں کو آگ دکا دی جائے۔"
 تیل سے جھکے ہوئے کپڑوں میں آگ لگی تو جیسے وہاں چراغاں ہو گیا۔ مرہٹہ بہریداروں نے
 ہزاروں چراغ جلتے دیکھے تو پریشان ہو گئے۔ انہوں نے سونے والے لشکریوں کو جگا دیا۔ وہ
 سب ہڑبڑا کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

اب حیدر علی نے آخری حکم دیا :
 "تمام بیلوں کو مرہٹہ خیمہ گاہ کی طرف ہانک دیا جائے۔"

چنانچہ —

سوار دستوں نے بیلوں کو، جن کے سیگوں سے شعلے بلند ہو رہے تھے، مرہٹہ خیمہ گاہ کی
 طرف ہانکنا شروع کر دیا۔

پھر یوں محسوس ہوا جیسے شعلوں کا ایک دریا یا سمندر گر جتا ہوا مرہٹہ خیموں کی طرف دوڑ پڑا
 ، سو۔ جب شعلوں کی گرمی بیلوں کے سیگوں تک پہنچی تو ان کے دودھنے میں اور تیزی آگئی۔
 اور وہ پھر سے ہوئے پالگوں کی طرح مرہٹہ خیمہ گاہ پر ٹوٹ پڑے۔

مرہٹے ابھی پوری طرح بیدار ہو کر سینٹھتے ہی نہ تھے کہ متعل بردار میل کسی بلاٹے بے دریاں کی
 طرح انہیں روندنے پکھنے اور سینگوں سے چھیدنے لگے۔
 یوں مرہٹہ لشکر میں قیامت برپا ہو گئی اور وہ خیمہ گاہ چھوڑ کے ادھر ادھر بھاگ کھڑے ہوئے
 تاکہ بیلوں سے بچ سکیں۔

لیکن —

ان بھاگنے والوں کو بیلوں سے دور ہو کر بھی پناہ نہ مل سکی اس لیے کہ حیدر علی نے اپنی گھبرا
 ڈالنے والی فوج کو حکم دے دیا تھا کہ بھاگنے والے مرہٹوں کو تہ تیغ کر دیا جائے۔
 نتیجہ یہ ہوا کہ مرہٹہ لشکر پہلے تو بیلوں کا شکار ہوا اور جو بچ کے نکل بھاگا اسے حیدر علی فوجوں
 نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اس افرا تفری میں ترک راڈ بھی اپنی جان بچا کے بھاگ نکلا اور جب وہ وہاں سے بھاگنے
 کے بعد صبح کو خیمہ گاہ سے دس میل دور بھاگے رکھا تو اس کے ساتھ صرف چند ہزار سپاہیوں کے
 سوا اور کچھ نہ تھا۔

دوسری طرف محمد علی کیدان اپنے دستوں کو، بچا کے نواب حیدر علی کے پاس پہنچ چکا تھا۔ وہ
 اس وقت ماگڑی کے گنے جنگلی کے کنارے مقیم تھے۔ مرہٹوں پر شب خون مارنے کے بعد شہزادہ
 بھی ان سے جاملے۔ اب نواب حیدر علی خاں نے مرہٹہ لشکر پر ایک زبردست شب خون مارنے کا
 فیصلہ کیا۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ حیدر علی سردار محمد علی کیدان، شہزادہ، بیوا اور خود نواب حیدر علی
 موقع کی مناسبت سے اپنی جنگی حکمت علی تبدیل کیا کرتے تھے اور کبھی بھی بالکل نئے قسم کی
 حکمت علی استعمال کرتے تھے۔ پس — اس شب خون میں بھی نواب حیدر علی خاں نے بالکل
 نئی حکمت علی اختیار کی۔

بیدار مرہٹہ حیدر علی نے حکم دیا کہ ترک راڈ سے حاصل کیے ہوئے تمام بیلوں کو ایک جگہ اکٹھا
 کیا جائے اور قرب و جوار سے بھی دس بارہ ہزار میل خرید کر لائے جائیں۔

سب لوگ پریشان تھے کہ آخر نواب بہادر اس قدر کثیر تعداد میں بیلوں کا کیا کریں گے؟
 لیکن جب بارہ ہزار کے قریب میل حیدر علی کی خیمہ گاہ کے قریب جمع کر دیے گئے تو انہوں نے
 حکم دیا :
 "تمام بیلوں کے سیگوں پر کپڑا لپیٹ کے تیل چھڑک دیا جائے۔"

نواب کے اس حکم کی فوراً تعمیل ہوئی اور چار گھنٹے میں بیلوں کے سیگوں پر پلٹے ہوئے
 کپڑوں کو تیل سے تر کر دیا گیا۔

اس وقت نواب نے دوسرا حکم جاری کیا :

"صرف دوسو سواروں بیلوں کو قابو میں رکھیں۔ باقی تمام لشکر، مرہٹہ لشکر کے گرد و درددور
 رہ کے گھبرا ڈال لے۔ حملہ ہرگز نہ کیا جائے۔"

حیدر علی کے اس حکم کی بھی فوراً تعمیل کی گئی۔ حیدر علی فوجیں چاروں طرف پھیل گئیں مرہٹہ
 لشکر اس جنگلی کے سامنے بیلوں دوزخ تک پھیل ہوا تھا۔

ترک راڈ کو معلوم ہو گیا تھا کہ حیدر علی کی پوری طاقت اسی جگہ اکٹھا ہے اور وہ ایک فیصلہ کن
 جنگ لڑنا چاہتا ہے اس لیے وہ بھی زور شور سے تیاریاں کر رہا تھا۔

حیدر علی نے اپنے تمام لشکر کو مرہٹوں کے گرد پھیلا دیا اور خود بیلوں والے دستے کے پاس
 کھڑے رہے۔

ہوئے گشتِ اعدا بہت وقتِ جنگ
زمینِ خوں سے یکسر ہوئی لالہ رنگ
کوئی ٹوٹا تھا پٹا خاک پر
کوئی کھلے نیزہ گرا آہ سر

ہوئے گشتِ کتنے کروں کیا بیاں
سوالاش کے کچھ نہ واں تھا عیاں
منظر ہوئی غازیوں کی سپاہ
ہوئی فوجِ پُونا سراسر تباہ



ترک راؤ کی خیمہ گاہ کو رات بھر حیدری لشکر کے پنڈاروں اور خود مرہٹہ لشکر کے ساتھی
پنڈاروں نے خوب خوب لوٹا۔
اسی عظیم شکست کے بعد ترک راؤ نے پونا سے ملک کی درخواست کی۔

حیدر علی خاں کے سر سے نخوت کا سایہ دور ہو چکا تھا۔ ان کی قسمت نے اب یادری
شروع کر دی۔

جب ترک راؤ کا قاصد ملک کی درخواست لے کر پونا پہنچا تو مادھو راؤ پیشوا مرچکا تھا اور
نارائن راؤ اور رگوباد دو امیدواروں میں پیشوا کے عہدے کے لیے جنگ ہو رہی تھی۔
حیدر علی نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور ترک راؤ کے پاس صلح کا پیغام بھیجا۔
ترک راؤ نے اسے غنیمت جانا مگر تادان جنگ کا مطالبہ کیا۔ آخر ۳۶ لاکھ تادان جنگ حاصل کر
کے ترک راؤ پونا واپس چلا گیا۔

اور — یہ چھ سالہ جنگ ختم ہو گئی!
اس جنگ کے سلسلہ میں 'بادارنامہ' ایک مختصر منظوم جنگ نامہ درج ہے جو تارین کے
یہ یقیناً باعثِ دلچسپی ہوگا:

کردن کیا بیاں باجراٹے ستیز
کہ برپاتھی اس جاہِ اک رستخیز
سرد حلقی مردانِ جنگ آزما
نثارِ دمِ خنجر و تیغ تھا

رداں خوں تھا مانندِ دریائے آب!
سر پہلواناں تھے مثلِ حباب
جوانِ مرد جتنے تھے اس فوج کے
سبھی دفعۃً واں پہ مارے گئے

کارنامے دور دور تک مشہور تھے۔ مراری راؤ نے دوبار حیدر علی خاں کی مخالفت کی تھی اور اپنی فوج کے ساتھ دشمنوں میں شامل ہو کے حیدر علی خاں سے جنگ کر چکا تھا۔

حیدر علی خاں نے محاصرہ اس قدر سخت کیا کہ اندر والوں کو باہر سے رسد ملنا بند ہو گئی اور قلعہ کے اندر تالاب اور باڑیاں خشک ہو گئیں۔ جب لوگ بھوک اور پیاس سے بے حال ہوئے تو راجہ نے اطاعت قبول کر لی۔

حیدر علی خاں نے ریاست پر قبضہ کر کے راجہ اور اس کے اہل و عیال کو سرنگا پٹم بھیج دیا۔ گنتی کی فتح کا یہ اثر ہوا کہ گرم کٹہہ کے قلعہ دار نے خود ہی قلعہ حیدر علی کے حوالے کر دیا۔

بلاری کے ماتھے سے نکل جانے کی وجہ سے نفاک دکن، حیدر علی کے خلاف ہو گیا تھا اور اب جو ان کا قبضہ گنتی پر ہوا تو مرہٹے بھی ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس وقت مرہٹوں کا پیشوا رگھو یا تھا۔ اس نے سولہ ہزار کاشکر نفاک دکن کے پاس بھیجا تاکہ وہ اپنے اور مرہٹہ لشکر کی مدد سے حیدر علی کو شکست دے کر بھاگادے۔

پس —

نفاک دکن اور مرہٹوں کا لشکر دونوں مل کے حیدر علی لشکر کی طرف بڑھے۔ اس مشترکہ لشکر کا سردار ابراہیم خاں دھونہ تھا۔

حیدر علی خاں نے اپنے سردار محمد علی کیدان کو ”گھونہ“ کا خطاب دے کر دھونہ کے مقابلے پر روانہ کیا۔

محمد علی گھونہ نے جلتے ہی دھونہ کو مار بھاگایا۔

کہتے ہیں کہ جب ابراہیم خاں دھونہ میدان جنگ سے بھاگا تو اس کے سر پر ٹوپی یا خود کوئی چیز نہیں تھی اور وہ شگے مر جھاگ کے بسالت جنگ کے پاس پہنچا۔

یہ دہی بسالت جنگ تھا جسے حیدر علی نے بلاری کے محاذ پر شکست دے کر پسپا کر دیا تھا۔ اس وقت بھی حیدر علی، دھونہ کا تعاقب کرتے ہوئے ادھونی تک پہنچ گئے اور وہاں پہنچ کے حیدر علی نے ایک دلچسپ مذاق کیا۔ انہوں نے ایک قاصد کے ہاتھ ناظم ادھونی کو مندرجہ ذیل پیغام بھجوایا:

خانہ جنگی کی وجہ سے مرہٹہ طاقت منتشر ہو کر رہ گئی۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد حیدر علی خاں اپنے کھوئے ہوئے علاقوں کی بازیابی کے لیے کوشاں ہوئے۔

حیدر علی خاں کے پاس اس وقت محمد علی کیدان، رضا علی خاں، بسیت جنگ اور خود اس کا جوان بیٹا شہزادہ ٹیپو جیسے اعلیٰ درجہ کے شجاعت سے بھرپور اور تجربہ کار سرداران فوج موجود تھے۔ ان لوگوں کی موجودگی میں حیدر علی کسی بھی طاقت سے ٹکر لے سکتے تھے۔

انہی دنوں ادھونی کے ناظم بسالت جنگ نے بلاری پر حملہ کر دیا۔ بلاری کوئی ریاست نہیں بلکہ ایک پالیگاڑ زمینداری تھی۔

بلاری کے پالیگاڑ نے حیدر علی سے مدد مانگی۔ حیدر علی فوراً لشکر لے کر بلاری پہنچے۔ بسالت جنگ کی فوج فرانسیسی سردار موسیو ڈی لالی کے زیرِ کمان تھی۔ وہ حیدر علی کے مقابلے پر آیا اور شکست کھا کر پسپا ہو گیا۔

اس شکست کے نتیجے میں بلاری کی پالیگاڑ زمینداری (یہ زمیندار خود کو راجہ کہتے تھے) حیدر علی کے ماتحت ہو گئی۔ اور وہاں کے راجہ نے نفاک دکن کے بچے حیدر علی خاں کو خراج دینا شروع کر دیا۔

بلاری کے بعد حیدر علی نے ریاست گنتی کا رخ کیا۔ راجہ گنتی مراری راؤ کی بہادری کے

”ناظم ادھونی بسالت جنگ کو معلوم ہونا چاہیے کہ دارالامارت
مرنگا پٹم دور ہونے کی وجہ سے حیدری لشکر کو دو ماہ کی تنخواہ ادا نہیں
کی گئی اس لیے فردی مصارف کے لیے دس لاکھ روپیہ بھیج دیا
جائے۔“

یہ حسن طلب کا ایک بہترین اور نہایت عمدہ و جذباتی انداز ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا
ہے کہ حیدر علی اُن پرٹھ ہونے کے باوجود اخلاق اور تہذیبی اقدار کا کس قدر خیال رکھتے تھے۔
بسالت جنگ کو جیسے ہی حیدر علی خاں کا پیغام ملا، اس نے اسی وقت مطلوبہ رقم بھیج کے
ادھونی کو بچایا۔

ایک روایت کے مطابق حیدر علی خاں نے قلعہ ادھونی کا محاصرہ کر کے جب دو چار گولے قلعہ
کے اندر پھینکوائے تو بسالت جنگ کی بجلی سر میں تسکے پگ گیا۔ اور خواتین اور بچوں کے شور سے
قیامت برپا ہو گئی۔

بسالت جنگ نے خود بخود ایک بڑی رقم حیدر علی کے پاس ارسال کی اور اپنے دوسری کا وعدہ
کر کے اسے رخصت کر دیا۔

نواب بہادر کو ذرا امن نصیب ہوا تو انہیں اپنے بیٹے شہزادہ بیچو کی شادی کی فکر ہوئی۔ شہزادہ
نہایت پرہیزگار اور سعادت مند پیدا تھا۔ اس نے گیارہ سال کی عمر ہی میں میدانِ حرب میں قدم رکھ
دیا تھا اور اب اس کی عمر تقریباً ۲۳ سال ہو رہی تھی۔ وہ جوانی کی منزل سے گزر رہا تھا مگر اس سے
اب تک کوئی ایسی لغزش نہ ہوئی تھی کہ والدین یا اہل لشکر کو انگشت نمائی کا موقع ملتا۔
انہی خوبوں کے پیشِ نظر حیدر علی خاں کسی ایسی بیوی کی تلاش میں تھے جو جو امرِ مذکور نیک دل
شہزادے کی ملکہِ دل بن سکے۔

جہاں تک شہزادہ بیچو کا تعلق تھا تو اس کی طرف سے سچ تک کسی سمت ہٹنا سنا شروع
نہ ہوا تھا۔

بیان کیا جا چکا ہے کہ شہزادہ بیچو کی والدہ فاطمہ بیگم (فخر النساء) میر رضا علی خاں کی ہمیشہ
تھیں۔ اس طرح میر رضا علی خاں شہزادے کے ماموں ہوتے تھے۔ پس فاطمہ بیگم نے اپنے بھائی

کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ کسی طرح شہزادے کا عندیہ معلوم کریں یعنی یہ معلوم ہو کہ شہزادہ کسی خاص لڑکی
کو تو پسند نہیں کرتا۔

فاطمہ بیگم نے یہ کام بھائی کو تین سال قبل سپرد کیا تھا جب شہزادے کی تیرہویں سال تھی
مگر میر رضا علی خاں اپنی تاملتہ کو شش کے باوجود اس معاملہ میں کورسے کورسے ہی رہے۔
اور آخر انہوں نے بن کو یقین دلادیا کہ شہزادے کے دل میں کسی کی صورت نہیں بسی ہے اور
اس کی شادی جس جگہ بھی کرنے کا ارادہ کیا جائے وہ اسے بخوشی تسلیم کر لے گا۔

قرائن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حیدر علی خاں نے بھی شادی کے لیے شہزادے کی
مرضی معلوم کرنے کی کوشش کی مگر انہیں بھی اس سلسلے میں ناکامی ہوئی تھی۔ اب حیدر علی نے اپنے طور
پر شہزادے کے لیے لڑکی کی تلاش شروع کر دی۔

اس تلاش میں ان کی نظر امام صاحب بخشنی ناطکی بیٹی پر پڑ کر رک گئی۔

ناٹک خاندان، نواب حیدر علی خاں کے ساتھ ہی ارکاٹ سے ہجرت کر کے مرنگا پٹم آیا تھا۔
اور دونوں خاندانوں میں گہرے تعلقات تھے۔

ادھر حیدر علی خاں نے شہزادے کے لیے امام صاحب بخشنی ناطکی بیٹی کو پسند کیا، ادھر ان کی
حرم سرا میں ایک اور بیٹی گلی گھلا۔

وہ گلی یہ تھا کہ شہزادے کی والدہ نے اپنے ہی خاندان کے لالہ مہاں کی بیٹی رقیہ بانو کو
شہزادے کے لیے پسند کر لیا۔ اور اس کا اعلان بھی کر دیا۔

جب یہ خبر حیدر علی کو پہنچی تو ان کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور انہوں نے بھی فوراً اعلان کر
دیا کہ شہزادے کی شادی امام صاحب بخشنی ناطکی کی دختر نیک اختر سے ہوگی۔

اس طرح حیدر علی خاں کے حرم میں چھ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ لطف یہ کہ حیدر علی خاں نے
شہزادے کی شادی کی تیاریوں کا حکم بھی دے دیا۔ مگر دوسری جانب شہزادے کی والدہ
بھی اگڑی ہوئی تھیں اور انہوں نے ہوا ز بلند کہا تھا کہ شہزادے کی شادی رقیہ بانو سے ہوگی
اور اس شادی کو کوئی نہیں روک سکتا۔

حیدر علی خاں کی حرم سرا کی یہ چھ میگوئیاں علی سے نکلی کہ دربار تک پہنچ گئیں۔ عجیب
بات یہ تھی کہ حیدر علی خاں نے شہزادے کی شادی کی تیاریوں کا حکم تو دے دیا تھا مگر انہوں نے
ابھی تک امام صاحب بخشنی ناطک سے اس نسبت کے لیے کوئی گفتگو نہیں کی تھی جبکہ دوسری طرف

فاطمہ بیگم نے لالہ میاں سے شہزادے کے لیے رقیہ بیگم کو مانگ لیا تھا اور لالہ میاں نے اس پر انتہائی خوشی کا اظہار کیا تھا۔

شہزادہ بیگم کے لیے جس خاندان سے بھی رشتہ مانگا جاتا وہ اس پر فخر کرتا اس لیے کہ شہزادہ ولی عہد سلطنت خداداد ملیح رہونے کے علاوہ اپنی شجاعت اور اعلیٰ کردار کی وجہ سے پوری سلطنت میں مقبول تھا۔

بہر حال — حیدر علی خاں کو جب یہ معلوم ہوا کہ فاطمہ بیگم نے شہزادے کے لیے رقیہ بانو کو پسند کر کے رشتہ طے کر لیا ہے تو انہیں بہت غصہ آیا۔ انہوں نے بیوی سے تو کچھ نہ کہا البتہ رضا علی خاں کو بلا کر ان سے شکایت کی:

”رضا علی خاں! یہ کیسے ستم کی بات ہے کہ ہم نے شہزادے کے لیے اما صاحبہ بخشی نائطہ کی بیٹی کو پسند کیا اور ہمارا بیگم نے ہماری مرضی کے خلاف شہزادے کے لیے رقیہ بانو کو پسند ہی نہیں کیا بلکہ اس سے رشتہ بھی طے کر دیا!“

رضا علی خاں کو حیدر علی اور فاطمہ بیگم کے اس دلچسپ اختلاف کی خبر ملی تھی اس لیے انہوں نے بڑی احتیاط سے جواب دیا:

”نواب بہادر درست فرما رہے ہیں۔ نواب بیگم کو آپ کی مرضی کے خلاف یہ رشتہ طے نہیں کرنا چاہیے تھا!“

”پھر اب کیا کیا جاسکتا ہے۔ میں شہزادے کے لیے اما صاحبہ بخشی کی بیٹی بیاہ کے مزدور لاؤں گا۔ اب یہ سبیری انا کا مسئلہ بن گیا ہے کیونکہ بات پورے دربار میں پھیل چکی ہے۔“ نواب بہادر کے بچے سے غصہ کا صاف اظہار ہو رہا تھا۔

رضا علی خاں کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے:

”نواب بہادر۔ میرا خیال ہے کہ نواب بیگم کو شاید یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آپ نے اما صاحبہ بخشی کی بیٹی کو شہزادے کے لیے مانگ لیا ہے۔ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ نواب بیگم اب بھی یہی کہہ رہی ہیں کہ آپ نے اما صاحبہ بخشی سے ان کی بیٹی کے لیے اب تک کوئی بات نہیں کی۔“

حیدر علی خاں جیسے چونک پڑے۔

وہ کچھ دیر رضا علی خاں کو گھورتے رہے۔ پھر بولے:

”یہ ٹھیک ہے کہ میں نے اس مسئلے میں اما صاحبہ سے اب تک کوئی بات نہیں کی مگر کیا میرا یہ اعلان کہ دنیا کافی نہیں کہ میں نے شہزادے کے لیے اما صاحبہ کی بیٹی کو پسند کر لیا ہے۔“ رضا علی خاں نے ذرا شیر ہو کر دے بے لمحے میں کہا:

”نواب بہادر بالکل درست فرما رہے ہیں۔ آپ کا اعلان کہ دنیا ہی کافی تھا مگر شاید نواب بہادر اس بات سے واقف نہیں کہ نائطہ خاندان اپنی بیٹیاں دوسرے خاندانوں میں نہیں دیتے۔ ہو سکتا ہے وہ شہزادے کے لیے بھی انکار کر دیں۔“

”کیا کہا۔ انکار کر دیں!“

یہ کہتے ہوئے نواب بہادر غصہ سے تھلا کے کھڑے ہو گئے:

”یہ تم نے کیسے کہا کہ نائطہ ہمارے شہزادے کے رشتہ کو رد کر دیں گے۔ کیا ہمارا خاندان ان سے کم تر ہے۔“

رضا علی خاں نے پُر زور الفاظ میں کہا:

”ہرگز نہیں۔ ہم نائطہ سے کسی بات میں بھی کم نہیں لیکن معلوم یہ ہوا ہے کہ نائطہ اس بات پر غور کرتے ہیں کہ وہ خالص عربی النسل ہیں اور ان کے خون میں اب تک کوئی میل نہیں ہوا اس لیے وہ دوسرے لوگوں سے افضل اور اعلیٰ ہیں۔“

حیدر علی خاں چیخ کے بولے:

”اگر نائطہ ایسا کہتے ہیں تو وہ لوگوں کو فریب دیتے ہیں۔ میں خود بھی عربی النسل ہوں لیکن میں امن بات پر فخر نہیں کرتا اس لیے کہ اسلام نے رنگ النسل اخون کے تمام امتیاز مٹا دیے ہیں۔ اور اعلان کیا تھا کہ بزرگی اور عظمت کا تقویٰ تقویٰ ہے جس کا کردار جتنا عظیم ہو گا وہ خود بھی اتنا ہی عظیم سمجھا جائے گا۔“

نبے شک بے شک۔ میں نواب بہادر کے خیالات سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں۔“

رضا علی خاں نے تاکید کی، اسے خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں نواب بہادر نائطہ کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھا بیٹھیں۔

نواب بہادر نے ذرا توقف کے بعد کہا:

”رضا علی خاں! تم اما صاحبہ بخشی نائطہ کے پاس جاؤ اور ہماری طرف سے ان کی بیٹی کا رشتہ شہزادے کے لیے مانگو۔ میں دیکھوں گا وہ کیا جواب دیتے ہیں۔“

رضاعلی خاں مجھے میں پھنس گئے۔ وہ دراصل حیدر علی خاں کو اس رشتے سے باز رکھنا چاہتے تھے۔ گلاب نواب بہادر نے انہیں شہزادے کے رشتے کے لیے ناٹھ کے پاس جانے کا حکم دے دیا تھا۔ انکار کرنے کا بھی کوئی موقع نہ تھا اس لیے انہوں نے تعین کے لیے سر جھکا دیا۔

امام صاحب بخشی ناٹھ، رضاعلی خاں کو اچھی طرح جانتے تھے اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ رضاعلی میسور کے ان آدمیوں میں سے ہیں جن پر نواب بہادر اندھا اعتماد کرتے تھے۔ انہوں نے رضاعلی خاں کو بڑی عزت اور محبت سے ملاقات کا مشرف بخشا اور ان کی تواضع کے لیے عرب سے آئی ہوئی گجریں پیش کیں۔

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد رضاعلی خاں حرفِ مطلب زبان پر لائے :
”محترم امام صاحب۔ آپ کی بزرگی اور خاندانی عظمت کا سلطنتِ خداداد کا کچھ بچہ قائل ہے اور ہر شخص آپ سے قربت پر ہونے کا خواہاں ہے۔“
امام صاحب خوش ہو گئے۔

”یہ تو آپ لوگوں کی نوازش ہے کہ ہماری بزرگی کو تسلیم کرتے ہیں۔“
رضاعلی خاں نے فوراً کہا :

”امام صاحب۔ آپ بزدگی تسلیم کرنے کی بات کرتے ہیں۔ یہاں تو بڑے بڑے لوگ آپ سے رشتے ملتے کرنا چاہتے ہیں۔ کیا خیال ہے آپ کا؟“

امام صاحب نے حیران نظروں سے رضاعلی کو دیکھا :

”خان صاحب میں سمجھا نہیں۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

رضاعلی نے تکلف کو بالائے طاقت رکھ کر صاف الفاظ میں کہہ دیا :

”امام صاحب ! آپ کو مبارک ہو کہ نواب بہادر حیدر علی خاں، شہزادہ شیو کو آپ کی فرزندگی

میں دیکھا جاتے ہیں۔“

یہ سن کر امام صاحب کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ شاید انہوں نے بولنے کی کوشش کی مگر الفاظ ان کے حلق میں الجھ گئے۔

رضاعلی خاں سمجھ گئے کہ امام صاحب کے دل میں اس وقت کیسے کیسے ناخوشی کا بیان خیال

اٹھ رہے ہوں گے۔

فارسی مثل ہے کہ گوتم مشکل، نہ گوتم مشکل۔ (بو تو تو مشکل نہ بو تو تو مشکل)۔ ان میں نواب بہادر کی درخواست نامنظور کرنے کی جرأت نہ تھی اور قبول کرنے میں ان کے خون میں فرق آتا تھا۔ کچھ انتظار کے بعد رضاعلی خاں نے کہا :

”امام صاحب۔ آپ نے نواب بہادر کی خواہش کا کوئی جواب نہیں دیا؟“

امام صاحب بوکھلا گئے :

”جواب۔ ملن ملن جواب۔ ضرور دوں گا جواب۔ زمان خانے سے ہو کے میں ابھی واپس آتا ہوں۔“

رضاعلی خاں کو تقریباً دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ زمان خانے میں کیا گفتگو ہو رہی تھی اس کا صحیح اندازہ تو وہ نہ کر سکے مگر انہوں نے یہ ضرور دیکھا کہ ناٹھ خاندان کے تقریباً تمام بڑے بڑے سردار اور معززین ایک ایک کر کے باہر سے آتے اور زمان خانے میں جاتے رہے۔ بعض اوقات زمان خانے کی گفتگو میں اس قدر تلخی اور ترشی آجاتی تھی کہ آوازیں دیواروں اور دروازوں سے گزر کر رضاعلی تک بھی پہنچتی تھیں۔

آخر امام صاحب سر جھکائے، منہ لٹکائے برآمد ہوئے اور رضاعلی خاں کے پاس پہنچ کے بڑے سہمہ طریقے سے بولے :

”خان صاحب۔ معاف فرمائیے۔ آپ کو بہت انتظار کی زحمت گوارا کرنا پڑی۔ دراصل فیصلہ تو مجھ ہی کو کرنا تھا۔ آخر میں لڑکی کا باپ ہوں لیکن بیٹی کے معاملے میں دستور کے مطابق چاہے عزیزوں سے مشورہ بھی ضروری ہوتا ہے۔ تاخیر کی یہی وجہ تھی۔“

رضاعلی خاں ایک تو انتظار کرتے کرتے تنگ گئے تھے اس پر امام صاحب کا وضاحتی بیان وہ بل کھا کر دگئے اور ترش لہجے میں بولے :

”بندہ امام صاحب۔ مجھے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ مجھے تو نواب بہادر کی خواہش کا جواب چاہیے؟“

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ نواب بہادر کی خواہش کو کون نامنظور کر سکتا ہے۔ پھر آخر شہزادہ بہادر ولی عہد سلطنت ہیں۔“ امام صاحب نے چاہا کہ جواب دیا جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ فیصلہ انہوں نے بادلِ خواستہ کیا ہے۔

اما صاحب کا جواب صاف اور واضح نہ تھا۔
رضاعی خاں نے وضاحت چاہی:

"اما صاحب۔ میں آپ کے جواب سے کیا نتیجہ نکالوں۔ آپ نے شہزادہ بہادر کا رشتہ منظور فرمایا ہے یا ابھی اس پر مزید غور و فکر باقی ہے؟"

"نہیں نہیں خان صاحب۔ غور و فکر کی کیا ضرورت ہے۔ نواب بہادر کا ارشاد ہمارے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ آپ ہماری طرف سے خوشنودی اور رضامندی کا اظہار فرمادیجیے۔"
اما صاحب نے اگرچہ صاف طور پر اپنی رضامندی ظاہر کر دی مگر رضاعی خاں کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ اما صاحب اور ان کے عزیز و اقارب اس رشتے سے خوش نہیں ہیں۔

رضاعی خاں کو اس بات کا پہلے سے اندازہ تھا اور اسی لیے وہ نہیں چاہتے تھے کہ شہزادے کا رشتہ اس گھرانے میں ہو جو بزم خود اپنے خاندان کو محض عزتی اہل ہونے کے سبب برصغیر کی تمام دیگر قوموں اور خاندانوں سے افضل سمجھتا ہو۔

انہی خیالات میں گم وہ نواب بہادر کے پاس پہنچے۔
نواب بہادر رہمان خان سے اٹھ کر اندر جا چکے تھے۔ رضاعی خاں نے اپنے آنے کی اطلاع کرائی تو نواب نے انہیں اندر ہی بلوایا۔

نواب بہادر نے دیکھتے ہی سوال کیا:

"کیا جواب دیا اما صاحب بخشتی نائٹھ نے؟"

اور۔

رضاعی خاں کو مجبوراً کہنا پڑا:

"انہوں نے رشتہ منظور کر لیا ہے۔ نواب بہادر اور مجھے پیغام دیا ہے کہ نواب بہادر کو ان کی خوشنودی اور رضامندی سے آگاہ کر دیا جائے۔"

نواب بہادر کا بھابھا سا چہرہ اک دم چمک اٹھا:

"میں نہ کہتا تھا کہ اما صاحب انکار نہیں کر سکتے۔ آخر ہم بھی تو عزتی اہل ہیں۔ وہ انکار کیسے کر سکتے تھے؟"

اس وقت نواب بیگم کمرے میں تشریف لے آئیں۔ نواب بہادر انہیں دیکھ کے مسکرائے:

"مادرِ پیو۔ آپ نے سنا اما صاحب نے اپنی دختر کے لیے ہمارے شہزادے کا

رشتہ منظور کر لیا ہے۔"

فاطمہ بیگم کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی، چٹخ کے بولیں:

"نواب بہادر۔ اولاد کے رشتوں کا فیصلہ ان کی مرضی سے ہونا کرتا ہے۔ آپ یہ حق مجھ سے کیوں چھیننا چاہتے ہیں؟"

نواب بہادر کا منہ بھی کچھ دمر نہ ہو گیا۔ انہوں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا:

"فاطمہ بیگم۔ اگر آپ شہزادے کی ماں ہیں تو میں اس کا باپ ہوں۔ مجھے بھی اس پر وہی حق حاصل ہے جس کا دعویٰ آپ کر رہی ہیں اور میں نے اپنا حق استعمال کیا ہے۔ آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے۔"

"نواب بہادر۔ میں کمال معذرت سے یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ شہزادے بیٹوی شادی کوئی ملکی یا سیاسی معاملہ نہیں جس میں آپ کی مرضی کو مقدم رکھا جائے۔ آپ کے علم میں یہ بات تھی کہ میں نے شہزادے کے لیے رقیہ بانو کا انتخاب کر لیا ہے۔ پھر آپ کو نائٹھ خاندان کی خوشامد کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

رضاعی خاں نے دیکھا کہ بات بہت بڑھ گئی ہے۔ ان کا اور نواب بہادر کا رشتہ بہت نازک تھا اس لیے وہ فوراً وہاں سے اٹھ اٹھے۔

ان کے جاتے ہی نواب بہادر کا لہجہ بھی گرجت ہو گیا:

"میں نے بھی اعلان کر دیا تھا کہ میں شہزادے کی شادی نائٹھ خاندان میں کر رہا ہوں۔ پھر آپ نے رقیہ بانو کے لیے کیوں درخواست کی؟"

فاطمہ بیگم نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا:

"رقیہ بانو کا رشتہ پہلے میں نے مانگا تھا اس لیے شہزادے بیٹوی شادی میں رقیہ بانو سے کروں گی۔"

نواب بہادر ایک لمحے کو جھکے پھر بولے:

"میں نے بھی بخشتی نائٹھ کی بیٹی کو شہزادے کے لیے مانگ لیا ہے اور اس نے رشتہ منظور کر لیا ہے۔ میں اپنے بیٹے کی شادی وہیں کر دوں گا۔"

ٹھیک اسی وقت حیدر علی خاں کی والدہ حمیدہ بیگم دو کینزوں کے سہارے کمرے میں داخل ہوئیں۔ حیدر علی خاں کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ فاطمہ بیگم نے اپنی سنبھالتے ہوئے نور اگے بڑھ کر

ان کا بازو تھا کیا۔
 "ادھر آئیے اور میراں۔ یہاں تشریف رکھیے۔ حیدر علی خاں نے ماں کو سہارا دے کر ایک نرم کوچ پر بٹھا دیا۔
 مجیدہ بیگم نے مانس سنبھالنے ہوئے کہا:
 "کیا بات ہے فاطمہ بیٹی۔ یہ کیسا شور ہو رہا تھا؟"
 فاطمہ بیگم نے بیان دینا شروع کیا:
 "دیکھیے امی جان۔ میں نے شہزادے پٹو کے لیے رقیہ بانو کو پسند کر لیا ہے اور شہزادے کی شادی اسی سے ہوگی۔"
 "ٹھیک ہے۔ اچھا رشتہ ہے۔ مگر دو شادی۔ بڑی بی بی نے بڑے اطمینان سے شادی کی اجازت دے دی۔"

اب نواب بہادر نے دخل دیا:
 "مادر میراں۔ میں نے شہزادے کے لیے نائطہ خاندان کے امام صاحب بخٹی کی دختر کو پسند کیا ہے۔ شہزادے کی شادی اس سے ہوگی۔"
 بڑی بی بی نے ایک لمبی سانس لے کر فرمایا:
 "ٹھیک ہے۔ اچھا رشتہ ہے۔ مگر دو شادی۔
 "جی!"
 یہ لفظ حیدر علی خاں اور فاطمہ بیگم دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا اور وہ دونوں حیران ہو کر بڑی بی بی کو دیکھنے لگے۔
 "جی سے تم دونوں کا کیا مطلب ہے؟" بڑی بی بی تلخی سے بولیں۔
 "امی جان۔ آپ نے مجھے شہزادے اور رقیہ بانو کی شادی کی اجازت دے دی ہے ناں؟"
 فاطمہ بیگم نے بڑی امیدوں سے کہا:
 "اں ہاں بیٹی۔ میں نے کب انکار کیا ہے؟" بڑی بی بی نے فاطمہ بیگم کی بات کی تائید کر دی۔
 فاطمہ بیگم نے فائنمانہ انداز میں حیدر علی کو دیکھا۔
 حیدر علی نے ایک قدم آگے بڑھ کر مجیدہ بیگم کا ہاتھ پکڑا اور محبت سے بولے:
 "مادر میراں۔ ابھی آپ نے مجھے شہزادے سے پٹو کی امام صاحب بخٹی کی بیٹی کے ساتھ شادی

کی اجازت دی تھی ناں؟"
 "ہاں ہاں بیٹی۔ میں نے کب انکار کیا ہے؟" بڑی بی بی نے حیدر علی خاں کی بات کی بھی تائید کر دی۔
 اب فاطمہ بیگم حیران رہ گئیں۔ تنک کر بولیں:
 "آپ نے مجھے رقیہ بانو کے ساتھ شہزادے کی شادی کی اجازت دی ہے؟"
 بڑی بی بی مسکرائیں:
 "فاطمہ بیگم۔ میں نے تمہیں اجازت ضرور دی ہے مگر ایک شرط کے ساتھ۔"
 "جی۔ کیسی شرط؟" فاطمہ بیگم نے گھبرا کر کہا:
 "میں سمجھ نہیں سکی۔"

"شرط بتانے سے پہلے میں تمہیں ایک ہندی مثل سناتی ہوں۔ مجیدہ بیگم نے بیٹے اور پٹو کے غصہ بھرے چہروں کی پروا نہ کرتے ہوئے کہنا شروع کیا:
 "ہندی مثل مشہور ہے کہ حوراج ہٹ سے ٹکرایا۔ اس نے اپنا سب کچھ گنوا دیا۔ ہٹ کہتے ہیں ضد کو۔ راج ہٹ کے معنی ہوئے راجہ یا بادشاہ کی ضد۔ اس لیے میں چاہوں گی کہ تم بادشاہ یعنی حیدر بیٹے کی ضد سے نہ ٹکراؤ۔ انہیں اپنی ہٹ پوری کرنے دو۔"
 "واہ وا۔ سبحان اللہ۔ کیا اچھا فیصلہ کیا ہے مادر میراں نے۔" حیدر علی خاں نے ماں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
 اس وقت وہ خوشی سے پھولے نہیں سہا رہے تھے۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے کہ مجیدہ بیگم نے انہیں روک دیا:
 "ٹھہر و حیدر بیٹی۔ ابھی میں نے اپنی بات ختم نہیں کی۔" مجیدہ بیگم سنبھل سنبھل کے کہہ رہی تھیں "ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ حوراج ہٹ سے ٹکرایا۔ اس نے اپنا سب کچھ گنوا دیا۔ اس مثل کا اگلا ٹکڑا یہ ہے کہ جس نے تریا ہٹ توڑی اس نے زندگی کی راحت چھوڑی۔ تریا ہٹ سے مراد ہے عورت کی ضد۔ پس جس طرح راج ہٹ سے ٹکرانے سے سب کچھ گنونا پڑتا ہے اسی طرح تریا ہٹ کے توڑنے سے زندگی کا عیش چھوڑنا پڑتا ہے۔"

فاطمہ بیگم خوش ہو کر جلدی سے بولی:
 "امی جان۔ اس کا مطلب ہے کہ نواب بہادر کو میری ضد مان لینی چاہیے۔"

"ہاں تو پوری مثل یوں ہے کہ "تین بیس کبھی نہیں ٹوٹیں۔ چاہے دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے۔"

بڑی بی بی کنیزوں کے سارے کڑی چبا چبا کے کھد رہی تھیں:
"ان ہٹوں میں سے ایک ہے 'راج ہٹ'۔ دوسری ہے 'نریم ہٹ' اور تیسری ہٹ کا نام ہے 'بال ہٹ'۔ یعنی بچے کی ضد۔ یہ تینوں ضدیں ہمیشہ پوری ہوتی ہیں اور ہمیشہ پوری ہوتی رہیں گی۔"

حیدر علی کی والدہ کے اس فیصلے کو سب نے پسند کیا۔ فاطمہ بیگم اور حیدر علی کے درمیان اسی شادی کے سلسلے میں جو اختلاف پیدا ہو گیا تھا، اس کا بھی خاتمہ ہو گیا اور دونوں کی ضدیں بھی برقرار رہیں۔

پھر ۱۸۵۵ھ یعنی ۱۷۷۷ء کی ایک مبارک رات کو شہزادہ شیو سلطان کے دو عقد ہوئے۔ ایک بار بارات جس میں حیدر علی کے علاوہ تمام عمائدین سلطنت اور معززین شامل تھے، امام صاحب بخش نانٹہ کے گھر لگی اور ان کی دختر کو رخصت کرا کے لایا گیا۔ پھر اسی رات کو شہزادے کی دوسری بارات چڑھی اور لالہ میاں کے گھر پہنچی۔ اس بارات میں بھی وہی باراتی تھے۔ اس طرح رقیہ بانو کو رخصت کرا کے لاتے لاتے نصف شب سے زیادہ گزر چکی تھی۔

دونوں باراتیں بڑی دھوم دھاک سے پڑھی تھیں۔
حیدر علی کے گھر میں یہ پہلی شادی تھی اور شادی بھی ولی عہد سلطنت شہزادہ شیو سلطان کی تھی پھر کیوں نہ خوشیاں منائی جاتیں؟
ایک ماہ تک پورے ملک میں خوشیاں منائی گئیں۔ ہر کوچہ و بازار میں چراغاں کیا گیا اور تمام خواص و عوام کو دعوت حیدر میں شریک کیا گیا۔ غریب و مساکین کو جی کھول کے بخشش دی گئی۔ خزانے کا منہ کھول دیا گیا اور سب نے حسبِ توفیق اپنا حصہ پایا۔
کہتے ہیں پورا مہینہ رقص و سرود کی اس تندر محفلیں جہیں کہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے روز ایک شادی ہوئی تھی۔

ولی عہد سلطنت کی شادی سے فارغ ہونے کے بعد حیدر علی خاں نے اپنے مرحوم بھائی شہباز خاں کی دو چھوٹی بیٹیوں کی شادی کی۔ ان میں سے ایک لڑکی علی خاں نانٹہ سے بیاہی گئی

"بالکل مان لینا چاہیے۔"
مجیدہ بیگم نے بے تکلف کہہ دیا:
"لیکن جس طرح حیدر بیٹے کو تمہاری ضد مان لینا چاہیے اسی طرح تمہیں بھی حیدر بیٹے کی ضد پوری کرنی چاہیے۔"

فاطمہ بیگم اور حیدر علی دونوں نے گہرا کر مجیدہ بیگم کو دیکھا:
"مگر اور نہ رہا۔ دو میں سے ایک ہی بات ہو سکتی ہے!" حیدر علی سے نہ رہا گیا اور وہ کہہ بیٹھے۔
مجیدہ بیگم نے گھور کر انہیں دیکھا:

"ایک نہیں۔ دونوں باتیں ہو سکتی ہیں اور ہوں گی۔ تمہاری ضد ہے کہ شہزادے کی شادی امام صاحب بخش نانٹہ کی بیٹی سے کی جائے۔ یہ بات ہوگی۔ تم شہزادے کی شادی دہل کر دو۔ رہی فاطمہ بیگم کی بات، تو وہ شہزادے کی شادی رقیہ بانو سے کرنا چاہتی ہیں، انہیں اپنی ضد پوری کرنے دو۔ وہ شہزادے کی شادی رقیہ بانو سے کر دیں۔
اب میری ضد ہے کہ شہزادے سے شیو کی شادی امام صاحب بخش کی بیٹی اور رقیہ بانو سے یعنی دونوں لڑکیوں سے ہو اور ایک ساتھ اور ایک ہی دن ہو۔ اس طرح تم دونوں کی ضرر پوری ہو جائے گی۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"
"بالکل ٹھیک۔ اسی جان۔ آپ نے بڑا اچھا فیصلہ کیا۔" فاطمہ بیگم مسرت سے بولیں۔ ان کی ضد جو پوری ہو رہی تھی۔

حیدر علی نے بھی ماں کے فیصلے کی تائید کر دی:
"اور نہ رہا۔ مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہے۔"
"اب مجھے اجازت دو۔ میں جا رہی ہوں۔" مجیدہ بیگم نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دیے اور ان کی کنیزوں نے سارا دے کر انہیں کھڑا کر دیا۔
مجیدہ بیگم دو قدم چلیں۔ پھر رکیں اور پلٹ کر بولیں:
"میں نے جو ہندی مثل بیان کی ہے اس کے دو ٹکڑے تم نے سن لیے مگر اس کا ایک ٹکڑا ابھی باقی ہے۔ کو تو وہ بھی بیان کر دوں؟"
"ضرور اسی جان۔ ضرور بیان کیجیے۔" فاطمہ بیگم چپک کے بولیں۔

اور دوسری کا عقد ملین خاں دکنی سے ہوا۔
شاہی خاندان کی شادیوں کے اس سلسلے میں سب سے آخری شادی شہزادہ یسویں کی بہن کی
تھی۔ اس شہزادی کو حافظ علی ولد شاہ صاحب دکنی سے بیاہا گیا۔
اس طرح شادیوں کا یہ سلسلہ ایک مہینے سے بڑھ کر کئی مہینوں پر محیط ہوا اور ان دنوں میں
سرنگاپٹم کے گلی کوچوں میں ہر وقت میلہ سا لگا رہتا تھا۔

شاہی خاندان کی ان تمام شادیوں کے بعد حیدر علی خاں اور بیٹو سلطان اپنی فوج کے انتظام
کی طرف متوجہ ہوئے۔
حیدر علی نے فرانسیسی، ولندیزی اور پرتگالی بندرگاہوں سے اپنی فوج کے لیے اسلحہ اور
دیگر سامان جنگ منگوایا۔ آئندہ تین سال تک حیدر علی اور شہزادہ بیٹو زیادہ تر سرنگاپٹم ہی میں
رہے مگر وہ مرہٹوں، انڈیا اور انگریزوں سے ملنے والی سرحدوں سے غافل نہیں ہوئے اور انہیں
مضبوط سے مضبوط تر بناتے رہے۔
پتلی درگ کی مہم کے بعد ایک نہایت دلچسپ واقعہ پیش آیا تھا۔ یہاں پر اس کا ذکر قارئین کیلئے
دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔
واقعہ کچھ یوں ہے کہ نواب بہادر حیدر علی خاں کے دماغ میں ایک دم یہ خیال آیا کہ اس کے
عطا مہدین اور متعلقین بظاہر اس کی وفاداری کی بڑی ڈینگیں مارتے ہیں۔ کیوں نہ ایسا انتقام کیا جائے
کہ ان کی وفاداری کا امتحان ہو سکے اور دوست دشمن کی تمیز بھی ہو جائے۔

چنانچہ —

حیدر علی خاں نے یہ کیا کہ خود ایک خیمے میں گوشہ نشین ہو گیا اور ایک شاندار تابوت بنا کر
سرنگاپٹم روانہ کر دیا۔

منصور یہ کیا کیا کہ نواب بہادر کا انتقال ہو گیا ہے اور ان کی میت سرنگاپٹم بھیجی جا رہی ہے
تابوت پر سرنگاپٹم پر دس پڑے ہوئے تھے۔ آگے آگے چلنے والوں کے ہاتھوں میں عود دان اور
لوبان دان تھے جن سے خوشبو دار دھواں پھیل رہا تھا۔ تابوت کے چاروں طرف بہریدار سوار
چل رہے تھے۔

حیدر علی خاں کے مرنے کی خبر پھیلی تو پورے ملک میں کھرام مچ گیا۔ سوائے چند لوگوں کے
کسی اور کو حقیقت کا علم نہ تھا۔ یہاں تک کہ تابوت کے ساتھ چلنے والے سپاہیوں کو بھی کچھ علم
نہ تھا۔ وہ روتے اور سر پیٹتے تابوت کے ساتھ چل رہے تھے۔
تابوت جس آبادی سے گزرتا وہاں کے باسی خاک، ہسر چھیٹے پتلا تے تابوت کے ساتھ
کچھ دور تک چلتے رہتے۔

ظاہر ہے کہ اس سانحے کا رد عمل تو ہونا ہی تھا۔ حیدر علی کے دوستوں کو حد درجہ افسوس
ہوا جس نے سنا اس کے آنسو ٹپک آئے۔ وہ بیوہ اور مکین عورتیں جن کے حیدر علی نے وظیفے مقرر
کر رکھے تھے ان کے بچے تو دیکھتے نہ جانتے تھے۔ وہ اپنا سینہ اور سر پیٹتی ہوئی تابوت کے ساتھ
ساتھ بھاگ رہی تھیں۔
مگر —

حیدر علی کے دشمنوں نے اس خبر پر خوب بغلیں بجائیں۔ مرہٹوں، انگریزوں اور نظام دکن
نے سکھ کا مانس لیا۔
نواب عبدالعلیم خاں والی کڑیہ تو اس حادثے سے اس قدر خوش ہوا کہ اس نے پورے علاقہ
میں میٹھی تقسیم کرائی اور حکم دیا کہ خوشی کے تاریاں بے بسائے جائیں۔ اس نے حیدر علی پرچہ نوپس
کو بھی کڑیہ سے نکال باہر کیا۔

ادھر حیدر علی کو ایک ایک لمحے کی خبر مل رہی تھی۔ جب انہوں نے والی کڑیہ عبدالعلیم کی شادمانی
کا حال سنا تو مارے غصے کے بڑا حال ہو گیا۔ پھر وہ خلوت سے باہر آئے اور دربار لگایا۔

جن لوگوں نے حیدر علی کے لیے جس قدر غم کا اظہار کیا تھا اسی اعتبار سے انہوں نے ان میں
انعام و اکرام تقسیم کیا۔ اور عبدالعلیم خاں کے خلاف فوج کشی کا حکم دیا اور خود فوج لے کر کڑیہ
کی طرف روانہ ہونے کا قصد کیا۔

عبدالعلیم خاں کو حیدر علی کے زندہ ہونے کی خبر ملی تو اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ اس نے
فوراً اپنے وکیل کو معافی مانگنے کے لیے حیدر علی کے پاس بھیجا۔ وہاں عبدالعلیم کا نکالا ہوا نواب بہادر
کا پرچہ نوپس موجود تھا اور اس نے رد و کر نواب سے بیان کیا کہ والی کڑیہ نے اسے
کس قدر ذلیل کر کے نکالا تھا اور کیسی شان سے نواب کی موت کا جشن منایا تھا۔

حیدر علی نے والی کڑیہ کے وکیل کو بے نیل و مرام واپس بھیج دیا اور سارے دار و کھوار اب عبدالعلیم

کو کسی صورت معافی نہیں مل سکتی۔

عبدالعظیم خاں کے لیے اب سوائے مقابلہ کے اور کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے دو بہن بھائیوں اور حسین بیاب کی سرکردگی میں ایک لشکر دیپور کی طرف روانہ کیا تاکہ حیدر علی کو روکنے کی کوشش کریں۔

اتفاق سے دیپور میں پہلے ہی سے میر رضا علی خاں موجود تھا۔ اسے نواب بہادر نے اپنے آنے کی خبر بھیج دی تھی اور وہ انتظار کر رہا تھا۔

ادھر سے عبدالعظیم خاں کے دونوں بھتیجے افغانوں کا لشکر لے کر دیپور پہنچے اور انہوں نے ہلے ہی میر رضا علی خاں پر حملہ کر دیا۔

یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ میر رضا علی خاں کو شکست ہو گئی لیکن اسی وقت حیدر علی خاں پہنچ گئے اور انہوں نے والی افغان کے اس لشکر کو کڑ پتہ کی طرف پھینکا ہونے پر مجبور کر دیا۔

دیپور کا یہ معرکہ ۱۷۷۹ء میں پیش آیا تھا۔ افغانوں نے بڑی سخت مدافعت کی اور ان کے فوجی سردار ہاتھیوں پر سوار میدان میں ڈٹے رہے تھے۔ صبح سے دوپہر ہو گئی۔ جب حیدر علی نے دیکھا کہ وہ ہتھیار نہیں ڈالتے تو انہوں نے ان پر ایسی گولہ باری کرائی کہ ان کی ایک نہ چلی اور ہتھیار ڈالتے ہی بنی۔

سعد بیاب اور حسین بیاب کو گرفتار کر لیا گیا۔

وہاں سے حیدر علی لشکر کڑ پتہ پہنچا اور ایک ہی حملے میں قلعہ کڑ پتہ فتح ہو گیا۔ نواب عبدالعظیم اور اس کے بھتیجوں سعد بیاب اور حسین بیاب کو جوبلی میں قید کر دیا گیا۔

حیدر علی نے حکم دیا کہ تمام افغان اپنے ہتھیار حیدر علی فوج کے حوالے کر دیں۔ اس حکم پر بعض افغانوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ جھگڑا بڑھ گیا۔ رات کا وقت تھا اور حیدر علی میدان میں ایک خیمے میں آرام کر رہے تھے۔

ایک افغان جھگڑتا ہوا حیدر علی کے خیمے کی طرف پہنچ گیا اور تنگی تلوار سے خیمے کے اندر داخل ہو گیا۔ حیدر علی شور سن کر بیدار ہو گئے اور قنات چیر کر دوسری طرف نکل گئے۔ لوٹھکھٹایا ہوا افغان حیدر علی کے خیمے پر تلوار مارنے لگا۔ اسی وقت ایک حیدر علی لشکر نے اندر آ کر اس کا خاتمہ کر دیا۔

رات کی اس افزائش میں عبدالعظیم خاں کو موقع مل گیا اور وہ سدھو کوٹ بھاگ جانے میں

کامیاب ہو گیا۔

صبح کو جب عبدالعظیم خاں کے فرار ہو جانے کی اطلاع حیدر علی کو دی گئی تو انہوں نے اسی وقت ایک دستہ کٹھن کوٹ روانہ کیا اور خود افغانوں کے قتل عام کا حکم دے کر سدھو کوٹ چل پڑے۔ وہاں پہنچ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

میر رضا علی خاں فوجی دستے کے ساتھ کٹھن کوٹ پہنچا اور اس نے کٹھن کوٹ کو فتح کر لیا۔ سدھو کوٹ کا یہ انجام ہوا کہ نواب عبدالعظیم نے اپنے وکیل محمد غیاث کو نواب بہادر حیدر علی خاں کے پاس بھیجا۔

”نواب بہادر“ محمد غیاث نے والی میسور کے حضور بڑے ادب سے عرض کیا:

”میرے آقا نواب عبدالعظیم خاں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں شاہ میسور سے ان کی طرف سے دست بستہ معافی کا خواست گزار ہوں۔ انہیں امید ہے کہ آپ اپنے الطاف خسروانہ کے تحت انہیں معاف فرمائیں گے۔“

”مہر گز نہیں“ نواب بہادر نے غصہ سے جواب دیا:

”عبدالعظیم خاں کی یہ پسلی غلطی نہیں۔ وہ اس سے پہلے بھی مرہٹوں کی حمایت میں ہمارے خلاف تلوار اٹھا چکا ہے۔“

”انہیں اپنی غلطی کا احساس ہے عالی مرتبت شاہ میسور“۔ محمد غیاث نے بڑے مہذب طریقے سے اپنے آقا کی وکالت کی:

”انہی غلطیوں کا نتیجہ ہے کہ آج وہ ذلیل و خوار ہو کے آپ کے سامنے دست بستہ معافی نامہ پیش کر رہے ہیں۔ شاہ معظم کو اپنی عظمت کا اظہار کرتے ہوئے انہیں معاف کر دینا چاہیے؟“

آخر حیدر علی نے مشروط معافی پر اظہارِ رضامندی کیا۔

”محمد غیاث“ ہم تمہاری وکالت سے خوش ہوئے۔ تمہارے آقا کو ہم معافی دے سکتے ہیں مگر ایک شرط پر۔“

”وہ کیا شرط ہے بادشاہ؟“ محمد غیاث نے جلدی سے پوچھا۔

حیدر علی نے شرط بیان کی:

”شرط یہ ہے کہ عبدالعظیم کے ساتھ قلعے کے اندر جتنے افغان سپاہی ہیں ان سب کو باہر نکال دیں۔ اسی صورت میں ہم اسے معاف کر دیں گے!“

منہد ہو کر انگریزوں کو ملک سے نکال دیں۔

حیدر علی نے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس لیے کہ مرہٹے آئے دن اس کے علاقوں پر یلغار کرتے رہتے تھے اور علاقوں کی تباہی و بربادی کے علاوہ اسے مرہٹوں کو لاکھوں اور کروڑوں کی رقم دے کر اپنے ملک سے نکلنا پڑتا تھا۔

نظام دکن کی بھی یہی کیفیت تھی۔ اس کے دربار میں انگریزوں کا اثر و سرور اس قدر بڑھ گیا تھا کہ وہ نظام کے علاقہ گنٹور پر بغیر نظام کی اجازت کے قابض ہو گئے تھے۔

مرہٹوں اور نظام کے علاوہ حیدر علی کو انگریزوں سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لیے کہ انگریزوں نے سادہ مدراس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے حیدر علی کے درخواست کرنے کے باوجود مرہٹوں کے خلاف فوجی مدد نہیں دی تھی۔ حیدر علی کے لیے یہ تینوں طاقتیں انتہائی بد لحاظ بے مروت اور ناقابل اعتبار تھیں۔

ابھی یہ خط و کتابت ہو ہی رہی تھی کہ یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔

انگریزوں کا ملک برطانیہ اور فرانسیسیوں کا ملک فرانس براعظم یورپ میں واقع ہیں اور ان کے درمیان ۱۸ میل کی ایک سمندری پٹی واقع ہے۔ اسی پٹی کو انگلش چینل کہا جاتا ہے۔ یورپ کی یہ دونوں قومیں زمانہ قدیم سے لڑتی جھگڑتی چلی آرہی ہیں۔

اسی طرح جب قوموں میں یورپ میں جنگ شروع ہوتی ہے تو اس کا اثر ان کی نوآبادیات پر بھی پڑتا ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کے پاس کلکتہ، بمبئی اور مدراس کے کچھ علاقے تھے جبکہ فرانسیسیوں کے قبضے میں پانڈیچری اور ماہی کی بندرگاہ تھے۔ یورپ میں جنگ چھڑتے ہی انگریزوں نے پانڈیچری پر قبضہ کر لیا اور فرانس سے لے کر ماہی کی طرف بڑھے۔

ماہی مالابار کے علاقے میں تھا اور مالابار کا پورا علاقہ حیدر علی کے زیر تسلط تھا۔ انگریز بغیر حیدر علی کے علاقے سے گزرے ماہی تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

حیدر علی نے ایک قاصد کے ذریعے انگریزوں کو تنبیہ کی کہ ان کی فوجیں ماہی پہنچنے کیلئے حیدر علی کی زیر تسلط سرزمین سے گزرنے کی کوشش نہ کریں۔

انگریزوں نے اس تنبیہ کی کوئی پروا نہ کی اور حیدر علی کے علاقے کو روندتے ہوئے ہی پہنچے اور اس پر قبضہ کر لیا۔

غرضیات سلام کر کے واپس گیا۔ عبدالحلیم خاں سے شرط بیان کی۔ اس نے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جانوں پر تمام افغان سپاہیوں کو قربان کر دیا۔

اس نے حکم دیا کہ تمام افغان سپاہی قلعہ سے نکل جائیں۔ سپاہی قلعے سے باہر نکلے اور قتل کر دیے گئے۔

اس وقت کمانڈر تیر کی طرح عبدالحلیم خاں کے دیوان خانے میں پہنچا اور اسے پاکی میں بیٹھنے کا حکم دیا۔

عبدالحلیم خاں پاکی میں بیٹھ گیا۔ پھر اس کے حرم کی عورتیں اور دیگر متعلقین کو بھی گرفتار کر لیا گیا اور انہیں شہر گنج میں قید کر دیا گیا۔ عبدالحلیم اور اس کے اہل خانہ کے لیے حیدر علی نے ایک معقول رقم وظیفہ کے طور پر مقرر کر دی۔

کچھ عرصہ بعد اس قید میں تو اب عبدالحلیم خاں کا انتقال ہو گیا۔ حیدر علی خاں نے مرزا کاظم بیگ کے عبدالحلیم خاں کی مہن سے شادی کر لی اور اسے "بخشی سلیم" کا خطاب دیا۔



پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ یوناہ مرہٹہ بیٹھوٹی کے لیے دو گروہوں میں جنگ شروع ہو گئی تھی۔ مرہٹوں کے ایک گروہ کا سرغنہ رگوبانڈا اور دوسرا گروہ نالاجی راؤ کے شیر خوار پیکار تھا جس کا ساتھ مرہٹہ وزیر اعظم نانافرنوس دے رہا تھا۔

مرہٹوں کی آپس کی اس جنگ میں حیدر علی خاں نے تو کوئی حصہ نہ لیا مگر انگریز رگوبانڈا حمایت میں کھڑے ہو گئے اور انہوں نے اپنی فوج بھیج کے جنگ کے شعلے اور بھڑکا دیے۔ اس وقت نانافرنوس کو ہوش آیا کہ انگریز ہندوستانیوں کے آپس کے اختلافات سے فائدہ اٹھا کر کسی طرح اپنا علاقہ بڑھا رہے ہیں۔

رگوبانڈے انگریزوں کو اس مدد کے عوض ایک بڑا علاقہ لکھ کے دیدیا تھا۔ یہ بات دماغ میں آنے ہی نانافرنوس نے ایک خط نظام دکن کو اور دوسرا خط حیدر علی کو لکھا۔ خط کا مضمون کچھ اس طرح تھا:

انگریز دوزب و زاپنی چہرہ و تنوں سے ہندوستان پر قبضہ کر رہے ہیں۔ تحفظ وطن کی خاطر اب ضروری ہے کہ دیسی حکمران ملک

اسی خبر سے حیدر علی کے قہقہے بدن میں اگ لگ گئی۔ ان کی دور رس نگاہوں نے عسوس کر لیا کہ ہندوستان کی کمزوری کی اصل وجہ ہندوستان میں بحری فوج اور طاقت کا فقدان ہے۔ اس مسئلے میں وہ پہلے ہی قدم اٹھا چکے تھے۔ ماہی کی بندرگاہ کے ذریعے حیدر علی کا یورپ سے رابطہ تھا جہاں سے وہ سامان جنگ منگا سکتے تھے اور اس بندرگاہ کے ذریعے انگریزوں کے خلاف فرانسیسیوں سے بھی سامان حاصل کر سکتے تھے۔

انگریزوں کے بندرگاہ ماہی پر قبضہ کرتے ہی نواب حیدر علی خاں نے کرناٹک پر زبردست حملہ کر دیا۔

کرناٹک کہنے کو تو والا جاہ محمد علی کے قبضہ میں تھا مگر اس علاقے کے مالک اصل میں انگریز یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی تھی۔

حیدر علی کے اس حملہ کے متعلق یورپ کے تمام موزخین ایک ہی بات لکھتے اور کہتے ہیں اور وہ بات یہ ہے کہ:

حیدر علی خاں کا حملہ ایک طوفان برق و باد تھا جو میسور سے اٹھا اور

کرناٹک پر چھا گیا۔ نواب حیدر علی خاں کے زیرِ کمان اسی ہزار کا لشکر تھا۔

نواب حیدر علی کا یہ حملہ اس قدر مہیب تھا کہ کرناٹک نے اپنی سر زمین پر اس سے پہلے اتنا بڑا افواج کا اجتماع نہ دیکھا تھا۔

حیدر علی نے اپنے لشکر کو مختلف سرداروں اور دونوں شہزادوں، شہزادہ شیواور شہزادہ کریم میں تقسیم کر دیا اور خود ایک حصہ فوج کے ساتھ پائیں گھاٹ کی طرف پیش قدمی کی۔ یہ علاقہ والا جاہ محمد علی کا تھا۔

اس جنگ کو انگریزوں کی دوسری جنگ کانام دیا جاتا ہے۔ اس کام غازی جولاہی ۱۸۱۷ء میں ہوا اور یہ دو سال تک جاری رہی۔

شہزادہ شیو نے پائیں گھاٹ سے نکل کے قلعہ ارنی کا محاصرہ کر لیا۔ پھر اس محاصرہ پر بدرازاں کو مامور کر کے خود نری کی طرف بڑھا اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

حملات حیدر علی کا مصنف اس حملہ کے بارے میں لکھتا ہے:

"والا جاہ کے قلعہ دار نے شہزادہ شیو کے حضور خود آ کر عرض کیا: شہزادہ بہادر۔ میں قلعہ کی حفاظت کرنے کو تیار ہوں مگر قلعہ میں

کثرت سے اہل سادات آباد ہیں اور سادات خاتین آپ کی گولہ باری سے بہت زیادہ خوفزدہ ہیں۔ اس لیے گولہ باری موقوف کر کے آپ قلعہ کا قبضہ لے لیجیے۔"

شہزادہ شیو کو قلعہ ارحین علی خاں کے اس فضول جواز پر سنسی آگئی۔ اس نے قلعہ دار کو کوئی جواب نہ دیا البتہ اس سے قلعہ کی چابیاں لے کر سیدی انام کے سپرد کر دیں۔ سابق قلعہ دار وہاں سے رخصت ہو کر اندرون ملک چلا گیا۔

فتح ارنی کے بعد تروکورا، کلہوہ اور کادییری پٹن معمولی لڑائیوں کے بعد قبضہ میں آ گئے۔ شہزادہ کریم نے بندرگاہ محمود بند پر حملہ کیا اور چند دنوں کی جنگ کے بعد اس پر حیدر علی پرچم لہرا دیا۔

نواب بہادر اپنے لشکر کے ساتھ چنگا گھاٹ سے نکل کے کرناٹک کے صدر مقام ارکاٹ پہنچے راستے میں چھوٹے چھوٹے قلعوں پر معمولی سی مزاحمت ہوئی اور بس!

اب نواب بہادر کی فوج کبھی درم کے نواح میں پہنچ چکی تھی اور ان کے بہادر دستے انگریزوں کے مرکز مدراس کے قریب پہنچے ہوئے تھے۔

انگریزوں نے ارکاٹ کو بچانے کے لیے دو لشکر مدراس سے روانہ کئے۔ ان میں سے ایک لشکر کا کمانڈر سر سیگنر منز تھا اور دوسری فوج کرنل ہیلی کے زیرِ کمان تھی۔ کرنل ہیلی تمام دکن کے علاقہ گنٹور کا انگریزوں کی طرف سے حاکم تھا۔

نواب بہادر کو ان لشکروں کی آمد کی خبر ملی تو وہ ارکاٹ کے محاصرہ پر ایک دستہ فوج چھوڑ کے باقی لشکر کے ساتھ کبھی آگئے۔ یہاں سے انہوں نے شہزادہ شیو کو حکم بھیجا کہ وہ پولی پور پہنچ کے کیمپ لگائے اور دونوں لشکروں کو آپس میں ملنے سے باز رکھے۔

کرنل سر سیگنر منز اپنے لشکر کے ساتھ پولی پور پہنچا اور وہاں سے دو میل آگے ندی کے کنارے اپنا کیمپ لگالیا۔

دوسری طرف کرنل ہیلی بھی پولی پور آیا تو وہاں اس کی شہزادہ شیو سے جنگ شروع ہو گئی۔ جنگ کو چند ہی گھنٹے گزرے تھے کہ نواب حیدر علی نے اپنے ایک دستے کے ساتھ کرنل ہیلی پر دوسری جانب سے حملہ کر دیا۔

حیدر علی کے اس حملہ سے کرنل ہیلی کی فوج جیسے چٹکی کے دو پاٹوں کے درمیان آگئی۔

کرنی فوج بھی اس جنگ میں مارا گیا۔ کرنی بلی اور کپتان میرٹھ باقیانہ
فوج کے ساتھ گرفتار ہوئے۔
جس وقت کرنی بلی کی شکست کی خبر سرسبکپتر منرو کو ملی تو وہ اپنی بڑی بڑی قوتیں دریا میں
پھینک کر مدد فرما رہا ہو گیا۔

جنوبی بھارت کے نقشہ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ مرہٹوں کی پونا کی سلطنت اور نظام
دن کی حکومت کے علاوہ جنوبی ہند کا تمام علاقہ سلطنت خداداد میسور میں شامل ہو گیا تھا۔ نواب
حیدر علی خاں نے گزشتہ اسی سال میں میسور کی ایک چھوٹی سی ریاست کو ایک عظیم سلطنت
میں تبدیل کر دیا تھا۔

اس سلطنت کے قیام میں حیدر علی خاں کے علاوہ اس کے جوان سال بیٹے شہزادہ ٹیپو کا بھی
پورا پورا ہاتھ تھا۔ یہ ساری ترقی حیدر علی اور ان کے شیردل فرزند شہزادہ ٹیپو کے زور بازو اور
دورانہ لیشی کا نتیجہ تھی۔

وہ سینکڑوں پائیکار جو حکومت کی فتح و شکست کے ساتھ ہی اپنی وفاداریاں تبدیل کر لیتے
تھے، اب پوری طرح مطیع ہو چکے تھے۔

حیدر علی نے بڑے بڑے کچلے ہوئے کے سر نیچے کر دیے تھے اور انہیں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور
کر دیا تھا۔ نواب بہادر نے انہیں صرف بزدل شمشیر ہی مطیع نہیں کیا تھا بلکہ بعض سرکشوں کو الفت
اور قربت کے رشتے میں جوڑ کر بھی اپنا بنایا تھا۔

ساد نور کا حاکم عبدالعلیم خاں (یاد رہے کہ یہ دلی کرپہ عبدالعلیم خاں نہیں ہے) کبھی کبھی بغاوت
پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ حیدر علی نے اسے قربت کی ارماری یعنی اپنے دوسرے بیٹے شہزادہ کریم صاحب
کی شادی عبدالعلیم خاں حاکم ساد نور کی صاحبزادی سے کر دی۔ یہی نہیں بلکہ اپنی بیٹی کو عبدالعلیم خاں
کے بیٹے عبدالغیر خاں سے بیاہ دیا۔

شہزادہ ٹیپو اب تک ہر معرکہ میں حیدر علی خاں کے ساتھ رہا تھا اور اس نے تباہت اور
اولوالعزمی کے ایسے جوہر دکھائے تھے کہ معاملات جنگ ہوں یا صلح کی گفتگو، انتقام سلطنت ہو
یا عوام کی فلاح و بہبود کے منصوبے، ہر معاملہ میں حیدر علی، شہزادہ ٹیپو کی رائے اور شرکت کو

ایک طرف سے شہزادہ ٹیپو اور دوسری طرف سے حیدر علی نے انگریزوں کو مارنا شروع کیا۔ کرنی بلی
نے گھرا کر ایک باغ میں پناہ لے لی مگر حیدر علی نے باغ پر گولہ باری شروع کرادی جس سے
پورا باغ دھوئیں سے بھر گیا۔ اب حیدر علی نے اپنے سواروں کو باغ میں داخل ہونے کا حکم دیا۔
حیدر علی فوج کے سواروں نے باغ میں داخل ہو کر انگریزی فوج پر اس قدر زبردست حملہ کیا کہ
انگریز گاجر مولیٰ کی طرح کٹنے لگے۔ یہاں تک کہ فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔

حیدر علی سواروں نے انگریز لشکریوں کو بھی گرفتار کیا اور ان کے سالار کرنل بیلی کو بھی
امیر کر لیا۔

بادشاہ کے مصنف نے اس جنگ کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

جہاں جُرنے دیکھا جو لشکر کھڑا

تو آسمانے اس کے باندھا پیرا

سوارانِ جنگی و مردانِ کار

ہوئے آکے قائم یسین و یسار

لگی لڑنے پھر دونوں جانب کی فوج

لگا مارنے خون ہر سمت موج

ہو اس گھڑی اس قدر کشت و خون

کہ حیرت میں تھا چرخِ خیر و زہ کوں

عدو اس قدر واں یہ کشت ہوئے

کہ میدان میں کشتوں کے پتے ہوئے

ہوا موت کا واں پہ بازارِ گرم

دلوں میں رحم اور نہ آنکھوں میں شرم

برستی تھیں یوں گولیاں اس گھڑی

کہ بھادوں کی جس طرح برسے بھڑی

اس نظم میں پہلے شعر میں "جہاں جو" کا اشارہ شہزادہ ٹیپو کی طرف ہے۔

رسالہ "لٹریٹری بائیو گرافی" مطبوعہ لندن، میں تحریر ہے کہ:

"اس جنگ میں مارٹے چار ہزار فرنگی سپاہی مارے گئے۔"

پولی پور کی فتح میلو کا ایک شاندار کارنامہ تھا۔ اس فتح کو وہ کبھی نہیں بھولا۔ اس جنگ کی یادگار کے طور پر شہزادے نے دریا دولت باغ میں تصاویر بنوائیں جن میں اس جنگ کے پورے واقعات دکھائے گئے تھے۔

اس واقعہ کے بعد میلو کا نام انگریزوں میں لرزہ پیدا کر دیتا تھا۔ انہوں نے شہزادے کے بارے میں بہت سے من گھڑت قصے تراشے۔ اسے ظالم اور جابر کہا گیا بلکہ لغت میں برائی کے جتنے الفاظ تھے وہ سب شہزادے میلو کے لیے استعمال کیے گئے۔

داعی کے مقام پر حیدر علی کے سامنے انگریز قیدی لائے گئے۔ ان قیدیوں میں ہزل بیدی بھی تھا۔ قیدیوں کے ساتھ انگریزوں کے کئے ہوئے سر بھی تھے مگر ان میں کرنل فلچر کا سر نہ تھا۔ فلچر کے سر کی تلاش میں لوگوں کو لگایا گیا۔ تلاش، سیار کے بعد فلچر کا سر بھی دستیاب ہو گیا۔ حیدر علی نے ان قیدیوں کو شہزادہ میلو کے سپرد کر دیا۔

شہزادہ میلو نے انگریز قیدیوں کے ساتھ نہایت شریفانہ برتاؤ کیا اور ان کی بڑی خاطر تواضع کی۔

قیدیوں میں ایک کپتان مونٹن نام کا تھا۔ اس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اس کی بیوی مدراس میں تھی۔ کپتان نے شہزادے سے اظہار کر دیا کہ وہ اپنی بیوی کو خط لکھنا چاہتا ہے۔ شہزادے نے اسے خط لکھنے کا سامان مہیا کیا اور خط لے جانے کے لیے ایک تیز رفتاری سے مقرر کر دیا۔

ان قیدیوں میں ڈیوڈ میرڈ بھی تھا۔ اس نے اس بات کی گواہی دی ہے کہ شہزادے میلو کا سلوک تمام قیدیوں کے ساتھ بھی نہایت شریفانہ تھا اور انگریز افسروں کا شہزادہ میلو بہت زیادہ خیال رکھتا تھا۔

شہزادہ میلو کرنل بلی کی بہت دلجوئی کرتا تھا اور اسے وہ تمام چیزیں مہیا کر دی گئی تھیں جن کی اس نے تمنا کی تھی۔

لیکن —

انگریز مورخین نے شہزادہ میلو کو کبھی اچھے نام سے یاد نہیں کیا۔

قیدیوں کو سرنگاٹم بھیجنے کے بعد حیدر علی خاں دیو پر قبضہ کرتے ہوئے اڑکات سینے۔

مقدمہ رکھتے تھے۔

اس جنگ اس بات کا اظہار کر دینا بہت ضروری ہے کہ پچھلے چھ سال سے حیدر علی ایک خطرناک مرض میں مبتلا تھے جس کی خبر بہت کم لوگوں کو تھی۔

نواب بہادر کی بیٹی پر سرطان کے پھوٹے نکلنے تھے جنہیں جراح نثر زنی کر کے صاف کر دیا کرتے تھے مگر یہ موزی مرض جس کو لگ جائے اس کا پتہ نہیں چھوڑتا۔

نواب بہادر کو اظہار نے آرام کا مشورہ دیا تھا مگر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آرام کا لفظ انہوں نے سنا ہی نہ تھا۔ انہوں نے معالجون کے مشوروں کی کبھی پروا نہ کی اور اپنے مرض کی شدت کو بڑھاتے ہی رہے۔

ان کی بیٹی پر ہر سال ایک خطرناک پھوٹا نکلتا جس کا مواد جراحت کے ذریعہ نکال دیا جاتا۔ نواب بہادر صرف چار چھ دن صاحب فراش رہنے کے بعد گھوڑے پر یوں جست کر کے سوار ہو جاتے جیسے انہیں کبھی کوئی مرض ہوا ہی نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی صحت سال بہ سال گرتی چلی گئی۔

مرہٹوں کی چھ سالہ جنگ کے بعد میسور کی دوسری لڑائی نے انہیں اور زیادہ ڈھال کر دیا تھا مگر وہ اپنی تکلیف کو اپنے چہرے سے ظاہر نہ ہونے دیتے تھے اور شدید حملہ مرض میں بھی گھومتے کی سواری نہ چھوڑتے اور زبردستی پر آرام کرتے۔

ان کے تمام قریبی متعلقین ان کی گرتی ہوئی صحت سے سخت پریشان تھے۔ وہ مختلف انداز سے نواب بہادر کو اس مرض کی ہلاکت خیزیوں سے آگاہ کرنے کا کوشش کرتے مگر نواب بہادر اس کان سے سنتے اور اس کان سے اڑا دیتے۔

شہزادہ میلو ہر معرکہ میں اپنے باپ کے دوش بدوش رہتا تھا۔ اس کی تلوار دشمنوں کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہ نوجوان سپہ سالار دن بدن اپنی فوج میں مقبول ہو رہا تھا۔ چچا بہادر جنگ میں تو اس کی ہمارت حرب ایشل بن گئی تھی اور اسی وجہ سے وہ حیدر علی کی نظروں کے ساتھ ساتھ فوج میں بھی ہر دلعزیز ہوتا جا رہا تھا۔

سب جانتے تھے کہ اسی ہونہار شہزادے کو بگے چل کر انتقام سلطنت سنبھالنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سیاست دان اس کی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے اس کے روشن اور تابناک مستقبل کی مسن گوئیاں کرتے تھے۔

حیدرنگر رکھ دیا تھا اور اسے اپنا دارالسلطنت بنائے اس میں بہت سی عمارتیں تعمیر کرائی تھیں۔
حیدر علی نے حیدرنگر کا نیا گورنر اپنے لیے پاک بھٹے شیخ ایاز کو مقرر کیا۔

فتح بدنور کے بعد حیدر علی خاں پھر ارکاٹ والیس آئے اور یہاں انہوں نے ایک بہت بڑا
جشن منایا۔

اس موقع پر جو دربار لگا اس میں امراء نے نذریں پیش کیں نذر پیش کرنے والوں میں
درگاہ شیوستان کے متولی بھی تھے۔ یہ درگاہ انہی شیوستان کی تھی جن کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے
حیدر علی کو شہزادہ شیو دبا تھا اور انہی کے نام پر شہزادے کا نام شیو سلطان رکھا گیا تھا۔
حیدر علی خاں نے شیوستان کے متولی کو ایک سواشر فیاں اور زرہ بنت کا ایک شامیانہ
عنایت کیا جس کے چار دن پائے طلائی تھے۔

قارئین کو علم ہے کہ حیدر علی خاں کی پیدائش کو لار میں ہوئی تھی اور جب والاجاہ محمد علی نے ۱۷۶۸ء
میں کو لار پر قبضہ کیا تھا تو اسے امید ہو چلی تھی کہ اب حیدر علی اس کے پاس معافی مانگنے اور اپنی
جائے پیدائش کو مانگنے آئے گا مگر اس کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی تھی۔
خدا کی قدرت دیکھیے کہ اس کے صرف بارہ سال بعد حیدر علی، والاجاہ کے دارالسلطنت ارکاٹ
پر قبضہ کر کے وہاں جنرل نصرت منار دبا تھا اور والاجاہ انگریزوں کی دوستی میں در بدر رہ رہا تھا۔
اور ان دنوں مدراس میں ایک منور کی زندگی بسر کر رہا تھا۔

حیدر علی نے اس دربار میں بڑے غصے سے اعلان کیا تھا:

"والاجاہ کی وطن دشمنی اور منافقت نے مجھے بہت دکھ دیے ہیں
اس لیے اس دفعہ میں گرنائیک کی رعیت کے لیے غضب الہی بن کر
آیا ہوں۔"

اس کے اس اعلان پر لوگ دربار میں چیخ پڑے تھے کیونکہ مسلسل جنگ کرنے کرنا نیک اور
خاص کردار سلطنت ارکاٹ کے شہر اور مسانوات، نافقشہ بگاڑ کے رکھ دیا تھا اور ہر طرف بربادی
اور ویرانی ڈیرے ڈالے پڑی تھی۔
پس —

ارکاٹ نواب والاجاہ محمد علی کا صدر مقام تھا اور اس کا قیام یہیں رہتا تھا۔

یہ قلعہ مضبوط تھا اور اس کی تفصیل بہت بلند تھی چنانچہ حیدر علی نے زمین کھود کر دھمے بنانے
کا حکم دیا۔ حکم کی دیر تھی کہ لشکریوں نے زمین کھود کے سٹی کے اونچے اونچے ٹیلے بنادیے۔ ان
ٹیلوں پر توپیں چڑھا دی گئیں۔ پھر یہاں دال سے گولہ باری ہوئی تو قلعہ میں زلزلہ آگیا۔
مگر —

قلعہ میں سو بزر والاجاہی اور انگریز فوجوں نے بڑی مسدیدی دھان اور زبردست مدافعت کی
تین ماہ تک قلعہ پر گولہ باری ہوتی رہی مگر تفصیل نہ پڑ سکی۔ تفصیل میں جگہ جگہ رخنہ پڑ گئے۔
ان رخنوں پر حیدر علی فوج نے زبردست حملہ کیا اور دست بدست لڑائی شروع ہو گئی۔ اسی جنگ
میں حیدر علی کے داماد حافظ علی خاں شہید ہوئے۔

حافظ علی خاں کی شہادت سے حیدر علی فوج میر اور زیادہ جوش پیدا ہو گیا اور اس نے ایسا
زبردست حملہ کیا کہ دشمن کے قدم اکھڑ گئے۔ والاجاہ کے تمام سرداروں نے ہتھیار ڈال کے
گرفتار ہو کر پیش کی۔

والاجاہ محمد علی کے جو سردار اس جنگ میں امیر ہوئے ان میں سید حمید خاں، راجہ بیربر
دجنا پڈت، ارشد بیگ، چشتی یار خاں، تبنو نائٹر اور میر صادق شامل تھے۔ ایک پرانا دشمن
نحف نادر ابھی معافی مانگنے حاضر ہوا۔

ان سب سرداروں نے معافی مانگ کر اپنی خدمات۔ نواب بہادر حیدر علی خاں کو پیش
کر دیں۔

نواب بہادر نے ازراہ کرم سید حمید خاں کو چار ہزار سپاہ کی سرداری پر مقرر کیا۔ راجہ بیربر
کو ارکاٹ کی گورنری دی گئی اور میر صادق افسر مال مقرر ہوا۔

واضح رہے کہ یہ وہی نادر میر صادق ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

جعفر از بنگال و صادق از دکن

ننگ توام و ننگ ملت، ننگ وطن

اس کے بعد حیدر علی نے حیدرنگر (بدنور) پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کیا جو اس کے ہاتھ
سے نکل گیا تھا۔

بدنور وہی مقام ہے جس پر قبضہ کرنے کے بعد حیدر علی خاں نے اس کا نام تبدیل کر کے

حیدر علی نے خود ہی اپنے اس اعلان کو رد کر دیا اور ان کے ساتھ اتنا اچھا سلوک کیا کہ وہ حیدر علی کا دم بھرنے لگے۔

مشرط بلوٹ مارٹس ممبر پارلیمنٹ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

”ایک مہیب اور خوریزہ محل کے بعد راکٹ پر ۳۰ نومبر ۱۷۸۰ء کو حیدر علی خاں کا قبضہ ہو گیا۔ قبضے کے بعد رعایا کے ساتھ بہت شرافت اور انسانیت بھرا سلوک کیا گیا۔ لوٹ مار اور قتل و غارت کی قطعی ممانعت کر دی گئی۔ ہر شخص کو اجازت تھی کہ وہ امن و آسائش سے اپنا کاروبار جاری رکھے۔“

اس کے علاوہ والا جاہ کے ملازموں کو ان کے سابقہ عہدوں پر بحال رکھا گیا جو انگریز قیدی حیدر علی خاں کی قید میں تھے انہیں روپیہ دیا گیا کہ وہ اپنی ضروریات پوری کریں۔“

اس سلسلے میں ”امپائر ان ایشیا“ کے مصنف کا بیان بھی قابل ذکر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”انگریزوں نے جب مامی پر قبضہ کر لیا تو حیدر علی خاں کے غصہ کی انتہا نہ رہی۔ وہ کرناٹک پر طوفانِ بلاں کے گراں شدہ دیہات پر نہ صرف قبضہ کیا بلکہ انہیں تباہ کر دیا۔ وہ لوگ (انگریز) جو والا جاہ مجموعی کی نیابت کرتے ہوئے حکمرانی کر رہے تھے رعایا کی حفاظت کرنے کے بجائے انہیں اپنی قسمت پر چھوڑ کر چلے گئے۔ عذریہ تھا کہ فوجِ مدافعت کے قابل نہیں رہی۔“

یہ جگہ تو ہے انگریز جب مدراس پہنچے تو انہوں نے وہاں سے انگلستان کی حکومت کو خط لکھ دیا جس میں حیدر علی کے ظلم و ستم کی فرضی داستانیں بیان کی گئیں مگر ان باتوں کو کوئی مہارت نہ تھی اور نہ ان کا کوئی ثبوت پیش کیا گیا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ کرناٹک کے عوام حیدر علی خاں کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔ اس بات کا ثبوت کرنا کبھی کے واقعہ سے ملتا ہے۔ اس نے اپنے ایک خط میں اقرار کیا ہے کہ:

”کرناٹک کے لوگ ہماری ذرا ذرا سی نقل و حرکت کی اطلاع

حیدر علی کو پہنچاتے تھے۔“

اسی سے حیدر علی کے ساتھ عوام کی ہمدردی کا پورا ثبوت ملتا ہے۔ ایک دوسری مثال سے بھی حیدر علی کے ساتھ عوام کی محبت کا پوری طرح اظہار ہوتا ہے۔ وہ واضح مثال یہ ہے کہ:

”جب کرنل بیلی حیدری فوجوں میں گھر گیا اور اس کی خبر کرنل مزو کو ملی تو اس نے کرنل بیلی کی مدد کا قصد کیا۔ اب مشکل یہ تھی کہ اسے سیدھا اور محفوظ راستہ بتانے والا کوئی نہ تھا۔“

جنرل مزو نے حکم دیا کہ چند مقامی لوگوں کو گرفتار کر کے حاصر کیا جائے۔ انگریز سپاہی کچھ ستامی افراد کو گرفتار کر کے جنرل کے پاس لے آئے۔ اس نے حکم دیا کہ ان کے گلے میں طوقِ غلامی ڈالے جائیں۔

پھر اس نے گرفتار شدہ لوگوں کو حکم دیا کہ وہ انگریز لشکر کو کرنل بیلی کے لشکر تک پہنچا دیں تو انہیں انعام دیا جائے گا اور انہیں طوق اتار دئے آزاد کر دیا جائے گا ورنہ انہیں قتل کر دیا جائے گا۔“

مثیل منظور ہے کہ بندھا ہوا مار کھانا ہے پس گرفتار شدہ مقامی لوگ مجھ کو انگریز لشکر کو راستہ دکھانے پر آمادہ ہو گئے۔

لشکرِ ردائے ہوا مقامی لوگ ان کے آگے آگے تھے۔ یہ سب لوگ تنہا دن سفر کرتے رہے اور شاک کے وقت ایک ایسی جھل یا آلاب کے کنارے پہنچے کہ جس سے آگے جانے کا راستہ مسدود تھا۔ اس وجہ سے جنرل مزو، کرنل بیلی کی مدد کو نہ پہنچ سکا۔“

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ کرناٹک کے لوگ جو انگریزوں کے محکوم تھے وہ حیدر علی سے حدودِ رجعت کرتے تھے۔

یہاں پر اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ کرناٹک وہ علاقہ یا ریاست تھا جس کا والا جاہ محمد علی حاکم تھا اور راکٹ اس ریاست کا دارالسلطنت تھا۔

انگریزوں نے تمام محاذوں پر شکست کھانے کے بعد ایک بار پھر صلح کے لیے سفارت بھیجی۔
نواب بہادر اس وقت ارکاٹ میں مقیم تھے۔

اس سفارت کا سربراہ ایک کپتان تھا۔ اس نے نواب بہادر حیدر علی خاں کے سامنے درخواست پیش کی:

”مدرسہ سرکاری خواہش ہے کہ اب خلیفہ خدا کا خون نہ بہایا جائے کیونکہ اس وقت ہم دونوں طرف سے سینکڑوں آدمی مارے جا چکے ہیں اور اس سے کسی کو کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ اس لیے مدرسہ سرکار نواب بہادر حیدر علی خاں سے درخواست کرتی ہے کہ جنگ بند کر دی جائے اور دونوں فریقوں میں صلح ہو جائے۔“

نواب بہادر نے کپتان کی تقریر رد پذیر سن کے زہر خند کیا:

”بہت خوب۔ انگریز ہم سے پھر صلح کی درخواست کر رہے ہیں۔ ٹھیک ہے ہم صلح پر آمادہ ہیں لیکن ہمیں یہ بتایا جائے کہ کیا انگریز اس سے پہلے ہم سے صلح نہیں کر چکے ہیں؟“

کپتان خوش ہو کر جلدی سے بولا:

”جی ہاں نواب بہادر۔ ہمارے اور آپ کے درمیان صلح نامہ مدرسہ موجود ہے اور میں اسی کا تجدید کے لیے حاضر ہوا ہوں۔“

نواب بہادر نے اسے گھور کر دیکھا:

”کپتان۔ تم نے ٹھیک کہا۔ ہم بھی اسی صلح نامے کا حوالہ دینا چاہتے تھے۔ اچھا ہوا کہ تم نے اپنی زبان سے اس صلح نامے کا ذکر کر دیا۔ مگر شاید تمہیں اس کی شرطیں یاد نہیں۔ ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ صلح نامہ مدرسہ اس وقت ہوا تھا جب ہمارے مکار قوم پورے جنوبی ہند سے نکل چکی تھی اور ہمارے پاس صرف مدرسہ کی ریڈ بلسی رہ گئی تھی۔ اس وقت ہم مدرسہ سے صرف تین یا پانچ ہیل کے فاصلے پر تھے۔ ہمارا لشکر مدرسہ کو گیرے ہوئے تھا اور ہمارا توپ خانہ اس پناہ پر نصب تھا جہاں سے گولہ باری کر کے مدرسہ کو زمین کے برابر کیا جاسکتا تھا۔ کیوں کپتان یاد آیا وہ وقت؟“

”جی ہاں نواب بہادر۔ کپتان جلدی سے بولا:

”میں خود اس وقت مدرسہ میں موجود تھا۔“

نواب بہادر کی تیوریوں کے بل اور گھرے ہو گئے:

گھٹا ایک ہی ماں اور ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ اسی لیے وہ گھٹا سے برادرانہ محبت تو کر سکتی تھی لیکن وہ اس کی اس پاگل بن کی محبت کے سخت خلاف تھی۔

دس سال کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہوتی لیکن گمرخ نے ایک دن گھٹا کو ڈاٹ دیا تھا:

”گھٹا۔ ہوش کی باتیں کرو۔ تم میرے سگے بھائی جیسے نہیں بلکہ سگے بھائی ہو۔ میں تم سے بھائیوں جیسی تو محبت کر سکتی ہوں مگر اس کے آگے کچھ نہیں۔“

مگر اس کے ہم عمر گھٹا نے بڑے والمانہ انداز میں جواب دیا تھا:

”نہیں گمرخ۔ تم میری سگی بہن نہیں ہو۔ میں تم سے بڑا ہوں کر شادی کر دوں گا۔ مجھے تم سے بہت محبت ہے۔“

ادھر گمرخ نے غصہ سے اس کے منہ پر ایک ٹاپنہ جڑ دیا تھا۔

اس دن کے بعد گھٹا نے اسے چھیڑنا اور اپنی بے تنگی باتوں سے تنگ کرنا تو چھوڑ دیا تھا مگر گمرخ کی محبت اس کے دل سے پھر بھی نہ نکل سکی۔

پھر جب وہ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تو گھٹا کی محبت میں کمی ہونے کے بجائے اور اضافہ ہو گیا۔

یہ ۱۶۶۷ء کا آغاز تھا۔

نظام الملک لٹاک دکن نے والی ارکاٹ والا جاہ نواب محمد علی خاں کو سزا دینے کے لیے نواب حیدر علی والی میسور کو ایک نامہ روانہ کیا جس کا ذکر اوپر کر چکا ہے۔

یہ بات نہیں تھی کہ نظام دکن میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ والا جاہ نواب ارکاٹ کو شکست دے سکے بلکہ بات یہ تھی کہ بدبھی تاجر یعنی انگریز والا جاہ نواب محمد علی کے حلیف تھے اور خطرہ یہ تھا کہ اگر نظام نے ارکاٹ پر حملہ کیا تو والا جاہ اپنے حلیف کو پکارے گا اور انگریزی فوجیں فوراً اس کی مدد کو پہنچ جائیں گی۔

اس موقع اتحاد سے نظام دکن پریشان تھا اور اسی بنا پر اس نے نواب حیدر علی خاں کو خط لکھا تھا اور ان سے تعاون کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

یہ نامہ جب لکھ کر تیار ہوا تو اس پر نظام دکن کے دستخط ہو کر مرگ گئی۔ پھر نظام نے اپنے خاص غلام گھٹا کو طلب کیا۔ وہ اس کا معتد خاص تھا۔

”گھٹا! نظام نے اسے مخاطب کیا:

”یہ خطابت اہم اور خفیہ ہے۔ اسے لے کر تمہیں سرنگاٹم جانا ہے اور مرث نواب حیدر علی خاں کے ہاتھ میں دینا ہے۔ میں امید ہے کہ تم اس خط کو پوری پوری حفاظت کرو گے۔“

شاہ بہادر اطمینان رکھیے۔

گلغام نے بڑے وثوق سے کہا:

”میں اس اہم نامہ کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا اور نواب حیدر علی خاں کو پہنچانے آپ کی نظر میں سرفرو ہوں گا۔“

”میں تم سے یہی امید ہے گلغام۔“

نظام نے اپنی خوشنودی کا اظہار کیا:

”تم کافی بھدار ہو اور تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تم اس نامہ کو جسم کے کون سے حصے میں چھپاؤ گے۔“

”آپ بالکل فکر نہ فرمائیے شاہ بہادر۔“

گلغام نے سینہ تان کر کہا:

”میں اس سے پہلے بھی آپ کے اعتماد پر پورا اتر چکا ہوں۔ اسی طرح اب بھی میں امتداد بحال رکھوں گا۔“

”تھیک ہے گلغام۔“

نظام کو اطمینان ہو گیا:

”اب اس سلسلے میں ایک انتہائی غامض بات بھی سن لو۔ وہ یہ کہ دو بادشاہوں کے درمیان جو خط و کتابت ہوتی ہے اس کی تفصیل کبھی قاعدہ کو نہیں بتائی جاتی لیکن اس خط کے مضمون سے تمہیں آگاہ کیا جا رہا ہے اس لیے کہ اگر خدا نخواستہ راستے میں کوئی ایسا وقت آجائے جب تمہیں یقین ہو جائے کہ یہ خط تم سے چھین لیا جائے گا، اس صورت میں تمہیں اختیار حاصل ہو گا کہ تم اس خط کو فوراً ضائع کر دو اور سرنگاٹم پہنچ کر نواب حیدر علی خاں کے سامنے اس خط کے مضمون کو زبانی عرض کرو۔“

گلغام کی سمجھ میں نہ آیا کہ نظام دکن کیا کہنا چاہتا ہے:

”میں سمجھ نہیں سکا شاہ معظّم۔ نواب حیدر علی خاں سے میں کیا عرض کروں گا۔“

نظام دکن مسکرایا۔ وہ سمجھ گیا کہ گلغام الجھ گیا ہے:

”تم نواب بہادر سے وہی کہو گے جو ہم تمہیں بتائیں گے۔ اگر تمہیں خط ضائع کرنا پڑے تو نواب سے کہنا کہ کرنا ملک کے والا جاہ نے بغاوت کر دی ہے۔ اسے ہم سزا دینا چاہتے ہیں۔ اس کام میں نواب بہادر ہم سے تعاون کریں۔“

”میں سمجھ گیا۔ گلغام نے فوراً جواب دیا:

”بالکل سمجھ گیا شاہ معظّم۔“

نظام دکن نے گلغام کو ایک سرسمر لفظ دیا۔ گلغام نے لفظ لے کر نظام کو سلام کیا اور واپسی کا ارادہ کیا ہی تھا کہ نظام کی آواز سنائی دی:

”گلغام! تمہیں مزید کسی تاکید کی ضرورت تو محسوس نہیں ہوتی پھر بھی دوبارہ یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ کام نہایت خفیہ اور اہم ہے۔ گلغام نے پلٹ کر اس طرح سر کو خم کیا جیسے دل و جان سے حاضر ہو۔“

گلغام جب نظام کا نام لے کر گھر پہنچا تو اسے کچھ اور ہی خیالوں نے گھیر لیا۔

اس نے اس بات پر پہلے غور ہی نہیں کیا تھا کہ سرنگاٹم میں اس کا ایک بھائی سردار بھی موجود ہے۔ یہ اس کا وہی بھائی تھا جس سے اس کی بچپن میں جنگ ہوا کرتی تھی اور اس جنگ کا باعث ان کی بن گھر خ تھی۔

گلگرخ کا خیال آتے ہی اس کا دماغ الٹ گیا۔

چھپے سال ایک آدمی کرنا ملک جا رہا تھا تو اس نے گلگرخ کو ایک بھت بھرا خط لکھا تھا۔ اسے اب تک یہی یقین تھا کہ گلگرخ اس کی سونیتی بن ہے اور وہ اس سے رشتہ جوڑ سکتا ہے مگر الگ الگ مقامات پر رہنے کی وجہ سے ان کی بھت پروان چڑھتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

گلگرخ، گلغام اور سردار۔

اس مثلث نے اس کا دماغ گھما کے رکھ دیا۔ وہ تمام رات انہی خیالوں میں الجھا رہا اور لمحہ بھر نہ سو سکا۔

صبح کو اس کا بدن بے خوابی سے ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے نظام سے کہہ دیا تھا کہ وہ صبح ہوتے ہی سرنگاٹم روانہ ہو جائے گا مگر وہ پھر تک وہ بستر سے نہ اٹھ سکا۔

شاہی محل کے اندر ہی غلام گردش میں اس کی کوٹھڑی تھی رتبہ کو معلوم تھا کہ گلفام، نظام کا منہ چڑھا غلام ہے اس لیے سب اس سے دور ہی دور رہتے تھے اور اس کے معاملات میں قطعی دخل نہ دیتے تھے۔

شاہ ہوتے ہوتے اس کا داغ کچھ ٹھکانے لگا۔ وہ نہادھو کے تیار ہوا وہ ایک نئے فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔

گلفام مختصر سفری سامان لے کر گھوڑے پر سوار ہوا مگر جب اس نے گھوڑے کو اڑدی تو اس کا رخ سرنگا پٹم کے بجائے کرناٹک کی طرف تھا۔ اس نے واقعی ایک ذبردست فیصلہ کیا تھا۔

گلفام اپنی بہن گلرخ کی محبت میں اس قدر اندھا ہو گیا تھا کہ اس نے شاہی راز کو دشمن کے حوالے کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

اس نے کرناٹک جیل کے کافیسٹر اس لیے کیا تھا کہ وہ نواب والا جاہ محمد علی کے ہاتھ اس راز کو فروخت کرنا چاہتا تھا۔

گلفام نے چلنے سے پہلے اس معاملہ پر ابھی طرح سوچ چکا کر لیا تھا۔ اس کا یہ قدم انتہائی خطرناک تھا۔ وہ کھلے طور پر اپنے آقا اور اپنے ملک دشمن سے غداری کر رہا تھا کیونکہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ سرنگا پٹم کے بجائے کرناٹک پہنچے نواب والا جاہ کو یہ یقین دلانے کا کہ نظام دکن، اس کے خلاف نواب حیدر علی خاں کا تقاضا حاصل کرنا چاہتا ہے جس کا ثبوت وہ خود یعنی گلفام ہے جو نظام کا پیغام لے کر نواب بہادر پور کے پاس جا رہا ہے۔

پھر جب گلفام نے کرناٹک پہنچ کر نواب والا جاہ کو یہ خبر بھجوائی کہ نظام دکن کا ایک خاص ہرکارہ والا جاہ کو ایک اہم راز سے آگاہ کرنے آیا ہے تو والا جاہ واقعی چونک پڑا۔

نظام دکن کا ہرکارہ اور کرناٹک کے دربار میں۔

اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔

والا جاہ نے گلفام کو فوراً اپنے پاس طلب کر لیا۔

”تمہارا نام؟“ نواب والا جاہ نے گلفام کے فرشی سلام کے جواب میں سوال کیا۔

”نظام کو گلفام کے نام سے پکارا جاتا ہے۔“ اس نے ادب سے جواب دیا۔

”ہم نے سنا ہے تمہارے پاس نظام دکن کا کوئی راز ہے“ والا جاہ نے اس سے دوسرا

سوال کیا۔

”اعلیٰ حضرت والا جاہ کو صحیح اطلاع دی گئی۔“ گلفام نے مختصر جواب دیا۔

”اور یہ راز تم ہم پر ظاہر کرنا چاہتے ہو؟“

”یہ بھی درست ہے اعلیٰ حضرت!“

”مگر یہ راز تو نظام دکن کا ہے ہیں اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔“

والا جاہ بڑا ہوشیار حکمران تھا۔ وہ گلفام پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ راز معلوم کرنے کے لیے بے چین ہے۔ پس اس نے پہلو بدل کے اس انداز سے کہا جیسے یہ بات اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

”مگر اعلیٰ حضرت والا جاہ! گلفام گھبرا گیا۔“

اس کا اندازہ تھا کہ والا جاہ راز معلوم کرنے کے لیے بے چین ہو جائے گا مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ تھا۔

اس نے فوراً خود کو سنبھالا اور حوصلے سے کہا:

”اعلیٰ حضرت یہ درست ہے کہ راز نظام دکن کا ہے مگر اس راز یا اطلاع کا تعلق براہ راست حکومت کرناٹک سے ہے اور اگر وہ اطلاع آپ کے گوش گزار نہ کی گئی تو آپ کی حکومت کو ذبردست نقصان پہنچ سکتا ہے۔“

والا جاہ پھر بھی لاپرواہ بنا رہا۔ وہ بولا:

”اچھا۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ تمہارے پاس جو راز ہے اس کا تعلق ہماری سلطنت کرناٹک سے ہے اور تم اسے ہم پر ظاہر بھی کرنا چاہتے ہو تو بھی تم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ تم نظام دکن سے غداری کر رہے ہو۔ ایک ملک کے راز کو دوسرے ملک کے ہاتھ فروخت کرنا غداری کے سوا اور کسی نام سے نہیں پکارا جاسکتا۔ اس سلسلے میں تمہارا کیا جواب ہے؟“

”غلام کو افسوس ہے کہ اسے غلط سمجھا جا رہا ہے۔“

گلفام نے مضبوط لہجے میں کہا:

”حالانکہ میں نے اعلیٰ حضرت پر خود اس راز کو افشا کرنے کی پیش کش کی ہے۔ اسے راز کو فروخت کرنے کا نام نہیں دیا جاسکتا اس لیے کہ میں نے اس کی کوئی قیمت طلب نہیں کی۔“

والاجاہ نے دیکھا کہ غلام تمہارے سے اکھڑا جا رہا ہے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کچھ بتائے بغیر ہی ناراض ہو کر چل جائے۔ اس نے فوراً نرم پڑتے ہوئے کہا:

”ہمیں تمہاری صاف گوئی سے بہت خوشی ہوئی گلفام۔ دراصل یہی تمہارا امتحان ہے۔ اس قسم کے واقعات اکثر دیکھنے میں آتے ہیں کہ ادھر ادھر کے لوگ غلامی کے فرائض کو بھاری معاوضہ وصول کر لیتے ہیں۔

بہر حال تم وہ راز ظاہر کرو۔ ہم تمہاری خاطر خواہ خاطر مدارات کریں گے اور اگر کوئی مطالبہ کرو گے تو اسے بھی پورا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اعلیٰ حضرت۔ اس معاملہ میں چونکہ ذرا سی غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے اس لیے میں درخواست کروں گا کہ پہلے اسے دور کر لیا جائے۔ گلفام نے بڑی ذہانت سے اپنی اہمیت جتانی۔

والاجاہ جلدی سے بولا:

”ہمیں کوئی غلط فہمی نہیں۔ تم بے فکر ہو گلفام۔“

”غلام اعلیٰ حضرت کا شکر گزار ہے۔“

گلفام نے ہلت آگے بڑھائی:

”مگر میں پھر بھی یہ چاہتا ہوں کہ اپنی شخصیت، دیانت اور شرافت کے ثبوت میں آپ کے محل سے ایک گواہ پیش کر دوں۔“

والاجاہ نے چونک کر گلفام کو دیکھا:

”کیا کیا تم نے۔ گواہ اور ہمارے محل میں۔ کیا کیا چاہتے ہو تم؟“ اور والاجاہ کے چہرے پر مشکیں نمودار ہو گئیں۔

”جی ہاں عالی جاہ! گلفام نے جواب میں کہا:

”آپ کے محل میں مگر خ نام کی ایک کمینہ ہے۔ آپ اسے طلب کیجیے۔ وہ میری گواہی دے گی۔“

والاجاہ کو تعجب سا ہوا:

”میری کمینہ اور تمہاری گواہی۔ تمہاری بات کچھ مبہم ہے۔“

”عالی جاہ۔ ہاتھ لگن کو آرسی کیا۔ آپ مگر خ کو بلوایئے تو۔ پھر دیکھیے وہ میری گواہی دیتی ہے یا نہیں۔ گلفام نے زور دے کر کہا۔

نواب والاجاہ محمد علی خاں نے مگر خ کو طلب کر لیا۔

وہ اس اچانک ظہری پر ہنسنے لگا۔ دربار میں پہنچ کے گلفام کو دیکھا تو بھونپکا رہ گئی۔ اُدھر گلفام اسے بڑے پیار بھرے انداز میں دیکھ رہا تھا۔

”کیوں کمینہ۔ والاجاہ نے سخت جے میں دریافت کیا:

”کیا تم اس آدمی کو پہچانتی ہو؟“

گل رخ سہمی ہوئی تو پہلے ہی تھی، ہٹھکاتی ہوئی بولی:

”جی ہاں سرکار۔ یہ میرا بھائی گلفام ہے جو نظام دکن کی ضرورت۔“

”کس طرح کی نوکری کرتا ہے یہ؟“ والاجاہ نے وضاحت چاہی۔

”اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی سرکار۔“

گل رخ جان چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی:

”بہت پرانی بات ہے۔ آٹھ سال پہلے کی۔ جب میں نظام دکن کے محل میں رہتی تھی اس وقت میں بہت چھوٹی تھی۔ پتہ نہیں یہ تب کیا کرتا تھا اور اب کیا کر رہا ہے۔“

جب گلفام تمہارا بھائی ہے تو اتنے عرصے تک تم نے اس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟“ والاجاہ نے جھٹکا ہوا سوال کیا۔

”سرکار۔ چھوٹے دیس کا رشتہ ہی کیا۔ میں کرناجک سرکار کی نمک خوار ہوں اور یہ نظام سرکار کا غلام۔ رشتہ تو اسی وقت ٹوٹ گیا تھا جب میں کرناجک آ گئی تھی۔ مگر خ نے بڑی جرات سے جواب دیا۔

”تم جاسکتی ہو کمینہ۔“ نواب والاجاہ نے اسے واپس کر دیا۔

گلفام۔ ہمیں تم پر پہلے ہی اعتماد ہو گیا تھا۔

والاجاہ نواب محمد علی خاں نے کہا:

”ہم نے تمہاری خواہش پر کمینہ کو طلب کیا تھا۔ اس نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی کہ تمہارا تعلق نظام حکومت سے ہے۔ اب تم بے دھڑکی اس راز کو ظاہر کر سکتے ہو۔“

خیال رہے کہ خواہ زمانہ قدیم کے شاہی غلات، ہوں یا آج کل کے حکومتی ایوانات، وہاں ہونے والی تمام گفتگو کمینہ میں اور غلام چھپ چھپ کے سنتے تھے اور معقول معاوضہ پر دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ چونکہ یہ کام مشترکہ طور پر ہوتا تھا اس لیے کوئی کمینہ یا غلام دوسرے کی شکایت نہ

کرتا تھا۔

اس ترقی یافتہ دور میں بھی بڑی بڑی حکومتوں کے اہم ترین راز ایسے ہی لوگوں کے ذریعے افشا ہوتے اور تجارتی معاوضہ پر دوسروں تک پہنچ جاتے ہیں۔

نواب والا جاہ نے جب گلرخ کو طلب کیا تھا، اسی وقت تمام محل میں کھلی گئی تھی اور اکثر کینز بھی اور غلام اپنے اپنے مورچوں میں بیٹھ کے دربار میں ہونے والی گفتگو سننے میں لگ گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے گلخام، گلرخ اور نواب والا جاہ کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو سنی تھی۔

اس کے بعد جب گلرخ دربار سے واپس گئی تو اسے بھی فکر ہوئی کہ آخر گلخام، نواب ہادر کے پاس کس غرض سے آیا ہے؟ پس دلوں سے باہر نکلتے ہی وہ بھی ایک ایسی جگہ چھپ کے کھڑی ہو گئی جہاں سے وہ دربار میں ہونے والی گفتگو سن سکتی تھی۔

نواب والا جاہ نے گلخام سے تنہائی میں گفتگو کی تھی۔ دربار کے پہلو والے حصے میں دونوں میں گفتگو ہوئی تھی اس کے باہر صرف غلام پہرے پر تھا۔ گلخام چونکہ خود بھی ایک درباری غلام تھا اس لیے اس نے کرناٹک کے دربار میں داخل ہوتے ہوئے ایک سرسری نگاہ میں ہر چیز دیکھ لی تھی۔

جب والا جاہ نے گلخام کو راز ظاہر کرنے کو کہا تو اس نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے عرض کیا:

”اعلیٰ حضرت۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ دروازے پر پہرے دار موجود ہے۔ مجھے راز ظاہر کرنے میں کوئی عذر نہیں بشرطیکہ آپ مطمئن ہوں۔“

نواب نے اس کی احتیاط کو سراہا:

”تم نے درست کہا گلخام۔“

پھر نواب نے تالی بجا کر پہرے دار کو اندر بلوایا:

”تم دربار کے بڑے دروازے پر ہمارے پہرہ دار کسی کو اس طرف ہرگز نہ آنے دینا۔“

پہریدار نواب کا حکم سن کر باہر چلا گیا۔ اس طرح پہرے دار کے گفتگو سن لینے کا خضرہ بھی ختم ہو گیا مگر نواب والا جاہ محمد علی خاں اس بات سے قطعی بے خبر تھا کہ اس کی کینز گلرخ کمرے کی اس

کھڑکی سے چٹی کھڑی ہے جہاں سے وہ تمام گفتگو آسانی سے سن سکتی ہے۔ صرف وہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ ایک اور کینز اور ایک غلام بھی دربار کی گفتگو سننے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔

ہر طرف سے غلطی ہونے کے بعد گلخام نے اپنی عملی غداری کا ثبوت دیتے ہوئے نفاذ دکن کاراز افشا کیا:

”اعلیٰ حضرت۔ میرے آقا نظام دکن نے حیدر علی خاں والی سرنگاپٹم کو میرے ذریعے پیغام بھیجا ہے کہ تاجر پیشہ انگریز کرناٹک کے سرکش صوبدار محمد علی خاں کی علیحدت سے جو فی ہند میں اپنی حکمرانی کے لیے زمین ہوار کر رہا ہے اس لیے نظام دکن یہ چاہتے ہیں کہ وہ حیدر علی خاں کے تعاون سے کرناٹک کے صوبے دار اور اس کے علاقہ کو اپنے قبضہ میں لے لیں۔“

گلخام نے مانتی لے کر اپنی بات جاری رکھی:

”یہ پیغام لے کر میں سرنگاپٹم جا رہا ہوں اور جو اب حیدر علی خاں مجھے دے گا وہ میں نظام کو پہنچاؤں گا۔“

میں نے اس مسئلے پر جب ٹھنڈے دل سے غور کیا تو اسی نتیجہ پر پہنچا کہ اگر نظام دکن اور حیدر علی خاں کا مشترکہ لشکر کرناٹک پر حملہ آور ہو اور اہمیت خون بے گار اور ہزاروں بے گناہ مارے جائیں گے اور۔ اور۔“

گلخام کہتے کہتے گھر آیا۔ اس کا آواز گلے میں اٹک گئی۔ اس موقع پر نواب والا جاہ نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا:

”کوہو۔ اور کیا کہنا چاہتے ہو؟“

اور یہ کہ اعلیٰ حضرت جانتے ہیں کہ کیا میری بہن گلرخ بھی موجود ہے؟ آخر گلخام نے دل کی بات اگلی دی۔

”تمہیں اپنی بہن سے بہت محبت ہے گلخام؟“ نواب والا جاہ نے بڑی تنگی نظر دلا سے گلخام کو دیکھا۔

گلخام کا سر جھکا ہوا تھا اس لیے وہ نواب کا نظریں اور تلخ لہجہ محسوس نہ کر سکا۔

”جی ہاں اعلیٰ حضرت۔ گلرخ صرف میری بہن ہی نہیں بلکہ منگیتر بھی ہے مگر خدا بد دماغی واقع ہوئی ہے۔“

والا جاہ چونک پڑا:

انچاقو بہ بات ہے۔ خیر ہم تمہارا خیال رکھیں گے۔ تم دو چار دن ہمارے مکان رہو۔ ہم کچھ غور و فکر کریں گے اور اس دوران گلبرخ سے بھی دریافت کریں گے۔
گلکھام کی تو باجیس بھل گئیں۔ اس نے سمجھ لیا کہ بس اب ہالامار لیا۔ اس کا چھوٹا دماغ اس کے سوا اور سوچ بھی کیا سکتا تھا۔

نواب والا جاہ کے حکم پر گلکھام کو شاہی مہمان خانے میں پہنچا دیا گیا اور وہ اپنے تصور میں گلبرخ کو لیے مہمان خانے کے لوازمات میں پھنس گیا۔

ادھر والا جاہ کو اپنی فکر بڑھ گئی۔ کرناٹک کا صوبہ اگرچہ ایک علیحدہ حکومت تھی جس کا وہ بلا شرکت غیرے حکمران تھا لیکن دہلی دربار کے فرمان کے مطابق نظام دکن کو کرناٹک کی یہ سیادت دی گئی تھی کہ کرناٹک کا ہر نیا نواب نظام دکن کی مرضی سے مقرر ہوتا تھا۔

نواب والا جاہ بالکل خود مختار صوبے دار تھا لیکن اسے دہلی دربار کی یہ شقی بھی گوارا نہ تھی کہ کرناٹک کے گورنر کا تقرر نظام دکن کی مرضی سے کیا جائے۔

دہلی دربار کے فرمان کی اس شقی کو دور کرنے کے لیے نواب محمد علی خان نے ٹک ددو شروع کی اور مزہ اس میں کا بیاب ہو گیا۔

دہلی دربار سے تاحدار ہند کا ایک فرمان جاری ہوا جس میں نواب محمد علی خان کو کرناٹک کا مزہ خود مختار حکمران تصور کیا گیا بلکہ اسے "والا جاہ" کا خطاب بھی دیا گیا۔

اس فرمان سے نظام دکن پر جیسے بجلی گر پڑی۔ نواب والا جاہ نے اس فرمان کے چارے ہوتے ہی نظام دکن سے آنکھیں پھیر لیں اور اپنی طاقت بڑھانے کے لیے اس نے انگریزوں سے ایسا کٹھ جوڑ کیا کہ انگریز اور والا جاہ ہم پیالہ وہم فالہ ہو گئے۔

نواب والا جاہ کی اس سرکشی اور غرور کے پیش نظر ہی نظام دکن نے نواب حیدر علی خاں کے تعاون سے کرناٹک پر قبضہ کرنے کا سوچا تھا اور اس سلسلے میں ایک خط اپنے خاص غلام گلکھام کے ہاتھ مرنگا پیم بھجوا یا تھا لیکن نثار گلکھام نے اس راز کو اپنی ایک طرفہ جھٹ پر قربان کر دیا اور اپنی غیبیہ گلبرخ کو حاصل کرنے کے لیے کرناٹک پہنچ گیا۔

حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ گلکھام اد گلبرخ سے بے بھائی تھے مگر گلکھام کے دماغ میں یہ بیٹھ گیا تھا کہ کسی نے بٹھا دیا تھا کہ وہ گلبرخ کا سونپلا بھائی ہے اور یہ کہ وہ گلبرخ سے شادی کر سکتا ہے جبکہ گلبرخ کو اپنے سونپلے بھائی سردار علی سے جھٹ تھی جو ان دنوں مرنگا پیم میں نواب حیدر علی خاں کی فوج

میں ملازم تھا۔

نواب والا جاہ نے گلکھام کو مکان خانے میں بیچ کے فوراً اپنے نائب کو بلوایا اور اسی وقت اپنے حلیف انگریزوں کو ایک خط لکھوایا :

"ہمارے فوجی جاسوسوں نے نظام الملک نظام دکن کے ایک نامہ برد کو گرفتار کیا ہے جس کے قبضہ سے ایک اہم خط برآمد ہوا۔ اس خط میں نظام دکن نے نواب حیدر علی خاں کو لکھا ہے کہ غیر ملکی انگریز تاجر دوائی کرناٹک یعنی میرے تعاون سے جنوبی ہند پر قبضہ کرنے کے لیے راہ ہموار کر رہا ہے اس لیے نواب حیدر علی خاں اور نظام دکن کو مشترکہ لشکر کے ساتھ انگریزوں اور کرناٹک کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہیے۔ خط لے جانے والا قاصد ہمارے قبضہ میں ہے۔ آپ سے اتنا س ہے کہ فوری طور پر آپ نظام دکن کو حیدر علی خاں کے ساتھ کٹھ جوڑ کرنے سے کسی بھی طرح روکنے کی کوشش نہ کیجیے۔ اور نظام کو کچھ لالچ دے کہ اس بات پر آمادہ کیجیے کہ وہ حیدر علی خاں کا تعاون حاصل کرنے کے بجائے آپ کا اور ہمارا تعاون حاصل کرے تاکہ ہم سب مل کر حیدر علی کی زور پرکٹی طاقت کو ختم کر دیں۔"

والا جاہ نے یہ خط انگریزی میں ترجمہ کرا کے انگریزوں کے صدر مقام مدراس روانہ کیا۔ اس بروقت اطلاع کے ملنے سے والا جاہ بہت خوش تھا کیونکہ نظام اور حیدر علی کے کٹھ جوڑ میں انگریزوں سے زیادہ اس کا نقصان مضر تھا۔ کرناٹک پر حملہ کی صورت میں انگریز کرناٹک کی مدد کو ضرور آتے ، کیونکہ والا جاہ دراصل انگریزوں کا ماتحت ہو گیا تھا لیکن انگریزوں کی طاقت اس قدر نہ تھی کہ وہ نظام اور حیدر علی کے دہرے حملے کا مقابلہ کر سکتے۔

والا جاہ کے شاہی محل سے شام کے وقت ایک قاصد مدراس روانہ ہوا اور اسی محل سے نصف شب کے بعد ایک اور قاصد روانہ ہوا مگر اس کا رخ کرناٹک سے مدراس کے بجائے مرنگا پیم کی طرف تھا۔ یہ قاصد شاہی محل کا ایک غلام تھا جسے گلبرخ نے اپنے تمام زیورات حوالے کر کے اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ فوراً مرنگا پیم پہنچے اور وہاں سردار علی سے جو حیدر علی فوج میں ملازم ہے، ملے اور اسے یہ پیغام دے کہ نظام دکن کا قاصد مرنگا پیم روانہ ہوا تھا مگر والا جاہ کے فوجیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا ہے اور

اس نے تمام راز اگلی دیا ہے۔ اور اس نے دالاجاہ کو بتایا ہے کہ نظام دکن، نواب حیدر علی خاں کا تعاون حاصل کرنا چاہتا ہے۔ پس اگر نظام دکن کو صدمہ لگتا ہے تو اس کی کسی بات کا اعتبار نہ کیا جائے بلکہ نواب حیدر علی خاں کو اپنے طوطہ پر جنگ کی تیاری کرنی چاہیے کیونکہ دالاجاہ نے انگریزی فوج کو ہلانے کے لیے قاصد روانہ کر دیا ہے اور سرنگا پٹم پر چند دنوں بعد حملہ ہو سکتا ہے۔

پھر ایسا ہوا کہ کرناٹک کے شاہی محل سے چلنے والے دونوں نامبر اور پیامبر اپنے اپنے مقام پر پہنچے۔ دالاجاہ کا نامبر بردار اس پہنچا۔

اور

گلبرخ کے بیچے ہوئے پیامبر نے سرنگا پٹم میں قدم رکھا۔



سردار علی حیدر علی فوج کا ایک عام سپاہی تھا۔

مگر یہ عام سپاہی اپنی ہنس مکھ طبیعت، چٹکلوں اور لطیفوں کی وجہ سے خاص آدمی بن گیا تھا۔ حیدر علی فوج کے تمام چھوٹے بڑے عہدیدار سردار علی کی پُر لطف باتوں سے محفوظ ہوتے تھے اور وہی وجہ تھی کہ وہ فوجیوں کی محبوب اور مقبول شخصیت بن گیا تھا۔

چنانچہ

ارکاٹ سے آنے والے اس غلام کو جو گلبرخ کا پیغام لے کر سرنگا پٹم پہنچا، سردار علی کو تلاش کرنے میں کوئی پریشانی نہ ہوئی۔

پیامبر نے فوجی بستی میں پہنچ کے جب سردار علی کے بارے میں دریافت کیا تو کئی فوجی اسے ساتھ لے کر سردار علی کے پاس پہنچے۔

”لو سنبھالو اپنے مہمان کو“ ایک نے ہنس کر کہا۔

”سردار۔ ہم نے مہمان کو تمہارے پاس پہنچا تو دیا ہے مگر اپنے مہمان کی وجہ سے ہمیں فراموش

نہ کر دینا“ ایک دوسرے سپاہی نے اسے پھیرا۔

”میرے بھائیو۔ تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے میرے مہمان کو ٹھیک پہنچا دیا۔“ سردار نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

”مگر اب خدا کے لیے میری جان چھوڑو تاکہ میں اپنے مہمان کی خاطر مدارات کر سکوں۔ اس بے



باتیں کر سکوں۔

اس مختصر نوک جھجک کے بعد جب مردار علی کے یار دوست رخصت ہو گئے تو اس نے اپنے مکان سے دریافت کیا۔

”میرے مکان بھائی۔ ان کم بختوں کی بک بک میں میں آپ سے ایک بات بھی نہیں کر سکا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اسی سے پہلے آپ کو کہاں دیکھا تھا!“

ارکاٹ کے قاصد نے جواب دیا:

”مردار بھائی۔ آپ اپنی یادداشت پر زور نہ دیجیے اس لیے کہ آپ مجھ سے کبھی نہیں ملے او نہ میں نے آپ کو اس سے پہلے دیکھا ہے۔“

”آپ بڑے سچے اور کمرے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔“ مردار نے بڑے خلوص سے کہا:

”کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں اور میں آپ کی کیس خدمت کر سکتا ہوں؟“

قاصد نے جواب میں کہا:

”میرے بھائی مردار علی۔ میں ارکاٹ سے آیا ہوں جہاں کے حکمران نواب محمد علی والا جاہ ہیں۔“

”اچھا تو آپ ارکاٹ سے تشریف لائے ہیں!“ ارکاٹ کا نام سن کر مردار علی کا دل بلیوں اچھلنے لگا تھا۔

”جی ہاں۔ میں ارکاٹ سے آیا ہوں اور آپ کے لیے گلرخ کا ایک نہایت اہم پیغام لایا ہوں۔“ قاصد نے بے دھرمی کے گفتگو شروع کی۔

”گلرخ؟“

مردار علی نے حیران نظروں سے پیامبر کو دیکھا:

”کیا تم گلرخ کو جانتے ہو؟“

”شاید تم ہوش میں نہیں ہو مردار علی۔“ پیامبر نے جواب دیا:

”میں کہہ رہا ہوں کہ میں گلرخ کا پیغام لایا ہوں اور تم مجھ سے پوچھ رہے ہو کیا میں گلرخ کو جانتا ہوں۔ تم ہوش میں آؤ تو میں تمہیں وہ اہم پیغام سناؤں جسے سنانے کے لیے میں خطروں کی پرواہ نہ کرتا ہوں۔ یہاں تک پہنچا ہوں اور جس کے لیے گلرخ نے مجھے منہ مانگا معاوضہ ادا کیا ہے!“

”ہاں ہاں ضرور سناؤ۔ میں بالکل ہوش میں ہوں۔ بس ذرا یقینی —“ اور مردار علی کہتے کہتے رک گیا جیسے شرمایا ہو۔

قاصد نے ادھر ادھر دیکھ کر راز دارانہ انداز میں کہنا شروع کیا:

”ذرا کان کھول کے سنو مردار علی۔ میں اس وقت تم سے جو کچھ کہہ رہا ہوں یہی کچھ تم نواب حیدر علی خاں کے سامنے دہراؤ گے۔“

”میں — میں نواب بہادر کے پاس کیسے جاؤں گا؟“ مردار علی نے بات کاٹ دی:

”مجھ جیسے معمولی سپاہی سے نواب بہادر کیوں ملیں گے؟“

”تم خواہ مخواہ پریشان ہو گئے مردار علی۔“

قاصد نے اسے تسلی دی:

”یہ بات اتنا اہم ہے کہ نواب بہادر تمہیں انعام دیں گے۔ پہلے تم سنو تو!“

”اچھا۔ تم کہتے ہو تو سن لیتا ہوں۔“

مردار کو پسینہ آ گیا تھا۔

قاصد نے آہستہ آہستہ ٹھٹھڑکے گلرخ کا پیغام لے لیا۔ پیغام سن کر مردار علی اور زیادہ گھبرا گیا۔

”قاصد بھائی۔ اس نے تھوک نکلنے ہوئے کہا:

”تم جو پیغام لائے ہو وہ ضرور سچ ہو گا مگر میں نواب بہادر کے سامنے اسے کس طرح میں کر سکوں گا۔ میں تو ان کے سامنے بول ہی نہ سکوں گا۔“

”مردار علی۔ تم بڑے بزدل آدمی ہو۔ سپاہی ہو کر ایسے ڈر پک۔ معلوم نہیں تم میدان جنگ میں کیسے لڑتے ہو گے؟“ قاصد بڑبڑانے لگا۔ اسے مردار علی پر غصہ آ رہا تھا۔

”دیکھو بھائی۔ میدان جنگ اور جگہ ہے اور نواب بہادر کا دربار اور جگہ۔“ مردار علی نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی:

”پھر بھی اگر تم مجھے ڈر پک کہتے ہو تو میں تسلیم کیے لیتا ہوں لیکن میں نواب بہادر کے سامنے یہ سب کچھ نہ کہہ سکوں گا۔“

”پھر اور کون کہے گا؟“ قاصد بگڑ گیا:

”اس بے چاری گلرخ نے تم تک یہ بات پہنچانے کے لیے مجھے اپنے مارے زہر دے دیے

بجرا بدن کا نب اٹھا۔

”میرے آقا۔ میرے مالک۔ میرے نواب بہادر۔ میں گستاخی کرنے پر مجبور ہوں۔ میں یہ گستاخی بار بار کروں گا مگر آپ کو غصہ نہ کرنے دوں گا۔“

حیدر علی خاں چیخ پڑے:

”ہم تمہیں قتل کرنے کا حکم بھی دے سکتے ہیں:

”غلام کو قتل ہو جانا منظور ہے لیکن آپ کا غسل کرنا منظور نہیں۔ طبیب نے سر متقبلی پر رکھ کر جواب دیا۔

”نہا صاحب دم۔ بخود کھڑے رخصت اور طبیب کے نرم و گرم، تلخ و شیریں سوال و جواب سن رہے تھے۔

طبیب کے آخری جواب نے نواب بہادر کو خاموش کر دیا۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور سرتکیے پر رکھ دیا۔

طبیب اوڑھا جوں کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔

اس لمحے۔ نواب بہادر نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ صاحبین نے زندگی میں پہلی بار ان کی آنکھوں میں آنسو چمکتے دیکھے۔

پھر۔

انہوں نے بہت ہی خفیف آواز میں طبیب کو مخاطب کیا:

”میرے وفادار۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں اپنے مالک کے دربار میں گندے بدن اور بدبودا کپڑوں کے ساتھ جاؤں؟“

نواب بہادر کے اس جملے پر حاضرین کی آنکھیں برس پڑیں۔ طبیب نے چیخ مار کر نواب بہادر کے پیر پکڑ لیے:

”میرے آقا۔ اب میں آپ کو نہیں روک سکتا۔ میں آپ سے نو گستاخی کر سکتا ہوں مگر اس دربار میں گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آپ غل ضرور فرمائیں گے۔“

نواب بہادر کو اسی وقت غسل دیا گیا۔ اور ان کا لباس تبدیل کیا گیا۔ دوسرا لباس پہن کے حیدر علی خاں نے کلمہ اور دو درتشریف پڑھ کے منہ پر ہاتھ بھرا۔ پھر حکم دیا:

”پانچ ہزار سوار، انگریزوں کے مقابلہ پر اور دو ہزار سوار ارکاٹ روانہ کیے جائیں۔“

ہیں اور ایک تم ہو کہ جسے نہ گلہ رخ کا خیال ہے اور نہ اس بات کی اہمیت کا کوئی احساس ہے۔“

”قاصد بھاٹی!“ سردار بجاحت سے بولا:

”میں گلہ رخ کا اور تمہارا دونوں کا بہت بہت شکریہ گزار رہی اور تم سے امید کرتا ہوں کہ جس حفاظت سے تم نے یہ پیغام بھجوا دیا ہے بالکل اسی طرح تم اسے نواب بہادر تک پہنچا دو گے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

قاصد کا بارہ چڑھ گیا:

”میں نے پیغام پہنچانے کا کام انجام دے دیا۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔ میں واپس ارکاٹ جا رہا ہوں۔“

قاصد واقعی جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

سردار علی نے اس کے پیر پکڑ لیے:

”میرے بھاٹی۔ میرے دوست۔ میں تمہارے ساتھ نواب بہادر کے پاس چلوں گا لیکن ان سے بات تم کرو گے۔ خدا کے لیے بھڑ پیر یہ احسان کر دو۔“

قاصد کو اس پر رحم آ گیا۔ بھڑ مسکراتے لگا:

”اچھا۔ مجھے بے چارے نواب بہادر کے پاس۔ میں خود بات کر لوں گا ان سے۔“

سردار علی خوش ہو گیا۔ اور قاصد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا:

”تم یہیں ٹھہرو۔ میں نواب بہادر سے اجازت لے کر ابھی آتا ہوں۔“

نواب بہادر حیدر علی خاں اپنے ایک سردار نہایت خاں سے گفتگو کر رہے تھے کہ ان کے محافظ نے داخل ہو کر عرض کیا:

”نواب بہادر کا اقبال بلند ہو۔ سردار علی نام کے ایک سپاہی نے درخواست پیش کی ہے کہ اس کے پاس ارکاٹ سے ایک قاصد آ رہا ہے۔ اس کے پاس نواب بہادر کے لیے ایک مزوری پیغام ہے۔ اجازت ہو تو ان دونوں کو حاضر کیا جائے؟“

نواب بہادر نے حیرانگی سے پہلے محافظ اور پھر بہت خاں کو دیکھا:

”ارکاٹ سے قاصد آیا ہے۔ یہ بات کچھ مجھ میں نہیں آتی۔ والا جاہ محمد علی نانا نانا بڑوں کے جوتے

صرف ہی حکم نہیں دیا بلکہ اس کی تعمیل بھی کرائی۔

یہ نواب بہادر کا پہلا اور آخری سنبھالا تھا جس میں انہوں نے احکامات صادر کیے۔
رات کے آخری حصے میں چند گھنٹے شور بے کے پیہ اور آرام کرنے کے لیے بہتر پر
لیٹ گئے۔ پھر تمام لوگوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا مگر تمام لوگ ذرا سا پیچھے ہٹ کر دہلی کھڑے
رہے۔

پھر

چند ساعت بعد نواب بہادر حیدر علی خاں نے ایک پُر آشوب اور پُر جوش زندگی گزار کر
نہایت خاموشی سے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

یہ وہ شب تھی کہ ۱۱۹۵ھ رخصت اور ۱۱۹۶ھ کا آغاز ہو رہا تھا اور انگریزی تاریخ ۲ دسمبر
۱۷۸۲ء تھی۔

اراکین سلطنت نے وفات کی خبر مصلحتاً مخفی رکھی اور جنازہ کو ایک آراستہ و میراستہ
مندوق میں اس طرح بھیجا کہ یادہ کوئی بڑا قیمتی خزانہ ہو۔

عاری طور پر نواب بہادر کا جسدِ خاکی کو لار میں ان کے والد فتح محمد کے پہلو میں امانتِ دفن
کیا گیا۔ بعد میں سرنگاپٹم بھیج کے گنبد میں دفن کیا گیا۔
ایک شاعر نے تاریخِ وفات:

حیدر علی خاں بہادر

۱۱۹۵ھ

سے نکالی۔



جزوی ہند کے اس اولوالعزم اور بہادر فرمانروا نے اپنی تمام عمر نہایت حزم و احتیاط کے
ساتھ بسر کی۔

حیدر علی نے اگرچہ مکتب کی صورت نہیں دیکھی تھی لیکن وہ تعصبات سے مبرا ایک کھرے سپاہی
اور بہترین شہسوار تھے۔ دنیا میں اس پایہ کے بہت کم فوجی پیدا ہوئے ہیں۔

حیدر علی نے کبھی خوف و ہراس کو پاس نہیں چھٹکنے دیا۔ انہوں نے مشکل سے مشکل وقت میں
بھی ہمت نہیں ہاری۔ سرنگاپٹم میں جب راجہ کی سازش سے ان کی جان پر برائی تو وہ رات کو دریا کی

لوٹانی موجوں میں کود کے پار جاتا رہے اور پھر فوجِ حج کر کے مقابلے پر آ گئے۔

مرہٹہ سپہ سالار ترمک راڈ کے مقابلہ میں انہیں سرنگاپٹم کی طرف پسپا ہونا پڑا مگر انہوں
نے ہمت نہ ہاری اور پلٹ کر ایسا شب خون مارا کہ مرہٹوں کو بھاگتے ہی سہی۔

ان کی بہادری کا یہ عالم تھا کہ دشمنوں کی صفوں میں بے خوف و خطر دراندہ وار گھس جایا
کرتے تھے۔

نواب حیدر علی خاں مستقل مزاج اتنے تھے کہ خطرے میں کبھی نہ گھبراتے۔ کڑ پتہ میں رات کے
وقت جب افغانوں نے ان کے خیمہ پر حملہ کیا تو انہوں نے نہایت اطمینان کے ساتھ میسر پر تکیہ رکھا اور

اس پر چادر اوڑھ کر چپ چاپ باہر نکل گئے۔

ان کے رعب اور دہرہ کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے مفسدہ پردازان کے ناک سے کانپتے
تھے۔ حیدر علی غلیانِ معاف نہیں کرتے تھے بلکہ کوڑوں کی مرادیت تھے۔ ایک بار کسی غلطی پر

انہوں نے اپنے پیارے بیٹے شہزادہ بیچو کو بھی کوڑوں کی سزا دی تھی۔
 حیدر علی کی سختی اور درشتگی کا بہت پراسیدہ کیا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ جہقدر
 سخت مزاج تھے اس سے کہیں زیادہ منصف مزاج اور رحمدل تھے۔ دو انگریزوں نے جب فرانسیسی
 جن کران کے ملازموں کو درغلانا شروع کیا تو نواب بہادر نے انہیں سزا دینے کے بجائے ہانڈیکری
 روانہ کر دیا۔

ان کے انصاف کا یہ عالم تھا کہ ایک بار میر کے دوران ایک بڑھیا نے ان کو روک کر فریاد کیا کہ اس نے
 ایک درخواست دی تھی جس پر غور نہیں کیا گیا۔ پتہ چلا کہ درخواست سردار حیدر شاہ کو دی گئی تھی جس میں درج
 تھا کہ فقیروں کے سردار امام محمد نے بڑھیا کی لڑکی بھین لے ہے اور حیدر شاہ نے اس لیے درخواست پر غور نہیں کیا کہ
 ماں بیٹی کو طوائف بنایا گیا تھا۔

مزید تحقیقات سے ثابت ہوا کہ بڑھیا اور لڑکی پاکیزہ ہیں اور ان پر ظلم ہوا ہے۔ نواب بہادر نے سردار حیدر شاہ
 کو ۲۰ کوڑوں کی سزا دی اور امام محمد کا سر قلم کرا کے بڑھیا کو اس کی بیٹی واپس کی گئی اور اسے کافی رقم دے کر
 معاف کیا گیا۔

خدا جنت کرے برصغیر کے اور عالم اسلام کے اس عظیم اور زبردست ہیرو پر جو برصغیر کے
 راجا جات و سبہ بن کر آیا تھا۔

